مولانا سید لعل شاہ صاحب بخاری کی کتاب

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ واستخلافِ یزید"

کا

تحقیقی جائزہ

حافظ عُبید اللہ

ابوریحان اکیڈمی (اسلام آباد)

مولانا سید لعل شاہ صاحب بخاری کی کتاب

”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ و استخلافِ یزید“

کا

تحقیقی جائزہ

حافظ عُبیداللہ

ابوریحان اکیڈمی (اسلام آباد)

E-BOOK

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : .... سید لعل شاہ بخاری کی کتاب "استخلاف یزید" کا تحقیقی جائزہ

مصنف : .... حافظ عُبید اللہ

طبع اول : .... ای بُک (E-Book) اکتوبر 2025ء

طبع دوم : .... ای بُک (E-Book) جنوری 2026ء

E-BOOK

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
13	پیش لفظ	1
14	سید لعل شاہ صاحب کی کتاب کے بارے میں علماء کی آراء	2
14	مولانا سید نور الحسن بخاری رحمہ اللہ کی رائے	3
16	مولانا قاضی مظہر حسین چکوالی رحمہ اللہ کی رائے	4
17	استاذ العلماء شیخ الحدیث مولانا عبد القدیر رحمہ اللہ کی رائے	5
18	مفتی محمد فرید رحمہ اللہ (دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) کی رائے	6
18	مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی رحمہ اللہ (جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) کی رائے	7
21	سید لعل شاہ صاحب کا انداز تحقیق	8
28	چند اصولی باتیں	9
36	مشاجرات صحابہ کے بارے میں اہل سنت کا اصولی موقف	10
44	"تاریخ نواصب" نامی کتاب اور لعل شاہ صاحب	11
47	"تحقیق" کسے کہتے ہیں؟	12
50	حدیثی و تاریخی روایات سے متعلق یاد رکھنے کی چند باتیں	13
51	ہر افواہ جو پھیل جائے، اسے "خبر متواتر" نہیں کہتے	14

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
54	راویوں کی توثیق وتضعیف	15
55	تاریخ اور تاریخی روایات	16
60	مفسرین وشارحین کے تفسیری وتشریحی اقوال کی حیثیت	17
62	سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرنے والوں کے بارے میں اسلاف کا طرز عمل	18
64	لعل شاہ صاحب کی تحقیق کا جائزہ	19
69	"ابومخنف لوط بن یحییٰ" کا تعارف	20
73	ابومخنف کے بارے میں شیعہ علماء کے اقوال	21
74	لعل شاہ صاحب اور ابومخنف	22
81	سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ایک مظلوم صحابی	23
84	"حُجر بن عدی" کا قضیہ	24
89	حجر بن عدی کا قتل اور لعل شاہ صاحب کی تلبیس	25
95	جنگ جمل وصفین اور لعل شاہ صاحب کی تلبیسات	26
120	"اولی الطائفتین بالحق" کا مفہوم کیا ہے؟	27
126	ایک اہم تنبیہ	28
128	سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور "الفئة الباغية"	29
138	لعل شاہ صاحب کی جدید تحقیق	30
145	مشاجرات صحابہ کے بارے میں جماعت صحابہ اور اسلاف کے مواقف	31
150	سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک بے سند قول سے استدلال	32
154	دونوں گروہوں کی "دعوة" یا "دعوی" ایک ہونے کا کیا مطلب؟	33

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
34	سیدنا علی اور سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں حق پر تھے	155
35	لعل شاہ صاحب کے قلم سے آخر ان کے اندر کی بات نکل ہی گئی	163
36	ایک اہم تنبیہ	164
37	کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عدالت ساقط ہوگئی تھی؟	167
38	لعل شاہ صاحب کی ایک باطل تاویل	169
39	لعل شاہ صاحب، سید مودودی سے بھی دو قدم آگے	172
40	خلافت و ملوکیت کی بحث (کیا خلافت و ملوکیت دو متضاد چیزیں ہیں؟)	178
41	تنبیہ	179
42	خلافت کی تعریف	184
43	کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ راشد نہیں کہا جا سکتا؟	186
44	بحوالہ فرائض خلیفۂ راشد	187
45	بحوالہ ضابطۂ تقرر خلیفہ	192
46	بحوالہ سپردگی خلافت از خلیفۂ راشد	194
47	کیا خلافت راشدہ صرف تیس سال تک تھی؟	200
48	حدیث سفینہ (رضی اللہ عنہ)	205
49	حدیث میزان	210
50	حضرت ثمامہ رضی اللہ عنہ کا اثر	215
51	"سعید بن جمہان"	218
52	ابو ریحانہ بصری کی متابعت کا حال	224

E-BOOK

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
53	خلافت کی اقسام اور خلافت راشدہ خاصہ و خلافت راشدہ عامہ	227
54	لعل شاہ صاحب کی پریشانی	236
55	انقضائے خلافت راشدہ پر لعل شاہ صاحب کے دوسرے دلائل کا جائزہ	239
56	حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر بیت المال کے غلط استعمال کا بہتان	247
57	سید لعل شاہ صاحب بخاری اور تین روایتوں کے مطالب	254
58	حدیث "خیرامتی قرنی" اور لعل شاہ صاحب کی تحقیق	255
59	حدیث "اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس سال تک چلے گی"	261
60	بارہ خلفاء تک اسلام کے غالب رہنے والی روایت	262
61	استخلاف یزید (یعنی "یزید کی نامزدگی")	264
62	کیا یزید کی ولی عہدی کی تحریک سنہ 44ھ میں شروع ہوئی؟	267
63	سیدنا حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) کی وفات کب ہوئی؟	269
64	لعل شاہ صاحب بمقابلہ تمام مؤرخین	275
65	کیا واقعی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز دی؟	278
66	کیا حاکم اپنے بعد کسی کو ولی عہد مقرر نہیں کرسکتا؟	282
67	کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ابتدا سے ہی یزید کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے؟	294
68	کیا یزید کی نامزدگی کسی ذاتی مفاد کے تحت کی گئی؟	295
69	لعل شاہ صاحب کی مستدلہ ایک حکایت کا جائزہ	304
70	صحیح بخاری کی دو روایات سے لعل شاہ صاحب کے استدلال کا جائزہ	315
71	لعل شاہ صاحب کی مستدلہ صحیح بخاری کی دوسری روایت (خطبہ معاویہ رضی اللہ عنہ)	320

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
326	حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کب ہوئی؟	72
327	لعل شاہ صاحب کی ایک تلبیس	73
336	کیا "ھذا الامر" سے مراد خلافت وحکومت ہے؟	74
339	کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود کو حضرات ابوبکر وعمر وعلی (رضی اللہ عنہم) سے زیادہ خلافت کا حقدار سمجھتے تھے؟	75
339	سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی مراد	76
340	باپ کے حوالہ کا مفہوم	77
344	متعلقہ معاملہ کی نوعیت	78
349	حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ	79
352	حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ	80
356	قریش اور ان کی خاندانی تقسیم	81
358	کیا امام یا حاکم کا سب سے افضل ہونا ضروری ہے؟	82
361	مسئلہ استخلاف (یعنی" نامزدگی اور جانشینی کا مسئلہ")	83
364	کبار صحابہ کا شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد گوشہ نشین ہوجانا	84
367	سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک اثر کی حقیقت	85
376	خلاصۂ کلام	86
369	حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور بیعتِ یزید	87
370	تنبیہ	88
374	"یتخوّفونہ" یا "لایتخوّفونہ"؟	89
380	لعل شاہ صاحب آخر ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟	90

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
91	کیا صحابہ کرام کو "بہترین امت" نہیں قرار دیا گیا؟	383
92	لعل شاہ صاحب کا ایک اقرار اور ایک تلبیس	384
93	"حدیث قسطنطنیہ اور یزید" (لعل شاہ صاحب کی تحقیق)	388
94	حدیث قسطنطنیہ اور لعل شاہ صاحب کی تحقیق جدید	391
95	تنبیہ	408
96	صحیح بخاری کی حدیث کے بارے میں لعل شاہ صاحب کا موقف	408
97	صحیحین کی روایات کا انکار تعصب (لعل شاہ صاحب)	418
98	صحیح بخاری کی حدیث کو "خود ساختہ" ثابت کرنے کے لئے لعل شاہ صاحب کے دلائل کا جائزہ	419
99	کیا امام بخاری نے اس حدیث کی تضعیف کی طرف اشارہ کیا ہے؟	429
100	کیا "حدیث قسطنطنیہ" کی سند محل نظر ہے؟	431
101	لعل شاہ صاحب کے ایک مغالطہ کا ازالہ	434
102	کیا سارے ذخیرہ حدیث میں "عمیر بن الاسود" سے کوئی دوسری روایت مروی نہیں؟	438
103	لعل شاہ صاحب کا جلیل القدر تابعی پر طنز	440
104	لعل شاہ صاحب کی ایک اور لاعلمی یا غلط بیانی	444
105	امام ابن تیمیہ کا حوالہ اور لعل شاہ صاحب کی تلبیس	444
106	صحیح بخاری کی روایت کے مخفی گوشے جو لعل شاہ صاحب "روشن" نہ کر سکے	445
107	لعل شاہ صاحب اور غلام احمد پرویز	445
108	کیا یزید قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے پہلے لشکر میں شامل نہیں تھا؟	448
109	تنبیہ	451

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
454	تنبیہ	110
456	لعل شاہ صاحب کا ایک اور مغالطہ	111
457	”یزید بن فضالہ“ یا ”فضالہ بن عبید“ ؟	112
460	کیا قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا سب سے پہلا لشکر یزید بن معاویہ کا نہیں تھا؟	113
464	لعل شاہ صاحب کے ”حقیقت آشکارا کرنے“ کے ذرائع کا جائزہ	114
469	تنبیہ	115
470	خلاصۂ کلام	116
471	لعل شاہ صاحب کا ایک اور مغالطہ	117
473	تنبیہ	118
476	لعل شاہ صاحب کے پیش کردہ مزید حوالوں کا جائزہ	119
480	نبیہ	120
486	لعل شاہ صاحب کا ایک اور مغالطہ	121
489	یہ افسانہ ہی من گھڑت اور جھوٹا ہے	122
493	لعل شاہ صاحب کی ”تحقیق مزید“	123
496	”مضیق قسطنطینیہ“ کہاں واقع ہے؟	124
500	لعل شاہ صاحب کی آخری کوشش	125
507	فسقِ یزید کی بحث	126
513	کیا فسق یزید ”متفق علیہ“ ہے؟	127
519	اہم ترین سوال: یزید کب فاسق ہوا؟	128

صفحہ نمبر	مضامین	نمبر شمار
525	ایک تلبیس اور اس کا جواب	129
526	علامہ ابن خلدون کا وہم	130
536	فسق یزید سے متعلق سوالات	131
539	اجماع کیا ہوتا ہے؟	132
541	تواتر کا غلط دعویٰ	133
546	لعل شاہ صاحب کا چند روایات واحادیث سے غلط استدلال	134
555	قریشی بچوں کے ہاتھوں امت کی ہلاکت والی حدیث اور اس کا مفہوم	135
559	سنہ 60ھ اور امارت صبیان	136
562	ساٹھ سال یا ستر سال؟ لعل شاہ صاحب کی ایک علمی خیانت	137
569	حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کو یزید پر منطبق کرنے کی کوشش	138
571	**واقعہ حرہ، اسباب وواقعات**	139
573	واقعہ حرہ کا پس منظر	140
590	اطاعتِ امیر اور حاکم کے خلاف خروج کے بارے میں نبوی ارشادات اور جمہور اہل سنت کا موقف	141
600	سوال: اہل مدینہ کی بغاوت پر کیا اقدام کیا جاتا؟	142
602	کیا جنگ حرہ میں نقصان صرف ایک طرف کا ہوا؟	143
604	یزید بن معاویہ کے بارے میں لعل شاہ صاحب کی ذکر کردہ صحابہ کرام وتابعین عظام کی ”آراء“ اور ان کا تجزیہ	144
605	لعل شاہ صاحب کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بہتان	145
607	تنبیہ	146
608	لعل شاہ صاحب کا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ پر بہتان	147

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
148	حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اور ان کے بیٹے	610
149	حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ	612
150	محمد بن عمر الواقدی کا تعارف	614
151	تاریخ ابن عساکر کی ایک روایت کا جائزہ	622
152	حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ	628
153	حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ	630
154	تنبیہ	632
155	حضرت حارث بن عبداللہ بن کعب الانصاری رضی اللہ عنہ	634
156	حضرت معاذ بن الحارث الانصاری رضی اللہ عنہ	636
157	حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے	637
158	کیا عبداللہ بن مطیع صحابی ہیں؟	641
159	نوٹ	643
160	کیا یزید کے بیٹے نے اپنے والد کے خلاف گواہی دی؟	645
161	عبیداللہ بن زیاد کی طرف منسوب ایک جھوٹی روایت	646
162	کیا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے یزید کو "امیر المؤمنین" کہنے والے کو کوڑے لگوائے؟	649
163	تنبیہ	650
164	عَمرو بن عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ	651
165	یزید بن معاویہ کے بارے میں مبالغہ آرائی اور عدل و انصاف کا تقاضا	654
166	"دید" اور "شنید" کا تقابل ہو تو دید کو ترجیح دی جاتی ہے	656

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
167	جمہور امت نے یزید کو بطور حاکم اور خلیفہ قبول کر لیا تھا	661
168	تنبیہ	667
169	جمل وصفین کے مقتولین اور حرہ کے مقتولین کا عددی موازنہ	668
170	کیا ناموسِ صحابہ کے تحفظ کے لئے یزید کو فاسق وفاجر کہنا ضروری ہے؟	671
171	سانحہ کربلا اور یزید کا کردار	677
172	ایک اہم سوال	681
173	صحابہ کرام پر لعل شاہ صاحب کا بہتان	682
174	لعل شاہ صاحب کی ایک روایت میں تحریف	684
175	کسی صحیح روایت کو جعلی اور موضوع کہہ دینا ناخدا ترسی کا ثبوت؟	687
176	آخری بات	688
177	ضمیمہ: بغاوت اور "الفئة الباغية"	689
178	"بغاوت" کا شرعی وفقہی مفہوم	692
179	کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا صفینی اقدام "شرعی بغاوت" بنتا ہے؟	698
180	"فئہ باغیہ" کا مصداق کون؟	705
181	ایک اشکال کا ازالہ	713

E-BOOK

پیش لفظ

تقریباً ساٹھ سال قبل کی بات ہے ایک صاحب جن کا نام محمود احمد عباسی تھا انہوں نے پہلے ایک کتاب" خلافت معاویہ و یزید" اور پھر "تحقیق مزید بسلسلۂ خلافت معاویہ و یزید" لکھی، انہوں نے اپنی تحقیق کے مطابق ان موضوعات پر جو درست سمجھا وہ ان کتابوں میں لکھا، بالکل اسی طرح جیسے مودودی صاحب نے " خلافت وملوکیت" میں اپنی تحقیق پیش کی محمود عباسی صاحب کے رد میں کئی لوگوں نے کتابیں لکھیں، ان میں سے ایک کتاب سید لعل شاہ صاحب بخاری صاحب (م 1990ء، سابق خطیب مدنی مسجد، لائق علی چوک واہ کینٹ) کی بھی ہے جس کا پورا نام تو" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ واستخلاف یزید بجواب تحقیق مزید علی خلافۃ معاویہ و یزید" ہے، لیکن یہ کتاب مختصر نام" استخلاف یزید" کے ساتھ ہی مشہور ہوئی، اس کتاب کی طبع اول پر تاریخ طباعت تو کہیں نظر نہیں آئی لیکن غالبا یہ پہلی بار سنہ 1980ء کے آس پاس شائع ہوئی تھی (ہمارے پیش نظر یہی طبع اول ہے) اس کے بعد نومبر 1989ء میں یہ کتاب دوسری بار طبع ہوئی اور پھر تقریباً چار دہائیوں بعد اسی قدیم طبع کا عکس لے کر اسے تیسری بار نئے ٹائٹل کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

خالی الذہن ہو کر سید لعل شاہ صاحب بخاری کی یہ کتاب پڑھنے والا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر محمود احمد عباسی صاحب ایک انتہا پر کھڑے ہیں تو لعل شاہ صاحب بھی" اعتدال" سے کوسوں دور اس کے مدمقابل دوسری انتہا پر کھڑے ہیں ورنہ دونوں کی سوچ کا انداز، طرز استدلال اور طریق استنباط واستخراج سب ایک جیسے ہیں، گویا کہ یہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں صرف ایک کا منہ اگر مثلاً مشرق کی طرف ہے تو دوسرے کا مغرب کی طرف۔

مصنف کتاب سید لعل شاہ بخاری صاحب کئی سال قبل دار الفناء سے دار البقاء کی طرف جا چکے اور احکم الحاکمین کی عدالت میں پہنچ چکے اس لئے اب ان کی کتاب اور تحقیق پر تنقیدی تبصرہ کرنا یا ان کا جواب لکھنا عجیب سا لگتا ہے، لیکن چونکہ آج کل شاہ صاحب کے کچھ معتقدین نے بڑی شدومد کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا شروع کیا ہے کہ مصنف" استخلاف یزید" نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جو قابل اعتراض ہو، نیز ان کا

دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں ایسی لاجواب تحقیق پیش کی گئی ہے جس کا رد ممکن ہی نہیں، بلکہ لعل شاہ صاحب کے خاص شاگرد مولوی مہر حسین بخاری علیہ ما علیہ نے تو اس کتاب کو" نادرہ عصر اور علم و تحقیق کا نادر شاہکار" قرار دیا (حدیث قسطنطنیہ۔ حقائق و اوہام، مرتبہ مہر حسین بخاری، صفحہ 11) اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک مختصر مگر جامع تبصرہ اس کتاب پر اور اس میں پیش کردہ حوالہ جات پر کر دیا جائے، اور شاہ صاحب نے جو حوالوں کی بھرمار اس کتاب میں اپنا موقف یا یوں کہیں کہ " اپنے مفروضے" ثابت کرنے کے لئے نقل کی ہے ان کا تحقیقی جائزہ لیا جائے کہ وہ کس حد تک مستند ہیں۔ رہی محمود احمد عباسی صاحب کی کتب میں پیش کردہ ان کی تحقیق یا ان کے نظریات و افکار، تو ان کا جائزہ لینا یا ان پر تبصرہ کرنا یہاں ہمارا مطمحِ نظر نہیں ہے، لہٰذا اگر محمود عباسی صاحب نے کوئی غلط یا خلاف حقیقت بات لکھی ہے یا کوئی ایسا استدلال کیا ہے جو واقعہ کے خلاف ہے اور لعل شاہ صاحب نے اسی کو بنیاد بنا کر اپنی کوئی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو ہم نے بجائے محمود عباسی صاحب کی بات کا جائزہ لینے کے، لعل شاہ صاحب کی تحقیق کا جائزہ لیا ہے کہ وہ قابل اعتماد اور درست ہے یا نہیں۔

یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہمارے کچھ حضرات جو بظاہر اپنے آپ کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا دفاع کرنے والا بتاتے ہیں اور وہ لعل شاہ صاحب کے حلقہ ارادت میں بھی داخل نہیں، وہ بھی جانے انجانے میں اس کتاب" استخلاف یزید" کی مشہوری کرتے پائے گئے ہیں، اور پھر کئی حضرات نے اپنی تحریرات میں بغیر کتاب کا نام لئے لعل شاہ صاحب کی تحقیق سے استفادہ کیا ہے، اس لئے شروع میں چند بزرگوں اور مفتیان کرام کی اس کتاب کے بارے میں آراء نقل کی جاتی ہیں جن میں سے پہلے دو بزرگ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور ایک تو خلیفہ مجاز بھی ہیں (لعل شاہ صاحب بخاری بھی اپنے آپ کو مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد بتاتے تھے، استخلاف یزید، صفحہ 355)۔

رائے گرامی حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد مدافع صحابہ حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک خط میں لعل شاہ صاحب کی کتاب سے ایک اقتباس نقل فرمایا جو یہ ہے :

”ہمارے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سنہ 41ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہو کر عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہیں اور سنہ 44ھ میں عصبیت مُضر کی پشت پناہی میں اپنے بیٹے کو نامزد کر دیتے ہیں اور تادم زیست اس سے زیادہ کسی مسئلہ کو اہم نہیں سمجھا، جلیل القدر صحابہ پہلے ہی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے، کچھ صحابہ اشارتِ فتنہ اور تفریق امت کے اندیشہ سے خاموش ہو گئے، بعض کی آواز سفک دماء اور خونریزی کے خوف سے حلقوم میں اٹک کر رہ گئی، کچھ رؤساء مناصب کی وجہ سے مجبور تھے، بعض کی زبانیں نقرئی مہروں سے داغ دی گئیں اور بعض کی دہن دوزی لقمہ ہائے چرب سے کر دی گئی اور بعض کو حرص وآز نے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ ملک کے طول وعرض میں رواں دواں اور استحکام ولایت یزید کے لئے کوشاں تھے، مناصب وعہود کی خاطر وفود کے وفود دمشق بھیجے جاتے ہیں، آخر ان کی سعی نامشکور بار آور ہوتی ہے اور یزید ابن معاویہ جس کے ہاتھوں امت کی تباہی مقدر ہو چکی تھی پوری امت پر مسلط کر دیا جاتا ہے..“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 316 طبع اول)

یہ عبارت نقل کرنے کے بعد سید نورالحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا درد دل یوں پیش فرمایا (خلاصہ) :

”میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں حضرت شاہ صاحب نے (یعنی سید لعل شاہ صاحب نے۔ناقل) مسلک اہل سنت سے صاف گریز فرمایا ہے اور انہوں نے اول تو دشمنان صحابہ رضی اللہ عنہم ”روافض“ کی پیروی کی ورنہ کم از کم مودودی صاحب کا طرز عمل اختیار کیا، انہوں نے اپنی کتاب میں ہر جگہ اپنے ہم عصر مصنفین کو ”تسنّن“ سے ہٹ جانے پر مطعون کیا ہے مگر کیا وہ خود یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ انداز سخن اہل سنت کے کس ذمہ دار بزرگ نے اختیار کیا؟..... دراصل حضرت شاہ صاحب سید بخاری ہیں اور ایک سید کے لئے سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے انصاف کرنا مشکل ہے..... اب فاضل مصنف سے دریافت کیا جائے کہ ” آپ کے مطالعہ کا حاصل“ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے سوء ظن پر مبنی نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر یہ سوءِ ظن نہیں تو براہ کرم "44ھ میں عصبیت مُضر کی پشت پناہی میں اپنے بیٹے کو نامزد کر دیتے ہیں اور تادم زیست اس سے زیادہ اہم کسی مسئلہ کو نہیں سمجھا" کی نشاندہی کروا دیجئے کہ یہ الفاظ اہل سنت کے کس بزرگ نے کہاں لکھے ہیں؟..... آپ نے تسنّن (یعنی سنی ہونے کا۔ناقل) دعویٰ کرتے ہوئے دائرۂ تسنّن سے نکل جانے کو بہتر سمجھا پھر اتنا بھی نہ سوچا کہ اس منطق سے آپ نے صرف سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ذبح نہیں کیا بلکہ جمیع صحابہ کے گلے پر چھری پھیر دی.. "۔

(ملخصاً بحوالہ : "القول السدید فی جواب استخلاف یزید" صفحہ 59 تا 62)

مولانا قاضی مظہر حسین صاحب چکوالی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

بانی تحریک خدام اہل سنت اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ایک دوسرے شاگرد اور مُجاز مولانا قاضی مظہر حسین چکوالی مرحوم نے سید لعل شاہ بخاری صاحب کی کتاب "استخلاف یزید" کا ذکر کرکے یوں فرمایا :

"مولانا لعل شاہ بخاری خطیب مدنی مسجد لائق علی چوک واہ کینٹ کے متعلق بندہ کو پہلے سے کوئی واقفیت نہیں، ان کا نام سنا ہے لیکن ملاقات یاد نہیں، ان دنوں ان کی ایک ضخیم کتاب "حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ اور استخلاف یزید" بجواب "تحقیق مزید علی خلافت معاویہ و یزید" صفحات 711 بھی موضوع بحث بنی ہوئی ہے، ان کی اس کتاب کے خلاف ایک رسالہ بنام "القول السدید فی جواب استخلاف یزید" مولانا عبدالسلام صاحب مدرس جامعہ اشاعت القرآن حضرو ضلع اٹک نے شائع کیا ہے جس میں بعض دوسرے علماء کی بھی تصدیقات ہیں اس رسالہ میں" استخلاف یزید" کی سولہ عبارات کے متعلق جوابات شائع کیے گئے ہیں..... "استخلاف یزید" سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری صاحب موصوف کا مطالعہ وسیع ہے متعدد کتابوں کے انبار لگا دیے ہیں لیکن وہ بھی راہ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں، کتاب کے مطالعہ کے بعد ناواقف قاری کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ حسن ظن نہیں رہتا جو حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل

القدر صحابی کے ساتھ ہونا چاہئے.....الخ"۔

(ملخصاً: خارجی فتنہ، جلد 1 صفحہ 318 طبع دوم 2011ء)

پھر قاضی صاحب اسی سیاق میں آگے ایک جگہ لکھتے ہیں :

"مولانا لعل صاحب بخاری نے جس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہدف طعن بنایا ہے ان کے جن فضائل کے اکابر اہل سنت قائل ہیں ان پر بھی جرح کی ہے اور ترتیب وار ان کے منکرات کو تفصیلاً پیش کیا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کی تنقیص و توہین کا پہلو ہی نمایاں ہے...."۔

(خارجی فتنہ، جلد 1 صفحہ 320 حاشیہ، طبع دوم)

اور اگلے صفحہ پر لکھتے ہیں :

"شاہ صاحب موصوف نے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو جس طریق سے تنقید و مذمت کا ہدف بنایا ہے ناجائز ہے، شاہ صاحب اسی ایک بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دور حاضر میں ان کے خلاف جو بعض علماء نے" القول السدید" میں لکھا ہے اس میں انہوں نے اپنی ذات کی توہین محسوس کی ہے حتی کہ اپنے وقار کے تحفظ کے لئے انہوں نے ان کے خلاف استغاثہ تک دائر کر دیا ہے تو پھر حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو تو شرف صحابیت حاصل ہے ان کے دینی وقار کو مجروح کرنا کتنا مذموم ہوگا..."۔

(خارجی فتنہ، جلد 1 صفحہ 321 حاشیہ، طبع دوم)

استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے:

"میری نظر سے کتاب" استخلاف یزید" کے چند اقتباسات گزرے، النصح لکل مسلم کی ذمہ داری کو دیکھتے ہوئے کچھ معروضات پیش خدمت ہیں۔ مصنف کتاب کی بعض عبارات میں جو نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ بلا شک و شبہ مسلک اہل سنت والجماعت کے خلاف افمن زُیِّن

له سوء عمله فرأه حسناً ۔الآیة کامصداق ہیں...الخ"۔

(بحوالہ: "القول السدید فی جواب استخلاف یزید" ،صفحہ 16)

مولانا مفتی محمد فرید رحمۃ اللہ علیہ (دارالافتاء جامعہ حقانیہ، اکوڑہ خٹک) کی رائے:

"یہ مؤلف شیعہ پرور ہے اس نے غیر مستند تاریخی روایات اور ضعیف روایات کی وجہ سے مسلّمہ اصول عدالت صحابہ کو نظر انداز کیا ہے اور مستند روایات حدیثیہ کو اتباعِ ھویٰ کی وجہ سے خود ساختہ قرار دیا ہے۔پس بہر حال ایسا شخص نیم شیعہ یا شیعہ پرور شخص ہے..."۔

(بحوالہ: "القول السدید فی جواب استخلاف یزید" ،صفحہ 15)

مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ) کی رائے:

"مذکورہ بالا محولہ عبارات" استخلاف یزید" اہلسنت کے نظریات نہیں ہیں، ایسا شخص اہلسنت کے معتقدات کا مخالف ہے"۔

(بحوالہ: "القول السدید فی جواب استخلاف یزید، صفحہ 56)

قارئین محترم! دلوں کے حال اللہ ہی جانتا ہے کہ وہی علیم بذات الصدور ہے، ہم کسی پر تنقیص یا توہین کا الزام تھوپنا نہیں چاہتے لیکن جنہیں اللہ نے عقل سلیم اور فراست ایمانی عطا فرمائی ہے وہ اشاروں کنایوں میں کہی یا لکھی بات سے، کہنے یا لکھنے والے کے دل میں چھپی بات کا اندازہ لگا لیتے ہیں، اب سید لعل شاہ بخاری صاحب نے اپنا حاصل مطالعہ پیش کرنے کے لئے (جس پر مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دل کا درد پیش کیا ہے) اگر چہ اردو کے مشکل ترین الفاظ کا انتخاب کیا ہے تاکہ عام آدمی سمجھ ہی نہ سکے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن جسے اللہ نے سمجھ بوجھ دی ہے اور جس کا دل اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے معمور ہے وہ ان الفاظ کی سنگینی کو سمجھ سکتا ہے، آپ بھی ایک بار پھر دل پر پتھر رکھ کر یہ اقتباس دوبارہ پڑھیں، سید لعل شاہ بخاری صاحب

لکھتے ہیں :

”ہمارے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سنہ 41ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہو کر عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہیں اور سنہ 44ھ میں عصبیت مُضر کی پشت پناہی میں اپنے بیٹے کو نامزد کر دیتے ہیں اور تادم زیست اس سے زیادہ کسی مسئلہ کو اہم نہیں سمجھا، جلیل القدر صحابہ پہلے ہی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے، کچھ صحابہ اثارتِ فتنہ اور تفریق امت کے اندیشہ سے خاموش ہو گئے، بعض کی آواز سفک دماء اور خونریزی کے خوف سے حلقوم میں اٹک کر رہ گئی، کچھ رؤساء مناصب کی وجہ سے مجبور تھے، بعض کی زبانیں نقرئی مہروں سے داغ دی گئیں اور بعض کی دہن دوزی لقمہ ہائے چرب سے کر دی گئی اور بعض کو حرص و آز نے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ ملک کے طول و عرض میں رواں دواں اور استحکام ولایت یزید کے لئے کوشاں تھے، مناصب و عہود کی خاطر وفود کے وفود دمشق بھیجے جاتے ہیں، آخر ان کی سعی نامشکور بار آور ہوتی ہے اور یزید ابن معاویہ جس کے ہاتھوں امت کی تباہی مقدر ہو چکی تھی پوری امت پر مسلط کر دیا جاتا ہے اس طرح صادق المصدوق پیغمبر کی پیشگوئی سچی ہو جاتی ہے کہ (يهلك الناس هذا الحي من قريش) کہ لوگوں کو قریش کا یہ قبیلہ ہلاک کر دے گا اور بالآخر لوگوں کے سامنے وہ منظر آ ہی گیا جسے بیان کرتے ہوئے زبان نبوت مرتعش ہو گئی، آپ نے فرمایا تھا لو اعتزل الناس عنهم کاش لوگ ان سے جدا ہو جاتے۔ صحیح بخاری ص 1040 ج..2“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 316 طبع اول)

قارئین محترم! ہم لعل شاہ صاحب کی اس ”نئی“ تحقیق پر اس کے مقام پر بات کریں گے کہ کیا واقعی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے یزید کی نامزدگی اور ولی عہدی کا واقعہ سنہ 44ھ کا ہے؟ اور کیا ”سوچ“، ”تجویز“ اور ”تحریک“ اور ”نامزدگی“ سب کا متصل ہونا ضروری ہے؟ خاص طور پر جب خود لعل شاہ صاحب نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس بارے میں ”ان کی تحقیق تمام مؤرخین کے خلاف واقع ہوئی ہے“ (دیکھیں: استخلاف یزید،

صفحہ 274) نیز ہم آگے اس پر تفصیلی بات کریں گے کہ کیا واقعی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سنہ 44ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے؟ کیونکہ خود لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ "حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما تحریک ولی عہدی سے قبل ہی وفات پا چکے تھے" (صفحہ 402)، سر دست ہم اس تحریر کی سنگینی پر ہی توجہ مرکوز رکھنا چاہتے ہیں، لعل شاہ صاحب ہمیں بتا رہے ہیں کہ :

(1) سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے تین سال بعد ہی کسی اور مصلحت یا وجہ سے نہیں بلکہ صرف اور صرف خاندانی عصبیت کی وجہ سے اپنے بیٹے کو اگلا خلیفہ نامزد کر دیا۔

(2) اس کے بعد اپنی وفات تک (یعنی تقریباً 16 سال) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باقی تمام امور مملکت کے مقابلے میں اسی مسئلہ کو اہم ترین سمجھتے رہے۔

(3) اس زمانہ میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کچھ صحابہ نے اس لئے خاموشی اختیار کر لی کہ کہیں امت میں افتراق اور فتنہ نہ پیدا ہو جائے۔

(4) بعض صحابہ کی آواز خونریزی کے خوف سے ان کے گلے میں اٹک کر رہ گئی اور وہ کچھ نہ بولے۔

(5) کچھ صحابہ کرام اس لئے خاموش رہے کہ وہ بڑے عہدوں پر براجمان تھے اور انہیں یہ عہدے چھن جانے کا ڈر تھا۔

(6) کچھ کے منہ مال و زر (یعنی رشوت) دے کر بند کر دیے گئے۔

(7) کچھ مناصب اور عہدوں کی حرص اور لالچ میں اندھے ہو کر یزید کی ولی عہدی کے لئے کوششیں کرنے لگے۔

(8) آخر کار امت کی تباہی کے لئے ان سب نے مل کر یزید کو امت پر مسلط کر دیا جس کے ہاتھ سے امت کی تباہی مقدر تھی۔

(9) بقول لعل شاہ صاحب، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں یزید کے ہاتھوں امت کی تباہی کی پیشگوئی کی گئی تھی جو پوری ہوئی۔

قارئین محترم! یہ ہے لعل شاہ صاحب کے نزدیک اس زمانہ کا نقشہ جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

امت کے بہترین زمانوں میں بتایا ہے،یہ ہے صحابہ کرام کی اس جماعت کا تعارف جنہوں نے اسلام کی کھیتی کو اپنے خون سے سیراب کیا، اپنا سب کچھ اسلام کے لئے قربان کر دیا اور جن کی حق گوئی اور راستبازی کی مثال پیش کرنے سے آج تک دنیا قاصر ہے، یہ ہے ان اصحاب رسول ﷺ کا تعارف جن کی بہادری کے گواہ بدرو احد کے میدان اور فارس وروم ومصر وشام کی زمینیں ہیں۔

اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا سوچیں، صحابہ کرام کا جو نقشہ لعل شاہ صاحب نے کھینچا ہے کیا یہ اس سے مختلف ہے جو دشمنان صحابہ بتاتے ہیں؟ کیا واقعی صحابہ کرام نے ہی سنہ 44ھ میں اپنے ہاتھوں سے امت کی تباہی کی بنیاد رکھی تھی اور کیا واقعی یزید کے دور میں ہی امت مسلمہ کا خاتمہ ہو گیا اور وہ تباہ ہو گئی؟ لاحول ولاقوۃ الاباللہ۔

اگر کسی کو اس دل خراش تحریر میں صحابہ کرام کی عام طور پر اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بالخصوص تنقیص و توہین نظر نہیں آتی تو اس بیماریِ دل کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔

سید لعل شاہ صاحب کا انداز تحقیق

سید لعل شاہ صاحب، محققین کے اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو پہلے اپنے ذہن میں ایک نظریہ اور مفروضہ بناتے ہیں، اس کے بعد اس نظریہ کو درست ثابت کرنے کے لئے تانے بانے بُنتے اور صغرے کبرے ترتیب دیتے ہیں اور اس عمل میں اگر انہیں صحیح بخاری کی کسی حدیث کو "خودساختہ" بھی لکھنا پڑے تو دریغ نہیں کرتے (دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 320) اور جہاں اپنے فرضی نظریہ کو تقویت دینی ہو وہاں اسی صحیح بخاری سے مبہم الفاظ پیش کر کے اسے کسی پر بھی منطبق کرنے سے ذرہ بھر نہیں شرماتے، اب یہیں دیکھ لیں لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ پیش کر کے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے جیسے اس روایت میں "هذا الحي من قريش" سے مراد خاص طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا صحابہ یا بنوامیہ ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کو اس حدیث کی سمجھ نہ آسکی کہ نبی کریم ﷺ کی پیشگوئی میں جس بات سے بچنے کی تلقین تھی ہم وہی کرنے جارہے ہیں اور قریش کے جس قبیلے کے ہاتھوں امت کی ہلاکت ہونی تھی ہم اسی کے ساتھ کھڑے ہیں، لیکن چودہ سو سال بعد کے محقق لعل شاہ صاحب کو یہ معلوم

ہوگیا کہ اس حدیث میں" هذا الحي من قريش " سے مراد کون ہے؟

جبکہ یہ بات اس حدیث کی تشریح میں کسی شارح نے نہیں لکھی کہ اس سے مراد قریش کا فلاں قبیلہ ہے،اس کی تشریح میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ (م544ھ) لکھتے ہیں:

وقوله:"يهلك أمتي هذا الحي من قريش" وفي البخاري :"هلاك أمتي على يدي أغيلمة من قريش". فيه الحجة على ترك القيام على أمراء الجور، إذ أخبر النبي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بحال هؤلاء ولم يأمر بالقيام عليهم ولامحاربتهم، بل قال إذ سُئل:"لوأنّ الناس اعتزلوهم... "

خلاصہ: اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ظالم حاکموں کے خلاف خروج سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کے حال کی تو خبر دی ہے لیکن ان کے خلاف کھڑا ہونے اور ان سے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ سوال کرنے پر یہ فرمایا کہ: (بجائے ان سے الجھنے کے) ان سے الگ ہو جائیں۔

(اکمال المعلم بفوائد مسلم، ج8ص460، دار الوفاء، مصر)

جبکہ لعل شاہ صاحب نے" لو اعتزل الناس عنهم " کا بھی الٹا مفہوم بیان کیا۔(اس پر مزید کلام"فسق یزید" کی بحث میں آگے آئے گا)۔

پھر محقق کا کام ہے کہ وہ صرف اپنے مطلب کی احادیث ہی کو نہ لے بلکہ اس کی نظر دوسری احادیث پر بھی ہو، مثلاً لعل شاہ صاحب کو یہاں یہ احادیث کیوں نظر نہ آئیں؟

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے کتاب الاحکام میں اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"يكون اثنا عشر أميراً - فقال كلمة لم أسمعها - فقال أبي: انه قال: كلهم من قريش"۔

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کے کتاب الامارۃ میں جابر بن سمرہؓ سے مختلف اسناد کے ساتھ، مختلف الفاظ روایت کیے ہیں: ،ایک روایت اسطرح ہے :

"ان هذا الأمر لا ينقضي حتى يمضي فيهم اثنا عشر خليفة ... الى ان قال... كلهم من قريش"۔

دوسری روایت اسطرح ہے :

"لايزال أمر الناس ماضياً ما وليهم اثنا عشر رجلاً ... الى ان قال ... كلهم من قريش"۔

تیسری روایت اسطرح ہے :

"لايزال الاسلام عزيزاً الى اثني عشر خليفة... الى ان قال... كلهم من قريش"۔

چوتھی روایت کے الفاظ ہیں:

لايزال هذا الأمر عزيزاً الى اثني عشر خليفة...الى ان قال... كلهم من قريش"۔

پانچویں روایت اس طرح ہے:

"لايزال هذا الدين عزيزاً منيعاً الى اثني عشر خليفة ... الى ان قال... كلهم من قريش" ۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں اسی روایت کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

"يكون من بعدي اثنا عشر أميراً ... الى ان قال ... كلهم من قريش" وقال هذا حديث حسن صحيح"۔

سنن ابی داود میں یہ روایت اسطرح ہے :

"لايزال هذا الدين قائماً حتى يكون عليكم اثنا عشر خليفة كلهم

تجتمع عليه الأمة... الی ان قال... کلهم من قریش"، اورایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں "لایزال هذا الدین عزیزاً الی اثني عشر خلیفة ... الی ان قال ... کلهم من قریش"۔

اوپر مذکورہ تمام روایات حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں، تاہم مسند احمد میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر اس حدیث کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک میری امت میں بارہ ایسے خلیفہ یا بارہ امیر نہ گذر جائیں، جن کے دورِ حکومت میں دین اسلام طاقتور اور مضبوط ہوگا، اور ان بارہ کے بارہ خلفاء پر امت مسلمہ متفق ہوگی، اور یہ سب خلفاء یا امراء قریش میں سے ہوں گے"۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا مختلف روایات میں مختلف الفاظ ہیں لیکن سب روایات کو ملا کر وہی مفہوم نکلتا ہے جو بیان ہوا۔ اب مندرجہ ذیل نکات پر غور کریں :

(1) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کہ ان خلفاء یا امراء کے دورِ حکومت میں دین اسلام مضبوط اور غالب رہے گا۔

(2) ما ولیهم اور اثنا عشر امیراً کے الفاظ صراحۃً اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ بارہ کے بارہ مسلمانوں کے حکمران ہوں گے، یعنی حکومت کریں گے، (صرف روحانی خلافت مراد نہیں، جیسا کہ دشمنان صحابہ کہتے ہیں)۔

(3) سب سے اہم الفاظ جو فرمائے وہ یہ ہیں "کلهم تجتمع علیه الأمة" یعنی ان سب خلفاء یا امراء پر امت اسلامیہ کا اتفاق ہوگا۔

اور شارحین حدیث نے اس حدیث کی شرح میں بارہ کے بارہ خلفاء کے نام بھی گنوائے ہیں، آئیے چند حوالے دیکھتے ہیں :

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (م852ھ) لکھتے ہیں :

"وَإِيضَاحُ ذَلِكَ أَنَّ الْمُرَادَ بِالِاجْتِمَاعِ انْقِيَادُهُمْ لِبَيْعَتِهِ وَالَّذِي وَقَعَ

أَنَّ النَّاسَ اجْتَمَعُوا عَلَى أَبِي بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرَ ثُمَّ عُثْمَانَ ثُمَّ عَلِيٍّ إِلَى أَنْ وَقَعَ أَمْرُ الْحَكَمَيْنِ فِي صِفِّينَ فَسُمِّيَ مُعَاوِيَةُ يَوْمَئِذٍ بِالْخِلَافَةِ ثُمَّ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَى مُعَاوِيَةَ عِنْدَ صُلْحِ الْحَسَنِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى وَلَدِهِ يَزِيدَ وَلَمْ يَنْتَظِمْ لِلْحُسَيْنِ أَمْرٌ بَلْ قُتِلَ قَبْلَ ذَلِكَ ثُمَّ لَمَّا مَاتَ يَزِيدُ وَقَعَ الِاخْتِلَافُ إِلَى أَنِ اجْتَمَعُوا عَلَى عبدالْملك بن مَرْوَان بعد قتل بن الزُّبَيْرِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى أَوْلَادِهِ الْأَرْبَعَةِ الْوَلِيدِ ثُمَّ سُلَيْمَانَ ثُمَّ يَزِيدَ ثُمَّ هِشَامٍ وَتَخَلَّلَ بَيْنَ سُلَيْمَانَ وَيَزِيدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَهَؤُلَاءِ سَبْعَةٌ بَعْدَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ وَالثَّانِي عَشَرَ هُوَ الْوَلِيدُ بْنُ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ لَمَّا مَاتَ عَمُّهُ هِشَامٌ ..." ۔

(خلاصہ) ان بارہ کی خلافت پر امت کے اجتماع سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی بیعت کرلیں گے، اور واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کا اجتماع حضرت ابوبکر، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی (رضی اللہ عنہم) پر ہوا، پھر ان کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوا، پھر ان کے بیٹے یزید بن معاویہ پر ہوا، پھر یزید کی وفات کے بعد اختلاف رہا، یہاں تک کہ پھر لوگ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے قتل کے بعد، عبد الملک بن مروان پر مجتمع ہوئے، پھر عبدالملک کے چاروں بیٹوں ولید، سلیمان، یزید اور ہشام پر اجتماع ہوا، ان کے درمیان عمر بن عبد العزیز بھی آتے ہیں، تو خلفاء راشدین کے بعد یہ سات خلفاء ہوئے، اور بارہواں خلیفہ ولید بن یزید بن عبد الملک ہوا جس پر لوگوں کا اجتماع ہوا"۔

(فتح الباری، ج13ص215، دار المعرفة بيروت)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (م728ھ) فرماتے ہیں:

"وفي لفظ: لا يزال الإسلام عزيزا إلى اثني عشر خليفة كلهم من

قريش وهكذا كان، فكان الخلفاء :أبو بكر، وعمر، وعثمان، وعلي، ثم تولى من اجتمع الناس عليه وصار له عز ومنعة: معاوية، وابنه يزيد، ثم عبد الملك وأولاده الأربعة، وبينهم عمر بن عبد العزيز. وبعد ذلك حصل في دولة الإسلام من النقص ما هو باق إلى الآن، فإن بني أمية تولوا على جميع أرض الإسلام، وكانت الدولة في زمنهم عزيزة"۔

اوراس حدیث کے بعض الفاظ ہیں: "اسلام غالب رہے گا بارہ خلفاء تک جو سب کے سب قریش سے ہوں گے" اور ایسے ہی ہوا، چنانچہ یہ خلفاء اس طرح تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ، ان کے بعد جن پر امت جمع رہی اور اس کے لئے عزت وطاقت رہی، وہ معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے یزید، پھر عبدالملک اور پھر اس کے چاروں بیٹے اور ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز بھی تھے۔ اور اس کے بعد اسلامی حکومت میں نقص آگیا جو آج تک باقی ہے، اور بنو امیہ نے تمام عالم اسلام پر حکومت کی اور اسلامی حکومت ان کے زمانے میں مضبوط تھی"۔

(منهاج السنة، ج8، ص 238، طبع السعودية)

مُلّا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ (م 1014ھ) فرماتے ہیں:

"وكان الأمر كما قال النبي صلى الله عليه وعلى آله وسلم، فالإثني عشر هم الخلفاء الراشدون الأربعة، ومعاوية وابنه يزيد، وعبدالملك بن مروان و أولاده الأربعة، وبينهم عمربن عبدالعزيز، ثم أخذ الأمر في الإنحلال، وعند الرافضة أن أمر الأمة لم يزل في أيام هؤلاء فاسداً منغصاً يتولاه الظالمون المعتدون، بل المنافقون الكافرون وأهل الحق أذل من اليهود،

وقولهم ظاهر البطلان، والله المستعان"۔

"اور معاملہ ویسے ہی ہوا جیسے نبی ﷺ نے فرمایا تھا، چنانچہ یہ جو بارہ خلیفہ ہیں، ان میں چار خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) تھے، اس کے بعد معاویہ (رضی اللہ عنہ) اور ان کے بیٹے یزید تھے، اس کے بعد عبدالملک بن مروان اور ان کے چاروں بیٹے تھے اور ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز تھے، اس کے بعد یہ معاملہ کمزور پڑگیا۔ جبکہ روافض کا کہنا ہے کہ ان تمام کے دور میں امت کے معاملات خراب تھے اور ظالموں کے ہاتھ میں تھے، بلکہ منافقوں اور کافروں کا تسلط تھا جبکہ اہل حق یہودیوں سے بھی زیادہ ذلت کے ساتھ رہ رہے تھے، ان (رافضیوں) کی اس بات کا باطل ہونا ظاہر ہے، والله المستعان"۔

(مِنح الروض الأزهر في شرح الفقه الاكبر، ص 206، دار البشائر الاسلامية بيروت)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (م 1373ھ) لکھتے ہیں:

"علمائے اہل سنت میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفاء میں سے بارہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی اور وہ متقی تھے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ابوداؤد (رحمۃ اللہ علیہ) کے الفاظ کی بنا پر خلفائے راشدین اور بنوامیہ میں سے ان بارہ خلفاء کو گناتے ہیں جن کی خلافت پر تمام امت کا اجتماع رہا یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید ثانی، ہشام"۔

(سیرت النبی: جلد 2 صفحہ 393، ادارہ اسلامیات پاکستان)

الغرض! اس حدیث میں بھی تو نبی کریم ﷺ نے ایک پیش گوئی فرمائی تھی اور اس پیشگوئی کے مطابق کم ازکم بارہ خلفاء کے زمانے میں تو اسلام مضبوط، غالب اور محفوظ رہنا تھا، لیکن سید لعل شاہ صاحب بخاری بتا رہے ہیں کہ سنہ 44ھ میں ہی امت کی تباہی کی بنیاد صحابہ کرام کے ہاتھوں ہی سے رکھ دی گئی تھی اور پھر سنہ 60ھ تا 64ھ کے عرصہ میں امت کو تباہ کروا کر اس کا جنازہ بھی لعل شاہ صاحب نے پڑھا دیا، سوچنے کا

مقام ہے کہ یہ نظریہ اہل سنت کا ہے یا روافض کا؟

چند اصولی باتیں

مزید آگے چلنے سے پہلے ہم چند ایسی اہم اور اصولی باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جنہیں اس موضوع پر بات کرنے یا کچھ لکھنے سے پہلے ہمیں ہر وقت ذہن میں رکھنا ہے، ان میں سے بعض باتوں کا اقرار تو خود سید لعل شاہ بخاری صاحب نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے، لہٰذا سب سے پہلے لعل شاہ صاحب کی کتاب سے مندرجہ ذیل اقتباسات اور ان پر ہمارا مختصر تبصرہ پڑھیں اس کے بعد ہم چند مزید باتوں کا اس پر اضافہ کریں گے :

خلیفہ راشد سوم سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے سید لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں :

"....اس تنظیم کا بانی اور اس تحریک کا اولین محرک عبداللہ بن سبا تھا جو ایک یہودی تھا اور محض فتنہ پردازی کے لئے اسلام قبول کیا اور قلب میں نفاق کو پوشیدہ رکھا، امت مسلمہ میں افتراق و شقاق کا پیدا کرنا اس کا نصب العین تھا، جن کے دلوں میں کدورت تھی وہ اس کے گرد جمع ہوگئے، <u>اس میں شک نہیں کہ بعض مخلص اصحاب بھی اس کے زہریلے پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے</u> جس طرح حضرت مسطح رضی اللہ عنہ اور حسان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ (رضی اللہ عنہا) کے خلاف منافقین کے برپا کردہ طوفان افک و بہتان کے آتشیں شعلوں کی لپیٹ میں آگئے تھے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 19و20)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عصمت چونکہ خاصہ لازمہ انبیاء ہے، انبیاء کے سوا اہل سنت والجماعت کسی دوسرے انسان کے لئے عصمت کے قائل نہیں اس لئے مسلّم ہے کہ صحابہ سے گناہ کا صدور ممکن ہے.."۔

(ایضاً صفحہ 43)

تبصرہ :

آپ نے دیکھا کہ سید لعل شاہ صاحب بخاری اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ شر پسندوں کے پروپیگنڈے کا شکار صرف عام لوگ ہی نہیں بلکہ مخلص اور جلیل القدر صحابہ کرام بھی ہوتے رہے اور شاہ صاحب نے تو اس کی ایک مثال بھی پیش کر دی، اسی طرح انہوں نے بتایا کہ صحابہ کرام سے بھی گناہوں کا صدور ممکن ہے کیونکہ اہل سنت کے نزدیک انبیاء کے بعد کوئی انسان معصوم نہیں۔

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جرح تو خیر دور کی بات ہے پچھلی امت صحابہ کی نسبت یہ حیثیت بھی نہیں رکھتی کہ ان کی تعدیل کر سکے وہ بزرگوار ہماری تعدیل سے بھی بالاتر ہیں وہ جن کی تعدیل خدا اور سول نے کر دی ہے انہیں معیار تعدیل پر لانا بھی ان کی توہین ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 48)

تبصرہ :

یعنی لعل شاہ صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بعد والوں کے لئے صحابہ کرام پر جرح کرنے کا اختیار تو ایک طرف، صحابہ کرام تو ان بعد والوں کی تعدیل کے بھی محتاج نہیں۔

ایک جگہ رقم طراز ہیں :

"(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور براہ راست مہبط وحی کے زیر تربیت رہ کر برکات صحبت سے مستفید ہوئے اور سراج منیر کی نورانی شعاعوں سے قلب سلیم کو مستنیر فرمایا، چونکہ شرف صحابیت سے مشرّف ہیں لہٰذا اس پاکیزہ جماعت کے فرد ہیں جنہیں اللہ نے اپنے نبی کی صحبت کے لئے مختار فرمایا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 112)

اور ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ :

"میرے نزدیک حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا دفاع دین کی اہم خدمت ہے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت مجروح و مذبوح کر کے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی مدافعت کرنا نہ دین کی خدمت ہے نہ اہل السنہ کا موقف"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 90)

تبصرہ :

معلوم ہوا کہ سید لعل شاہ صاحب بخاری، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو صحابی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تربیت یافتہ تسلیم کرتے ہیں، نیز وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دفاع کو دین کی اہم خدمت بھی بتا رہے ہیں، البتہ ہم اس پر یہ اضافہ بھی کریں گے کہ جس طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت مجروح کر کے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی مدافعت کرنا دین کی خدمت نہیں ہے، بالکل اسی طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیثیت مجروح و مذبوح کر کے اور ان کے بارے میں" تنقیح ما نُکر به علی معاویة" جیسے عنوانات باندھ کر اور" نکیرات الاعیان علی معاویة بن ابي سفیان " جیسے دل آزار رسالے لکھ کر اور جن صحیح احادیث سے بھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت نکلتی ہو ان احادیث کو" خود ساختہ" ثابت کرنے پر ورق سیاہ کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مدافعت کرنا بھی دین کی خدمت اور مسلک اہل السنہ نہیں۔

سید لعل شاہ صاحب بخاری ایک جگہ لکھتے ہیں :

" بھلا چودھویں صدی میں امریکی گندم اور ڈالڈا کھانے والے مجتہد اس شان کے کہاں ہیں کہ صحابہ کے زمانے کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 94)

تبصرہ :

واضح رہے کہ خود سید لعل شاہ صاحب بخاری بھی چودھویں بلکہ پندرھویں صدی کے محقق ہیں، ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ انہوں نے کبھی امریکی گندم اور ڈالڈا کھایا یا نہیں، لیکن انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کی الجھی ہوئی گتھیوں کو مزید الجھا یا ضرور ہے جس کی تفصیل آگے بیان ہو گی۔

ایک جگہ رقم طراز ہیں :

”کسی شخص معیّن پر جنتی یا دوزخی ہونے کا حتمی اور قطعی طور پر حکم کرنا اہل السنہ کا شیوہ نہیں کیونکہ اس کے خاتمے کا حال اس علام الغیوب کے سوا کسی کو نہیں“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 29)

<u>تبصرہ :</u>

یعنی اصولی طور پر لعل شاہ صاحب یہ مانتے ہیں کہ کسی شخص (یقیناً ان کی مراد مسلمان شخص ہی ہوگا۔ ناقل) کے قطعی جنتی یا جہنمی ہونے کا حکم لگانا یہ اہل سنت کا طریق نہیں، جس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی مسلمان کی مغفرت نہ ہونے یا جنتی نہ ہونے کا قطعی حکم لگانا بھی اہل سنت کا شیوہ نہیں کیونکہ خاتمے کا حال اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں :

” حاکم کی اطاعت ضروری ہے بشرطیکہ وہ معصیت کا حکم نہ دے ورنہ لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق، حاکم فاسق کے خلاف خروج اور بغاوت جائز نہیں ہے جب تک وہ کفر بوّاح یعنی ظاہر کفر کا ارتکاب نہ کرے“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 29)

<u>تبصرہ :</u>

شاہ صاحب کی یہ بات بڑی واضح ہے کہ حاکم چاہے فاسق بھی ہو تو بھی اس کے خلاف خروج اور بغاوت جائز نہیں جب تک وہ صریح اور ظاہری کفر کا ارتکاب نہ کرے۔

ایک جگہ ”نواصب“ کی پہچان یوں کرواتے ہیں :

”نواصب: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ راشد تسلیم نہیں کرتے اور ان کی جگہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو

خلافت راشدہ کے مرتبہ علیا کے چوتھے درجہ پر فائز گمان کرتے ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 27)

<u>تبصرہ:</u>

اس سے معلوم ہوا کہ سید لعل شاہ صاحب بخاری کے نزدیک جو شخص سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ راشد تسلیم کرے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی جگہ چوتھے درجہ پر نہ رکھے بلکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد والے خلفاء میں رکھے وہ ناصبی نہیں۔

اسی طرح سید لعل شاہ صاحب نے چند کتابوں اور ان کے مصنفین کا تعارف بھی کروایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

"البدایۃ والنہایۃ حافظ ابن کثیر المتوفّیٰ سنہ 774ھ کی تصنیف ہے، حافظ صاحب موصوف راسخ العقیدہ سنی، بلند پایہ مفسر، محدث اور محقق ہیں، تاریخ میں بھی ان کی نظر نہایت وسیع اور عمیق ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 66)

"منہاج السنہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تصنیف ہے جو انہوں نے منہاج الکرامہ کے رد میں لکھی اور جیسا کہ مشہور و معروف ہے کہ حضرت موصوف علم کے بحر ذخار ہیں، حضرت امام کی یہ کتاب غلیظ اور ردی مواد کے استحقاق اور جید اور طیب مواد کے انجلاب میں لاجواب ہے، نہایت سنجیدگی سے نقلی اور عقلی دلائل سے منہاج الکرامہ کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور کسی مقام پر نہیں دیکھا گیا کہ ان کے محتاط قلم نے حد سے سر مو تجاوز کیا ہو، منہاج السنۃ واقعی اسم بامسمّیٰ ہے...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 71)

"العواصم من القواصم قاضی ابو بکر ابن العربی کی نہایت شاندار تصنیف ہے، ناموس صحابہ کے

تحفظ میں حصن حصین ہے، البتہ یزید ابن معاویہ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ناصبیت کی جھلک پائی جاتی ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 71)

تبصرہ :

یعنی سید لعل شاہ صاحب حافظ ابن کثیر کو راسخ العقیدہ سنی، بلند پایہ محقق اور تاریخ پر وسیع نظر رکھنے والا مانتے ہیں، نیز حافظ ابن تیمیہ کو علم کا بحر ذخار اور محتاط قلم والا تسلیم کرتے ہیں، البتہ قاضی ابو بکر ابن العربی کی کتاب" العواصم من القواصم" کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان پر" ناصبیت" کی چوٹ بھی کر دی ہے کیونکہ قاضی صاحب یزید بن معاویہ کے سلسلے میں لعل شاہ صاحب کی تحقیق سے متفق نہیں، اب نہ جانے قاضی صاحب بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ راشد مانتے تھے یا نہیں؟ کیونکہ لعل شاہ صاحب نے تو بتایا ہے کہ ناصبی وہ ہوتے ہیں جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ راشد نہیں مانتے بلکہ ان کی جگہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو چوتھے درجہ پر فائز کرتے ہیں۔

ایک جگہ محمود احمد عباسی پر چوٹ کرتے ہوئے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں :

"تعصب نے اندھا کر دیا۔صحیحین کی روایات کا انکار۔عباسی صاحب نے بڑی بے باکی سے بہت سی احادیث صحیحہ کا انکار کیا، بخاری، مسلم، ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی، مسند امام احمد، بیہقی اور طبرانی کی روایات جن کا استقصاء دشوار ہے انکار کیا ہے، بعض روایات کا صراحتاً انکار کیا اور بعض روایات کے مضامین کو باطل، لغو اور واہی قرار دیا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 620)

اور اسی سیاق میں صحیح بخاری کی ایک حدیث پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" عباسی صاحب نے اس ایک حدیث کو کیا ٹھکرایا گویا صحیح بخاری کے تین صفحات پر پانی پھیر دیا اور یہی حال صحیح مسلم کا بھی ہوا، قارئین کرام کی مرضی پر منحصر ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات کو برقرار رکھ کر محمود عباسی کے بیس صفحات کو لغو قرار دیں یا عباسی صاحب کی کاوش کی قدر کریں

اور بخاری ومسلم کے سوا چار صفحات پر خط تنسیخ کھینچ دیں، بہر حال ہم صحیح بخاری کی روایات کو عباسی صاحب کے مزعومات پر قربان نہیں کرسکتے....... (آگے دوسری روایات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں)..... یہ روایات جنہیں عباسی صاحب نے وضع کہنے کی شرمناک جسارت کی ہے بخاری ومسلم کی روائتیں ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 622)

تبصرہ:

یعنی لعل شاہ صاحب کے نزدیک صحیحین کی روایات کا انکار وہی کرتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو اور بخاری ومسلم کی روایات کو کسی کے مزعومات پر قربان کرنا درست نہیں، نیز بخاری ومسلم کی روایات کو "وضع" (یعنی من گھڑت یا خودساختہ یا باطل وغیرہ) کہنا یہ شرمناک جسارت ہے۔

اور پھر ایک جگہ لعل شاہ صاحب نے اپنا بنایا ہوا ایک اصول یوں بیان کیا ہے کہ:

" میں کہتا ہوں کہ اگر بخاری یا مسلم میں کوئی ایسی روایت موجود ہے جس کے روایت کرنے میں بخاری ومسلم منفرد ہو گئے ہوں کہ اس کو بخاری کے علاوہ کسی محدث نے روایت نہ کیا ہو یا مسلم کے علاوہ کسی نے نہ روایت کیا ہو تو اس روایت پر انتقاد کی گنجائش ہے... "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 41)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب نے اپنے لئے یہ اصول اس لئے گھڑا کیونکہ انہوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ میں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی فلاں فلاں روایت کو "خود ساختہ" اور" باطل" لکھنا ہے (جس کی تفصیل آگے آئے گی)۔

قارئین محترم! اس مضمون کے مطالعہ کے دوران میں آپ کو سید لعل شاہ صاحب بخاری کی یہ باتیں جو اوپر نقل کی گئیں ہمیشہ ذہن میں رکھنی ہیں، ہم کوشش کریں گے کہ حضرت شاہ صاحب کے بیان کردہ انہیں

نکات کی روشنی میں اپنی معروضات پیش کریں۔تاہم اس کے علاوہ چند بنیادی باتیں اور بھی ہیں جن کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

❀❀❀

E - Book

مشاجرات صحابہ کے بارے میں اہل سنت کا اصولی موقف

سب سے پہلے ہم واشگاف الفاظ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں اہل سنت کا قوی ترین، محتاط ترین اور اولیٰ ترین مسلک "توقف اور سکوت" ہے، یعنی اس بارے میں بجائے عدالتیں لگانے کے سکوت اختیار کیا جائے اور ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تاریخی شخصیات نہیں بلکہ قرآنی شخصیات ہیں، خود لعل شاہ صاحب بخاری کی کتاب سے یہ حوالہ پہلے نقل ہو چکا کہ :

"جرح تو خیر دور کی بات ہے پچھلی امت صحابہ کی نسبت یہ حیثیت بھی نہیں رکھتی کہ ان کی تعدیل کر سکے وہ بزرگوار ہماری تعدیل سے بھی بالاتر ہیں، وہ جن کی تعدیل خدا اور رسول نے کر دی ہے انہیں معیار تعدیل پر لانا بھی ان کی توہین ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 48)

اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا کہ "وکلاً وعد اللہ الحسنی" (اللہ نے سب سے اچھائی کا وعدہ کر رکھا ہے)، وہ احکم الحاکمین کے پاس جا چکے، ہم سے ہرگز یہ سوال نہ ہوگا کہ بتاؤ صحابہ کرام میں کون حق پر تھا اور کون باطل پر، اس پر اکابر اہل سنت کے چند حوالے ملاحظہ ہوں :

امام ابوبکر احمد بن محمد الخلال ؒ (م 311ھ) نے صحیح سند کے ساتھ معروف تابعی حضرت محمدؒ بن سیرین سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا :

"هاجت الفتنة واصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم عشرة آلاف فما حضر فيها مائة بل لم يبلغوا ثلاثين"۔

جب فتنہ اٹھا (یعنی جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد صحابہؓ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی، لیکن ان میں سے (کسی بھی جانب شرکت کرنے والے) سو (100) بھی نہ تھے بلکہ ان کی تعداد تیس تک بھی نہیں پہنچتی۔

(السنة لابی بکر الخلال، الجزء الثانی، ص 466، روایت نمبر 728، دار الرایة، الریاض)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت موجود صحابہ کرامؓ کی 99 فیصد اکثریت غیر جانبدار رہی تھی اور "توقف" کے مسلک وموقف پر قائم تھی۔

ثقہ وصدوق تبع تابعی، امام عوام بن حوشبؒ (م148ھ) فرماتے ہیں :

"اذكروا محاسن أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم، تأتلف عليه قلوبكم، ولا تذكروا غيره، فتحرشوا الناس عليهم"۔

تم محمد ﷺ کے صحابہ کرام کے محاسن ہی بیان کیا کرو۔ اس سے تمہارے مابین اتحاد پیدا ہوگا۔ صحابہ کرام کے بارے میں بدگمانی والی باتیں نہ کرو۔ اس سے تم لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے کا سبب بنو گے۔

(الشريعة للآجري 1981، السنة لأبي بكر الخلال 828/ 829، وسنده حسن)

کثرسنی، عظیم تبع تابعی، امام شہاب بن خراشؒ (المتوفی بعد 174ھ) فرماتے ہیں :

"أدركت من أدركت من صدر هٰذه الأمة، وهم يقولون :اذكروا أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ما تأتلف عليه القلوب، ولا تذكروا الذي شجر بينهم، فتحرشوا الناس عليهم"۔

میں نے اس امت کے اسلاف کو یہی کہتے ہوئے سنا ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کا صرف ایسا تذکرہ کیا کرو، جس سے ان کے بارے میں محبت پیدا ہو۔ ان کے اختلافات کا تذکرہ نہ کرو کہ اس سے تم لوگوں کو ان سے متنفر کرنے کا سبب بنو گے۔

(الكامل فى ضعفاء الرجال لابن عدي 5/53، تاريخ دمشق لابن عساكر 23/215، ميزان الاعتدال للذهبي 2/282، وسنده صحيح)

امام ابوبکر الخلالؒ امام احمد بن حنبلؒ سے صحیح سند کے ساتھ ایک اور روایت بھی نقل کرتے ہیں،

امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا گیا کہ:

"یا ابا عبداللہ ما تقول فیما کان من علي ومعاویة رحمهما الله؟ فقال ابو عبداللہ: ما أقول فیھا الا الحسنیٰ رحمهم الله أجمعین"۔

اے ابوعبداللہ (امام احمد بن حنبل کی کنیت ہے) جو کچھ حضرت علیؓ و معاویہؓ کے درمیان ہوا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: میں اس بارے میں سوائے اچھی بات کے کچھ نہیں کہتا، اللہ کی ان سب پر رحمت ہو۔

(السنۃ لابی بکر الخلال، الجزء الثانی، ص 460، روایت نمبر 713، طبع دار الرایۃ، الریاض)

اس روایت کے نیچے کتاب کے محقق ڈاکٹر عطیہ زہرانی لکھتے ہیں:

"اسنادہ صحیح، وھذا ھو مذھب السلف واحسان القول فیھم والسکوت عما شجر بینھم۔ اس روایت کی سند صحیح ہے، سلف کا یہی مذہب ہے کہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں اچھی بات کی جائے اور جو کچھ ان کے درمیان ہوا اس بارے سکوت اختیار کیا جائے۔

امام ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم رازیؒ (م 264ھ) اور امام ابوحاتم محمد بن ادریس رازیؒ (م 277ھ) اہل سنت کا اجماعی عقیدہ بیان فرماتے ہیں:

"أدرکنا العلماء فی جمیع الامصار حجازا، وعراقا، ومصرا، وشاما، ویمنا، فکان من مذھبھم ... والترحم علیٰ جمیع أصحاب محمد، صلی اللہ علیه وسلم، والکف عما شجر بینھم"۔

ہم نے حجاز و عراق، مصر و شام اور یمن تمام علاقوں کے علمائے کرام کو دیکھا ہے، ان سب کا مذہب یہ تھا کہ۔۔۔ محمد ﷺ کے تمام صحابہ کے لیے رحمت کی دعا کرنا اور ان کے درمیان ہونے والے اختلافات سے اپنی زبان بند رکھنی چاہیے۔

(أصل السنة واعتقاد الدین لابن أبي حاتم، صفحه 18 طبع دار الشریف للطباعة، الریاض)

امام ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعریؒ (م324ھ) اہل سنت کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ونتولیّٰ سائر اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ونکفّ عمّا شَجر بینهم"۔

ہم رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ سے محبت کرتے ہیں اور ان کے مابین جو اختلافات ہوئے ان (کے بیان کرنے) سے رُک جاتے ہیں (کفِ لسان کرتے ہیں)۔

(الابانة عن اصول الدیانة، ص11، دار ابن زیدون، بیروت)

عباسی خلیفہ القائم بامراللہ، ابوجعفر ابن القادر باللہ ہاشمیؒ (391ھ-467ھ) نے تقریباً 430 ہجری میں "الاعتقاد القادری" کے نام سے مسلمانوں کا اجماعی و اتفاقی عقیدہ شائع کیا، جسے اس دور کے تمام اہل علم کی تائید حاصل تھی اور اس کا مخالف باتفاقِ اہل علم فاسق و فاجر قرار پایا، اس میں یہ عقیدہ بھی درج ہے :

"ولا یقول فی معاویة إلا خیرا، ولا یدخل فی شیئ شجر بینهم، ویترحم علی جماعتهم"۔

مسلمان سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں صرف اچھی بات ہی کرتا ہے، وہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات میں دخل نہیں دیتا، بلکہ تمام صحابہ کرام کے لیے رحمت کی دُعا کرتا ہے۔

(الاعتقاد القادري، مندرج فی المنتظم لابن الجوزي 15/: 281، وسنده صحیح)

امام حافظ ابوالقاسم اسماعیل بن محمد الاصبہانیؒ (م535ھ) لکھتے ہیں :

"ومن السنة السکوت عما شجر بین اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ونشر فضائلهم والاقتداء بهم...الخ"۔

سنت (کا مقتضیٰ) یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے مابین جو اختلافات ہوئے ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی جائے، ان کے فضائل بیان کئے جائیں اور ان کی اقتداء کی جائے۔

(الحجة فی بیان المحجة وشرح عقیدة اہل السنة، ج1/ص236، دار الرایة، سعودیہ)

اسی کتاب میں دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں :

"وما جریٰ بین علي و معاویة فقال السلف: من السنة السُّکوتُ عمّا شَجر بین اصحاب النبي صلی اللہ علیه وسلم"۔

حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے مابین جو اختلافات ہوئے، اس سلسلے میں سلف کا موقف یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مابین اختلافات میں خاموشی اختیار کرنا سنت (کا مقتضیٰ) ہے۔

(الحجة فی بیان المحجة وشرح عقیدة اہل السنة، ج2/ص526)

امام موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامة المقدسی الحنبلیؒ (م620ھ) لکھتے ہیں:

"ومن السنة تولي اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ومحبتهم ، وذکر محاسنهم ، والترحم علیهم ، والاستغفار لهم ، والکف عن ذکر مساوئهم وماشجر بینهم... الخ"۔

سنت (کا مقتضیٰ) ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے دوستی اور محبت رکھی جائے اور ان کی خوبیوں کا ذکر کیا جائے، ان کے لئے رحمت کی دعا کی جائے اور ان کے لئے مغفرت مانگی جائے، اور ان کے عیوب اور جو کچھ اختلافات ان کے مابین ہوئے ان کو بیان کرنے سے اپنے آپ کو روکا جائے۔

(لُمعة الاعتقاد، ص40، المکتب الاسلامی بیروت)

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبیؒ (م 671ھ) لکھتے ہیں :

"لا يجوز ان يُنسب الى أحد من الصحابة خطأ مقطوع به، اذ كانوا كلهم اجتهدوا فيما فعلوه، وارادو الله عزوجل، وهم كلهم لنا ائمة، وقد تعبّدنا بالكف عما شجر بينهم، وألا نذكرهم الا بأحسن الذكر...الخ"

کسی صحابی کی طرف قطعی طور پر غلطی کی نسبت کرنا جائز نہیں کیونکہ ان سب نے جو کیا وہ اس میں مجتہد تھے اور ان کا ارادہ اللہ کی رضا تھی، وہ سب ہمارے امام ہیں، اور ہمیں چاہیے کہ جو کچھ ان کے درمیان ہوا، اس (کو بیان کرنے) سے رک جائیں اور ان سب کا ذکر اچھے طریقے سے کریں۔

(الجامع لأحكام القرآن، ج 19، ص 382 ، 383، مؤسسة الرسالة)

پھر اگلے صفحے پر حضرت حسن بصریؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آپ سے صحابہؓ کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا :

"قتالٌ شهده اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم وغِبنا، وعلِموا وجهلنا، واجتمعوا فاتبعنا، واختلفوا فوقفنا"

اس لڑائی میں صحابہ کرامؓ موجود تھے اور ہم نہیں تھے، اُن کا جن باتوں میں اختلاف ہوا وہ اُن کا خوب علم رکھتے تھے جبکہ ہم ان باتوں سے جاہل ہیں، جن باتوں پر ان کا اتفاق ہوا ہم ان کی پیروی کرتے ہیں، اور جن باتوں میں ان کا اختلاف ہوا ہم وہاں توقف کرتے ہیں۔

(ایضاً)

نوٹ : لعل شاہ صاحب نے بھی اپنی کتاب میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ایک قول بلا سند نقل کیا ہے جس کی بنیاد پر انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تنقید کا دروازہ کھولا ہے، ہم اس پر آگے بات کریں گے اور بتائیں گے کہ یہ کس "کذاب" کی روایت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م 728ھ)، مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں مختلف اقوال ذکر کرتے

ہوئے لکھتے ہیں :

ولهذا كان من مذاهب اهل السنة الاِمساک عما شَجَر بين الصحابة...الخ"۔

یعنی صحابہ کرامؓ کے درمیان جو بھی اختلافات ہوئے ان کے بارے میں زبان بند رکھنا اہل سنت کے عقائد میں شامل ہے"۔

پھر آگے لکھتے ہیں :

"ولهذا كان الامساك طريقة افاضل السلف"۔

اس لئے (مشاجراتِ صحابہ میں) زبان بند رکھنا ہی (جسے سکوت وتوقف بھی کہا جاتا ہے) سلف صالحین کا طریقہ تھا۔

(منہاج السنة، ج4/ص 448، 449السعودية)

اسی طرح حافظ ابن تیمیہؒ، مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں اہل سنت کے چار اقوال ذکر کرتے ہوئے چوتھا قول یہ ذکر کرتے ہیں :

"والرابع الامساك عما شَجَرَ بينهم مطلقاً ... (الیٰ قوله) ... وعَلىٰ هذا نصوص أحمد واكثر أهل السنة... وهو مذهب اهل السنة والجماعة"۔

یعنی چوتھا قول، مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں مطلقاً زبان بند رکھنا اور سکوت اختیار کرنا ہے، اور امام احمد بن حنبلؒ اور اکثر اہل سنت کی نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے...... اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔

(مجموع الفتاویٰ ، ج35/ص 51، السعودية)

یہاں امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر آیا ہے تو اسی مناسبت سے ان کی ایک اور بات بھی نقل کی جاتی ہے، امام ابن عبدالبر قرطبیؒ (م463ھ) روایت کرتے ہیں کہ محمد بن عبدالرحمن الصیرفیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ

سے سوال کیا کہ :

"اذا اختلف اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم في مسئلة هل يجوز لنا ان ننظر في اقوالهم لنعلم مع من الصواب منهم فنتبعه؟ ، فقال لي: لا يجوز النظر بين اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقلتُ :فكيف الوجه في ذلك؟ قال :تُقَلِّد أَيَّهُم احببتَ"۔

ترجمہ : صحابہ کرامؓ میں جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو کیا جائز ہے کہ ہم ان کے اقوال کا جائزہ لیں کہ راستی کس کے پاس ہے تا کہ ہم اس کی پیروی کریں؟ آپ نے مجھے فرمایا کہ نہیں جائز کہ اصحابِ رسول کا جائزہ لیا جائے، میں نے کہا پھر کیا ِکیا جائے؟ تو آپ نے فرمایا : ان میں سے جس کی چاہو پیروی کرلو (ان میں سے کسی کے موقف پر رائے زنی نہ کرو)۔

(جامع بيان العلم وفضل، ج2/ص909، دار ابن الجوزی، السعودية)

دارالعلوم دیوبند نے اپنے ایک فتویٰ میں لکھا ہے (جو کہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ پر موجود ہے) کہ :

"....مشاجرات صحابہ میں ہمارے لئے حکم یہ ہے کہ ہم دونوں کو حق پر سمجھیں اور خاموش رہیں، ہمیں مشاجرات صحابہ میں نہ الجھنا چاہئے...."۔

(فتویٰ نمبر 145945)

اسی طرح جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی سے مورخہ 2 ذوالحجہ 1412ھ کو ایک فتویٰ صادر ہوا جس میں لکھا ہے کہ:

"اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت قطعی طور پر حق پر تھی اور دوسری جماعت قطعی طور پر ناحق پر تھی، اس کی کوئی دلیل قطعی قرآن میں نہیں ہے، ہاں ظن

وگمان کے درجہ میں بعض کو صواب اور بعض کو خطا پر سمجھنا ممکن اور جائز ہے، لازم نہیں، کیونکہ صحابہ کرام کی ایک تیسری جماعت ایسی بھی تھی کہ جس نے ان میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ یہ حضرات خاموشی کو سلامتی ایمان سمجھتے تھے..."۔

یہ فتویٰ لکھا "مولانا مفتی عبدالسلام چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ" نے اور اس پر ان کے علاوہ سات دوسرے مفتیان کے تائیدی دستخط بھی موجود ہیں، اصل فتوے کی نقل ہمارے پاس موجود ہے اور یہ مکمل فتویٰ مع استفتاء، ماہنامہ "بینات" ماہ ربیع الاول 1413ھ مطابق ستمبر 1992ء کے صفحہ 27 تا 38 پر شائع بھی ہوا تھا۔

یہ بطورِ نمونہ چند حوالے ذکر کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوا کہ مشاجراتِ صحابہؓ میں اہل سنت کا "حقیقی مسلکِ اعتدال" توقف وامساک اور سکوت ہے، نہ یہ کہ اپنی اپنی عدالتیں لگا کر اور صحابہ کرامؓ کو کٹہرے میں کھڑا کر کے فیصلے صادر کرتے رہیں کہ ان کے اجتہادی اختلافات ومشاجرات میں فلاں قطعی طور پر مخطی تھا اور فلاں مصیب، اور جو اُس زمانے میں موجود صحابہ کرامؓ کی اکثریت اور سلف صالحین کی اتباع میں توقف وامساک کو 'احوط واسلم واقویٰ' بتائے، اُس پر "خارجی وناصبی ویزیدی" جیسی پھبتی اڑائی جائے۔

"تاریخ نواصب" نامی کتاب اور سید لعل شاہ بخاری صاحب

یہ غالباً سنہ 1984 / 1985 کی بات ہے کہ اسلام آباد کے ادارہ تحقیقات اسلامی کی لائبریری کے ملازم "عبدالقیوم علوی" نامی ایک شخص نے (جو اپنے آپ کو "وفاق المدارس کا سند یافتہ" اور "سُنی" کہتا تھا) ایک کتاب بنام "تاریخ نواصب، حصہ اول" شائع کی جس میں اس بد بخت نے صحابہ کرامؓ جیسی مقدس اور اللہ ورسول کی تزکیہ شدہ جماعت سے لے کر اس دور تک کے دنیائے اسلام کے بہت سے معروف ومشہور پیشوایانِ امت اور ائمہ ہدیٰ، مفسرین ومحدثین اور محققین وائمہ مجتہدین کو "ناصبی" بتا کر معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، کافر، منافق، ملعون وغیرہ وغیرہ بنانے کی ناپاک وناکام جسارت کی، بعض پر تو نام بنام یہ فتوے مصنف نے لگائے اور بعض پر بعنوان عام، اور صحابیٔ رسولؐ، کاتبِ وحی سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی صحابہؓ وتابعینؒ

کو تو کسی طرح سے کافر، منافق و دشمن اسلام بنانے کی شیطانی کوشش کی، جس کے خلاف اسلام آباد کی مایہ ناز دینی شخصیت حضرت مولانا محمد عبداللہ شہید رحمۃ اللہ علیہ (خطیب مرکزی جامع مسجد اسلام آباد) نے 14 فروری 1985ء کو رپورٹ درج کروائی، پانچ سال کی انتھک کوشش کے بعد بالآخر 15 نومبر 1989ء کو جناب ملک محمد حفیظ صاحب، اسسٹنٹ کمشنر/مجسٹریٹ درجہ اول اسلام آباد کی عدالت سے مصنف مذکور کو جُرم ثابت ہونے پر زیر دفعہ 298 اے تعزیرات پاکستان، تین سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، بعد میں یہ عدالتی فیصلہ "فیصلہ اسلام آباد" کے عنوان سے شائع بھی کیا گیا تھا، اس مقدمہ کی مکمل فائل ہمارے پاس محفوظ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آج کل کے جدید سبائی گروہ کی طرح مصنف" تاریخ نواصب" عبدالقیوم علوی نے بھی سماعت کے دوران میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ" میں نے اپنی کتاب میں حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) اور ان کے دیگر ساتھی صحابہ کرامؓ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، یہ سب میں نے اپنی طرف سے نہیں لکھا بلکہ اہل سنت کے علماء کی کتابوں سے ہی نقل کیا ہے" اور پھر یہ شخص کتابوں کے حوالے بھی پیش کیا کرتا تھا کہ دیکھو اہل سنت کے فلاں فلاں عالم اور مؤرخ نے یہ لکھا ہے، حتیٰ کہ جج صاحب نے اپنے فیصلہ میں خود یہ تحریر فرمایا کہ عدالت نے ملزم سے سوال کیا کہ:

"کیا آپ نے حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص کو کافر، منافق، ظالم وغیرہ کہا ہے؟"

تو اس نے جواب دیا:

"میں نے بالکل یہ کہا ہے اور کتاب میں لکھا ہے"

پھر عدالت نے سوال کیا کہ:

"کیا آپ کی نظر میں ان صحابہ کو برا بھلا کہنے سے جذبات مجروح نہیں ہوتے؟"

تو ملزم نے جواب دیا:

"اس سے جذبات مجروح نہیں ہوتے کیونکہ اہل سنت کے نزدیک یہ ظالم اور بُری شخصیات ہیں"۔

یہ واقعہ بیان کرنے کی غرض یہ ہے کہ سید لعل شاہ بخاری صاحب کا تحریر کردہ 127 صفحہ پر مشتمل

ایک رسالہ شائع ہوا جس کا نام" نکیرات الاعیان علی معاویة بن ابي سفيان" تھا جس پر مصنف کا نام" سید لعل شاہ بخاری" لکھا ہے اور ناشر کا نام" بزم بخاری، لائق علی چوک واہ کینٹ" تحریر ہے، اور سال طباعت 1986ء لکھا ہے، اس رسالہ کے مندرجات پر تو ہم اپنے مقام پر بات کریں گے، یہاں صرف اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اسی رسالہ کے صفحہ 121 تا126 پر" ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ" کے عنوان سے کچھ باتیں لکھی گئی ہیں، لکھنے والے کا نام آخر میں" سید حسین بخاری" لکھا ہے (جو ہمارے خیال میں" سید مہر حسین بخاری" ہے اور کتابت کی غلطی سے لفظ" مہر" چھوٹ گیا ہے)، اس تحریر میں اس شخص نے چند دعوے کیے ہیں :

(1) پہلی بات لکھی ہے کہ" یہ حقیقت ہے کہ تاریخ نواصب حصہ اول کی اشاعت کے لئے اس کے مصنف عبد القیوم علوی کو لعل شاہ صاحب بخاری نے گرانقدر رقم عنایت فرمائی تھی"۔

(2) دوسری بات یہ لکھی ہے کہ" تاریخ نواصب کے اکثر و بیشتر مضامین میری موجودگی میں عبد القیوم علوی نے لعل بخاری صاحب کو سنائے تھے اور لعل شاہ صاحب نے اس پر کوئی باز پرس نہیں کی تھی بلکہ عبد القیوم علوی سے کہا تھا کہ اگر نواصب نے تمہارے خلاف مقدمہ کیا تو مقدمہ کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا"۔

(3) تیسری بات یہ لکھی ہے کہ" جب عبد القیوم علوی کی کتاب تاریخ نواصب پر کراچی کے ماہنامہ بینات میں مولانا یوسف لدھیانوی کا تنقیدی مضمون چھپا تو لعل شاہ صاحب نے مجھے فون کر کے بلایا اور پھر پنڈی بھیجا کہ عبد القیوم علوی کو اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آؤ، چنانچہ میں عبد القیوم علوی کو لے کر واہ کینٹ پہنچا تو لعل شاہ صاحب نے عبد القیوم علوی کو کہا کہ تم یوسف لدھیانوی صاحب کو مفصل جواب تحریر کرو اور اس میں فلاں باتیں اور فلاں حوالے ضرور لکھنا، امید ہے وہ جواب نہیں دے سکیں گے، اور اگر انہوں نے جسارت کی تو دوبارہ میں خود تمہیں جواب لکھواؤں گا"۔

(4) چوتھی اور سب سے اہم بات یہ لکھی ہے کہ لعل شاہ صاحب نے اس رسالہ (یعنی" نکیرات الاعیان علی معاویة بن ابي سفيان") کا مسودہ بھی عبد القیوم علوی کو خود عنایت فرمایا تھا اور کہا تھا کہ اس کی تصحیح کر کے اسے شائع کیا جائے"۔

اگر تو یہ تمام باتیں سچ ہیں، اور یہ درست ہے کہ عبد القیوم علوی کی ضبط شدہ کتاب لعل شاہ صاحب کی

مدد سے شائع ہوئی اور رسالہ" نکیرات الاعیان" بھی واقعی لعل شاہ صاحب کا ہی لکھا ہوا ہے تو پھر ہمیں یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کہ لعل شاہ صاحب بخاری ایک خطرناک قسم کے" تقیہ باز" تھے اور خود جو بات اشاروں کنایوں میں لکھتے تھے وہ اپنے مریدین اور شاگردوں سے صاف اور واضح لفظوں میں لکھوایا کرتے تھے، اور اگر مہر حسین بخاری اور عبدالقیوم علوی نے خود یہ رسالہ لکھ کر لعل شاہ صاحب کی طرف منسوب کر دیا اور یہ جھوٹ بولا کہ" تاریخ نواصب" کی اشاعت میں لعل شاہ صاحب نے مالی مدد دی تھی اور اسے شائع کرنے کی ترغیب دی تھی تو پھر دروغ بر گردن راوی، ہماری معلومات کے مطابق لعل شاہ صاحب نے صلبی اولاد تو کوئی نہیں چھوڑی، اگر ان کا کوئی اور مرید اور شاگرد یا کوئی معتقد اس رسالے" نکیرات الاعیان" اور اس میں لکھے مندرجہ بالا دعووں کی ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ تردید یا وضاحت کر سکے تو کئی لوگوں کے شکوک وشبہات دور ہو جائیں گے، واضح رہے کہ اس کے جواب میں لعل شاہ صاحب کا وہ" رسمی" مبہم براءت نامہ پیش کرنے سے کام نہیں چلے گا جو" استخلاف یزید" کی طبع دوم 1989ء کے آخر میں لگایا گیا کہ وہ براءت نامہ مہر بخاری اور عبدالقیوم علوی کی" بعض تحریروں" سے متعلق ہے، اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ آیا لعل شاہ صاحب نے" تاریخ نواصب" کی اشاعت میں مدد کی تھی یا نہیں؟ نیز اس میں اس بات کا بھی ذکر نہیں کہ" نکیرات الاعیان" لعل شاہ صاحب کی ہی تصنیف ہے یا نہیں؟ اور یہ رسالہ انہوں نے عبدالقیوم علوی کو شائع کرنے کے لئے دیا تھا یا نہیں؟ جب تک مہر حسین بخاری اور عبدالقیوم علوی کی باتوں کی صراحت کے ساتھ ٹھوس شواہد سے تردید سامنے نہیں آتی اس وقت تک یہ بیان اپنی جگہ سچے ہی سمجھے جاتے رہیں گے۔

تحقیق کسے کہتے ہیں؟

محقق اسے نہیں کہتے جو تحقیق کے نام پر تلبیس کرے، اپنے ذہن میں پہلے سے تیار کردہ مفروضوں کو حرف آخر سمجھے اور پھر انہی مفروضوں کو ثابت کرنے کے لئے دلائل تلاش کرے یا دلائل تراشے اور بلا تحقیق ہر رطب و یابس نقل کرتا جائے۔ اور جو دلائل وشواہد اس کے اپنے مفروضوں سے ٹکرائیں یا انہیں غلط ثابت کریں ان دلائل پر جرح کرنے کے لئے ورق سیاہ کرے چاہے وہ بخاری ومسلم کی احادیث ہی کیوں نہ ہوں،

بلکہ محقق وہ ہوتا ہے جو شریعت کے مقرر کردہ اصول وضوابط کو معیار بنائے اور ذاتی پسند و ناپسند اور شخصیت و ذاتیات سے بالاتر ہو کر عدل وانصاف کے ترازو کو کسی ایک طرف جھکنے نہ دے، محقق کی اپنی ذاتی عقیدت کسی سے بھی ہو، اس کے جذبات جو بھی ہوں لیکن تحقیق وہی انصاف پر مبنی ہوگی جس میں ہر جانب کو ایک ہی ترازو اور ایک ہی معیار پر تولا گیا ہو۔

لیکن بدقسمتی سے اہل سنت میں ایک طبقہ ایسا پایا جاتا ہے جو لکھنے کی حد تک تو اصول اہل سنت کی روشنی میں تمام صحابہ کرام کی تعظیم وتوقیر کا دم بھرتا ہے اور اس قدسی جماعت کی توہین وتنقیص کو برا تو بتلاتا ہے، لیکن دوسری طرف تحقیق کے نام پر دشمنان صحابہ کی روش اختیار کرتے ہوئے صحابہ کرام کی ایک جماعت پر عمومی طور پر اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر خاص طور پر جرح وطعن کرنا اپنا حق اور فریضہ سمجھتا ہے، اس طبقہ کے خیال میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت اور فضیلت تب تک ثابت نہ ہوگی جب تک آپ سے سیاسی واجتہادی اختلاف کرنے والے صحابہ کرام پر چن چن کر طعن نہ کیا جائے اور ہر اس روایت یا قول کو موضوع اور من گھڑت ثابت نہ کیا جائے جس سے صحابہ کرام کے اس گروہ کے کسی فرد کی تعریف وتوصیف نکلتی ہو، اسی طبقہ میں سے ایک سید لعل شاہ صاحب بخاری بھی تھے، موصوف کی تحقیق کا ایک چھوٹا سا نمونہ بطور مثال پیش کر کے میں آگے چلتا ہوں، وہ اس بات پر ورق سیاہ کر رہے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں :

> ”جاننا چاہئے کہ محدثین کا اتفاق ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں پورے ذخیرہ حدیث میں ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے ..... (پھر چند لوگوں کے اقوال کے حوالے دے کر لکھتے ہیں).... محدثین کی مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ فضل معاویہ میں جو روایات مروی ہیں وہ یا تو موضوع ہیں یا ضعیف ... “۔

(استخلاف یزید، صفحہ 118)

قارئین محترم! ابھی ہم اس پر بحث نہیں کر رہے کہ جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے ان کی یہ بات درست ہے یا نہیں؟ اور ہم ابھی اس پر بھی بات نہیں کریں گے کہ صحت کی نفی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اگر ”اصطلاحی“ صحیح حدیث نہیں ہے تو وہ یقیناً یا موضوع ہوگی یا ضعیف، یہ جہالت اور دجل وتلبیس ہے یا نہیں؟ کیونکہ حدیث

کا صحیح نہ ہونا ایک اصطلاحی چیز ہے مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس خاص درجہ کی حدیث نہیں ہے اور اس سے نیچے حدیث کے موضوع یا ضعیف ہونے کا ہی درجہ نہیں بلکہ حسن بھی ہے تو صحت کی نفی سے بات وضع اور ضعف تک پہنچا دینا یہ اصول حدیث سے جہالت کی دلیل ہے۔ سر دست ہم صرف لعل شاہ صاحب کے لکھے ان الفاظ پر توجہ مرکوز رکھنا چاہتے ہیں کہ "معلوم ہوا کہ فضل معاویہ میں جو روایات مروی ہیں وہ یا تو موضوع ہیں یا ضعیف"، یہ الفاظ پڑھنے والا عام قاری ان الفاظ سے کیا سمجھتا ہے؟ یہی ناں کہ ہر وہ روایت من گھڑت یا ضعیف ہے جس سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی کسی قسم کی فضیلت یا منقبت معلوم ہوتی ہو؟

لیکن آگے ایک جگہ لعل شاہ صاحب نے ایک سرخی کچھ اس طرح سے لگائی ہے :

"حضرت جریر ابن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا
اور اس دعا میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مشارکت کا ادعاء"

اس سرخی سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ لعل شاہ صاحب کے نزدیک یہ صرف ایک "ادعاء" ہے اور وہ اس "مشارکت" کو درست نہیں سمجھتے، لیکن پھر آگے صحیح بخاری کے حوالے سے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت نقل کر کے لکھتے ہیں :

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی کلمات دعائیہ ترمذی کی ایک روایت میں حضرت معاویہ کے حق میں مذکور ہیں، اللهم اجعل معاوية هادياً مهدياً۔ رواه الترمذي في مناقب وقال حسن غريب. لیکن چونکہ ترمذی کی یہ روایت حسن درجہ کی ہے اسی لئے فضائل و مناقب میں معتبر سمجھی گئی ہے"۔ (اختلاف یزید، صفحہ 127و128)

اب غور فرمائیں! پہلے لکھ آئے کہ "فضل معاویہ میں جو روایات مروی ہیں وہ یا تو موضوع ہیں یا ضعیف"، اور یہاں لکھتے ہیں کہ "ترمذی کی یہ روایت حسن درجہ کی ہے اس لئے فضائل و مناقب میں معتبر سمجھی گئی ہے"، اب کون سی بات درست ہے؟ شاید کسی نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا ہے :

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

حدیثی وتاریخی روایات سے متعلق یادرکھنے کی چند باتیں

اللہ جل شانہ نے اُمتِ محمدیہ کو جن امتیازات سے نوازا ہے ان میں ایک وصف سند کا اہتمام ہے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (م261ھ) نے امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ (م181ھ) سے اپنی سند کے ساتھ یہ قول نقل فرمایاہے کہ:

"الْإِسْنَادُ مِنَ الدِّينِ، وَلَوْلَا الْإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَاشَاءَ"۔

سند دین میں سے ہے اگر سند نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتاوہ کہتا۔

نیز فرمایا:

"بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْقَوَائِمُ يَعْنِي الْإِسْنَادَ"۔

ہمارے درمیان اور دوسرے لوگوں کے درمیان فرق سند کا ہے۔

(مقدمة صحيح مسلم، ج1ص15،طبع عيسىٰ البابي، القاهرة)

یہی وجہ ہے کہ مفسرین ومحدثین اور مؤرخین نے حدیث کے علاوہ تفسیر، تاریخ، فقہ، رجال، انساب، لغت، ادب، نحو، اشعار بلکہ حکایات تک میں سند کا اہتمام کیاہے، کسی شخصیت سے عقیدت یاکسی فرد سے نفرت کی بنیاد پر کہی گئی کوئی بھی بات جس کا شریعت کے مقرر کردہ قواعد وضوابط کے مطابق قابل اعتماد ثبوت نہ ہواس کی کوئی حیثیت نہیں چاہے اسے کئی لوگوں نے نقل درنقل کردیاہو۔

خود لعل شاہ صاحب بخاری نے اپنی کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ کیاہے کہ :

"کوشش کی ہے کہ مواد کتب احادیث سے فراہم کیاجائے اور التزام کیاہے کہ زیادہ صحت مند مواد استخراج کیاجائے"۔ (استخلاف یزید، صفحہ 709)

اور ایک جگہ مولوی محمود احمد عباسی، پروفیسر علی احمد عباسی اور حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی کی نقل کردہ ایک روایت پر رد کرتے ہوئے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"معلوم نہیں یہ محقق ہیں یالکیر کے فقیر"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667)

اور آگے لکھتے ہیں :

”پھر جو لوگ رواۃ سند کی تمیز سے بھی بے خبر ہوں وہ صحت وسقم کی تمیز کیسے کر سکتے ہیں؟ حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 774ھ ہے اور الاعمش کی وفات سنہ 148ھ ہے، حافظ ابن کثیر کو اعمش کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا تاہنوز معرض خفا میں ہے...“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

لٰہذا ہم نے اس بات کا بھی جائزہ لینا ہے کہ لعل شاہ صاحب اپنے مدمقابل فریق کو جو سبق یاد کروا رہے ہیں، آیا خود انہوں نے اس پر عمل کیا ہے اور اپنی کتاب میں واقعی کتب حدیث سے صحیح مواد نقل کیا ہے یا اس کا الٹ کیا ہے؟۔

ہر افواہ جو پھیل جائے اسے خبر متواتر نہیں کہا جا سکتا

ہر افواہ جو پھیل جائے اس کو خبر متواتر کہنا تواتر کی سخت توہین ہے، تواتر کے لیے جہاں اور شرطیں ہیں اس کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ اگر خبر کا تعلق دیکھنے کی چیز سے ہو تو ضروری ہے کہ اس کا مستندِ انتہا مشاہدہ ہو اور جس نے سب سے پہلے وہ بات بیان کی وہ چشم دید اور قابل اعتماد گواہ ہو ورنہ وہ خبر متواتر نہیں ہو سکتی، پس کسی کی ذات اور کردار پر کوئی الزام لگانے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس الزام یا اس بات کا سلسلہ اوپر جا کر جہاں ختم ہوتا ہے، وہاں ایسے لوگوں کے بیانات پائے جاتے ہیں یا نہیں جو یہ کہتے ہوں کہ ہم نے اس شخص کو یہ کام کرتے ہوئے خود دیکھا ہے، اگر خبروں کا سلسلہ ایسے بیانات پر منتہی ہوتا ہے تو ان کو متواتر کہنا بے شک صحیح ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ ان کی آخری کڑی محض افواہ اور سنی سنائی باتیں ثابت ہوتی ہیں، اور کوئی بھی چشم دید گواہی موجود نہیں تو شریعت کی نظر میں ایسی باتیں محض الزام اور سنی سنائی افواہ ہی رہیں گی اور ایسی بے ثبوت باتوں کو متواتر کہنا بالکل غلط اور صریح مغالطہ ہے۔

اسی طرح اگر کوئی تاریخی روایت کئی کتابوں میں منقول ہو یا بہت مشہور ہو، تو اسے بھی صرف اس وجہ سے قطعی اور معتبر درجہ نہیں حاصل ہو جاتا، روایت کے معتبر ہونے کا دار و مدار اس پر نہیں کہ وہ کئی

کتابوں میں منقول ہو، بلکہ اس کے معتبر یا مشکوک ہونے کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے چشم دید گواہ کون تھے؟ کتنے تھے؟ اور ان سے آگے نقل کرنے والے کیسے لوگ تھے اور مصنفین تک سند کیسی ہے ؟ بالفاظ دیگر ایک روایت (یا واقعہ) کو متعدد مصنّفین کا نقل کر دینا اس کے معتبر ہونے کی دلیل نہیں بن جاتا، اگر ایک واقعہ شروع میں ایک ضعیف گواہ نے بیان کیا ہو، پھر اس سے چند افراد نے نقل کر کے اپنی کتب میں لکھ دیا ہو، بعد میں سینکڑوں عالم فاضل لوگوں نے اسے نقل کر دیا تو اس طرح ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے جانے سے اصل واقعے کے ثبوت میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی، اگر شروع کے راوی ضعیف ہیں تو واقعہ ضعیف ہی ثابت ہوگا، اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص نے قتل کی واردات ہوتے دیکھی اور کہا کہ یہ فلاں صاحب کی کارستانی ہے، اس بات کو دس افراد نے سنا، ان دس افراد سے سن کر پچاس مبصرین نے اس موضوع پر مذمتی تقریریں کر ڈالیں، تو اس سے ان صاحب کا مجرم ہونا یقینی نہیں ہوگیا، ایک عام آدمی کے نزدیک چاہے یہ بات یقینی ہو مگر علمی میزان میں یہ چیز پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی، اگر کسی عدالت میں یہ قضیہ پیش کیا گیا تو ملزم کے خلاف ان دس افراد اور پچاس مبصرین سے گواہی نہیں دلائی جا سکتی، گواہی کے لیے صرف وہ پہلا چشم دید گواہ طلب کیا جائے گا، اگر وہ معتبر ہے اور اپنے بیان کا کوئی ثبوت پیش کر سکتا ہے تو ان صاحب کو مجرم مانا جائے گا ورنہ نہیں، جعلی روایات میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ناقابل اعتماد راوی سے منقول ہوتا ہے، وہ راوی اسے خود گھڑ لیتا ہے یا اصل بات کو مبالغے کے ساتھ سناتا ہے، اس طرح اس سے کئی لوگ نقل کر دیتے ہیں ،ان ناقلین سے .بہت سے مؤرخین روایت لے لیتے ہیں کیونکہ اس واقعے میں جو تفصیلات ہوتی ہیں وہ انہیں کہیں اور دستیاب نہیں ہوتیں، آہستہ آہستہ اس بات کو تاریخی حقیقت کا بلکہ عقیدے کا درجہ دے دیا جاتا ہے، جبکہ اس کی بنیاد بہت کمزور ہوتی ہے۔

سید لعل شاہ صاحب نے خود یہ لکھا ہے کہ:

”عہد رسالت میں بسا اوقات بعض خبریں مشہور ہو جاتی تھیں عند التحقیق غلط ثابت ہوتیں یا حقیقت کچھ اور ہوتی مثلاً مشہور ہو گیا تھا کہ حضور ﷺ دُرّہ بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنا چاہتے ہیں لیکن ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ افواہ محض غلط ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ام سلمہ رضی اللہ عنہا میرے نکاح میں نہ ہوتیں جب بھی دُرّہ بنت

ام سلمہ میرے لئے حلال نہیں تھیں اس لئے کہ اس کا باپ ابو سلمہ میرا رضاعی بھائی ہے ....
اسی طرح مشہور ہو گیا تھا کہ حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب دریافت کیا یا رسول الله اطلقت نسائك (کہ یا رسول اللہ آپ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے) فرمایا: نہیں۔ آنحضور نے صرف ایک ماہ کے لئے ایلاء کیا تھا.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 35)

تو جب عہد رسالت میں ایسا ہو سکتا ہے تو بعد والے زمانوں میں بھی ایسا ہونا کیوں ممکن نہیں؟ لہٰذا یہ بات ہر وقت ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اگر بیان کردہ خبر کا تعلق دیکھنے کی چیز سے ہو لیکن اس کا چشم دید گواہ ایک بھی نہ ہو، یا کوئی واقعہ ابتداء میں ایک ضعیف یا جھوٹے شخص نے بیان کیا ہو،، پھر اس سے کچھ افراد نے نقل کر کے اپنی کتب میں لکھ دیا ہو، بعد میں سینکڑوں لوگوں نے بھی اسے نقل کر دیا اور آہستہ آہستہ اس بات کو تاریخی حقیقت کا درجہ بھی دے دیا گیا ہو تو اس کے باوجود بھی اصل واقعے کے ثبوت میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی اور ایسے واقعہ کو "اجماعی" یا "اتفاقی" کہنا اجماع و اتفاق کی توہین ہے۔

مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ (م 1332ھ) نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے کہ:

فلسفہ تاریخی کا یہ ایک راز ہے کہ جو واقعات جس قدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہو جاتی ہے، سدِ سکندر، دیوارِ قہقہہ، چاہِ بابل، آبِ حیواں، مارِ ضحاک، جامِ جم سے بڑھ کر کس واقعہ نے شہرت عام کی سند حاصل کی ہے، لیکن کیا ان میں ایک بھی اصلیت سے کچھ علاقہ رکھتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اکثر واقعات کسی خاص وقتی سبب سے شہرت کی منظر عام پر آجاتے ہیں، پھر عام تقلید کے اثر سے جو خاصۂ انسانی ہے شہرت عام کی بنا پر لوگ اس پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں اور کسی کو تنقید یا تحقیق کا خیال نہیں آتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ مسلمات عامہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کا حکم کسی بدنیت عیسائی نے دل سے گھڑ کر منسوب کیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ صلیبی لڑائیاں جاری تھیں اور

عیسائی مسلمانوں سے نفرت دلانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کرتے تھے، اس واقعہ کا کانوں میں پڑنا تھا کہ گویا خدا کا خاص قاصد آ کر ایک ایک کے کان میں وحی پھونک گیا، جوان، بوڑھے، جاہل، عالم، شریف، نیک، بد، جو تھا یہی راگ گاتا تھا، رفتہ رفتہ تقریر، تحریر، ضرب المثل، تلمیحات، افسانہ کوئی چیز اس سے خالی نہیں رہی، لیکن تحقیق کی عدالت نے فیصلہ کیا کہ:

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ

(اورنگ زیب عالمگیر، صفحہ 23، فکشن ہاؤس لاہور)

راویوں کی توثیق وتضعیف

حدیث کے راویوں کی جرح وتعدیل کے سلسلے میں ائمہ فن نے جو کلام فرمایا ہے اس میں جس جرح وتعدیل کا تعلق راوی کے ضبط وحفظ سے ہے اس کی بنیاد اس راوی کی بیان کردہ روایات کے استقراء اور جائزے پر ہوتی ہے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی ایسی شخصیات ہیں جن کی ذاتی شخصیت اور کردار بے عیب ہے لیکن بطور راوی ان کی تضعیف پائی جاتی ہے جس کا تعلق ان کے ذاتی کردار سے نہیں ہوتا لیکن جس جرح کا تعلق راوی کے ذاتی کردار سے ہو، مثلاً کسی راوی پر یہ جرح کی جائے کہ" وہ فلاں گناہ کبیرہ کا مرتکب تھا" تو یہ جرح اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگی جب تک اصول شہادت کے مطابق اس بات کا مستند ثبوت نہ پیش کیا جائے۔

شریعت کے ان اصول وضوابط سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، چاہے وہ صحابی ہو یا غیر صحابی، لعل شاہ صاحب کو بھی اقرار ہے کہ مخلص صحابہ کرام تک بھی بعض دفعہ فتنہ پردازوں کے پروپیگنڈے سے متأثر ہو گئے (استخلاف یزید، صفحہ 19 و 20)، اس لئے جس معاملے میں شرعی شہادت کی ضرورت ہے وہاں صحابی اور غیر صحابی سب کے لئے یہی اصول ہوگا اور اگر" دید" اور" شنید" کا تقابل ہوگا (یعنی ایک آدمی اپنا مشاہدہ بیان کرے اور دوسرا صرف یہ کہے کہ میں نے ایسا سنا ہے) تو وہاں" لیس الخبر کالمعاینۃ" کے اصول

کے تحت" دید" (مشاہدہ) کو ترجیح ہوگی، یہاں جذباتی باتیں قبول نہ کی جائیں گی۔

اسی طرح کسی عالم کی اپنی رائے یا بیان اس حد تک قابل قبول ہو سکتے ہیں جب تک واقعات و مشاہدات اس کے مکذّب نہ ہوں، واقعات سے آنکھ بند کر کے کسی غیر معصوم کے قول کو واجب التسلیم سمجھنا، اس کو معصوم سمجھنا ہے۔

تاریخ اور تاریخی روایات

یہ ایک حقیقت ہے کہ ائمہ سلف صالحین نے روایات حدیث کی سند متن اور درایت ہر اعتبار سے جو تحقیق و تنقیح فرمائی ہے اتنی توجہ تاریخی روایات کی تنقیح و تفتیش کی طرف نہیں دی گئی، جس سے چودھویں صدی کے بعض (بزعم خود) محققین نے یہ سمجھ لیا کہ تاریخی روایات میں سند اور متن کو پرکھنے کی ضرورت ہی نہیں بس جو بات طبری، ابن سعد، ابن الاثیر یا ابن کثیر وغیرہ (رحمۃ اللہ علیہم) نے اپنی کتابوں میں نقل کر دی اسے ان کتابوں کے حوالے سے نقل کر دینا ہی اس بات کے معتبر ہونے کے لئے کافی ہے، اگر ہم تاریخی روایات کو بھی اصول حدیث پر پرکھنا شروع کر دیں تو تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ دریا برد کرنا پڑے گا۔

تو اس پر ہم عرض کرتے ہیں کہ کتب تاریخ میں ایک تو ایسی باتیں بیان ہوتی ہیں کہ مثلاً فلاں واقعہ فلاں سال میں ہوا تھا، یا فلاں شخص فلاں سال میں فوت ہوا تھا، فلاں جنگ فلاں سال میں ہوئی تھی وغیرہ یا اس جیسی معلومات جن کے بیان کرنے میں کسی کی شخصیت یا کردار پر کسی قسم کا منفی یا مثبت کسی قسم کا کوئی پہلو نہیں نکلتا، تو ایسی باتوں کی سند وغیرہ کی تحقیق و تفتیش سے صرف نظر بھی کیا جائے تو اکثر و بیشتر وہ چنداں مضر نہیں۔

دوسری قسم کی ایسی تاریخی روایات ہوتی ہیں جن میں کسی کی شخصیت و کردار کا مثبت پہلو سامنے آتا ہے یا دوسرے لفظوں میں کسی کی تعریف و توصیف یا منقبت ہوتی ہے، تو ایسی روایات میں بھی اگر کوئی ان کی اسنادی حیثیت کی تحقیق میں نہ پڑنا چاہے تو کوئی مُضائقہ نہیں ہوتا، تا آنکہ اس میں غلوّ نہ پایا جائے۔

لیکن ایسی تاریخی روایات جن میں کسی مسلمان کی کردار کشی پائی جاتی ہو، یا اس پر گناہ کبیرہ کا الزام آتا ہو، یا اس کی طرف کوئی ایسی قابل اعتراض بات منسوب ہوتی ہو جس کے اثبات کے لئے شریعت مطہرہ نے

خاص معیار یا ضابطہ مقرر کیا ہے یا ایسی بات کسی کی طرف منسوب کر کے اسے ثابت نہ کر سکنے والے پر حد قذف لگتی ہو تو ایسی روایات میں تساہل کرنا اور ان کی جانچ پڑتال کیے بغیر نقل در نقل کیے جانا یہ ہر گز قابل قبول نہیں، اگر اس قسم کی کوئی روایت اصول وقواعد کی رو سے غیر مستند ثابت ہو یا اس کی سند میں غیر معتبر راوی پائے جائیں یا کسی اور علت کی وجہ سے ناقابل قبول ثابت ہو جائے یا اگر اس میں کسی پر ایسے الزام کا ذکر ہے جس کے لئے شرعی شہادت درکار ہے اور ایسی شہادت موجود نہ ہو تو ایسی بات کو رد کر دیا جائے گا چاہے اسے سینکڑوں لوگوں نے نقل در نقل کر دیا ہو، یہاں ایسی موشگافیاں کسی کام کی نہیں کہ" اس بات کو فلاں فلاں نے کہا یا لکھا ہے تو کیا یہ سب لوگ جھوٹے تھے" ؟ کیونکہ شریعت کی نظر میں کسی کا کچھ کہنا یا کچھ سمجھنا باقی لوگوں کے لئے کوئی دلیل نہیں جب تک کہ وہ کہنے یا لکھنے والا اس بات کو شرعی طریقہ سے ثابت نہ کر دے، غلط فہمی کا شکار تو باقرار لعل شاہ صاحب مخلص صحابہ کرام تک بھی ہو سکتے ہیں تو غیر صحابی کیوں نہیں ہو سکتے؟

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے کچھ لوگوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر بدکاری کی شہادت دی ان شہادت دینے والوں میں صحابی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، لیکن یہ شہادت ضابطہ شہادت پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے رد ہو گئی (چار گواہ پورے نہ ہوئے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ پر حد قذف لگوائی اور ان سے فرمایا کہ" اگر یہ اپنی غلطی مان کر توبہ کر لیں تو پھر مقبول الشہادۃ ہو جائیں گے" لیکن انہوں نے اپنے آپ کو جھٹلانے سے انکار کر دیا۔

(دیکھیں: صحيح البخاری، ج3، ص379،باب حد القاذف والسارق والزانی، طبع دار طوق النجاة / مع شرحه في فتح الباري، ج 5ص 256طبع دار المعرفة بيروت)۔

سید لعل شاہ صاحب بخاری نے بھی اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے، چنانچہ حضرت مغیرہ وحضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے خلاف یزید کی نامزدگی کو لے کر اپنے خیالی مفروضوں کا تانا بانا بنتے ہوئے مختصراً یوں لکھا ہے کہ:

"حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بھی زیاد کے تغلّب کو ناپسند فرماتے تھے شاید اس لئے کہ زیاد اپنے تین بھائیوں کی معیت میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ پر زنا کی شہادت دینے کے لئے پیش ہوئے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں حاضری کے بعد زیاد توقف کر گیا، نصاب پورا نہ ہونے کی

وجہ سے بقیہ تینوں اشخاص پر امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حد قذف جاری کی اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے ماسوا تینوں تائب ہو گئے البتہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ اپنی شہادت پر قائم رہے، کچھ طبعی خلش حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے قلب میں تھی پس انہوں نے یزید کی ولایت عہد کی تحریک کھڑی کر دی، چنداں بعید نہیں کہ یہ تحریک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایماء سے کی گئی ہو، یزید کی نامزدگی سے زیاد کے آگے بڑھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 288و289)

ہمارا سوال ہے کہ سید لعل شاہ صاحب کیا سمجھتے ہیں؟ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے سچی گواہی دی یا جھوٹی؟ اگر سچی گواہی دی تو ان پر حد قذف کیوں لگائی گئی؟ اور اگر ان کی گواہی جھوٹ تھی تو کیا صحابی جھوٹ بول سکتا ہے؟ کیا حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے اس دعویٰ کی بنیاد پر حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں (نعوذ باللہ من ذلك) یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پر زنا کا جرم ثابت ہو گیا؟ ہرگز نہیں، کیونکہ شریعت کا مقرر کردہ ضابطہ پورا نہیں ہو سکا (اس پر مزید تفصیلی کلام ہم اپنے مقام پر کریں گے ان شاء اللہ)۔

اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ علم جرح وتعدیل میں صرف ان اشخاص سے بحث کی جاتی ہے جنہوں نے احادیث کو روایت کرنے میں حصہ لیا ہے، اور جن لوگوں نے احادیث روایت کرنے میں حصہ نہیں لیا ان سے عام طور پر اس فن میں بحث نہیں ہوتی، خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ہوں، نیز جیسا کہ پہلے بیان ہوا، کسی بھی راوی کو ثقہ کہنے کے لیے اس کی دو چیزوں "عدالت" اور "ضبط". کا جائزہ لیا جاتا ہے اور عام طور پر ان دونوں چیزوں کا فیصلہ راوی کی بیان کردہ روایات (مرویات) کو دیکھ کر ہوتا ہے، جب ایک راوی ایسی روایات بیان کرے جو دوسرے ثقہ راویوں کی روایات کے مطابق ہوں تو ایسے راوی کو ثقہ کہا جاتا ہے، کیوں کہ روایات کی موافقت جہاں اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ راوی "ضابط" ہے یعنی اس کا حافظہ ٹھیک ہے، وہیں اس بات کی بھی دلیل ہوتی ہے کہ راوی عادل بھی ہے کیوں کہ اس نے روایات میں تبدیلی نہیں کی، یعنی عام طور راوی کی عدالت اور ضبط کا فیصلہ اس کی مرویات کی بنا پر ہی ہوتا ہے، جب راوی کی توثیق یا تضعیف کے لئے عام طور سے راوی کی مرویات کو ہی بنیاد بنایا جاتا ہے تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ کسی راوی کی

توثیق وتضعیف کے لیے ضروری نہیں ہے کہ توثیق یا تضعیف کرنے والا اس راوی کے دَور کا ہو، کیوں کہ جب روایات دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے تو کسی بھی دَور کا ناقد محدث کسی بھی زمانے کے راوی کی مرویات کا استقراء کر کے اس کے بارے میں وثاقت یا ضعف کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ راوی کی روایات کو پرکھ کر راوی کے بارے میں فیصلہ دینا اجتہادی معاملہ ہوتا ہے اور فقہی اجتہاد کی طرح جرح وتعدیل کے اس اجتہاد میں بھی مجتہد سے خطا وصواب دونوں باتوں کا احتمال ہوتا ہے، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی راوی سے متعلق ناقدین کے اقوال میں اختلاف ہو جاتا ہے کیوں کہ ہر ناقد اپنے اجتہاد کی روشنی میں فیصلہ دیتا ہے، یہ بات علماء اسماء الرجال نے وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے، مثلاً امام بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ (م794ھ) فرماتے ہیں :

"فَلَا شكّ أَن فِي الْجرْح وَالتَّعْدِيل ضَرْبَيْنِ من الِاجْتِهَاد وأئمة النَّقْل يَخْتَلِفُونَ فِي الْأَكْثَر فبعضهم يوثق الرجل إِلَى الْغَايَة وَبَعْضهمْ يوهنه إِلَى الْغَايَة وهما إمامان إِلَيْهِمَا الْمرجع فِي هَذَا الشَّأْن قَالَ التِّرْمِذِيّ اخْتلف الْأَئِمَّة من أهل الْعلم فِي تَضْعِيف الرِّجَال كَمَا اخْتلفُوا فِيمَا سوى ذَلِك من الْعلم"۔

اس میں شک نہیں کہ جرح وتعدیل میں بھی دو طرح کا اجتہاد ہوتا ہے اور ائمہ نقل کا اکثر اختلاف ہو جاتا ہے، چنانچہ ان میں سے کوئی ایک راوی کی حد درجہ توثیق کر دیتا ہے اور کوئی دوسرا اسی راوی کی حد درجہ تضعیف کر دیتا ہے، جبکہ وہ دونوں اس فن کے امام اور مرجع شمار ہوتے ہیں، امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ رجال (راویوں) کی تضعیف میں ائمہ کا اختلاف ایسے ہی ہے جیسے اس کے علاوہ دوسرے علوم میں ان کا اختلاف ہے۔

(النكت على مقدمة ابن الصلاح ، ج 3ص341، طبع الرياض)

تاہم کبھی کبھار راوی کی عدالت کے سلسلے میں راوی کے اخلاق اور ذاتی کردار کو بھی پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے، مثلاً کسی راوی کے بارے میں یہ شہادت مل جائے کہ وہ دین دار اور متقی تھا تو اس کی تعدیل

کی جاتی ہے، یا اس کے برعکس کسی راوی کے بارے میں یہ مل جائے کہ وہ فاسق یا شرابی یا زانی یا بددین تھا وغیرہ تو اس پر جرح کی جاتی ہے اور یہ معاملہ خالص شہادت پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ اجتہاد پر، اس لئے اس معاملے میں شہادت اور گواہی کا ثابت شدہ ہونا ضروری ہے صرف کسی کا نقل کردینا یا کسی کا اجتہاد کافی نہیں، نیز اس طرح کی شہادت اور گواہی دینے کا حق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہے جو راوی کے ہم عصر ہوں اور اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ہوں، اور اگر اس بات کا تعلق ایسی چیز سے ہے جو قابل مشاہدہ ہے تو پھر چشم دید شہادت ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی شہادت کو بنیاد بنا کر جب محدثین جرح و تعدیل کرتے ہیں تو اس بارے میں صرف معاصرین ہی کی شہادت و گواہی قبول کرتے ہیں، نیز معاصرین سے بھی اس کا بسند صحیح نقل ہونا ضروری سمجھتے ہیں، بصورت دیگر اس طرح کی باتوں کو رد کردیتے ہیں، خواہ اس کی ہم نوائی بعد کے کسی بڑے سے بڑے امام ہی نے کیوں نہ کی ہو۔

لہٰذا یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ کسی مسلمان کی ذات اور کردار پر کوئی الزام ثابت کرنے کے لیے قطعی، قوی اور شریعت کے ضابطہ کے مطابق ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ اس الزام سے اس کی براءت کے لیے شک اور احتمال ہی کافی ہوتا ہے، اور قطعی وقوی ثبوت الزام لگانے والے کو فراہم کرنا ہوتا ہے، دنیا کا کوئی قانون، ملزم (یعنی جس پر الزام لگایا گیا ہے) سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اپنی براءت کے لیے قطعی ثبوت فراہم کرے، مثلاً اگر کوئی کسی پر یہ الزام لگائے کہ یہ شرابی ہے تو اس کا قطعی و شرعی ثبوت اور گواہ پیش کرنا الزام لگانے والے کے ذمہ ہے، اگر وہ ایسا ثبوت یا قطعی شہادت پیش کردے تو ملزم پر یہ الزام ثابت ہوگا اور شرعی حد جاری ہوگی، لیکن اگر الزام لگانے والا کوئی ثبوت یا شرعی شہادت پیش نہ کرسکے تو الٹا اس پر جھوٹی تہمت لگانے کی وجہ سے تعزیر جاری کی جاسکتی ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ کوئی کسی پر" شرابی" ہونے کا الزام لگائے اور جب اس سے شرعی ثبوت مانگا جائے تو وہ الٹا یہ مطالبہ کرے کہ" میں نے جس پر الزام لگایا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ شرابی نہیں بلکہ ایک نیک آدمی ہے، اور اگر وہ اپنا نیک ہونا ثابت نہ کرسکے تو میرا الزام درست سمجھا جائے"۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ضروری نہیں کہ ہر وہ بات جو لوگوں میں مشہور ہوجائے وہ سچ بھی ہو، بعض

روایتیں بہت مشہور ہوتی ہیں اور واعظین وخطباء انہیں اکثر بیان کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ضعیف یا موضوع ہوتی ہیں، اس کی مثالیں تو بہت سی ہیں، لیکن ہم یہاں سید لعل شاہ صاحب کی پیش کردہ دو مثالیں ہی ذکر کرتے ہیں، پہلی مثال تو شاہ صاحب نے وہ روایت پیش کی ہے جس میں ہے" اصحابي كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم "لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"یہ روایت عرفاً مشہور ہے یعنی زبان زد خلائق ہے، مگر محدثین کے نزدیک اصطلاحی مشہور نہیں بلکہ خبر واحد ہے اور ضعیف ہے، تمام محدثین کا اس روایت کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے اور بعض ائمہ نے اسے موضوع بھی کہا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 32 و 33)

جبکہ دوسری مثال وہ روایت پیش کی ہے جس میں ہے کہ" حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے سورج بعد غروب ہونے کے لوٹا یا گیا تھا"، چنانچہ لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ :

"یہ روایت بھی زبان زد خلائق ہے. بہت سے لوگ اسے مشہور سمجھتے ہیں، امام طحاوی نے اس کی تصحیح بھی کی ہے حالانکہ یہ روایت ساقط الاعتبار ہے..... اس روایت کے اکثر رواۃ مجاہیل، مجروحین اور بدعقیدہ رافضی ہیں"۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 34)

لہٰذا کسی بات کا صرف مشہور ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ اسے متواتر اور متفق علیہ قرار دے کر عقیدہ کا درجہ دے دیا جائے۔

مفسرین وشارحین کے تفسیری وتشریحی اقوال کی حیثیت

ایک اصولی بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن کریم تو کلام اللہ ہے اور لاریب ہے، اور احادیث نبویہ جو مستند اور صحیح ہوں اور محدثین کرام وعلماء فن نے ان کی جانچ پھٹک کر کے انہیں صحیح قرار دیا ہو ان کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے، لیکن کسی آیت کی تفسیر میں جو مفسرین اپنے"تفسیری اقوال" یا آراء پیش کرتے ہیں وہ انہی مفسرین کے اقوال ہوتے

ہیں انہیں ہم کلام اللہ نہیں کہہ سکتے، اسی طرح شارحین حدیث جو کسی حدیث کی تشریح میں اپنے استنباط و اجتہاد سے آراء پیش کرتے ہیں وہ شارحین کے اقوال ہی ہوں گے انہیں "حدیث نبوی" نہیں کہا جا سکتا، اس لئے اگر کہیں کوئی مصنف کسی بات کے بارے میں دعویٰ تو یہ کرے کہ اس کی خبر نبی کریم ﷺ نے خود دی تھی، لیکن دلیل میں ایسی حدیث پیش کرے جس میں اس بات کا واضح ذکر نہ ہو لیکن کسی شارح نے اپنے اجتہاد سے اس حدیث کا کوئی مطلب بیان کر دیا جس میں یہ لکھ دیا کہ اس حدیث میں فلاں واقعہ کی طرف اشارہ لگتا ہے تو شارح کی یہ تشریح ہرگز حدیث رسول اللہ ﷺ نہ سمجھی جائے گی، اس بات کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں، بلکہ یوں کہا جائے گا کہ فلاں شارح کا خیال ہے کہ اس حدیث میں فلاں واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

یہ بھی ہمیشہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: یا أیها الذین آمنوا کونوا قوّامین بالقسط شهداء لله ولو علی أنفسکم أو الوالدین والأقربین ... (اے ایمان والو مضبوط کھڑے رہو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اللہ کے، اگرچہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو۔ النساء 135)... نیز دوسری جگہ فرمایا: یا أیها الذین آمنوا کونوا قوّامین لله شهداء بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ألا تعدلوا اِعدلوا هو اقرب للتقوی ... (اے ایمان والو کھڑے ہو مضبوط اللہ کے لیے انصاف کے گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر آمادہ نہ کرے، انصاف ہی کرو کہ یہ قرین تقویٰ ہے۔ المائدہ 8)، اسلام کی اس واضح اور صریح تعلیم کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس بات کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ مختلف صحابہ کرام یا صحابی اور غیر صحابی کے لیے ہمارے پاس الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ ہوں، ہاں شرف صحابیت اور مقام صحابیت اور صحابہ کے فضائل و مناقب اپنی جگہ حق ہیں، لیکن جہاں احکام شریعت اور دین کے اصول و ضوابط کی بات آئے گی تو ان کا اطلاق ہر مسلمان پر ہوگا۔

قارئین محترم! تمہید ذرا طویل ہوگئی لیکن یہ سب اصولی باتیں ہیں جو آپ کے ذہن میں مستحضر رہیں تو آئندہ سطور میں جو ہم سید لعل شاہ بخاری صاحب کی کتاب اور ان کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لینے جا رہے ہیں

اس کے بارے میں آپ درست طور پر فیصلہ کرسکیں گے کہ ہمارا جائزہ اور نقد اصولی اور عدل و انصاف پر مبنی ہے یا نہیں۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرنے والوں کے بارے میں اسلاف کا طرزِ عمل

ایک بار سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی برائی کی گئی تو آپ نے فرمایا :

"دعونا من ذم فتیٰ قریش من یضحك في الغضب ولا یُنال ما عنده اِلّا عن الرضا ولا یؤخذ ما فوق رأسه اِلّا من تحت قدمیه"۔

قریش کے اس جوان کی برائی مت کرو جو غصہ کے وقت ہنستا ہے یعنی انتہائی بردبار ہے، اور جو کچھ اس کے پاس ہے بغیر اس کی رضامندی کے حاصل نہیں کیا جاسکتا اور اس کے سر پر کی چیز کو حاصل کرنا چاہو تو اس کے قدموں میں جھکنا پڑتا ہے یعنی انتہائی غیور و شجاع ہے۔

(الاستیعاب في معرفة الاصحاب، ج2، ص245، دار الفکر بیروت)

امام ابوبکر احمد بن محمد الخلال (م 311ھ) نے صحیح سند کے ساتھ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

"قال رجل: یا ابا عبدالله! لي خال ذکر أنه ینتقص معاویة وربما أکلتُ معه. فقال ابو عبدالله مبادراً لا تأکل معه"۔

ایک آدمی نے امام ابوعبداللہ (احمدؒ بن حنبل) سے کہا کہ میرا ایک ماموں ہے جس کے بارے میں سنا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرتا ہے اور کبھی کبھی میں اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا بھی ہوں، تو امام احمد بن حنبل نے ایک دم فرمایا : اس کے ساتھ بیٹھ کر نہ کھایا کرو۔

(السنة لابي بکر الخلال، ج2ص448)

انہی ابوبکر احمد بن محمد الخلال نے صحیح سند کے ساتھ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ آپ کے پاس ایک رقعہ آیا جس میں لکھا تھا کہ :

"ماتقول رحمك الله فیمن قال: لا أقول ان معاویة کاتب الوحي

ولاأقول أنه خال المؤمنين، فإنه أخذها بالسيف غصباً؟ قال ابو عبدالله:هذا قول سوء رديء، يجانبون هؤلاء القوم ولا يجالسون ونبين امرهم للناس "۔

آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے جو کہتا ہے کہ: میں حضرت معاویہ کو کاتب وحی اور خال المؤمنین نہیں مانتا اس لئے کہ انہوں نے (خلافت) تلوار کے زور پر غصب کی تھی، تو امام احمد بن حنبل نے فرمایا: یہ بری اور گھٹیا بات ہے، ایسے لوگوں سے الگ رہا جائے، ان کے ساتھ نشست و برخاست نہ کی جائے اور انہیں لوگوں کے سامنے ننگا کیا جائے۔

(السنة لأبي بكر الخلال، ج 2ص434، دار الراية)

یاد رہے کہ لعل شاہ صاحب بخاری نے بھی کچھ ایسی ہی بات لکھی ہے جس پر امام احمد بن حنبل نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، چنانچہ لکھا ہے:

"جس طریق سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت حاصل کی تھی چونکہ اس میں تلوار بھی دخیل تھی اس لئے وہ خلافت علی منہاج النبوۃ نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ تسلط ملک کہلواتا ہے خلافت علی منہاج النبوۃ نہیں کہلاتا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 199)

اس سے اگلی روایت ہے کہ ابو بکر المروذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"قلتُ لابي عبدالله أيما أفضل معاوية او عمر بن العزيز، فقال:معاوية أفضل، لسنا نُقيس بأصحابِ رسول الله صلى الله عليه وسلم أحداً، قال النبي صلى الله عليه وسلم :خير الناس قرني الذي بُعثتُ فيهم "۔

میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا: حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز میں سے افضل کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: معاویہؓ افضل ہیں، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ پر کسی (غیر صحابی) کو قیاس نہیں کرتے (یعنی کسی غیر صحابی کا صحابی کے ساتھ موازنہ نہیں کرتے

کیونکہ) نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہترین میرے زمانے (کے مؤمنین) ہیں جن کے اندر میں مبعوث کیا گیا ہوں۔

(السنة لأبي بكر الخلال، ج 2ص434، دار الراية)

حافظ ابن عساکرؒ نے بروایت ابراہیم بن میسرۃ روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

"ما رأيتُ عمر بن عبدالعزيز ضَرَبَ انساناً قطُّ، اِلّا اِنساناً شَتَمَ معاويةَ، فاِنه ضربه اسواطاً"۔

میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو کبھی کسی انسان کو مارتے نہیں دیکھا، مگر ایک انسان کو جس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا تھا، آپ نے اسے کوڑے مارے۔

(تاريخ مدينة دِمَشق، ج 59ص211، دار الفكر)

لعل شاہ صاحب بخاری کی تحقیق کا جائزہ

اب آئیے سید لعل شاہ صاحب بخاری کی تحقیق کا جائزہ لیتے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا کہ لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب "استخلاف یزید" دراصل محمود احمد عباسی صاحب کی کتاب "تحقیق مزید علی خلافۃ معاویہ و یزید" کے جواب میں لکھی تھی، ہمارا مقصد محمود احمد عباسی صاحب کی طرف سے جواب دینا نہیں بلکہ ہماری غرض لعل شاہ صاحب کے اپنے نظریہ کے حق میں پیش کردہ دلائل کا جائزہ لینا ہے اور جو انہوں نے اپنے ہوائی قلعے تعمیر کیے ہیں اور اندازے و تخمینے لگا کر اپنا مقدمہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس پر جرح کرنا ہے۔

اپنی کتاب کے ابتدائی حصہ میں لعل شاہ صاحب نے مختلف علماء کرام پر بھی تنقید کی ہے جن میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں، مولانا عثمانی پر ان کے مودودی صاحب کے رد میں لکھے ایک رسالہ "براءۃ عثمان رضی اللہ عنہ" کے حوالے سے لعل شاہ صاحب نے ایک جگہ یوں غصہ کا اظہار کیا ہے:

".. حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بارہ میں مودودی صاحب کے غلیظ اور زہریلے مضامین کا

بطریق احسن ردّ فرمایا ہے، البتہ جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر گفتگو کی ہے وہاں اس حزم و احتیاط کو برقرار نہیں رکھ پائے جو ان جیسی باوقار ہستی کے شایانِ شان تھا، تحریر میں غصہ کے آثار پائے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تنفس میں تیزی آگئی ہے، ایک جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہو گئے، لکھتے ہیں: یہ عقدہ اب تک حل نہیں ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان بلوائیوں اور باغیوں کا مفسد اور فتنہ پرداز ہونا معلوم تھا تو پھر ان کو اپنے ساتھ لشکر میں کیوں شامل کیا؟ اور بانی فتنہ محمد بن ابی بکر اور مالک اشتر نخعی کی پوزیشن کو اتنا کیوں مضبوط کیا گیا؟ کہ وہ ہر جگہ ہر مجلس اور ہر مہم میں آپ کے ساتھ رہتے؟ اور سیاسی اور جنگی مہموں میں پیش پیش نظر آتے تھے؟ کیا ہمارے معترض ناقد جو درجہ اجتہاد پر پہنچنا چاہتے ہیں اس گتھی کو سلجھانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟" ..... (مولانا ظفر عثمانی کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں) .... "معلوم نہیں مولانا نے یہ تنقید مودودی صاحب پر کی ہے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر، یہ کلمات لکھتے وقت حضرت مولانا بھول گئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں اور غیر صحابی کو صحابی پر تنقید کا حق نہیں، خود مولانا نے اسی کتاب کے مقدمہ میں تصریح کی ہے، دیگراں رانصیحت خودرا فضیحت کار دانشمند اں نیست، میرے بزرگوار! یہ عقدہ آپ سے اس لئے حل نہیں ہوا کہ آپ نے مجتہد مطلق ہو کر اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور مودودی صاحب بھی اس عقدہ کو حل کرنے سے اس لئے قاصر ہیں کہ وہ بھی مدعی اجتہاد ہیں اور ہر وہ شخص جو عصر حاضر میں اپنی مجتہدانہ صلاحیت سے اس عقدہ کو حل کرنے کی سعی کرے گا اسے اسی طرح مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا جیسے آپ مایوس ہوئے بھلا چودھویں صدی میں امریکی گندم اور ڈالڈا کھانے والے مجتہد اس شان کے کہاں ہیں کہ صحابہ کے زمانے کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکیں (یاد رہے! لعل شاہ صاحب خود بھی پندرھویں صدی کے محقق ہیں لیکن انہیں یہ گتھیاں سلجھانے کا لائسنس ملا ہوا ہے۔ناقل)، آئیے ائمہ دین کی خدمت میں جو طرفۃ العین میں اس عقدہ کو وا کر کے دے سکتے ہیں.... الخ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 93و94)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے قاضی ابو یوسف، علامہ ہیتمی، خازن اور بغوی کے حوالے نقل کیے ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ باغیوں کے احکام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ قدوہ اور امام ہیں اور ان کے طریق کار کو حجت سمجھا گیا ہے اور آخر میں لعل شاہ صاحب نے وہ حدیث پیش کی ہے کہ "تم پر میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے نہایت مضبوطی سے ان سنتوں کو تھامنا ہوگا" اور بات ختم کر دی ہے لیکن اس عقدہ یا اس کے حل کا ذکر تک نہیں کیا جس کی طرف مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا ہے، مولانا عثمانی، حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے مابین قتال کی بات تو نہیں کر رہے، قاتلان عثمان جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل ہو چکے تھے ان کی بابت ایک سوال اٹھا رہے ہیں، اس سوال کا جواب تو لعل شاہ صاحب نے دیا ہی نہیں، اور اگر لعل شاہ صاحب یہ بتانا چاہتے تھے کہ محمد بن ابی بکر اور مالک الاشتر وغیرہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان لوگوں کو تیسرے خلیفہ راشد سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف فساد برپا کرنے اور بغاوت کی تحریک کی قیادت کرنے کے گناہ سے معافی دے دی گئی تو یہ بات لعل شاہ صاحب کو صراحت کے ساتھ لکھنی چاہئے تھی، تاکہ ان سے اگلا سوال یہ ہوتا کہ اگر تیسرے خلیفہ راشد کے خلاف بغاوت کرنے والے، جس کے نتیجے میں ایک خلیفہ راشد کی شہادت ہو جاتی ہے، ان کی صفائی پیش کی جا سکتی ہے اور وہ بری ہو سکتے ہیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو بہت کم ہے، ان کے ساتھ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خود جنگ بندی قبول فرمائی اور پھر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کر کے بیعت بھی فرما لی، لیکن لعل شاہ صاحب اور ان جیسے چودھویں صدی کے" مجوسی" گندم اور ڈالڈا گھی کھانے والے محقق اس بات پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ ضرور ہم نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی، طاغی، عنادی خطا کا مرتکب وغیرہ ثابت کر کے چھوڑنا ہے۔

کاش لعل شاہ صاحب بخاری آج زندہ ہوتے تو ہم ان سے یہ سوال بھی کرتے کہ اگر آپ کے بقول مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر گفتگو کرتے ہوئے اس حزم واحتیاط کو برقرار نہیں رکھ پائے جو ان جیسی باوقار ہستی کے شایان شان تھا اور ان کی تحریر میں غصہ کے آثار پائے جاتے ہیں اور آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تنفس میں تیزی آگئی ہے، تو کیا اسی موضوع پر لکھتے ہوئے آپ اپنے غصہ پر قابو

رکھ سکے؟ آپ کا فشار خون کیوں بلند ہوا؟ آپ نے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر رافضیوں سے بھی آگے بڑھ کر تبرا کرنے کا حق ادا کر دیا ہے، کیا آپ نے یہ نہیں لکھا کہ:

"عیار راویوں نے کمال تصنع سے عقیدت معاویہ کا خوشبو دار تیل جسم پر لگا کر منقبت معاویہ کی حسین تاروں سے بنا ہوا خوشنما جال بچھا کر سعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس جیسے جلیل القدر عظیم المرتبت صحابہ کے اسماء گرامی کو بطور دانہ استعمال کیا کہ بخاری (یعنی امام بخاری۔ناقل) جیسا بلند پرواز طائر لاہوتی بھی باوصف کمال ہوشیاری و بایں ہمہ حزم و احتیاط صید زبوں ہو کر رہ گیا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 129)

اور کیا آپ نے یہ ثابت کرنے کے لئے زور نہیں لگایا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ "کاتب وحی" نہیں تھے؟ کیا آپ نے "نکیرات الاعیان علی معاویۃ بن ابی سفیان" جیسے عنوانات پر رسالے نہیں چھپوائے؟، اور تو اور آپ نے "ابو مخنف" جیسے کذابوں اور جھوٹوں کی روایات کی بنیاد پر اسی کتاب "استخلاف یزید" میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر تنقید نہیں کی؟ یہ لیجئے:

لعل شاہ صاحب نے عنوان باندھا ہے: "تنقيح ما نكر به على معاوية رضى الله عنه" ان امور کی تنقیح جن کی وجہ سے حضرت معاویہ پر نکیر کی گئی ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں :

"حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں: وقد رُوِي عن الحسن البصري انه كان ينقم على معاوية اربعة اشياء قتاله علياً وقتله حجر ابن عدي واستلحاقه زياد ابن ابيه ومبايعته ليزيد ابنه. حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر چار چیزوں کی نقمت کرتے تھے، حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جنگ کرنا اور حجر بن عدی کو قتل کرنا اور زیاد ابن ابیہ کے نسب کو اپنے باپ ابوسفیان سے لاحق کرنا اور اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانا۔ البدایۃ والنہایۃ صفحہ 130 جلد 8"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 134و135)

آگے ایک جگہ دوبارہ اسی "جھوٹی روایت" کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ:

"آپ حسن بصری کا قول پڑھ چکے ہیں کہ وہ حضرت معاویہ کے فیصلہ کے بعد بھی زیادہ بن ابیہ ہی کہتے ہیں اور حضرت معاویہ پر تقمت فرماتے ہیں.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 146)

اور اپنے رسالہ "نكيرات الاعيان على معاوية بن ابي سفيان" کے "پیش لفظ" میں یوں لکھا ہے :

"امابعد، راقم آثم خدمت میں قارئین کے عرض پرداز ہے کہ بندہ نے اپنی تصنیف (استخلاف یزید) جو عصر حاضر کے رئیس النواصب محمود عباسی صاحب کے ناصبی نظریات کے ابطال کے لئے لکھی ہے....... اس کتاب میں بندہ نے ایک عنوان قائم کیا ہے "تنقيح ما نكر على معاوية" اور اس عنوان کے تحت حضرت حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ معاویہ پر چار چیزوں سے نکیر کی گئی ہے..... یہ عنوان استخلاف یزید کے صفحہ 134 پر قائم کیا گیا ہے اور حوالہ البدایۃ والنہایۃ کا دیا ہے اور یہ حوالہ کامل ابن اثیر میں بھی ہے... پھر ان چار اشیاء کے بارے میں مضبوط بحث کی اور معاویہ کی خلافت کی حیثیت پر بحث کی کہ آپ کی خلافت، خلافت راشدہ نہ تھی"۔

(نکیرات الاعیان، صفحہ 4و5، طبع بزم بخاری، واہ کینٹ)

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر جرح کا دروازہ کھولنے اور اپنے دل کا عناد نکالنے لئے یہ روایت نقل کی ہے، آج شاہ صاحب اس دنیا میں موجود نہیں، اگر ان کا کوئی وکیل یا پیروکار ہمیں البدایۃ والنہایۃ سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب اس قول کی سند دکھا دے تو ہم اس کے شکر گذار ہوں گے، خود لعل شاہ صاحب نے اپنے مخالفین پر تنقید کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے :

"پھر جو لوگ رواۃ سند کی تمیز سے بھی بے خبر ہوں وہ صحت وسقم کی تمیز کیسے کر سکتے ہیں؟ حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 774ھ ہے اور الاعمش کی وفات سنہ 148ھ ہے، حافظ ابن کثیر کو اعمش

کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا تاہنوز معرض خفا میں ہے... "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

تو ہم انہی کی بات کو لے کر یہ کہتے ہیں کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سنہ 774ھ ہے اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سنہ 110ھ ہے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کو حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا؟ چلیں آئیے ہم بتائے دیتے ہیں۔

قارئین محترم! حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب یہ بات "تاریخ طبری" کی ایک روایت میں سند کے ساتھ موجود ہے اور غالباً حافظ ابن کثیر نے وہیں سے لی ہے، کیا آپ جانتے ہیں تاریخ طبری میں یہ روایت کہاں سے شروع ہوتی ہے؟، لیجئے:

"قَالَ أَبُو مخنف :عن الصقعب بن زهير، عن الْحَسَن، قَالَ :أربع خصال كن فِي مُعَاوِيَة..."۔

(تاریخ الطبري، ج5ص279،دار المعارف مصر)

آپ نے دیکھا کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ بات منسوب کرنے والے کا نام "ابو مخنف" ہے لیکن چودھویں صدی کے بغض معاویہ رضی اللہ عنہ کے مارے محقق صاحب یہاں یہ بھول گئے کہ حافظ ابن کثیر اور حسن بصری کے درمیان کی سند کیسی ہے؟

ابو مخنف لوط بن یحییٰ کا تعارف

آئیے اب ان صاحب کا تعارف بھی کرواتے ہیں :

امام ابو حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ (م 277ھ) نے اسے "متروک الحدیث" کہا۔

(الجرح والتعديل لابن ابي حاتم، ج7، ص182، حيدر آباد دكن)

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ (م233ھ) کے شاگرد عباس الدوری بیان کرتے ہیں کہ :

"سَمِعت يحيى يَقُول أَبُو مخنف وَأَبُو مَرْيَم وَعَمْرو بن شمر لَيْسُوا

هم بِشَيْء قلت ليحيى هم مثل عَمْرو بن شمر قَالَ هم شَرّ من عَمْرو بن شمر "۔

میں نے یحییٰ بن معین کو یہ فرماتے سنا کہ : ابومخنف، ابومریم، اور عمرو بن شمر کچھ بھی نہیں، (دوری کہتے ہیں) میں نے یحییٰ سے کہا: کیا وہ (یعنی ابومخنف اور ابومریم) عمرو بن شمر جیسے ہیں؟ تو یحییٰ بن معین نے فرمایا : وہ عمرو بن شمر سے بھی برے ہیں۔

(تاريخ ابن معين برواية الدوري، ج3ص439، مكة المكرمة)

یہی عباس الدوری کہتے ہیں کہ، میں نے امام یحییٰ بن معین کو یہ فرماتے سنا کہ :

"أَبُو مخنف لَيْسَ بِثِقَة"، ابومخنف ثقہ نہیں ہے۔

(تاريخ ابن معين برواية الدوري، ج3ص366)

اسی کتاب میں ہے کہ امام یحییٰ بن معین نے فرمایا :

"وَأَبُو مخنف لَيْسَ بِشَيْء"، ابومخنف کچھ بھی نہیں۔

(تاريخ ابن معين برواية الدوري، ج 3ص285)

نوٹ : امام یحییٰ بن معین نے "ابومخنف" کو "عمرو بن شمر" سے بھی برا بتایا، آئیے دیکھتے ہیں یہ عمرو بن شمر کون ہے؟ امام جوزجانی اس کے بارے میں کہتے ہیں: "زائغ كذاب"، گمراہ اور جھوٹا ہے. ابن حبان کہتے ہیں: "رافضي يشتم الصحابة ويروي الموضوعات عن الثقات"، رافضی ہے، صحابہ کو گالیاں دیتا ہے اور ثقہ لوگوں سے موضوع روایات بیان کرتا ہے. اور سلیمانی کہتے ہیں: "كان يضع للروافض"، یہ عمرو بن شمر رافضیوں کے لئے روایتیں گھڑا کرتا تھا۔

(دیکھیں :لسان الميزان لابن حجر، ج6، ص210،دار البشائر الاسلامية)

اب خود اندازہ کرلیں کہ اگر یحییٰ بن معین نے "ابومخنف" کو اس "عمرو بن شمر" سے بھی برا کہا ہے تو وہ کیا چیز ہوگا؟۔

ابن عدی (م 365ھ) نے "ابومخنف" کا تعارف یوں کروایا ہے :

"شیعی محترق صاحب اخبارھم"، جلا بھنا شیعہ ہے اور شیعہ کا راوی ہے۔

(الكامل في ضعفاء الرجال، ج7، ص241، دارالكتب العلمية بيروت)

امام دارقطنی (م 385ھ) فرماتے ہیں :

"لوط بن يحي الكوفي أبو مخنف أخباري. ضعيف"، لوط بن یحییٰ کوفی ابو مخنف تاریخی روایات بیان کرنے والا ضعیف ہے۔

(الضعفاء والمتروكون للدار قطنی، ج3، ص128، المدينة المنورة)

ابن الجوزی (م 597ھ) نے ایک روایت کے بارے میں کہا :

"وفى حَدِيث ابْن عَبَّاس أَبُو صَالح والْكَلْبِيّ وَأَبُو مخنف وَكلهمْ كذابون"، ابن عباس کی اس حدیث کی سند میں ابوصالح اور (محمد بن سائب) کلبی اور ابو مخنف ہے، اور یہ سب بڑے جھوٹے ہیں۔

(الموضوعات لابن الجوزي، ج1، ص406، المكتبة السلفية ، المدينة المنورة)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (م 728ھ) روافض کے علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"وَعُلَمَاؤُهُمْ يَعْتَمِدُونَ عَلَى نَقْلِ مِثْلِ أَبِي مِخْنَفٍ لُوطِ بْنِ يَحْيَى ، وَهِشَامِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ السَّائِبِ ، وَأَمْثَالِهِمَا مِنَ الْمَعْرُوفِينَ بِالْكَذِبِ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ"۔

ان کے علماء ابومخنف لوط بن یحییٰ، ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ان جیسوں کی روایت پر اعتماد کرتے ہیں، جب کہ یہ سب وہ ہیں جن کا اہل علم کے نزدیک جھوٹا ہونا معروف ہے۔

(منهاج السنة، ج1، ص58، السعودية)

ایک دوسرے مقام پر رافضیوں کی طرف سے صحابہ کرام پر مطاعن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"وَأَكْثَرُ الْمَنْقُولِ مِنَ الْمَطَاعِنِ الصَّرِيحَةِ هُوَ مِنْ هَذَا الْبَابِ يَرْوِيهَا الْكَذَّابُونَ الْمَعْرُوفُونَ بِالْكَذِبِ، مِثْلَ أَبِي مِخْنَفٍ لُوطِ بْنِ يَحْيَى،

E-BOOK

وَمِثْلُ هِشَامِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ السَّائِبِ الْكَلْبِيّ وَأَمْثَالِهِمَا مِنَ الْكَذَّابِين"۔

زیادہ تر مطاعن وہ ہیں جنہیں وہ کذاب روایت کرتے ہیں جن کا جھوٹا ہونا معروف ہے، جیسے ابومخنف لوط بن یحییٰ اور جیسے ہشام بن محمد سائب کلبی اوران جیسے دوسرے جھوٹے۔

(منهاج السنة، ج1، ص81)

امام ذہبی (م 748ھ) نے ابومخنف کا تعارف یوں کروایا :

"لوط بن يحيى، أبو مخنف، أخباري تالف، لايوثق به"،لوط بن یحییٰ ابومخنف،تاریخی روایات بیان کرنے والا متروک راوی ہے،اس پر بھروسا نہیں کیا جاتا۔

(ميزان الاعتدال، ج3، ص419، دار المعرفة بيروت)

اورایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"أبو مخنف- اسمه لوط بن يحيى هالك"،ابومخنف جس کا نام لوط بن یحییٰ ہے وہ ہلاک شدہ ہے (یعنی ناقابل اعتبار ہے)۔

(ميزان الاعتدال، ج4، ص571)

ایک اورمقام پر لکھا :

"لوط بن يحيى أَبُو مخنف سَاقِط"،لوط بن یحییٰ ایک گراہوا راوی ہے۔

(المغنى في الضعفاء، ج2، ص135، طبع قطر)

اورایک مقام پر لکھا :

"لوط بن يحيى، أَبُو مِخْنَف الكوفيُّ الرافضيُّ الأخباريُّ"،لوط بن یحییٰ ابومخنف کوفی، رافضی تاریخی روایات بیان کرنے والا۔

(تاريخ الاسلام، ج4، ص189، دار الغرب الاسلامي)

حافظ ابن حجر(م 852ھ)نے ابومخنف کا تعارف یوں کروایا ہے :

"لوط بن يحيى أبو مخنف-أخباري تالف لايوثق به ، تركه أبو حاتم ،وَغيره، وقال الدارقطني ضعيف- وقال ابن مَعِين:ليس بثقة-وقال مرة:ليس بشيء- وقال ابن عَدِي :شيعي محترق صاحب أخبارهم "-

لوط بن یحیٰ ابومخنف، تاریخی روایات بیان کرنے والا قابل رڈ راوی ہے اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا، ابو حاتم اور دوسروں نے اسے ترک کر دیا، دارقطنی نے اسے ضعیف کہا، ابن معین نے کہا کہ وہ ثقہ نہیں، اور ایک بار کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں، ابن عدی نے کہا کہ وہ جلا بھنا شیعہ ہے اور شیعہ کا راوی ہے۔

(لسان الميزان بتحقيق شيخ ابي غدة، ج6، ص430،دار البشائر الاسلامية)

حافظ ابن حجر نے دوسری جگہ لکھا:

"أبو مخنف :لوط بن يحيى هالك "،ابومخنف لوط بن یحیٰ، ہلاک شدہ ہے۔

(لسان الميزان، ج9، ص159)

امام سیوطی(م 911ھ)نے کہا :

"لوط والكلبي كذابان"،لوط(بن یحیی)اور کلبی دونوں کذاب ہیں۔

(اللآلي المصنوعة في الاحاديث الموضوعة، ج1، ص355، دار الكتب العلمية بيروت)

ابومخنف کے بارے میں شیعہ امامیہ کے علماء کے اقوال

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابومخنف لوط بن یحیٰ کے بارے میں علماء شیعہ کے چند اقوال بھی پیش کر دیے جائیں۔

عباس بن محمد رضا بن أبي القاس قمی نے "ابومخنف" کے بارے میں لکھا:

E-Book

"كان من اعاظم مؤرخي الشيعة"، یہ عظیم شیعہ مؤرخین میں سے تھا۔

(الكُنى والالقاب، ج1، ص198، راوی نمبر163، مؤسسة النشر الاسلامي، قُم)

ابوالقاسم الخوئی ابومخنف کے بارے میں لکھتے ہیں :

"فهو ثقة مسكون الى روايته"، وہ ثقہ ہے اور اس کی روایت قابل اعتماد ہے۔

(معجم رجال الحديث، ج15، ص142، راوی نمبر 9792، مكتبة الخوئي،نجف)

شیعہ کے علم رجال کے ماہر احمد بن علی النجاشی نے "ابومخنف" کا تعارف یوں کروایا ہے :

"شيخ اصحاب الأخبار بالكوفة ووجههم وكان يسكن الى ما يرويه"، یہ کوفہ کے اخباریوں کا شیخ اور ان کی اہم شخصیت تھا، اور اس کی روایت پر اعتماد کیا جاتا تھا۔

(رجال النجاشي، ص306، راوی نمبر875،مؤسسة الاعلمي بيروت)

معرف شیعہ عالم عبداللہ المامقانی نے "ابومخنف" کے بارے میں لکھا ہے :

"أنه لا ينبغي التأمل في كونه شيعياً امامياً....وبالجملة فكون الرجل شيعياً امامياً مما لا ينبغي الريب فيه"۔ اس کے امامی شیعہ ہونے میں تامل نہیں کرنا چاہئے...... خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آدمی (ابومخنف۔ناقل) کا امامی شیعہ ہونا ایسی بات ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں۔

(تنقیح المقال طبع قدیم، ج3، ص 44۔ بحوالہ شیخ یحییٰ بن ابراہیم بن علی الیحییٰ کی کتاب" مرويات ابي مخنف في تاريخ الطبري "طبع دار العاصمہ، الریاض کے صفحہ 42 سے لیا گیا ہے)

لعل شاہ صاحب اور "ابومخنف"

خود لعل شاہ صاحب نے بھی ابومخنف کو "شیعہ" لکھا ہے اور اس کی روایات کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ قابل اعتنا نہیں"۔ (دیکھیں، استخلاف یزید، صفحہ 158)۔

نیز انہوں نے ایک دوسری جگہ شیخ الحدیث مولانا محمد اسحاق سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ (مصنف کتاب "اظہارِ حقیقت بجواب خلافت وملوکیت") کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مصنف کتاب اظہار حقیقت کے نزدیک ابو مخنف راوی غالی شیعہ، کٹر رافضی اور کذّاب ہے، ابو مخنف کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ روایت جھوٹی ہے"۔

اور پھر اس سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مبصر (یعنی لعل شاہ صاحب بخاری) کو اس سے کلی طور پر اتفاق ہے"۔

(اظہار حقیقت پر بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 21)

قارئین محترم! یہ ہے تعارف "ابو مخنف لوط بن یحییٰ الازدی الغامدی" کا، جسے "کذاب"، "رافضیوں کے لیے روایتیں گھڑنے والا"، "رافضی"، "جلا بھنا شیعہ"، "ساقط"، "ہالک" اور "تالف" بتایا گیا ہے، نیز خود شیعہ علماء نے اسے "اپنا عظیم مؤرخ" اور "امامی شیعہ" تسلیم کیا ہے، اور چودھویں صدی کے بغضِ معاویہ کے مارے محقق اپنے مقدمہ کی بنیاد ہی اس کی روایت پر رکھ رہے ہیں۔

قارئین محترم! آپ نے دیکھا کہ کس طرح سید لعل شاہ صاحب، ایک تابعی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ایک غیر مستند اور جھوٹے قول کو دلیل بنا کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اپنی تنقید کا دروازہ کھول رہے ہیں، جبکہ یہی لعل شاہ صاحب خود اپنی کتاب میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں حضرت عبد اللہ بن مبارک اور امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہما) کے اقوال بھی یوں نقل کرتے ہیں:

"صحابی اور تابعی کے درمیان مرتبے کے جس فرق عظیم اور فضل وخیر کے جس بون بعید کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے حضرت عبد اللہ ابن مبارک نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کی تشریح اس طرح کی ہے : حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جس گھوڑے پر سوار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں شریک جہاد ہوئے اس گھوڑے کی ٹاپ سے اڑ کر جو غبار گھوڑے کے نتھنوں میں داخل ہوا ہے وہ بدرجہا حضرت عمر بن عبد العزیز سے بہتر ہے..... اسی طرح امام شافعی سے بھی منقول ہے، غور فرمائیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز ایک جلیل القدر تابعی

ہیں اور خلفائے راشدین کے ساتھ ان کا شمار ہے مگر باوصف ایں محاسن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گرد پا کو نہیں پا سکتے اس لئے کہ وہ صحابی تھے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 112و113)

نیز حضرت لعل شاہ صاحب نے سیدنا عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے صحیح بخاری میں مروی دو روایات کا ذکر یوں کیا ہے :

"عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ قال انه صحب النبي صلى الله عليه وسلم ۔حبر امت ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ تحقیق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے (صحیح بخاری) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور براہ راست مہبط وحی کے زیر تربیت رہ کر برکات صحبت سے مستفید ہوئے اور سراج منیر کی نورانی شعاعوں سے قلب سلیم کو مستنیر فرمایا، چونکہ شرف صحابیت سے مشرّف ہیں لہٰذا اس پاکیزہ جماعت کے فرد ہیں جنہیں اللہ نے اپنے نبی کی صحبت کے لئے مختار فرمایا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 112)

اور اگلے صفحے پر لکھا ہے:

"ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کا قول مروی ہے کہ (انه فقيه) فقیہ یعنی مجتہد ہیں (صحیح بخاری)..... چونکہ فقہائے صحابہ کی شان نسبتاً بلند ہے اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ رفیع الشان صحابی ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 113)

اور لعل شاہ صاحب نے یزید بن معاویہ پر جرح کرتے ہوئے ایک جگہ عبداللہ بن مطیع (جو لعل شاہ صاحب کے نزدیک صحابی ہیں) کے مقابلہ میں پسرِ علی و برادر حسنین کریمین رضی اللہ عنہم حضرت محمد بن علی الہاشمی (ابن الحنفیہ) کی بات کو یوں رد کیا ہے کہ:

”ایک صحابی کے مقابلہ میں ایک تابعی کی تعدیل چہ معنی دارد.. “۔

(استخلاف یزید، صفحہ 422)

لیکن یہاں لعل شاہ صاحب (بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما) ایک مجتہد صحابی کے بطور خلیفہ اور امیر المؤمنین کیے گئے فیصلوں پر ایک تابعی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید کو بطور دلیل پیش کر رہے ہیں، کیا یہاں وہ یہ بھول گئے کہ ایک مجتہد صحابی کے فیصلوں پر ایک تابعی کی تنقید چہ معنی دارد؟ جب کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب یہ روایت بھی بے سروپا اور جھوٹے راویوں کی گھڑی ہوئی ہے۔

اب آئیے آگے چلتے ہیں، حضرت حسن بصری کی طرف منسوب اس غیر مستند بلکہ جھوٹی روایت کی بنیاد پر لعل شاہ صاحب نے پہلے تو ”استلحاق زیاد“ کو لے کر ورق سیاہ کیے ہیں۔ ہمارا مقصد یہاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس طعن کا جواب دینا نہیں کہ اس پر علماء تفصیل سے لکھ چکے ہیں، ہم یہاں لعل شاہ صاحب کی تحقیق کی چند جھلکیاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

قاضی ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ (م 543ھ) کا حوالہ دیتے ہوئے لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

”قاضی ابوبکر لکھتے ہیں کہ بہت سے اصحاب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر اعتراض کیا لیکن اس میں کچھ حرج نہیں کہ مسئلہ اجتہادی ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد یہ ہے کہ استلحاق درست ہے اور دوسرے اور بزرگوں کے نزدیک یہ استلحاق نادرست ہے اس لئے انہوں نے اس مسئلہ کو بڑا عظیم جانا اور نکیر کی بلکہ بہت سے لوگ اسی سبب سے زیاد پر لعنت بھی کرتے ہیں... (پھر آگے عربی عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں)... قاضی صاحب کے سوال و جواب سے یہ امر بالکل عیاں ہو گیا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ پر نکیر کی ہے اور زیاد پر لعنت بھی لیکن بقول قاضی صاحب چونکہ مسئلہ اجتہادی ہے اور مسئلہ اجتہادی میں خطا بھی واقع ہو جائے جب بھی قاضی اور حاکم کا فیصلہ بہر حال نافذ ہو جاتا ہے.. “۔

(استخلاف یزید، صفحہ 136و137)

آگے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قاضی ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہم ذکر کر آئے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ بہت سے صحابہ نے اس مسئلہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر نکیر کی ہے اور زیاد کو ملعون ٹھہرایا اور حدیث رسول کو حجت ٹھہرایا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 144)

قارئین محترم! آپ نے دیکھا کہ لعل شاہ صاحب نے قاضی ابو بکر ابن العربی کے حوالے سے یہ تو لکھ دیا کہ "حضرت معاویہ کے اس فیصلے پر بہت سے صحابہ کرام نے نکیر کی ہے"، لیکن انہوں نے سند کے ساتھ یہ بیان نہیں کیا کہ فلاں فلاں صحابی نے یہ نکیر کی تھی، بلکہ صرف قاضی ابن عربی کی بات کو دلیل بنایا ہے، یہ بات ذہن میں رکھیں ہمیں آگے کام آئے گی، پھر لعل شاہ صاحب نے قاضی ابو بکر ابن العربی کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو درست سمجھا وہ فیصلہ کیا اور حاکم کا فیصلہ بہر حال نافذ ہو جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود شاہ صاحب اس طرح کے عنوان قائم کرتے ہیں:

"کن حضرات نے حضرت معاویہ پر اس سلسلہ میں نکیر کی ہے"

(استخلاف یزید، صفحہ 144)

اور پھر خوامخواہ اس پر بال کی کھال کھینچی ہے لیکن کسی صحابی سے سند کے ساتھ نکیر کا کوئی حوالہ نہیں دیا، جبکہ درست اور اصولی بات یہ ہے کہ بالفرض اگر اس مسئلہ پر کسی کی رائے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف بھی ہو تو بطور مجتہد صحابی اور بطور حاکم و قاضی انہوں نے شہادتوں کی بنیاد پر اگر ایک فیصلہ کیا تو وہ نافذ العمل ہو گیا (خود لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ سنہ 44ھ میں شہادتوں کی بنیاد پر حضرت معاویہ نے یہ فیصلہ فرمایا، دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 151)، اگر کسی صحابی کے فیصلے کے ساتھ کسی دوسرے صحابی کا اختلاف رائے یہ اس صحابی پر "نکیر" اور بری چیز شمار ہوتا ہے اور اسے لے کر دوسرے صحابی پر طعن کیا جا سکتا ہے تو پھر بات بہت دور تک جا سکتی ہے اور ہم ابھی اس طرف جانا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے اپنے دل میں چھپی کدورت یوں نکالی ہے غور سے پڑھیں، محمود

احمد عباسی صاحب کی کتاب سے ایک عبارت نقل کرنے کے بعد اس پر یوں حاشیہ آرائی کرتے ہیں:

”حضرت معاویہ کے محبوب فرزند نے جسے عباسی صاحب الخطیب الاشدق ثابت کرنا چاہتے ہیں اپنے زور خطابت اور کمال فصاحت و بلاغت میں جہاں زیاد کی مٹی پلید کی ہے وہاں اپنے شفیق باپ (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ۔ناقل) جو اسے فداك ابي و امي کہہ کر بلائیں لیتے ہیں ان کی سیاست کا بھی سارا بھرم کھول کر رکھ دیا ہے اور استلحاق زیاد کی ساری حقیقت صرف ایک فقرہ میں طشت از بام کردی محمود عباسی نے اس فقرہ کی مدح میں کچھ نہیں کہا حالانکہ یہی فقرہ اصل اصیل ہے جو ساری عبارت میں محوری حیثیت رکھتا ہے اس فقرہ نے یہ حقیقت واضح کردی کہ زیاد اصل میں عبید غلام کا فرزند تھا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی نسب نقل کرکے ابوسفیان کے ساتھ لاحق کردی یزید کی زبانی بھی یہ کہانی معلوم ہوگئی کہ زیاد قضیہ استلحاق سے قبل زیاد بن عبید کے نام سے پکارا جاتا تھا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ یزید جوش میں خدا جانے کیا کچھ کہہ جائے گا اور راز ہائے سربستہ افشا ہوجائیں گے فوراً اجلس فداك ابي و امي فرماتے ہیں اور پھر ناراض ہوجاتے ہیں تو اس کی توجیہ سوائے اس کے کیا ہوسکتی ہے یزید نے اس سربستہ راز سے پردہ اٹھادیا تھا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یزید اس وقت ہوش میں تھا یا مدہوش مگر ہم اس کی حق گوئی کی سو بار قدر کرتے ہیں..... مقصد یہ ہے کہ یزید ابن معاویہ بھی اس استلحاق کو سیاست ہی سمجھتا تھا ورنہ نسب کا انتقال ظاہر ہے ناممکن ہے..“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 155)

قارئین محترم! معلوم نہیں لعل شاہ صاحب نے یہ تنقید محمود عباسی صاحب پر کی ہے یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر؟، یہ کلمات لکھتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مجتہد صحابی ہیں اور ان کا یہ فیصلہ بطور حاکم وقاضی شہادتوں کی بنیاد پر تھا جو نافذ العمل ہوتا ہے، ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ لعل شاہ صاحب یہ عبارت لکھتے وقت ہوش میں تھے یا مدہوش، کیونکہ محمود عباسی صاحب کے نقل کردہ حوالے کی استنادی حیثیت سے قطع نظر،

اس میں موجود الفاظ سے جو نتیجہ لعل شاہ صاحب نے نکالا ہے وہ ان کے باطن کا پتا دے رہا ہے، زیر بحث حوالے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یزید نے زیاد پر احسان جتاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہم نے تجھے ایک عام کلرک یا منشی سے حاکم کی کرسی تک پہنچایا اور تجھے زیاد بن عبید کہا جاتا تھا ہم نے تجھے حرب بن امیہ کی اولاد میں شامل کیا (اور ظاہر ہے استلحاق زیاد کا فیصلہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عدالت میں ہی ہوا تھا) لیکن لعل شاہ صاحب نے اس پر جو اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے وہ آپ کے سامنے ہے، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ پھبتی کس رہے ہیں کہ یزید نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست کا سارا بھرم کھول کر رکھ دیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں یہ میرے اور راز بھی ظاہر نہ کر دے اس لئے اسے فوراً بیٹھ جانے کا کہہ دیتے ہیں اور اس پر بھی لعل شاہی فشار خون نیچے نہ آیا تو یہ آوازہ کسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ کرنے کا مقصد سیاسی تھا۔

اب ہمارا سوال ہے کہ یہاں ہم ایک مجتہد صحابی جو کہ وقت کا حاکم اور خلیفہ بھی ہے اس کا شہادتوں کی بنیاد پر کیا گیا فیصلہ قبول کریں یا چودھویں صدی کے مجوسی گندم اور ڈالڈا گھی کھانے والے محقق لعل شاہ بخاری کی تحقیق کو قبول کریں؟

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ "استلحاق زیاد" پر یہاں ورق سیاہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جبکہ خود لعل شاہ صاحب اسے اجتہادی مسئلہ بھی مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بطور حاکم شہادتوں کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا تھا اور حاکم کا فیصلہ نافذ العمل بھی ہوتا ہے؟ اس کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو داغدار بنا کر پیش کیا جائے؟

نوٹ: جس روایت کی بنیاد پر لعل شاہ صاحب نے یہ سب لکھا ہے وہ حافظ ابن کثیر نے یوں نقل کی ہے:

"قال العتبي :وقدم زياد بأموال كثيرة وبسفط مملوء جواهر عَلَى مُعَاوِيَةَ فَسُرَّ بِذَلِكَ مُعَاوِيَةُ، فَقَامَ زِيَادٌ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ ثُمَّ افْتَخَرَ بِمَا يَفْعَلُهُ بِأَرْضِ... الى آخر الكلام "۔

(البداية والنهاية، ج8ص321و 322، وزارة الاوقاف قطر)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "عتبی نے کہا ہے" اب یہ "عتبی" کون ہیں؟ واللہ اعلم، تا کہ اس

روایت کی سند دیکھی جائے کہ کہیں اس میں تو کوئی "ابومخنف" نہیں؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، ایک مظلوم صحابی

قارئین محترم! اہل السنۃ والجماعۃ کا کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا قائل اور معترف نہ ہو، محدثین ہوں یا متکلمین، اصحابِ سیر ہوں یا مؤرخین، علماء اسماء الرجال ہوں یا علماء الاصول، فقہاء ہوں یا صوفیاء، پھر حنفی و شافعی ہوں یا مالکی و حنبلی، غرضیکہ سبھی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قابل قدر صحابی مانتے اور کہتے ہیں، یوں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ان تمام فضائل و مناقب کے حامل ہیں جو عمومی طور پر قرآن کریم اور فرامین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بیان ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیگانے ہی خفا نہیں یگانے بھی ناخوش نظر آتے ہیں، ان پر اَغیار نے ہی طعن و تشنیع کے تیر نہیں برسائے بلکہ اپنوں نے بھی اس میں بھرپور حصہ لیا ہے، ان کی خوبیوں اور فضیلتوں کا غیروں نے ہی انکار نہیں کیا اپنوں نے بھی ان کے مناقب کا برملا انکار کیا ہے، ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو دشمنوں نے ہی نہیں اچھالا بلکہ دوستوں نے بھی ان کو خوب خوب مشتہر کیا ہے۔ بقول حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب:

> "حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت تاریخِ اسلام کے درخشاں زمانوں میں ہے جس میں اندرونی طور پر امن اطمینان کا دور دورہ بھی تھا اور ملک سے باہر دشمنوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن حضرت معاویہؓ کے مخالفین نے ان پر اعتراضات و الزامات کا کچھ اس انداز سے انبار لگایا ہے کہ تاریخ اسلام کا یہ تابناک زمانہ سبائی پروپگنڈے کے گرد و غبار میں روپوش ہو کر رہ گیا ہے"۔
>
> (حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق، حرفِ آغاز، ص 5)

اور اِن ناقدین معاویہ رضی اللہ عنہ میں بدقسمتی سے "غیروں" کے ساتھ کچھ ایسے بھی نظر آتے ہیں، جن کے ناموں سے پہلے "مفسر، محدث، فقیہ، مجتہد، فاضل دیوبند وغیرہ وغیرہ" کے سابقے و لاحقے بھی لگے ہوئے ہیں، اور ان میں سے کچھ "مجتہد" کہلانے والوں نے تو حضرت ابوسفیانؓ اور ان کے گروہ کے اسلام کو بھی مشکوک لکھ دیا جس میں حضرت معاویہؓ بھی شامل ہیں۔ فیا أسفاہ۔ مثلاً ملاحظہ ہو کہ :

(1) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تقریباً چالیس صحابہؓ ایسے ہیں جو وحی اور نبوی فرامین و معاہدات کی کتابت کیا کرتے تھے، جنہیں کاتبانِ نبوی اور کاتبانِ وحی کہا جاتا ہے، ان میں ایک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں، کتابتِ وحی ایک بہت بڑی سعادت ہے، حضرت معاویہؓ کا نام تو ان سعادت مند کاتبانِ رسول کی فہرست سے کاٹا نہ جاسکتا تھا لیکن ان کی اس سعادت کو گدلا کرنے کے لئے ان چالیس کاتبانِ نبوی میں سے سوائے حضرت معاویہؓ کے کسی کاتب نبوی کی کتابت میں یہ بحث نہیں چلائی گئی کہ اس نے وحی کی کتابت کی ہے یا صرف نبوی خطوط کی، اس کو کاتب وحی کہا جائے یا صرف کاتب رسول؟، یہ بحث چلائی گئی اور بڑے اہتمام سے یہ تفریق کی گئی تو صرف اور صرف حضرت معاویہؓ کی کتابت میں، صرف یہاں ہی یہ فیصلہ سنایا گیا کہ" انہوں نے چونکہ وحی کی کتابت نہیں کی بلکہ صرف نبوی خطوط بنامِ ملوک لکھے تھے لہٰذا صحیح یہی ہے کہ ان کو کاتب وحی نہ کہا جائے بلکہ کاتب رسول کہا جائے"۔ لعل شاہ صاحب نے بھی اپنی کتاب" استخلاف یزید" کے صفحات 129 تا 134 اسی پر سیاہ کیے ہیں اور پھر آخر میں لکھا ہے :

" مندرجات بالا کے پیش نظر اقرب الی الاحتیاط یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب رسول کہا جائے، کاتب وحی نہ کہا جائے.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 134)

(2) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں چالیس کے قریب صحابہ کرام کے نام بنام فضائل و مناقب بیان کئے ہیں، جن میں ایک حضرت معاویہؓ بھی ہیں، ان میں سے اکثر صحابہؓ کے فضائل کا ذکر تو لفظِ" مناقب" کے عنوان سے کیا ہے جیسے مثلاً" باب مناقب عمرؓ" لیکن سات صحابہؓ کے فضائل پر لفظِ" مناقب و فضائل وغیرہ" کے بجائے لفظِ" ذکر" سے باب باندھا ہے یعنی مثلاً یوں کہا ہے" باب ذکر عباسؓ"، حضرت معاویہؓ بھی انہی سات صحابہؓ میں ہیں، ان کے فضائل بھی" باب ذکر معاویہؓ" کے عنوان سے بیان کئے ہیں، لیکن ان سات صحابہؓ میں سے سوائے حضرت معاویہؓ کے اور کسی صحابی کے بارے میں یہ نکتہ نہیں اٹھایا گیا اور نہ ہی اس پر کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان کے فضائل پر" ذکر" کا عنوان اس لئے باندھا ہے کہ ان کی فضیلت و منقبت میں صحیح سند سے کچھ بھی ثابت نہیں، یہ نکتہ اٹھایا گیا تو صرف اور صرف حضرت معاویہؓ کے حق میں، حالانکہ "منقبت" کے بجائے "ذکر"

کے عنوان میں اگر یہی نکتہ ہوتا تو امام بخاریؒ ان صحابہؓ کے فضائل پر بھی ”ذکر“ کا باب کیوں باندھتے جن کے مناقب صحیح احادیث سے ثابت ہیں؟۔

(3) کسی بھی صحابی کو کسی بھی غیر صحابی کے برابر لا کر نہ تو یہ سوال اٹھایا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ اور نہ کسی غیر صحابی کو کسی صحابی پر جزوی یا کلی کسی بھی قسم کی کوئی فضیلت ہی دی گئی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت میں سے یہ امتیازی سلوک کیا گیا تو صرف اور صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہ ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے برابر لا کر یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ معاویہؓ افضل ہیں یا عمرؒ بن عبدالعزیز؟، اور پھر ان کو باوجود اس کے کہ وہ غیر صحابی ہیں زہد و عدل تک میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جزوی فضیلت بھی دے ڈالی گئی باوجود اس کے کہ وہ صحابی ہیں۔

(4) کہا جاتا ہے کہ تیس سالہ خلافت والی حدیث کے پیشِ نظر تیس سال بعد خلافت ختم ہو کر کاٹ کھانے والی بادشاہت شروع ہوگئی تھی، اس کے مطابق تیس سال کے بعد آنے والے تمام ہی حکمران، بادشاہ اور ان کی حکومتیں کاٹ کھانے والی بادشاہتیں بنتی تھیں، لیکن خلافتِ اسلامیہ کی ابتداء سے لے کر خلافتِ عثمانیہ ترکیہ پر اس کے زوال تک سوائے حضرت معاویہؓ کے نہ کوئی اور حکمران، بادشاہ کہلایا اور نہ کوئی اور حکومت، بادشاہت کہلائی، بلکہ اس دورانیے کے تقریباً تمام ہی حکمرانوں کو خلفاء کے نام سے یاد کیا گیا اور ان کی حکومتوں کو خلافتوں کے عنوان سے پکارا گیا، اس سارے عرصے میں اس حدیث کے بمصداق اگر کوئی بادشاہ ہوا تو وہ صرف حضرت معاویہؓ تھے، کوئی حکومت اگر بادشاہت ہوئی تو وہ صرف انہی کی حکومت تھی، اس حدیث کے بموجب تیس سالہ خلافت کے بعد آنے والی بادشاہت، حضرت معاویہؓ سے ہی شروع ہوئی اور انہی پر ختم ہوگئی، وہی دنیائے خلافت میں پہلے بادشاہ بھی ہوئے اور آخری بھی، بلکہ اس پر اپنی توانائیاں صرف کی گئیں کہ کسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ”راشدہ“ نہ ثابت ہونے دیا جائے، لعل شاہ صاحب بھی انہی میں شامل ہیں، اور آج کل کے بعض حضرات جو بزعمِ خود ”دیوبندیت کی تطہیر“ کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ”خلیفہ راشد“ کہنے والوں پر ناصبیت کا فتویٰ بھی داغ دیا ہے (دیکھیں: رسالہ ”دیوبندیت کی تطہیر ضروری ہے“، ص 9۔ از مفتی محمد سعید خان اسلام آبادی)، فیا آسفاہ۔

حُجر بن عدی کا قضیہ

بہر حال لعل شاہ صاحب نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ایک غیر مستند بلکہ جھوٹے قول کو بنیاد بنا کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنے کی جو شروعات کی ہے اسی کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں :

"دوسری چیز جس کی وجہ سے حضرت معاویہ پر نکیر کی گئی ہے وہ حجر بن عدی کا قتل ہے.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 156)

لعل شاہ صاحب نے پہلے" حجر بن عدی" کا مختصر تعارف کروایا ہے اور لکھا ہے کہ:

" بہت سے محدثین ان کی صحبت کے (یعنی صحابی ہونے کے۔ناقل) قائل نہیں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست کوئی حدیث روایت نہیں کی.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 157)

اور پھر حضرت معاویہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما پر اپنی جرح جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں (ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں):

"اتفاق سے کوفہ کی ولایت حضرت مغیرہ بن شعبہ کی قسمت میں آئی، وہ ایک جلیل القدر اور عظیم المرتبت صحابی اور مبایعین حدیبیہ علیہم الرضوان میں سے ہیں، ہر موقعہ پر نہایت اہم خدمت انجام دی اور نہایت جاں نثاری کا ثبوت دیا لیکن ان کا دل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے صاف نہیں تھا کیونکہ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے ان کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا، حضرت مغیرہ کو حضرت معاویہ کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ خطبہ جمعہ میں مدح عثمان رضی اللہ عنہ اور مذمت علی رضی اللہ عنہ کا التزام کریں چنانچہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خطبہ جمعہ میں تعریض کیا کرتے تھے...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 157)

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب نے جو یہ کہانی لکھی ہے اس کا کوئی حوالہ تو یہاں نہیں دیا کہ اس کا جائزہ لیا جائے، لیکن ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو، کوفہ کا والی اس وقت بنایا گیا جب حضرت حسن

بن علی (رضی اللہ عنہما) نے حدیث رسول کی پیش گوئی کے مطابق مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کروائی اور اپنی خلافت سے دست برداری اختیار فرما کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت خلافت فرمائی جس کے نتیجے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ امت اسلامیہ کے متفقہ حکمران بن گئے تھے، اس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لخت جگر ونورِ نظر سیدنا حسن، سیدنا حسین (رضی اللہ عنہما) اور حضرت محمد بن علی (المعروف "محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ ") بھی موجود تھے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ بقول چودھویں صدی کے "مجوسی" گندم اور ڈالڈا گھی کھانے والے محقق لعل شاہ صاحب کے، خلیفہ وقت نے (جو کہ متفق علیہ صحابی ہیں) ایک دوسرے صحابی (لعل شاہ کے اقرار کے مطابق) جو بیعت رضوان میں شامل تھے یعنی سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ وہ جمعہ کے خطبہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مذمت بیان کیا کریں اور وہ اس حکم نامہ پر عمل بھی کیا کرتے تھے، لیکن نہ تو خلیفہ وقت (سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ) سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور لواحقین اس بات پر احتجاج کرتے ہیں اور نہ ہی شکایت کرتے ہیں، اگر (بقول لعل شاہ صاحب) رگ غیرت وحمیت پھڑکتی ہے تو ایک (مختلف فیہ صحابی) حجر بن عدی کی؟ (یہ بھی اس صورت میں اگر فرض کرلیا جائے کہ واقعی حجر بن عدی کی اس روش اور جتھا بندی کی وجہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی توہین ومذمت تھی) اور دوسرا اگر یہ راز کھلا تو سبائی جراثیم سے متأثر محقق لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنواؤں پر؟

اور لعل شاہ صاحب کی جسارت دیکھیں کہ بیعت رضوان میں شامل صحابی پر یہ بہتان بھی لگا دیا کہ "چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا ایک مشورہ قبول نہیں کیا تھا اس لئے ان کا دل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے صاف نہیں تھا"۔

آگے لعل شاہ صاحب نے یہ افسانہ بیان کیا ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے بعد زیاد کو کوفہ کا گورنر بنایا گیا تو اس وقت زیاد کے اندر عداوت اہل بیت ابھر آئی تھی اس نے بھی وہی کاروائی (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت وتوہین کی) جاری رکھی جس پر حجر بن عدی نے بھی وہی کچھ کیا جو وہ کیا کرتے تھے، زیاد نے اس بات کی شکایت امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے کی اور لکھا کہ اگر انہیں سزا نہ دی گئی تو یہ حکومت کا تختہ الٹ دیں گے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ انہیں گرفتار کر کے یہاں بھیج دو، آگے کا افسانہ لعل شاہی قلم نے یوں لکھا ہے:

”زیاد کو حجر ابن عدی کے رضا کاروں کو گرفتار کرنے میں بڑی دقت پیش آئی زیاد کے سپاہیوں اور حجر ابن عدی کے رضا کاروں میں تصادم ہوگیا (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حجر بن عدی کا باقاعدہ کوئی جتھا موجود تھا۔ناقل) کتابوں میں بہت کچھ مبالغہ آمیزیاں ہیں جو مشہور ابومخنف شیعہ کی روایات سے ماخوذ ہیں اس لئے قابل اعتنا نہیں لیکن تاہم قرین قیاس ہے کہ حجر ابن عدی کی گرفتاری بڑی مشکل سے عمل میں آئی، زیاد نے متعدد شہادتیں حجر ابن عدی کی گرفتاری پر حاصل کیں اور ایک صحیفہ پر شہادتیں ثبت کر کے معہ اپنی رپورٹ اور مشورہ کے چند عینی گواہوں کی معیت میں حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بغاوت کے جرم میں قتل کا حکم دے دیا“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 158)

قارئین محترم! حقیقت کو چاہے جتنا بھی چھپانے کی کوشش کی جائے وہ ظاہر ہو ہی جاتی ہے، لعل شاہ صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جیسے حجر بن عدی کا باغیانہ طرز عمل اس لئے تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو حکم دیا ہوا تھا کہ وہ جمعہ کے خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذمت اور توہین کیا کریں اور حجر بن عدی اس پر بولا کرتے تھے، لیکن پھر خود لکھ گئے کہ حجر ابن عدی نے باقاعدہ اپنے رضا کاروں کا ایک جتھا بنا رکھا تھا اور جب سرکاری اہل کار انہیں گرفتار کرنے آئے تو ان لوگوں کی سرکار کے ساتھ جھڑپ بھی ہوئی، اور پھر لعل شاہ صاحب نے ”تاہم قرین قیاس ہے“ کا لفظ لکھ کر خود یہ بتا دیا کہ انہوں نے جو یہ افسانہ لکھا ہے یہ ان کے ذہن کی اختراع کی ہوئی کہانی اور ”قیاس“ ہی ہے، ورنہ وہ اپنے اس افسانے پر کوئی مستند حوالہ تو دیتے، لیکن چونکہ ان کا مقصد سیدنا معاویہ اور سیدنا مغیرہ (رضی اللہ عنہما) پر تعریض کرنا تھا اس لئے خواہ مخواہ اس معاملہ پر صفحات سیاہ کیے جبکہ وہ خود یہ بھی مانتے ہیں کہ حجر ابن عدی کے خلاف باقاعدہ گواہیاں قلم بند بھی کی گئی تھیں اور جب انہیں امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق بھیجا گیا تو ساتھ کچھ چشم دید گواہ بھی گئے تھے جنہوں نے وہاں جا کر بھی گواہی دی تھی۔

اور لعل شاہی تحقیق کا کمال دیکھیں کہ پہلے خود یہ لکھا کہ ”بہت سے محدثین حجر ابن عدی کے صحابی

ہونے کے قائل نہیں"،اور پھر دو صفحے بعد لکھتے ہیں:

"اگر حجر ابن عدی صحابی ہیں اور یقیناً ہیں.. "۔

(استخلاف یزید،صفحہ 159)

یعنی دو صفحات بعد حجر ابن عدی کی صحابیت "مختلف فیہ" سے "یقینی" بھی ہوگئی۔

یہاں ہم اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"أما البخاريّ وابن أبي حاتم عن أبيه وخليفة بن خياط وابن حبان فذكروه في التابعين وكذا ذكره ابن سعد في الطبقة الأولى من أهل الكوفة"،امام بخاری نے،ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے نقل کیا ہے نیز خلیفہ بن خیاط اور ابن حبان نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے،اسی طرح ابن سعد نے بھی انہیں اہل کوفہ میں سے تابعین کے پہلے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

(الاصابة في تمييز الصحابة، ج2ص485، دار هجر القاهرة)

اور حافظ ابن کثیر نے ابو احمد العسکری کا قول نقل کیا ہے کہ:

"وَقَالَ أَبُو أَحْمَدَ الْعَسْكَرِيُّ:أَكْثَرُ الْمُحَدِّثِينَ لَايُصَحِّحُونَ لَهُ صُحْبَةً"، اکثر محدثین ان کے صحابی ہونے کی بات درست نہیں سمجھتے۔

(البداية والنهاية، ج8ص64، وزارة الاقاف قطر)

لیکن لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"حضرت حجر ابن عدی کی صحابیت کا انکار اس لئے کیا گیا تاکہ واقعہ کی اہمیت کو گھٹا دیا جائے... "۔

(استخلاف یزید،صفحہ 159)

قارئین محترم! جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ہمارا مقصد یہاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر کیے گئے

طعن اور اعتراضات کا جواب دینا نہیں کہ یہ سب طعن وہی ہیں جو صدیوں سے دشمنان صحابہ کرتے آئے ہیں اور علماء اہل سنت ان کے تسلی بخش جواب دیتے آئے ہیں، حجر ابن عدی کو سزا دینے کا معاملہ بھی انہی میں سے ایک ہے، ہمارا مقصد یہاں لعل شاہ صاحب کے اندر چھپے اس بغض معاویہ رضی اللہ عنہ پر بات کرنا ہے جو وہ کسی بھی واقعہ کی آڑ میں اشاروں کنایوں میں انڈیلتے ہیں، اب دل پر ہاتھ رکھ کر آگے پڑھیں، لکھتے ہیں:

"... حکومت ان کے (یعنی حجر بن عدی کوفی کے۔ناقل) رویہ کو بغاوت پر محمول کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بغاوت جیسے جرم کو کیسے گوارا کرسکتا ہے اور زیاد سے برداشت کی توقع خیال است ومحال است وجنوں، اس نے سنگین کاروائی کی، حضرت معاویہ کو اپنا مشورہ لکھا، شہادتیں پیش کیں، بھلا وہ زیاد کا مشورہ کیسے قبول نہ کرتے بڑی مشکل سے شجرہ ابی سفیان میں اس شاخ نوبہاری کی پیوندکاری عمل میں آئی تھی اگر اس کی آبیاری نہ کی جاتی تو وہ شاخ مرجھا جاتی اور بے ثمر ہو جاتی، زیاد مصر تھا کہ یہ لوگ باغی ہیں اور مستحق قتل ہیں اور پھر اس پر شہادتیں بھی پیش ہوئیں، حضرت معاویہ نے انہیں سزائے موت دے کر کیفر کردار تک پہنچا دیا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 159و160)

قارئین محترم! اس اقتباس کو دوبارہ بلکہ سہ بارہ پڑھیں، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ چونکہ زیاد ان کی مجبوری تھا اور انہوں نے کسی مجبوری کے تحت اس کا استلحاق اپنے خاندان کے ساتھ کیا تھا اس لئے وہ اس کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے تھے، نیز جو الفاظ لعل شاہ صاحب نے استعمال کیے ہیں ان پر غور کریں کیا یہ الفاظ آج کل کے رافضی ذاکروں سے مختلف ہیں جو اشاروں کنایوں میں صحابہ کرام پر طنز کرتے ہیں؟

بہرحال جب خود لعل شاہ صاحب بار بار یہ لکھ رہے ہیں کہ حجر ابن عدی کے خلاف "شہادتیں" پیش ہوئیں اور یہ فیصلہ ان شہادتوں کی بنیاد پر کیا گیا تو پھر کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حجر ابن عدی پر قانون شہادت لاگو نہیں ہوتا تھا یا انہیں کوئی استثناء حاصل تھی اور شریعت کے اصول ان پر نہیں لگتے تھے؟

❀❀❀

حجر بن عدی کا قتل اور لعل شاہ بخاری صاحب کی تلبیس

قارئین محترم! جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر ان کے دشمنوں نے جو اعتراضات اور طعن کیے ہیں ان میں استلحاق زیاد اور حجر بن عدی کا قتل بھی شامل ہیں اور علماء اہل سنت نے ان تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیے ہوئے ہیں، سر دست ہماری غرض ان اعتراضات کا جواب دینا نہیں بلکہ لعل شاہ صاحب کی تحقیق کا جائزہ لینا ہے، مودودی صاحب نے بھی اپنی کتاب "خلافت وملوکیت" میں دشمنان صحابہ کے یہی جُوٹھے لقمے چبائے تھے اور انہی باتوں کو لے کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کیا تھا اور لعل شاہ صاحب نے بھی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ایک جھوٹی روایت کو بنیاد بنا کر انہی مطاعن کو دہرا کر کئی ورق سیاہ کیے ہیں۔

آئیے اب آگے چلتے ہیں۔ لعل شاہ صاحب نے بغاوت اور جتھا بندی کا الزام ثابت ہونے کی بناء پر بطور سزا قتل ہونے والے حجر بن عدی کے بارے میں ایک سوال یوں اٹھایا ہے :

> "سوال پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ سے ہم عصر صحابہ و تابعین نے کیا تاثر لیا ہے، حجر بن عدی کی بغاوت جتھہ بندی اور حکومت وقت کے ساتھ اس کا محاربہ اور تصادم متعدد اصحاب کی شہادتیں بھی ان کے سامنے تھیں انہوں نے حجر ابن عدی کو مطعون کیا یا زیاد کو ملعون جانا، انہوں نے خلیفہ وقت کے حکم کی تحسین کی یا ان پر تنکیر کی ہے، اہل سنت والجماعت کثر اللہ جماعتھم نے حجر ابن عدی کے قتل کو ایک باغی کا قتل سمجھا یا ایک بے گناہ کا قتل سمجھ کر اسے شہادت سے تعبیر کیا....."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 160)

قارئین محترم! مندرجہ بالا تحریر میں لعل شاہ صاحب بخاری یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ حجر ابن عدی کی بغاوت، جتھا بندی اور حکومت وقت کے ساتھ ان کی لڑائی پر متعدد شہادتیں پیش کی گئی تھیں، لیکن وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ان شہادتوں کی بنیاد پر جو حجر بن عدی کے قتل کا فیصلہ کیا گیا اسے اہل السنت والجماعت درست

تسلیم نہیں کرتے، یہ بھی لعل شاہ صاحب کی تلبیس ہے، اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے لعل شاہ صاحب نے انتہائی فریب دہی سے کام لیا ہے، قاضی ابوبکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ایک عبارت پیش کی ہے کہ صحابہ کرام زیاد پر لعنت کرتے تھے (جبکہ اس بات کا کوئی حوالہ نہ ابوبکر ابن العربی نے پیش کیا ہے اور نہ ہی لعل شاہ صاحب نے) اور پھر لعل شاہ صاحب نے اس پر اپنا مقدمہ کھڑا کیا ہے کہ کچھ لوگ زیاد پر لعنت کیا کرتے تھے لہٰذا ثابت ہوا کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو حجر ابن عدی کے بارے میں فیصلہ کیا تھا وہ غلط تھا۔

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب صرف وہی عبارات اور حوالے نقل کرتے ہیں جو ان کے ذہن کے مفروضوں سے جوڑ کھاتے ہوں، ورنہ کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ:

"جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر تھے تو حجر بن عدی ان کے خطبہ کے دوران کھڑے ہو کر سخت باتیں کہا کرتے تھے لیکن حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے درگذر کیا کرتے تھے۔ جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی اور بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی زیاد کی گورنری میں دے دیا گیا تو وہ کوفہ آیا، اس وقت حجر بن عدی کے گرد شیعان علی کی کئی جماعتیں لپٹی ہوئی تھیں، یہ لوگ انہیں تقویت دے رہے تھے اور ان کے ہاتھوں حالات میں شدت پیدا کر رہے تھے، یہ لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے اور ان سے بے زاری کا اظہار کرتے تھے، پس جب زیاد نے کوفہ میں پہلا خطبہ دیا تو اس میں اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کیے اور ان لوگوں کی مذمت کی جنہوں نے انہیں قتل کیا یا ان کے قتل میں معاونت کی، پس (یہ سن کر) حجر اسی طرح کھڑے ہو گئے جیسے وہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کھڑے ہوا کرتے تھے، اور اسی طرح بولنا شروع کر دیا جیسے وہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے بولا کرتے تھے، لیکن زیاد نے ان سے تعرض نہیں کیا اور بصرہ کی طرف روانہ ہو گیا، اس کا ارادہ تھا کہ وہ حجر بن عدی کو بھی ساتھ لے جائے تاکہ اس کے جانے کے بعد یہ کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا کریں لیکن حجر نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ میں بیمار ہوں...الخ"۔

(ملخصاً: البداية والنهاية، ج8ص65، وزارة الاقاف قطر)

دراصل زیاد کے حجر بن عدی کے ساتھ پرانے تعلقات تھے، کیونکہ یہ دونوں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھی رہے تھے، اس لئے زیاد کو حجر بن عدی کے خیالات اوران کے گرد جمع ہونے والے لوگوں کی سرگرمیوں کامکمل علم تھا، وہ یہی چاہتا تھا کہ حجر بن عدی کو شورش پسندی اور جتھا بندی سے روکے اور کوفہ ایک بار پھر مرکزِ فتنہ نہ بن جائے، زیاد نے شروع میں حجر بن عدی کے اعزاز و اکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور انہیں آرام سے سمجھانے اور اپنے قریب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ زیاد نے حجر کو بلا کر یہاں تک کہا کہ: اے ابوعبدالرحمن! آپ جانتے ہیں کہ مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کتنی محبت ہے، میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ کوئی ناگوار بات نہ کریں۔ مگر حجر کی بدگمانی دور نہ ہوئی، آخر زیاد نے دوبارہ کوشش کی اور کہا: ایک مدت تک میں اور آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیسے (وفادار) بن کر رہے، یہ مجھے بھی معلوم ہے اور آپ کو بھی، مگر اب صورت حال کچھ اور ہے، آپ کی طبیعت میں تیزی سے میں واقف ہوں، آپ اپنی زبان پر قابو رکھیے اور اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیے، ان جاہلوں سے ہوشیار رہیے، کہیں وہ آپ کو اپنا ہم خیال نہ بنالیں۔ یہ سن کر حجر بن عدی نے کہا: میں سمجھ گیا ہوں، مگر جب وہ اپنے گھر گئے اور شر پسند گروہ کے لوگوں نے ان سے مل کر زیاد سے ان کی ملاقات اور گفتگو کا حال سنا تو انہیں دوبارہ زیاد کے خلاف بھڑکا دیا اور کہا : زیاد نے آپ کے ساتھ کوئی خیر خواہی نہیں کی۔ بقول حافظ ابن عساکر، کوفہ کے شیعہ حجر بن عدی کے پاس آتے جاتے تھے اور ان سے کہا کرتے تھے کہ" آپ ہمارے شیخ اور بڑے ہیں" (وكانت الشيعة يختلفون إليه ويقولون: إنك شيخنا)۔

حتیٰ کہ ایک بار زیاد نے تین صحابہ کرام، حضرت عدی بن حاتم الطائی، حضرت جریر بن عبداللہ البجلی اور حضرت خالد بن عُرفطہ (رضی اللہ عنہم) کو کوفہ کے شرفاء کے ایک وفد کے ساتھ حجر بن عدی کے پاس بھیجا کہ یہ لوگ حجر کو سمجھائیں لیکن حجر بن عدی نے ان لوگوں کی بات سننے میں بھی کوئی دلچسپی نہ دکھائی، چنانچہ زیاد کا کہنا سننا بے سود رہا۔

الغرض! جب حجر ابن عدی کی حکومت مخالف کاروائیاں برداشت سے باہر ہونے لگیں تو گورنر کوفہ زیاد

بن ابی سفیان نے ان کے خلاف کاروائی کا فیصلہ کیا تو حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ عنہ نے ہی زیاد کے سامنے یہ سفارش کی تھی کہ اگر زیاد یہ وعدہ کرے کہ وہ حجر بن عدی کو خود سزا نہیں دے گا بلکہ یہ معاملہ خلیفہ وقت امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دے گا تو حجر بن عدی پر امن طور پر اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کر دیں گے، چنانچہ زیاد کی یقین دہانی کروانے کے بعد حجر بن عدی نے اپنی گرفتاری دی تھی، اسی وجہ سے زیاد نے حجر بن عدی کو کچھ نہیں کہا تھا بلکہ انہیں دمشق بھیج دیا تھا اور ساتھ ہی کوفہ کے ستر کے قریب شرفاء کو جمع کر کے ان سے حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف شہادتیں قلم بند کروا کر پوری ایک چارج شیٹ تیار کر کے ساتھ بھیجی، حجر بن عدی کے خلاف جن لوگوں نے گواہی دی ان میں صحابہ کرام بھی تھے جن میں حضرت عمرو بن حُریث، حضرت خالد بن ابی عُرفطہ، حضرت وائل بن حُجر اور حضرت کثیر بن شہاب (رضی اللہ عنہم) کے نام بھی ملتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھیں:

(تاريخ دمشق،ترجمة: حجر بن عدي،ج12ص207، دار الفكر بيروت /

طبقات ابن سعد، ج6ص241وما بعد، دار الكتب العلمية بيروت / البداية والنهاية،ج8ص65ومابعد، وزارة الاوقاف قطر)

تو کیا زیاد بن ابی سفیان کا جرم یہ تھا کہ اس نے حجر بن عدی اور ان کے فسادی جتھے کو بجائے خود سزا دینے کے (جس کا اس کے پاس بطور گورنر اختیار بھی تھا) امیر المؤمنین کے پاس دمشق بھیج دیا اور ساتھ ان کے خلاف چارج شیٹ اور گواہیاں بھی روانہ کر دیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خود فیصلہ کریں؟

یا اسے یہ چاہئے تھا کہ وہ کوفہ میں ان شر پسند جتھوں کو آزادی سے اپنی کاروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی دے دیتا جن کے پروپیگنڈے کا شکار حجر بن عدی بھی ہو چکے تھے؟

ہمیں حجر بن عدی کی ذات اور ان کے مقام و مرتبہ سے کوئی لینا دینا نہیں، اگر لعل شاہ صاحب کے نزدیک ان کا صحابی ہونا ہی راجح ہے تو بھلے ہو، لیکن کیا خلیفہ راشد سوم سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے خود سید لعل شاہ صاحب نے نہیں لکھا کہ :

"....اس تنظیم کا بانی اور اس تحریک کا اولین محرک عبد اللہ بن سبا تھا جو ایک یہودی تھا اور محض فتنہ پردازی کے لئے اسلام قبول کیا اور قلب میں نفاق کو پوشیدہ رکھا، امت مسلمہ میں افتراق و

شقاق کا پیدا کرنا اس کا نصب العین تھا، جن کے دلوں میں کدورت تھی وہ اس کے گرد جمع ہو گئے، اس میں شک نہیں کہ بعض مخلص اصحاب بھی اس کے زہریلے پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے جس طرح حضرت مسطح رضی اللہ عنہ اور حسان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ (رضی اللہ عنہا) کے خلاف منافقین کے بپا کردہ طوفان افک و بہتان کے آتشیں شعلوں کی لپیٹ میں آگئے تھے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 19و20)

تو اگر لعل شاہ صاحب کے نزدیک متفقہ صحابی، یکے از عشرہ مبشرہ، خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تحریک میں بھی بعض مخلص صحابہ پروپیگنڈے کا شکار ہو سکتے ہیں تو ایک مختلف فیہ (بلکہ اکثر محدثین کے نزدیک غیر صحابی) حجر بن عدی کوفہ کے شر پسندوں کے پروپیگنڈے کا شکار کیوں نہیں ہو سکتے؟ جبکہ یہاں تو باقاعدہ ان کے خلاف کثیر تعداد میں شرفاء کوفہ کی گواہیاں بھی موجود تھیں جن میں کئی گواہ تو صحابہ کرام بھی تھے۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ جرم ثابت ہو جانے کے بعد اب خلیفہ وقت کے پاس سزا دینے کا بھی اختیار تھا اور معاف کر دینے کا بھی، سزا کے متعلق تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بڑا واضح تھا:

"فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيعٌ، فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ"۔

جو اس امت میں تفرقہ ڈالنا چاہے جب امت مجتمع ہو، تو اسے تلوار سے مارو چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

(صحيح مسلم، بَابُ حُكْمِ مَنْ فَرَّقَ أَمْرَ الْمُسْلِمِينَ وَهُوَ مُجْتَمِع)

اسی طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس یہ اختیار بھی تھا کہ وہ معاف کر دیتے، بعض حضرات کے بارے میں ملتا بھی ہے کہ انہوں نے جان بخشی کی سفارش بھی کی لیکن شاید سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سزا دینے کی رائے کو ترجیح دی، لیکن جان بخشی کی سفارش کرنے والوں سے کہیں مستند طریقے سے یہ نہیں ملتا کہ انہوں نے یہ

کہا ہو کہ حجر بن عدی پر یہ الزام جھوٹا ہے، یا گواہیاں جھوٹی ہیں اور انہیں ناحق سزا دی گئی، یہ صرف لعل شاہ صاحب کی تلبیس اور فریب ہے کہ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جیسے حجر بن عدی کو اس لئے یہ سزا دی گئی کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سن سکتے تھے اور ان کی تحریک اسی وجہ سے تھی اور زیاد نے بلا وجہ انہیں قتل کروایا۔

لہٰذا کسی کا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دینا کہ وہ حجر بن عدی کو معاف کر دیں، اس بات کا ثبوت کیسے ہو گیا کہ حجر بن عدی پر جرم ثابت نہیں ہوا تھا اور وہ کوفی شر پسندوں کی تحریک میں شامل نہیں تھے؟ نیز ان کے اس جرم میں قتل ہو جانے کے بعد کسی کا ان کے قتل پر افسوس کرنا بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ بے گناہ قتل کیے گئے۔

نوٹ : اگر کسی اکادکا شخص نے حجر بن عدی کے بطور سزا قتل کو "شہادت" لکھا ہے تو یہ اس کا تسامح اور غلطی ہے، ہم اصول شریعت اور قانون شہادت کے مطابق دیے گئے فیصلے کے پابند ہیں کسی کی ذاتی رائے کے نہیں چاہے یہ رائے دینے والا اپنے وقت کا کوئی مجتہد یا فقیہ ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ کسی غیر صحابی کی حیثیت ایک مجتہد صحابی اور خلیفۂ وقت سے زیادہ نہیں۔

آگے لعل شاہ صاحب ایک بار پھر لکھتے ہیں :

"حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر چار چیزوں میں نقمت کیا کرتے تھے اسی قول کی بنا پر ہم چار چیزوں کے درپے ہوئے ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 166)

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ لعل شاہ صاحب نے جو قول حسن بصری کی طرف منسوب کیا ہے اس کی کوئی سند انہوں نے ذکر نہیں کی، انہوں نے اس کا حوالہ یوں دیا ہے :

"حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں: وقد رُوِي عن الحسن البصري انه كان ينقم على معاوية اربعة اشياء قتاله علياً وقتله حجر ابن عدي

واستلحاقه زياد ابن ابيه ومبايعته ليزيد ابنه"۔

حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ حضرت معاویہ پر چار چیزوں کی نقمت کرتے تھے، حضرت علی کے ساتھ جنگ کرنا اور حجر بن عدی کو قتل کرنا اور زیاد ابن ابیہ کے نسب کو اپنے باپ ابوسفیان سے لاحق کرنا اور اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانا. البدایہ والنہایہ صفحہ 130 جلد 8"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 134و135)

لیکن حافظ ابن کثیر نے حسن بصری تک اس روایت کی کوئی سند ذکر نہیں کی بلکہ "قد رُوِيَ" مجہول کے صیغے کے ساتھ ذکر کر کے اس بات کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے اور نہ ہی لعل شاہ صاحب نے کوئی سند بیان کرنے کی زحمت کی ہے، شاید وہ جانتے تھے کہ اگر وہ تاریخ طبری کا حوالہ دیتے تو وہاں اس بات کی سند بھی مذکور ہے لیکن اس میں جھوٹا اور کذاب راوی" ابومخنف لوط بن یحییٰ" براجمان ہے اس لئے لعل شاہ صاحب بھی بات کو گول کر گئے. لیکن یہاں انتہائی ڈھٹائی سے ایک بار پھر یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ چونکہ حسن بصری کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ چار اعتراضات کیا کرتے تھے اس لئے میں بھی ان پر ورق سیاہ کر رہا ہوں۔

جنگ جمل و صفین اور لعل شاہ صاحب کی تلبیسات

جنگ جمل و صفین کا ذکر کرتے ہوئے سید لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں :

"ان جنگوں کا پس منظر، پیش منظر، حقیقی اسباب و علل اور وجوہات کا پیش کرنا مقصود نہیں اور نہ ہی جنگ جمل سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے متعلق ہے..... یہاں صرف جنگ صفین میں جو مقابلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین ہوا اس میں اہل سنت والجماعت کے موقف کی تشخیص کرنی ہے"۔

(ملخصاً : استخلاف یزید، صفحہ 168)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے اپنی بات شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت سے

شروع کی ہے اور ان کی عبارت (کانٹ چھانٹ کر) یوں نقل کی ہے:

"حافظ ابن تیمیہ نے اس سلسلے میں بہت سے اقوال جمع کیے ہیں، بعض اقوال یہ ہیں، فرماتے ہیں: فَلَا رَيْبَ أَنَّهُ اقْتَتَلَ الْعَسْكَرَانِ عَسْكَرُ عَلِيٍّ وَمُعَاوِيَةَ بِصِفِّينَ، وَلَمْ يَكُنْ مُعَاوِيَةُ مِمَّنْ يَخْتَارُ الْحَرْبَ ابْتِدَاءً، بَلْ كَانَ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ حِرْصًا عَلَى أَنْ لَا يَكُونَ قِتَالٌ، وَكَانَ غَيْرُهُ أَحْرَصَ عَلَى الْقِتَالِ مِنْهُ- وَقِتَالُ صِفِّينَ لِلنَّاسِ فِيهِ أَقْوَالٌ: فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: كِلَاهُمَا كَانَ مُجْتَهِدَانِ مُصِيبَانِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ عَلِيٌّ هُوَ الْمُصِيبُ وَمُعَاوِيَةُ مُخْطِئٌ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: كَانَ الصَّوَابُ أَنْ لَا يَكُونَ قِتَالٌ، وَكَانَ تَرْكُ الْقِتَالِ خَيْرًا لِلطَّائِفَتَيْنِ، فَلَيْسَ فِي الِاقْتِتَالِ صَوَابٌ، وَلَكِنْ عَلِيٌّ كَانَ أَقْرَبَ إِلَى الْحَقِّ مِنْ مُعَاوِيَةَ"۔

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) بے شک جنگ دو لشکروں کے درمیان حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے لشکر کے درمیان صفین میں واقع ہوئی اور حضرت معاویہ ابتداءً جنگ کو پسند نہ کرتے تھے بلکہ شدید ترین اس مسئلہ پر تھے کہ جنگ نہ ہو، دوسرا فریق (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ) حریص ترین تھے جنگ پر، اور جنگ صفین کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ دونوں فریق مجتہد مصیب تھے (یعنی حق پر تھے) اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف حضرت علی حق پر تھے حضرت معاویہ مجتہد مخطی تھے (یعنی انہوں نے حق کا قصد کیا لیکن حق کو نہ پاسکے) بعض لوگ کہتے ہیں صواب یہ تھا کہ قتال نہ ہوتا ترک قتال فریقین کے لئے خیر تھا، قتال کرنے میں کچھ خیر نہیں (یعنی دونوں فریق قتال کرنے میں حق پر نہ تھے) لیکن حضرت علی حق کے زیادہ قریب تھے بنسبت معاویہ۔

(استخلاف یزید، صفحہ 168 و 167)

نوٹ: اس ترجمہ میں بین القوسین جس عبارت کے نیچے خط کھینچا گیا ہے یہ لعل شاہ صاحب کا اضافہ ہے، حافظ ابن

تیمیہ کی عربی عبارت میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔

آگے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں :

"اس کے بعد امام موصوف نے بعض ناقابل اعتداد اقوال کا تذکرہ بھی کیا مثلاً یہ کہ مروانی کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ حق پر تھے اور حضرت علی ظالم تھے، امام موصوف نے ایک قول کا تذکرہ نہیں کیا جو کتابوں میں مذکور ہے وہ قول مروانیوں کے قول کے بالکل برعکس ہے کہ حضرت علی حق پر تھے اور حضرت معاویہ فاسق تھے شاید جس قول کو بعض معتزلہ کی طرف منسوب کیا ہے (كان معاوية فاسقاً دون علي) اس سے بھی مراد یہی ہو کہ معاویہ فاسق تھے اور حضرت علی فاسق نہیں تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 169)

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب نے آگے حافظ ابن تیمیہ کی بات پر اپنا تبصرہ بھی کیا ہے لیکن ہم لعل شاہی تبصرہ پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جو عبارت نقل کی ہے وہ کانٹ چھانٹ کر اور ناقص نقل کی ہے، نیز جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ترجمہ میں متعدد جگہ بریکٹ لگا کر اپنی طرف سے کچھ اضافے بھی کیے ہیں اس لئے آگے چلنے سے پہلے حافظ ابن تیمیہ کی مکمل عبارت دیکھنا ضروری ہے جو نقل کی جاتی ہے، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں :

"فَلَا رَيْبَ أَنَّهُ اقْتَتَلَ الْعَسْكَرَانِ: عَسْكَرُ عَلِيٍّ وَمُعَاوِيَةَ بِصِفِّينَ، وَلَمْ يَكُنْ مُعَاوِيَةُ مِمَّنْ يَخْتَارُ الْحَرْبَ ابْتِدَاءً، بَلْ كَانَ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ حِرْصًا عَلَى أَنْ لَا يَكُونَ قِتَالٌ، وَكَانَ غَيْرُهُ أَحْرَصَ عَلَى الْقِتَالِ مِنْهُ. وَقِتَالُ صِفِّينَ لِلنَّاسِ فِيهِ أَقْوَالٌ: فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: كِلَاهُمَا كَانَ مُجْتَهِدًا مُصِيبًا، كَمَا يَقُولُ ذَلِكَ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكَلَامِ وَالْفِقْهِ وَالْحَدِيثِ مِمَّنْ يَقُولُ: كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ، وَيَقُولُ: كَانَا مُجْتَهِدَيْنِ. وَهَذَا قَوْلُ كَثِيرٍ مِنَ الْأَشْعَرِيَّةِ وَالْكَرَّامِيَّةِ وَالْفُقَهَاءِ وَغَيْرِهِمْ، وَهُوَ

قَوْلُ طَائِفَةٍ مِنْ أَصْحَابِ أَبِي حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ وَغَيْرِهِمْ، وَتَقُولُ الْكَرَّامِيَّةُ :كِلَاهُمَا إِمَامٌ مُصِيبٌ، وَيَجُوزُ نَصْبُ إِمَامَيْنِ لِلْحَاجَةِ- وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ :بَلِ الْمُصِيبُ أَحَدُهُمَا لَا بِعَيْنِهِ، وَهَذَا قَوْلُ طَائِفَةٍ مِنْهُمْ- وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ :عَلِيٌّ هُوَ الْمُصِيبُ وَحْدَهُ، وَمُعَاوِيَةُ مُجْتَهِدٌ مُخْطِئٌ، كَمَا يَقُولُ ذَلِكَ طَوَائِفُ مِنْ أَهْلِ الْكَلَامِ وَالْفُقَهَاءِ أَهْلِ الْمَذَاهِبِ الْأَرْبَعَةِ- وَقَدْ حَكَى هَذِهِ الْأَقْوَالَ الثَّلَاثَةَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ بْنُ حَامِدٍ عَنْ أَصْحَابِ أَحْمَدَ وَغَيْرِهِمْ- وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ:كَانَ الصَّوَابُ أَنْ لَا يَكُونَ قِتَالٌ، وَكَانَ تَرْكُ الْقِتَالِ خَيْرًا لِلطَّائِفَتَيْنِ، فَلَيْسَ فِي الِاقْتِتَالِ صَوَابٌ، وَلَكِنْ عَلِيٌّ كَانَ أَقْرَبَ إِلَى الْحَقِّ مِنْ مُعَاوِيَةَ، وَالْقِتَالُ قِتَالُ فِتْنَةٍ لَيْسَ بِوَاجِبٍ وَلَا مُسْتَحَبٍّ، وَكَانَ تَرْكُ الْقِتَالِ خَيْرًا لِلطَّائِفَتَيْنِ، مَعَ أَنَّ عَلِيًّا كَانَ أَوْلَى بِالْحَقِّ.وَهَذَا هُوَ قَوْلُ أَحْمَدَ وَأَكْثَرِ أَهْلِ الْحَدِيثِ وَأَكْثَرِ أَئِمَّةِ الْفُقَهَاءِ، وَهُوَ قَوْلُ أَكَابِرِ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ لَهُمْ بِإِحْسَانٍ، وَهُوَ قَوْلُ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، وَكَانَ يَنْهَى عَنْ بَيْعِ السِّلَاحِ فِي ذَلِكَ الْقِتَالِ، وَيَقُولُ:هُوَ بَيْعُ السِّلَاحِ فِي الْفِتْنَةِ، وَهُوَ قَوْلُ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، وَمُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ، وَابْنِ عُمَرَ، وَسَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، وَأَكْثَرِ مَنْ بَقِيَ مِنَ السَّابِقِينَ الْأَوَّلِينَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَلِهَذَا كَانَ مِنْ مَذَاهِبِ أَهْلِ السُّنَّةِ الْإِمْسَاكُ عَمَّا شَجَرَ بَيْنَ الصَّحَابَةِ"-

"بلاشک صفین میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے لشکروں کا ٹکراؤ ہوا، لیکن جنگ اختیار کرنے والے (یعنی ابتداء کرنے والے) حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نہ تھے، بلکہ آپ تمام لوگوں میں سے اس بات کے خواہاں تھے کہ جنگ نہ ہو، جبکہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ

یہ چاہتے تھے کہ جنگ ہو جائے (یہاں حافظ ابن تیمیہ نے "غیرہ" کا لفظ لکھا ہے لیکن لعل شاہ صاحب نے اس کا غلط ترجمہ "دوسرا فریق یعنی حضرت علی" کیا ہے۔ناقل) اور صفین کی جنگ کے بارے میں لوگوں کے تین قول ہیں۔

پہلا قول: ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ دونوں (یعنی حضرت علی وحضرت معاویہ رضی اللہ عنہما) مجتہد مصیب تھے (یعنی اپنے اپنے اجتہاد میں ٹھیک تھے)، یہ قول متکلمین وفقہاء ومحدثین میں سے بہت سے لوگوں کا ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہی ہوتا ہے، اور کہتے ہیں کہ (چونکہ) وہ دونوں ہی مجتہد تھے (اس لیے دونوں مصیب تھے)، یہی قول ہے اشعریہ، کرامیہ اور فقہاء میں سے بہت سوں کا اور ان کے علاوہ دوسروں کا، نیز یہی قول ہے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے ایک جماعت کا۔البتہ کرامیہ کہتے ہیں کہ دونوں ہی امام مصیب تھے اور ضرورت کے وقت دو امام مقرر کرنا جائز ہے۔

دوسرا قول: کچھ یہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی "مجتہد مصیب" تھے، لیکن کون تھے؟ اس کی تعیین نہیں کرسکتے، یہ بھی ان میں سے ہی ایک جماعت کا قول ہے۔

تیسرا قول: ان میں وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) ہی مصیب تھے اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) مجتہد مخطی تھے، جیسے کہ متکلمین اور چاروں مذاہب کے فقہاء کی کئی جماعتوں کا قول ہے۔اور یہ تینوں اقوال ابوعبداللہ بن حامد (غزالی) نے امام احمد کے اصحاب اور ان کے علاوہ دوسروں سے نقل کیے ہیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ بہتر یہ تھا کہ یہ لڑائی نہ ہوتی اور جنگ کا ترک کرنا دونوں جماعتوں کے لئے بہتر تھا، جنگ کرنا اچھا نہ تھا لیکن حضرت علی (رضی اللہ عنہ)، حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بنسبت حق کے زیادہ قریب تھے اور یہ لڑائی فتنہ کی لڑائی تھی جو نہ واجب تھی اور نہ ہی مستحب بلکہ لڑائی نہ کرنا دونوں گروہوں کے لئے بہتر تھا اس کے باوجود حضرت علی (رضی اللہ عنہ) حق کے زیادہ قریب تھے، یہی قول ہے امام احمد کا اور اکثر محدثین کا اور اکثر ائمہ فقہاء کا اور یہی قول اکابر صحابہ وتابعین کا ہے اور یہی قول ہے حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہ) کا آپ اس جنگ کے زمانہ فتنہ میں

ہتھیاروں کی فروخت سے منع فرمایا کرتے تھے اور یہی قول ہے حضرات اسامہ بن زید، محمد بن مسلمہ، ابن عمر، سعد بن ابی وقاص اور بقیہ سابقون اولون مہاجرین وانصار ﷺ کا، اور اسی لئے اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ صحابہ کے مابین ہونے والے مشاجرات میں توقف اختیار کیا جائے.....الخ"۔

(منهاج السنة ،ج4ص447،طبع السعودية)

قارئین محترم! یہ ہے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مکمل عبارت جس کا کچھ حصہ کانٹ چھانٹ کر لعل شاہ صاحب نے نقل کیا ہے، اس مکمل عبارت کو ذہن میں رکھیں اور اب اس پر لعل صاحب نے جو حاشیہ آرائی کی ہے وہ پڑھیں، لکھتے ہیں:

"پہلا قول دونوں فریق حق پر تھے بوجوہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی بنیاد مسئلہ تعدد حق پر ہے کہ اختلافی مسائل میں حق متعدد ہوسکتا ہے اور ہم مقدمہ میں بتلا چکے ہیں کہ (وحدة الحق حقٌ) کہ اہل سنت کے نزدیک حق صرف ایک ہی ہوتا ہے تعدد حق کا قول معتزلہ کا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 169)

قارئین محترم! دیکھا آپ نے؟ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو صاف یہ لکھا ہے کہ:

"یہ قول متکلمین وفقہاء ومحدثین میں سے بہت سے لوگوں کا ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہی ہوتا ہے، اور بقول حافظ ابن تیمیہ یہی قول ہے اشاعرہ، کرامیہ اور فقہاء میں سے بہت سوں کا اور ان کے علاوہ دوسروں کا، نیز یہی قول ہے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے ایک جماعت کا" (مکمل عبارت پہلے نقل ہو چکی)۔

لیکن لعل شاہ صاحب نے جان بوجھ کر عبارت مکمل نقل نہیں کی تھی تا کہ کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ حافظ ابن تیمیہ یہ کس کس کا مذہب بتا رہے ہیں، بلکہ الٹا لعل شاہ صاحب غلط بیانی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ تو

صرف معتزلہ کا مذہب ہے۔اب ہم لعل شاہ صاحب کی تحقیق مانیں یا شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی؟ جبکہ لعل شاہ صاحب نے خود اپنی بات شروع ہی حافظ ابن تیمیہ کی عبارت نقل کرنے سے کی ہے۔

اب آئیے دیکھتے ہیں لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں کیا لکھا ہے؟ غور سے پڑھیں :

"کسی مسئلہ پر اگر ائمہ مجتہدین کی آراء مختلف ہو جائیں تو تمام آراء برحق ہوتی ہیں یا حق صرف ایک جانب ہی ہوگا؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ حق صرف ایک ہی رائے ہوگی، بقیہ آراء اگرچہ خطا ہوں گی کہ (المجتهد قد يخطي ويصيب) کہ مجہتد کبھی خطا کر جاتا ہے اور کبھی اس کی رائے صائب ہوتی ہے مگر اجر و ثواب ان آراء پر بھی مرتب ہوگا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 62)

آگے لکھتے ہیں :

"سید انور شاہ صاحب المحدث نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں کہ علماء نے حق کے واحد اور متعدد ہونے میں اختلاف کیا ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی دو کتابوں عقد الجید اور انصاف میں مبسوط بحث کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ (والجمهور الى أنه واحد) کہ جمہور اس طرف گئے ہیں کہ حق واحد ہی ہے متعدد نہیں ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 62)

غور فرمائیں! خود لعل شاہ صاحب نے اس بات کو "جمہور" اہل سنت کی رائے بتایا ہے نہ کہ سب اہل سنت کی اور نہ ہی معتزلہ کا کوئی ذکر کیا ہے (ظاہر ہے یہاں علماء اہل سنت کی بات ہی ہو رہی ہے) جس کا مطلب ہے کہ خود اہل سنت میں اس بات پر اختلاف ہے، لیکن یہاں لکھ رہے ہیں کہ :

"ہم مقدمہ میں بتلا چکے ہیں کہ وحدۃ الحق حق کہ اہل سنت کے نزدیک حق صرف ایک ہی ہوتا ہے تعدد حق کا قول معتزلہ کا ہے"۔

کیا جب کوئی عالم یہ لکھے کہ "فلاں مسئلہ میں جمہور اہل سنت کی رائے فلاں ہے" تو اس کا مطلب ہوتا

ہے کہ جو جمہور میں نہیں وہ "معتزلہ" ہیں؟ یاد رہے! شرح عقائد نسفی میں بعض اشاعرہ کا بھی یہی مذہب بتایا گیا ہے (دیکھیں: شرح عقائد، صفحہ 399 مکتبۃ البشریٰ کراچی) اور "اشاعرہ" کو اہل سنت میں شمار کیا جاتا ہے۔

لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک حوالہ بھی یوں نقل کیا ہے :

"اصل مذہب جمہور اہل السنۃ والجماعت کا اور ائمہ اربعہ کا یہی ہے کہ اجتہادیات میں حق عند اللہ واحد ہے اور اسی بنا پر ہر مجتہد مصیب ہوسکتا ہے اور مخطی بھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 63)

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحریر میں بھی "جمہور اہل سنت" کے الفاظ ہیں یعنی یہ مطلقاً اہل سنت کا متفقہ مسلک نہیں ہے، نیز یہاں "حق عند اللہ" کے الفاظ قابل غور ہیں، جس سے یہ سمجھ آتی ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اجتہادی اختلافی اقوال میں حق ایک ہی ہوتا ہے ان کی مراد بھی یہ ہوتی ہے کہ "وہ اللہ کے علم میں ہوتا ہے" اور اس کا فیصلہ اللہ ہی قیامت کے دن فرمائیں گے اور اسی وقت جس مجتہد نے اپنے اجتہاد میں حق کو پالیا ہوگا اسے دوہرا اجر ملے گا اور جس نے غلطی کی ہوگی اسے بھی ایک اجر ملے گا، اس بات کو خود لعل شاہ صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے :

"مجتہد اگر اپنے اجتہاد میں خطا کر جائے اور حق کو نہ پاسکے تو بھی وہ عند اللہ ماجور ہوگا، مجتہد کے لئے اصابت حق لازم نہیں، اگر کسی بزرگ سے (کل مجتھد مصیب) کا جملہ منقول ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ (کل مجتھد مصیب للاجر) کہ ہر مجتہد اجر و ثواب کو پالیتا ہے اگرچہ حق کو پالینے میں خطا کر گیا ہو"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 63 زیر عنوان "فائدہ مہمہ")

اور یہی بات اپنی کتاب میں آگے ایک جگہ یوں لکھی:

"کل مجتھد مصیب کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کل مجتھد مصیب الاجر کہ ہر مجتہد

اجر و ثواب کا حقدار ہے خواہ حق کو پا نہ سکے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 170)

الغرض! ایک تو لعل شاہ صاحب نے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے تلبیس کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ باور کروایا ہے کہ جیسے تمام اہل سنت کا متفقہ مسلک یہ ہے کہ اجتہادیات میں حق صرف ایک ہی ہوتا ہے جبکہ مقدمہ میں وہ خود اسے "جمہور" کا مسلک بتا چکے ہیں، نیز حافظ ابن تیمیہ تو اسے بہت سے فقہاء اور متکلمین کا قول بتلا رہے ہیں لیکن لعل شاہ صاحب اسے صرف معتزلہ کا قول بتا رہے ہیں، دوسرا جن کا قول حق کے ایک ہونے کا ہے وہ بھی اللہ کے علم میں ایک ہونے کا ہے اور اس کا قطعی فیصلہ دنیا میں نہیں ہو سکتا خاص طور پر ان اجتہادی اختلافات میں جو وحی کے انقطاع اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد پیش آئے۔

چونکہ لعل شاہ صاحب نے اب جنگ صفین پر کلام شروع کیا ہے اس لئے آگے چلنے سے پہلے اس بات کی طرف توجہ دلانا انتہائی ضروری ہے کہ ایک ہے اہل السنۃ کا مذہب وعقیدہ، اور ایک ہے اکابرین اہل السنۃ کی اپنی ذاتی آراء اور تحقیقات، دونوں کی حیثیت بالکل الگ الگ ہے، اوّل کی بنیاد اصول وقواعد پر ہے جبکہ شخصی آراء کی بنیاد اپنے اپنے جذبات ہیں، ہم اہل السنۃ کے عقیدہ واصولی مذہب متعلقہ صحابہؓ سے تو حرف بحرف متفق ہیں، لیکن اکابرِ اہل السنۃ کی بعض ذاتی اور شخصی آراء سے اختلاف کو نہ گناہ سمجھتے ہیں نہ مسلکِ اہل السنۃ سے انحراف، چنانچہ لعل شاہ صاحب نے بھی کئی جگہ اکابرین اہل سنت کی آراء اور ان کی تحقیق سے اختلاف کیا ہے بلکہ صحیح بخاری کی ایک حدیث تک کو "راوی کی خودساختہ" قرار دیا ہے جس حدیث پر آج تک کسی محدث یا شارح نے جرح نہیں کی، اس لئے ہمارا نقطۂ اختلاف صرف اور صرف یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی اپنی زبان وقلم کو لگام دینی چاہئے، یہ کوئی تسنّن نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی، طاغی، جائر اور باطل پر ثابت کرنے کے لئے ورق کے ورق سیاہ کیے جائیں اور پھر اوپر سے یہ طفل تسلی بھی دی جائے کہ "اس میں ان کی کوئی توہین نہیں"۔

دیکھئے! اہل السنۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہؓ کے بارے میں اگر کوئی صحیح روایت بھی ایسی ہو جو صحابہؓ کے مقام و مرتبہ سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو اس کی تاویل کرنا یا اگر تاویل نہ ہو سکے تو اس کو رڈ کر دینا ضروری ہے، اور اِدھر لعل شاہ صاحب کو دیکھیں کہ کتبِ فقہ کے باب البغاۃ سے صحابہؓ کا وہ کردار کشید کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس کا وہ اپنے بارے میں نام تک سننا بھی شاید پسند نہ کریں گے، اور ان ابواب میں مذکور فقہاء کے اقوال کا حوالہ وہ اس انداز سے دیتے ہیں جیسے کہ یہ ابواب مدوّن ہی صحابہؓ کے ایسے ویسے کردار کو ثابت کرنے کے لئے کئے گئے ہیں، العیاذ باللہ، اسی طرح وہ غیر متعلقہ احادیث سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ناحق و مخطی اور باطل ہونا ایسے کشید کرتے ہیں جیسے کہ ان احادیث کا مقصد سوائے حضرت معاویہؓ کی خطا اور ”علی الباطل“ بیان کرنے کے اور تھا ہی کچھ نہیں، ظاہر ہے کہ یہ سُنی مسلک تو ہرگز نہیں بلکہ ان حضرات کے اپنے اضغاث احلام اور اپنی اختراعات ہیں، اب اگر یہ حضرات بیان تو کریں اپنی مزعومات و خیالات اور ان کو نام دیں مسلکِ اہل السنۃ کا اور پھر رعب جھاڑنے لگیں ہم پر مسلکِ اہل السنۃ کا؟ تو ظاہر ہے کہ یہ رعب مسلک کا نہ ہوگا بلکہ ان کی اپنی ذات و شخصیت اور اپنے نظریات کا رعب ہوگا، اب اگر کوئی مجتہد کہلانے والی شخصیت (جن کا نام میں جان بوجھ کر نہیں لکھ رہا) حضرت ابوسفیانؓ اور مسلمانانِؓ فتحِ مکہ کو ”منافق“ بتا کر اپنی فقاہت و اجتہاد کا ہم پر رعب ڈالے تو بتائیے کہ مسلکِ اہل السنۃ کے نام سے دھوکا کھا کر ہم اس شخصیت کا رعب کیسے مان لیں؟

لہٰذا سیدھی سی بات ہے قرنِ صحابہ کے کئی سو سال بعد پیدا ہونے والا جو شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رعب سے مرعوب نہیں ہوتا، کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہم پر اس شخصیت کا رعب جھاڑے اور اس سے ہمیں مرعوب کرے، اگر یہ حضرات مسلکِ اہل السنۃ کے علی الرغم مشاجراتِ صحابہؓ میں رائے زنی کر سکتے اور صحابہؓ کے فیصلے چکا سکتے ہیں تو ہم خود اِن پر اور ان کے نظریات پر کیوں رائے زنی نہیں کر سکتے؟ اِن کی عزت و حرمت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عزت و حرمت سے زیادہ تو نہیں؟

بہر حال ہمارا مقصد یہ ہے کہ مسلکِ اہل السنۃ الگ چیز ہے اور سُنی اکابر و اصاغر کی اپنی ذاتی اور شخصی آراء بالکل ایک جدا چیز ہے، نام مسلک کا لیا جاتا ہے اور منوائی ہم سے ان کی ذاتی رائے جاتی ہے خواہ صحیح ہو یا غلط، یہ ہم سے نہیں ہو سکتا، ان کی شخصی آراء کو رڈ کرنا اگر خروج عن اہل السنۃ ہے تو صحابہؓ پر اس طرح رائے زنی

کرنا کہ ان کو ایک ہی سانس میں باغی، طاغی، ظالم، جائر، عادل عن الحق، قرآن وسنت کو مہجور کرنے والے وغیرہ وغیرہ کہہ ڈالا جائے یہ بھی سنیت نہیں بلکہ سبائیت ہے، ہم جیسے الحمدللہ رافضی، خارجی اور ناصبی نہیں ایسے ہی سبائی بھی نہیں، مسلکِ اہل السنۃ ہمارا دین وایمان ہے لیکن شخصیات کی شخصی آراء کا نام مسلکِ اہل السنۃ نہیں، مسلک اصول کا نام ہے۔

اہل السنۃ کا اصول صحابہ کرام ﷢ کے مشاجراتی اور اسی طرح ان کے دیگر باہمی مخاصمات ومنازعات کے بارے میں یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو باتیں اُن سے متعلق پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہوں، ضروری ہے کہ ان کو عمدہ محمل اور صحیح مقصد پر محمول کیا جائے، ان کا معنٰی ومفہوم وہ مراد لیا اور بیان کیا جائے جو ان کی عظمتِ شان اور جلالتِ قدر کے شایاں ہو، جس سے ان کی پوزیشن صاف ہوتی ہو، ان پر کوئی الزام واتہام نہ آتا ہو، اس کے برخلاف ان باتوں کا کوئی ایسا معنٰی ومطلب لینا یا کوئی ایسا موقع ومحل بیان کرنا ''از روئے عقیدۂ اہل السنۃ'' جائز نہیں ہے جو ان کے مقامِ رفیع اور مرتبۂ جلیل کے منافی ہو، جس سے ان کی پوزیشن مجروح ہوتی ہو، ان پر کوئی حرف والزام آتا اور کوئی عیب لگتا ہو، اور ان سے متعلق کسی بات کا معنٰی ومطلب ان کی شایانِ شان نہ بن سکتا ہو یا کوئی مناسب تاویل وتوجیہ نہ ہو سکتی ہو تو اس بات کو رد کر دینا ضروری ہے، خواہ وہ کتنے ہی صحیح اور قوی ذریعہ سے ہی ثابت کیوں نہ ہو، اہل السنۃ کا یہ اصول ایسا مسلّمہ ومتفقہ، اور ایسا معروف ومشہور ہے کہ محتاجِ بیان نہیں، تاہم اپنے قارئین کی تسلی کے لئے چند تصریحات ذکر کر دینا مناسب ہے۔

الف:......امام نووی ؒ (م676ھ) لکھتے ہیں:۔

"ولسنا نقطع بالعصمة اِلا للنبي صلى الله عليه وسلم ولِمن شهد له بها لكنا مامورون بحسن الظن بالصحابة رضي الله عنهم اجمعين ونَفِي كُلِّ رذيلةٍ عنهم واذا انسدت طرق تاويلها نسبنا الكذبَ الى رواتها"۔

(شرح النووی علی صحیح مسلم، ج12ص72، دار احیاء التراث العربي بیروت)

معنیٰ ومطلب یہ ہے کہ ہم، نبی کریم ﷺ اور جن کے معصوم ہونے کی گواہی آپ نے دی ہے (یعنی دیگرانبیاء اور ملائکہ علیہم السلام) کے سوا کسی اور کو معصوم تو نہیں مانتے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حسنِ ظن رکھنے اور ان سے تمام اوصافِ رذیلہ کی نفی کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے (لہٰذا ہم ہر اُس حدیث کی تاویل کریں گے جو صحابہؓ کی شان کے بظاہر خلاف نظر آتی ہو) اور جب اس کی تاویل کے تمام راستے بند ہو جائیں گے تو ہم اس کے راویوں کو جھوٹا قرار دے کر اس کو ردّ کرڈالیں گے۔

ب:...... حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جمل وصفین کی جنگوں میں شریک ہونے والے اور شریک نہ ہونے والے صحابہ کرامؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"والحقُّ حمل عملِ كلِّ احدٍ من االصحابة المذكورين على السداد...الخ" یعنی حق یہ ہے کہ ان صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک کے عمل کو درستی وراستی پر ہی حمل کیا جائے۔

(فتح الباری،ج13ص42، دار المعرفة بيروت)

ج:...... علامہ سفارینیؒ مشاجراتِ صحابہؓ میں دخل دینے سے منع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فكل ما صحَّ مِمَّا جَرىٰ بين الصحابة الكرام وَجَبَ حمله علىٰ وجه ينفي عنهم الذنوب والآثام" یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان پیش آمدہ مشاجرات کی جو روایات، صحیح ہیں ان کا بھی معنیٰ ومطلب ایسا بیان کرنا واجب ہے جو ان حضرات سے تقصیروں اور گناہوں کے الزام کو دور کرنے والا ہو۔

(لوامع الانوار البهية، ج 2ص386، دمشق)

د:...... علامہ عبدالعزیز فرہارویؒ فرماتے ہیں کہ :

"وهكذا جرت عادةُ السلف الصالحين بحمل افعال الصحابة علىٰ مقاصد صحيحة" یعنی سلفِ صالحین کی عادت یوں ہی رہی ہے کہ وہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کے مشاجراتی ومنازعاتی افعال کو مقاصدِ صحیحہ پر ہی محمول کرتے رہے ہیں۔

(النبراس شرحُ شرحِ العقائد،ص697، آستانہ)

اپنی ایک دوسری کتاب میں اس پر اہل السنت والجماعت کا اجماع کرنا بتایا ہے، چنانچہ رقم طراز ہیں:

"وأجمع أهل السنة والجماعة على تأويل ما ثبت منها تخليصاً للعامة عن الوساوس والهواجس. وأما ما لم يقبل التأويل فهو مردود. فإن فضل الصحابة وحسن سيرتهم واتباعهم الحق ثابت بالنصوص القاطعة وإجماع أهل الحق فكيف يعارضه رواية الآحاد"۔

یعنی مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو باتیں صحیح طور پر ثابت اور قابل تاویل ہوں، عوام الناس کو صحابہؓ کے بارے میں وسوسوں اور اندیشوں سے بچانے کے لئے ان کی کوئی مناسب تاویل کرنے پر اور جو (باتیں) تاویلیں قبول نہ کریں ان کے مردود ہونے پر اہل السنت والجماعت نے اجماع کیا ہے، صحابہ کرم کی فضیلت وحسن سیرت اور ان کا حق کی پیروی کرنا یہ تو نصوص قطعیہ اور اہل حق کے اجماع سے ثابت ہے تو اس کے مقابلہ میں اخبار آحاد کیسے آسکتی ہیں؟"

(الناهية عن طعن امير المؤمنين معاوية،ص24، مكتبة الغراس، الكويت)

یہ چند اصولی باتیں ذہن میں رکھ کر آئیے آگے چلتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"تیسرا قول خود امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ یہی قول امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا، حضرت امام نے اس قول کے اصح ہونے پر دلائل دیے ہیں، زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوارج کے متعلق فرمایا تھا کہ (تمرق

مارقة على حين فرقة من المسلمين تقتلهم اولى الطائفتين بالحق) کہ جب مسلمان دوحصوں میں تقسیم ہوجائیں گے ایک گروہ دین سے بالکل خارج ہوجائے گا،مسلمانوں کی دوجماعتوں میں سے جوفریق انہیں قتل کرے گا حق کے زیادہ قریب ہوگا. شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کا استدلال یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے حق یہ ہے کہ قتال نہ ہوتا پس وہ صحابہ برحق تھے جنہوں نے اس قتال میں حصہ نہیں لیااور قتال کرنے والے فریقین میں سے حضرت علی ؓ حق کے زیادہ قریب تھے کیونکہ انہوں نے ہی خوارج سے قتال کیا تھااور انہیں قتل کیا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 170)

آگے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہم شیخ الاسلام (ابن تیمیہ) کے علوّ مقام کے پیش نظر کچھ کہنے کی ہمت تو نہیں رکھتے تاہم، ہم ان کے مسلک کو چندوجوہ کی بنا پر قبول کرنے سے معذور ہیں، اور رقمطراز ہیں :

"اولاً اس لئے کہ امام ابن تیمیہ کا قول ناقض لنفسہ ہے (یعنی ان کی بات میں آپس میں ہی تضاد ہے ۔ناقل) کیونکہ حضرت امام نے مندرجہ بالا عبارت میں اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کرتے ہوئے تین چیزوں کی تصریح کی ہے (1) حضرت معاویہ ؓ قتال کو پسند نہیں فرماتے تھے اور حضرت علی ؓ قتال پر حریص تھے ۔(2) حق اور صواب قتال میں نہیں تھا حق اور صواب یہ تھا کہ قتال نہ ہو اس لئے وہ صحابی حق پر تھے جنہوں نے قتال میں حصہ نہیں لیا اور حضرت علی وحضرت معاویہ ؓ اور ان کے اتباع جنہوں نے قتال میں حصہ لیا وہ حق پر نہ تھے ۔(3) حضرت علی ؓ اولیٰ بالحق ہیں کیونکہ ان کی اولویت پر صادق المصدوق پیغمبر صلوات اللہ علیہ کی پیشینگوئی شاہد ہے۔

مجھے امام صاحب کے یہ اقوال متضاد معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ جب قتال میں صواب نہیں تھا،صواب ترک قتال ہے جس کے نتیجہ میں وہ اصحاب برحق تھے جنہوں نے قتال میں حصہ نہیں لیااور وہ حق پر نہ تھے جنہوں نے قتال میں حصہ لیا تو اس قضیہ کا تقاضا یہ ہے کہ جو فریق حق

پر نہ تھے (یعنی حضرت معاویہ وحضرت علی) کیونکہ انہوں نے قتال میں حصہ لیا ان میں سے جو فریق قتال کو ناپسند کرتا تھا وہ اقرب الی الحق ہوتا اور جو قتال پر شدید ترین حریص تھا وہ ابعد عن الحق ہوتا وذلك ظاهر ،لیکن حضرت امام نے اس کے برخلاف تیسرے قول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اولیٰ بالحق ہونے کی تصریح کی ہے اور صحیح بخاری کی روایت سے استدلال بھی کیا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 170و171)

قارئین محترم! ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیر بحث جو مکمل عبارت نقل کی تھی اس پر دوبارہ ایک نظر ڈال لی جائے، اس عبارت میں کہیں بھی یہ الفاظ نہیں کہ" حضرت علی رضی اللہ عنہ قتال پر حریص تھے" یہ لعل شاہ صاحب کا اپنا استنباط ہے، بلکہ حافظ ابن تیمیہ نے" غیرہ" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا سیدھا سا ترجمہ ہے کہ" حضرت معاویہ کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ قتال چاہتے تھے" لیکن لعل شاہ صاحب نے اپنی طرف سے اس" غیرہ" سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد لے لئے، کیا یہ ممکن نہیں کہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی" غیرہ" سے مراد وہ سبائی باغی ہوں جو جنگ جمل وصفین بھڑکانے والے تھے اور وہی اس بات پر شدید حریص تھے کہ مسلمانوں کے درمیان جنگ ہو؟ ورنہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کیا مجبوری تھی کہ وہ یہاں" غیرہ" کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام نہ لکھ دیتے؟

پھر لعل شاہ صاحب نے یہاں یہ تلبیس پیدا کی ہے کہ جیسے حافظ ابن تیمیہ نے"حق اور ناحق" یا"حق و باطل" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جبکہ ان کی عبارت میں" خیر"،"صواب" اور" اقرب الی الحق" کے الفاظ لکھے ہیں، ابن تیمیہ کی عبارت یہ ہے:

"كَانَ الصَّوَابُ أَنْ لَا يَكُونَ قِتَالٌ، وَكَانَ تَرْكُ الْقِتَالِ خَيْرًا لِلطَّائِفَتَيْنِ، فَلَيْسَ فِي الِاقْتِتَالِ صَوَابٌ، وَلَكِنْ عَلِيٌّ كَانَ أَقْرَبَ إِلَى الْحَقِّ مِنْ مُعَاوِيَةَ، وَالْقِتَالُ قِتَالُ فِتْنَةٍ لَيْسَ بِوَاجِبٍ وَلَا مُسْتَحَبٍّ، وَكَانَ تَرْكُ الْقِتَالِ خَيْرًا لِلطَّائِفَتَيْنِ، مَعَ أَنَّ عَلِيًّا كَانَ أَوْلَى بِالْحَقِّ..الخ"۔

ترجمہ: اور ایک قول یہ ہے کہ بہتر یہ تھا کہ یہ لڑائی نہ ہوتی اور جنگ کا ترک کرنا دونوں جماعتوں کے لئے بہتر تھا، جنگ کرنا بہتر نہ تھا لیکن حضرت علی (رضی اللہ عنہ)، حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بنسبت حق کے زیادہ قریب تھے اور یہ لڑائی فتنہ کی لڑائی تھی جو نہ واجب تھی اور نہ ہی مستحب بلکہ لڑائی نہ کرنا دونوں گروہوں کے لئے بہتر تھا اس کے باوجود حضرت علی (رضی اللہ عنہ) حق کے زیادہ قریب تھے"۔

غور فرمائیں! کیا یہاں حافظ ابن تیمیہ نے یہ کہا ہے کہ جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا وہ حق پر نہیں تھے اور جو الگ رہے وہ حق پر تھے؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ فرما رہے ہیں کہ دونوں گروہوں کے لئے زیادہ بہتر یہی تھا کہ وہ جنگ نہ کرتے کیونکہ یہ فتنہ کے زمانہ کی جنگیں تھیں اور ان میں شرکت کرنا کوئی واجب، مستحب یا باعث اجر وثواب نہیں تھا اس لئے مسلمانوں کے درمیان ہونے والی ان جنگوں سے بچنا دونوں فریقوں کے لئے زیادہ بہتر تھا لیکن لعل شاہ صاحب نے اس میں "حق" اور "ناحق" کا تڑکا لگا کر اپنی طرف سے عبارت میں تضاد ثابت کرنا شروع کر دیا، اب یہاں لعل شاہ صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ کوئی ایسی دلیل دیتے جس سے ثابت ہوتا کہ زمانہ فتنہ میں ہونے والی یہ جنگیں لڑنا اور ان میں حصہ لینا ہر مسلمان کے لئے واجب یا مستحب تھا اور جنگ سے بچنا اور دور رہنا یہ غلط تھا تو پھر حافظ ابن تیمیہ کی بات کی تردید بھی ہوتی۔

ایک اور جگہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خوارج کے خلاف قتال اور صفین میں آپ کے قتال کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"فقتال علي للخوارج ثابت بالنصوص الصريحة عن النبي صلى الله عليه وسلم باتفاق المسلمين وأما القتال يوم صفين ونحوه فلم يتفق عليه الصحابة؛ بل صدّ عنه أكابر الصحابة؛ مثل سعد بن أبي وقاص ومحمد بن مسلمة وأسامة بن زيد وعبد الله بن عمر وغيرهم. ولم يكن بعد علي بن أبي طالب في العسكرين مثل سعد بن أبي وقاص. والأحاديث الصحيحة عن النبي صلى الله عليه وسلم

تقتضي أنه كان يجب الإصلاح بين تينك الطائفتين؛ لا الاقتتال بينهما كما ثبت عنه في صحيح البخاري أنه خطب الناس والجيش معه فقال: إن ابني هذا سيد وسيصلح الله به بين طائفتين عظيمتين من المؤمنين. فأصلح الله بالحسن بين أهل العراق وأهل الشام: فجعل النبي صلى الله عليه وسلم الإصلاح به من فضائل الحسن مع أن الحسن نزل عن الأمر وسلم الأمر إلى معاوية. فلو كان القتال هو المأمور به دون ترك الخلافة ومصالحة معاوية لم يمدحه النبي صلى الله عليه وسلم على ترك ما أمر به وفعل ما لم يؤمر به ولا مدحه على ترك الأولى وفعل الأدنى. فعلم أن الذي فعله الحسن هو الذي كان يحبه الله ورسوله؛ لا القتال وقد ثبت في الصحيح أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يضعه وأسامة على فخذيه ويقول: اللهم إني أحبهما فأحبهما وأحب من يحبهما. وقد ظهر أثر محبة رسول الله صلى الله عليه وسلم لهما بكراهتهما القتال في الفتنة؛ فإن أسامة امتنع عن القتال مع واحدة من الطائفتين وكذلك الحسن كان دائما يشير على علي بأنه لا يقاتل ولما صار الأمر إليه فعل ما كان يشير به على أبيه. رضي الله عنهم أجمعين".

مفہوم : علی رضی اللہ عنہ کا خوارج سے قتال کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صریح نصوص سے باتفاق امت ثابت ہے، لیکن جہاں تک علی رضی اللہ عنہ کا صفین وغیرہ کے دن قتال کا معاملہ ہے تو اس پر صحابہ متفق نہ ہوئے بلکہ اکابر صحابہ نے اس سے اجتناب ہی کیا، جیسے سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ، اسامہ بن زید، عبداللہ بن عمر وغیرہم رضی اللہ عنہم، اور دونوں لشکروں (اہل عراق واہل شام) میں علی رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی بھی شخصیت ایسی نہ تھی جو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسی ہو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح

احادیث کا تقاضا یہ تھا کہ ان دونوں گروہوں (اہل عراق اور اہل شام) کے مابین صلح واجب تھی نہ کہ قتال۔ جیسا کہ نبی ﷺ سے صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے لشکر کے سامنے خطبہ دیا اور کہا: میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالی مؤمنین کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالی نے حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اہل عراق اور اہل شام کے مابین صلح کرائی۔

یہاں اللہ کے نبی ﷺ نے صلح حسن رضی اللہ عنہ کو ان کے فضائل میں شمار کیا ہے حالانکہ وہ خلافت سے دست بردار ہو گئے تھے اور اسے معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تھا، تو اگر شریعت کا حکم یہ ہوتا کہ ترک خلافت اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کے بجائے ان سے قتال ہی کیا جائے تو اللہ کے نبی ﷺ حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس حکم کے ترک پر اور جس کا حکم نہیں تھا اس کی انجام دہی پر کبھی بھی حسن رضی اللہ عنہ کی تعریف نہ فرماتے، اور نہ ہی ادنیٰ کے بجائے اولیٰ کے ترک پر ان کی مدح فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسن رضی اللہ عنہ نے جو کیا وہی اللہ اور اس کے رسول کو پسند تھا نہ کہ قتال۔ اور صحیح بخاری کی حدیث میں ثابت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ حسن اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اپنی ران پر بٹھاتے اور کہتے: اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے محبت کر اور جو ان دونوں سے محبت کرے ان سے بھی محبت کر۔ اور ان دونوں سے اللہ کے نبی ﷺ کی محبت کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ ان دونوں نے فتنہ کے وقت قتال کو ناپسند کیا، چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے دونوں لڑائیوں (جمل وصفین) میں کسی کے ساتھ مل کر بھی قتال نہیں کیا، اسی طرح حسن رضی اللہ عنہ بھی ہمیشہ اپنے والد علی رضی اللہ عنہ کو ترک قتال کا مشورہ دیتے رہے یہاں تک کہ جب ان کے ہاتھ میں معاملہ آیا تو انہوں نے وہی کام کیا جس کا مشورہ وہ اپنے والد کو دیتے آئے تھے رضی اللہ عنہم اجمعین"۔

(مجموع الفتاویٰ، ج28ص549و 550، المدینة المنورة)

تو اگر یہ جنگیں واجب یا مستحب ہوتیں تو پھر کئی اکابر صحابہ کرام یہ جنگیں رکوانے کے لئے کوششیں کیوں کرتے رہے؟ اور خود دونوں مدمقابل فریق جنگ بندی کر کے تحکیم پر کیوں راضی ہوئے؟ جبکہ اس

بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی تھی یا اپنے موقف سے پیچھے ہٹ گئے تھے، لہٰذا حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات بالکل درست اور واقعی ہے کہ قتال فتنہ سے الگ رہنا ہی بہتر تھا۔

خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ان جنگوں پر افسوس کرنا منقول ہے، مثلاً جنگ جمل کے بعد آپ نے اپنے بیٹے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا :

"يَا حَسَنُ، يَا حَسَنُ، لَيْتَ أَبَاكَ مَاتَ مُنْذُ عِشْرِينَ سَنَةً" وفی روایة "لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا الْيَوْمِ بِعِشْرِينَ سَنَةً" وفي رواية "لَوَدِدْتُ أَنِّي مِتُّ قَبْلَ هَذَا الْيَوْمِ بِعِشْرِينَ سَنَةً"۔ (کاش میں اس سے بیس سال پہلے اس دنیا سے چلا گیا ہوتا)۔

(السنة لأبي بكر الخلال، ج 2 ص 474، دار الراية، الرياض)
(مصنف ابن ابي شيبة ، ج 7 ص 545،مكتبة الرشيد ، الرياض)
(المطالب العالية، ج 18 ص 144،دار العاصمة، السعودية)
(المعجم الكبير للطبراني، ج 1ص 113،مكتبة ابن تيمية، القاهرة)
(إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، ج 8ص 17، الرياض)

امام ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی اس قول کی سند کو "حسن" اور "جید" لکھا ہے (مجمع الزوائد، جلد 9صفحه 150،القاهرة)۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے :

"قَالَ عَلِيٌّ يَوْمَ الْجَمَلِ:يَا حَسَنُ، يَا حَسَنُ، لَيْتَ أَبَاكَ مَاتَ مُنْذُ عِشْرِينَ سَنَةً. فَقَالَ لَهُ :يَا أَبَهْ قَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ هَذَا. قَالَ :يَا بُنَيَّ إِنِّي لَمْ أَرَ أَنَّ الْأَمْرَ يَبْلُغُ هَذَا"۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے جنگ جمل کے دن فرمایا :اے حسن! کاش تمہارا والد بیس سال پہلے فوت ہو گیا ہوتا، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: ابو جان! میں نے آپ کو پہلے ہی اس سے روکا تھا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا : مجھے اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ یہاں

تک پہنچے گا۔

(البداية والنهاية، ج 7ص418، وزارة الاوقاف قطر)

تو اگر زمانہ فتنہ میں جنگ نہ کرنے کی بنسبت، جنگ کرنا بہتر یا اچھا ہوتا تو خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اس پر افسوس نہ ہوتا۔

اسی طرح جنگ صفین میں جنگ بندی کے وقت جب دونوں فریق تحکیم پر راضی ہو گئے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف سے حَکَم مقرر کیا تو فرمایا:

"اذهب يا ابا موسى فاحكم ولو خرّ عُنُقي"۔

اے ابوموسیٰ! جاؤ کوئی فیصلہ کرو، اگرچہ میری گردن نیچے ہو جائے۔

(المصنف لابن ابی شيبة، ج 7ص 548، مكتبة الرشيد ، الرياض)

اور قاضی امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بواسطہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ الفاظ روایت کیے ہیں:

"خلصني منها ولو بعرق رقبتي"۔ میری اس معاملہ سے جان چھڑائیں اگرچہ میری گردن کی رگ کٹ جائے۔

(كتاب الآثار للقاضی ابي يوسف، ص 208، دار الكتب العلمية بيروت)

غور طلب بات یہ ہے کہ اگر جمل و صفین کا یہ قتال اور جنگیں واجب یا مستحب تھیں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان پر افسوس کا اظہار کیوں فرمایا؟ نیز انہوں نے جنگ بندی اور مصالحت کیوں قبول فرمائی تھی؟ اور تحکیم پر راضی کیوں ہوئے؟

نیز لعل شاہ صاحب یا تو یہ ثابت کرتے کہ جنگ صفین کی ابتداء حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کی تھی یا لشکر کشی اہل شام کی طرف سے ہوئی تھی تاکہ حافظ ابن تیمیہ کی یہ بات غلط ثابت ہوتی کہ "حضرت معاویہ نے جنگ کی ابتداء نہیں کی تھی"، لیکن اس پر لعل شاہ صاحب نے کچھ نہیں لکھا، حافظ ابن تیمیہ کی عبارت یوں ہے "وَلَمْ يَكُنْ مُعَاوِيَةُ مِمَّنْ يَخْتَارُ الْحَرْبَ ابْتِدَاءً، بَلْ كَانَ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ حِرْصًا عَلَى أَنْ لَا يَكُونَ قِتَالٌ" (اس کا ترجمہ پہلے ہو چکا)۔

لعل شاہ صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ :

" مجھے امام صاحب (یعنی حافظ ابن تیمیہ۔ناقل) کے یہ اقوال متضاد معلوم ہوتے ہیں" ۔

(اختلاف یزید، صفحہ 171)

تو اس پر عرض ہے کہ جب حافظ ابن تیمیہ مختلف اقوال ہی ذکر کر رہے ہیں تو مختلف اقوال آپس میں مختلف ہی ہوتے ہیں، ہاں اگر ایک ہی قول کے مقدم وتالی میں اختلاف ہوتا تو وہ اختلاف کہلاتا ہے۔

پھر حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی اس بات کے حق میں کہ جنگ سے بچنا زیادہ بہتر تھا، متعدد احادیث ذکر کی ہیں جن کا لعل شاہ صاحب نے ذکر تک نہیں کیا بس صرف ایک اس حدیث کو پکڑ لیا جس سے حافظ ابن تیمیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ جنگ کرنے والے دونوں فریقوں میں سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ حق سے زیادہ قریب تھے، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تفصیلی عبارت یہ ہے :

"وَفِي الصَّحِيحِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ :"إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ، وَإِنَّ اللَّهَ سَيُصْلِحُ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ" فَأَصْلَحَ اللَّهُ بِهِ بَيْنَ أَصْحَابِ عَلِيٍّ وَأَصْحَابِ مُعَاوِيَةَ. فَمَدَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ بِالْإِصْلَاحِ بَيْنَهُمَا، وَسَمَّاهُمَا مُؤْمِنِينَ۔ وَهَذَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ الْإِصْلَاحَ بَيْنَهُمَا هُوَ الْمَحْمُودُ، وَلَوْ كَانَ الْقِتَالُ وَاجِبًا أَوْ مُسْتَحَبًّا، لَمْ يَكُنْ تَرْكُهُ مَحْمُودًا۔وَقَدْ رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ:"سَتَكُونُ فِتْنَةٌ الْقَاعِدُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ، وَالْقَائِمُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِي، وَالْمَاشِي فِيهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِي، مَنْ يَسْتَشْرِفُ لَهَا تَسْتَشْرِفُهُ، وَمَنْ وَجَدَ فِيهَا مَلْجَأً فَلْيَعُذْ بِهِ" أَخْرَجَاهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ۔ وَفِي الصَّحِيحَيْنِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ۔ وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: إِنِّي لَأَرَى

الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوتِكُمْ كَمَوَاقِعِ الْقَطْرِ۔وَالَّذِينَ رَوَوْا أَحَادِيثَ الْقُعُودِ فِي الْفِتْنَةِ وَالتَّحْذِيرِ مِنْهَا، كَسَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، وَمُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ لَمْ يُقَاتِلُوا لَا مَعَ عَلِيٍّ وَلَا مَعَ مُعَاوِيَةَ.وَقَالَ حُذَيْفَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ:مَا أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ تُدْرِكُهُ الْفِتْنَةُ إِلَّا أَنَا أَخَافُهَا عَلَيْهِ إِلَّا مُحَمَّدَ بْنَ مَسْلَمَةَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَهُ :لَا تَضُرُّكَ الْفِتْنَةُ۔

(منهاج السنة، ج4ص447)

اس طویل عبارت کا اردو میں خلاصہ یہ ہے کہ:

”صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے (حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں) فرمایا: میرا یہ بیٹا سردار ہے اللہ تعالی اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا، پس اللہ تعالی نے ان کے ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کے ساتھیوں میں صلح کروادی، تو نبی کریم ﷺ نے اس مصالحت کروانے پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدح وتوصیف فرمائی اور دونوں جماعتوں کو مومن بھی فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ قابل ستائش فعل دونوں جماعتوں کے درمیان صلح کروانا تھا (نہ کہ جنگ کرنا) کیونکہ اگر جنگ و قتال واجب یا مستحب ہوتا تو اس کو ترک کرنے اور صلح کی تعریف نہ کی جاتی۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک فتنہ بپا ہوگا اس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے اور کھڑے ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا جو اس فتنہ کے دوران کوئی پناہ گاہ پائے تو اس میں پناہ لے لے (یعنی الگ رہے)، اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: عن قریب مومن کا سب سے بہتر مال بکریاں ہوگا جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش والی جگہوں پر چلا جائے گا اور اس طرح اپنے دین کو فتنوں کی زد سے بچالے گا، جن صحابہ نے فتنہ سے احتراز واجتناب اور بچنے کی احادیث روایت کی ہیں مثلاً سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ اور اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہم) انہوں نے جنگ میں سیدنا علی

وسیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہما) میں سے کسی کا ساتھ نہیں دیا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ تمام لوگ جنہیں فتنہ کا سامنا ہو مجھے ان سب کے بارے میں خوف ہے کہ وہ اس کا شکار نہ ہو جائیں لیکن محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں مجھے کوئی خوف نہیں کیونکہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : تمہیں فتنہ کوئی نقصان نہ پہنچائے گا۔

لعل شاہ صاحب کی کاریگری دیکھیں کہ ان احادیث کا ذکر نہیں کیا اور جس حدیث کو لے کر بیٹھ گئے اس میں بھی" اولیٰ بالحق" کا مفہوم" اقرب الی الحق" بتا کر اس کے مقابلہ میں" ابعد عن الحق" کو لا رہے ہیں اور "حق و ناحق" کی بحث چھیڑ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ:

"اس لئے کہ جب قتال میں صواب نہیں تھا، صواب ترک قتال ہے جس کے نتیجہ میں وہ اصحاب برحق تھے جنہوں نے قتال میں حصہ نہیں لیا اور وہ حق پر نہ تھے جنہوں نے قتال میں حصہ لیا تو اس قضیہ کا تقاضا یہ ہے کہ جو فریق حق پر نہ تھے (یعنی حضرت معاویہ وحضرت علی) کیونکہ انہوں نے قتال میں حصہ لیا ان میں سے جو فریق قتال کو ناپسند کرتا تھا وہ اقرب الی الحق ہوتا اور جو قتال پر شدید ترین حریص تھا وہ ابعد عن الحق ہوتا وذلك ظاهر، لیکن حضرت امام نے اس کے برخلاف تیسرے قول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اولیٰ بالحق ہونے کی تصریح کی ہے"۔

(حوالہ پہلے نقل ہوا)

تو کیا" اقرب الی الحق" کی ضد" ابعد عن الحق" ہے؟ یعنی اگر کہا جائے کہ دو فریقوں میں سے ایک فریق حق سے زیادہ قریب ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرا فریق حق سے دُور ترین ہے؟ یا یہ مطلب ہوگا کہ ایک حق سے زیادہ قریب ہے اور دوسرا ذرا کم قریب ہے لیکن ہیں دونوں حق کے قریب؟

یہ جنگیں کوئی فقہی مسائل نہ تھے کہ ان میں حق و ناحق اور خطا وصواب کی بحثیں چھیڑ لی جاتیں بلکہ یہ تو " قتالِ فتنہ" تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو" فتنہ" سے ہی تعبیر فرمایا تھا، اور ان فتنوں کی خبر پہلے سے دے کر اُمت کو جہاں تک ممکن ہو ان سے اپنے آپ کو بچانے کی ہدایت کی تھی، کتب حدیث میں" کتاب الفتن" میں ایسی احادیث دیکھی جاسکتی ہیں، امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی" ازالۃ الخفاء" میں اس پر

تفصیلی بحث کی ہے، چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں :

"باز آنحضرت ﷺ برائے قُعود از اں فتنہ فرمودند و دریں باب تاکید تمام نمودند و فرمودند کہ شمشیرہا را دراں فتنہ بشکنید وزِہ کمانہا قطع کنید ..... الخ"۔

یعنی آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو اس فتنہ سے بیٹھ رہنے کا حکم دیا اور اس باب میں تاکید تمام کی اور یہ ارشاد فرمایا کہ اس فتنہ میں اپنی تلواریں توڑ ڈالنا اور کمانوں کے چلّے کاٹ دینا۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، ج1 ص 488، قدیمی کتب خانہ کراچی)

اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بارے میں متعدد احادیث نبویہ نقل کی ہیں۔ اور ایک جگہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ :

"باقی ماند مسئلہ در غایت غموض کہ قدم اکثرے دراں لغزیدہ است واں آنست کہ متخلفین از نصرت حضرت مرتضیٰ مجتہد مصیب بودند یا مجتہد مخطی معذور، وآنچہ در پیش بندہ محقق شدہ است آں است کہ متخلفان آخذ بعزیمت بودند ومتمسک بصریح احایث صریحہ متواترۃ المعنی..... الخ"۔

باقی رہا ایک مسئلہ جو نہایت دقیق ہے اور اس مسئلہ میں اکثر لوگوں کے قدم لغزش کھا گئے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کی مدد سے تخلف کرنے والے (یعنی زمانہ فتنہ کی جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل نہ ہونے والے) مجتہد مصیب تھے یا مجتہد مخطی اور معذور تھے؟ بندہ کے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ تخلف کرنے والے (یعنی ان جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دینے والے) عزیمت پر کاربند تھے اور صریح احادیث سے جو صحیح اور متواتر المعنی ہیں دلیل پکڑے ہوئے تھے"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، ج4 ص 526و527)

یہاں آگے پھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی احادیث نقل فرمائیں ہیں۔

اسی طرح مثلاً امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ عُديسه بنت اهبان صيفي غفاری سے روایت کیا ہے کہ :

"آپ فرماتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے والد کے پاس آئے اور ان کو دعوت دی کہ جنگ کے لئے ان کے ساتھ چلیں، میرے والد نے ان سے کہا کہ آپ کے چچا کے بیٹے اور میرے خلیل (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے واضح طور پر فرمایا تھا کہ جب لوگوں (یعنی مسلمانوں میں) اختلاف ہو جائے تو میں اپنی تلوار لکڑی کی بنالوں تو میں نے اسے بنالیا ہے تو اگر آپ چاہیں تو میں (وہ لکڑی کی تلوار لے کر) آپ کے ساتھ نکلوں، (عُدیسہ کہتی ہیں) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میرے والد کو رہنے دیا"۔

(سنن الترمذي، ، بَابُ مَا جَاءَ فِي اتِّخَاذِ سَيْفٍ مِنْ خَشَبٍ فِي الفِتنة)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے :

"وَكَانَ عَلِيٌّ لَمَّا عَزَمَ عَلَى قِتَالِ أَهْلِ الشَّامِ قَدْ نَدَبَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ إِلَى الْخُرُوجِ مَعَهُ، فَأَبَوْا عَلَيْهِ، وَطَلَبَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَحَرَّضَهُ عَلَى الْخُرُوجِ مَعَهُ، فَقَالَ :إِنَّمَا أَنَا رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ، فَإِنْ خَرَجُوا خَرَجْتُ، وَعَلَيَّ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ، وَلَكِنْ لَا أَخْرُجُ لِلْقِتَالِ فِي هَذَا الْعَامِ. ثُمَّ تَجَهَّزَ ابْنُ عُمَرَ وَخَرَجَ إِلَى مَكَّةَ.."۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل شام کے ساتھ جنگ کا ارادہ فرمایا تو مدینہ والوں کو اپنے ساتھ نکلنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کر دیا، آپ نے حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) پر اپنے ساتھ نکلنے کے لئے زور دیا تو انہوں نے کہا: میں اہل مدینہ میں سے ایک فرد ہوں پس اگر وہ نکلیں گے تو میں بھی بسر و چشم نکلوں گا، لیکن میں اس سال جنگ کے لئے نہیں نکلوں گا پھر حضرت عبداللہ بن عمر نے تیاری کی اور مکہ کی طرف نکل گئے۔

(البداية والنهاية،ج7ص405، وزارة الاوقاف قطر)

اسی طرح جب حضرت عمار اور حضرت حسن (رضی اللہ عنہما) کوفہ گئے فضا ہموار کرنے کے لئے تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ لوگوں کو جانے سے منع فرماتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتے کہ یہ فتنہ ہے اور فتنہ میں گھر

بیٹھے رہنے کا حکم ہے، اس پر حضرت عمارؓ غصے بھی ہوئے اور حضرت اشعریؓ کو سخت سست باتیں کیں "فغَضِبَ عمّارٌ وسبّه"۔

(البداية والنهاية، ج7ص412، وزارة الاوقاف قطر)

"اولی الطائفتين بالحق" کا مفہوم و مطلب کیا ہے؟

لعل شاہ صاحب نے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے :

"شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کا مدار اس روایت کے لفظ (اولى الطائفتين بالحق) پر ہے یہ صیغہ اسم تفضیل کا ہے مطلب یہ ہوا کہ دونوں حق پر نہ تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ حق کے زیادہ قریب تھے اور معاویہ رضی اللہ عنہ بھی قریب تھے مگر اقرب الی الحق حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، لیکن (اولیٰ بالحق) کا معنے از روئے محاورہ عرب برحق کے بھی آتے ہیں (هو اولى بكذا) أي أحق. المنجد صفحہ 1021"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 171)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے چند اور حوالے دیے ہیں اور پھر لکھا ہے :

"یہی حال (اولى الطائفتين بالحق) کا ہے حق پر ثابت علیٰ وجہ الکمال حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے"

۔

(استخلاف یزید، صفحہ 172)

اور پھر اگلے صفحہ پر ساری بحث کا خلاصہ یوں پیش کیا ہے:

"مندرجہ بالا ضابطہ کے تحت روایت بخاری کی رُو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین، سارے صحابہ کی نسبت سے زیادہ ("یہ" زیادہ" کی قید کا کیا مطلب؟۔ ناقل) حق پر مستقیم تھے اور بالمقابل صحابہ حق پر نہ تھے اگرچہ تمام صحابہ نے حق کا ہی قصد کیا تھا، تعجب ہے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے انہوں نے یہ مسلک کیسے اختیار کیا ہے اور اس سے زیادہ قابل تعجب ان کا

اس روایت سے استدلال کرنا ہے، اگر خوارج سے قتال کرنا قابل ستائش عمل ہے اور یقیناً ہے کیونکہ آنحضور (ﷺ) نے فرمایا ہے اگر میں خود ہوتا تو لاقاتلنهم قتل عادٍ وثمود.... تو جن لوگوں نے خوارج سے قتال نہ کیا وہ برحق کیسے ہو گئے؟ اور جس نے خوارج سے قتال کیا اور شارع علیہ السلام کے منشا کو پورا کیا کیوں حق پر نہ ہوں؟"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 173و174)

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حدیث میں جو" اولی الطائفتين بالحق" کے الفاظ ہیں ان میں" اولی" اگرچہ اسم تفضیل ہے لیکن اس حدیث میں اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق کے زیادہ قریب تھے اور ان کے مدمقابل صحابہ بھی حق کے دائرے میں ہی تھے، بلکہ یہاں اس کا یہ مفہوم ہے کہ حق پر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی تھے اور بالمقابل صحابہ کرام حق پر نہ تھے۔

لعل شاہ صاحب تعجب کا اظہار تو حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ پر کر رہے ہیں لیکن ہمیں خود لعل شاہ صاحب پر حیرت ہے کہ انہوں نے سب سے پہلا حوالہ لغت کی کتاب" المنجد" سے پیش کیا اور خود" اولی بکذا" کا مفہوم" أحق" نقل کیا، یہ" أحق" بھی تو اسم تفضیل ہے، اس کا معنیٰ" برحق" کہاں سے ہو گیا؟ بلکہ" زیادہ حقدار" ہو گا۔

پھر دوسری حیرت یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے" یہی حال (اولی الطائفتين بالحق) کا ہے حق پر ثابت علیٰ وجہ الکمال حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے" (حوالہ اوپر گذرا) تو یہ" علیٰ وجہ الکمال" کس لفظ کا ترجمہ یا مفہوم ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ حق پر تو دونوں فریق تھے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ" علیٰ وجہ الکمال" تھے؟ (اس پر تفصیلی کلام آگے آ رہا ہے)۔

اور تیسری حیرت یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے جو لکھا ہے:

" تو جن لوگوں نے خوارج سے قتال نہ کیا وہ برحق کیسے ہو گئے؟ اور جس نے خوارج سے قتال کیا اور شارع علیہ السلام کے منشا کو پورا کیا کیوں حق پر نہ ہوں"۔

اس کا کیا مطلب ہے؟ خوارج سے قتال نہ کرنا اگر اس قتال کو ناجائز سمجھنے کی وجہ سے ہوتا تو تب تقابل، حق و ناحق کا ہو سکتا تھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ و دیگر عمال و امراء نے بھی

خوارج سے جنگیں کی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قتال کے جواز پر سب متفق تھے، عملاً سب کا شریک ہونا ضروری نہ تھا،لیکن حافظ ابن تیمیہ تو یہاں صحابہ کے آپس میں قتال کی بات کر رہے ہیں نہ کہ قتال بالخوارج کی، وہ اقدام تو حضرت علی ﷛ کا بالکل ٹھیک تھا اور عقیدۃً سب صحابہ اس مسئلہ میں ان کے ساتھ تھے عملاً اگر بعض صحابہ کسی وجہ سے ان کے ساتھ شامل نہ ہو سکے تو پھر آنحضرت ﷺ نے خوارج کے متعلق تو یہ بھی فرمایا ہے کہ : يَقْتُلُونَ أَهْلَ الْإِسْلَامِ ، وَيَدَعُونَ أَهْلَ الْأَوْثَانِ... وہ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑیں گے (صحیح مسلم :باب ذکر الخوارج وصفاتهم، حدیث نمبر 2451) اور خوارج نے قتال حضرت علی ﷛ سے کیا تو گویا وہ تو ہوئے اہل اسلام اور باقی صحابہ جن سے خوارج نے قتال نہیں کیا وہ معاذ اللہ ہوئے اہل اوثان؟ لعل شاہ صاحب اور ان کے متبعین خدا جانے یہاں کیا منطق جھاڑیں گے؟

پھر لعل شاہ صاحب بخاری نے یہاں چار عدد قرآنی آیات سے بھی استدلال کیا ہے کہ دیکھو مثلاً "فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ" (سورۃ الانعام) میں "احق" اسم تفضیل ہے لیکن اس سے مراد یہاں مطلقاً امن کا حقدار ہے کیونکہ مشرک تو بالکل امن کا حقدار ہے ہی نہیں، اسی طرح "أولئك شر مكانا وأضل عن سواء السبيل" (سورۃ المائدۃ) میں "أضل" اسم تفضیل ہے لیکن یہ مطلق زیادتی کے لئے استعمال ہوا ہے یہاں مومنین کی نسبت زیادتی مقصود نہیں کیونکہ مومنین میں تو اصلاً شرارت اور ضلالت ہے ہی نہیں، اسی طرح "يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ" (سورۃ المنافقون) میں "أعزّ" اور "أذلّ" دونوں اسم تفضیل ہیں لیکن یہ فی ذاتہ زیادتی عزت اور زیادتی ذلت کے لئے استعمال ہوئے ہیں، نیز "فتبارك الله أحسن الخالقين" (سورۃ المؤمنون) میں "أحسن" کا صیغہ ہے لیکن یہاں یہ مراد نہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور خالق بھی ہے اور اللہ اس دوسرے خالق کی نسبت زیادہ اچھا خالق ہے۔ (ملخصاً :استخلاف یزید، صفحہ 172و173)۔

اس سے لعل شاہ صاحب یہ نتیجہ نکال رہے ہیں کہ "اولیٰ بالحق" میں بھی اگرچہ اسم تفضیل ہے لیکن اس سے مراد حضرت علی ﷛ کا مطلق حق پر ہونا اور بالمقابل صحابہ کرام کا حق پر نہ ہونا ہی ہے۔

تو اس پر عرض ہے کہ ان آیات میں تو ایسے قرائن وشواہد و دیگر ایسے دلائل موجود ہیں جو بتلاتے ہیں کہ یہاں اضافی زیادتی مراد نہیں بلکہ نفس زیادتی مراد ہے لیکن زیر بحث صحیح بخاری کی حدیث میں ایسا کون سا قرینہ موجود ہے؟ اسم تفضیل کا اکثر معنی تو اضافی زیادتی ہی ہے، نفس زیادتی کے معنی میں وہ کم استعمال ہوتا ہے، لہٰذا اس کے لئے قرینہ چاہیے اور بخاری کی اس حدیث میں کوئی ایسا قرینہ نہیں بلکہ صحابہ سے متعلق دیگر نصوص اس کی نفی کرتی ہیں پھر جبکہ جانبین کو مجتہد بھی مانا جا رہا ہے تو وحی کا دروازہ بند ہونے کے بعد اب مجتہدین میں سے کسی کو باطل وغیرہ پر کہنا خود اصول اہل السنہ کے خلاف ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ لعل شاہ صاحب خاص طور پر اور دورِ حاضر کے متأثرین سبائیت عام طور پر، حضرت علیؓ کی "الحق" سے "اقربیت" کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کا "الحق" سے صرف "قریب" ہونا بھی برداشت نہیں کرتے بلکہ ان کو "باطل" پر کھڑا ہوا ہی دکھانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، اس لئے وہ اس لفظ "اَولیٰ" میں ایسی منطق جھاڑتے ہیں کہ "یہ اسم تفضیل تو ہے مگر اس کا معنیٰ حق پر علیٰ وجہ الکمال ثابت ہونا ہے"، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ سے متعلق یہاں مزید چند سطور لکھ دی جائیں۔

یہ لفظ "اَولیٰ" اسم تفضیل ہے، اور اسم تفضیل کا استعمال اگر اضافت کے ساتھ ہو تو پھر اس کے دو معنیٰ آتے ہیں :

نمبر :1...... اضافی زیادتی، یعنی ما اضیف الیہ کے اعتبار سے زیادتی۔

نمبر:2...... مطلق زیادتی۔

ان دونوں میں پہلا معنیٰ اکثری ہے، اور "اولی الطائفتین" میں پہلا معنیٰ بلا تکلف ہو سکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ بھی حق کے قریب تھے مگر حضرت علیؓ اقرب (زیادہ قریب) تھے، لیکن اس سے چونکہ حضرت معاویہؓ کا بھی حق کے قریب ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے دورِ حاضر کے "سبائیت گزیدہ" یہاں دوسرا معنیٰ ہی کرنے پر زور دیتے ہیں تا کہ حضرت معاویہؓ کو باطل پر ہی ثابت کیا جائے، ان کے نزدیک "اولی الطائفتین بالحق" کا معنیٰ یہ ہے کہ "حق پر ثابت علی وجہ الکمال حضرت علیؓ تھے" (استخلافِ یزید، ص 172) اور "بالمقابل صحابہؓ حق پر نہ تھے" (استخلافِ یزید، ص 173) غور فرمانا چاہیئے کہ لعل شاہ صاحب نے حضرت علیؓ

کے حق پر ثابت ہونے میں تو علیٰ وجہ الکمال کی قید لگائی لیکن بالمقابل صحابہ کرام کے ساتھ نہ لگائی، حالانکہ اگر وہاں علی وجہ الکمال حق تھا تو یہاں نفی بھی تو نفس حق کی نہیں بلکہ علی وجہ الکمال حق کی ہونی چاہئے تھی۔

اصول تو یہ ہے کہ صحابہؓ کی عزت وحرمت کو بہر صورت ملحوظ رکھا جائے گا خواہ اس کے لئے صحیح حدیث میں بھی اور دُور دراز کی ہی تاویل کیوں نہ کرنی پڑے لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ یہاں اکثری معنیٰ کو چھوڑ کر غیر اکثریتی کو اختیار کیا جا رہا ہے صرف صحابہؓ کی ایک جماعت کو "غیر حق" پر ثابت کرنے کیلئے؟ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسی حدیث کے دوسرے الفاظ ان لوگوں کی اس ہرزہ سرائی کی تردید کرتے اور اسم تفضیل کے پہلے اور اکثریتی معنیٰ کی تائید کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

لعل شاہ صاحب کی یہ تاویل صرف وہاں چل سکتی ہے جہاں "اولیٰ" کا صلہ "ب" آیا ہے یعنی "اولیٰ بالحق" میں، اور "المنجد" کا جو حوالہ لعل شاہ صاحب نے دیا ہے وہ بھی اسی صلے کا ہے "اولیٰ بکذا" (استخلافِ یزید، ص 171)، لیکن اولیٰ کا صلہ صرف "ب" ہی حدیث میں نہیں مذکور بلکہ "اِلیٰ" اور "مِن" صلہ بھی مذکور ہے، اور یہاں وہ تاویل نہیں چل سکتی، ملاحظہ ہو :

1) "يَقْتُلُهُمْ أَدْنَى الطَّائِفَتَيْنِ إِلَى الْحَق" (صحيح مسلم، باب ذكر الخوارج وصفاتهم)

یہ "ادنیٰ" "دُنُوّ" کا اسم تفضیل ہے جس کا معنیٰ ہے "قریب ہونا" اس کا صلہ یہاں "اِلیٰ" آیا ہے، تو یہاں "ادنیٰ الی الحق" کا معنیٰ ہوگا "حق کی طرف زیادہ قریب" اس ترکیب میں "حق پر علی وجہ الکمال ثابت قدم ہونے" کا معنیٰ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ یہاں صلہ "ب" کی بجائے "اِلیٰ" ہے اور صیغہ "اولیٰ" کے بجائے "ادنیٰ" ہے۔

2) "يَقْتُلُهُمْ أَقْرَبُ الطَّائِفَتَيْنِ مِنَ الْحَق" (صحيح مسلم، باب ذكر الخوارج وصفاتهم) لیجئے! یہاں "اقرب" بھی آگیا اور "مِن" بھی، "اقرب" اسم تفضیل کا جو معنیٰ آپ کو چاہئے کر لیجئے، اضافی قرب یا مطلق قرب، بہر صورت "حق" سے مراد زیادہ قرب یا مطلق قرب ہی ثابت ہوگا، "حق علی وجہ الکمال ثابت ہونا" تو کسی صورت بھی یہاں معنیٰ نہیں ہو سکتا۔

3) "يَقْتُلُهُمْ أَقْرَبُ الطَّائِفَتَيْنِ إِلَى الْحَق" (مسند احمد، ج 18 ص 302 مؤسسة

الرسالۃ) یہاں ”اقرب“ ہے اور ”اِلیٰ“ بھی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنوا ان احادیث میں کیا گل افشانی کریں گے؟

پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ آنحضرت ﷺ نے ”الطائفتین“ میں فرقِ مراتب ”الحق“ کے عنوان سے بیان فرمایا ہے، باطل یا خطا کا ذکر تک نہیں فرمایا، جس سے یہ نکتہ پیدا کیا جاسکتا ہے کہ مشاجرات میں فریقین کا ذکر ”الحق“ کے حوالہ سے ہی کیا جانا زیادہ بہتر اور پسندیدۂ نبی کریمؐ ہے، یعنی کسی کو اگر ”اقرب الی الحق“ کہا جائے تو دوسرے کو خطا وغیرہ یا غیر حق پر کہنے کی بجائے ”قریب الی الحق“ کہا جائے، مثلاً جیسے ”قبل طلوع الشمس“ اور ”قبل غروب الشمس“ کی تعبیر سے فقہاء حنفیہ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ صبح کی نماز طلوعِ شمس کے قریب یعنی اِسفار میں اور عصر کی نماز غروبِ شمس کے قریب یعنی مثلِ ثالث میں ادا کرنا افضل ہے، کیونکہ دونوں نمازوں کے اوقات کی پہچان قبل طلوع الشمس اور قبل غروب الشمس سے کروائی گئی ہے۔

واضح رہے کہ یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے، دورِ حاضر کے ”متاثرین سبائیت“ کی حضرت معاویہؓ سے متعلق مخصوص ذہنیت کے پیشِ نظر عرض کیا گیا ہے، ورنہ ہم ان جیسی احادیث میں ایسی ہندی کی چندی کے قائل ہی نہیں، تمام صحابہؓ کی عزت و حرمت کے پیشِ نظر جس حدیث کا جو مناسب معنیٰ و مطلب بن سکتا ہو بنالینا چاہئے، جو لوگ آج سے سینکڑوں برس پہلے جنت میں ڈیرے لگا بیٹھے ہوں خواہ مخواہ کی بال کی کھال اتار کے ان کو مجرموں کی صف میں لاکھڑا کرنے کی کوشش کرنا ایک شیطانی حرکت ہی ہوسکتی ہے اور بقول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ، مرضِ قلب اور خبثِ باطن کی دلیل۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ حدیث من اولہ الی آخرہ ”خوارج“ سے متعلق ہے، جمل و صفین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، نہ یہاں صحابہؓ کے مابین حق و باطل کے فیصلے چکائے جارہے ہیں، جن احادیث میں جمل و صفین کا ذکر ہے یعنی احادیث الفتن، ان کا اندازِ بیان ہی کچھ اور ہے، وہاں کسی گروہ کے حق پر اور دوسرے کے ناحق پر ہونے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں، اور جہاں تھوڑا بہت ذکر ہے جیسے کہ یہاں ”اولی الطائفتین بالحق“ میں، تو وہاں صرف فضیلت کا بیان ہے نہ کہ حق و باطل کی معرکہ آرائی کا اور وہ بھی ضمناً لا اصالۃً۔

ایک اہم تنبیہ

یہاں بطور جملہ معترضہ ایک بات بیان کرتا جاؤں کہ احادیث میں "خوارج" کے متعلق "یمرقون من الاسلام"، "یمرقون من الدین"، "یمرقون من الحق"، "الخوارج کلاب النار" اور "قد کان ھؤلاء مسلمین فصاروا کفارا" اور "لا یجاوز ایمانھم حناجرھم" کے الفاظ بھی صراحۃً موجود ہیں (ان ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خوارج مسلمان نہیں بلکہ کافر ہیں) لیکن اس کے باوجود علماء اہل السنۃ کی ایک جماعت کے نزدیک خوارج، کافر اور خارج از اسلام نہیں ہیں وہ حضرات ان تمام الفاظ کی تاویل و توجیہ کرتے ہیں، امام نووی تو فرماتے ہیں کہ:

"الْمَذْهَبَ الصَّحِيحَ الْمُخْتَارَ الَّذِي قَالَهُ الْأَكْثَرُونَ وَالْمُحَقِّقُونَ أَنَّ الْخَوَارِجَ لَا يُكَفَّرُونَ".

صحیح اور مختار مذہب جس کے قائل اکثر علماء ور محققین ہیں یہ ہے کہ خوارج کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

(شرح صحيح مسلم للنووي، ج2ص50، دار احياء التراث العربي بيروت)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"وَمَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ وَجَمَاهِيرِ أَصْحَابِهِ الْعُلَمَاءِ أَنَّ الْخَوَارِجَ لَا يُكَفَّرُونَ".

امام شافعی اور ان کے جمہور اصحاب علماء کا مذہب یہ ہے کہ خوارج کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

(شرح صحيح مسلم للنووي، ج7ص160)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"وَأَنَّ الصَّحِيحَ عَدَمُ تَكْفِيرِهِم" ۔صحیح یہ ہے کہ وہ کافر نہیں۔

(شرح صحيح مسلم للنووي، ج 7ص 165)

حافظ ابن حجرؒ، خطابیؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

"وَقَالَ الْخَطَّابِيُّ أَجْمَعَ عُلَمَاءُ الْمُسْلِمِينَ عَلَى أَنَّ الْخَوَارِجَ مَعَ ضَلَالَتِهِمْ فِرْقَةٌ مِنْ فِرَقِ الْمُسْلِمِينَ"۔

خطابی نے کہا ہے کہ علماء مسلمین کا اس بات پر اجماع ہے کہ خوارج اپنی گمراہی کے باوجود مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ ہیں۔

(فتح الباري، ج 12ص 300، دار المعرفة بيروت)

اور ابن بطالؒ کا قول نقل کیا کہ:

"قَالَ بن بَطَّالٍ ذَهَبَ جُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ إِلَى أَنَّ الْخَوَارِجَ غَيْرُ خَارِجِينَ عَنْ جُمْلَةِ الْمُسْلِمِينَ"۔

ابن بطال نے کہا ہے کہ جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ خوارج مسلمانوں سے خارج نہیں۔

(فتح الباري، ج 12ص 300، دار المعرفة بيروت)

تو اگر ان صریح الفاظ کے ہوتے ہوئے ان میں دُور از کار تاویلات کر کے خوراج کو کفر سے بچایا جاسکتا ہے تو اسی حدیث میں موجود لفظ ”اولیٰ بالحق“ میں تاویل کر کے حضرت معاویہؓ کو باطل، ناحق، جور، بغاوت اور طغیان سے کیوں نہیں بچایا جاسکتا؟ جبکہ یہ لفظ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے باطل یا ناحق پر ہونے یا جَور اور بغاوت وغیرہ میں صریح بھی نہیں ہے، یہ باتیں اس سے بطور مفہوم مخالف کے ثابت کی جاتی ہیں جو کہ حنفیہ کے نزدیک خصوصاً غیر معتبر اور وجوہِ فاسدہ میں سے ہے، نیز اس ”الحق“ کی یہ تشریح یعنی ناحق و بغاوت وغیرہ سے کرنا کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ خالصۃً اس مفروضے پر مبنی ہے کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کچھ بھی ہوجائیں بس مخطی و باغی اور ناحق پر ہی ہیں، ناممکن ہے کہ حضرت علیؓ کی طرح وہ بھی مصیب ہوجائیں اور اس کا تو سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ اس معاملہ میں وہ تو مصیب ہوں اور حضرت علیؓ بالفرض مخطی ہوجائیں، بس اس مفروضے پر یہ ساری تشریحات مبنی ہیں اور مؤول حدیث سے استدلال جتنا کچھ وزنی ہوتا ہے وہ سبھی جانتے ہیں، لیکن یہاں اُلٹا یہ کھینچا تانی کی جاتی ہے اور ”اولیٰ بالحق“ کے بارے میں اس بات پر زور لگایا جاتا ہے کہ یہاں ”اسم تفضیل“ والا معنی نہیں اور یہ ثابت کرنے پر زور لگایا جاتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے

اجتہادی اختلاف کرنے والے صحابہ کرام کسی طرح بھی حق کے دائرے میں نہ رہ سکیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) اور" الفئۃ الباغیۃ"

سید لعل شاہ صاحب بخاری نے خوارج سے قتال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اس لئے کہ جن صحابہ نے قتال میں حصہ نہیں لیا تھا ان میں سے جن بعض صحابہ پر جب حقیقت منکشف ہوگئی تو انہوں نے ندامت کا اظہار کیا تھا مثلاً بروایت صحیحہ ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تأخر عن القتال مع علی پر تاسف کا اظہار فرمایا کرتے تھے ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :قال ابن عمر لم اجدني آسى على شيء الا اني لم اقاتل الفئة الباغية مع علي ۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کسی چیز کا افسوس نہیں مگر صرف ایک بات کا افسوس ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں باغی گروہ سے قتال نہ کرسکا.. "تطہیر الجنان ص 33، مجمع الزوائد ص 242 ج 7، اسد الغابۃ ص 229۔ اس روایت کے جملہ رواۃ ثقہ ہیں رجالہ رجال الصحیح" (یعنی اس کے راوی صحیح بخاری یا صحیح مسلم کے راوی ہیں۔ناقل) بحوالہ تطہیر الجنان و مجمع الزوائد ....."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 174)

(یہی روایت لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ 424 پر دوبارہ بھی ذکر کی ہے)

تبصرہ:

ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ یہاں قتال بالخوارج کے ذکر کے ساتھ یہ روایت پیش کر کے لعل شاہ صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں خوارج کے ساتھ قتال نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کیا (یعنی وہ الفئۃ الباغیۃ سے مراد خوارج لے رہے ہیں) یا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں جنگ نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کیا؟ لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے شروع میں بھی مؤرخ ابن خلدون کی ایک عبارت پر نقد کرتے

ہوئے یہی روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے:

”حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بے شک تخلف عن القتال کیا تھا مگر وہ آخر میں نادم تھے اور افسوس کیا کرتے تھے ان کا یہ قول نہایت قوی اور صحیح سند سے نقل کیا گیا ہے... “۔

(استخلاف یزید، صفحہ 70)

اسی طرح انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق روایات صحیحہ میں موجود ہے کہ آخر وقت میں فرمایا کرتے تھے کہ لم اجدني آسی علی شيء الا اني لم اقاتل الفئة الباغية مع علي کہ میں کسی چیز پر اپنے آپ کو متاسف نہیں پاتا مگر یہ کہ میں نے فئہ باغیہ کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں قتال نہیں کیا“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 541)

بہر حال لعل شاہ صاحب کے ذہن میں جو بھی ہو اس پر ہم بعد میں آتے ہیں پہلے ہم اس روایت کی اسنادی حیثیت پر بات کریں گے۔

لعل شاہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ ”حضرت ابن عمر سے تأخر عن القتال مع علی بروایت صحیحہ ثابت ہے اور نہایت قوی اور صحیح سند سے منقول ہے“، پھر انہوں نے جو روایت پیش کی ہے اس کے بارے میں صاحب مجمع الزوائد علامہ ہیثمی (م 807ھ) کا یہ قول پیش کیا کہ ”اس روایت کے سارے راوی ”صحیح“ کے راوی ہیں“۔

نیز لعل شاہ صاحب نے اپنی ایک دوسری کتاب ”اظہار حقیقت بر بصیرت افروز تبصرہ“ میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے:

”... یہ واقعہ روایات صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے.. طبرانی نے بہت سی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے، ایک سند کے تمام راوی ثقہ ہیں... “۔

(بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 62 طبع اول)

اور پھر اسی کتاب میں ایک جگہ آگے مولانا مودودی کا دفاع کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب اس قول پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے کچھ اس قسم کی باتیں لکھی ہیں کہ " یہ روایات دوسری کتب میں بھی مذکور ہیں اور اکابر امت نے ان پر اعتماد کیا ہے" اور پھر مزید کتابوں کے حوالے نقل کیے ہیں کہ فلاں فلاں کتاب میں بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں : بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 148 تا 157)۔

توسب سے پہلے عرض ہے کہ لعل شاہ صاحب نے یہاں تلبیس سے کام لیا ہے، یہ بات تو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے " باغی گروہ" کے خلاف قتال نہ کرسکنے پر افسوس کا اظہار کیا، لیکن اس سلسلے کی وہ روایات جس میں " مع علي" کی زیادتی ہے جو لعل شاہ صاحب نے طبرانی کے حوالے سے نقل کی ہے اور پھر اس سے یہ سمجھا جائے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا اصحاب جمل کے خلاف قتال نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کیا، یہ ہرگز صحیح نہیں، یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول میں " فئة باغية " سے مراد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا صحابہ و اہل شام یا ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا و سیدنا زبیر و سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہما اور اصحاب جمل کو متعین کرنا یہ کسی طرح درست نہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما " باغی گروہ" سے کون لوگ مراد لیتے تھے؟ یہ اس روایت میں تصریح نہیں، جبکہ لعل شاہ صاحب نے ان روایات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا جن میں تصریح ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کسے " فئہ باغیہ" فرمایا، ہم اس کا بیان آگے کریں گے، پہلے لعل شاہ صاحب کی نقل کردہ اس " مع علی " کی زیادتی والی روایت کی اسنادی حیثیت پر بات کرتے ہیں جسے صحیح ثابت کرنے کے لئے انہوں نے علامہ ہیثمی کا حوالہ بھی دیا ہے۔

اصول حدیث کا ادنیٰ سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ جب محدثین یا محققین کسی روایت کے بارے میں " اسناده صحيح" کہیں یا یوں کہیں کہ " اس کے تمام راوی ثقہ ہیں" تو اس کا لازماً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ حدیث یا روایت بھی " صحیح " ہے۔ یہ اصول حدیث سے نابلد کئی لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ " صحيح الاسناد" یا " رجاله رجال الصحيح" یا " رجاله ثقات" اور " صحيح" کا فرق بھی نہیں جانتے۔ محدثین کے نزدیک

"تمام راوی ثقہ ہونے" کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث بھی "صحیح" ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"لِأَنَّهُ لَا يَلْزَمُ مِنْ كَوْنِ رِجَالِهِ ثِقَاتٍ أَنْ يَكُونَ صَحِيحًا" یعنی روایت کے تمام راوی ثقہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ روایت بھی صحیح ہے۔

(التلخيص الحبير، ج3، ص48، دار الكتب العلمية بيروت)

اسی طرح علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں :

"وَقد يكون الْإِسْنَاد كُله ثِقَات وَيكون الحَدِيث مَوْضُوعا" کبھی کسی سند کے سارے راوی ثقہ ہوتے ہیں لیکن حدیث اس کے باوجود موضوع اور من گھڑت ہوتی ہے۔

(الموضوعات لابن الجوزي،ج1، ص99، المكتبة السلفية، المدينة المنورة)

بلکہ علامہ جمال الدین عبداللہ بن یوسف الزیلعی الحنفی (م762ھ) نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

"... وَكَمْ مِنْ حَدِيثٍ كَثُرَتْ رُوَاتُهُ وَتَعَدَّدَتْ طُرُقُهُ، وَهُوَ حَدِيثٌ ضَعِيفٌ؟...... بَلْ قَدْ لَا يَزِيدُ الْحَدِيثَ كَثْرَةُ الطُّرُقِ إلَّا ضَعْفًا ..."۔

کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے راوی کثیر تعداد میں ہوتے ہیں اور ان کے طُرُق (یعنی سندیں۔ناقل) بھی متعدد ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے .... بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی حدیث کی طُرُق اور اسناد کا زیادہ ہونا اس کے ضعف میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

(نصب الراية لاحاديث الهداية، ج1، ص360، دار القبلة جدة)

لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ کسی روایت کی جتنی سند ذکر کی گئی ہو وہ تمام راوی تو ثقہ ہوں لیکن سند میں انقطاع ہو، یا مثلاً کوئی راوی مدلس ہو اور وہ "عن" سے روایت کر رہا ہو یا کوئی اور علت پائی جائے، تو ایسی روایت باوجود اس کے کہ اس کی جو سند نقل کی گئی ہے اس کے تمام راوی ثقہ ہوں لیکن یہ روایت صحیح شمار نہ ہوگی۔

اب اس روایت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اصل میں لعل شاہ صاحب کے نقل

کردہ الفاظ کے ساتھ یہ روایت امام طبرانی کی "المعجم الکبیر" میں ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرنے والے راوی کا نام ہے "حبیب بن ابی ثابت" جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے "عن" کے ساتھ روایت کر رہے ہیں. (المعجم الکبیر للطبرانی، ج13ص145،روایت نمبر 13824)، اور "حبیب بن ابی ثابت" کا سماع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں، یہی وجہ ہے کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے :

"عَنْ حَبِيْبِ بنِ أَبِي ثَابِتٍ، أَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ: مَا آسَى عَلَى شَيْءٍ فَاتَنِي إِلَّا أَنِّي لَمْ أُقَاتِلْ مَعَ عَلِيٍّ الفِئَةَ البَاغِيَةَ. فَهَذَا مُنْقَطِعٌ"۔(یعنی یہ روایت "منقطع" ہے)۔

(سیر اعلام النبلاء،ج3ص231،مؤسسة الرسالة)

نیز اس روایت میں "حبیب بن ابی ثابت کوفی" نے "عن" کے ساتھ روایت کی ہے جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے حبیب بن ابی ثابت کو مدلسین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے:

"یکثر التدلیس" یہ کثرت سے تدلیس کرتے تھے۔

(طبقات المدلسین لابن حجر، ص12، مطبعة الحسینیة، مصر)

یاد رہے کہ حافظ ابن حجر نے مدلسین کے تیسرے طبقہ کے بارے میں لکھا ہے:

"من أكثر من التدليس فلم يحتج الائمة من أحاديثهم الا بما صرحوا فيه بالسماع" یعنی یہ بہت زیادہ تدلیس کرنے والے ہیں پس ائمہ فن نے ان کی صرف ان احادیث کو معتبر جانا ہے جن میں وہ ("عنعنه" کے بغیر) سماع کی صراحت کریں۔

(طبقات المدلسین، ص1)

پھر یہ بھی عرض ہے کہ امام ہیثمی نے اس روایت کے بارے میں ہرگز یہ نہیں لکھا کہ "یہ صحیح متصل ہے اور اس میں کوئی علت نہیں" اس روایت کے تمام راویوں کو "صحیح کے راوی" بتلانا (جس سے عام طور پر صحیح

بخاری یا صحیح مسلم کے راوی مراد لیے جاتے ہیں) یہ بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ حدیث "اصطلاحی صحیح" بھی ہے (جیسا کہ یہ روایت منقطع ہے)۔

لہٰذا، اوّلاً تو لعل شاہ صاحب کا اس روایت کو "صحیح" بتانا درست نہیں، یہ تو امام ہیثمی نے بھی نہیں لکھا کہ "یہ روایت صحیح ہے" بلکہ انہوں نے بھی صرف "رجال" یعنی راویوں کے بارے میں بتایا ہے۔

ثانیاً عجیب بات یہ ہے کہ خود لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے :

"کوشش کی ہے کہ مواد کتب احادیث سے فراہم کیا جائے اور التزام کیا ہے کہ زیادہ صحت مند مواد استخراج کیا جائے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 709)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں :

"پھر جو لوگ رواۃ سند کی تمیز سے بھی بے خبر ہوں وہ صحت وسقم کی تمیز کیسے کر سکتے ہیں؟..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

لیکن یہاں وہ کتنے دھڑلے سے بلا تحقیق اس روایت کو "صحیح" لکھ رہے ہیں۔

ثالثاً اگر بالفرض اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو قرین قیاس یہی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مراد اس "الفئة الباغية" سے خوارج ہیں اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں ان خوارج کے ساتھ قتال میں شریک نہ ہو سکنے پر افسوس کا اظہار فرما رہے ہیں، "استخلاف یزید" کے اس مقام پر لعل شاہ صاحب کی تحریر کے سیاق وسباق سے بھی یہی سمجھ آتا ہے کہ وہ بھی اس سے مراد "خوارج کے ساتھ قتال" لے رہے ہیں، لیکن اپنی دوسری کتاب "بصیرت افروز تبصرہ" میں انہوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مراد "باغی گروہ" سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وران کے ساتھی ہیں اس پر انہوں نے مفسر محمود شہاب الدین آلوسی (م 1270ھ) کی تفسیر روح المعانی کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں علامہ آلوسی نے اپنی رائے لکھی ہے کہ حضرت ابن

عمر رضی اللہ عنہما کی اس سے مراد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کا ساتھ دینے والے دوسرے باغی تھے (بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 149 و 150) جبکہ لعل شاہ صاحب کا یہ تاثر دوسری روایات سے غلط ثابت ہوتا ہے جن کا ذکر ہم آگے کریں گے، نیز حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول کے بارے میں ایک جگہ صراحت کے ساتھ یہ وضاحت کی ہے اور لکھا ہے :

"واتفقت الصحابة على قتال الخوارج، حتى إنّ ابن عمر مع امتناعه عن الدخول في فرقة، كسعد، وغيره من السابقين ولهذا لم يبايعوا لأحدٍ إلا في الجماعة قال عند الموت: ما آسى على شيء إلا على أني لم أقاتل الطائفة الباغية مع علي رضي الله عنه؛ يريد بذلك قتال الخوارج، وإلا فهو لم يبايع لا لعلي ولا غيره، ولم يبايع معاوية إلا بعد أن اجتمع الناس عليه فكيف يقاتل إحدى الطائفتين؟ وإنّما أراد المارقة التي قال فيها النبيّ صلى الله عليه وسلم :"تمرُق مارقة على حين فرقةٍ من الناس، يقتلهم أدنى الطائفتين إلى الحق" وهذا حدَّث به أبو سعيد، فلما بلغ ابن عمر قول النبي صلى الله عليه وسلم في الخوارج، وأمره بقتالهم، تحسّر على ترك قتالهم"۔

یعنی خوارج کے خلاف جنگ کرنے پر تمام صحابہ کا اتفاق تھا، یہاں تک کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما باوجود اس کے کہ وہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور دوسرے سابقون صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی طرح (زمانہ فتنہ میں) کسی گروہ کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے اسی لئے ان حضرات نے عام الجماعۃ سے پہلے (یعنی حضرت معاویہ و حضرت حسن رضی اللہ عنہما کی صلح سے پہلے) کسی فریق کی بیعت نہیں کی تھی، انہوں نے (یعنی عبداللہ ابن عمر نے) اپنی موت کے وقت فرمایا : مجھے اس بات کے سوا کسی چیز کا افسوس نہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں باغی گروہ سے قتال

نہ کر سکا، اس سے حضرت ابن عمر کی مراد خوارج کے ساتھ قتال تھا، ورنہ انہوں نے تو (زمانہ فتنہ میں) نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی اور نہ ہی کسی اور کی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی انہوں نے اس وقت کی جب تمام لوگ ان پر متفق ہو چکے تھے، تو وہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کیسے قتال کر سکتے تھے؟ لہٰذا ان کی مراد (ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کے ساتھ قتال نہ تھا) بلکہ ان کی مراد اس نکلنے والی جماعت سے قتال تھا جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: ایک گروہ اس وقت نکلے گا جب لوگوں میں اختلاف ہوگا انہیں وہ جماعت قتل کرے گی جو حق کی طرف زیادہ قریب ہوگی، یہ بات حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی، پس جب حضرت ابن عمر کو خوارج کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پہنچا تو انہوں نے ان کے خلاف قتال نہ کرنے پر افسوس کا اظہار فرمایا۔

(كتاب النبوات لابن تيمية، ج1ص566، مكتبة اضواء السلف الرياض)

اور امام ابوبکر البیہقی (م 458ھ) نے اپنی مکمل صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے حمزہ بن عبداللہ بن عمر کے واسطے سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"مَا وَجدْتُ فِي نَفْسِي مِنْ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ هَذِهِ الْأُمَّةِ مَا وَجدْتُ فِي نَفْسِي أَنِّي لَمْ أُقَاتِلْ هَذِهِ الْفِئَةَ الْبَاغِيَةَ كَمَا أَمَرَنِي اللهُ عَزَّ وَجَلَّ. زَادَ الْقَطَّانُ فِي رِوَايَتِهِ :قَالَ حَمْزَةُ :فَقُلْنَا لَهُ :وَمَنْ تَرَى الْفِئَةَ الْبَاغِيَةَ؟ قَالَ ابْنُ عُمَرَ :ابْنُ الزُّبَيْرِ بَغَى عَلَى هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ .فَأَخْرَجَهُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ وَنَكَثَ عَهْدَهُمْ"۔

اس امت کے معاملات میں سے کسی معاملے میں مجھے اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا افسوس اس بات پر ہوا کہ میں نے اس باغی گروہ سے قتال کیوں نہ کیا جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے، (حسین بن الفضل) القطان نے اس میں یہ الفاظ زیادہ بیان کیے ہیں کہ حمزہ کہتے ہیں ہم نے پوچھا کہ

آپ کس کو باغی گروہ سمجھتے ہیں؟ تو حضرت ابن عمر نے فرمایا :ابن زبیر (رضی اللہ عنہ)، انہوں نے اس قوم کے خلاف بغاوت کی ہے، انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا اور ان کا عہد توڑ دیا.. "۔

(السنن الكبرى للبيهقى، ج 8ص 298، دار الكتب العلمية بيروت)

یہ روایت بالکل صحیح ہے اور اسی روایت کو امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے "تاریخ الاسلام" میں نقل کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مراد حجاج بن یوسف کی جماعت تھی، تو امام ذہبی نے اس کارڈ یوں فرمایا ہے :

"قُلْتُ: هَذَا ظَنٌّ مِنْ بَعْضِ الرُّوَاةِ، وَإِلا فَهُوَ قَدْ قَالَ: الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ ابْنُ الزُّبَيْرِ كَمَا تَقَدَّمَ "۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بعض راویوں کا اپنا گمان ہے ورنہ حضرت ابن عمر نے تو خود فرمادیا کہ باغی گروہ سے ان کی مراد حضرت ابن زبیر ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہوا)"۔

(تاريخ الاسلام للذهبى، ج 2ص 843، دار الغرب الاسلامي)

الغرض! حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس مضمون کی جس روایت میں یہ ذکر ہے کہ" مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر باغی گروہ کے خلاف جنگ کرنے پر افسوس ہے" وہ منقطع اور ضعیف ہے، اور جس روایت میں صرف" باغی گروہ کے خلاف قتال نہ کرنے پر افسوس" کا بیان ہے وہاں اس گروہ کی تحدید نہیں، اگر کسی راوی یا علامہ آلوسی جیسے کسی مفسر نے اپنی رائے سے کچھ لکھا ہے تو وہ ان کی ذاتی رائے ہے، اس کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صراحت نہیں، اور سنن بیہقی کی جو روایت ہم نے اوپر نقل کی ہے وہ صحیح بھی ہے اور اس میں خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فئہ باغیہ کی وضاحت بھی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات جنگ جمل و صفین کے زمانہ کے برس ہا برس بعد والے زمانہ سے متعلق ہے۔

سید لعل شاہ صاحب بخاری نے" بصیرت افروز تبصرہ" میں یہی مغالطہ دیا ہے کہ متعدد حوالے نقل کیے ہیں جن میں صرف" فئة باغية" کے الفاظ ہیں، نہ حضرت ابن عمر سے اس کی تحدید مذکور ہے اور نہ ہی

یہ الفاظ ہیں کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر قتال نہ کرنے کا افسوس ہے“ اوران حوالوں کونقل کرکے یہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت متعدد طریقوں سے مروی ہے اور پھر اس سے اس منقطع اور ضعیف روایت کی تائید کرنا چاہتے ہیں جوطبرانی کے حوالے سے انہوں نے پیش کی ہے، جبکہ ان کا فرض تھا کہ وہ ان الفاظ والی روایت کو صحیح ثابت کرتے جس میں ”حضرت علی کے ساتھ مل کر قتال نہ کرنے پر افسوس“ کا ذکر ہے یا کوئی ایسی روایت پیش کرتے جس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بتایا ہوتا کہ میری مراد اس باغی گروہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت ہے۔

نوٹ : حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک جلیل القدر صحابی ہیں، زمانہ فتنہ میں ان کا اپنا موقف بڑا واضح اور دو ٹوک تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور عبد الملک بن مروان کے درمیان کشمکش جاری تھی لکھا ہے :

"وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فِي تِلْكَ الْمُدَّةِ امْتَنَعَ أَنْ يُبَايِعَ لِابْنِ الزُّبَيْرِ أَوْ لِعَبْدِ الْمَلِكِ كَمَا كَانَ امْتَنَعَ أَنْ يُبَايِعَ لِعَلِيٍّ أَوْ مُعَاوِيَةَ ثُمَّ بَايَعَ لِمُعَاوِيَةَ لَمَّا اصْطَلَحَ مَعَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَاجْتَمَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ وَبَايَعَ لِابْنِهِ يَزِيدَ بَعْدَ مَوْتِ مُعَاوِيَةَ لِاجْتِمَاعِ النَّاسِ عَلَيْهِ ثُمَّ امْتَنَعَ مِنَ الْمُبَايَعَةِ لأحد حَال الِاخْتِلَاف إِلَى ان قُتِل بنُ الزُّبَيْرِ وَانْتَظَمَ الْمُلْكُ كُلُّهُ لِعَبْدِ الْمَلِكِ فَبَايَعَ لَهُ حِينَئِذٍ"۔

یعنی عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) اس زمانہ میں عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) اور عبدالملک بن مروان دونوں کی بیعت سے الگ رہے، جیسا کہ اس سے پہلے انہوں نے نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی، انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت اس وقت کی تھی جب ان کی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کے بعد لوگوں کا ان پر اتفاق ہوگیا، پھر انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے یزید کی بیعت کی کیونکہ اس پر بھی لوگوں کا اجتماع ہوگیا تھا، پھر وہ زمانہ اختلاف میں کسی کی بھی بیعت سے رکے رہے یہاں تک کہ

حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) کے قتل کے بعد جب مملکت کا انتظام عبدالملک کے ہاتھ میں آ گیا تو پھر انہوں نے اس کی بیعت کی.. "۔

(فتح الباری، ج 13ص 195، دار المعرفة بیروت)

لعل شاہ صاحب کی "جدید" تحقیق

آگے لعل شاہ صاحب نے عنوان دیا ہے" جمہور اہل سنت کے اس بارے میں دو قول ہیں" اور پھر لکھا ہے :

" پہلا قول: وہی ہے جسے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے جس کا تذکرہ ہم نے دوسرے نمبر پر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں اور حضرت معاویہ مجتہد مخطی ہیں اور خطا ان کی اجتہادی ہے یعنی انہوں نے حق کا قصد کیا لیکن خطا کر گئے، حق کو نہ پا سکے بہر حال عنداللہ ماجور ہیں اس قول کے قائلین بہت سے محققین ہیں ان میں سے بعض مشاہیر کے اسماء گرامی مع ان کی عبارات کے ملاحظہ فرمائیں... "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 174و175)

غور فرمائیں! پہلے صفحہ 170 پر حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے اس قول کے بارے میں لعل شاہ صاحب نے لکھا تھا کہ" یہ بعض اہل سنت کا قول ہے"، لیکن یہاں وہ اس قول کو بھی " جمہور اہل سنت" کے دو قولوں میں شمار کر رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں" اس قول کے قائلین بہت سے محققین ہیں"، یعنی جو قول چار صفحے قبل صرف" بعض اہل سنت کا قول تھا" وہ اب" بہت سے محققین اہل سنت" کا قول ہو گیا؟

آگے لعل شاہ صاحب نے علامہ ابن خلدون، قاضی ابو بکر ابن العربی، حافظ ابن کثیر، ابن حجر مکی، امام نووی، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا عبدالعزیز پرھاروی، ملا علی قاری اور عبدالشکور سالمی وغیرہ کی عبارات پیش کی ہیں اور انہیں اس قول کا قائل بتایا ہے (صفحہ 175 تا 180) ہم یہاں ان

حضرات کے اقوال پر بحث نہیں کریں گے کہ ہم کسی کی ذاتی رائے کو"مسلک اہل سنت" نہیں سمجھتے بلکہ مسلک اہل سنت اصول کا نام ہے کسی کی ذاتی آراء کا نہیں۔مثال کے طور پر لعل شاہ صاحب نے"تمہید ابی الشکور السالمی" کا ایک حوالہ بھی نقل کیا ہے جس میں ہے کہ:

"قال اهل السنة والجماعة بان معاوية ومن تابعه من الصحابة في حال حيٰوة علي رضى الله عنه كانوا مخطئين في دعوى الامارة والبيعة معه باغين بالمقاتلة مع علي وانما قلنا انهم كانوا مخطئين لانهم اجتهدوا في محل الاجتهاد لافي وقت الاجتهاد"۔

کہ اہل سنت والجماعت نے کہا ہے کہ حضرت معاویہ اور ان کے متبعین صحابہ حضرت علی کی زندگی میں دعویٰ امارت اور بیعت میں خطا کار تھے اور حضرت علی کے ساتھ جنگ کرنے میں باغی تھے بیشک ہم نے یہ قول اس لئے اختیار کیا ہے کہ انہوں نے محل اجتہاد میں اجتہاد کیا مگر اجتہاد کے وقت اجتہاد نہیں کیا۔(تمہید عبد الشکور السالمی،ص 182)۔

(استخلاف یزید،صفحہ 180)

غور فرمائیں!اس عبارت میں ابو شکور سالمی نے اہل سنت کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ کہتے ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں دعوائے امارت کرکے اور ان کے ہمنوا صحابہ نے ان کی بیعت کرکے خطا کی تھی،جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خلافت تھا ہی نہیں بلکہ اختلاف تو قصاص عثمان رضی اللہ عنہ پر تھا،نہ ہی صحیح قول کے مطابق کسی نے اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بطور امیر المؤمنین بیعت کی تھی۔اسے ہی"بناء الفاسد على الفاسد"کہا جاتا ہے،چنانچہ امام احمد بن یحییٰ البلاذری(م 279ھ)نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ:

"فلما قتل علي تداعى أَهْل الشَّامِ إِلَى بيعة مُعَاوِيَة، فقال عبد الرحمان بْن خالد بْن الوليد:نحن المؤمنون وَمُعَاوِيَة أميرنا وَهُوَ أمير الْمُؤْمِنِينَ فبايع لَهُ أَهْل الشَّامِ وَهُوَ بإيليا لخمس ليال خلون

من شهر ربيع الأول سنة أربعين، فكان مَا بين قتل عُثْمَان وبيعة النَّاس لمعاوية أربع سنين وشهرين وسبع عشرة ليلة"۔

جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا (تو اس کے بعد) اہل شام نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی دعوت دی، چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم مومنین ہیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ ہمارے امیر ہیں، لہٰذا وہ امیر المؤمنین ہوئے، پس اہل شام نے آپ کی بیعت کر لی، اس وقت آپ ایلیاء میں تھے اور سنہ 40ھ کے ماہ ربیع الاول کی پانچ راتیں گزر چکی تھیں، یوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل ناحق اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی درمیانی مدت چار سال دو ماہ اور سترہ راتیں بنتی ہے۔

(انساب الاشراف، ج3ص251، دار الفکر بیروت)

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (م463ھ) لکھتے ہیں:

"كانت بيعة أهل الشام لمعاوية عند مقتل عَلِيّ، وذلك في سنة أربعين"۔

اہل شام نے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بیعت حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے قتل کے بعد کی تھی اور یہ سنہ 40ھ کی بات ہے۔

(تاريخ بغداد، ج1ص577، دار الغرب الاسلامي، بيروت)

مؤرخ طبری نے بھی سنہ 40ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے:

"وفي هَذِهِ السنة بُويع لمعاوية بالخلافة بإيلياء، حَدَّثَنِي بِذَلِكَ مُوسَى بن عَبْدِ الرَّحْمَنِ، قَالَ: حَدَّثَنَا عُثْمَان بن عَبْدِ الرَّحْمَنِ، قَالَ: أَخْبَرَنَا إِسْمَاعِيل ابن راشد"۔

اس سال مقام ایلیاء میں معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بیعت خلافت کی گئی، یہ بات مجھے موسیٰ بن

عبدالرحمن نے بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہمیں عثمان بن عبدالرحمن نے بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہمیں اسماعیل بن راشد نے بتائی۔

(تاريخ الطبري، ج5ص161، دار المعارف مصر)

اور یہیں آگے "سعید بن عبدالعزیز تنوخی رحمۃ اللہ علیہ" کا قول لکھا ہے کہ:

"حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو عراق میں امیر المؤمنین کہا جاتا تھا، جبکہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو شام میں (صرف) امیر کہا جاتا تھا، جب حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی شہادت ہوگئی تب حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو امیر المؤمنین کہہ کر پکارا گیا"۔

(ایضاً)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے:

" لَمَّا مَاتَ عَلِيٌّ قَامَ أَهْلُ الشَّامِ فَبَايَعُوا مُعَاوِيَةَ عَلَى إِمْرَةِ الْمُؤْمِنِينَ ، لِأَنَّهُ لَمْ يَبْقَ لَهُ عِنْدَهُمْ مُنَازِعٌ" ۔

جب حضرت علی (رضی اللہ عنہ) وفات پا گئے، تو اہل شام نے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی امیر المؤمنین کے طور پر بیعت کرلی، کیونکہ اب ان کے نزدیک کوئی مدمقابل (دعوے دار) نہ رہا تھا۔

(البداية والنهاية، ج7ص617، وزارة الاوقاف قطر)

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بطور امیر المؤمنین بیعت کی تھی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہی کی تھی۔

تنبیہ

مؤرخ طبری نے سنہ 38ھ کے واقعات میں "ابومخنف" کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ:

أن أهل الشام لما انصرفوا من صفين كانُوا ينتظرون مَا يأتي بِهِ الحكمان، فلما انصرفا وتفرقا بايع أهل الشام مُعَاوِيَةَ بالخلافة..."۔

صفین سے لوٹنے کے بعد اہل شام اس بات کے منتظر تھے کہ حکمین کیا فیصلہ کرتے ہیں، پس

جب حکمین (فیصلہ کرکے) لوٹ گئے اور لوگ منتشر ہو گئے تو اہل شام نے بطور خلیفہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بیعت کرلی۔

(تاريخ الطبرى، ج5ص97، دار المعارف مصر)

پھر سنہ 60ھ کے واقعات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور آپ کی مدت خلافت کا ذکر کرتے ہوئے مختلف باتیں ذکر کی ہیں، پہلے "ابن عاشور" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"بُويع لمعاوية بأذرح، بايعه الْحَسَن بن علي فِي جمادى الأولى سنة إحدى وأربعين، وتوفي مُعَاوِيَة فِي رجب سنة ستين، وكانت خلافته تسع عشره سنه وثلاثة اشهر"۔

حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بیعت مقام اذرح پر کی گئی، حضرت حسن (رضی اللہ عنہ) نے جمادی الاولیٰ سنہ 41ھ میں آپ کی بیعت کی، اور آپ کی وفات رجب سنہ 60ھ میں ہوئی، یوں آپ کی مدت خلافت انیس سال اور تین ماہ تھی۔

(تاريخ الطبرى، ج5ص324، دار المعارف مصر)

اور پھر یہیں آگے ایک روایت یہ بھی ذکر کی ہے کہ:

"بايع أهل الشام مُعَاوِيَة بالخلافة فِي سنة سبع وثلاثين فِي ذي القعدة حين تفرق الحكمان"۔

اہل شام نے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بیعت خلافت ذی قعدہ سنہ 37ھ میں حکمین کے الگ ہونے کے بعد کی تھی۔

(ایضاً)

اور پھر آگے "ہشام بن محمد کلبی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"بُويع لمعاوية بالخلافة فِي جمادى الأولى سنة إحدى وأربعين"۔

حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی بیعت خلافت جمادی الاولیٰ سنہ 41ھ میں کی گئی۔

(تاريخ الطبرى، ج5ص325، دار المعارف مصر)

یوں تاریخ طبری میں کہیں یہ ملتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت سنہ 38ھ میں کی گئی، کہیں یہ ہے کہ سنہ 37ھ میں کی گئی، اور کہیں یہ ہے کہ سنہ 41ھ میں کی گئی۔ اسی طرح بعض دیگر مؤرخین مثلاً خلیفہ بن خیاط اور امام ذہبی نے بھی لکھ دیا ہے کہ اہل شام نے آپ کی بیعت خلافت واقعہ تحکیم کے فوراً بعد کر لی تھی، تاہم محققین نے ان روایات کو درست قرار نہیں دیا جو یہ بتاتی ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت واقعہ تحکیم کے فوراً بعد کی گئی تھی، صحیح بات یہی ہے کہ بطور خلیفہ اور امیر المؤمنین آپ کی عمومی بیعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہی کی گئی تھی جیسا کہ امام بلاذری، خطیب بغدادی اور حافظ ابن کثیر کے حوالے سے گذرا ہے۔ واللہ اعلم، تفصیل کے لئے دیکھیں: صحیح وضعیف تاریخ الطبري، ج9ص142و 143، دار ابن کثیر بیروت۔

پھر ابو شکور سالمی کون ہوتے ہیں یہ فیصلے کرنے والے کہ حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کے وقت میں اجتہاد نہیں کیا؟ کیا ان کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے کئی صدیاں بعد پیدا ہونے والے ابو شکور سالمی سے یہ کیوں نہ پوچھ لیا اور ان سے مشورہ کیوں نہ کر لیا کہ اجتہاد کا وقت کون سا ہوتا ہے؟

نوٹ: لعل شاہ صاحب نے "ابو شکور السالمی" کا نام "عبد الشکور السالمی" لکھا ہے جو کہ درست نہیں، مصنف نے اپنی کتاب (تمہید ابی الشکور) کے صفحہ 2 پر خود اپنا نام یوں لکھا ہے "ابو شکور محمد بن عبدالسعید بن شعیب الکبشی"، واضح رہے کہ ان کے حالات زندگی اور آپ کے شیوخ و اساتذہ کے نام تو کتابوں میں نہیں ملتے، کہا جاتا ہے کہ موصوف پانچویں صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اسی طرح لعل شاہ صاحب نے سلیمان بن سحمان نجدی (م 1349ھ) کی کتاب "الهدیة السنیة" کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

"وهم (معاوية واصحابه في ذلك) مخطئون بالاجماع واستمروا في ذلك الخطأ حتى ماتوا"۔ (الهدية السنية، ص35)

کہ حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی حضرت علی کے مقابلہ میں خطا پر تھے اور اسی خطا پر مرتے

دم تک قائم رہے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 180)

ملاحظہ فرمائیں! یہ صاحب لکھ رہے ہیں کہ حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی (رضی اللہ عنہم) بالاجماع مخطی تھے اور مرتے دم تک اپنی اس خطا پر قائم رہے۔ اولاً تو اس پر اجماع کا دعویٰ ہی غلط ہے، آپ پہلے با حوالہ پڑھ چکے ہیں کہ اس بارے میں خود صحابہ کرام میں مختلف مواقف و مسالک پائے جاتے ہیں۔ ثانیاً، موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مرتے دم تک اپنی خطا (یعنی بغاوت) پر قائم رہے، جبکہ خود لعل شاہ صاحب یہ سب نقل کرنے کے بعد ہمیں بتاتے ہیں کہ:

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جمہور اہل سنت کی مذکورۃ الصدر آراء دورِ خلافت علی رضی اللہ عنہ میں ان کے خروج و قتال کے سلسلہ میں تھیں لیکن جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان سے مصالحت کر کے خلافت سے دست بردار ہو گئے اور ساری جماعت ان پر متفق ہو گئی تو ان کی بغاوت ختم ہو گئی...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 191)

الغرض! یہ دو مثالیں صرف یہ بتانے کے لئے پیش کی ہیں کہ "مسلک اہل سنت" کسی کی ذاتی آراء کا نام نہیں کہ جو کسی نے لکھ دیا اسے آنکھیں بند کر کے "جمہور اہل سنت" کا مسلک قرار دے دیا جائے۔ مشاجرات کے بارے میں اہل سنت کا اصولی موقف آپ کتاب کے شروع میں پڑھ آئے ہیں۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے سرخی لگائی ہے "جمہور اہل سنت کا دوسرا قول" اور اس کے تحت لکھتے ہیں:

"کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باطل پر تھے یعنی خطا ان کی عنادی تھی اور دورِ خلافت علی میں وہ ملک جائر تھے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 180)

اور پھر لعل شاہ صاحب نے اس قول کے قائلین کے نام گنوائے ہیں اور ان کی عبارات نقل کی ہیں جن میں اکثریت زمانہ صحابہ کے کئی سو سال بعد پیدا ہونے والے فقہاء کی ہے، لیکن حیرت انگیز طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے نام بھی لکھے ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ وہ بھی اسی قول کے قائل تھے (اس پر ہم آگے بات کریں گے) لیکن یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ حضرت علی وحضرت عمار (رضی اللہ عنہما) تو مشاجرات صحابہ میں ایک فریق ہیں ان کو اپنے سے اختلاف کرنے والے دوسرے صحابہ کے بارے میں کوئی بات کرنے اور اپنی رائے دینے کا حق تھا، لیکن صحابہ کرام کے دونوں فریقوں میں سے کسی فریق کی بات کو لے کر بعد والوں کا دوسرے فریق کے خلاف اسے استعمال کرنا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ پھر کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا اور بات جنگ تک پہنچی وہ صحابہ نہ تھے؟ تو ان کے اقوال وآراء لعل شاہ صاحب کیوں نقل نہیں کرتے کہ وہ کس بات کو "حق" اور کس بات کو "ناحق" سمجھتے تھے؟

مشاجرات کے بارے میں جماعت صحابہ اور اسلاف کے مواقف

قارئین محترم! حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق تو آپ پہلے پڑھ چکے، خود لعل شاہ صاحب نے یہ بحث شروع ہی "منہاج السنۃ" کی عبارت سے کی تھی، آئیے اب علامہ ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ (م 456ھ) کی تحقیق دیکھتے ہیں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"الْكَلَام فِي حَرْب عَلِيّ من حاربه من الصَّحَابَة رَضِي الله عَنْهُم. (قَالَ أَبُو مُحَمَّد) اخْتلف النَّاس فِي تِلْكَ الْحَرْب على ثَلَاث فرق فَقَالَ جَمِيع الشِّيعَة وَبَعض المرجئة وَجُمْهُور الْمُعْتَزلَة وَبَعض أهل السّنة أَن عليا كَانَ الْمُصِيب فِي حربه وكل من خَالفه على خطأ وَقَالَ وَاصل بن عَطاء وَعَمْرو بن عبيد وَأَبُو الْهُذيْل وَطَوَائِف من الْمُعْتَزلَة أَن عليا مصيبا فِي قِتَاله مَعَ مُعَاوِيَة وَأهل النَّهر ووقفوا فِي قِتَاله مَعَ أهل

الْجمل وَقَالُوا إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ مخطئة وَلَا نَعْرِف أَيهمَا هِيَ وَقَالَت الْخَوَارِج عَليّ الْمُصِيب فِي قِتَاله أهل الْجمل وَأهل صفّين وَهُوَ مخطيء فِي قِتَاله أهل النَّهر وَذهب سعد بن أبي وَقاص وَعبد الله بن عمر وَجُمْهُور الصَّحَابَة إِلَى الْوُقُوف فِي عَليّ وَأهل الْجمل وَأهل صفّين وَبِه يَقُول جُمْهُور أهل السّنة وَأَبُو بكر بن كيسَان وَذهب جمَاعَة من الصَّحَابَة وَخيَار التَّابِعين وَطَوَائِف مِمَّن بعدهمْ إِلَى تصويب محاربي عَليّ من أَصْحَاب الْجمل وَأَصْحَاب صفّين وهم الْحَاضِرُونَ لقتاله فِي الْيَوْمَيْنِ الْمَذْكُورين وَقد أَشَارَ إِلَى هَذَا أَيْضا أَبُو بكر بن كيسَان..."۔

ترجمہ : حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی دوسرے صحابہ کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں اس بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے اور ان کے تین (بڑے) گروہ ہیں۔

تمام شیعہ، بعض مرجئہ، جمہور معتزلہ اور بعض اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان جنگوں میں درست تھے اور وہ تمام لوگ جو آپ کے مدمقابل تھے وہ غلطی پر تھے، (پھر اس گروہ میں سے) واصل بن عطاء، عمرو بن عبید، ابوالہذیل اور معتزلہ کے بہت سے گروہ کہتے ہیں کہ جہاں تک حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) اور اہل نہر (یعنی خوارج) کے ساتھ جنگ کا تعلق ہے تو ان میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) درست تھے (اور دوسرے غلط تھے) لیکن آپ کی جو جنگ اہل جمل (حضرت عائشہ وطلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کے ساتھ) ہوئی اس میں ایک گروہ صحیح اور دوسرا غلط تھا لیکن کون صحیح اور کون غلط تھا؟ یہ ہم نہیں جانتے، لہٰذا ہم اس بارے توقف کرتے ہیں، اور خوارج کہتے ہیں کہ جنگ جمل وصفین میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) ہی حق پر اور درست تھے، لیکن اہل نہر کے ساتھ جنگ میں وہ غلط تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر اور جمہور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا موقف ہے کہ ہم جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں کے بارے میں توقف کرتے ہیں (یعنی ہم یہ فیصلہ نہیں دیتے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط۔ناقل) اور جمہور اہل سنت اور ابوبکر بن کیسان کا یہی مسلک

ہے۔

جبکہ صحابہ اور خیار تابعین کی ایک جماعت اور ان کے بعد بہت سے لوگوں کا یہ مسلک ہے کہ جمل اور صفین دونوں جنگوں میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مدمقابل حضرات "مصیب" یعنی صحیح موقف پر تھے، اور یہ لوگ (یعنی جو صحابہ اور تابعین یہ موقف رکھتے ہیں۔ناقل) ان دونوں جنگوں میں شریک تھے، اس بات کی طرف بھی ابو بکر بن کیسان نے اشارہ کیا ہے۔

(الفصل في الملل والأهواء والنحل ،ج4ص119و120، مكتبة الخانجي ، مصر)

ملاحظہ فرمائیں! ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ بھی "جمہور صحابہ کرام" اور "جمہور اہل سنت" کا مسلک یہی بیان کر رہے ہیں کہ ہم جنگ جمل و جنگ صفین کے بارے میں توقف کرتے ہیں اور فریقین میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ فیصلہ نہیں دیتے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط، اور غور فرمائیں جس قول کو لعل شاہ صاحب "جمہور اہل سنت کا دوسرا قول" بتا رہے ہیں اسے ابن حزم "شیعہ، معتزلہ، بعض مرجئہ اور بعض اہل سنت" کا قول بتا رہے ہیں۔

بلکہ علامہ ابن حزم نے تو صحابہ وخیار تابعین کی ایک جماعت کا مسلک یہ بھی بتایا ہے کہ جمل اور صفین دونوں جنگوں میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مدمقابل حضرات "مصیب" یعنی صحیح موقف پر تھے۔

اسی طرح امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"فَإِنَّ ثُلُثَ الْأُمَّةِ أَوْ أَقَلَّ أَوْ أَكْثَرَ لَمْ يُبَايِعُوا عَلِيًّا. بَلْ قَاتَلُوهُ وَالثُّلُثُ الْآخَرَ لَمْ يُقَاتِلُوا مَعَهُ وَفِيهِمْ مَنْ لَمْ يُبَايِعْهُ أَيْضًا؛ وَالَّذِينَ لَمْ يُبَايِعُوهُ مِنْهُمْ مَنْ قَاتَلَهُمْ ، وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ يُقَاتِلْهُمْ ..."۔

بے شک امت کے ایک تہائی یا کچھ کم یا کچھ زیادہ لوگوں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی بیعت نہیں کی تھی، بلکہ ان کے ساتھ جنگ بھی کی، اور دوسرے ایک تہائی نے ان کی معیت میں جنگ نہ کی اور ان میں بھی ایسے تھے جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، اور پھر جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی ان میں سے ایسے بھی تھے جن کے ساتھ حضرت علی نے قتال کیا اور

ایسے بھی تھے جن کے ساتھ نہیں کیا۔۔"۔

(منهاج السنة ، ج 8، ص 338، السعودية)

اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (م 1033ھ) نے لکھا کہ :

"اے برادر! اس معاملہ میں (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے میں) امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) تنہا نہیں ہیں، بلکہ صحابہ کرام کی کم وبیش نصف جماعت اس معاملہ میں حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ شریک ہے"۔

(مکتوبات امام ربانی، اردو، دفتر اول، مکتوب نمبر 251، ادارہ مجددیہ کراچی)

امام اہل سنت ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ (م 330ھ) نے صحابہ کرام کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کے بارے میں آٹھ اختلافی مواقف نقل کیے ہیں، اور ان میں سے پہلا موقف یوں نقل کیا ہے :

"فقالت الروافض والزيدية وبعض المعتزلة "إبراهيم النظام وبشر بن المعتمر" وبعض المرجئة أن علياً كان مصيباً في حروبه وأن من قاتله كان على الخطأ فخطّئوا طلحة والزبير وعائشة ومعاوية...."۔

یعنی روافض، زیدیہ، بعض معتزلہ جیسے ابراہیم النظام اور بشر بن معتمر اور بعض مرجئہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ان جنگوں میں درست تھے اور آپ کے ساتھ جن لوگوں نے جنگ کی وہ غلطی پر تھے پس یہ لوگ حضرت طلحہ وزبیر وسیدہ عائشہ ومعاویہ رضی اللہ عنہم کو خطا پر کہتے ہیں۔

(مقالات الاسلاميين، ج 2ص 145، المكتبة العصرية ، بيروت)

اسی طرح ایک قول انہوں نے یوں ذکر کیا ہے :

"وقال قائلون: سبيل علي وطلحة والزبير وعائشة في حربهم سبيل

الاجتهاد وأنهم جميعاً كانوا مصيبين وكذلك قول هؤلاء في قتال معاوية وعلي.."۔

کئی لوگ اس کے قائل ہیں کہ حضرت علی وطلحہ وزبیر وعائشہ (رضی اللہ عنہم) ان سب کے درمیان جو ہوا وہ اجتہاد پر مبنی تھا اور یہ سب اپنی اپنی جگہ درست اور مصیب تھے اسی طرح حضرت معاویہ و حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں بھی ان کا قول ایسا ہی ہے"۔

(حوالہ بالا)

اور ایک قول وہی ذکر کیا ہے جسے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے بہتر موقف بتایا ہے :

"وقال قائلون: نزعم أن علياً وطلحة والزبير لم يكونوا مصيبين في حربهم وأن المصيبين هم القعود ونتولاهم جميعاً ونبرأ من حربهم ونرد أمرهم إلى الله"۔

اور کئی لوگوں کا کہنا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ حضرات علی وطلحہ وزبیر (رضی اللہ عنہم) اپنی جنگوں میں صواب پر نہ تھے بلکہ جو لوگ ان جنگوں سے الگ رہے وہ صواب پر تھے اور ویسے ہم ان سب حضرات سے دوستی رکھتے ہیں اور ان کی جنگوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں (یعنی توقف اور سکوت کرتے ہیں)۔

(ایضاً)

تو غور فرمائیں! امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کی بات سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ جس قول کو لعل شاہ صاحب "جمہور اہل سنت کا دوسرا قول" کے عنوان سے جمہور اہل سنت کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مطلقاً باطل اور ناحق پر تھے (یعنی ان کی خطا اجتہادی نہیں بلکہ عنادی تھی)، یہ قول دراصل روافض، شیعہ زیدیہ اور بعض معتزلہ کا ہے، اور دوسرا یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس بارے میں اہل سنت میں شروع سے اختلاف رہا ہے اور جو لوگ اس بات پر "اجماع" کا دعویٰ کرتے ہیں کہ زمانہ فتنہ کی ان جنگوں میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل صحابہ کے قطعی خطا کار ہونے پر اہل سنت کا اجماع ہے یہ ایسا

دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ سب سے بڑے اور اکابر اہل سنت صحابہ کرام وتابعین عظام تھے جن کے سامنے یہ جنگیں ہوئیں تو جب ان کے اس بارے میں مختلف مسالک ہیں تو اجماع کہاں ہوا؟ اور اگر کہا جائے کہ یہ اجماع قرن اول کے بعد ہوا تو بالفرض ایسا اجماع ہوا بھی تو اس کو صحابہ کرام پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔

الغرض! سوال یہ ہے کہ ہم کس کی تحقیق کو قبول کریں؟ امام ابو الحسن اشعری، علامہ ابن حزم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حضرت مجدد صاحب (رحمۃ اللہ علیہم) کی؟ یا چودھویں صدی کے محقق لعل شاہ صاحب کی؟ اور کیا ہم "شیعہ ومعتزلہ" کے قول کو لعل شاہ صاحب کے کہنے پر" جمہور اہل سنت کا ایک قول" تسلیم کرلیں؟

پھر تعجب اس بات پر بھی ہے کہ" جمہور" کے مقابلے میں "بعض" ہوتے ہیں، یہ پہلی بار پڑھ رہے ہیں کہ لعل شاہ صاحب ہمیں بتاتے ہیں" جمہور اہل سنت کے دو قول ہیں" اور مزے کی بات دونوں قول الگ الگ ہیں اور بقول لعل شاہ صاحب دونوں طرف جمہور ہی ہیں، تو ہمارا سوال یہ بھی ہے کہ اگر دونوں قول" جمہور اہل سنت" کے ہیں تو پھر جمہور کے مقابلے میں" بعض" کا قول کیا ہے؟ وہ تو بتایا ہی نہیں گیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک بے سند قول سے استدلال

لعل شاہ صاحب بخاری لکھتے ہیں:

"خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے کہ انہوں نے غیر جانبدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق فرمایا تھا: اولئك قوم قعدوا عن الحق ولم يقوموا مع الباطل (ترجمہ از ناقل: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کی مدد تو نہ کی لیکن باطل کے ساتھ بھی کھڑے نہیں ہوئے)۔

(استخلاف یزید، صفحہ 180 و181)

(لعل شاہ صاحب نے یہاں تین کتابوں کے حوالے دیے ہیں. محب الدین الطبری کی" الرياض النضرة"، ابن عبدالبر قرطبی کی" الاستيعاب في معرفة الاصحاب" اور" فتاوی عزیزی")۔

اس سے لعل شاہ صاحب کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے موقف کو حق اور اپنے مد مقابل صحابہ (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ) کے موقف کو صرف اور صرف" باطل" کہتے تھے۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب اس قول کی اسنادی حیثیت کا تعلق ہے تو محب الدین طبری (م694ھ) نے تو" قال ابو عمر" کہہ کر یہ بات نقل کی ہے اور" ابو عمر" سے مراد" یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر القرطبی" (م463ھ) ہیں یعنی محب الدین طبری نے یہ بات" الاستیعاب" سے نقل کی ہے، اب ہم" الاستیعاب" کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں اس قول کی کوئی سند نہیں ملتی بلکہ یہ ابن عبد البر کا اپنا قول اور رائے ہے، اب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت (40ھ) اور ابن عبد البر کی ولادت (368ھ) کے درمیان تقریباً 328 سال کا عرصہ ہے اور ابن عبد البر نے اس قول کی کوئی سند ذکر نہیں کی، لہٰذا لعل شاہ صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس قول کی مکمل سند ذکر کرتے، وہ خود تو دوسروں کو یوں طعنے دیتے ہیں:

> " جو لوگ رواۃ سند کی تمیز سے بھی بے خبر ہوں وہ صحت وسقم کی تمیز کیسے کرسکتے ہیں؟ حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 774ھ ہے اور الاعمش کی وفات سنہ 148ھ ہے، حافظ ابن کثیر کو اعمش کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا تاہنوز معرض خفا میں ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

دوسری بات یہ کہ کیا لعل شاہ صاحب غیر جانبدار صحابہ کے بارے میں یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ " مداہن" تھے اور جانتے بوجھتے ہوئے" حق" کے لئے کھڑے نہ ہوئے؟ خدا کا خوف نہیں آتا، براءۃ صحابہ سے متعلق روایات کی ہندی کی چندی کرتے ہوئے اور ذم صحابہ سے متعلق ہر رطب و یابس قول کو (خواہ پایہ ثبوت کو پہنچے یا نہ پہنچے) لیتے ہوئے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے؟

پھر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تو جنگ صفین میں جنگ بندی قبول کر کے تحکیم پر رضامند ہوتے ہیں، نیز ارسالِ مصحف کے جواب میں" نَعَمْ ، أَنَا أَوْلَى بِذَلِكَ ، بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّه" (البدایۃ والنہایۃ، ج7 ص464، قطر) فرماتے ہیں، یوں نہیں فرماتے کہ تم باطل پر ہو اور باغی قرار پا چکے ہو اور باغیوں کے حق میں یہی مُصحف اور قرآن "فقاتلوا التي تبغي حتىٰ تفيء الىٰ امر الله" کا فیصلہ دے چکا ہے، لہٰذا مزید اب کسی فیصلے کی ضرورت نہیں، بس یا تو بیعت کر کے میری اطاعت قبول کرو، باطل کو چھوڑ کر حق قبول کرو یا پھر اسی مصحف کے فیصلے کے مطابق آخر تک تم سے یوں ہی قتال جاری رکھا جائے گا۔ لیکن

حضرت علیؓ یوں نہیں فرماتے بلکہ جنگ بندی قبول کر لیتے اور آخر کار مہادنہ (صلح) پر راضی ہو جاتے ہیں، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ، حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو اس طرح باطل پر نہ سمجھتے تھے جو لعل شاہ صاحب ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب بخاری نے صاحب ھدایہ شیخ علی بن ابی بکر المرغینانی (م 593ھ)، علامہ ابن ہمام (م 861ھ)، علامہ ابن نُجَیم (م 969ھ)، قاضی خان اوز جندی (م 592ھ)، شیخ عبدالحق محدث دھلوی (م 1052ھ)، مُلا احمد جیون (م 1130ھ) سید انور شاہ کشمیری (م 1352ھ)، میر سید شریف جرجانی (م 816ھ)، عبد الرحمن جامی (م 898ھ) اور نواب صدیق حسن خان (م 1307ھ) وغیرہ کی کچھ عبارات نقل کی ہیں کہ ان میں سے بعض نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو "جائر" لکھا ہے، کسی نے لکھا ہے کہ "اس وقت حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا" اور کسی نے لکھا ہے کہ "حضرت معاویہ نے بغاوت کی تھی" کسی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "خطائے منکر" کے مرتکب ہوئے اور کسی نے لکھا ہے کہ وہ "گناہ کے مرتکب ہوئے"۔

(ملخصاً، استخلاف یزید، صفحہ 181 تا 188)

نوٹ: یہ تمام لوگ قرن صحابہ کے کئی صدیوں بعد پیدا ہوئے جیسا کہ میں نے ہر ایک کے نام کے ساتھ ان کی وفات کا سال لکھ دیا ہے، انہوں نے اگر کچھ لکھا ہے تو وہ ان کی ذاتی آراء ہی سمجھی جائیں گی، مسلک اہل سنت کسی کی ذاتی رائے کا نام نہیں بلکہ اصول کا نام ہے، سر دست ہم ان کی عبارات پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتے، اس کے لئے مفتی وقاص رفیع کی کتاب "حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عبارات اکابر" پر لکھا گیا ہمارا تبصرہ بنام "اکابر کے نادان وکیل" پڑھ لیا جائے اس میں ان تمام عبارات پر بحث کر دی گئی ہے۔

اور پھر لعل شاہ صاحب یوں نتیجہ نکالتے ہیں غور سے پڑھیے گا:

"دلائل کے لحاظ سے یہ دوسرا قول بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے۔ جمہور اہل السنہ کا پہلا قول کہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ المحق المصیب اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ المخطی المعذور تھے) راجح سمجھا

جائے مگر قوت دلائل کے لحاظ سے دوسرا قول بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باطل پر تھے۔ کیونکہ سبھی صحابہ اپنے اپنے زعم میں حق کوش تھے اور فریق ثانی کو باطل سمجھتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت لا تقوم الساعة حتی تقتتل فئتان دعواهما واحد کے حاشیہ میں حضرت مولانا احمد علی المحدث رحمۃ اللہ علیہ سہارنپوری تحریر فرماتے ہیں :اي تدعي كل واحدة أنها على الحق وخصمها مبطل۔ یعنی ہر گروہ مدعی ہوگا کہ میں حق پر ہوں اور میرا مقابل باطل پر ہے اور جمہور اہل سنت کے نظریہ کے مطابق جب طے ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ المحق المصيب ہیں تو یہ امر مستلزم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بالمقابل محارب گروہ باطل پر ہو کیونکہ حق کے بالمقابل باطل کا کلمہ مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ ویحق اللہ الحق ویبطل الباطل ..الآیة سے ظاہر ہے....“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 188)

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب کی مندرجہ بالا عبارت کو ایک بار پھر پڑھیں، کیا آپ کو کچھ سمجھ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ جس قول کو انہوں نے اپنی طرف سے ”جمہور اہل سنت کا دوسرا قول“ بتانے پر ورق سیاہ کیے ہیں اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”دلائل کے لحاظ سے وہ راجح ہے“ لیکن اگلی ہی سطر میں لکھتے ہیں کہ ”جمہور اہل السنہ کا پہلا قول راجح سمجھا جائے“، بھائی کیوں؟ اگر قوت دلائل کے لحاظ سے دوسرا قول راجح معلوم ہوتا ہے تو پھر پہلا قول کیوں راجح سمجھا جائے؟ کیا آپ صحابہ کرام پر احسان کرنا چاہتے ہیں؟

اور وہ کون سے دلائل ہیں جن کی بنیاد پر لعل شاہ صاحب اس قول کو راجح قرار دے رہے ہیں؟ آپ تو غیر جانبدار صحابہ کرام کے موقف کو بھی مرجوح ثابت کرنے پر بضد ہیں جن کے موقف کے حق میں وہ تمام احادیث صحیحہ موجود ہیں جن میں فتنہ کے زمانہ میں الگ اور ایک طرف ہو کر بیٹھ رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

دونوں گروہوں کی" دعوۃ" یا" دعویٰ" ایک ہونے کا کیا مطلب؟

پھر لعل شاہ صاحب کی تلبیس دیکھیں کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث پیش کی جس کا ترجمہ ہے کہ" قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایسے دو گروہوں کے درمیان جنگ نہ ہو جائے جن دونوں کی دعوت یا دعویٰ ایک ہوگا" اور پھر اس کی وہ تشریح نقل کی جو محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ (م 1297ھ) نے حاشیہ میں لکھی، لیکن شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ (م 852ھ) نے جو لکھا ہے وہ نقل نہیں کیا، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

" وَالْمُرَادُ بِالدَّعْوَةِ الْإِسْلَامُ عَلَى الرَّاجِحِ وَقِيلَ الْمُرَادُ اعْتِقَادُ كُلٍّ مِنْهُمَا أَنَّهُ عَلَى الْحَقِّ.."۔

یعنی اس دعویٰ سے مراد یہ ہے کہ وہ دونوں گروہ اسلام کے دعویدار ہوں گے یہی بات راجح ہے، اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ ہر ایک یہ سمجھے گا کہ وہ حق پر ہے۔

(فتح الباری، ج 12ص 303، دار المعرفة بیروت)

یاد رکھیں! یہ بھی حافظ ابن حجر کی تشریح ہے اور وہ بھی مولانا احمد علی سہارنپوری کی تشریح تھی، یہ دونوں باتیں حدیث رسول ﷺ نہیں بلکہ اقوال شارحین ہیں، حدیث میں نہ یہ ذکر ہے کہ ان دونوں گروہوں سے کون کون مراد ہے اور نہ" حق" یا" باطل" کے الفاظ ہی مذکور ہیں، صرف یہ ذکر ہے کہ" ان دونوں کا دعویٰ ایک ہوگا"، ایک شارح حافظ ابن حجر لکھ رہے ہیں کہ اس دعویٰ سے مراد اسلام کا دعویٰ ہے یعنی دونوں گروہ مسلمان ہوں گے، اور یہی راجح ہے (سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو حدیث ہے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کروائیں گے اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دعوے سے مراد اسلام کا دعویٰ ہے) اور دوسرے قول کو حافظ ابن حجر" قیل" کے ساتھ بیان کر رہے ہیں جو اس قول کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ ہے، نیز اسی صحیح بخاری کی ایک حدیث میں الفاظ ہیں: لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَقْتَتِلَ فِئَتَانِ عَظِيمَتَانِ، يَكُونُ بَيْنَهُمَا مَقْتَلَةٌ عَظِيمَةٌ، دَعْوَتُهُمَا وَاحِدَةٌ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7121) یعنی" دعویٰ" کے بجائے" دعوۃ" کے الفاظ ہیں کہ ان دونوں گروہوں کی دعوت ایک ہوگی، لیکن لعل شاہ صاحب چونکہ اپنے ذہنی مفروضوں کی تائید چاہتے ہیں اس لئے

حافظ ابن حجر کی تشریح تو نقل نہ کی اور نہ ہی" دعوتهما واحدة" والے الفاظ نقل کیے بلکہ حافظ ابن حجر کے چار صدیاں بعد ہونے والے ایک شارح کی بات نقل کر دی۔

اسی طرح حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے :

"وَهَاتَانِ الْفِئَتَانِ هُمَا أَصْحَابُ الْجَمَلِ وَأَصْحَابُ صِفِّينَ. فَإِنَّهُمَا جَمِيعًا يَدْعُونَ إِلَى الْإِسْلَامِ، وَإِنَّمَا يَتَنَازَعُونَ فِي شَيْءٍ مِنْ أُمُورِ الْمُلْكِ، وَمُرَاعَاةِ الْمَصَالِحِ الْعَائِدِ نَفْعُهَا عَلَى الْأُمَّةِ وَالرَّعَايَا، وَكَانَ تَرْكُ الْقِتَالِ أَوْلَى مِنْ فِعْلِهِ، كَمَا هُوَ مَذْهَبُ جُمْهُورِ الصَّحَابَةِ..."۔

اس حدیث میں دو گروہوں سے مراد جنگ جمل اور جنگ صفین والے یعنی ان جنگوں میں ایک دوسرے سے برسرپیکار گروہ ہیں، ان سب کی دعوت اسلام کی طرف تھی، ان کا تنازعہ ایسی چیز میں تھا جس کا تعلق امور مملکت اور لوگوں کے مصالح سے تھا، البتہ جنگ ترک کرنا، جنگ کرنے سے بہتر تھا جیسا کہ جمہور صحابہ کا مذہب ہے۔

(البداية والنهاية، ج6ص319،وزارة الاوقاف قطر)

لیجئے! حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (جنہیں لعل شاہ صاحب نے" راسخ العقیدہ سنی، بلند پایہ مفسر، محدث، محقق اور تاریخ میں نہایت وسیع اور عمیق نظر رکھنے والا" تسلیم کیا ہے۔ استخلاف یزید، صفحہ 66) انہوں نے بھی اس حدیث میں" دعویٰ" یا" دعوۃ" کی تشریح یہی فرمائی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں کی دعوت اسلام کی طرف ہی ہوگی، ایک دوسرے کو حق یا باطل پر سمجھنے کا کوئی اشارہ تک نہیں، نیز حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صاف لکھا ہے کہ جنگ نہ کرنا زیادہ بہتر تھا اور جمہور صحابہ کا یہی مسلک تھا۔

سیدنا علی اور سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں حق پر تھے

ہمارا کہنا ہے کہ اس جنگ میں سیدنا علی اور سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں حق پر تھے اور اگر کسی نے قرن صحابہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اجتہادی خطا کی نسبت کی بھی ہے تو" خطائے اجتہادی" نہ حق

کے خلاف ہوتی ہے نہ گناہ بلکہ یہ حق کے دائرے کے اندر ہی ہوتی ہے اس کو خلافِ حق نہیں کہہ سکتے اجتہاد میں "صواب وخطا" کا تقابل ہوتا ہے نہ کہ "حق و باطل" کا، اور اللہ کے علم میں جس مجتہد کے اجتہاد میں خطا ہو گی اسے بھی ایک اجر ملے گا، خود لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ "مجتہد اگر خطا کر جائے تو بھی وہ عند اللہ ماجور ہو گا" (استخلاف یزید، صفحہ 63) تو ہمارا سوال ہے کہ کیا "باطل" پر بھی کسی کو اجر ملا کرتا ہے؟ علاوہ ازیں خلیفہ راشد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص اور اس کے مطالبہ کو "باطل" اور "ناحق" کہنے کا معنیٰ تو یہ بنتا ہے کہ ان کا قتل (العیاذ باللہ) برحق تھا، اور اس بات کا قائل کوئی کور باطن سبائی تو ہو سکتا ہے، کوئی سُنی ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ جنگ جمل وصفین کی بنیاد تو یہی مطالبہ تھا، وہاں خلافت کا جھگڑا تو نہیں تھا۔

پھر لعل شاہ صاحب آگے زیر عنوان "اہل سنت کے دونوں اقوال کا مآل ایک ہی ہے" مزید لکھتے ہیں:

> "اگر دوسرے قول کی یہ تاویل کر لی جائے کہ محاربین حضرت علی رضی اللہ عنہ واقعتاً باطل پر تھے مگر انہوں نے باطل کا قصد نہیں کیا تو اس قول کا مرجع بھی وہی ہو جاتا ہے جو پہلے قول کا ہے البتہ بعض عبارات اس تاویل کو قبول نہیں کرتیں، ہمارے لئے بہت آسان ہے کہ ہم ان عبارتوں کو رد کر دیں جو اس تاویل کو قبول نہیں کرتیں اور اس نظریہ کو حق وصواب سمجھیں کہ اس مقاتلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور ان کے محاربین فی الحقیقۃ باطل پر تھے مگر انہوں نے باطل کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ حق کا قصد کر کے اجتہاد کیا تھا مگر حق کو پا نہ سکے اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے.."۔
>
> (استخلاف یزید، صفحہ 189)

قارئین محترم! پہلے تو لعل شاہ صاحب نے اپنی طرف سے یہ فرض کر لیا کہ اس بارے میں اہل سنت کے صرف دو قول ہیں اور دونوں کو "جمہور اہل سنت" کے اقوال ہی بتایا جبکہ آپ پہلے پڑھ چکے کہ علامہ ابن حزم، حافظ ابن تیمیہ اور امام ابوالحسن اشعری (رحمۃ اللہ علیہم) نے اس بارے میں دو سے زیادہ مسالک نقل کیے ہیں جمہور صحابہ کا مسلک بھی انہوں نے بتایا ہے، اصل میں شاہ صاحب نے کچھ فقہاء کی ذاتی آراء اور تشریحات کو "اہل

E-BOOK

سنت کا اصولی مسلک" سمجھ لیا ہے اور اسی پر اپنے موقف کی بنیاد رکھ رہے ہیں جبکہ اہل سنت کے اصول اجتہاد کچھ اور ہیں، اور اب مندرجہ بالا عبارت میں ایک بار پھر " کھچڑی" پکا رہے ہیں کہ " محاربین حضرت علی فی الحقیقۃ باطل پر تھے مگر انہوں نے باطل کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ حق کا قصد کر کے اجتہاد کیا تھا"، یعنی شاہ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بے خبری اور سوتے میں اتنی بڑی جنگیں ہو گئیں، محاربین کا قصد تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استقبال اور انہیں خوش آمدید کہنے کا تھا مگر چل گئی تلوار؟ پھر "حق کا قصد کر کے اجتہاد" کرنا کیا "باطل" کہلاتا ہے؟ اگر یہ باطل ہوتا ہے تو اجتہادی خطا پر ایک اجر کیوں ملتا ہے؟ کیا باطل پر بھی اجر ملا کرتا ہے؟ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

آگے لعل شاہ صاحب نے دو حوالے نقل کیے ہیں، پہلا حوالہ مولوی عبد القادر سلہٹی کی کتاب "الدرر الازھر شرح فقه الاکبر" کا جو شاہ صاحب نے پہلے بھی صفحہ 165 پر نقل کیا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"الدرر الازہر کی عبارت اصل تاویل کی طرف اشارہ کرتی ہے اما حرب الصفين كان الحق مع علي، ومعاوية وان كان على الباطل ولكن يمكن ان يكون ذالك منه بالاجتهاد والخطأ في الاجتهاد كان مغفوراً۔ لیکن جنگ صفین میں تو حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ باطل پر تھے لیکن ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اجتہاد کیا ہو اور خطا کر گئے ہوں اجتہاد میں خطا سے درگذر کی گئی ہے (الدرر الازہر شرح الفقہ الاکبر صفحہ 34)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 189)

اور دوسرا حوالہ صدر الاسلام ابو الیسر بزدوی حنفی کا یوں نقل کیا ہے:

"كان علي على الحق ومعاوية على الباطل الا أنه كان متأولاً۔ یعنی حضرت علی حق پر تھے اور حضرت معاویہ باطل پر لیکن متأول تھے (اصول الدین، صفحہ 197)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 190)

آپ نے پہلے پڑھا کہ لعل شاہ صاحب نے لکھا تھا کہ :

"جمہور اہل سنت کا دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باطل پر تھے یعنی خطا ان کی عنادی تھی.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 180)

اور ظاہر ہے "باطل" اور "عنادی خطا" کو "اجتہادی" نہیں کہا جا سکتا، پھر لعل شاہ صاحب نے صفحہ 181 تا 189 مختلف لوگوں کی عبارات نقل کی ہیں جن سب کا لب لباب یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ "باطل" پر تھے، وہ "سلطان جائر" تھے، کسی کی عبارت سے لعل شاہ صاحب نے یہ ثابت کیا کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین میں سے ام المؤمنین سیدہ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم تو مجتہد مخطی تھے جبکہ دوسرے یعنی حضرت معاویہ وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہچانا نہیں یا دنیا کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے" کسی نے لکھا کہ "حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خطائے منکر کے مرتکب ہوئے" کسی کا حوالہ دیا کہ "ان کی یہ حرکت خواہش نفسانی کی وجہ سے تھی" کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اختلاف کرنے والوں کو "آثم، عاصی اور خاطی" لکھا۔

یہ سب عبارات نقل کرنے کے بعد لعل شاہ صاحب نے لکھا تھا کہ :

"دلائل کے لحاظ سے یہ قول بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 188)

اور اب "الدرر الازہر" اور "اصول بزدوی" کی عبارت پیش کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ باطل پر تھے لیکن انہوں نے تاویل کی تھی اور ممکن ہے انہوں نے اجتہاد کیا ہو اور اجتہادی خطا معاف ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ لعل شاہ صاحب نے انہیں لوگوں کے قول کو دلائل کی رو سے راجح باور کروایا ہے جنہوں نے اجتہادی خطا کے بجائے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف "باطل"، "خطائے منکر" اور "اثم وعصیان" کی نسبت کی ہے اور وہ خود بھی بار بار "حق" و "باطل" کے الفاظ لکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ :

"جو لوگ اس مسئلہ میں خطائے اجتہادی کے قائل نہیں وہ ہمارے اس نظریہ سے متفق نہیں

ہو سکتے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 190)

حالانکہ انہیں یوں لکھنا چاہئے تھا کہ "جو لوگ خطائے اجتہادی کے قائل ہیں وہ ہمارے اس (خطائے عنادی اور باطل اور اثم وعصیان) والے نظریہ سے متفق نہیں ہو سکتے، بقول شاعر :

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے خود یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد مودودی صاحب پر نقد کرتے ہوئے پہلے ان کی یہ عبارت نقل کی ہے :

"مودودی صاحب لکھتے ہیں: مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہے کہ انہوں نے یہ غلطی نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے کی، مگر میں اسے محض غلطی کہتا ہوں، اجتہادی غلطی ہم صرف اس رائے کو کہہ سکتے ہیں جس کے حق میں کوئی شرعی استدلال ہو مگر وہ صحیح نہ ہو"۔ (خلافت وملوکیت، صفحہ 343)"۔

اور پھر اس پر لعل شاہ صاحب نے اپنا تبصرہ یوں کیا ہے :

"اجتہادی غلطی سے انکار کا لازمی غیر منفک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فریقین میں سے ایک کو برحق اور دوسرے کو باطل سمجھا جائے اور ان کی اس غلطی کو موجب فسق قرار دیا جائے، خواہ اجتہادی غلطی کے منکر اس نتیجہ کو تسلیم کریں یا اس سے بیزاری کا اظہار کریں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 190)

قارئین محترم! مودودی صاحب کی کتاب کا جو اقتباس لعل شاہ صاحب نے نقل کیا ہے اسے غور سے پڑھیں، کیا یہ وہی بات نہیں جسے لعل شاہ صاحب "جمہور اہل سنت کا دوسرا قول" بتا کر اس پر کئی ورق سیاہ کر آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ "باطل پر تھے" (یاد رہے! باطل حق کے دائرے سے باہر ہوتا ہے اس لئے اس پر اجر نہیں ملا کرتا بلکہ سزا ہوتی ہے، جبکہ خطائے اجتہادی حق کے دائرے کے اندر ہوتی ہے اسی لئے اس پر

ایک اجر ملتا ہے) اور کیا لعل شاہ صاحب مولانا عبد الرحمن جامی کے حوالے سے یہ نقل نہیں کر آئے کہ حضرت معاویہ کی خطا (اجتہادی نہیں) بلکہ "خطائے منکر" تھی (صفحہ 187) اور کیا شاہ صاحب نے نواب صدیق حسن خان کا قول صفحہ 187 پر نقل نہیں کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین "آثم و عاصی اور خاطی" تھے؟ اور کیا شاہ عبد العزیز کی طرف منسوب فتاویٰ عزیزی سے یہ عبارت نقل نہیں کر آئے کہ "اہل حدیث نے روایت صحیحہ سے دریافت کیا ہے کہ یہ حرکت خواہش نفسانی کی وجہ سے تھی" (صفحہ 187) اور پھر یہ سب اقوال نقل کرنے کے بعد کیا لعل شاہ صاحب نے دلائل کے لحاظ سے ان اقوال کو راجح نہیں لکھا؟ تو پھر مودودی صاحب نے کیا نئی بات لکھی ہے؟ من و عن وہی تو لکھا جو بقول لعل شاہ صاحب "جمہور اہل سنت کا دوسرا قول" ہے اور دلائل کے لحاظ سے راجح بھی ہے؟ تو لعل شاہ کو اس پر اعتراض کیوں ہے؟

نیز غور فرمائیں یہاں لعل شاہ صاحب خود تسلیم کر رہے ہیں کہ :

"اجتہادی غلطی سے انکار کا لازمی غیر منفک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فریقین میں سے ایک کو برحق اور دوسرے کو باطل سمجھا جائے اور ان کی اس غلطی کو موجب فسق قرار دیا جائے، خواہ اجتہادی غلطی کے منکر اس نتیجہ کو تسلیم کریں یا اس سے بیزاری کا اظہار کریں"۔ (حوالہ اوپر گذرا)۔

آگے لعل شاہ صاحب نے محمود احمد عباسی صاحب اور مودودی صاحب دونوں کے بارے میں لکھا ہے:

"دونوں حضرات کی روش جمہور اہل سنت کے خلاف ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 191)

یعنی ثابت ہوا کہ لعل شاہ صاحب نے اپنے تئیں جس قول کو "جمہور اہل سنت کا دوسرا قول" بتایا ہے اور دلائل کے لحاظ سے اسے راجح بھی لکھا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "باطل" پر سمجھا جائے، اور لعل شاہ صاحب یہ بھی تسلیم کر رہے ہیں اس کا آگے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی اس غلطی (یعنی خطائے منکر) کو موجب فسق قرار دیا جائے خواہ خطائے اجتہادی کے منکر (یعنی اسے خطائے منکر، باطل اور اثم وعصیان و جور وغیرہ کہنے والے) اس نتیجہ کو تسلیم کریں یا اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔

واضح رہے کہ مودودی صاحب کی جو عبارت لعل شاہ صاحب نے پیش کی ہے اس میں مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فسق کا مرتکب نہیں لکھا، لیکن لعل شاہ صاحب لکھ رہے ہیں کہ خطائے اجتہادی کے انکار کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے چاہے کوئی صراحت کے ساتھ اسے فسق کہے یا نہ کہے، اور لعل شاہ صاحب نے مودودی صاحب کی بات کو "جمہور اہل سنت کے خلاف" بھی لکھا ہے تو اب لعل شاہ صاحب ان تمام بزرگوں پر کیا فتویٰ لگائیں گے جن کی عبارات وہ خود پیش کر آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ "خطائے منکر" اور "باطل" کے مرتکب ہوئے تھے؟ بلکہ لعل شاہ صاحب نے تو خود صفحہ 181 پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی زبان سے اہل شام کو "فاسق وظالم" کہلوایا ہے، تو پھر مودودی صاحب کا موقف تو "جمہور اہل سنت کے دوسرے قول" کے عین مطابق ہوا ناں؟ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں تھی

پھر مودودی صاحب نے جو لکھا ہے کہ:

اجتہادی غلطی ہم صرف اس رائے کو کہہ سکتے ہیں جس کے حق میں کوئی شرعی استدلال ہو مگر وہ صحیح نہ ہو"۔

تو مودودی صاحب کی یہ بات بھی عین اصول اجتہاد کے مطابق ہے کہ شرعی اجتہاد ہوتا ہی وہ ہے جس کی بنیاد کوئی شرعی استدلال ہو، کیونکہ اجتہاد کے لئے کسی اصل شرعی کا ہونا ضروری ہے، بلا کسی اصل شرعی کے اجتہادِ شرعی ہو ہی نہیں سکتا اور وہی اصلِ شرعی، مُجتہد کی دلیل ہوتی ہے، چونکہ لعل شاہ صاحب فقہی طور پر حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے لئے بطور مثال عرض ہے کہ علماء حنفیہ رفع یدین، آمین بالجہر وغیرہ کرنے کو جائز اسی لئے تو کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث موجود ہیں، ورنہ ہم جائز ہی کیوں کہتے؟ اس لئے سوال یہاں یہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس دلیل تھی یا نہیں، وہ حق پر تھے یا نہیں، ان کے پاس تو دلیل یقیناً تھی اور وہ حق پر بھی تھے، سوال یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی جب مجتہد ہیں تو کیا ان کے پاس اپنے اجتہاد کی کوئی بنیاد یا اصل شرعی تھی یا نہیں؟ اگر نہیں تو وہ مجتہد ہی نہیں کہلا سکتے، اگر تھی تو

پھر سوال صرف ترجیح کا رہ جائے گا نہ کہ جائز و ناجائز اور حق و باطل کا۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کی ہر دلیل ضرور دنیا والوں کو معلوم بھی ہو، تو بالفرض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی دلیل اگر ہمیں معلوم نہ ہو تو اس سے اس کا عدم لازم نہیں آتا اور جب دلیل ہوئی تو بادلیل مجتہد کو اس تحدی اور قطعیت کے ساتھ مخطی کہنا بلکہ "خطائے عنادی کا مرتکب" کہنا بجائے خود خطا ہے، جیسے مثلاً امام شافعیؒ کی مستدلّہ احادیث رفعِ یدین ان کے موقف کے صحیح ہونے کی دلیل ہیں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام ابوحنیفہؒ کی عدمِ رفعِ یدین والی حدیث غلط ہو جائے، یا جیسے کوئی حضرت امام شافعیؒ کی طرف سے رفعِ یدین کی حدیث پیش کر کے یوں کہہ دے کہ اس حدیث کے پیشِ نظر معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ اس مسئلہ میں مخطی تھے اور ان کی خطا عنادی تھی یا اس کا عکس، ظاہر ہے کہ ایسا طریقہ درست نہیں یہ وجوہِ فاسدہ میں سے ہے جو عندالحنفیہ قابلِ حجت نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "مجتہد" مانا جائے تو پھر یہ ماننا لازمی ہے کہ یہ مسئلہ منصوصہ نہ تھا ورنہ اجتہاد کا کیا معنیٰ؟ اور اگر پہلے ان کی طرف "خطائے منکر"، "باطل" اور "اثم وعصیان وجور" وغیرہ کی نسبت کی جائے اور اسے جمہور اہلِ سنت کا راجح قول بتایا جائے اور پھر انہیں "مجتہد" بھی کہا جائے تو یہ اجتماعِ نقیضین ہے۔

نیز یاد رہے! جب مسئلہ منصوصہ نہیں ہے اور اس میں اجتہاد ہوا ہے تو مجتہد کے اجتہاد کے خطا و صواب کا اب وحی کا دروازہ بند ہونے کے بعد قطعی فیصلہ بھی دنیا میں نہیں ہو سکتا صرف ترجیح ہو سکتی ہے کما صرّح به العلماء، مصیبت پر مصیبت یہی ہے کہ دعویٰ اجتہاد کے ساتھ "خطا" کا فیصلہ صادر کرنے والے حضرات نے شاید اس چیز کو پیشِ نظر نہیں رکھا کہ اجتہاد ہمیشہ غیر منصوص چیزوں میں ہوا کرتا ہے، منصوصات میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، منصوصات میں تو یا حق ہے یا باطل۔

الغرض! لعل شاہ صاحب نے جو بزعمِ خود جمہور اہلِ سنت کے دو قول ذکر کیے ہیں وہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں، کیونکہ پہلے قول کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "مجتہد" بتایا گیا ہے اور دوسرے قول کے مطابق ان کی خطا کو "عنادی" اور "باطل" بتایا گیا ہے، اس لئے لعل شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ "دونوں

اقوال کا مآل ایک ہی ہے" یہ کسی طرح بھی درست نہیں۔

لعل شاہ صاحب کے قلم سے بھی آخر ان کے اندر کی بات نکل ہی گئی

مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی غلطی کو محض "غلطی" سمجھتے ہیں، اجتہادی غلطی نہیں تسلیم کرتے، اس پر لعل شاہ صاحب نے یہ تبصرہ بھی کیا ہے کہ:

"مودودی صاحب جس راستہ پر چلے ہیں اس راستہ پر شیعہ اور معتزلہ کے قدموں کے نشان ملتے ہیں البتہ بعض اہل السنہ بھی شاید بھٹک کر اسی راہ پر آنکلے ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 191)

غور فرمائیں! مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "مجتہد مخطی" تسلیم کرنے سے انکار کیا اور صرف "مخطی" کہا، ان کی اس بات کو لعل شاہ صاحب "شیعہ اور معتزلہ" کا راستہ بتا رہے ہیں، یہ وہی بات ہے جو ہم پہلے علامہ ابن حزم کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں کہ:

"تمام شیعہ، بعض مرجئہ، جمہور معتزلہ اور بعض اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان جنگوں میں درست تھے"۔

(الفِصل في الملل والأهواء والنِّحل ، ج4ص119و120)

اور امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ بھی گذر چکا کہ:

"روافض، زیدیہ، بعض معتزلہ جیسے ابراہیم النظام اور بشر بن معتمر اور بعض مرجئہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ان جنگوں میں درست تھے اور آپ کے ساتھ جن لوگوں نے جنگ کی وہ غلطی پر تھے پس یہ لوگ حضرت طلحہ و زبیر و سیدہ عائشہ و معاویہ رضی اللہ عنہم کو خطا پر کہتے ہیں"۔

(مقالات الاسلاميين، ج 2ص 145، المكتبة العصرية ، بيروت)

دوسری طرف لعل شاہ صاحب نے جو اپنے زعم میں" جمہور اہل سنت کا دوسرا قول" بتایا ہے وہ بھی تو بعینہ وہی ہے جو مودودی صاحب نے لکھا ہے، تو کیا وہ سب لوگ بھی شیعہ و معتزلہ کی روش پر چل رہے ہیں اور

صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں جن کے اقوال نقل کرنے پر لعل شاہ صاحب نے تقریباً 10 صفحات سیاہ کیے ہیں؟

حق بات جانتے ہیں مگر مانتے نہیں
ضد ہے جناب شیخ تقدس مآب میں

ایک اہم تنبیہ

ہم لعل شاہ صاحب سے کئی صدیاں پہلے ہونے والے متعدد علماء کی عبارات پہلے نقل کر چکے ہیں جن میں صاف مذکور ہے کہ جنگ جمل و صفین کے بارے میں صحابہ کرام کے مواقف مختلف تھے بلکہ ان اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کی اکثریت ان جنگوں سے الگ رہی تھی، اور پھر قرن صحابہ کے بعد بھی اس بارے میں مختلف اقوال ملتے ہیں لیکن لعل شاہ صاحب نے یہ تاثر دیا ہے جیسے اس بارے میں اہل سنت کے صرف دو ہی قول ہیں، مثلاً ہم علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ پہلے نقل کر چکے ہیں جس میں انہوں نے جمہور صحابہ کا موقف یہ بتایا ہے کہ :

"وَذهب سعد بن أَبي وَقاص وَعبد الله بن عمر وَجُمْهُور الصَّحَابَة إِلَى الْوُقُوف فِي عَليّ وَأهل الْجمل وَأهل صفّين وَبِه يَقُول جُمْهُور أهل السّنة وَأَبُو بكر بن كيسَان"۔

یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر اور جمہور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا موقف ہے کہ ہم جنگ جمل اور جنگ صفین دونوں کے بارے میں توقف کرتے ہیں (یعنی ہم یہ فیصلہ نہیں دیتے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط۔ ناقل) اور جمہور اہل سنت اور ابوبکر بن کیسان کا یہی مسلک ہے۔

(الفصل في الملل والأهواء والنحل ،ج4،ص119و120، مكتبة الخانجى ، مصر)

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی جماعت کا قول یہ بتایا کہ :

"فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ: كِلَاهُمَا كَانَ مُجْتَهِدًا مُصِيبًا، كَمَا يَقُولُ ذَلِكَ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكَلَامِ وَالْفِقْهِ وَالْحَدِيثِ مِمَّنْ يَقُولُ: كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ، وَيَقُولُ: كَانَا مُجْتَهِدَيْنِ. وَهَذَا قَوْلُ كَثِيرٍ مِنَ الْأَشْعَرِيَّةِ وَالْكَرَّامِيَّةِ وَالْفُقَهَاءِ وَغَيْرِهِمْ، وَهُوَ قَوْلُ طَائِفَةٍ مِنْ أَصْحَابِ أَبِي حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ وَغَيْرِهِمْ..."۔

ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ دونوں (یعنی حضرت علی وحضرت معاویہ رضی اللہ عنہما) مجتہد مصیب تھے (یعنی اپنے اپنے اجتہاد میں ٹھیک تھے)، یہ قول متکلمین وفقہاء ومحدثین میں سے بہت سے لوگوں کا ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہی ہوتا ہے، اور کہتے ہیں کہ (چونکہ) وہ دونوں ہی مجتہد تھے (اس لیے دونوں مصیب تھے)، یہی قول ہے اشعریہ، کرامیہ اور فقہاء میں سے بہت سوں کا اور ان کے علاوہ دوسروں کا، نیز یہی قول ہے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے ایک جماعت کا۔

(منهاج السنة ، ص **447**، ج **4**، السعودية)

اسی طرح ایک جگہ لکھا:

"وَأَمَّا قِتَالُ الْجَمَلِ وَصِفِّينَ فَقَدْ ذَكَرَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ مَعَهُ نَصٌّ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنَّمَا كَانَ رَأْيًا وَأَكْثَرُ الصَّحَابَةِ لَمْ يُوَافِقُوهُ عَلَى هَذَا الْقِتَالِ، بَلْ أَكْثَرُ أَكَابِرِ الصَّحَابَةِ لَمْ يُقَاتِلُوا: لَا مَعَ هَؤُلَاءِ وَلَا مَعَ هَؤُلَاءِ، كَسَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، وَابْنِ عُمَرَ، وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، وَمُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ، وَأَمْثَالِهِمْ مِنَ السَّابِقِينَ الْأَوَّلِينَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ، مَعَ أَنَّهُمْ مُعَظِّمُونَ لِعَلِيٍّ، يُحِبُّونَهُ وَيُوَالُونَهُ وَيُقَدِّمُونَهُ عَلَى مَنْ سِوَاهُ، وَلَا يَرَوْنَ أَنَّ أَحَدًا أَحَقُّ بِالْإِمَامَةِ مِنْهُ فِي زَمَنِهِ لَكِنْ لَمْ يُوَافِقُوهُ فِي رَأْيِهِ فِي الْقِتَالِ، وَكَانَ مَعَهُمْ نُصُوصٌ سَمِعُوهَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ تَدُلُّهُمْ عَلَى أَنَّ تَرْكَ الْقِتَالِ وَالدُّخُولِ فِي الْفِتْنَةِ خَيْرٌ مِنَ الْقِتَالِ، وَفِيهَا مَا يَقْتَضِي النَّهْيَ عَنْ ذَلِكَ، وَالْآثَارُ بِذَلِكَ كَثِيرَةٌ مَعْرُوفَةٌ"۔

جہاں تک جمل وصفین کی جنگوں کا تعلق ہے تو خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات ذکر فرمائی کہ یہ جنگیں کرنے کے لئے ان کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی نص نہیں تھی بلکہ یہ اقدام انہوں نے اپنی رائے سے کیا، اور اکثر صحابہ نے اس جنگ پر ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا، بلکہ اکثر اکابر صحابہ نے دونوں فریقوں میں سے کسی کے ساتھ مل کر بھی قتال میں حصہ نہیں لیا، جیسا کہ سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، اسامہ بن زید، محمد بن مسلمہ اور ان جیسے دوسرے مہاجرین وانصار میں سے سابقون اولون صحابہ اور ان کی اچھی پیروی کرنے والے (رضی اللہ عنہم) اس کے باوجود کہ یہ سب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تعظیم کرتے تھے، آپ سے محبت و دوستی بھی رکھتے تھے، آپ کو دوسروں سے مقدم رکھتے تھے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ آپ کے زمانہ میں آپ سے زیادہ امامت (خلافت) کا کوئی اور بھی حق دار ہے، لیکن اس کے باوجود ان حضرات نے جنگ کے معاملہ میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا کیونکہ ان کے پیش نظر وہ نصوص (احادیث) تھیں جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھی تھیں جو یہ بتلاتی تھیں کہ جنگ کا ترک کرنا اور فتنہ میں داخل نہ ہونا جنگ کرنے سے بہتر ہے جس سے یہ بات سمجھ آتی تھی کہ اس بات سے منع کیا جا رہا ہے، اور اس بارے میں آثار بہت زیادہ اور معروف ہیں۔

(منهاج السنة ، ص 333، ج 6، السعودية)

تو جمہور علماء اہل سنت، صرف گنتی کے وہی چند مرغینانی، جونپوری، سلہٹی، جرجانی، قنوجی، شوکانی، سالمی اور سہارنپوری وغیرہ نہیں جن کے حوالے لعل شاہ صاحب نے نقل کیے ہیں جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کو خطائے منکر کا مرتکب، علی الباطل، سلطان جائر اور آثم و عاصی وغیرہ قرار دیا ہے بلکہ وہ ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ بھی اسلاف ہی ہیں اور سب بعد والوں سے بڑھ کر اسلاف ہیں، اور بعد والی ساری امت کے اسلاف

ہیں، جنہوں نے ان جنگوں کا زمانہ پایا، بلکہ حضرت عمارؓ کی شہادت کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اپنے موقف پر قائم رہے، اسے اجتہادی اختلاف ہی سمجھا اور حق و باطل کے فیصلے نہیں صادر کیے بلکہ توقف وسکوت اور کف لسان اختیار کیا۔

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی "عدالت" ساقط ہوگئی تھی؟

آگے لعل شاہ صاحب عنوان قائم کرتے ہیں "حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عدالت برقرار ہوگئی"، اور لکھتے ہیں :

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جمہور اہل سنت کی مذکورۃ الصدر آراء دورِ خلافتِ علی رضی اللہ عنہ میں ان کے خروج وقتال کے سلسلہ میں تھیں، لیکن جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان سے مصالحت کر کے خلافت سے دست بردار ہوگئے اور ساری جماعت ان پر متفق ہوگئی تو ان کی بغاوت ختم ہوگئی اور بالاتفاق ان کی عدالت برقرار ہوگئی، ازاں بعد ان کی طرف فسق و فجور اور ظلم و تعدی کی نسبت کرنا ظلم و تعدی ہے...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 191)

قارئین محترم! سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو لعل شاہ صاحب بھی صحابی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ پہلے لکھ آئے ہیں:

"(حضرت معاویہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور براہ راست مہبط وحی کے زیر تربیت رہ کر برکاتِ صحبت سے مستفید ہوئے اور سراج منیر کی نورانی شعاعوں سے قلب سلیم کو مستنیر فرمایا، چونکہ شرف صحابیت سے مشرّف ہیں لہٰذا اس پاکیزہ جماعت کے فرد ہیں جنہیں اللہ نے اپنے نبی کی صحبت کے لئے مختار فرمایا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 112)

اور شاہ صاحب خود اپنی کتاب کے شروع میں اپنا فلسفہ یوں جھاڑ آئے ہیں کہ:

"صحابہ فاسق نہیں، لیکن وہ معصوم بھی نہیں، ان سے موجباتِ فسق کا صدور ممکن ہے اور بعض نے

عمداً ارتکاب معصیت کیا ہے لیکن بتوفیق اللہ تعالیٰ توبہ کر لی عدالت ساقط نہ ہوئی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 47)

اور یہاں یہ بتا رہے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عدالت ساقط ہو چکی تھی اور اس وقت تک ان کی عدالت ساقط رہی جب تک حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان سے مصالحت نہ کر لی، اس کے بعد ان کی عدالت برقرار ہوگئی (یعنی اس سے پہلے برقرار نہ رہی تھی) لاحول ولاقوۃ الاباللہ، اور جو شاہ صاحب نے یہ لکھا ہے کہ:

"ازاں بعد ان کی طرف فسق و فجور اور ظلم و تعدی کی نسبت کرنا ظلم و تعدی ہے"۔

اس کا واضح اور صریح مطلب یہی نکلتا ہے کہ صلح حسن رضی اللہ عنہ سے پہلے تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف "فسق و فجور اور ظلم و تعدی" کی نسبت کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس کے بعد ایسا کرنا بذات خود ظلم و تعدی ہے۔

یہ لعل شاہ صاحب کی بڑی خطرناک تعبیر ہے، اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ انہوں نے خود محمود احمد عباسی صاحب اور مودودی صاحب پر تعریض کرتے ہوئے اور ان دونوں حضرات کی روش کو جمہور اہل سنت کے خلاف بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اجتہادی غلطی سے انکار کا لازمی غیر منفک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فریقین میں سے ایک کو برحق اور دوسرے کو باطل سمجھا جائے اور ان کی غلطی کو موجب فسق قرار دیا جائے خواہ اجتہادی غلطی کے منکر اس نتیجہ کو تسلیم کریں یا اس سے انکار کریں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 190و191)

لیکن اب اسی صفحہ پر خود یہ تاثر دے رہے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی "عدالت" ختم ہو چکی تھی، اور یاد رہے! عدالت کا مقابل فسق و فجور اور ظلم ہوتا ہے جیسا کہ خود لعل شاہ صاحب کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صلح حسن رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف فسق و فجور اور ظلم و تعدی کی نسبت کرنے سے روک رہے ہیں تو نتیجہ کیا نکلا؟

مودودی صاحب نے اگرچہ یہ لکھا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی غلطی کو "محض غلطی" سمجھتے ہیں جو نیک نیتی کے ساتھ کی گئی، لیکن وہ اسے "اجتہادی غلطی" نہیں تسلیم کرتے، لیکن انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف "فسق وفجور" کی نسبت نہیں کی تھی، جبکہ لعل شاہ صاحب ان سے دو قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔

لعل شاہ صاحب کی ایک باطل تاویل

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ لعل شاہ صاحب کی مندرجہ بالا عبارت پر جب ان کی زندگی میں اعتراض کیا گیا تھا تو انہوں نے اپنی دوسری کتاب "بصیرت افروز تبصرہ" میں اپنی بات کی یوں تاویل کرنے کی کوشش کی کہ:

"عدل جس طرح بخل، اسراف اور تبذیر کا قسیم ہے اور جس طرح ظلم اور فسق کے بالمقابل استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح بغاوت کے بالمقابل بھی مستعمل ہوتا ہے...."۔

(بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 245)

اور اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے فقہ کی مختلف کتب کی عبارات نقل کی ہیں جن میں "سلطان عادل" اور "سلطان جائر" کا ذکر ہے اور "اہل البغی" کا ذکر ہے، اور پھر لکھا ہے کہ:

"کتب فقہ کی مندرجہ بالا عبارات میں عدل اور عادل کے الفاظ بغاوت اور باغی کے بالمقابل استعمال ہوئے، فاسق کے بالمقابل استعمال نہیں کئے گئے اور ہماری تحریر میں (یعنی استخلاف یزید والی تحریر میں۔ناقل) کہ بغاوت ختم ہو گئی اور عدالت برقرار ہو گئی، لفظ عدالت بغاوت کے بالمقابل استعمال ہوا، فاسق کے بالمقابل استعمال نہیں کیا گیا"۔

(بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 246)

اور اگلے صفحہ پر یوں لکھا:

"بندہ نے حضرت معاویہ۔پر باغی کا لفظ تو بولا .... مگر میں نے کہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فاسق نہیں کہا اور نہ ہی بندہ نے غیر عادل کا لفظ بولا ہے...."۔

(ایضاً صفحہ 247)

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب بخاری کی یہی خاصیت ہے کہ وہ اپنی بات کو اشاروں کنایوں میں کہتے ہیں اور جب کوئی ان کی بات کو سمجھ کر اس پر اعتراض کرتا ہے تو ایک دم وہ تاویل کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ میں نے تو یوں کہا تھا اور میرا مطلب تو یہ تھا، اب یہیں دیکھیں، استخلاف یزید میں ان کی عبارت یوں ہے:

"جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان سے مصالحت کر کے خلافت سے دست بردار ہو گئے اور ساری جماعت ان پر متفق ہوگئی تو ان کی بغاوت ختم ہوگئی اور بالاتفاق ان کی عدالت برقرار ہوگئی، <u>از اں بعد ان کی طرف فسق و فجور اور ظلم و تعدی کی نسبت کرنا ظلم و تعدی ہے</u>...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 191)

اس عبارت میں ان الفاظ پر توجہ مرکوز کریں" از اں بعد ان کی طرف فسق و فجور اور ظلم و تعدی کی نسبت کرنا ظلم و تعدی ہے"، اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ" قبل از اں ان کی طرف فسق و فجور اور ظلم و تعدی کی نسبت ہو سکتی تھی"؟ جب آپ نے خود" عدالت" کے بالمقابل" فسق و فجور اور ظلم و تعدی" کے الفاظ لکھ دیے تو اب یہاں آپ یہ تاویل کیسے کر سکتے ہیں کہ میں نے تو عدالت کو بغاوت کے بالمقابل استعمال کیا ہے؟ ہاں اگر آپ کی عبارت یوں ہوتی کہ" از اں بعد ان کی طرف بغاوت کی نسبت کرنا ظلم و تعدی ہے" تو آپ کی بعد میں کی گئی تاویل قابل قبول ہو سکتی تھی۔

پھر لعل شاہ صاحب نے یہ وضاحت نہیں کی کہ" باغی" عادل ہوتا ہے یا غیر عادل؟ اگر عادل ہوتا ہے تو" بغاوت" و" عدل" مقابل کیسے ہوئے؟ اور اگر" باغی" غیر عادل ہی ہوتا ہے تو جب آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو" باغی" کہا تو وہ خود بخود" غیر عادل" ہو گئے، پھر آپ کا یہ کہنا کتنا عجیب ہے کہ" میں نے حضرت معاویہ کو غیر عادل نہیں کہا"؟ کیا" باغی" اور" عادل" کے درمیان بھی کوئی درجہ ہوتا ہے؟

نیز شاہ صاحب نے یہ وضاحت بھی نہیں کی کہ" بغاوت" گناہ کبیرہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو" فسق" اور کس چیز کا نام ہے؟ کیا آپ کے نزدیک" بغاوت" کی کوئی ایسی قسم بھی ہے جو گناہ کبیرہ میں شمار نہ ہو؟ اگر ہے تو اسے کیا کہتے ہیں؟ اور کیا آپ نے اپنے خیال میں جمہور اہل سنت کے دوسرے قول کے ضمن میں حضرت

معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی زبانی "فاسق" نہیں کہلوایا؟ (دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 181)۔

اور پھر آپ نے خود "بصیرت افروز تبصرہ" میں زیرِ عنوان "بغاوت" یہ نہیں لکھا کہ:

"امام برحق کے خلاف خروج وقتال فسق اور ظلم کو مستلزم ہے کیونکہ امام برحق کی اطاعت لازم اور خروج عن الاطاعت ممنوع اور حرام ہے اور حرام اور ممنوع کا عمداً ارتکاب معصیت ہے..."۔

(بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 248)

اور پھر آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"جو لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف خطاءِ عنادی نسبت کرتے ہیں (جسے لعل شاہ صاحب نے جمہور اہل سنت کا دوسرا قول بتایا ہے۔ناقل) وہ فسق وفساد کی نسبت جائز سمجھتے ہیں.."۔

(ایضاً صفحہ 248)

اور پھر لعل شاہ صاحب نے فتاویٰ عزیزی کی عبارت بھی نقل کی ہے جس میں یہ تصریح ہے کہ:

"باغی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے"۔

(ایضاً صفحہ 249)

اور یاد رہے! لعل شاہ صاحب نے ہی ہمیں بتایا ہے کہ "دلائل کے لحاظ سے یہ دوسرا قول بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے" اور اب یہاں بتا رہے ہیں کہ دوسرے قول کے جو قائل ہیں (جو کہ لعل شاہ صاحب کے مطابق جمہور اہل سنت ہی ہیں) وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف فسق وفساد کی نسبت جائز سمجھتے ہیں۔

پھر غور فرمائیں! لعل شاہ صاحب اپنے اس فلسفہ کی بنیاد کئی صدیاں بعد پیدا ہونے والے" کچھ بزرگوں کی آراء" کو بنا رہے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ سب کہا ہے، اور مزے کی بات لعل شاہ صاحب نے اپنے خود ساختہ "جمہور اہل سنت" کے اقوال ذکر کرتے ہوئے بحوالہ "الہدیۃ السنیۃ" ایک قول یوں نقل کیا ہے اور اس پر کوئی تبصرہ یا رد نہیں کیا:

"کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) اور ان کے ساتھی حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مقابلہ میں خطا پر تھے اور

اسی خطا پر مرتے دم تک قائم رہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 180)

جس سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے مرتے دم تک "بغاوت" سے توبہ نہیں کی تھی، اور اب یہاں لعل شاہ صاحب ہمیں بتا رہے ہیں کہ:

"جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان سے مصالحت کر کے خلافت سے دست بردار ہو گئے اور ساری جماعت ان پر متفق ہوگئی تو ان کی بغاوت ختم ہوگئی"۔

اب کون سی بات درست ہے؟ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مرتے دم تک بغاوت سے توبہ نہیں کی تھی اور اپنی خطا پر قائم رہے تھے تو پھر ان کی جو عدالت ساقط ہوئی تھی وہ بحال کیسے ہوئی؟ اور اگر انہوں نے صلح حسن رضی اللہ عنہ کے وقت اپنی بغاوت سے توبہ کر لی تھی تو اس کا ثبوت لعل شاہ صاحب کو پیش کرنا چاہیے تھا، بات تو مکمل کرنی چاہیئے ناں!۔

نیز کیا لعل شاہ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت ایک "غیر عادل باغی" کے سپرد کر دی تھی اور امت کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دی تھی" جس کی عدالت ساقط تھی"؟

لعل شاہ صاحب، سید مودودی سے بھی دس قدم آگے

مسئلہ یہی ہے کہ لعل شاہ صاحب دراصل مودودی صاحب سے بھی دس قدم آگے ہیں لیکن اپنے اندر چھپے نظریات کو گھما پھرا کر بیان کرتے ہیں یا یوں کہیں کہ" اہل سنت" نام کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں، اور چونکہ ان کے نام کے ساتھ" فاضل دارالعلوم دیوبند" بھی لگا ہوا ہے اس لئے مودودی صاحب پر گرجنے برسنے والے ہمارے علماء نے" استخلاف یزید" میں چھپے زہر کی طرف توجہ دینے کی زحمت ہی نہیں کی، انہوں نے صرف یہ دیکھا کہ لعل شاہ صاحب نے" یزید بن معاویہ" پر خوب لعن طعن کیا ہے اس لئے انہوں نے مسلک اہل سنت کا حق ادا کر دیا ہے، باقی رہے سیدنا معاویہ اور دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) تو آج کل کے سنیت کے ٹھیکیداروں کے ہاں اہل سنت ہونے کا معیار ان کا دفاع نہیں بلکہ یزید بن معاویہ کو فاسق و فاجر اور شرابی و

زانی بلکہ کافر ثابت کرنا ہے اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں، مولانا عبد الجبار سلفی نامی ایک صاحب نے قاضی مظہر حسین چکوالی مرحوم کی سوانح حیات لکھی ہے اس میں لعل شاہ صاحب کی کتاب پر مختصر سا" ہومیو پیتھک" قسم کا تبصرہ کیا ہے کہ:

" یہ کتاب ان کے گہرے علم وضبط تحقیق کی آئینہ دار ہے اور انہوں نے فسق یزید کے پرچار اور تحفظ آل نبی ﷺ پر خاطر خواہ علمی مواد قلمبند کر دیا مگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بابت ان سے کچھ ایسی بے احتیاطیاں سرزد ہو گئیں تھیں جن کا صدور اس قسم کی مباحث میں شعوری یا لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے.. "۔

(مظہر کرم، صفحہ 900 طبع اول 2020ء)

غور فرمائیں! تبصرہ نگار کے نزدیک "فسق یزید کا پرچار" سب سے اہم چیز ہے کہ پہلے اس کارنامے پر لعل شاہ صاحب کی تعریف و توصیف کی جارہی ہے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لعل شاہ صاحب کی (بقول سلفی صاحب) " بے احتیاطیوں" کو یوں ذکر کیا جارہا ہے جیسے وہ معمولی بات ہو۔

پھر واقعہ یوں ہوا کہ جب سید لعل شاہ صاحب بخاری نے " استخلاف یزید" شائع کی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی قابل اعتراض عبارات کو لے کر حضرو ضلع اٹک کے علماء مولانا محمد صابر رحمۃ اللہ علیہ مولانا عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد امتیاز صاحب حفظہ اللہ نے ان عبارات کے رد پر ایک مختصر رسالہ " القول السدید فی جواب استخلاف یزید" شائع کیا تھا جس میں کچھ علماء سے فتاویٰ لے کر بھی نقل کیے گئے، اس پر لعل شاہ صاحب نے ان حضرات پر اٹک کی عدالت میں ہتک عزت کا دعویٰ بھی کیا تھا جس کی طویل تفصیل ہے، اس مقدمہ میں حضرو کے ان علماء کی جانب سے بطور گواہ جن علماء نے عدالت میں پیش ہو کر اپنے بیان قلمبند کروائے ان میں حضرت علامہ خالد محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مانچسٹر) بھی تھے، لیکن عبد الجبار سلفی نامی صاحب " القول السدید" کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

" ہم سمجھتے ہیں کہ بالفرض شاہ صاحب کی کتاب استخلاف یزید میں حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی

ذات کے متعلق غیر محتاط لب ولہجہ نہ بھی ہوتا تو بھی جمعیت اشاعۃ التوحید والسنہ نے اس کی مخالفت کرنا تھی کیونکہ فسق یزید کا عنوان بھی ان حضرات کا معدہ قبول نہیں کرتا، تاہم شاہ صاحب کے صحابی رسول ﷺ کے متعلق غیر ذمہ دارانہ بعض جملوں نے ان کے اپنوں کو بھی ان کا مخالف کردیا اگرچہ یہ مخالفت فی نفسہ حب معاویہ رضی اللہ عنہ کے درپردہ محبت یزید پر مبنی تھی... "۔

(مظہر کرم، صفحہ 901)

قارئین محترم! آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ "القول السدید" میں لعل شاہ صاحب کی صرف ان عبارات کو موضوع بحث بنایا گیا تھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام سے متعلق تھیں، "فسق یزید" کے موضوع کو اس میں قطعاً زیر بحث نہیں لایا گیا تھا، لیکن دفاع صحابہ کے لئے ان حضرات کی اس کاوش کو آج کل کے سنیت کے ٹھیکیدار یہ کہہ کر داغدار کر رہے ہیں کہ ان حضرات نے جو لعل شاہ صاحب کی مخالفت کی اس کی وجہ حب معاویہ نہیں بلکہ محبت یزید تھی، یہ ایک مثال ہم نے صرف یہ بتانے کے لئے پیش کی ہے کہ مودودی صاحب کی "خلافت وملوکیت" کے رد میں کتابیں لکھنے والے اور زمین و آسمان سر پر اٹھانے والے مذہب اہل سنت کے ٹھیکداروں نے "استخلاف یزید" کا باقاعدہ جواب لکھنے کی زحمت نہ فرمائی بلکہ ایک طرح سے اس کی تعریف کی کہ اس میں یزید بن معاویہ کی ایسی تیسی کی گئی ہے، جس کا اثر یہ ہوا کہ آج لعل شاہ صاحب کے مریدین کے حلقہ سے یہ آوازیں اٹھنا شروع ہوگئیں کہ یہ ایک لاجواب کتاب ہے، اگر اس کا کوئی جواب ہوتا تو لکھا جاتا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "استخلاف یزید" مودودی صاحب کی "خلافت وملوکیت" سے کہیں زیادہ زہر آلود کتاب ہے بلکہ یوں کہیں کہ جس بات کو مودودی صاحب یوں لکھتے تھے کہ "اس بارے میں میری رائے یہ ہے.... " لعل شاہ صاحب نے اسی بات کو "جمہور اہل سنت کا قول" بنا کر حوالوں سے مزین کردیا۔ حال ہی میں (جولائی 2025ء میں) جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مفتی محمد زاہد صاحب کی طرف سے بھی سوشل میڈیا پر ایک مختصر مضمون نشر کیا گیا جس کے ساتھ لعل شاہ صاحب کی دو کتابوں "استخلاف یزید" اور "بصیرت افروز تبصرہ" کا ٹائٹل دے کر یہ لکھا گیا کہ:

" نیچے مولانا سید لعل حسین شاہ صاحب کی دو کتابوں کی تصویر دی گئی ہے، جمہور اہل السنت کا نقطہ نظر

جاننے کے لئے یہ بہت مفید ہیں"۔

(جبکہ مصنف کا نام" سید لعل شاہ بخاری" ہے، نہ کہ" سید لعل حسین شاہ" ۔ناقل)

بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ درمیان میں آگیا، ہم واپس اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں، تو لعل شاہ صاحب نے جو عنوان باندھا کہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عدالت برقرار ہوگئی" اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ایک عرصہ تک ان صحابی رسول کی عدالت زائل رہی اور وہ" غیر عادل" رہے، اور ہمارے لئے اس بات پر صدق دل سے ایمان لانا لازم ہے کیونکہ صاحب ہدایہ علی بن ابی بکر المرغینانی، علامہ ابن نجیم، محمد بن محمود بابرتی اور قاضی خان جیسے اکابرین اہل سنت نے یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے، اور ان کی بات کو نہ ماننے والا بھلا اہل سنت میں کیسے رہ سکتا ہے؟ اگر چہ خود لعل شاہ صاحب لکھ آئے ہیں کہ:

" جرح تو خیر دور کی بات ہے پچھلی امت صحابہ کی نسبت یہ حیثیت بھی نہیں رکھتی کہ ان کی تعدیل کر سکے وہ بزرگوار ہماری تعدیل سے بھی بالاتر ہیں وہ جن کی تعدیل خدا اور رسول نے کر دی ہے انہیں معیار تعدیل پر لانا بھی ان کی توہین ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 48)

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

آگے لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے:

" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور خلافت انقضائے خلافت راشدہ کا عبوری دور تھا اور وہ اسلام میں سب سے پہلے مَلِک (بادشاہ) تھے، حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہما کی خلافت سے دستبرداری اور حضرت امیر معاویہ سے مصالحت کے بعد اگر چہ عدالت امیر معاویہ کی برقرار ہوگئی اور خلافت بھی ان کو مفوض ہوگئی، مگر تاہم ان کی خلافت، خلافت علی منہاج النبوہ نہیں تھی، خلافت راشدہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ختم ہوگئی تھی اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کو

"مُلک" بادشاہت کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اسلام میں سب سے پہلا بادشاہ قرار دیا گیا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 191و192)

قارئین محترم! پہلے تو یہ غور فرمائیں کہ لعل شاہ صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس میں کم از کم چار بار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کے لئے" خلافت" کا لفظ خود لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لعل شاہ صاحب کے نزدیک ان کے دور کو بھی خلافت کہا جا سکتا ہے لیکن چونکہ بعد کے کچھ لوگوں نے انہیں" ملک" یعنی بادشاہ کے لفظ سے یاد کیا ہے اس لئے وہ بتاتے ہیں کہ انہیں" خلیفہ" نہیں بلکہ" مَلِک" یعنی بادشاہ کہا جائے گا۔

پھر لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت" علیٰ منہاج النبوۃ" نہیں تھی، اس پر ہمارا سوال ہے کہ پھر کس منہاج پر تھی؟ کون سا کفر ان کی خلافت میں آگیا تھا؟ کون سا غیر نبی والا قانون اور ضابطہ انہوں نے ملک میں چلایا تھا؟ آپ نے خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر سارا تبرا کرنے کے بعد آخر میں یہ لکھا ہے:

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کرنا ممنوع ہے، ان کی خلافت بحیثیت مجموعی خیر تھی قطع نظر ان چند اشیاء کے جن کی وجہ سے ان پر نکیر کی گئی ہے ان کی خلافت میں خیر غالب تھی .... (پھر لعل شاہ صاحب نے" تطہیر الجنان"،" العواصم من القواصم" اور" البدایۃ والنہایۃ" کے حوالے دے کر لکھا ہے).... معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں خیر اور خلافت نبوت کا پہلو غالب تھا اگرچہ ملک اور امور منکرہ کی آمیزش بھی تھی.. "۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 248)

پھر لعل شاہ صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں خود لکھا ہے کہ:

"ان کی عمر کا اکثر و بیشتر حصہ جہاد میں گذرا ہے........ ان کی قیادت اور امارت میں بری بحری جنگیں لڑی گئیں، بتحقیق ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں جن مجاہدین کو دیکھ کر مسرور ہوئے تھے ان کے قائد اولین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے اسی طرح انہوں نے اپنے

زمانہ خلافت میں بے شمار لشکر مختلف علاقوں کی طرف بھیجے اور بہت سی فتوحات ہوئیں.. "۔

(ملخصاً :استخلاف یزید، صفحہ 249و250)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے فتوحات کا تذکرہ کیا ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمات میں "اشاعت اسلام"، "تعمیر مساجد"، "ترفیہ عام"، "مظلوموں اور محتاجوں کی دادرسی" پر لکھا ہے، اور پھر بات یہاں ختم کی ہے:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رجب سنہ 60ھ میں وفات پائی اور یزید بن معاویہ مسند خلافت پر متمکن ہوا (یہاں بھی لفظ "خلافت" لکھا ہے۔ناقل).... اور اس سے قبل حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت مجموعی حیثیت سے خیر تھی... ہماری ہزار برس کی ریاضت سے ان کے دل کی ایک دھڑکن بدر جہا بہتر ہے رضی اللہ عنہ"۔

(ملخصاً:استخلاف یزید، صفحہ 250 تا257)

قارئین محترم! ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ خود لعل شاہ صاحب کے اقرار کے مطابق جو خلافت بحیثیت مجموعی خیر ہو اس کے بارے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ" وہ علی منہاج النبوۃ نہیں تھی" ؟

چونکہ یہ بڑا اہم موضوع ہے اکثر یہ آوازیں سننے کو ملتی ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت، خلافت راشدہ تو کیا ہوتی، سرے سے خلافت ہی نہیں تھی بلکہ "کٹ کھنی" بادشاہت تھی، اس لئے ہم اس پر تفصیل سے لکھتے ہیں کہ خلافت کی تعریف کیا ہے؟ خلیفہ راشد بننے کے لئے کن شرائط کا ہونا ضروری ہے اور خلیفہ راشد کون ہوتا ہے؟ نیز کیا "خلافت" و"ملوکیت" دو متضاد چیزیں ہیں؟

❀❀❀

خلافت وملوکیت کی بحث

کیا "خلافت" اور "ملوکیت" دو متضاد چیزیں ہیں؟

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ فی الواقع اور فی نفسہ اسلام میں "ملوکیت" یعنی بادشاہت مذموم نہیں ہے، صرف وہ بادشاہت مذموم ہے جو اللہ جل شانہ اور رسول اللہ ﷺ کی بتلائی ہوئی حدود سے نا آشنا ہو، لیکن وہ بادشاہ جس کا مقصد دین حق کی اشاعت اور اس کی سربلندی، اسلامی تہذیب وتمدن کا نفاذ اور اس کا فروغ ہو اس بات سے قطع نظر کہ وہ کس طریقے سے اس منصب پر فائز ہوا ہے یا باپ کے مرجانے کے بعد وراثتاً تخت نشین ہوا ہے، اسلام کی نظر میں وہ پسندیدہ اور قابل تعریف ہے، آج کل لوگوں نے بادشاہت کو خلافت ونبوت کے منافی تصور کر رکھا ہے جس کے لئے کوئی شرعی بنیاد نہیں، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی اصطلاحی طور پر بادشاہ ہی تھے یعنی طریقہ ولی عہدی ہی سے خلیفہ بنے تھے لیکن اپنے طرز حکمرانی کی بنا پر اپنا نیک نام چھوڑ گئے کہ ان کا نام خلفائے راشدین میں شامل کر دیا جاتا ہے، اسی طرح اسلامی تاریخ میں اور بھی متعدد بادشاہ ایسے گزرے ہیں جن کے روشن کارنامے تاریخ اسلام کے اوراق پر بکھرے پڑے ہیں، لہٰذا اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کوئی شخص "بادشاہ" کہنے پر ہی مُصر ہو تو بصد شوق کہے، ان جیسا عادل اور خدا ترس بادشاہ دنیا کی پوری تاریخ پیش نہیں کر سکتی لیکن اگر کوئی شخص اس نقطۂ نظر سے ان کو "بادشاہ" کہے کہ وہ اسلامی طرز حکومت سے دور ہٹ گئے تھے ان کے دور حکومت کا نظام اسلامی نہیں بلکہ جاہلی تھا اور ان کو شریعت کی حدود پھاندجانے میں کوئی باک نہ تھا، تو یہ سراسر ظلم، غیر معتدل طرز فکر اور یکسر امر واقعہ کے خلاف ہے، کیونکہ یہ خیر القرون کا ابتدائی دور تھا، اور یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ جس دور اور زمانہ کو نبی کریم ﷺ اپنی امت کا بہترین زمانہ فرمائیں اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ معاذ اللہ قانون شریعت نظر انداز کر دیا گیا تھا اور منہاج نبوت سے ہٹ کر کوئی اور منہاج نافذ کر دیا گیا تھا اور ہزاروں صحابہ وتابعین بیس سال تک اسی منہاج نبوت کے مخالف نظام کو قبول کر کے چُپ سادھے بیٹھے رہے۔

چنانچہ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

ولا يقال إنّ الملك أدون رتبة من الخلافة فكيف يكون خليفة

ملكا، واعلم أنّ الملك الّذي يخالف بل ينافي الخلافة هو الجبروتيّة المعبر عنها بالكسرويّة التي أنكرها عمر على معاوية حين رأى ظواهرها، وأما الملك الّذي هو الغلبة والقهر بالعصبية والشوكة فلا ينافي الخلافة ولا النبوّة فقد كان سليمان بن داود وأبوه صلوات الله عليهما نبيّين وملكين وكانا على غاية الاستقامة في دنياهما وعلى طاعة ربّهما عزّ وجل۔

یہ نہ کہا جائے کہ بادشاہت خلافت سے مرتبہ میں کم ہے لہٰذا خلیفہ، بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جان لو کہ! جو ملوکیت (بادشاہت) خلافت کے منافی ہے وہ جبروتیت ہے جسے کسرویت سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی گورنری کے زمانہ میں. ناقل) ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ناپسند فرمایا تھا، لیکن وہ بادشاہت جو غلبہ، شوکت اور عصبیت سے حاصل ہوتی ہے وہ نہ خلافت کے منافی ہے اور نہ ہی نبوت کے منافی ہے، سلیمان علیہ السلام اور ان کے والد داوود علیہ السلام نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے کاموں میں نہایت استقامت والے اور اپنے رب کی اطاعت کے پابند تھے۔

(تاریخ ابن خلدون، ج2ص650، دار الفکر بیروت)

واضح رہے کہ لعل شاہ صاحب بخاری نے انہی علامہ ابن خلدون کے بارے میں لکھا ہے:

"تاریخ کے بارہ میں علامہ ابن خلدون کو محقق تسلیم کیا گیا ہے، خصوصاً مقدمہ ابن خلدون بڑی گرانمایہ کتاب ہے، تاریخی واقعات کا فلسفیانہ ربط علامہ ابن خلدون کی خصوصیات میں سے ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 67)

تنبیہ

علامہ ابن خلدون کی مندرجہ بالا تحریر میں جو بیان ہوا ہے کہ:

”خلافت کے منافی وہ جبروتیت ہے جسے کسرویت سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی گورنری کے زمانہ میں. ناقل) ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ناپسند فرمایا تھا“۔

اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی گورنری کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کسرویت یا جبروتیت سے تعبیر فرمایا، ابن خلدون کا اشارہ غالباً اس واقعہ کی طرف ہے جو کتب تاریخ میں (بشرطِ صحتِ روایت) اس طرح منقول ہے کہ:

”جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی گورنری کے زمانے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں آپ کا استقبال کیا اور آپ سے ملاقات کی، جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ قریب ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ جلوس والے آپ ہیں؟ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جی ہاں! تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کا یہ حال ہے کہ جلوس آپ کے ساتھ ہے، اور مجھے یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ ضرورت مند لوگ آپ کے دروازے پر لمبے عرصے تک کھڑے رہتے ہیں، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو باتیں آپ تک پہنچی ہیں ان میں یہ بات بھی ہوگی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: اے امیر المؤمنین! ہم ایک ایسے علاقے میں ہیں کہ جہاں دشمن کے جاسوسوں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان کے سامنے حاکم کی عزت اور رعب و دبدبہ کا اظہار کیا جائے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی عزت ہوگی اور دشمن خوفزدہ بھی ہوں گے، پس اگر آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے تو میں ایسا کروں گا، اور اگر آپ منع فرمادیں گے تو میں ایسا کرنے سے رک جاؤں گا، تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فریا: اے معاویہ! میں نے آپ سے جس بات کے متعلق بھی پوچھا ہے، آپ نے میری تسلی کروادی ہے، لہٰذا میں نہ آپ کو اس کام کا حکم دیتا ہوں اور نہ ہی اس سے روکتا ہوں.... الخ“۔

(ملخصاً، البداية والنهاية، ج8ص181و 182، وزارة الاوقاف قطر)

علامہ محب الدین الخطیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"الخلافة والملك والإمارة عناوين اصطلاحية تتكيف في التاريخ باعتبار مدلولها العملي، والعبرة دائما بسيرة المرء وعمله. ومعاوية قد ولي الشام للخلافة الراشدة مدة عشرين سنة، ثم اضطلع بمهمة الإسلام كلها عشرين سنة أخرى في الوطن الإسلامي الأكبر بعد بيعة الحسن بن علي له، فكان في الحالتين قوّاما بالعدل، محسنا إلى الناس من كل الطبقات، يكرم أهل المواهب ويساعدهم على تنمية مواهبهم، ويسع بحلمه جهل الجاهلين فيعالج بذلك نقائصهم، ويلتزم في الجميع أحكام الشريعة المحمدية بحزم ورفق ومثابرة وإيمان. يؤمّهم في صلواتهم ويوجههم في مجتمعهم ومرافقهم ويقودهم في حروبهم......... والذي يتتبع سيرة معاوية في حكمه يرى أن حكومته في الشام كانت حكومة مثالية في العدل والتراحم والتآسي، لم يخير بين الطيب والأطيب إلا اختار الأطيب على الطيب. فإذا كان هذا المسلك في أربعين سنة يؤهل الأمير المسلم للخلافة على المسلمين وقد ارتضوه لذلك واغتبطوا به فهو خليفة، ومَن سمّاه مَلِكاً لا يستطيع أن يكابر في أنه من أرحم ملوك الإسلام وأصلحهم"۔

یعنی خلافت، بادشاہت اور امارت یہ اصطلاحی عنوانات ہیں، جن کی اصل کیفیت ان کے مدلول کے طرز عمل سے ہی معلوم ہو سکتی ہے، آدمی کی سیرت اور اس کا طرز عمل ہی ہمیشہ معتبر ہوتا ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسلسل 20 سال خلافت راشدہ میں شام کے گورنر رہے، پھر بیعت حسن رضی اللہ عنہ کے بعد 20 سال پوری اسلامی قلمرو کے خلیفہ رہے، دونوں حالتوں میں انہوں نے عدل وانصاف کے علم کو بلند سے بلند رکھا، تمام طبقات کے ساتھ نیک سلوک ان کا مقصد اور

شرفاء کی تکریم اور جہلاء سے عفو و درگذر ان کا شیوہ رہا، تمام امور میں پورے حزم و احتیاط کے ساتھ اور ایمان و استقامت کے ساتھ شریعت محمدیہ کے احکام کی پابندی کرتے، لوگوں کو نماز خود پڑھاتے، ان کی مجالس و محافل میں شریک ہوتے اور جنگ کے موقعے پر خود ان کی قیادت کرتے...... جو شخص بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی پر غور کرے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ شام میں ان کی حکومت عدل و انصاف، باہم رحمت و شفقت اور ہمدردی و اُخوّت کے لحاظ سے بے مثال تھی، خوب اور خوب ترین میں سے ہمیشہ خوب ترین کو اختیار کرتے رہے، چالیس سال تک جس نے اس طرح مسلمانوں کی خدمت کی ہو اور اس دوران میں مسلمان بھی ان سے خوش رہے ہوں، وہ بلاشک خلیفہ ہے، اور جو شخص انہیں "بادشاہ" کہنے پر مُصر ہو، وہ بھی اس حقیقت سے انکار کی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ تمام اسلامی بادشاہوں میں سب سے زیادہ رحم دل اور صالح ترین تھے"۔

اس کے بعد علامہ محب الدین الخطیب نے علماء و محدثین کے وہ تبصرے نقل کیے ہیں جو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار کے متعلق کیے ہیں، انہیں نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں :

"وقد أوردنا هذه الأمثلة ليعلم الناس أن الصورة الحقيقية لمعاوية تُخالف الصورة الكاذبة التي كان أعداؤه وأعداء الإسلام يُصَوِّرونه بها. فمن شاء بعد هذا أن يسمِّي معاوية خليفة وأميراً للمؤمنين......... ومن لم يملأ معاوية عينه وأراد أن يضن عليه بهذا اللقب فإن معاوية مضى إلى الله عز وجل بعدله وحلمه وجهاده وصالح عمله، وكان وهو في دنيانا لا يبالي أن يلقب بالخليفة أو الملك، وإنه في آخرته لأكثر زهدا بما كان يزهد به في دنياه۔

"یہ مثالیں ہم نے اس لئے ذکر کی ہیں تاکہ لوگ جان لیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حقیقی صورت اس جھوٹی صورت سے کس قدر مختلف ہے جس کی تصویر کشی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دشمن

اور اسلام کے دشمن کرتے ہیں، اس کے بعد ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اور امیر المؤمنین کہے..... اور جس کی آنکھ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نہیں بھاتے اور وہ انہیں یہ لقب دینے سے بخل برتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہماری دنیا کی اس بحث سے بے نیاز ہیں کہ انہیں خلیفہ کے لقب سے یاد کیا جائے یا بادشاہ کے نام سے، وہ اپنی آخرت میں اس چیز سے کہیں زیادہ بے رغبت ہوں گے جتنے وہ اپنی دنیوی زندگی میں پہلے رہے ہوں گے"۔

(تعليقات على العواصم من القواصم،ص215تا217، مكتب السنة،القاهرة)

ایک جگہ علامہ محب الدین الخطیب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا عمدہ بات لکھی ہے :

"ان كان مقياس الأهلية لذلك أن يبلغ مبلغ أبي بكر وعمر في مجموع سجاياهما، فهذا ما لم يبلغه في تاريخ الإسلام، ولا عمر بن عبد العزيز، وإن طمعنا بالمستحيل وقدرنا إمكان ظهور أبي بكر آخر وعمر آخر فلن تتاح له بيئة كالبيئة التي أتاحها الله لأبي بكر وعمر..."۔

یعنی اگر اہلیت کا پیمانہ یہ ہے کہ خلیفہ اپنی مجموعی سیرت کے لحاظ سے سیدنا ابو بکر و سیدنا عمر (رضی اللہ عنہما) کے مثل ہو تو پھر تاریخ اسلام میں ایسا کوئی خلیفہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا حتیٰ کہ عمر بن عبد العزیز (رحمۃ اللہ علیہ) بھی اس مقام کو نہیں پہنچ سکتے، اور اگر ہم کسی ناممکن چیز کی آس لگائے بیٹھے رہیں اور ہم ایک اور ابو بکر یا عمر (رضی اللہ عنہما) کا امکان تسلیم کرلیں، تب بھی وہ، وہ ابو بکر و عمر نہیں بن سکتے جو پہلے گذر چکے، کیونکہ ان کے لئے وہ ماحول اور سوسائٹی ہی سرے سے مفقود ہوں گے جو اللہ نے ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کے لئے مہیا کیے تھے..."۔

(تعليقات على العواصم من القواصم،ص221)

لعل شاہ صاحب نے انہی علامہ محب الدین الخطیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"علامہ محب الدین الخطیب نے العواصم من القواصم اور المنتقیٰ پر جو تعلیقات لکھے ہیں گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے البتہ بعض مقامات پر حد سے تجاوز کر گئے ہیں (کیونکہ وہ باتیں

لعل شاہ صاحب کے مخصوص افکار ونظریات کے خلاف ہیں. ناقل)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 72)

اب آئیے دیکھتے ہیں آخر" خلافت" ہوتی کیا ہے؟

خلافت کی تعریف

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت عامہ کی تعریف یوں فرمائی ہے :

" خلافت وہ ریاست عامہ ہے جو بذریعہ علوم دینیہ کے زندہ رکھنے اور بذریعہ ارکان اسلام کے قائم کرنے اور بذریعہ جہاد اور متعلقات جہاد قائم رکھنے کے جیسے لشکروں کا مرتب کرنا، مجاہدین کو وظائف دینا، مال غنیمت کو ان پر تقسیم کرنا، اور بذریعہ عہدہ قضا کے فرائض انجام دینے اور حدود کے قائم کرنے اور مظالم کے دور کرنے اور لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے منع کرنے کے بحیثیت نائب نبی ہونے کے حاصل ہوئی ہو.."۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، صفحہ 13 جلد 1 طبع قدیمی کتب خانہ کراچی)

اسی کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے" خلافت راشدہ" اور" خلافت جابرہ" کے درمیان فرق کرتے ہوئے بھی بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ جو خلیفہ اوپر مذکورہ کام احسن طریقے سے سر انجام دے گا اس کی خلافت، خلافت راشدہ ہوگی اور جو شریعت کے برخلاف عمل کرے، ضروری ذمہ داریوں سے سبکدوش نہ ہو اور شریعت کے احکام کی پابندی نہ کرے اس کی خلافت، خلافت جابرہ کہلائے گی۔

(دیکھیں :ازالۃ الخفاء، صفحہ 330، جلد 2)

لیکن دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تو درکنار نرے خلیفہ بھی نہ تھے بلکہ مَلِک یعنی بادشاہ تھے، اسی طرح ان کی حکومت بھی خلافت راشدہ تو رہی ایک طرف نری خلافت بھی نہ تھی بلکہ ملوکیت یعنی بادشاہت تھی، حالانکہ خلیفہ وخلافت کے جس قانون قاعدے اور اصول ضابطے سے ان سے پہلے حضرات خلفاء، خلفاء راشدین اور ان کی حکومتیں راشدہ خلافتیں بنی تھیں بعینہٖ اسی قانون قاعدے اور اصول

ضابطے سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفۂ راشد اور ان کی حکومت، خلافت راشدہ ثابت ہوتی ہے، جس کا مختصر بیان حسب ذیل ہے۔

اہل سنت علماء عقائد وکلام بالخصوص امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفۂ راشد کی استحقاقی شرائط اور اس کے منصبی فرائض بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اور جو حکمران وحکومت ان پر پورے اترے ہوں ان کو انھوں نے خلیفۂ راشد اور خلافتِ راشدہ ہی کہا اور مانا ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی شخص کے مستحق خلافت ہونے کی درج ذیل شرطیں لکھی ہیں۔

(1) مسلمان ہو، کافر نہ ہو

(2) عاقل ہو، مجنون وبے وقوف نہ ہو

(3) بالغ ہو، نابالغ نہ ہو

(4) مرد ہو، عورت نہ ہو

(5) حُر یعنی آزاد ہو، غلام نہ ہو

(6) متکلم، سمیع اور بصیر ہو، گونگا، بہرا اور اندھا نہ ہو۔

(7) شجاع یعنی بہادر وہوشیار ہو اور صاحب رائے ہو، (بزدل) آرام طلب اور ناتجربہ کار نہ ہو۔

(8) عادل اور صاحبِ مروت ہو، یعنی کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا ہو، صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والا، نیز وارستہ مزاج یعنی آزاد طبع اور بے پرواہ نہ ہو۔

(9) مجتہد ہو (اور بقول شاہ ولی اللہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مجتہد ہونے کے لیے صرف علمِ قرآن اور حفظ حدیث کافی تھا۔ ازالۃ الخفا مترجم، صفحہ 21 و22، جلد 1)

(10) پدری نسب سے قریشی ہو۔

(ملخصاً، ازالۃ الخفاء، مترجم، از صفحہ 17 تا 22، جلد 1)

جس شخص میں یہ شرطیں پائی جائیں وہ خلافت کا مستحق ہوتا ہے اور جب ایسے کسی شخص کو اربابِ حل و

عقد خلیفہ بنالیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں تو وہ خلیفۂ راشد ہوتا اور کہلاتا ہے ۔ چنانچہ شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہی استحقاقِ خلافت کی مذکورہ شرطوں کی تفصیل دے کر تصریح فرماتے ہیں کہ:

"الحاصل جب یہ شرطیں کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ مستحق خلافت سمجھا جائے گا اور اگر اس کو (اہل حل وعقد) خلیفہ بنائیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں تو وہ خلیفۂ راشد ہوگا"۔

(ازالۃ الخفاء، مترجم صفحہ 23 جلد 1)

خود لعل شاہ صاحب نے "ازالۃ الخفاء" کے بارے میں تسلیم کیا ہے کہ:

"حضرت شاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور معروف کتاب ہے اور اپنے موضوع پر بڑی مفید ہے، حضرت شاہ صاحب بلند پایہ مفسر و محدث ہیں، خلفائے راشدین کی خلافت کی حقیقت کا مختلف طرق سے اثبات کیا ہے.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 73)

بہر حال! حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خلیفۂ راشد ہونے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اس میں استحقاقِ خلافت کی مذکورہ تمام شرطیں پائی جائیں اور دوسری یہ کہ اہلِ حل وعقد اس کو خلیفہ بنالیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "خلیفۂ راشد" نہیں کہا جاسکتا؟

لٰہذا کسی شخص کے خلیفۂ راشد ہونے نہ ہونے کا پہلے بھی یہی معیار اور یہی قاعدہ تھا اور اب بھی یہی ہے اور آئندہ بھی یہی رہے گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور خاص قاعدہ وقانون کسی کے خلیفۂ راشد ہونے نہ ہونے کے لیے سُنی مسلک میں نہ پہلے کبھی ضروری قرار دیا گیا ہے اور نہ آئندہ ہی اس کو ضروری قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج تک جو کوئی خلیفۂ راشد ہوا ہے یا آئندہ ہوگا اسی قاعدے قانون کے تحت ہی ہوا ہے اور ہوگا۔ حتیٰ کہ پہلے چاروں خلفائے راشدین مہدیین (رضی اللہ عنہم) بھی اپنے اپنے دور میں جو خلیفہ ہوئے تھے تو اسی قاعدے قانون کے تحت ہی ہوئے تھے یعنی ان میں خلافتِ راشدہ کے استحقاق کی تمام شرطیں بھی پائی گئیں تھیں اور اہلِ حل وعقد نے

ان کو خلیفہ بھی بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔ یہی دونوں چیزیں خارج میں ان حضرات اِربعہؓ کے خلفائے راشدین ہونے کے لیے کافی سمجھی گئی تھیں ان کے علاوہ کوئی اور خاص چیز یا کوئی شرط ان کے لیے بھی ضروری قرار نہ دی گئی تھی۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ جن کو ساری دنیائے سنیت بالاتفاق خلیفہ راشد جانتی اور مانتی ہے (لعل شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے، دیکھیں استخلاف یزید، صفحہ 505) وہ بھی انہی دو باتوں کی بنیاد پر ہی خلیفہ راشد ہوئے تھے، لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلیفہ راشد ہونے نہ ہونے کا دارومدار بھی انہیں دو چیزوں پر ہوگا، ان کے علاوہ کسی اور خاص چیز یا کسی خاص شرط کی ضرورت ہرگز ہرگز نہ ہوگی، ان سے پہلے خلفاء راشدین کی طرح اگر ان میں بھی یہ دونوں چیزیں پائی گئی ہوں تو پھر بعد کی ساری دنیا کے انکار کے باوجود بھی یقیناً وہ خلیفہ راشد ہوں گے، اور اگر یہ دونوں چیزیں ان میں نہ پائی گئی ہوں تو پھر ساری دنیا کے ان کو ہزاروں مرتبہ خلیفہ راشد کہنے اور ماننے کے باوجود بھی وہ ہرگز ہرگز خلیفہ راشد نہ ہوں گے۔

اس اعتبار سے جب دیکھا جاتا ہے تو اس میں ایک ذرہ بھر بھی کوئی شک نہیں رہتا کہ ان میں یہ دونوں چیزیں علی وجہ الاتم پائی گئی تھیں۔ چنانچہ کوئی سُنّی مسلمان اس سے انکار نہیں کرتا اور نہ بقائمی ہوش وحواس کر ہی سکتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں استحقاقِ خلافت کی تمام شرطیں موجود تھیں، وہ مسلمان بھی تھے اور عاقل و بالغ بھی، مرد بھی تھے اور حر بھی، متکلم و سمیع بھی تھے اور بصیر بھی، شجاع بھی تھے اور عادل بھی، مجتہد بھی تھے اور قریشی بھی، اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ استحقاقِ خلافت کے بعد اس دور کے تمام اہلِ حل وعقد نے جو صحابہ تھے یا کبار تابعین ان کو بالاتفاق خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

جب ان میں وہ دونوں چیزیں پائی گئیں جن کے پائے جانے سے کوئی شخص، خلیفہ راشد ہوا کرتا ہے تو وہ بھی یقیناً اور یقیناً، خلیفہ راشد ہی ہوئے۔ اگرچہ کسی کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

فرائضِ خلیفہ راشد

اور اب آئیے، خلیفہ راشد کے فرائضِ منصبی کی طرف۔

حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ راشد کے فرائض بھی ایک مستقل عنوان کے تحت بیان

فرماتے ہیں چنانچہ عنوان قائم کیا ہے۔:

"مسئلہ (پنجم) ان امور کا بیان جو خلیفہ پر واجب ہیں از قسم اجراء مصالح اہلِ اسلام" پھر وہ امور بالتفصیل بیان فرماتے ہیں جو ایک نظر میں حسب ذیل ہیں۔

(1) دین محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کو اسی طرح محفوظ رکھنا جس طرح آنحضرت ﷺ کی سنتِ مستفیضہ سے ثابت ہوا اور سلفِ صالحین کا اجماع اس پر منعقد ہو چکا ہو۔

(2) ارکان اسلام یعنی جمعہ، جماعت، زکوٰۃ، حج اور صوم کا قائم کرنا، اپنے مقام پر بذاتِ خود اور مقاماتِ بعیدہ میں اپنے نائبین کے ذریعہ۔

(3) جس قدر ہو سکے بذاتِ خود علومِ دینیہ کو زندہ رکھنا اور ہر شہر میں مدرّسین و معلّمین مقرر کرنا۔

(4) عہدۂ قضاء کے فرائض انجام دینا اور قاضیوں، مفتیوں کو مقرر کرنا۔

(5) بلادِ اسلامیہ کو، کافروں، رہزنوں، اور غاصبوں سے محفوظ رکھنا اور دارالاسلام کی سرحدوں کو فوجوں اور آلاتِ جنگ سے معمور رکھنا، دشمنانِ خدا سے جہاد کرنا اور لشکروں کی ترتیب، مجاہدوں کے وظائف، مالِ غنیمت کی تقسیم، قاضیوں، مفتیوں، معلموں، واعظوں، اور مساجد کے اماموں کے مشاہرے نیز جزیہ وخراج کی وصولی جیسے اس کے تمام متعلقات کو بحسن وخوبی انجام دینا۔

(6) کاروبار میں سچے، امانت داروں اور خیر خواہوں کو نائب بنانا۔

(7) رعایا، امراء شہر، حکّام، اور افواج کے حالات کی خبر گیری رکھنا تا کہ ظلم اور خیانت نہ ہونے پائے۔

(8) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔

(9) حدود اللہ کو جاری کرنا۔

(10) مسلمانوں کے کام، کافروں کے سپرد کسی صورت نہ کرنا۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، صفحہ 28 تا 30، جلد 1)

اور جو حکمران خلیفۂ راشد کے یہ تمام منصبی فرائض ادا کرے وہ خلیفہ راشد ہوتا ہے، چنانچہ شاہ صاحب

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہی ناقل ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرات طلحہ، زبیر، کعب اور سلمان رضی اللہ عنہم سے خلیفہ اور مَلِک (یعنی بادشاہ) میں فرق سے متعلق سوال کیا تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ :

"خلیفہ وہ ہے جو رعیت میں عدل کرے اور ان کے درمیان برابر تقسیم کرے اور لوگوں پر ایسی شفقت کرے جیسے کوئی اپنے گھر والوں پر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرے"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، صفحہ 222 جلد 2)

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ :

"واللہ! میں نہیں جانتا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ، ایک کہنے والے نے کہا : اے امیر المؤمنین! ان دونوں میں فرق ہے۔ فرمایا! کیا ہے؟ اس نے کہا: خلیفہ نہیں لیتا بجز حق کے اور خرچ بھی صرف حق کے موقع میں کرتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ آپ ایسے ہی ہیں، اور بادشاہ، لوگوں پر ظلم کرتا ہے، اس سے لیتا ہے اور اس کو دیتا ہے، تو (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ چپ ہو گئے"۔

(ایضاً صفحہ 223 جلد 2)

یہاں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اور ایک کہنے والے نے خلیفۂ راشد کے فرائض میں سے بطور مثال چند فرائض کا ذکر کیا ہے، مراد تمام ہی فرائض ہیں۔

واضح رہے کہ خلیفۂ راشد کے یہ منصبی فرائض بعینہٖ خلافت ِ راشدہ کے مقاصد یا کہہ لیجیے کہ اسلامی حکومت کی دستوری دفعات بھی ہیں، لہٰذا ان کو بجا لانے والا حکمران جب خلیفۂ راشد کہلاتا ہے ایسے ہی جس حکومت میں یہ انجام پائیں وہ خلافتِ راشدہ کہلاتی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہی رقم طراز ہیں:

"جب ہم خلافت کو وصفِ راشدہ کے ساتھ مقید کریں گے (یعنی خلافتِ راشدہ کہیں گے) تو اس کے معنی ہوں گے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت ان کاموں میں جو بر بناءِ وصفِ پیغمبری، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم انجام دیتے تھے یعنی اقامتِ دین اور دشمنانِ خدا کے ساتھ جہاد اور حدود اللہ کا جاری کرنا اور علوم دینیہ کا احیاء اور ارکانِ اسلام (یعنی نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ) کا قائم کرنا اور قضاء وافتاء کا قائم

کرنا اور جو امور اس ذیل میں آتے ہیں ان کی انجام دہی ایسے احسن طور پر کہ گناہ سے محفوظ رہتے ہوئے اس کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، صفحہ 330 جلد 2)

دیکھ لیجئے یہ تمام کام وہی ہیں جو اوپر، خلیفہ راشد کے فرائض کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی خلافت کا معنیٰ یوں نقل کیا ہے۔

"اور معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ منبر پر بیٹھ کر کہا کرتے تھے، اے لوگو! خلافت مال جمع کرنے اور خرچ کرنے کا نام نہیں ہے لیکن خلافت ہے حق پر عمل کرنا اور انصاف کے ساتھ حکم کرنا اور اللہ کے حکم کے مطابق لوگوں سے لینا"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، صفحہ 223 جلد 2)

اور بلاشک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی حکومت اس معیار پر بھی پورے اترتے ہیں، کیونکہ انہوں نے خلیفہ راشد کے یہ تمام منصبی فرائض اپنی تقریباً چونسٹھ لاکھ مربع میل سے زیادہ پر پھیلی ہوئی وسیع و عریض مملکت میں بکمال و تمام انجام دیے تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ان کے دورِ حکومت پر مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الجهاد فى بلاد العدوّ قائم وكلمة الله عالية والغنائم ترد اليه من اطراف الارض والمسلمون معه فى راحة وعدل وصفح وعفو"۔

(البداية والنهاية، ج8ص173، قطر)

یعنی 41 ہجری سے لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک ان کے تقریباً بیس سالہ پورے دورِ خلافت میں دشمن کے ملکوں میں جہاد کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ اللہ کے دین کا (چہار دانگ عالم میں) ڈنکا بجتا رہا، غنائم زمین کے گوشوں سے آپ کے پاس آتے رہے، اور مسلمان آپ کی ہمراہی یعنی آپ کے دورِ حکومت میں عدل و انصاف اور عفو و درگذر کے سایہ میں امن و راحت کی زندگی بسر کرتے رہے۔

پھر ان غنیمتوں اور بیت المال کی دیگر آمدنیوں سے تمام ملکی مصارف پورے کیے جاتے تھے، مملکت اسلامیہ کی معاشی و صنعتی ہر طرح کی ترقی انہیں آمدنیوں سے وابستہ تھی، فوجی اخراجات، والیوں اور گورنروں کے مشاہرات، قاضیوں، مفتیوں، معلموں، اور مؤذنوں کی تنخواہیں بھی اسی قومی خزانہ سے ادا کی جاتی تھیں۔صرف ایک دمشق کے بیت المال کی جو تفصیل مؤرخین نے دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا تمام اخراجات کے بعد بھی بیت المال میں چار چار لاکھ دینار بچ جایا کرتے تھے۔

حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ یہ تفصیل دے کر لکھتے ہیں :

"وهذا يَدُلُّ على كثرة دخلها وعظم البركة في مستغلها"

یہ صورتِ حال، آمدنی کی کثرت اور غلے میں بہت زیادہ برکت پر دلالت کرتی ہے۔

(تاريخ دمشق، ج1ص253، دار الفكر)

یہی حال عراق اور مصر وغیرہ کے اسلامی بیت المالوں کا بھی تھا، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہی شان وشوکت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ گورنری کی بھی بیان کی ہے۔چنانچہ لکھا ہے کہ :

"وَلَمْ تَزَلِ الْفُتُوحَاتُ وَالْجِهَادُ قَائِمًا عَلَى سَاقِهِ فِي أَيَّامِهِ فِي بِلَادِ الرُّومِ وَالْفِرِنْجِ وَغَيْرِهَا"

یعنی ان کے پورے دورِ گورنری میں، رومیوں، فرنگیوں اور ان کے علاوہ دیگر کافر ملکوں میں برابر فتوحات ہوتی رہیں اور جہاد اپنی پوری آن بان کے ساتھ قائم رہا۔

(البداية والنهاية، ج8ص173، وزارة الاوقاف، قطر)

حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا:

" ففتح الله به الفتوح ويغزو الروم ويقسم الفئ والغنيمة ويقيم الحدود والله لا يضيع أجر من أحسن عملا"

اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بہت سی فتوحات عطا فرمائیں، وہ ملکِ روم (جیسی عظیم مملکت) میں جہاد کرتے، مالِ فئی و غنیمت تقسیم کرتے اور حدود اللہ قائم (جاری) کرتے تھے، اللہ تعالیٰ

اچھا عمل کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔

(تاریخ دمشق، ج59ص61)

یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے منصبی فرائض نہ صرف ادا کیے بلکہ ایسے عمدہ اور اچھے طریقے سے ادا کیے کہ اس پر اس اللہ تعالیٰ سے، جو کسی کے بھی اچھے عمل کا اجر ضائع نہیں کرتا، اجر و ثواب کی بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے۔

علماء سلف کے ان تبصروں سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ راشد کے زیرِ بحث تمام منصبی فرائض پوری طرح ادا کیے تھے اور بتایا جا چکا ہے کہ جو مسلمان حکمران یہ تمام فرائض بجا لائے وہ خلیفہ راشد ہوا کرتا اور جس حکومت میں یہ فرائض انجام پائیں وہ خلافتِ راشدہ ہوا کرتی ہے، لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ راشد ہوئے اور ان حکومت بھی خلافتِ راشدہ ہوئی۔

اور اب ملاحظہ ہو کچھ اور حوالوں سے بھی۔

بحوالہ ضابطہ تقررِ خلیفہ

امام ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (1114ھ-1176ھ) نے تقررِ خلیفہ سے متعلق یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ:

"مسلمانوں پر ایسے خلیفہ کا مقرر کرنا جو جامع شرائط خلافت ہو، فرضِ کفایہ ہے (اور) قیامت تک (فرض رہے گا)"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم صفحہ 17 جلد 1)

آگے لکھا ہے کہ:

"اگر کسی ایسے شخص کو لوگ خلیفہ بنائیں، جس میں یہ شرائط نہ پائی جاتی ہوں تو اس کی خلافت کے بانی گناہگار ہوں گے"۔

(ایضاً صفحہ 23، جلد 1)

اور اب دیکھئے اس ضابطہ کی روشنی میں حضرت معاویہ ﷛ کی خلافت کو۔

اتنی بات تو یقینی اور ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ دورِ معاویہ ﷛ کے تمام اربابِ حل و عقد صحابہ ﷡ وتابعین ﷭ نے بالاتفاق حضرت معاویہ ﷛ کو خلیفہ بنایا اور اس وقت کے عوام وخواص تمام مسلمانوں نے ان کو اپنا خلیفہ مانا تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اسی لیے تاریخ میں اس سال کو" عام الجماعۃ" یعنی مسلمانوں کی اجتماعیت کا سال کہا جاتا ہے۔

اب اس استخلاف یعنی خلیفہ بنانے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ایک یہ کہ حضرت معاویہ ﷛، خلافت کے مستحق یعنی اس کی تمام شرطوں کے جامع ہوں اور ان کو خلیفہ بنانے والے تمام صحابہ بشمول سیدنا حسن بن علی ﷡ وتابعین ﷭ نے خلافت کے مستحق شخص کو ہی خلیفہ بنایا اور مقرر کیا ہو،اور دوسری یہ کہ وہ خلافت کے مستحق اور اس کی تمام شرطوں کے جامع نہ ہوں اور ان کو خلیفہ بنانے والوں نے ایک غیر مستحق خلافت اور غیر جامعِ شرائط شخص کو خلیفہ بنا ڈالا ہو۔

اگر دوسری صورت فرض کی جائے تو حضرت معاویہ ﷛ کو خلیفہ بنانے والے تمام اربابِ حل وعقد، تمام صحابہ وتابعین اور تمام مسلمانوں عوام وخواص مسلمانوں کا مذکورہ ضابطہ کی شق 2 کے تحت گناہ گار ہونا لازم آتا ہے،اور ان تمام صحابہ وتابعین کا یوں اجتماعی طور پر گناہ گار ہونا باطل ہے۔

ایک تو اس لیے جیسا پہلے بیان ہوا کہ حضرت معاویہ ﷛ کی خلافت کا زمانہ،صحابہ وتابعین کا زمانہ ہے جس کو آنحضرت ﷺ نے خیر القرون یعنی اس امت کا بہترین زمانہ فرمایا ہے، خير امتي قرني ثم الذين يلونهم الخ......اگر اس سارے ہی قرن کو گناہ گار مانا جائے تو وہ خیر القرون نہیں رہتا بلکہ شر القرون ٹھہرتا ہے جس میں العیاذ باللہ آنحضرت ﷺ کی تکذیب لازم آتی ہے۔

اور دوم اس لیے کہ آنحضرت ﷺ نے اس امت کی یہ فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو گناہ اور معصیت پر جمع نہ کرے گا...... ان الله لا يجمع امتى على ضلالة......تو جو امت،اللہ کے فضل وکرم اور ببرکتِ نبی مکرم، گناہ پر جمع ہونے سے محفوظ ہو، یہ نہیں ہوسکتا کہ صحابہ وتابعین پر مشتمل اس کا ہراول دستہ ہی پورا گناہ پر جمع ہو جائے۔

سوم اس لیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے نتیجہ میں منعقد ہوئی تھی اور یہ صلح، اللہ ورسول کی پسندیدہ ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی...... فمن عفا و اصلح.... الخ میں بتصریح شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اسی صلح کی طرف اشارہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی تو اس صلح کے بارے میں مشہور ہی ہے، جس کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے فضائل میں دیکھا جاسکتا ہے تو جو خلافت، اللہ ورسول کی پسندیدہ صلح کے نتیجہ میں منعقد ہوئی ہو، ہرگز ہرگز باور نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے بانی صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمۃ اللہ علیہم بالخصوص حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس میں گناہ گار ٹھہرے ہوں۔

چہارم اس لیے کہ اگر یہ سارا ہی طبقہ یوں یک لخت گناہ گار قرار پاجائے تو پھر بعد والی ساری امت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی وایمانی رشتہ ہی منقطع ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ بعد والوں کو دین وایمان ان صحابہ و تابعین کے واسطہ سے ہی پہنچا ہے۔

بحوالہ سپردگی خلافت از خلیفہ راشد

اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے خلیفہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ تھے اور خلیفہ بھی محض وقتی، عارضی اور ہنگامی نہ تھے بلکہ اربابِ حل وعقد کی بیعت سے باقاعدہ وباضابطہ اور مستقل خلیفہ ہوئے تھے، اسی لیے ان کی خلافت کو باوجودیکہ وہ خود مہاجرین اولین میں سے نہیں ہیں، باقاعدہ طور پر خلافت راشدہ میں شمار کیا جاتا ہے (اگرچہ اعتراض سے بچنے کے لئے ان کی خلافت کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا "تتمہ" کہہ دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ الگ اور مستقل خلیفہ بنے تھے)، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکومت وسلطنت حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ہی سپرد کی تھی اور سپرد بھی بلا کسی جبر واکراہ، بلا کسی کمزوری ومجبوری اور بلا کسی قلت وعلت کے محض مسلمانوں کی خیر خواہی کے پیش نظر باختیار خود کی تھی اور باقاعدہ وباضابطہ اور مستقل طور پر ملی ہوئی حکومت سے دست بردار ہو کر کی تھی، ظاہر ہے کہ انہوں نے وہی حکومت، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سپرد کی تھی اور اسی حکومت سے دست بردار بھی ہوئے تھے جو انہیں اوپر سے پہنچی تھی اور سب جانتے اور مانتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اوپر سے منتقل ہوتی ہوئی خلافتِ راشدہ والی حکومت ہی پہنچی تھی۔ بادشاہی والی حکومت نہ پہنچی تھی، بلکہ اگر

بعض اہل سنت کے اس استدلال کو دیکھا جائے جس میں وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کو حدیثِ سفینہ کے حوالہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تکملہ وتتمہ بنا کر قرآن کی موعودہ خلافتِ راشدہ کے تیس سال پورے کیا کرتے ہیں تو پھر یہ تک بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت حسن کو قرآن کی موعودہ خلافت راشدہ ہی پہنچی تھی، اسی سے دستبردار ہو کر اسی کو انہوں نے آگے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا تھا، بادشاہت والی حکومت نہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس تھی نہ ان کو اوپر سے پہنچی تھی اور نہ انہوں نے وہ آگے سپرد ہی کی تھی، جب ان کو سپرد ہی خلافتِ راشدہ ہوئی تھی تو ادھر سے اُدھر جاتے ہی آخر وہ (مذموم) بادشاہت کیسے بن گئی؟ کیا صرف اس لیے کہ حدیث سفینہ میں تیس سالہ خلافت کے بعد" ثم يؤتى الله الملك من يشاء " آیا ہے؟ تو یہ لفظ تو حدیث میزان میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ذکر کے بعد بھی آیا ہے، ان حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "خلافة نبوة ثم يؤتى الله الملك من يشآء" (ابوداؤد، ازالۃ الخفاء وغیرہ) اس سے تو حضرت عثمان وحضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافت بھی بادشاہت ثابت ہوتی ہے۔

بلکہ حضرت شاہ صاحب دہلوی ؒ نے احادیثِ خلافت کا تفصیلی ذکر کرکے یہاں تک تصریح کردی ہے کہ نقلِ متواتر سے کہ جس سے زیادہ معتبر شرعیات میں کوئی نقل نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا ثابت ہو چکا ہے کہ:

"بعد شہادت حضرت عثمان کے خلافت برطریق نبوت نہ رہے گی اور کاٹ کھانے والی سلطنت ظاہر ہوگی"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 552 جلد 1)

تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی کاٹ کھانے والی سلطنت بنتی ہے، جو تاویلیں ان حدیثوں میں کی جاتی ہیں وہی آخر حدیثِ سفینہ میں کیوں نہیں ہوسکتیں اور کیوں نہیں کرلی جاتیں؟ اور کیوں نہیں کی گئیں؟ یہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مَلِک اور ان کی حکومت کو ملوکیت کہنے کو ہی آخر "سنت" کیوں بنا ڈالا گیا؟

نوٹ : تیس سالہ خلافت والی حدیث سفینہ پر ہم آگے الگ سے بات کریں گے۔

یوں تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ:

"تمکین دین اور تمکین فی الارض کی صورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حاصل نہ ہو سکی"۔

(خلاصہ : ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 572 جلد 2)

ایک جگہ لکھا :

"حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) باوجود سوابق اسلامیہ میں راسخ القدم ہونے اور باوصف کثرت اوصاف خلافت خاصہ کے (ان کی ذات میں پائے جانے کے) اور باوجود اس کے کہ ان کے لئے بیعت کا انعقاد ہوا، اور رعیت کا احکام الٰہی میں ان کے لئے مطیع ہونا ثابت ہوگیا، خلافت میں متمکن نہ ہوئے اور اطراف ملک میں ان کا حکم نافذ نہ ہوا اور تمام مسلمانوں نے ان کے حکم کے آگے سر نہ جھکایا اور جہاد ان کے زمانہ میں بالکل بند ہوگیا اور مسلمانوں کی یکجہتی میں فرق آیا......... ہر چند ان خرابیوں نے آنجناب رضی اللہ عنہ کے صفات کاملہ نفسانیہ میں کوئی خلل نہیں پیدا کیا مگر مقاصد خلافت جیسا کہ چاہئے حاصل نہ ہوئے.."۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 479 و 480 جلد 1)

آگے لکھتے ہیں :

"اور حضرت مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کے بعد جب معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہما) متمکن ہوئے اور لوگوں کا اتفاق ان (کی خلافت) پر حاصل ہوگیا اور مسلمانوں کی جماعت سے نااتفاقیاں اٹھ گئیں (تو گو ان کو خلافت میں تمکین حاصل ہوگئی مگر ان کی خلافت، خلافت خاصہ نہ تھی کیونکہ) وہ سوابق اسلامیہ نہ رکھتے تھے اور خلافت خاصہ کے لوازم ان میں نہ پائے جاتے تھے.."۔

(ایضاً)

شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت میں ایک لفظ "خلافت خاصہ" کا آیا ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک خلافت کی دو قسمیں ہیں "خلافت خاصہ" اور "خلافت عامہ"، اور خلافت خاصہ کے لوازم میں ایک چیز خلیفہ کا "سابقون اولون" میں سے ہونا بھی ہے، اسی کی

طرف اشارہ کیا کہ چونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں "سوابق اسلامیہ" نہیں پائے جاتے تھے اس لئے ان کی خلافت "خلافت خاصہ" نہیں، یعنی "خلافت عامہ" تو ہے ہی۔

خود لعل شاہ صاحب بخاری نے اپنی کتاب میں ایک جگہ اس بات کی طرف مختصر اشارہ یوں کیا ہے کہ:

"حضرت شاہ صاحب (یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ناقل) کے نزدیک خلافت راشدہ کی تین قسمیں ہیں، ایک خلافت راشدہ تامہ منتظمہ غیر مفتونہ، دوسری خلافت راشدہ تامہ منتظمہ مفتونہ، تیسری خلافت راشدہ تامہ غیر منتظمہ۔ حضرات الشیخین المعظمین (یعنی ابوبکر و عمر۔ ناقل) رضی اللہ عنہما کی خلافت قسم اول کی خلافت ہے اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی خلافت از قسم ثانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت از قسم ثالث ہے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 73و74)

میں کہتا ہوں کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت راشدہ کی بھی دو قسمیں کی ہیں ایک "خلافت راشدہ خاصہ" اور دوسری "خلافت راشدہ عامہ"، لعل شاہ صاحب بخاری نے جو یہ تین قسمیں بیان کی ہیں یہ "خلافت راشدہ خاصہ" کی ہیں، اور پہلے چاروں خلفاء کی خلافت "خلافت راشدہ خاصہ" ہے اور اس کی وجہ ان چاروں کا "سابقون اولون" میں سے ہونا ہے، ان کے بعد جس میں بھی خلافت راشدہ کی وہ تمام شروط پائی جائیں گی جن کا ذکر خود شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے پہلے گذرا، تو وہ "خلافت راشدہ عامہ" میں شمار ہوگی۔

اگر شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقسیم کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو تیس سالہ خلافت والی حدیث اور دوسری احادیث مثلاً 12 خلفاء والی حدیث اور بکثرت خلفاء ہونے والی حدیث کے درمیان تطبیق بڑی آسان ہے جس پر ہم آگے بات کریں گے۔

اسی طرح حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث میں جو متواترہ ہیں اور متعدد اسناد سے روایت کی

گئی ہیں بیان فرما دیا ہے کہ امت حضرت مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) پر جمع نہ ہوگی"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 504 جلد 4)

اور آگے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"بہت سی احادیث ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت مرتفع ہو جائے گی"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 505 جلد 4)

نیز لکھا ہے:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی حضرت مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) کی خلافت کے بارے میں خبر دی کہ وہ منتظم نہ ہوگی"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 592 جلد 1)

تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ" اس میں نہ تمکین دین حاصل ہو سکی اور نہ تمکین فی الارض" لیکن اس کے باوجود خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اہل سنت و جماعت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت راشدہ ہی شمار کرتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات جیسے مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"باقی رہے امیر معاویہ، ہر چند ان کو بظاہر تمکین میسر آئی لیکن حقیقت میں وہ تمکین دین نہ تھی، تمکین ملک و سلطنت تھی چنانچہ واقفان فن سیر پر پوشیدہ نہیں کہ خلفاء اربعہ کے اطوار و انداز اور امیر معاویہ کے اطوار و انداز میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اُن کی گزران فقیرانہ و زاہدانہ تھی اور امیر معاویہ کا طور ملوک سا تھا اس لیے اہل سنت ان کو باوجود یکہ صحابی سمجھتے ہیں، خلفاء میں نہیں گنتے، ملوک میں شمار کرتے ہیں، لیکن ملوک ملوک میں بھی فرق ہے، ایک نوشیروان تھا، ایک چنگیز خان، سو یہ ہر چند ملوک میں سے تھے لیکن اس کے یہ معنی ہیں کہ خلفائے راشدین کے مقابلے میں دنیا دار معلوم ہوتے تھے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور (یعنی

دیگر) انبیاء کے مقابلے میں مالدار معلوم ہوتے ہیں نہ یہ کہ ظلم وستم کے روادار تھے، غرباء کے حق میں ستمگار تھے، ان کا حلم، اور رعایا پروری اور دلجوئی خلائق شہرہ آفاق ہے...."۔

(ہدیۃ الشیعہ ، صفحہ 67 نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور)

یعنی مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (اپنے خیال میں) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں "تمکین فی الارض" مانتے ہیں صرف "تمکین دین" کے منکر ہیں (جو کہ نانوتوی صاحب کی رائے ہے، اس کا ماننا ہم پر لازم نہیں) تو اگر مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اس وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو "خلافت راشدہ" بلکہ "فقط خلافت" نہیں تسلیم کرتے کہ ان کے خیال میں اس دور میں تمکین دین حاصل نہ تھی، تو پھر کیا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے" ان کے دور میں نہ تمکین دین حاصل ہوسکی اور نہ تمکین ارضی" تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ (نعوذ باللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو بھی" خلافت راشدہ" نہیں کہا جاسکتا؟۔

اس لئے ہم بصد احترام عرض کرتے ہیں کہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے محل نظر ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں "تمکین دین نہ تھی صرف تمکین ملک وسلطنت تھی"، کیا ہم یہ تسلیم کرلیں کہ جس زمانہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے" بہترین زمانہ" قرار دیا، اس میں ہی دین اسلام کی جگہ کوئی اور نظام آگیا تھا؟

آگے دیکھیے! مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ :

" (آیت استخلاف میں مذکور) تینوں نعمتوں کا مجموعہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے زمانے میں نہیں پایا گیا سنی شیعہ دونوں کا اس پر اتفاق ہے"۔

(تحفہ خلافت، مجموعہ تفسیر آیات قرآنی، صفحہ 120، مطبوعہ تحریک خدام اہل سنت، جہلم)

نیز لکھا :

" یہ بات باتفاق فریقین ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان تینوں نعمتوں کا مجموعہ نہیں ملا، لہٰذا ان کی خلافت اس آیت (یعنی آیت استخلاف. ناقل) کی موعودہ خلافت ہرگز نہیں ہوسکتی نہ وہ خصوصیت کے ساتھ اس آیت کے موعود لہ کہے جاسکتے ہیں، پس قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ سوا اس کے کوئی صورت نہیں کہ وقت نزول کے تمام مومنین صالحین سے یہ وعدہ متعلق مانا

جائے اور حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کو اس آیت کی موعودہ خلافت تسلیم کیا جائے"۔

(تحفہ خلافت، صفحہ 124، مطبوعہ تحریک خدام اہل سنت جہلم)

(نیز دیکھیں مناظرہ منٹگمری 1930 کی روداد، مطبوع ماہنامہ" مناقب، بھکر" بابت ماہ دسمبر 1991ء)

تو کیا ان عبارات سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ (نعوذ باللہ) یہ حضرات سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو "خلافت راشدہ" سے خارج کر رہے ہیں؟ ہرگز نہیں، اس لئے اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور کے پرفتن ہونے، تمام مسلمانوں کے آپ کے حکم کے تابع نہ ہوسکنے، اور آپ کو تمکین فی الارض نہ حاصل ہوسکنے کے باوجود آپ کی خلافت کو" خلافت راشدہ" کہا جاسکتا ہے (جو کہ خلافت راشدہ ہی ہے) تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کی جاتی ہیں کہ" چونکہ انہیں تمکین دین حاصل نہ ہوئی تھی اس لئے ان کی خلافت کو راشدہ تو کیا، صرف خلافت بھی نہیں کہا جاسکتا؟۔

کیا خلافت صرف تیس سال تک تھی؟

قارئین محترم! اب تک ہم نے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب" ازالۃ الخفاء" کی روشنی میں" خلافت" کے بارے میں اصولی بحث کی ہے کہ خلافت کیا ہوتی ہے؟ خلیفہ کے اندر کن خاصیات کا ہونا ضروری ہے اور خلافت راشدہ کسے کہتے ہیں۔

سید لعل شاہ بخاری صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"ان کی خلافت خلافت علی منہاج النبوۃ نہیں تھی، خلافت راشدہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر ختم ہوگئی تھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 191و192)

پھر انہوں نے صفحہ 192 تا 199 کئی علماء اہل سنت کی عبارات پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ "خلیفہ" نہیں تھے بلکہ اسلام میں سب سے پہلے" بادشاہ" تھے۔

اور مقام حیرت ہے کہ ان عبارات میں لعل شاہ صاحب نے علامہ محب الدین الخطیب اور علامہ ابن خلدون کی عبارات سے بھی صرف اپنے من پسند الفاظ نقل کیے ہیں جبکہ ان دونوں حضرات کی مکمل عبارات

ہم نقل کر آئے ہیں، مثال کے طور پر علامہ ابن خلدون کی مندرجہ ذیل طویل عبارت ملاحظہ فرمائیں :

"وقد كان ينبغي أن تلحق دولة معاوية وأخباره بدول الخلفاء وأخبارهم فهو تاليهم في الفضل والعدالة والصحبة، ولا ينظر في ذلك إلى حديث الخلافة بعدي ثلاثون سنة فإنه لم يصحّ، والحق أنّ معاوية في عداد الخلفاء وإنّما أخّره المؤرخون في التأليف عنهم لأمرين:

الأوّل أنّ الخلافة لعهده كانت مغالبة لأجل ما قدّمناه من العصبية التي حدثت لعصره، وأمّا قبل ذلك كانت اختيارا واجتماع فميّزوا بين الحالتين، فكان معاوية أوّل خلفاء المغالبة والعصبيّة الذين يعبّر عنهم أهل الأهواء بالملوك، ويشبّهون بعضهم ببعض وحاشى الله أن يشبّه معاوية بأحد ممّن بعده، فهو من الخلفاء الراشدين ومن كان تلوه في الدين والفضل من الخلفاء المروانية ممن تلاه في المرتبة كذلك وكذلك من بعدهم من خلفاء بني العباس، ولا يقال إنّ الملك أدون رتبة من الخلافة فكيف يكون خليفة ملكا۔

واعلم أنّ الملك الّذي يخالف بل ينافي الخلافة هو الجبروتيّة المعبر عنها بالكسرويّة التي أنكرها عمر على معاوية حين رأى ظواهرها، وأما الملك الّذي هو الغلبة والقهر بالعصبية والشوكة فلا ينافي الخلافة ولا النبوّة فقد كان سليمان بن داود وأبوه صلوات الله عليهما نبيّين وملكين وكانا على غاية الاستقامة في دنياهما وعلى طاعة ربّهما عزّ وجل۔ ومعاوية لم يطلب الملك ولا أبّهته للاستكثار من الدنيا، وانما ساقه أمر العصبيّة بطبعها لمّا استولى

المسلمون على الدول كلها وكان هو خليفتهم فدعاهم بما يدعو الملوك إليه قومهم عند ما تستفحل العصبيّة وتدعو لطبيعة الملك. وكذلك شأن الخلفاء أهل الدين من بعده إذا دعتهم ضرورة الملك إلى استفحال أحكامه ودواعيه، والقانون في ذلك عرض أفعالهم على الصحيح من الأخبار لا بالواهي، فمن جرت أفعاله عليها فهو خليفة النبي صلى الله عليه وسلم في المسلمين، ومن خرجت أفعاله عن ذلك فهو من ملوك الدنيا وإنما سمّي خليفة بالمجاز۔

الأمر الثاني في ذكر معاوية مع خلفاء بني أمية دون الخلفاء الأربعة أنهم كانوا أهل نسب واحد وعظيمهم معاوية، فجعل مع أخل نسبه، والخلفاء الأوّلون مختلفو الأنساب فجعلوا في نمط واحد وألحق بهم عثمان وإن كان من أهل هذا النسب للحوقه بهم قريبا في الفضل والله يحشرنا في زمرتهم ويرحمنا بالاقتداء بهم"۔

(عبارت کا اردو میں خلاصہ)

"چاہیئے تو یہ تھا کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی حکومت اور ان کے حالات بھی ان سے پہلے خلفاء کی حکومتوں اور ان کے حالات کے ساتھ ہی بیان کر دیے جاتے، کیونکہ فضیلت، عدالت اور صحبت میں ان کے بعد انہی کا نمبر ہے، اور اس حدیث کی طرف توجہ نہ کی جائے جس میں ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال تک ہے، کیونکہ یہ حدیث صحیح نہیں، اور حق بات یہی ہے کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا شمار بھی خلفاء میں ہی ہوتا ہے، لیکن مؤرخین نے ان کا ذکر جو مؤخر کر کے (الگ سے) لکھا ہے اس کی دو وجہیں ہیں، پہلی یہ کہ ان کے زمانے میں خلافت غلبہ کی وجہ سے قائم ہوئی تھی، اس عصبیت اور گروہ بندی کی وجہ سے جس کے بارے میں ہم پہلے

بیان کر آئے ہیں کہ ان کے زمانے میں پیدا ہوگئی تھی، جبکہ ان سے پہلے اختیار اور اجماع سے قائم ہوتی تھی، پس مؤرخین نے دونوں حالتوں میں تمیز کرنے کے لیے ان کا ذکر الگ کر دیا، حضرت معاویہ ان خلفاء میں سے پہلے تھے جو غلبہ اور گروہ بندی کے ساتھ خلافت پر متمکن ہوئے، ایسے خلفاء کو ہوا پرست لوگ "بادشاہوں" سے تعبیر کرتے ہیں، اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، حاشاللہ! حضرت معاویہ کو ان کے بعد والوں کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی، کیونکہ وہ خلفاء راشدین میں سے ہی ہیں، اسی طرح بنی مروان کے خلفاء میں سے بھی جو دین و فضل اور مرتبہ میں ان کے بعد تھے، وہ بھی اسی طرح ہیں (یعنی خلفاء راشدین میں سے ہی ہیں۔ناقل)، اور اسی طرح ان کے بعد بنی عباس کے خلفاء میں سے بھی ہیں، لہذا یہ نہ کہا جائے کہ بادشاہت خلافت سے مرتبہ میں کم ہے لہذا خلیفہ بادشاہ کیسے ہوسکتا ہے؟. جان لو کہ! جو ملوکیت (بادشاہت) خلافت کے منافی ہے وہ جبروتیت ہے جسے کسرویت سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (حضرت معاویہ کی گورنری کے زمانہ میں۔ناقل) ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ناپسند فرمایا تھا، لیکن وہ بادشاہت جو غلبہ، شوکت اور عصبیت سے حاصل ہوتی ہے وہ نہ خلافت کے منافی ہے اور نہ ہی نبوت کے منافی ہے، سلیمان علیہ السلام اور ان کے والد داوود علیہ السلام نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے کاموں میں نہایت استقامت والے اور اپنے رب کی اطاعت کے پابند تھے. حضرت معاویہ نے بادشاہت کے طور اطوار دنیا کے لئے نہیں (بلکہ مملکت کی طبعی صورت حال کے لازمی تقاضے کی پاسداری کرتے ہوئے ایسا کیا۔ناقل) اور ان کو اس امر پر فطری گروہ بندی نے ابھارا تھا جب مسلمانوں نے تمام سلطنتوں پر تسلط حاصل کر لیا تھا اور یہ ان کے خلیفہ تھے، پس انہوں نے بھی لوگوں کو اس بات کی طرف بلایا جیسے تمام بادشاہ اپنی قوم کو طبعی گروہ بندی اور عصبیت کی وجہ سے بلاتے ہیں. اور ایسا ہی حال حضرت معاویہ کے بعد دین دار خلفاء کا بھی ہے جب امور سلطنت چلانے کی ضرورت داعیہ پیدا ہوئی تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔اس بارے میں اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ ان خلفاء کے افعال کو احادیث صحیحہ پر پیش کیا جائے گا نہ کہ خرافات وواہیات پر، پس جن کے افعال احادیث

صحیح کے مطابق ہوں گے وہ مسلمانوں میں نبی ﷺ کا خلیفہ شمار ہوگا، اور جس کے افعال اس سے خارج ہوں گے وہ دنیاوی بادشاہوں میں شمار ہوگا جسے صرف مجازی طور پر خلیفہ بھی کہا جاتا ہے۔

دوسری وجہ (جس کے سبب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اور آپ کے حالات کو خلفاء اربعہ سے الگ کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ناقل) یہ ہے کہ خلفاء بنی امیہ ایک ہی نسب اور ایک ہی خاندان سے تھے، ان سب کے بڑے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے (پس یہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ ذکر کیے گئے) اور خلفاء سابقین مختلف خاندانوں کے تھے اس لیے ان کو ایک ساتھ الگ سے ذکر کیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (اگرچہ وہ اموی تھے۔ناقل) لیکن چونکہ وہ فضیلت و مرتبے میں انہیں کے قریب تھے اس لیے ان کا ذکر بھی انہی کے ساتھ کر دیا گیا۔ اللہ ہمارا حشر بھی ان کے زمرہ میں کرے اور ان کی اقتداء کرنے کی وجہ سے ہم پر رحم کرے۔

(تاریخ ابن خلدون، ج2ص650و 651، دار الفکر بیروت)

قارئین محترم! علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کی اس ساری عبارت سے مندرجہ ذیل باتیں سمجھ آتی ہیں:

(1) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ان کے نزدیک بلاشبہ خلفاء راشدین میں سے ہیں۔

(2) ان کے نزدیک "تیس سالہ خلافت" والی حدیث صحیح نہیں ہے۔

(3) ان کے نزدیک مطلق "خلافت" اور مطلق "ملوکیت" (بادشاہت) میں کوئی فرق نہیں، اور نہ ہی مطلق "ملوکیت" کا مرتبہ "خلافت" سے کم ہے۔

(4) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت جس غلبہ اور گروہ بندی کے ذریعے قائم ہوئی، ایسی خلافت کو "ہوا پرست" لوگ "ملوکیت" کہتے ہیں۔

(5) وہ بادشاہت جو غلبہ، شوکت اور عصبیت سے حاصل ہوتی ہے وہ نہ خلافت کے منافی ہے اور نہ ہی نبوت کے منافی ہے۔

(6) علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق، نہ صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، خلیفہ راشد ہیں، بلکہ ان کے بعد کے

خلفاء میں بھی جو دین دار ہوئے ہیں، اور ان کے اعمال وافعال احادیث صحیحہ کے موافق ہوں وہ بھی خلفاء راشدین ہیں۔

(7) علامہ ابن خلدون کے مطابق مؤرخین نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا ذکر، پہلے خلفاء سے الگ اس لیے نہیں کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار خلفاء راشدین میں شمار نہیں ہوتا، بلکہ ان کا ذکر دو وجہ سے الگ کیا جاتا ہے، ایک تو اس لئے کہ پہلے چاروں خلفاء الگ الگ خاندانوں سے تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے چونکہ ایک ہی خاندان کی خلافت کا آغاز ہوا اس لئے ان کا ذکر اپنے خاندان کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، نیز چونکہ ان کی خلافت قائم ہونے میں غلبہ اور گروہ بندی کو بھی دخل تھا اس لیے بھی ان کا ذکر الگ سے کر دیا جاتا ہے۔

جبکہ لعل شاہ صاحب بخاری نے علامہ ابن خلدون کے حوالے سے صرف یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ :

"لیکن خلفائے راشدین کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے وقت عصبیت ابھر آئی تھی بادشاہت پر اور وازع دینی کمزور پڑ گیا تھا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 195)

حدیث سفینہ رضی اللہ عنہ

اب آئیے اس حدیث کا جائزہ لیتے ہیں جس کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ خلافت تو صرف تیس سال تک تھی اور اس کے بعد "ملوکیت" یعنی بادشاہت ہونی تھی اور چونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور تیس سال کے بعد کا ہے اس لئے اسے "خلافت" نہیں کہا جا سکتا، حدیث ملاحظہ فرمائیں جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں روایت فرمائی ہے :

"حدّثنا أحمد بن منيع قال: حدّثنا سريج بن النعمان قال :حدّثنا حشرج بن نباتة، عن سعيد بن جمهان، قال: حدّثني سفينة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الخلافة في أمتي ثلاثون سنة، ثم ملك بعد ذلك، ثم قال لي سفينة: أمسك خلافة أبي بكر، وخلافة عمر، وخلافة عثمان، ثم قال لي: أمسك خلافة علي قال :

فوجدناها ثلاثين سنة، قال سعيد: فقلت له :إن بني أمية يزعمون أن الخلافة فيهم، قال: كذبوا بنو الزرقاء بل هم ملوك من شر الملوك، وفي الباب عن عمر، وعلي قالا: لم يعهد النبي صلى الله عليه وسلم في الخلافة شيئا وهذا حديث حسن قد رواه غير واحد عن سعيد بن جمهان ولا نعرفه إلا من حديثه"۔

ترجمہ : سعید بن جمہان کہتے ہیں کہ ہم سے حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں تیس سال تک خلافت رہے گی، پھر اس کے بعد ملوکیت آجائے گی، پھر مجھ سے سفینہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت، عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت، عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت اور علی رضی اللہ عنہ کی خلافت، شمار کرو، (سعيد بن جمهان یاحشرج بن نباتة یا اور نیچے کے کسی راوی نے کہا کہ) کہ ہم نے اسے تیس سال پایا، سعيد بن جمهان کہتے ہیں کہ میں نے سفینہ رضی اللہ عنہ سے کہا: بنو امیہ یہ سمجھتے ہیں کہ خلافت ان میں ہے؟ تو انہوں نے کہا: بنو زرقاء جھوٹ اور غلط کہتے ہیں، بلکہ ان کا شمار تو بدترین بادشاہوں میں ہے"۔

(سنن الترمذي، حديث نمبر 2226 :طبع مصطفى البابي، مصر)

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ حدیث حسن ہے، کئی لوگوں نے یہ حدیث سعید بن جمہان سے روایت کی ہے، ہم اسے صرف سعید بن جمہان ہی کی روایت سے جانتے ہیں"۔

تو کہا جاتا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف چار یا پانچ خلیفے ہی ہوں گے (تیس سال میں صرف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ تک ہی آتے ہیں) اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کو "خلافت" نہیں کہا جا سکتا۔

اب ذرا ان احادیث کو بغور پڑھیں:

امام مسلم رحمہ اللہ روایت فرماتے ہیں :

"حدثنا هداب بن خالد الأزدي، حدثنا حماد بن سلمة، عن سماك بن حرب، قال:سمعت جابر بن سمرة، يقول:سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول:لا يزال الإسلام عزيزاً إلى اثني عشر خليفة، ثم قال كلمة لم أفهمها، فقلت لأبي:ما قال؟ فقال :كلهم من قريش"۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام بارہ خلفاء تک غالب وبلند رہے گا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات کہی جو میں سمجھ نہیں سکا، میں نے اپنے والد سے پوچھا : آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟: تو انہوں نے بتایا کہ(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ)سب کے سب (بارہ خلفاء) قریش میں سے ہوں گے۔

(صحیح مسلم، کتاب الامارة حدیث نمبر 1821 :واللفظ له، صحیح البخاري:حدیث نمبر 7222)

قارئین محترم! جیسا کہ کتاب کے شروع میں بیان ہوا کہ اکثر شارحین نے اس حدیث کی شرح میں ان بارہ خلفاء کے نام بھی گنوائے ہیں، مثلاً :

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

"فِي بَعْضِ طُرُقِ الْحَدِيثِ الصَّحِيحَةِ كُلُّهُمْ يَجْتَمِعُ عَلَيْهِ النَّاسُ وَإِيضَاحُ ذَلِكَ أَنَّ الْمُرَادَ بِالِاجْتِمَاعِ انْقِيَادُهُمْ لِبَيْعَتِهِ وَالَّذِي وَقَعَ أَنَّ النَّاسَ اجْتَمَعُوا عَلَى أَبِي بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرَ ثُمَّ عُثْمَانَ ثُمَّ عَلِيٍّ إِلَى أَنْ وَقَعَ أَمْرُ الْحَكَمَيْنِ فِي صِفِّينَ فَسُمِّيَ مُعَاوِيَةُ يَوْمَئِذٍ بِالْخِلَافَةِ ثُمَّ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَى مُعَاوِيَةَ عِنْدَ صُلْحِ الْحَسَنِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى وَلَدِهِ يَزِيدَ وَلَمْ يَنْتَظِمْ لِلْحُسَيْنِ أَمْرٌ بَلْ قُتِلَ قَبْلَ ذَلِكَ ثُمَّ لَمَّا مَاتَ يَزِيدُ وَقَعَ الِاخْتِلَافُ إِلَى أَنِ اجْتَمَعُوا عَلَى عبد الْملك بن مَرْوَان بعد قتل بن الزُّبَيْرِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى أَوْلَادِهِ الْأَرْبَعَةِ الْوَلِيدِ ثُمَّ سُلَيْمَانَ ثُمَّ يَزِيدَ

ثُمَّ هِشَامٍ وَتَخَلَّلَ بَيْنَ سُلَيْمَانَ وَيَزِيدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَهَؤُلَاءِ سَبْعَةٌ بَعْدَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ وَالثَّانِي عَشَرَ هُوَ الْوَلِيدُ بْنُ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ لَمَّا مَاتَ عَمُّهُ هِشَامٌ ..." ۔

(خلاصہ) بعض طرق حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ان بارہ خلفاء پر لوگوں کا اتفاق و اجتماع بھی ہوگا، اس سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی بیعت کرلیں گے، اور واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کا اجتماع حضرت ابو بکر، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی (رضی اللہ عنہم) پر ہوا، پھر ان کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوا، پھر ان کے بیٹے یزید بن معاویہ پر ہوا، پھر یزید کی وفات کے بعد اختلاف رہا، یہاں تک کہ پھر لوگ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے قتل کے بعد، عبد الملک بن مروان پر مجتمع ہوئے، پھر عبد الملک کے چاروں بیٹوں ولید، سلیمان، یزید اور ہشام پر اجتماع ہوا، ان کے درمیان عمر بن عبد العزیز بھی آتے ہیں، تو خلفاء راشدین کے بعد یہ سات خلفاء ہوئے، اور بارہواں خلیفہ ولید بن یزید بن عبد الملک ہوا جس پر لوگوں کا اجتماع ہوا جب اس کا چچا ہشام فوت ہوگیا۔

(فتح الباری، ج13ص214، دار المعرفة بيروت)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی اسی بات کو مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی "تکملة فتح الملهم" میں بعینہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہی بات حافظ ابن حجر کے نزدیک راجح ہے۔

(تكملة فتح الملهم، ج3ص236، دار احياء التراث العربي بيروت)

اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ بھی پہلے گذرا کہ:

"وفي لفظ :لا يزال الإسلام عزيزا إلى اثني عشر خليفة كلهم من قريش وهكذا كان. فكان الخلفاء :أبو بكر، وعمر، وعثمان، وعلي، ثم تولى من اجتمع الناس عليه وصار له عز ومنعة:معاوية، وابنه يزيد، ثم عبد الملك وأولاده الأربعة، وبينهم عمر بن عبد

العزيز. وبعد ذلك حصل في دولة الإسلام من النقص ما هو باق إلى الآن ، فإن بني أمية تولوا على جميع أرض الإسلام ، وكانت الدولة في زمنهم عزيزة"۔

اوراس حدیث کے بعض الفاظ ہیں : " اسلام غالب رہے گا بارہ خلفاء تک جو سب کے سب قریش سے ہوں گے" اور ایسے ہی ہوا چنانچہ یہ خلفاء اس طرح تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ان کے بعد جن پر امت جمع رہی اور اس کے لئے عزت وطاقت رہی، وہ معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے یزید، پھر عبدالملک اور پھر اس کے چاروں بیٹے اور ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز بھی تھے ۔اوراس کے بعد اسلامی حکومت میں نقص آگیا جو آج تک باقی ہے، اور بنو امیہ نے تمام عالم اسلام پر حکومت کی اور اسلامی حکومت ان کے زمانے میں مضبوط تھی" ۔

(منهاج السنة، ج8، ص 238، طبع السعودية)

اسی طرح ایک دوسری متفق علیہ حدیث میں نبی ﷺ نے اپنے بعد کثیر تعداد میں خلفاء کا تذکرہ فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیں :

"حدثني محمد بن بشار، حدثنا محمد بن جعفر، حدثنا شعبة، عن فرات القزاز، قال:سمعت أبا حازم، قال:قاعدت أبا هريرة خمس سنين، فسمعته يحدث عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال:كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء، كلما هلك نبي خلفه نبي، وإنه لا نبي بعدي،وسيكون خلفاء فيكثرون،قالوا:فما تأمرنا؟ قال:فوا ببيعة الأول فالأول،أعطوهم حقهم، فإن الله سائلهم عما استرعاهم"۔

ابوحازم نے بیان کیا کہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں پانچ سال تک بیٹھا ہوں، میں نے

انہیں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے انبیاء ان کی سیاسی رہنمائی بھی کیا کرتے تھے، جب بھی ان کا کوئی نبی فوت ہو جاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا (یعنی مبعوث کر دیا جاتا) لیکن یاد رکھو میرے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، ہاں (میرے) خلیفے ہوں گے اور بکثرت ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا کہ ان کے متعلق آپ کا ہمیں کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے جس سے بیعت کر لو، بس اسی کی وفاداری پر قائم رہو اور ان کا جو حق ہے اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن ان کی رعایا کے بارے میں سوال کرے گا۔

(صحيح البخاري، واللفظ له،حديث نمبر3455، صحيح مسلم :حديث نمبر 1842)

اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے بعد بہت سارے "خلفاء" کا تذکرہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ صرف چار یا پانچ خلفاء کی تعداد پر کثرت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

حدیث میزان

اب "مسند بزار" سے یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں جس کی ایک سند میں وہی راوی "سعید بن جمہان" انہی "حضرت سفینہ" (رضی اللہ عنہ) سے روایت کر رہے ہیں جنہوں نے "تیس سالہ خلافت" والی حدیث روایت کی ہے :

" وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، قَالَ: نَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الأَنْصَارِيُّ، قَالَ: نَا الأَشْعَثُ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَبِي بَكْرَةَ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ :يَا رَسُولَ اللَّهِ، رَأَيْتُ كَأَنَّ مِيزَانًا دُلِّيَ مِنَ السَّمَاءِ فَوُزِنْتَ بِأَبِي بَكْرٍ، ثُمَّ وُزِنَ أَبُو بَكْرٍ بِعُمَرَ فَرَجَحَ أَبُو بَكْرٍ بِعُمَرَ، ثُمَّ وُزِنَ بِعُثْمَانَ فَرَجَحَ عُمَرُ بِعُثْمَانَ، ثُمَّ رُفِعَ الْمِيزَانُ فَاسْتَهَلَهَا رَسُولُ اللَّهِ، خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ، ثُمَّ يُؤْتِي اللَّهُ الْمُلْكَ مَنْ يَشَاءُ وَهَذَا الْحَدِيثُ قَدْ رُوِيَ كَلَامُهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَوَاهُ أَبُو بَكْرَةَ وَسَفِينَةُ وَغَيْرُهُمَا وَلِأَبِي بَكْرَةَ طَرِيقٌ آخَرُ هَذَا الإِسْنَادُ أَحْسَنُ مِنَ الإِسْنَادِ الآخَرِ الَّذِي

يُرْوَى عَنْ أَبِي بَكْرَةَ وَهُوَ مَا رَوَاهُ أَشْعَثُ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَبِي بَكْرَةَ"۔

و

حَدَّثَنَا رِزْقُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى، قَالَ: نَا مُؤَمَّلٌ، قَالَ: نَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُمْهَانَ، عَنْ سَفِينَةَ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، رَأَيْتُ كَأَنَّ مِيزَانًا دُلِّيَ مِنَ السَّمَاءِ فَوُزِنْتَ بِأَبِي بَكْرٍ فَرَجَحْتَ بِأَبِي بَكْرٍ، ثُمَّ وُزِنَ أَبُو بَكْرٍ بِعُمَرَ فَرَجَحَ أَبُو بَكْرٍ بِعُمَرَ، ثُمَّ وُزِنَ عُمَرُ بِعُثْمَانَ فَرَجَحَ عُمَرُ بِعُثْمَانَ، ثُمَّ رُفِعَ الْمِيزَانُ فَاسْتَهَلَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ ثُمَّ يُؤْتِي اللَّهُ الْمُلْكَ مَنْ يَشَاءَ۔

(مسند البزار، ج9ص281، مكتبة العلوم والحكم المدينة)

ان دونوں روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکرہ اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے (خواب) دیکھا کہ گویا آسمان سے ایک ترازو اتری ہے تو آپ کا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو آپ ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھاری ہو گئے، پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ بھاری ہو گئے، پھر عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو عمر رضی اللہ عنہ بھاری ہو گئے، بعد ازاں ترازو اٹھالی گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی تاویل یہ کی کہ یہ خلافت نبوت کی طرف اشارہ ہے اس کے بعد اللہ جس کو چاہے گا ملک (بادشاہت) دے دے گا۔

امام ابو العباس بوصیری رحمۃ اللہ علیہ (م839ھ) نے اسی حدیث کو اسی سند ومتن کے ساتھ نقل کرنے کے بعد فرمایا:

"هذا إسناد صحيح"، یہ سند صحیح ہے

(إتحاف الخيرة المَهرة للبوصيري، ج6ص153، الرياض)

اب اس حدیث میں غور کیجئے اس میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے خواب کی تعبیر بتلاتے

ہوئے ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے بعد ان کے دور کو خلافت نبوت کا دور قرار دیا ہے اور پھر اس کے بعد ملوکیت کا دور بتلایا ہے، اب سوال ہے کہ کیا اس حدیث کی بنا پر یہ کہنا شروع کر دیا جائے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پہلے بادشاہ ہیں؟

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی "حدیث میزان" کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :

"فَبَيَّنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ وِلَايَةَ هَؤُلَاءِ خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ، ثُمَّ بَعْدَ ذَلِكَ مُلْكٌ، وَلَيْسَ فِيهِ ذِكْرُ عَلِيٍّ لِأَنَّهُ لَمْ يَجْتَمِعِ النَّاسُ فِي زَمَانِهِ بَلْ كَانُوا مُخْتَلِفِينَ، لَمْ يَنْتَظِمْ فِيهِ خِلَافَةُ النُّبُوَّةِ وَلَا الْمُلْكُ"۔

پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا کہ ان (تینوں) کی حکومت، خلافت نبوت ہے پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی، اور اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے کیونکہ ان کے زمانہ میں لوگوں کا اتفاق نہیں ہوا تھا بلکہ ان میں اختلاف رہا، ان کے دور میں نہ خلافت نبوت منتظم ہو سکی اور نہ ہی بادشاہت۔

(منهاج السنة، ج1ص513و 514، السعودية)

سید لعل شاہ بخاری صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ 213 پر تیس سالہ خلافت والی روایت کا ایک نقشہ (چارٹ) بنایا ہے اس میں البدایۃ والنہایۃ کے حوالے سے امام یعقوب بن سفیان الفسوی (م 277ھ) کی ایک سند بھی نقل کی ہے جو کہ یوں ہے :

"وقال يعقوب بن سفيان: حدثني محمد بن فضيل، ثنا مؤمل، ثَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زيد، عن عبد الرحمن بن أبي بكرة، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وسلم يقول: خلافة نبوة ثلاثون عاما، ثم يؤتي الله ملكه من يشاء ..."۔

(المعرفة والتاريخ ليعقوب بن سفيان، ج3ص458، مكتبة الدار، المدينة المنورة)

اس سند میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد الرحمن سے روایت کرنے والا راوی "علي بن زيد بن عبد الله بن أبي مليكة زهير بن عبد الله بن جدعان" ہے جو کہ ضعیف ہے (تهذيب التهذيب، ج7ص322، دائرة المعارف، حيدرآباد دكن)، اور اگر اس راوی کی روایت سے استدلال درست ہے تو پھر ملاحظہ فرمائیں، سنن ابی داوود کی یہ دو روایات :

" حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ الْأَنْصَارِيُّ، حَدَّثَنَا الْأَشْعَثُ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَبِي بَكْرَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ :مَنْ رَأَى مِنْكُمْ رُؤْيَا؟ فَقَالَ رَجُلٌ:أَنَا، رَأَيْتُ كَأَنَّ مِيزَانًا نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ فَوُزِنْتَ أَنْتَ وَأَبُو بَكْرٍ فَرَجَحْتَ أَنْتَ بِأَبِي بَكْرٍ، وَوُزِنَ عُمَرُ وَأَبُو بَكْرٍ، فَرَجَحَ أَبُو بَكْرٍ، وَوُزِنَ عُمَرُ وَعُثْمَانُ، فَرَجَحَ عُمَرُ ثُمَّ رُفِعَ الْمِيزَانُ، فَرَأَيْنَا الْكَرَاهِيَةَ فِي وَجْهِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "۔

" حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا حَمَّادٌ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ زَيْدٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ذَاتَ يَوْمٍ ،أَيُّكُمْ رَأَى رُؤْيَا؟ فَذَكَرَ مَعْنَاهُ، وَلَمْ يَذْكُرِ الْكَرَاهِيَةَ، قَالَ: فَاسْتَاءَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، يَعْنِي فَسَاءَهُ ذَلِكَ، فَقَالَ: خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ، ثُمَّ يُؤْتِي اللَّهُ الْمُلْكَ مَنْ يَشَاءُ "۔

ان میں سے پہلی روایت (نمبر 4634) میں وہی بات بیان ہوئی ہے جو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں کہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے خواب کی نبوی تعبیر کا تذکرہ ہے اور دوسری روایت (نمبر 4635) میں یہی راوی "علی بن زید" انہی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے یہی بات نقل کر رہا ہے اور پھر یہ بھی بیان کر رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی تعبیر بتلاتے ہوئے ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس کے بعد

ان کے دور کو خلافت نبوت کا دور قرار دیا ہے اور پھر اس کے بعد ملوکیت کا دور بتلایا ہے۔

اب یہ روایات غور سے پڑھیں جو وہی راوی "سعید بن جمہان" انہی "حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ" سے روایت کر رہا ہے :

" حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ الْفُرَاتِ، ثنا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ، ثنا الْحَشْرَجُ بْنُ نُبَاتَةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُمْهَانَ، عَنْ سَفِينَةَ، قَالَ: بَنَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسْجِدًا، فَقَالَ لِأَبِي بَكْرٍ: ضَعْ حَجَرًا إِلَى جَنْبِ حَجَرِي، ثُمَّ قَالَ لِعُمَرَ: ضَعْ حَجَرًا إِلَى جَنْبِ حَجَرِ أَبِي بَكْرٍ، ثُمَّ قَالَ لِعُثْمَانَ: ضَعْ حَجَرَكَ إِلَى جَنْبِ حَجَرِ عُمَرَ، ثُمَّ قَالَ: هَؤُلَاءِ الْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِي"۔

(السنة لابن ابي عاصم ج2ص550، المكتب الاسلامي بيروت)

" حَدَّثَنَا ابْنُ الْمُبَارَكِ، أَخْبَرَنَا حَشْرَجُ بْنُ نُبَاتَةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُمْهَانَ، عَنْ سَفِينَةَ مَوْلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَمَّا بَنَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسْجِدَ الْمَدِينَةِ جَاءَ أَبُو بَكْرٍ بِحَجَرٍ فَوَضَعَهُ، ثُمَّ جَاءَ عُمَرُ بِحَجَرٍ فَوَضَعَهُ، ثُمَّ جَاءَ عُثْمَانُ بِحَجَرٍ فَوَضَعَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَؤُلَاءِ يَلُونَ الْخِلَافَةَ بَعْدِي"۔

(الفتن لنعيم بن حماد، ج1ص107، مكتبة التوحيد القاهرة)

"حَدَّثَنَا أَبُو يَعْلَى، ثنا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ الْحِمَّانِيُّ، ثنا حَشْرَجُ بْنُ نُبَاتَةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُمْهَانَ، عَنْ سَفِينَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَضَعَ حَجَرًا ،ثُمَّ قَالَ: لِيَضَعْ أَبُو بَكْرٍ حَجَرَهُ إِلَى جَنْبِ حَجَرِي، ثُمَّ قَالَ: لِيَضَعْ عُمَرُ حَجَرَهُ إِلَى جَنْبِ حَجَرِ أَبِي بَكْرٍ، ثُمَّ قَالَ: لِيَضَعْ

عُثْمَانُ حَجَرَهُ إِلَى جَنْبِ حَجَرِ عُمَرَ، ثُمَّ قَالَ:هَؤُلَاءِ الْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِي"۔

(المفاريد لابي يعلي الموصلي،ص103، دار الاقصى الكويت)

" حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ الْحِمَّانِيُّ، ثنا حَشْرَجُ بْنُ نُبَاتَةَ، حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ جُمْهَانَ، عَنْ سَفِينَةَ مَوْلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ:لَمَّا بَنَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَسْجِدَ وَضَعَ حَجَرًا، ثُمَّ قَالَ:لِيَضَعْ أَبُو بَكْرٍ حَجَرَهُ إِلَى جَنْبِ حَجَرِي، ثُمَّ قَالَ : لِيَضَعْ عُمَرُ حَجَرَهُ إِلَى جَنْبِ حَجَرِ أَبِي بَكْرٍ، ثُمَّ قَالَ:لِيَضَعْ عُثْمَانُ حَجَرَهُ إِلَى جَنْبِ حَجَرِ عُمَرَ، ثُمَّ قَالَ :هَؤُلَاءِ الْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِي. حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ، ثنا حَشْرَجُ بْنُ نُبَاتَةَ قَالَ :وَسَمِعْتُ الْعَوَّامَ بْنَ حَوْشَبٍ قَالَ :فَذَكَرَهُ أَيْضًا"۔

(بغية الباحث عن زوائد مسند الحارث ج2ص621، مركز خدمة السنة والسيرة النبوية - المدينة المنورة)

ان چاروں روایات کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے ایک پتھر رکھا، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے ایک پتھر رکھا، پھر عثمان رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے ایک پتھر رکھا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا : یہ لوگ میرے بعد ہونے والے خلفاء ہیں، ان روایات میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ذکر نہیں۔

صحابی حضرت ثمامہ رضی اللہ عنہ کا اثر

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ اپنی تاریخ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ :

" حدثنا مُوسَى قَالَ وهيب عَن أَيُّوب عَن أبي قلَابَة عَن أبي الْأَشْعَث كَانَ ثُمَامَة الْقرشِي على صنعاء وَله صُحْبَة فَلَمَّا جَاءَهُ قتل عُثْمَان بَكَى فَأَطَال وَقَالَ الْيَوْم نزعت الْخلَافَة من أمة مُحَمَّد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ وَصَارَت ملكا وَجَبْرِيَّة من غلب على شَيْء أكله هُوَ ثُمَامَة بْن عدي"۔

(التاريخ الاوسط للبخاري، ج1ص600،مكتبة الرشد الرياض)

ابوالاشعث روایت کرتے ہیں کہ صحابی رسول ثمامۃ القرشی رضی اللہ عنہ صنعاء کے عامل تھے، انہیں جب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو رو پڑے اور دیر تک روتے رہے پھر فرمایا : آج امت محمدیہ سے خلافت لے لی گئی ہے اور اب جبری ملوکیت کا دور شروع ہوگیا ہے جو جس چیز پر غلبہ پائے اسے کھا جائے۔

اس اثر کی سند امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے، دکتور اکرم ضیاء العمری نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے دیکھئے :(عصرالخلافة الراشدة،محاولة لنقد الرواية التاريخية وفق منهج المحدثين، ج1ص443،مكتبة العبيكان ، الرياض)۔

قارئین محترم! ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ جو احادیث اوپر نقل کی ہیں جن میں صحیح بخاری و صحیح مسلم کی احادیث بھی ہیں، یہ بظاہر اس حدیث کے معارض ہیں جو پیش کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ" خلافت تو تیس سال تک ہونی تھی، اس کے بعد ملوکیت ہونی تھی"، اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہماری نقل کردہ یہ دوسری احادیث، تیس سالہ خلافت والی حدیث سے زیادہ صحیح اور مضبوط ہیں، کیونکہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے مروی "تیس سالہ خلافت" والی حدیث کی صحت وضعف کی بابت اہل علم میں اختلاف ہے، بعض اہل علم نے اسے غیر صحیح قرار دیا ہے مثلاً:

مفسر قرآن اور شارح سنن ترمذی قاضی ابوبکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ (م543ھ) لکھتے ہیں:

"وهذا حديث لا يصح" اور یہ حدیث (حدیث سفینہ) صحیح نہیں ہے۔

(العواصم من القواصم ص 201 طبع السعودية)

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ (م808ھ) کا حوالہ پہلے گذرا، فرماتے ہیں:

"ولا يُنظر في ذلك إلى حديث الخلافة بعدي ثلاثون سنة فإنه لم يصحّ، والحق أنّ معاوية في عداد الخلفاء"۔

اور اس سلسلے میں وہ حدیث نہیں دیکھی جائے گی جس میں آیا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی، کیونکہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اور حق بات یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار بھی خلفاء میں ہے۔

(تاریخ ابن خلدون، ج2ص650، دار الفکر بیروت)

علامہ محب الدین الخطیب رحمۃ اللہ علیہ (م1389ھ) نے بھی العواصم کی تعلیق میں اسے ضعیف قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

"لأن راويه عن سفينة سعيد بن جهمان، وقد اختلفوا فيه، قال بعضهم: لا بأس به، ووثّقه بعضهم، وقال فيه الإمام أبو حاتم "شيخ لا يُحتجّ به"، وفي سنده حشرج بن نباتة الواسطي وثّقه بعضهم، وقال فيه النسائي: "ليس بالقوي" وعبد الله بن أحمد بن حنبل يروي هذا الخبر عن سويد الطحان قال فيه الحافظ ابن حجر في تقريب التهذيب: "لين الحديث"۔

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے یہ بات روایت کرنے والا راوی سعید بن جہمان ہے جو مختلف فیہ ہے۔ اس کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ (اس کی روایت لینے میں) کوئی حرج نہیں، بعض نے اس کی توثیق کی ہے، لیکن امام ابو حاتم (رازی) نے اس کے بارے میں کہا کہ اس سے حجت اور دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔ اسی طرح اس روایت کی سند میں ایک راوی حشرج بن نباتہ واسطی ہے، اس کی بھی بعض نے توثیق کی ہے لیکن امام نسائی نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ قوی نہیں۔ امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبد اللہ نے یہ روایت سوید بن طحان کے واسطے سے بھی روایت کی ہے، اس راوی کے بارے میں بھی حافظ ابن حجر عسقلانی نے تقریب التہذیب میں کہا ہے کہ یہ "لین الحدیث" (کمزور حدیث والا) ہے۔

(حاشیہ نمبر(4) العواصم من القواصم ص201، السعودیة)

❀❀❀

سعید بن جمہان (یا جھمان)

اس روایت کی سند میں حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی کا نام "سعید بن جمھان" ہے، آئیے اس راوی سے متعلق چند مزید ائمہ کے اقوال دیکھتے ہیں:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (م256ھ) نے کہا:

"في حديثه عجائب"، اس کی حدیث میں عجوبے ہیں۔

(تهذيب التهذيب، ج4ص10، دائرة المعارف انڈيا/ إكمال تهذيب الكمال، ج5ص271،الفاروق الحديثة)

امام ابو حاتم الرازی رحمۃ اللہ علیہ (م277ھ) نے کہا:

"شيخ يكتب حديثه، ولا يحتج به"، یہ شیخ ہے، اس کی حدیث لکھی جائے گی لیکن اس سے حجت نہیں پکڑی جائے گی۔

(الجرح والتعديل لابن أبي حاتم، ج4ص10،حيدر آباد دكن)

امام زکریا بن یحییٰ الساجی رحمۃ اللہ علیہ (م307ھ) نے کہا:

"لا يتابع على حديثه"، اس کی حدیث کی متابعت نہیں کی جاتی۔

(تهذيب التهذيب، ج4ص14، دائرة المعارف انڈيا)

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ (م 456ھ) نے کہا:

"فسعيد بن جمهان غير مشهور بالعدالة بل مذكور انه لا يقوم حديثه"۔ سعید بن جمہان عدالت میں غیر مشہور ہے بلکہ اس کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ اپنی حدیث ٹھیک طرح سے نہیں بیان کر پاتا (یا اس کی حدیث سیدھی نہیں ہوتی)"۔

(المحلىٰ بالآثار، ج8ص164، دار الفكر بيروت)

E-BOOK

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ (م 748ھ) نے کہا:

"صالح الحديث، لا يحتج به"، یہ صالح الحدیث ہے لیکن اس سے دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔

(ديوان الضعفاء والمتروكين، ص156،مطبعة النهضة الحديثة، المكة المكرمة)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ (م 852ھ) نے کہا:

"صدوق له أفراد"، یہ صدوق ہے اس کے پاس کچھ ایسی روایات ہیں جو صرف یہی بیان کرتا ہے۔

(تقريب التهذيب، ص234، دار الرشيد، سوريا)

ان اقوال جرح وتعدیل کے پیش نظر یہ راوی راجح قول میں علی الاطلاق ثقہ کے درجہ پر نہیں ہے بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ صدوق وحسن الحدیث کے درجے پر ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تمام اقوال کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے، نیز امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا:

"صدوق وسط قال أبو حاتم لا يُحتجّ به"، یہ اوسط درجے کا صدوق راوی ہے،اور ابو حاتم نے کہا ہے کہ (جس روایت میں یہ متفرد ہو) اس سے دلیل نہ پکڑی جائے۔

(الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة، ج1ص433، طبع جدة)

الغرض یہ راوی صدوق کے درجہ پر ہے اور متکلم فیہ ہے ایسے راوی کے بعض تفردات قرائن کی روشنی میں مردود ہوتے ہیں یہی حال اس راوی کی تیس سالہ خلافت والی روایت میں بھی ہے کیونکہ اس میں اس راوی کی طرف سے بیان کردہ مذکورہ باتوں کے خلاف قرائن موجود ہیں تفصیل ملاحظہ ہو:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت اور پھر اس کے بعد ملوکیت سے متعلق کئی صحیح روایات وارد ہوئی ہیں لیکن زیر بحث روایت کے علاوہ کسی بھی صحیح روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زمانہ خلافت کی تحدید وارد نہیں ہے کہ وہ اتنے سال ہوگی، ملاحظہ ہو:

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں:

"حدثنا شيبان بن فروخ، حدثنا سليمان بن المغيرة، حدثنا حميد بن هلال، عن خالد بن عمير العدوي، قال: خطبنا عتبة بن غزوان، فحمد الله وأثنى عليه، ثم قال: أما بعد، فإن الدنيا قد آذنت بصرم وولت حذاء، ولم يبق منها إلا صبابة كصبابة الإناء، يتصابها صاحبها، وإنكم منتقلون منها إلى دار لا زوال لها، فانتقلوا بخير ما بحضرتكم، فإنه قد ذكر لنا أن الحجر يلقى من شفة جهنم، فيهوي فيها سبعين عاما، لا يدرك لها قعرا، ووالله لتملأن، أفعجبتم؟ ولقد ذكر لنا أن ما بين مصراعين من مصاريع الجنة مسيرة أربعين سنة، وليأتين عليها يوم وهو كظيظ من الزحام، ولقد رأيتني سابع سبعة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، ما لنا طعام إلا ورق الشجر، حتى قرحت أشداقنا، فالتقطتُ بردة فشققتُها بيني وبين سعد بن مالك، فاتزرت بنصفها واتزر سعد بنصفها، فما أصبح اليوم منا أحد إلا أصبح أميراً على مصر من الأمصار، وإني أعوذ بالله أن أكون في نفسي عظيما، وعند الله صغيرا، وإنها لم تكن نبوة قط إلا تناسخت، حتى يكون آخر عاقبتها مُلكا، فستخبرون وتجربون الأمراء بعدنا"۔

سیدنا خالد بن عمیر عدوی کہتے ہیں کہ (امیر بصرہ) عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے ہمیں خطبہ دیا تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد کہا کہ بعد حمد وصلوٰۃ کے معلوم ہو کہ دنیا نے ختم ہونے کی خبر دی، اور دنیا میں سے کچھ باقی نہ رہا مگر جیسے برتن میں کچھ بچا ہوا پانی رہ جاتا ہے جس کو اس کا صاحب پیتا ہے۔ اور تم دنیا سے ایسے گھر کو جانے والے ہو جس کو زوال نہیں، پس اپنی زندگی میں نیک عمل کر کے جاؤ، اس لئے کہ ہم سے بیان کیا گیا کہ پتھر جہنم کے اوپر کے کنارے سے ڈالا جائے گا

اور ستر برس تک اس میں اترتا جائے گا اور اس کی تہہ کو نہ پہنچے گا۔ اللہ کی قسم! جہنم بھری جائے گی۔ کیا تم تعجب کرتے ہو؟ اور ہم سے بیان کیا گیا کہ جنت کے دروازے کی ایک طرف سے لے کر دوسری طرف کنارے تک چالیس برس کی راہ ہے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ دروازہ لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا ہوگا اور میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں کہ میں سات شخصوں میں سے ساتواں شخص تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور ہمارا کھانا درخت کے پتوں کے سوا کچھ نہ تھا یہاں تک کہ ہماری باچھیں زخمی ہوگئیں (بوجہ پتوں کی حرارت اور سختی کے)۔ میں نے ایک چادر پائی اور اس کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کئے، ایک ٹکڑے کا میں نے تہبند بنایا اور دوسرے ٹکڑے کا سعد بن مالک (سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ ناقل) نے۔

اب آج کے روز کوئی ہم میں سے ایسا نہیں ہے کہ کسی شہر کا حاکم نہ ہو اور میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھوں، لیکن اللہ کے نزدیک چھوٹا ہوں اور بیشک کسی پیغمبر کی نبوت (دنیا میں) ہمیشہ نہیں رہی بلکہ نبوت کا اثر (تھوڑی مدت میں) جاتا رہا، یہاں تک کہ اس کا آخری انجام یہ ہوا کہ وہ ملوکیت ہوگئی۔ پس عنقریب تم ہمارے بعد آنے والے امراء کو دیکھو گے اور تجربہ کرو گے ان امیروں کا جو ہمارے بعد آئیں گے (کہ ان میں دین کی باتیں جو نبوت کا اثر ہے، نہ رہیں گی اور وہ بالکل دنیادار ہو جائیں گے)۔

(صحیح مسلم ج 4ص 2278، حدیث نمبر2967، دار احیاء التراث العربي بیروت)

اس حدیث میں بھی نبوت کے بعد خلافت کی طرف اشارہ ہے اس کے بعد ملوکیت کی پیشین گوئی ہے، لیکن صحیح مسلم کی اس حدیث میں دورِ نبوت کے بعد دورِ خلافت کی مدت نہیں بتلائی گئی ہے۔

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں:

"حدثنا أحمد بن النضر العسكري، ثنا سعيد بن حفص النفيلي، ثنا موسى بن أعين، عن ابن شهاب (والصواب ابي شهاب)، عن فطر

بن خليفة، عن مجاهد، عن ابن عباس، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أول هذا الأمر نبوة ورحمة، ثم يكون خلافة ورحمة، ثم يكون ملكا ورحمة، ثم يكون إمارة ورحمة، ثم يتكادمون عليه تكادم الحمر فعليكم بالجهاد، وإن أفضل جهادكم الرباط، وإن أفضل رباطكم عسقلان"۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس معاملہ کا پہلا دور نبوت اور رحمت کا ہوگا۔ پھر خلافت اور رحمت کا دور ہوگا۔ پھر ملوکیت اور رحمت کا دور ہوگا۔ پھر امارت اور رحمت کا دور ہوگا۔ پھر لوگ اس معاملہ میں ایک دوسرے پر گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے۔ اور تمہارا بہترین جہاد دشمن کے مقابلہ کے لئے تیار رہنا ہے اور ایسی بہترین تیاری کی جگہ عسقلان ہے۔

(المعجم الكبير للطبراني، ج11ص88،رقم الحديث11138،مكتبة ابن تيمة القاهرة واسناده صحيح)

امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا:

"حدثنا زيد بن الحباب ،حدثنا العلاء بن المنهال الغنوي ، حدثنا مهند القيسي، وكان ثقة ، حدثني قيس بن مسلم ، عن طارق بن شهاب ، عن حذيفة رضي الله عنه،قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنكم في نبوة ورحمة ، وستكون خلافة ورحمة ، ويكون كذا وكذا ، ويكون ملكا عضوضا، يشربون الخمر، ويلبسون الحرير ، ومع ذلك ينصرون إلى قيام الساعة"۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نبوت اور رحمت کے دور میں ہو، اس کے بعد خلافت اور رحمت کا دور ہوگا، اس کے بعد ایسا دور اور ایسا دور ہوگا

۔اس کے بعد کاٹنے والی ملوکیت کا دور ہوگا، اس وقت لوگ شراب پیئں گے، ریشم پہنیں گے، اس کے باوجود بھی قیامت تک مدد کئے جاتے رہیں گے۔

(المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية، ج17ص559،طبع السعودية واسناده صحيح وصحّحه البوصيرى فى إتحاف الخيرة المهرة ج8ص93، طبع الرياض، واخرجه الطبراني من طريق ابن ابى شيبة فى المعجم الأوسط ج6ص345،طبع القاهرة، واخرجه ابن الأعرابي في المعجم ج2ص803،طبع السعودية)

غور کریں ان احادیث میں دور نبوت کے بعد دور خلافت کا تذکرہ ہے لیکن کسی میں بھی دور خلافت کی تحدید نہیں کی گئی کہ خلافت اتنے سال رہے گی، یہ بات صرف سعید بن جمہان ہی نقل کرتا ہے اور وہ متکلم فیہ اور متفرد ہے اس لئے اس کا بیان قابل احتجاج نہیں۔

اسی طرح زیر بحث حدیث سفینہ سے پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے بعد صرف چار یا پانچ خلیفہ بتلائے ہیں کیونکہ تیس سال میں تو صرف حضرت حسن رضی اللہ عنہ تک آتے ہیں، جبکہ صحیحین کی روایت کے مطابق جو پہلے نقل ہو چکی اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے بعد صراحتاً بارہ خلفاء کا تذکرہ فرمایا ہے، علاوہ ازیں صحیح بخاری کی حدیث بھی پہلے نقل ہو چکی جس میں نبی ﷺ نے اپنے بعد کثیر تعداد میں خلفاء کا تذکرہ فرمایا ہے۔

نیز خود سید لعل شاہ صاحب بخاری نے بھی اس "تیس سالہ خلافت والی" روایت کے بارے میں تسلیم کیا ہے کہ:

"..... یہ حسن درجہ کی حدیث ہے اگرچہ پایۂ صحت کو نہ پہنچی مگر دوسری روایت میں خلافت راشدہ کے انقطاع کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں اس کے وقت کے تعین کے لئے مفید ہے کیونکہ یہ روایت ایسی ضعیف نہیں کہ از قسم متروک ہو.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 210)

واضح رہے کہ لعل شاہ صاحب بخاری تو اس روایت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جن میں بقول ان کے خلافت راشدہ کے انقطاع کی طرف "اشارے" پائے جاتے ہیں، لیکن ہم نے تو ایسی صریح روایات پیش کی ہیں جن میں واضح طور پر خلافت نبوت کے انقطاع کا وقت بیان ہوا ہے۔

پھر لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 213 پر ایک چارٹ بنایا ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کرنے میں "سعید بن جمھان" اکیلا نہیں ہے بلکہ ایک "ابو ریحانہ" نامی راوی نے حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کرنے میں اس کی متابعت کی ہے، تو آئیے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیتے ہیں۔

ابو ریحانہ بصری سے منقول ایک متابعت کا حال

"اخبرنا أبو غالب بن البناء أنا أبو الحسين بن الآبنوسي أنا عبيد الله بن عثمان الدقاق أنا إسماعيل بن علي الخطبي نا عبد الله بن أحمد بن حنبل حدثني أبو علي سويد الطحان نا علي بن عاصم أنا أبو ريحانة عن سفينة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال الخلافة من بعدي ثلاثون سنة قال رجل كان حاضرا في المجلس قد دخلت من هذه الثلاثين ستة شهور في خلافة معاوية فقال من ها هنا أتيت تلك الشهور كانت البيعة للحسن بن علي بايعه أربعون ألفا أو اثنان واربعون ألفا"۔

ابو ریحانہ، سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی، مجلس میں موجود ایک شخص نے کہا: ان تیس سال میں سے چھ ماہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں داخل ہو گئے تو انہوں نے کہا: ان چھ مہینوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی تھی، ان سے چالیس ہزار یا بیالیس ہزار لوگوں نے بیعت کی تھی۔

(تاريخ دمشق لابن عساكر، ج13ص261، طبع دار الفكر بيروت)

لعل شاہ صاحب بخاری نے یہی روایت بحوالہ "البداية والنهاية" پیش کی ہے، تو عرض ہے کہ، اس کی سند میں ایک راوی سعد الطحان "ليّن الحديث" ہے، نیز سوید کا شیخ "على بن عاصم بن صهيب"

ہے جو کہ سخت ضعیف ہے، بلکہ کئی محدثین نے اس پر کذاب ہونے کی جرح کی ہے۔

امام یزید بن ہارون رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

"ماذِلنا نعرفه بالكذب"، ہم اسے جھوٹ کے ساتھ ہی جانتے رہے۔

(سؤالات البرذعي لأبي زرعة، ص133و 134، طبع القاهرة واسناده صحيح واخرجه ايضا العقيلى فى الضعفاء الكبير، ج 3ص 245، دار الكتب العلمية بيروت)

خالد بن مہران الحذّاء رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اسی علی بن عاصم کی کچھ احادیث بیان کی گئیں تو انہوں نے کہا:

"كذب فاحذروه"، اس نے جھوٹ بولا ہے اس سے بچ کر رہو۔

(الضعفاء الكبير للعقيلي، ج 3ص 246، دار الكتب العلمية بيروت واسناده صحيح)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

"وقال وهب بن بقية: سمعتُ يزيدَ بن زُريع، قال: حدثنا علي، عن خالد ببضعة عشر حديثا، فسألنا خالدا عن حديث، فأنكره، ثم آخر فأنكره، ثم ثالث فأنكره، فأخبرناه، فقال: كذاب فاحذروه"۔

وہب بن بقیہ نے یزید بن زریع کو کہتے سنا کہ علی بن عاصم نے ہم سے دس سے زیادہ احادیث خالد الحذاء سے بیان کیں، پھر ہم نے خالد الحذاء سے ان میں سے ایک حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اس سے انکار کیا، پھر ہم نے ایک دوسری حدیث کے بارے میں پوچھا، اس سے بھی خالد الحذاء نے انکار کیا، پھر ہم نے ایک تیسری حدیث کے بارے میں پوچھا اس سے بھی خالد الحذاء نے انکار کیا۔ اس کے بعد ہم نے خالد الحذاء کو یہ بات بتلادی تو خالد الحذاء نے کہا: یہ بہت بڑا جھوٹا شخص ہے اس سے بچ کر رہو۔

(التاريخ الكبير للبخاري، ج 6ص 290طبع المعارف العثمانية الهند، واسناده صحيح)

یہ واقعہ اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ علی بن عاصم نے جھوٹی احادیث بیان کی ہیں اسی وجہ سے کئی ایک محدثین نے انہیں کذاب کہا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہی کہا :

"ليس بالقوي عندهم وقال مرّة يتكلمون فيه"، یہ راوی ان (ائمہ جرح و تعدیل) کے نزدیک قوی نہیں ہے اور کبھی کہا یہ متکلم فیہ ہے۔

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا :

"كان يغلط ويثبت على غلطه" یہ غلطی کرتا تھا اور پھر اپنی غلطی پر ثابت قدم رہا کرتا تھا۔

(تهذيب التهذيب، ج 7ص 344طبع الهند)

بعض محدثین نے ان کا دفاع کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ان کی کتاب میں دوسرے لوگ ان کے نام سے جھوٹی احادیث لکھ دیتے تھے جسے یہ بیان کردیتے۔

اگر اس بات کو درست تسلیم کرلیں تو بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی طرف سے جھوٹی احادیث بیان ہوئی ہیں لہٰذا ان کی احادیث کسی شمار میں نہیں ہیں۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

"أجمعوا على ضعفه يعني علي بن عاصم" محدثین کا ان کے ضعیف ہونے پر اجماع ہے۔

(المستدرك للحاكم مع تعليق الذهبي، ج 4ص 375طبع دار الكتب العلمية بيروت)

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا :

"ليس بشيء" وہ (علی بن عاصم) کچھ بھی نہیں۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا :

"متروك الحديث"،اس کی حدیث ترک کردی گئی ہے۔

(ميزان الاعتدال، ج 3ص 135دار المعرفة بيروت)

خلاصہ کلام یہ کہ جس روایت کو سعید بن جمہان کی متابعت کے لئے پیش کیا جارہا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

الغرض! اگر اس تیس سالہ خلافت کے تعین والی روایت کو"حسن" درجہ کی روایت تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ ان"صحیح" روایات کے معارض ٹھہرتی ہے جو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں اور جن میں صحیحین کی روایات بھی ہیں، تو ترجیح ان روایات کو ہونی چاہیئے جو اصح ہیں، تاہم ہمیں اس تیس سالہ خلافت والی روایت کو ضعیف ثابت کرنے یا کہنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں، اس کے بغیر بھی جب ہم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب"ازالۃ الخفاء" اور حضرت شاہ اسماعیل دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب"منصب امامت" کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان میں بیان کردہ خلافت کی اقسام کا جائزہ لیتے ہیں تو ان تمام روایات میں تطبیق بہت آسان ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

خلافت کی اقسام اور خلافت راشدہ خاصہ وخلافت راشدہ عامہ

ہم پہلے نقل کر آئے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی شخص کے مستحق خلافت ہونے کی درج ذیل شرطیں لکھیں ہیں۔

(1)مسلمان ہو، کافر نہ ہو

(2)عاقل ہو، مجنون وبے وقوف نہ ہو

(3)بالغ ہو، نابالغ نہ ہو

(4)مرد ہو، عورت نہ ہو

(5)حر یعنی آزاد ہو، غلام نہ ہو

(6)متکلم، سمیع اور بصیر ہو، گونگا، بہرا اور اندھا نہ ہو۔

(7)شجاع یعنی بہادر وہوشیار ہو اور صاحب رائے ہو، (بزدل) آرام طلب اور ناتجربہ کار نہ ہو۔

(8)عادل اور صاحب مروت ہو،یعنی کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا ہو،صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہ ہو، نیز وارستہ مزاج یعنی آزاد طبع اور بے پرواہ نہ ہو۔

(9) مجتہد ہو(اور بقول شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مجتہد ہونے کے لیے صرف علمِ قرآن اور حفظِ حدیث کافی تھا۔دیکھیں :ازالۃ الخفاء مترجم،صفحہ 21و22،جلد1)

(10)باپ کی طرف سے قریشی ہو۔

(ازالۃ الخفاء،مترجم از صفحہ 17 تا22،جلد1)

اور پھر شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے استحقاقِ خلافت کی مذکورہ شرطوں کی تفصیل دے کر صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:

"الحاصل جب یہ شرطیں کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ مستحق خلافت سمجھا جائے گا اور اگر اس کو (اہل حلّ وعقد) خلیفہ بنائیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں تو وہ خلیفۂ راشد ہوگا"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم،صفحہ 23 جلد1)

اور ایک جگہ حضرت شاہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں :

"اور حضرت مرتضی (رضی اللہ عنہ) کے بعد جب (حضرت) معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہما) متمکن ہوئے اور لوگوں کا اتفاق ان (کی خلافت) پر حاصل ہوگیا اور مسلمانوں کی جماعت سے نااتفاقیاں اٹھ گئیں (تو گو ان کو خلافت میں تمکین حاصل ہوگئی مگر ان کی خلافت،خلافت خاصہ نہ تھی کیونکہ) وہ سوابق اسلامیہ نہ رکھتے تھے اور خلافت خاصہ کے لوازم ان میں نہ پائے جاتے تھے.."۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو،صفحہ 479، 480 جلد1)

قارئین محترم!ان دونوں اقتباسات کو غور سے پڑھیں،پہلے اقتباس میں شاہ صاحب نے دس شرائط گنوائی ہیں جو ایک خلیفہ میں ہونی چاہئیں،اور پھر لکھا ہے" جب یہ شرطیں کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ مستحق خلافت سمجھا جائے گا اور اگر اس کو (اہل حل وعقد) خلیفہ بنائیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کریں تو وہ خلیفۂ راشد

ہوگا"، جس کا صاف اور صریح مطلب ہے کہ خلیفہ راشد ہونے کے لئے صرف ان دس شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اور جب ان شرائط کے حامل کسی بھی شخص کو اہل حل وعقد خلیفہ بنا کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تو وہ "خلیفہ راشد" ہوگا۔

اور دوسرے اقتباس میں حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک لفظ "خلافت خاصہ" کا لکھا ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک خلافت کی دو قسمیں ہیں "خلافت خاصہ" اور "خلافت عامہ"، اور خلافت خاصہ کے لوازم میں ایک چیز خلیفہ کا "سابقون اولون" میں سے ہونا بھی ہے، اسی کی طرف اشارہ کیا کہ چونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں "سوابق اسلامیہ" نہیں پائے جاتے تھے اس لئے ان کی خلافت "خلافت خاصہ" نہیں ہے (یعنی "خلافت عامہ" تو ہے ہی)۔

اسی بات کو حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "خلافت خاصہ کے لوازمات" کے عنوان سے تفصیل کے ساتھ بھی بیان فرمایا ہے اور خلافت خاصہ کے تقریباً آٹھ لوازمات گنوائے ہیں جو کہ یہ ہیں :

1) خلیفہ مہاجرین اولین میں سے ہو۔

1) ان لوگوں میں سے ہو جو حدیبیہ (بیعت رضوان) میں شریک تھے۔

3) ان لوگوں میں سے ہو جو سورہ نور کے نزول کے وقت ایمان لا چکے تھے۔

4) ان میں سے ہو جو بدر و تبوک اور دوسرے مشاہد عظیمہ میں شریک تھے۔

5) جو ان لوگوں میں سے ہو جن کا نام لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہو۔

6) ایسا شخص ہو جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نص فرمادی ہو کہ وہ امت کے اعلیٰ طبقہ سے ہے۔

7) وہ ایسا شخص ہو جس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً وفعلاً بہت مرتبہ ایسا برتاؤ فرمایا ہو جیسا کہ کوئی بادشاہ ولیعہد کے ساتھ کرتا ہے۔

8) اور جو کچھ اللہ عزوجل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وعدہ فرمایا ہے ان میں سے بعض وعدے اس خلیفہ کے ہاتھ پر پورے ہوں (خلافت خاصہ کی یہ علامت خلافت منعقد ہو جانے کے بعد معلوم ہوتی ہے، خلافت سے قبل

معلوم نہیں ہوسکتی)۔

(ملخصاً : ازالۃ الخفاء مترجم اردو، جلد 1 صفحہ 43 تا 60)

تو جس خلافت میں یہ لوازمات پائے جائیں وہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "خلافت خاصہ" ہے، اس کے مقابلہ میں "خلافت عامہ" ہے جس کے لئے ان دس شرائط کا پایا جانا ہی کافی ہے جو پہلے مذکور ہوئیں جن میں مرد، مسلمان، عاقل، بالغ، آزاد، بہادر، عادل، کبیرہ گناہوں سے بچنے والا اور قریشی وغیرہ ہونا بیان ہوا۔

تو پہلے خلافت کی دو قسمیں ہوئیں :

1) خلافت عامہ

2) خلافت خاصہ

پہلے چار خلفاء رضی اللہ عنہم کی خلافت "خلافت راشدہ خاصہ" ہے کیونکہ ان میں بنیادی دس شرائط کے ساتھ ساتھ سوابق اسلامیہ اور خلافت خاصہ کے لوازمات بھی پائے جاتے ہیں، اور ان کے بعد قیامت تک جس خلیفہ میں بھی پہلی دس شرائط پائی جائیں گی اور اہل حل وعقد ان کی بیعت کرلیں گے تو ان کی خلافت "خلافت راشدہ عامہ" ہوگی۔

بلکہ حضرت شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک لکھتے ہیں :

"خلیفہ راشد وہ شخص ہے جو منصب امامت رکھتا ہو اور سیاست ایمانی کے معاملات اس سے ظاہر ہوں جو اس منصب تک پہنچا وہی خلیفہ راشد ہے خواہ زمانہ سابق میں ظاہر ہوا خواہ موجودہ زمانے میں ہو خواہ اوائل امت میں سے ہو خواہ اس کے آخر میں خواہ فاطمی نسل سے ہو یا ہاشمی سے خواہ نسل قُصَی سے ہو خواہ نسل قریش سے"۔

(منصب امامت مترجم اردو، صفحہ 116 مطبع حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور 2008ء)

پھر خلافت راشدہ کے اوقات کا عنوان دے کر لکھتے ہیں :

"پس جیسا کہ کبھی کبھی دریائے رحمت سے کوئی موج سر بلند ہوتی ہے اور ائمہ ہدیٰ میں سے کسی امام کو ظاہر کرتی ہے ایسا ہی اللہ کی نعمت کمال تک پہنچتی ہے تو کسی کو تخت خلافت پر جلوہ افروز کر دیتی ہے اور وہی امام اس زمانہ کا خلیفہ راشد ہے اور وہ جو حدیث میں وارد ہے کہ خلافت راشدہ کا زمانہ رسول مقبول علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد تیس سال تک ہے (واضح رہے کہ حدیث میں صرف "خلافت" کا لفظ ہے "خلافت راشدہ" کا نہیں۔ ناقل) اس کے بعد سلطنت ہوگی اس سے مراد یہ ہے کہ خلافت راشدہ متصل اور متواتر طریق پر تیس سال تک رہے گی اس کا مطلب یہ نہیں کہ قیام قیامت تک خلافت راشدہ کا زمانہ وہی تیس سال ہے اور بس..."۔

(ایضاً)

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ جو لوگ "تیس سالہ خلافت" والی حدیث کا مفہوم یہ ثابت کرنے پر بضد ہیں کہ خلافت راشدہ کا زمانہ صرف اور صرف تیس سال تھا اس کے بعد قیامت تک کوئی خلیفہ راشد نہیں ہوسکتا، تو ان کا یہ مفہوم درست نہیں، بلکہ اگر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کی روشنی میں اس تیس سالہ خلافت والی حدیث سے مراد "خلافت راشدہ خاصہ" لی جائے اور پھر اس کے بعد "خلافت راشدہ عامہ" کا جاری رہنا مانا جائے تو وہ حدیثیں بھی سمجھ آجاتی ہیں جن میں بکثرت خلفاء ہونے یا بارہ ایسے خلفاء ہونے کا بیان ہے جو سب قریشی ہوں گے اور جن پر امت کا اتفاق و اجماع ہوگا، ایسی احادیث میں "خلافت راشدہ عامہ" کا ذکر ہے۔

پھر شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت راشدہ خاصہ کی بھی تقسیم فرمائی ہے، اور اس تقسیم کی طرف خود لعل شاہ صاحب نے بھی اپنی کتاب میں ایک جگہ مختصر اشارہ یوں کیا ہے کہ:

"حضرت شاہ صاحب (یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ناقل) کے نزدیک خلافت راشدہ کی تین قسمیں ہیں، ایک خلافت راشدہ تامہ منتظمہ غیر مفتونہ، دوسری خلافت راشدہ تامہ منتظمہ مفتونہ، تیسری خلافت راشدہ تامہ غیر منتظمہ۔ حضرات الشیخین المعظمین (یعنی ابوبکر و عمر۔ناقل) رضی اللہ عنہما کی خلافت قسم اول کی خلافت ہے اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی خلافت از قسم ثانی اور

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت از قسم ثالث ہے.. ”۔

(استخلاف یزید، صفحہ 73و74)

لعل شاہ صاحب نے جو یہاں ” تامہ“ کالفظ لکھا ہے اس سے مراد” خاصہ“ ہی ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے دیکھا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت راشدہ کی دو قسمیں کی ہیں ایک” خلافت راشدہ خاصہ“ اور دوسری ” خلافت راشدہ عامہ“ لعل شاہ صاحب نے جو یہ تین قسمیں بیان کی ہیں یہ” خلافت راشدہ خاصہ“ کی ہیں، اور پہلے چاروں خلفاء کی خلافت” خلافت راشدہ خاصہ“ ہے اور اس کی وجہ ان چاروں کا” سابقون اولون“ میں سے ہونا ہے، ان کے بعد جس میں بھی خلافت راشدہ کی وہ تمام شروط پائی جائیں گی جن کا ذکر خود شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے پہلے گذرا، تو وہ” خلافت راشدہ عامہ“ میں شمار ہوگی۔

تو اب خلافت کی تقسیم کچھ یوں ہوگی :

(1) خلافت راشدہ عامہ

جس میں دس شرائط مکمل پائی جائیں اور وہ خلیفہ اپنے فرائضِ منصبی بخوبی ادا کرے، حضرت شاہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفۂ راشد کے فرائض بھی ایک مستقل عنوان کے تحت بیان فرمائے ہیں چنانچہ عنوان قائم کیا ہے:

”مسئلہ (پنجم) ان امور کا بیان جو خلیفہ پر واجب ہیں از قسم اجراء مصالح اہلِ اسلام“۔

پھر وہ امور بالتفصیل بیان فرماتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(1) دینِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کو اسی طرح محفوظ رکھنا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مستفیضہ سے ثابت ہو اور سلفِ صالحین کا اجماع اس پر منعقد ہو چکا ہو۔

(2) ارکان اسلام یعنی جمعہ، جماعت، زکوٰۃ، حج اور صوم کا قائم کرنا، اپنے مقام پر بذاتِ خود اور مقاماتِ بعیدہ میں اپنے نائبین کے ذریعہ۔

(3) جس قدر ہو سکے بذاتِ خود علوم دینیہ کو زندہ رکھنا اور ہر شہر میں مدرّسین و معلّمین مقرر کرنا۔

(4) عہدۂ قضاء کے فرائض انجام دینا اور قاضیوں، مفتیوں کو مقرر کرنا۔

(5) بلادِ اسلامیہ کو، کافروں، رہزنوں اور غاصبوں سے محفوظ رکھنا اور دارالاسلام کی سرحدوں کو فوجوں اور آلاتِ جنگ سے معمور رکھنا، دشمنانِ خدا سے جہاد کرنا اور لشکروں کی ترتیب، مجاہدوں کے وظائف، مالِ غنیمت کی تقسیم، قاضیوں، مفتیوں، معلموں، واعظوں، اور مساجد کے اماموں کے مشاہرے نیز جزیہ وخراج کی وصولی جیسے اس کے تمام متعلقات کو بحسن وخوبی انجام دینا۔

(6) کاروبار میں سچے، امانت داروں اور خیر خواہوں کو نائب بنانا۔

(7) رعایا، امراءِ شہر، حکام، اور افواج کے حالات کی خبر گیری رکھنا تاکہ ظلم اور خیانت نہ ہونے پائے۔

(8) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔

(9) حدود اللہ کو جاری کرنا۔

(10) مسلمانوں کے کام، کافروں کے سپرد کسی صورت نہ کرنا۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، صفحہ 28 تا 30، جلد 1)

(2) خلافت راشدہ خاصہ

جس میں ان دس شرائط کے ساتھ ساتھ خلافت خاصہ کے وہ آٹھ کے قریب لوازم پائے جائیں جو پہلے بیان ہو چکے (جیسے خلیفہ کا مہاجرین اولین میں سے ہونا اور سوابق اسلامیہ کا حامل ہونا وغیرہ) یہ پہلے چاروں خلفاء کی خلافت ہے۔

پھر خلافت خاصہ کی دو قسمیں ہیں:

خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ

وہ خلافت جسے مکمل تمکین حاصل ہو جائے اور تمام اطراف ملک میں ان کا حکم نافذ ہو جائے اور تمام مسلمانوں نے ان کے حکم کے آگے سر جھکا دیا ہو، یہ پہلے تین خلفاء (سیدنا ابو بکر، سیدنا عمر اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہم) کی خلافت ہے۔

خلافت راشدہ خاصہ غیر منتظمہ

یہ وہ خلافت راشدہ ہے جسے مکمل تمکین نہ حاصل ہوئی ہو، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ہے، اسے حضرت

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان فرمایا ہے :

”حضرت علی مرتضی (رضی اللہ عنہ) باوجود سوابق اسلامیہ میں راسخ القدم ہونے اور باوصف کثرت اوصاف خلافت خاصہ کے (ان کی ذات میں پائے جانے کے) اور باوجود اس کے کہ ان کے لئے بیعت کا انعقاد ہوا، اور رعیت کا احکام الٰہی میں ان کے لئے مطیع ہونا ثابت ہوگیا، خلافت میں متمکن نہ ہوئے اور اطراف ملک میں ان کا حکم نافذ نہ ہوا اور تمام مسلمانوں نے ان کے حکم کے آگے سر نہ جھکایا اور جہاد ان کے زمانہ میں بالکل بند ہوگیا اور مسلمانوں کی یکجہتی میں فرق آیا......... ہر چند ان خرابیوں نے آنجناب رضی اللہ عنہ کے صفات کاملہ نفسانیہ میں کوئی خلل نہیں پیدا کیا مگر مقاصد خلافت جیسا کہ چاہئے حاصل نہ ہوئے.. “۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 479، 480 جلد1)

اور ایک دوسری جگہ لکھا :

”تمکین دین اور تمکین فی الارض، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حاصل نہ ہوسکی“۔

(دیکھیں :ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 572 جلد2)

اسی بات کو حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے یوں لکھا ہے :

”پس خلافت راشدہ کی دو قسمیں ہوئیں، ایک خلافت منتظمہ جیسا کہ خلفائے ثلاثہ، دوسری خلافت غیر منتظمہ جیسا کہ خلافت علی المرتضی رضی اللہ عنہ.... “۔

(منصب امامت مترجم اردو، صفحہ 103)

پھر ”خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ“ کی بھی دو قسمیں ہیں :

(1) خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ محفوظہ

(2) خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ مفتونہ

ان دونوں قسموں کو حضرت شاہ اسماعیل دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے :

”خلافت منتظمہ کا انتظام کبھی کمال تک پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ خلیفہ راشد کا اپنی خلافت کے زمانہ

میں مسلم ہونا اور خاص وعام میں اس کی عزت ہوتا ہے، کسی کو اس کے تسلط سے رنج وملال نہیں پہنچتا اور نہ کسی کو اس کی لیاقت میں کلام ہوتا ہے، ہم اسے خلافت محفوظہ کہیں گے۔ اور کبھی اہل زمانہ خلیفہ راشد کے تسلط سے رنج اٹھاتے اور اس پر طعن وملامت کی زبان دراز کردیتے ہیں لیکن حفاظت ربانی اور تائید آسمانی کے باعث ان کی رد وقدح، بغاوت اور خروج تک نہیں پہنچتی اور ان کا ملال قلبی خلع بیعت کی نوبت نہیں لاتا، اور خلافت کا انتظام بظاہر خلیفہ راشد کی حسب مرضی چلتا ہے اگرچہ اس کے بعض احکام بعض اہل زمانہ کے دلوں پر شاق گذریں اسے ہم خلافت مفتونہ کہتے ہیں، پس خلافت منتظمہ بھی دو قسم پر منقسم ہوئی، محفوظہ مثل خلافت شیخین اور مفتونہ مثل خلافت ذوالنورین"۔

(منصب امامت مترجم اردو، صفحہ 114و115)

خلاصہ کلام

اس ساری تفصیل سے خلافت راشدہ کی یہ مندرجہ ذیل قسمیں معلوم ہوئیں:

1) خلافت راشدہ عامہ

2) خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ

3) خلافت راشدہ خاصہ غیر منتظمہ

4) خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ محفوظہ

5) خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ مفتونہ

اب اگر تیس سالہ خلافت والی حدیث کو" خلافت راشدہ خاصہ" پر محمول کرلیا جائے اور ان احادیث کو جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر خلافت کے خاتمہ کا اشارہ ملتا ہے" خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ" پر محمول کرلیا جائے، اور اگر کسی حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر خلافت ختم ہونے کا اشارہ ملے تو اسے" خلافت راشدہ خاصہ منتظمہ محفوظہ" پر محمول کرلیا جائے اور ان احادیث کو جن سے تیس سال کے بعد بھی خلافت کے جاری رہنے کا اشارہ ملتا ہے یا بکثرت خلفاء ہونے کا ذکر ہے" خلافت راشدہ عامہ" پر محمول کرلیا جائے تو بہت حد تک ان تمام

احادیث میں تطبیق ہو جائے گی اور کسی حدیث کو ضعیف قرار دینے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی اور نہ ہی تیس سالہ حدیث کی بنیاد پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ضرور بالضرور" بادشاہت" ثابت کرنے کی کوئی وجہ رہے گی۔

اہم نوٹ:

یاد رہے! تیس سالہ خلافت والی حدیث میں صرف" خلافت" کا لفظ ہے نہ کہ" خلافت راشدہ" کا، اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ زمانہ صحابہ میں ہمیں" خلافت راشدہ" اور" غیر راشدہ" کی اصطلاح نہیں ملتی، یہ اصطلاح ہمیں زمانہ صحابہ کے بعد ہی نظر آتی ہے۔

والله اعلم بالصواب وعلمه اتمّ وأحكم

لعل شاہ صاحب کی پریشانی

لعل شاہ صاحب نے یہ تو لکھ دیا کہ:

".... حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کو" ملک" بادشاہت کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اسلام میں سب سے پہلا بادشاہ قرار دیا گیا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 192)

اور پھر صفحہ 209 پر سنن ترمذی کے حوالے سے حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو بھی بطور استدلال نقل کیا ہے اور اس پر بہت لمبی چوڑی بحث کی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ" خلافت تیس سال رہے گی"۔ (دیکھیں :استخلاف یزید، صفحہ 209 تا 215)

لیکن ان کے دل میں بھی وہ روایات کھٹک رہی تھیں جن میں کثیر تعداد میں خلفاء ہونے یا بارہ خلیفوں کا ذکر ہے تو لعل شاہ صاحب نے بارہ خلفاء والی روایت کے بارے میں کچھ اس طرح لکھا :

"حضرت جابر بن سمرہ سے ایک ہی روایت مروی ہے اور اس کے الفاظ میں بہت اختلاف ہے، مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اسلام غالب رہے گا بارہ خلفاء تک وہ سب خلفاء

قریش میں ہوں گے، اس روایت کے مطلب میں بھی محدثین نے اختلاف کیا ہے... "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 361)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح مسلم سے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس روایت پر دو سوال وارد ہوتے ہیں، پہلا یہ کہ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ خلافت تیس سال تک ہوگی پھر بادشاہت ہوگی تو وہ حدیث اِس حدیث کے خلاف ہے کیونکہ ان تیس برسوں میں تو پہلے چاروں خلفاء اور کچھ مہینے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہی آتے ہیں تو پھر بارہ خلفاء والی بات کیسے درست ہوگئی؟ اس سوال کا جواب بقول لعل شاہ صاحب، قاضی عیاض نے یہ دیا ہے کہ تیس سالہ خلافت سے مراد "خلافت نبوت" ہے اور بارہ خلفاء میں خلافت نبوت شرط نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ خلفاء تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت ہوئے ہیں تو بارہ کی تحدید کیسے صحیح ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں تحدید نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ خلیفے صرف بارہ ہی ہوں گے اور یہ بھی احتمال ہے مستحقین خلافت عدد میں بارہ ہوں اور ان میں تتابع (یعنی ایک ساتھ ہونا۔ ناقل) شرط نہیں ہے، کچھ ہو چکے ہیں اور کچھ ہوں گے... "۔ (ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 262)

پھر لعل شاہ صاحب یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ :

"حدیث کے الفاظ اور مطالب میں شدید اختلاف ہے... اصل بات یہ ہے کہ یہ روایت صرف ایک ہی صحابی سے مروی ہے، حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے الفاظ میں اتنا اختلاف ہے کہ ان کے مطالب میں یکجہتی اور ایک محمل پر ان کا حمل بڑی کھینچ تان کر کے بھی ناممکن ہے اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت جابر بن سمرہ نے جو الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہیں پچھلے راویوں نے ان میں کچھ اضافے کیے ہیں یا بعض راویوں نے حدیث کے اصل الفاظ میں سے کچھ الفاظ کم کر دیے ہیں.... الخ "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 262 تا264)

قارئین محترم! بارہ خلفاء والی حدیث کے الفاظ میں کسی قسم کا ابہام نہیں، حدیث میں "بارہ" کا لفظ بھی ہے اور "خلفاء" کا بھی اور ان سب کے "قریشی" ہونے کا بھی، باقی ان بارہ خلفاء سے کون کون مراد ہیں؟ یہ

شارحین نے (حافظ ابن حجر غیرہ نے) اپنی تحقیق کے مطابق بیان کیا ہے جس کا ذکر لعل شاہ صاحب نے کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ ان کے نظریہ کے خلاف ہے، یہ بات درست ہے کہ حدیث میں ان بارہ خلفاء کے نام مذکور نہیں ہیں، لیکن لعل شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ پچھلے راویوں نے حدیث کے الفاظ میں کچھ اضافے کر دیے ہے یا کچھ الفاظ کم کر دیے ہیں یہ محض سینہ زوری ہے، اس سے زیادہ ابہام "تیس سالہ خلافت" والی حدیث میں پایا جاتا ہے، اس کے بھی مختلف روایات میں مختلف الفاظ ہیں اور اس روایت کو ظاہری الفاظ پر محمول کیا جائے تو خلفاء راشدین چار نہیں بلکہ پانچ بنتے ہیں اور کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ پہلے چار خلفاء کا زمانہ پورا تیس سال ہے، اسی طرح ہم "مسند بزار" کے حوالے سے اسی راوی "سعید بن جمہان" کے واسطے سے "حضرت سفینہ ؓ" سے مروی حدیث امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح کے ساتھ نقل کر چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے (خواب) دیکھا کہ گویا آسمان سے ایک ترازو اتری ہے تو آپ کا اور ابو بکر ؓ کا وزن کیا گیا تو آپ ابو بکر ؓ سے بھاری ہو گئے، پھر ابو بکر ؓ اور عمر ؓ کا وزن کیا گیا تو ابو بکر ؓ بھاری ہو گئے، اور عمر ؓ اور عثمان ؓ کا وزن کیا گیا تو عمر ؓ بھاری ہو گئے، پھر ترازو اٹھالی گئی۔ تو آپ ﷺ نے اس خواب کی تاویل یا تعبیر یہ فرمائی کہ یہ خلافت نبوت کی طرف اشارہ ہے اس کے بعد اللہ جس کو چاہے گا ملک (بادشاہت) دے دے گا۔

اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے ایک صحابی کے خواب کی تعبیر بتلاتے ہوئے ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان کے دور کو خلافت نبوت کا دور قرار دیا ہے اور پھر اس کے بعد ملوکیت کا دور بتلایا ہے۔

علاوہ ازیں ہم اسی راوی "سعید بن جمہان" کے واسطے سے "حضرت سفینہ ؓ" سے مروی چار عدد روایات بحوالہ "السنۃ لابن ابی عاصم اور "کتاب الفتن لنعیم بن حماد" وغیرہ بھی نقل کر چکے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ کے نبی ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کی تو ابو بکر ؓ آئے اور انہوں نے ایک پتھر رکھا، پھر عمر فاروق ؓ آئے اور انہوں نے ایک پتھر رکھا، پھر عثمان ؓ آئے اور انہوں نے ایک پتھر رکھا، تو اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: یہ لوگ میرے بعد ہونے والے خلفاء ہیں۔

لیکن وہاں تو لعل شاہ صاحب نے یہ نہ لکھا کہ اس روایت کے الفاظ اور مطالب میں شدید اختلاف

ہے، نہ یہ لکھا کہ پچھلے راویوں (سعید بن جمہان یا حشرج بن نباتہ وغیرہ) نے حدیث کے الفاظ میں کمی بیشی کردی ہے؟ لیکن یہاں بخاری ومسلم کی روایت پر وہ شکوک پیش کررہے ہیں کیونکہ یہ حدیث ان کے مفروضے کے خلاف ہے، لیکن آخر میں انہیں خود یہ لکھنا پڑا کہ :

"خلیفے بہتیرے ہوں گے لیکن وہ خلفاء قیامت تک صرف بارہ ہوں گے جن کی خلافت خلافت راشدہ ہوگی اور وہ تیس سالہ خلافت النبوۃ کی نظیر ہوگی واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم الکتاب"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 264و265)

یعنی وہ تسلیم کرگئے کہ بارہ خلفاء والی حدیث میں جن خلیفوں کا ذکر ہے ان کی خلافت، خلافت راشدہ ہوگی اور اور تیس سالہ خلافت علی منہاج النبوۃ کی طرح کی ہوگی، یعنی ان بارہ میں تیس سال میں ہونے والے خلفاء شامل نہیں یہ ان کے علاوہ ہوں گے۔

انقضائے خلافت راشدہ پر لعل شاہ صاحب کے دوسرے دلائل کا مختصر جائزہ

سید لعل شاہ صاحب بخاری نے پہلے تو چند علماء کے اقوال نقل کیے ہیں اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "خلافت" اور "ملوکیت" دو الگ الگ چیزیں ہیں اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے ہی "خلافت" ختم ہوچکی تھی اور آپ اسلام میں سب سے پہلے "بادشاہ" تھے، جبکہ ہم علامہ ابن خلدون کے حوالے سے یہ بات واضح کرآئے ہیں کہ :

"ولا يقال إنّ الملك أدون رتبة من الخلافة فكيف يكون خليفة ملكا. واعلم أنّ الملك الّذي يخالف بل ينافي الخلافة هو الجبروتيّة المعبر عنها بالكسرويّة التي أنكرها عمر على معاوية حين رأى ظواهرها. وأما الملك الّذي هو الغلبة والقهر بالعصبية والشوكة فلا ينافي الخلافة ولا النبوّة فقد كان سليمان بن داود وأبوه صلوات الله عليهما نبيّين وملكين وكانا على غاية الاستقامة في دنياهما وعلى طاعة ربّهما عزّ وجل"۔

یہ نہ کہا جائے کہ بادشاہت خلافت سے مرتبہ میں کم ہے لہذا خلیفہ، بادشاہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جان لو کہ! جو ملوکیت (بادشاہت) خلافت کے منافی ہے وہ جبر وتیت ہے جسے کسرویت سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی گورنری کے زمانہ میں۔ناقل) ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ناپسند فرمایا تھا لیکن وہ بادشاہت جو غلبہ، شوکت اور عصبیت سے حاصل ہوتی ہے وہ نہ خلافت کے منافی ہے اور نہ ہی نبوت کے منافی ہے، سلیمان علیہ السلام اور ان کے والد داوود علیہ السلام نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے کاموں میں نہایت استقامت والے اور اپنے رب کی اطاعت کے پابند تھے۔

(تاریخ ابن خلدون، ج2ص650، دار الفکر بیروت)

اور خود لعل شاہ صاحب بخاری بھی اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے پر لگانے کے بعد کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت "علی منہاج النبوۃ" نہیں تھی، خود یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ :

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کرنا ممنوع ہے ان کی خلافت بحیثیت مجموعی خیر تھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 248)

اور

"انہوں نے اپنے زمانہ خلافت میں بے شمار لشکر مختلف علاقوں کی طرف بھیجے اور بہت سی فتوحات ہوئیں.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 250)

اور

"بلا ریب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہزارہا میلوں کا رقبہ فتح ہوا اور اس پر اسلام کے پرچم لہرائے.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 253)

اور

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت مجموعی حیثیت سے خیر تھی، اللہ تعالی ان کی لغزشوں کو

معاف فرمائے اور ان کے اعمال حسنہ کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے، ہماری ہزار برس کی ریاضت سے ان کے دل کی ایک دھڑکن بدرجہا بہتر ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 257)

اور

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ خلافت کا ملوکیت کی طرف انتقال کرنے کا عبوری دور تھا اس میں سنہ 41ھ سے سنہ 44ھ تک خلافت کے آثار غالب تھے اور سنہ 44ھ میں استخلاف یزید سے لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 60ھ تک میں بتدریج ملوکیت کے آثار غالب آتے گئے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 259)

تو جب لعل شاہ صاحب خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت "بحیثیت مجموعی" خیر تھی تو پھر وہ منہاج نبوت سے ہٹ کر کیسے ہوئی؟ کیا جو خلافت منہاج نبوت کے مطابق نہ ہو وہ بحیثیت مجموعی "خیر" ہو سکتی ہے؟

بہرحال! اب آئیے لعل شاہ صاحب بخاری کے "تیس سالہ خلافت" والی حدیث کے علاوہ دوسرے دلائل کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

چنانچہ "پہلی دلیل" کا عنوان دے کر لکھتے ہیں:

"جس طریق سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت حاصل کی تھی چونکہ اس میں تلوار بھی دخیل تھی اس لئے وہ خلافت علی منہاج النبوۃ نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ تسلط ملک کہلواتا ہے خلافت علی منہاج النبوۃ نہیں کہلاتا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 199)

بلکہ لعل شاہ صاحب نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

"راقم السطور (یعنی لعل شاہ۔ناقل) کہتا ہے کہ رحمت خداوندی نے دستگیری کی، امت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر متفق ہوگئی، بالفرض ان پر امت متفق نہ ہوتی اور بیعت خلافت کے لئے

وہ تلوار اٹھاتے تو وہ بھی یقیناً ملوکیت ہوتی، خلافت راشدہ نہ ہوتی۔ ولكن ليقضي الله امراً كان مفعولا۔ وعد الله الذين آمنوا (منكم۔ناقل) وعملوا الصالحات ليستخلنهم في الارض کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے سچا کر دیا، اور آنحضور ﷺ کی پیشگوئی کہ (عائشه يأبى الله والمسلمون الا ان يكون ابابكر) اللہ اور مسلمان ابوبکر کے سوا کسی کو قبول نہیں کریں گے، سچی ہوگئی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 534)

یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ اول تو ہیں لیکن وہ اس کے حق دار نہ تھے، اس لئے اگر تلوار چلاتے تو غلط ہوتا۔ یہی شیعہ کہتے ہیں کہ خلیفہ اول تو بے شک ابوبکر بنے لیکن حق دار نہ تھے، اہل سنت اور روافض میں یہی تو بنیادی فرق ہے کہ اہل السنۃ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حق دار کہتے ہیں، اگر وہ تلوار بالفرض چلاتے تو اپنے حق کے لئے چلاتے، ان کا تلوار چلانا صحیح اور قرآن واحادیث کی پیشگوئیوں کے عین مطابق ہوتا۔ جبکہ روافض کہتے ہیں کہ انہوں نے ناحق خلافت لے لی، تلوار چلاتے تو ناحق ہوتا، یہی بات لعل شاہ صاحب کہہ رہے ہیں۔ واللہ المستعان۔

الغرض! لعل شاہ صاحب یہ لکھ رہے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو خلافت حاصل کی تھی چونکہ اس میں تلوار بھی دخیل تھی اس لئے وہ خلافت علی منہاج النبوۃ نہیں ہو سکتی، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، آپ کی خلافت تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے دست بردار ہونے اور نبوی بشارت کے عین مطابق مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح ہونے کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی اور اس کے لئے کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی، نہ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیعت لینے کے لئے کسی سے جنگ کی تھی۔

لیکن اگر یہ دلیل درست تسلیم کرلی جائے تو پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے "خلافت راشدہ" ہونے کا کوئی منکر بھی کہہ سکتا ہے کہ آپ نے بھی اپنی خلافت قائم کرنے کے لئے تلوار کا استعمال کیا جس کے نتیجے میں جنگ جمل وجنگ صفین میں ہزاروں لوگوں کا خون بہا لہٰذا ثابت ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی تلوار دخیل تھی، لہٰذا آپ کی خلافت بھی "علی منہاج النبوۃ" نہ ہوئی تو لعل شاہ صاحب نہ جانے اس کی دلیل کو کیسے رد کریں گے؟

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے :

"... مقاتلات وے رضی اللہ عنہ برائے طلب خلافت بود نہ بجہت اسلام"۔ یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقاتلات اور جنگیں طلب خلافت کے لئے ہوئیں، جہت اسلام سے نہیں (جہت اسلام سے نہ ہونے کا مطلب ہے کہ آپ کی جنگیں کفار کے ساتھ اسلام کی اشاعت و دعوت کے لئے نہیں ہوئیں۔ناقل)۔

(ازالۃ الخفاء مترجم،صفحہ 398 جلد 2 طبع قدیمی کتب خانہ کراچی)

تو کیا اب حضرت شاہ صاحب دہلوی کی اس منطق کو لے کر یہ کہا جاسکتا ہے کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت (نعوذ باللہ) علی منہاج النبوۃ نہ تھی؟

اس لئے لعل شاہ صاحب کی یہ بات ایک تو خلاف حقیقت ہے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت جنگ کر کے حاصل نہیں کی تھی، دوسرا آپ کی خلافت میں جو قانون نافذ تھا وہ قرآن وسنت کا ہی تھا،کوئی غیر اسلامی قانون نہیں تھا اور خلافت علی منہاج النبوۃ یہی تو ہوتی ہے اور کیا ہوتی ہے؟اس کی تفصیل ہم شاہ ولی اللہ دہلوی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے پہلے بیان کر آئے ہیں کہ خلافت راشدہ کی خصوصیات ولوازمات کیا ہیں۔

پھر سید لعل شاہ صاحب بخاری اپنی طرف سے دوسری دلیل دیتے ہوئے حضرت معاویہ وحضرت حسن (رضی اللہ عنہما) کے درمیان ہونے والی صلح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اگرچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مصالحت سے امت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی پر مجتمع ہو گئی تھی اور وہ سال (عام الجماعۃ) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے تاہم قلوب پوری طرح صاف نہیں ہوئے تھے کچھ نہ کچھ کدورتیں باقی تھیں..."۔

(استخلاف یزید،صفحہ 202)

غور فرمائیں! لعل شاہ صاحب نے اپنی پہلی دلیل یہ پیش کی تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت تلوار کے زور پر حاصل کی تھی، اور اب دوسری دلیل میں یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ ان کی خلافت تو سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے صلح کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی اور پوری امت نے آپ کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا (اور ظاہر ہے صلح اور امت

کا آپ کی ذات گرامی پر اجتماع بذریعہ تلوار نہیں ہوا تھا)،لیکن یہاں لعل شاہ صاحب بتا رہے ہیں کہ اگرچہ امت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر متفق ہوگئی تھی لیکن لوگوں کے دل پوری طرح صاف نہیں ہوئے تھے اور دلوں میں کچھ کدورتیں باقی تھیں (اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت، خلافت راشدہ سے ہٹ کر تھی)۔

اس پر لعل شاہ صاحب نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کا اردو ترجمہ انہی کا کیا ہوا پیش کیا جاتا ہے :

"حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ آیا اس خیر کے بعد پھر شر ہوگا جیسے پہلے تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں، میں نے عرض کیا پھر اس سے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وسلم نے فرمایا تلوار (یعنی قتال سے فتنہ کو دبانا ہوگا) میں نے عرض کیا آیا اس قتال کے بعد کچھ بقیہ خیر کا ہوگا؟ فرمایا ہاں امارت ہوگی ناگوار، اور صلح ہوگی جس میں دھوئیں کی آمیزش ہوگی۔ ایک اور روایت میں ہے (هدنة على دخن وجماعة على اقذاء) صلح ہوگی دلوں کی کدورتوں کے باوجود اور اجتماع ہوگا ناگوار امور کے باوجود، میں نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ (هدنة على دخن) کیا ہے؟ فرمایا قوموں کے دل پہلے کی طرح صاف نہ ہوسکیں گے۔(رواہ ابوداؤد، مشکوۃ صفحہ 463)۔

(استخلاف یزید، صفحہ 202و203)

قارئین محترم! سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ مذکورہ بالا حدیث شریف میں کہیں اشارتاً بھی یہ ذکر نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات حضرت معاویہ اور حضرت حسن (رضی اللہ عنہما) کے درمیان ہونے والی صلح کے بارے میں یا اس کے بعد ہونے والے حالات کے بارے میں فرمائی، یہ مستقبل کے کسی زمانے کے بارے میں خبر دی گئی اور زمانہ کی تحدید اس حدیث میں ہرگز نہیں۔

لعل شاہ صاحب کو بھی اس بات کا علم تھا اس لئے انہوں نے آگے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی آراء نقل کی ہیں کہ انہوں نے اس حدیث سے یہ سمجھا ہے کہ یہ اس وقت کی طرف اشارہ ہے جب حضرت حسن و حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کی صلح ہوئی تھی۔ تو یہ بات حدیث رسول تو نہ ہوئی بلکہ حافظ ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا خیال اور رائے ہوئی، اور ظاہر ہے کسی شارح کی بات اسی کی بات سمجھی جاتی ہے، اسے حدیث نہیں

کہا جاسکتا، ورنہ بارہ خلفاء والی حدیث کی تشریح میں جو شارحین حدیث نے بارہ نام گنوائے ہیں انہیں لعل شاہ صاحب حدیث کیوں نہیں مانتے؟

اس لئے ہمارے نزدیک یہ رائے بھی محل نظر ہے، کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی صلح کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا: إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے اللہ تعالی اس کی بدولت مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرادے) یعنی یہ بشارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت پہلے دے دی تھی، اور جس صلح کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کی طرف فرمائی تھی کہ اللہ یہ صلح کروائیں گے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعے، اور ظاہر ہے اس بشارت نبوی کے پورا ہونے پر اُس زمانہ کے مسلمانوں کی اکثریت اور خاص طور پر صحابہ وتابعین تو اس صلح پر اتنے خوش تھے کہ انہوں نے اس سال کا نام ہی" عام الجماعۃ" رکھ دیا تھا، ہاں وہ لوگ ضرور رنجیدہ ہوئے جنہیں" سبائی" کہا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرکے امت میں جو فساد شروع کیا تھا وہ اس صلح سے اپنے اختتام کو پہنچا تھا، تو ان کا رنجیدہ ہونا بنتا تھا اور آج بھی وہ رنجیدہ ہی لگتے ہیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ جس صلح کی بشارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہوئی تھی اور جس کی نسبت اللہ تعالی کی طرف فرمائی تھی، اس صلح کے بارے میں اس وقت کے اکابرین امت اور صحابہ وتابعین کے دلوں میں کدورت یا ناگواری ہو، اس لئے اس بات کو انقضائے خلافت کی دلیل بنانا سمجھ سے بالاتر ہے، یوں تو مثلاً خلافت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی منکر بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ ان سے پہلے تین خلفاء کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام کا اجماع واتفاق نہ ہوسکا اور صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد آپ کی بیعت سے الگ رہی، دلوں میں کدورت وناگواری تو ایک طرف ،اس پر جنگیں تک ہوگئیں، ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں، تو یہ ان کی خلافت کے" خلافت راشدہ" نہ ہونے کی دلیل ہے تو لعل شاہ صاحب نہ جانے اس دلیل کا جواب کیسے دے پاتے؟

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے کئی ورق اس بات پر سیاہ کیے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں ناصبیت کو فروغ حاصل ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برملا سب وشتم کیا جانے لگا اور پھر لکھتے ہیں کہ:

"سبّ علی رضی اللہ عنہ کی مہم جو ابتدائے عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں چلائی گئی تھی وہ سنہ 50 / 51ھ تک

اتنی شدت اختیار کر چکی تھی کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے اشخاص سے بھی سب علی رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کیا جانے لگا اور کوفہ شہر میں حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کے لئے سزائے موت کا موجب بن گئی.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 228)

قارئین محترم! لعل شاہ صاحب کے اس طعن کے رد میں مفصل طور پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے، یہی وہی طعن ہے جو مودودی صاحب نے" خلافت وملوکیت" میں یوں کیا ہے کہ :

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود، اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتی کہ مسجد نبوی میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عین روضہ رسول کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے..."۔

(خلافت وملوکیت، صفحہ 174 طبع جدید، ادارہ ترجمان القرآن لاہور)

اس طعن کی حقیقت جاننے کے لئے حافظ صلاح الدین یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب" خلافت و ملوکیت کی شرعی حیثیت" صفحہ 525 ومابعد، مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب" رحماء بینھم، حصہ چہارم، مسئلہ اقرباء نوازی" صفحہ 211 تا 225، نیز" سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حصہ دوم، الموسوم بہ جواب المطاعن" صفحہ 492 ومابعد، اور قاضی طاہر علی الہاشمی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب" سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر سو اعتراضات کا علمی تجزیہ" صفحہ 414 ومابعد کا مطالعہ کرلیا جائے۔ لیکن ہم یہاں صرف یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ لعل شاہ صاحب یہ جس زمانے کی بات کر رہے ہیں وہ امت کے" بہترین زمانوں" میں سے تھا لیکن حیرت در حیرت ہے کہ اس برسر منابر سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر (بقول" صاحبین" لعل شاہ صاحب ومودودی صاحب) سرکاری حکم اور سرپرستی میں کی جانے والے سب وشتم پر اگر بولنے کی ہمت ہوئی تو مدینہ سے دور کوفہ میں ایک مختلف فیہ صحابی حجر بن عدی کو؟ اور بقول لعل شاہ صاحب اس جرم کی پاداش میں ہی حجر کو سزائے موت دے دی گئی، لیکن باقی تمام صحابہ بشمول سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی آل واولاد خاموش رہے اور کوئی احتجاج نہ کیا؟ کیا یہ اس خیر القرون کے لوگوں کی

حمیت وغیرت پر حملہ نہیں؟ آج اگر لعل شاہ صاحب زندہ ہوتے اور آج کوئی حاکم یا گورنر یوں سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر بر سر منبر سب وشتم کرے تو کیا لعل شاہ صاحب اور ہم خاموش بیٹھے رہتے؟ تو یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ صحابہ و تابعین کے اس زمانہ میں بقول لعل شاہ صاحب یہ سب وشتم کی مہم شدت اختیار کر چکی تھی، لیکن ہمیں اکا دکا معمولی احتجاج کے سوا کہیں بھی سب وشتم کی اس مہم کے خلاف کوئی بولتا نظر نہیں آتا، حتی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، یزید کے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد اپنے موقف کے حق میں نکلتے ہیں اور اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں لیکن وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پورے دور خلافت میں اپنے بابا پر برسر منابر سب وشتم برداشت کرتے رہتے ہیں اور اس کے خلاف نہیں نکلتے؟

اور باعث حیرت یہ ہے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے باوجود لعل شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت مجموعی حیثیت سے خیر تھی، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کے اعمال حسنہ کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے، ہماری ہزار برس کی ریاضت سے ان کے دل کی ایک دھڑکن بدرجہا بہتر ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 257)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر بیت المال کے غلط استعمال کا بہتان

آگے لعل شاہ صاحب نے پہلے عنوان باندھا ہے:

"دوسری چیز جس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت کو خلافت کے نہج سے ہٹا دیا ہے وہ بیت المال کا استعمال ہے"۔

اور پھر اس کی تفصیل میں لکھتے ہیں کہ:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں بیت المال کا استعمال خلفائے راشدین کے طریقہ پر نہیں تھا، اس مسئلہ میں ہم تاریخی روایات سے قطع نظر کر کے کتب احادیث کی محکم روایات سے استناد ذکر کریں گے.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 234)

قارئین محترم! یہاں لعل شاہ صاحب "تاریخی روایات" اور "کتب حدیث" کے الفاظ لکھ کر یہ دھوکا دینا چاہتے ہیں کہ جیسے جو روایات وہ پیش کرنے جارہے ہیں وہ احادیث نبویہ ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے کوئی ایسی بات فرمائی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں بیت المال کا غلط استعمال ہوگا، جبکہ روایات چاہے تاریخی ہوں (یعنی کتب تاریخ میں ہوں) یا کتب حدیث میں ہوں ان کے جانچنے کا اصول اور معیار ایک ہی ہے، جو اصول وقواعد، حدیث کے پرکھنے کے لئے وضع کیے گئے ہیں انہیں کتب حدیث کے ساتھ خصوصیت حاصل نہیں ہے، ان کا تعلق نفس خبر کے ساتھ ہے خواہ وہ خبر نبی کریم ﷺ سے متعلق ہو یا کسی اور کے متعلق ہو، ان اصول کا استعمال جس طرح حدیث کے مقبول وغیر مقبول قرار دیے جانے کے لئے کیا جائے گا اسی طرح تاریخی روایات کے رد وقبول کے معاملہ میں بھی ان سے کام لیا جائے گا، اصول روایت کے معاملہ میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ علماء محققین نے کتب حدیث کی روایات پر تو یہ اصول سختی کے ساتھ لگائے ہیں لیکن دوسری طرف کتب تاریخ کی روایات میں تساہل سے کام لیا ہے اور ان کی جانچ پھٹک کی طرف کماحقہ توجہ نہیں دی۔

بہرحال آئیے دیکھتے ہیں لعل شاہ صاحب کون سی روایت پیش کررہے ہیں، لکھتے ہیں :

"سنن ابی داود میں حضرت عبد الرحمن بن عبد رب الکعبہ سے روایت ہے وہ حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی امام کی بیعت کرے پس اسے اپنے ہاتھ کا صفقہ اور اپنے دل کا ثمرہ عطا کردے پس اسے چاہئے کہ اس امام کی بحسب الاستطاعت اطاعت کرے پس اگر کوئی دوسرا شخص اس کا منازع کھڑا ہو تو اس کی گردن اڑادو، عبد الرحمن ابن عبد رب الکعبہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو ابن العاص سے دریافت کیا کہ آیا آپ نے یہ حدیث خود رسول اللہ رضی اللہ عنہ سے سنی ہے، انہوں نے فرمایا ہاں : میرے دونوں کانوں نے سنی ہے اور میرے دل نے محفوظ کرلی.. فقلتُ هذا ابن عمك معاوية يامرنا ان نفعل ونفعل قال اطعه في طاعة الله واعصه في معصية الله.. یعنی حضرت عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کو کہا کہ تیرا چچازاد بھائی معاویہ تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ایسا

کریں پس حضرت عبداللہ بن عمرو کہنے لگے پس تو ان کی اطاعت کر اس حکم میں جس میں اللہ کی اطاعت ہو اور اس کی نافرمانی کر اس حکم میں جس میں اللہ کی معصیت لازم آتی ہو"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 234و235)

یہ روایت لعل شاہ صاحب نے سنن ابو داود اور اس کی شرح "بذل المجہود" کے حوالے سے نقل کی ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں :

"ابو داود کی اس روایت میں نفعل و نفعل یعنی ایسا ایسا کریں ناشائستہ امور سے کنایہ ہے، صحیح مسلم کی ایک روایت میں ان امور ناشائستہ کی تصریح موجود ہے وہ روایت ایک طویل روایت ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 235)

پھر اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے صحیح مسلم سے یہ طویل روایت نقل کی ہے جس میں راوی "عبد الرحمن بن عبد رب الکعبہ" سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ انہوں نے کہا :

"هذا ابن عمك معاوية يامرنا ان نأكل اموالنا بيننا بالباطل ونقتل انفسنا.." "اپ کا چچا زاد بھائی معاویہ تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اپنے مال باطل طریقے سے کھائیں اور اپنی جانوں کو ناحق قتل کریں۔

یہ روایت نقل کرنے کے بعد لعل شاہ صاحب نے اپنا تبصرہ یوں کیا ہے :

"عبد الرحمن بن عبد رب الکعبۃ اور حضرت عبد اللہ ابن عمرو بن العاص کے سوال و جواب میں اس امر کی طرف تلویح و اِشعار ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے احکام میں اکل اموال اور قتل نفس کی بعض ایسی ناگوار صورتیں بھی ہیں جنہیں عبد الرحمن ابن عبد رب الکعبہ باطل اور ناحق قرار دیتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عمرو ابن العاص نے بھی تردید نہیں فرمائی بلکہ وہ حضرت عبد الرحمن کے سوال کے منشا کو پا گئے کہ اطاعتِ امیر مطلق اور غیر مشروط نہیں اس لئے انہوں نے جواب میں ان کی تردید نہیں کی بلکہ اپنے دعویٰ کو مقید کر دیا اطعه في طاعة الله واعصه في معصية الله ورنہ وہ صاف کہہ سکتے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوئی ایسا

حکم نہیں دیا اے عبدالرحمن تم غلط سمجھے ہو وغیر ذلک.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 237)

تبصرہ:

قارئین محترم! سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ" عبدالرحمن بن عبدرب الکعبۃ" ایک تابعی ہیں اور تابعی بھی غیر معروف، ان کے حالات میں صرف یہ ملتا ہے کہ یہ کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان سے فتن کے باب میں صرف یہی ایک روایت آتی ہے اور یہ اسی روایت کی وجہ سے مشہور ہیں، پورے ذخیرہ حدیث میں اس روایت کو ملا کر ان سے دو تین روایات ہی ملتی ہیں اور علماء نے لکھا ہے کہ" وما وثّقه سوى العجلي وهو من المتساهلين في توثيق الكوفيين وروى له حديثاً واحداً في طاعة الأمراء" (تحرير تقريب التهذيب، ج 2ص 333و 334) یعنی ان کی توثیق صرف امام عجلی نے کی ہے اور امام عجلی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو کوفی راویوں کی توثیق میں تساہل سے کام لیتے ہیں، نیز امام عجلی نے ان کی ایک ہی حدیث ذکر کی ہے جو امراء کی اطاعت کے بارے میں ہے۔

الغرض! یہ" عبدالرحمن ابن عبدرب الکعبۃ" کوفہ کے رہنے والے ایک تابعی ہی ہیں، اس بات کا بھی امکان نہیں کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کوئی افسر ہوں جنہیں اندر کی باتوں کا علم ہو، کیونکہ اگر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں کسی عہدے پر ہوتے تو ایک معروف شخصیت ہوتے، ان کا غیر معروف ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک عام شہری تھے اور ایسے حضرات سنی سنائی باتوں کو سچ سمجھ کر کوئی سوال کرلیں تو یہ تعجب کی بات نہیں، حیرت تو اس بات پر ہے کہ معترضین نے اس سوال کو ایک ثابت شدہ حقیقت تسلیم کر کے اس روایت سے یہ استدلال کرنا شروع کر دیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں بیت المال کا استعمال غلط ہوتا تھا، کیا" عبدالرحمن بن ابن عبدرب الکعبۃ" نے اپنے سوال میں اس بات کی کوئی دلیل یا شہادت بھی پیش کی یا تفصیل بتائی کہ انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ باطل طریقہ پر مال کھائیں اور اپنی جانوں کو باطل طریقہ پر قتل کریں؟ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا جائزہ لیں تو ان کے عادلانہ دور کے بارے میں یہ خیال کرنا غلط فہمی ہی ہو سکتی ہے کہ ان میں لوٹ مار اور ناجائز قتل وغارت ہو رہی تھی اور وہ بھی ان کے حکم سے۔

امام ابو العباس احمد بن عمر القرطبی (م 656ھ) اسی روایت پر لکھتے ہیں :

"وما ذكره عبد الرحمن عن معاوية إغياء في الكلام على حسب ظنه وتأويله، وإلّا فمعاوية رضى الله عنه لم يُعرف من حاله ولا من سيرته شيء مما قاله، وانما هذا كما قالت طائفة من الأعراب: إنّ ناساً من المُصدقين يظلموننا. فسمّوا أخذ الصدقة ظلماً حسب ما وقع لهم"۔

یعنی عبد الرحمن بن عبد رب الکعبہ نے جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ذکر کیا ہے وہ ان کے گمان اور تاویل کے مطابق کلام کی انتہا ہے، ورنہ تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت وحالات میں ایسی بات نہیں ملتی جو عبد الرحمن نے ذکر کی ہے، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ: کچھ تحصیل صدقہ کرنے والے ہم پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں، تو انہوں نے اپنے مطابق صدقہ وصول کرنے کو ظلم کا نام دے دیا"۔

(المفهم لما اشكل من تلخيص كتاب مسلم، ج4ص53، دار ابن كثير دمشق)

خود لعل شاہ صاحب بخاری کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں یہ بیان ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں کہ:

"حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت مجموعی حیثیت سے خیر تھی، اللہ تعالی ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کے اعمال حسنہ کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے، ہماری ہزار برس کی ریاضت سے ان کے دل کی ایک دھڑکن بدرجہا بہتر ہے رضی اللہ عنہ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 257)

نیز انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیس سالہ دور گورنری میں رعیت کے کسی ایک فرد کو اعتراض کا موقع نہیں دیا (استخلاف یزید، صفحہ 249) اور لعل شاہ صاحب نے ہی یہ لکھا ہے کہ:

"بلا ریب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہزارہا میلوں کا رقبہ فتح ہوا اور اس پر اسلام کے پرچم لہرائے ان علاقوں کے بسنے والے لکھوکھہا (یعنی کئی لاکھ۔ناقل) لوگ اسلام کی سچی تعلیم سے آگاہ ہو کر مسلمان ہوئے ہیں اور اس ذریعہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نیکیوں اور فضیلت و

خیریت کا حساب ماسوائے رب العزت کے جو عالم الغیب والشہادہ ہے کون کرسکتا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 252

تو پھر کوفہ کے رہنے والے ایک غیر معروف تابعی کا سوال جس کی انہوں نے کوئی دلیل بھی پیش نہیں کی اسے غلط فہمی اور سنی سنائی بات کیوں نہیں سمجھا جاسکتا؟ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے علاقے کے کسی حکومتی امیر یا افسر کے کسی حکم کو انہوں نے دمشق میں بیٹھے امیر المؤمنین کا حکم سمجھ لیا ہو؟ کیونکہ اس روایت کے مطابق "عبد الرحمن ابن عبد رب الکعبہ" نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام لے کر یہ کہا کہ وہ ہمیں اس بات کا حکم دیتے ہیں، جبکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تو دمشق میں تھے نہ کہ کوفہ میں۔

بہر حال یہ سب تو اس صورت میں ہے اگر فرض کرلیا جائے کہ "عبد الرحمن ابن عبد رب الکعبہ" کا حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے ساتھ یہ سوال و جواب زمانہ فتنہ کا واقعہ نہیں بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ ہو۔

جبکہ صحیح مسلم کے شارح امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ زمانہ فتنہ کی بات ہے جس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین قتال ہو رہا تھا اور "عبد الرحمن ابن عبد رب الکعبہ" چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار تھے (اور قرین قیاس بھی یہی ہے کیونکہ یہ کوفہ کے رہنے والے تھے) تو ان کے خیال میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف قتال کرنا اور شام کے علاقے میں خراج وغیرہ لینا یہ باطل طریقے سے مال کھانا اور ناحق جانوں کو قتل کرنا تھا، حالانکہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا۔

تاہم لعل شاہ صاحب امام نووی کی اس توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتے جس کی انہوں نے اپنے خیال کے مطابق کچھ وجوہات ذکر کی ہیں (جن پر تفصیل سے بات ہوسکتی ہے لیکن ہم آگے چلتے ہیں) اور لعل شاہ صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے:

"جب مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر امام نووی کی تاویل نادرست ہوگئی تو مسلم کی روایت سے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ گیا ہے کہ عہد حکومت معاویہ رضی اللہ عنہ میں ولاۃ الامور سے تحفظ اموال و انفس میں کوتاہیاں ہوتی تھیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 239)

قارئین محترم! غور فرمائیں یہاں لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں ان کے ولاۃ الامور یعنی ان کے مقرر کردہ گورنروں یا افسروں سے اس بارے میں کوتاہیاں ہوتی تھیں“، یہاں لعل شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ ”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایسا ہوتا تھا“ (جبکہ جس روایت کی بنا پر وہ ایک غیر معروف تابعی کی بلا دلیل بات کو حقیقت مان کر یہ نتیجہ نکال رہے ہیں اس میں تو صراحت کے ساتھ یہ ذکر ہے کہ یہ سب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہوتا تھا)، ہم کہتے ہیں کہ کوفہ کے رہنے والے ”عبدالرحمن ابن عبدرب الکعبہ“ کا غلط فہمی کا شکار ہونا کیوں ممکن نہیں ہے؟ انہوں نے کس بنیاد پر یہ کہا کہ اس بات کا حکم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے؟

پھر لعل شاہ صاحب نے انتہائی چالاکی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ عبدالرحمن ابن عبدرب الکعبہ کے سوال کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے ان کی بات کی تردید نہیں فرمائی بلکہ یہ جواب دیا کہ تم ان کی اس بات میں اطاعت کرو جس میں اللہ کی اطاعت ہے اور جس بات میں اللہ کی نافرمانی ہے اس میں ان کی بات نہ مانو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بھی اس بات کو غلط نہیں سمجھتے تھے (ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 237)۔

تو عرض ہے کہ اس سوال و جواب کی محفل میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حیثیت ایک مفتی کی سی تھی جو اس وقت لوگوں کو ایک قسم کا درس دے رہے تھے اور ان کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے، اور جب مفتی کے سامنے کوئی سوال آتا ہے تو وہ اس کا عمومی جواب دیتا ہے کہ اس کا یہ حکم ہے، اس کا کام سائل کے ساتھ اس تفصیل میں الجھنا نہیں ہوتا کہ جس بات کا حکم تم پوچھ رہے ہو پہلے یہ ثابت کرو کہ یہ درست ہے، تو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے تو وہ اصولی جواب دے دیا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا حاکم تمہیں کوئی غلط حکم دیتا ہے تو اصول یہ ہے کہ حاکم کی اطاعت صرف اس حکم میں کرنی ہے جس میں اللہ کی نافرمانی نہیں ہے. اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے اس بات کو درست اور سچ سمجھ کر یہ جواب دیا تھا؟

❀❀❀

سید لعل شاہ صاحب بخاری اور تین روایتوں کے مطالب

اپنی کتاب کے صفحہ 258 سے لعل شاہ صاحب بخاری نے چند احادیث کے (اپنی تحقیق کے مطابق) مطالب بیان کیے ہیں اور اس کا مقصد احادیث کی تشریح نہیں بلکہ یہ ہے کہ جو من گھڑت مفروضے انہوں نے اپنی اس کتاب میں پیش کیے ہیں یہ اور ایسی دوسری احادیث مبارکہ ان کے مفروضوں کو غلط ثابت کرتی ہیں تو انہوں نے ان احادیث کے ایسے مفہوم تراشے جس سے ان کے مفروضوں پر اعتراض نہ ہو سکے، مثال کے طور پر لعل شاہ صاحب کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ سنہ 44ھ میں اس امت کی تباہی کی بنیاد رکھ دی گئی تھی اور اس زمانہ کا جو نقشہ لعل شاہ صاحب نے کھینچا ہے وہ پہلے بھی نقل ہو چکا، جو کچھ یوں ہے :

"ہمارے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سنہ 41ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہو کر عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہیں اور سنہ 44ھ میں عصبیت مُضر کی پشت پناہی میں اپنے بیٹے کو نامزد کر دیتے ہیں اور تادم زیست اس سے زیادہ کسی مسئلہ کو اہم نہیں سمجھا، جلیل القدر صحابہ پہلے ہی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے، کچھ صحابہ اثارتِ فتنہ اور تفریق امت کے اندیشہ سے خاموش ہو گئے، بعض کی آواز سفک دماء اور خونریزی کے خوف سے حلقوم میں اٹک کر رہ گئی، کچھ رؤساء مناصب کی وجہ سے مجبور تھے، بعض کی زبانیں نقرئی مہروں سے داغ دی گئیں اور بعض کی دہن دوزی لقمہ ہائے چرب سے کر دی گئی اور بعض کو حرص و آز نے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ ملک کے طول و عرض میں رواں دواں اور استحکام ولایت یزید کے لئے کوشاں تھے، مناصب و عہود کی خاطر وفود کے وفود دمشق بھیجے جاتے ہیں، آخر انکی سعی نا مشکور بارآور ہوتی ہے اور یزید ابن معاویہ جس کے ہاتھوں امت کی تباہی مقدر ہو چکی تھی پوری امت پر مسلط کر دیا جاتا ہے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 316 طبع اول)

غور فرمائیں! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے صرف 34 سال بعد والے زمانہ کا نقشہ لعل شاہ صاحب یہ کھینچ رہے ہیں کہ اس وقت ایک صحابی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے "امت کی تباہی کی بنیاد" رکھی لیکن اس کے باوجود:

(1) اس زمانہ میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کچھ صحابہ نے اس لئے خاموشی اختیار کرلی کہ کہیں امت میں افتراق اور فتنہ نہ پیدا ہو جائے۔

(2) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی آواز خونریزی کے خوف سے ان کے گلے میں اٹک کر رہ گئی اور وہ کچھ نہ بولے۔

(3) کچھ اس لئے خاموش رہے کہ وہ بڑے عہدوں پر براجمان تھے اور انہیں یہ عہدے چھن جانے کا ڈر تھا۔

(4) کچھ کے منہ مال وزر (یعنی رشوت) دے کر بند کر دیے گئے۔

(5) کچھ مناصب اور عہدوں کی حرص اور لالچ میں اندھے ہو کر یزید کی ولی عہدی کے لئے کوششیں کرنے لگے۔

(6) آخر کار امت کی تباہی کے لئے ان سب نے مل کر یزید کو امت پر مسلط کر دیا جس کے ہاتھ سے امت کی تباہی مقدر تھی۔

قارئین محترم! یہ ہے لعل شاہ صاحب بخاری کے نزدیک اس زمانہ کا نقشہ جس میں بسنے والے لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے بہترین لوگ بتایا ہے، یہ ہے لعل شاہ صاحب کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس جماعت کا تعارف جنہوں نے اسلام کی کھیتی کو اپنے خون سے سیراب کیا، اپنا سب کچھ اسلام کے لئے قربان کر دیا اور جن کی حق گوئی اور راستبازی کی مثال پیش کرنے سے آج تک دنیا قاصر ہے، یہ ہے ان اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا "لعل شاہی" تعارف جن کی بہادری کے گواہ بدر و احد کے میدان اور روم و ایران و مصر و شام کی زمینیں ہیں۔

اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا سوچیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جو نقشہ لعل شاہ صاحب نے کھینچا ہے کیا یہ اس سے مختلف ہے جو دشمنان صحابہ بتاتے ہیں؟ کیا واقعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہی سنہ 44ھ میں اپنے ہاتھوں سے امت کی تباہی کی بنیاد رکھ دی تھی اور کیا واقعی یزید کے دور میں ہی امت مسلمہ کا خاتمہ ہو گیا اور وہ تباہ ہو گئی؟

لا حول ولا قوة الا بالله۔

حدیث "خیر امتی قرنی ...." اور لعل شاہ صاحب کی تحقیق

تو سید لعل شاہ صاحب بخاری نے سوچا کہ جس حدیث میں "امت کے بہترین لوگوں" کا ذکر آیا ہے اس کا ایسا مفہوم بیان کرنا چاہئے جس کے مطابق "خیر الناس" یا "خیر امت" سنہ 44ھ سے پہلے پہلے ختم ہو

جائیں اوراس کے بعد فوراً اس امت کے" شر القرون" (بدترین زمانے) شروع ہوجائیں تو سب سے پہلے انہوں نے اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے" قرن" یا" زمانہ" کا جو مطلب لکھا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے :

" قرن کی تفسیر اور تقدیر میں اختلاف ہے جن محدثین نے سنین کے ساتھ قرن کی تحدید کی ہے ان کے اقوال میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے دس برس سے لے کر ایک سو بیس برس تک بیان کئے گئے ہیں وليس منه شيء واضح، امام نووی لکھتے ہیں: قال الحسن وغيره عشر سنين امام حسن بصری اور بعض دیگر اصحاب علم ورائے فرماتے ہیں کہ قرن دس برس کا ہوتا ہے......... جس کسی نے جو کچھ کہا اس کے پیش نظر کچھ قرائن اور شواہد ہوں گے...... جب قرن کی تحدید پر کوئی حتمی قول نہیں ہے تو ہمیں حق ہے کہ اقوال بالا میں سے کوئی قول اختیار کریں اور یہ بھی حق ہے کہ کسی قرینہ کے تحت کوئی دوسرا موقف اختیار کریں پس ہمارے خیال کے مطابق قرن اٹھارہ سال کا ہے جو ایک انسانی بچے کی بلوغت کی عمر ہے اور قرن اول آنحضرت ﷺ کی ابتداء دعوت سنہ 3 بعثت سے لے کر سنہ 8ھ فتح مکہ تک ہے..... دوسرا قرن سنہ 8ھ سے لے کر سنہ 26ھ تک ہے اور قرن ثالث سنہ 26ھ سے لے کر سنہ 44ھ تک ہے..... آنحضور ﷺ کے بعد خلافت راشدہ تیس برس رہی اور وہ سنہ 41ھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست برداری کا زمانہ ہے...... غرضیکہ خلافت شیخین (یعنی سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی خلافت۔ناقل) قرن ثانی، خلافت ختنین (یعنی سیدنا عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کی خلافت۔ناقل) قرن ثالث میں تھیں..... حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چند سال جو قرن ثالث کا حصہ ہیں سنہ 44ھ تک، اگرچہ بادشاہت ہے مگر خلافت راشدہ کی طرز پر ہے اور سنہ 44ھ جس میں استلحاق زیاد اور استخلاف یزید کے قضایا در پیش ہوئے وہاں سے ملوکیت کے آثار کا ظہور ہوا.... الخ"۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 258و259)

قارئین محترم! آپ نے دیکھا کہ پہلے لعل شاہ صاحب نے" قرن" کے بارے میں لکھا کہ اس کے مفہوم میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے، پھر ان تمام اقوال سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے اپنی تحقیق

انیق پیش کی کہ" قرن" سے مراد اٹھارہ سال کا عرصہ ہے جو (لعل شاہ صاحب کے نزدیک انسانی بچے کی بلوغت کی عمر ہے)، اور پھر انہوں نے اس امت کے تینوں" بہترین زمانوں" کو سنہ 44ھ پر ختم کر دیا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ آخر لعل شاہ صاحب کو جمہور محدثین وشارحین سے ہٹ کر اپنی یہ نئی تحقیق پیش کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے پہلے یہ مفروضہ گھڑا کہ (لعل شاہ صاحب کی خانہ ساز تحقیق کے مطابق۔ناقل) سنہ 44ھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کر کے پوری امت پر مسلط کرنے کا سال ہے جس کے ہاتھوں (بقول لعل شاہ صاحب) امت کی تباہی مقدر ہو چکی تھی، بالفاظ دیگر امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صرف 34 سال تک تھی اس کے بعد امت کی تباہی شروع ہوگئی، اور سنہ 44ھ کے بعد جو بھی صحابہ کرام وتابعین موجود تھے وہ بجائے" خیر القرون" کے" شر القرون" میں داخل ہو گئے اس لئے اگر اس وقت کے جمہور صحابہ وتابعین نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا اور ان پر نکیر نہیں فرمائی تو اس سے ان پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ کون سا" امت کا بہترین زمانہ" تھا؟ وہ لوگ تو اپنی عمر کے اس حصہ میں داخل ہو چکے تھے جو" خیر القرون" سے باہر تھا اس لئے اگر انہوں نے" امت کی تباہی" کے اس اقدام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا یا بقول لعل شاہ صاحب" طوعاً وکرہاً" خاموشی اختیار کی تو یہ اعتراض نہیں آتا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ" خیر القرون" میں امت کی تباہی کی بنیاد رکھ دی گئی تھی اور صحابہ کرام وتابعین عظام کی اکثریت خاموش رہی؟، اس لئے لعل شاہ صاحب نے" خیر القرون" کو سنہ 44ھ پر بند کر دیا لیکن کاش انہوں نے حدیث کے الفاظ پر غور کیا ہوتا کہ وہاں" خیر امتی قرنی... " کے الفاظ ہیں جن کا ترجمہ ہے کہ " میری امت کے بہترین لوگ میرے زمانے والے ہیں" (خود لعل صاحب صاحب نے انہی الفاظ کے ساتھ یہ حدیث بحوالہ صحیح بخاری وصحیح مسلم نقل کی ہے، استخلاف یزید، صفحہ 258) صحیح بخاری میں یہ حدیث شریف مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے ایک جگہ" خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ " کے الفاظ بھی ہیں جن کا ترجمہ ہے کہ" بہترین لوگ میرے زمانہ والے ہیں پھر جو اُن سے ملے ہوئے ہیں اور پھر وہ جو اُن سے ملے ہوئے ہیں، ایک حدیث شریف میں" خَيْرُكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ " کے الفاظ ہیں، ایک حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

سوال کیا گیا کہ: "سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ؟ قَالَ: " قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم "کہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ سب سے بہترین لوگ کون ہیں؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: "میرا زمانہ (یعنی میرے زمانے والے) پھر ان کے بعد والے اور پھر ان کے بعد والے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں الفاظ یوں ہیں" خَيْرُ أُمَّتِي الْقَرْنُ الَّذِينَ بُعِثْتُ فِيهِمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم "اور صحیح مسلم میں ہی ایک جگہ الفاظ یہ ہیں" خَيْرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ الْقَرْنُ الَّذِينَ بُعِثْتُ فِيهِمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم " جن کا ترجمہ ہے کہ اس امت کے بہترین لوگ اس زمانہ والے ہیں جس زمانہ میں، میں مبعوث کیا گیا ہوں۔

ان تمام احادیث مبارکہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں اس امت کے" بہترین" لوگوں کا ذکر کیا جارہا ہے، کسی جگہ بھی" خیر القرون" کے الفاظ نہیں، یعنی اصل میں امت کے بہترین لوگوں کا بیان مقصود ہے نہ کہ زمانوں کا (اگرچہ بہترین لوگوں کا کسی زمانہ میں ہونا اس زمانہ کے بہترین ہونے کو بھی مستلزم ہے، لیکن لعل شاہ صاحب نے اصل" قرن" کو سمجھ لیا اور" خير الناس" و " خير امتي" کو بھول گئے) اب اگر لعل شاہ صاحب کی نادر تحقیق کے مطابق قرن اول کی ابتدا بعثت کے تیسرے سال سے اور قرن ثالث کا اختتام سنہ 44ھ پر بھی لے لیا جائے تو اس پورے عرصہ میں ہونے والے لوگ" امت کے بہترین لوگ" ہی تھے یا نہیں؟ مثال کے طور پر وہ صحابہ جو (لعل شاہی تحقیق کے مطابق) قرن اول یعنی سنہ 8ھ سے پہلے والے زمانہ میں بھی موجود تھے اور سنہ 44ھ تک بھی رہے اور پھر وہ سنہ 44ھ کے بعد بھی زندہ تھے تو ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ کہ وہ سنہ 44ھ تک تو" خیر امت" تھے اور اس کے بعد (نعوذ باللہ)" شر امت" بن گئے؟ ذرا سوچیئے!

اب آئیے دیکھتے ہیں کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے شارحین اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ شارح صحیح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ (جن کا نام لعل شاہ صاحب نے بھی یہیں ذکر کیا ہے) وہ لکھتے ہیں:

"اتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى أَنَّ خَيْرَ الْقُرُونِ قَرْنُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْمُرَادُ أَصْحَابُهُ ....وَالصَّحِيحُ أَنَّ قَرْنَهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

الصَّحَابَةُ وَالثَّانِي التَّابِعُونَ وَالثَّالِثُ تَابِعُوهُمْ ..." ۔

(مفہوم یہ ہے کہ) علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سب سے بہترین زمانہ آپ ﷺ کا زمانہ ہے اور اس سے مراد آپ کے صحابہ ہیں... اور صحیح بات یہی ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ سے مراد صحابہ ہیں (یعنی صحابہ کرام کا زمانہ) اور دوسرا زمانہ تابعین کا ہے اور تیسرا تبع تابعین کا۔

(ملخصاً: شرح النووي على صحيح مسلم، ج16ص84، دار احياء التراث بيروت)

صحیح بخاری کے شارح حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَالْمُرَادُ بِقَرْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ الصَّحَابَةُ وَقَدْ سَبَقَ فِي صِفَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْلُهُ وَبُعِثْتُ فِي خَيْرِ قُرُونِ بَنِي آدَمَ وَفِي رِوَايَةِ بُرَيْدَةَ عِنْدَ أَحْمَدَ خَيْرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ الْقَرْنُ الَّذِينَ بُعِثْتُ فِيهِمْ وَقَدْ ظَهَرَ أَنَّ الَّذِي بَيْنَ الْبَعْثَةِ وَآخِرِ مَنْ مَاتَ مِنَ الصَّحَابَةِ مِائَةُ سَنَةٍ وَعِشْرُونَ سَنَةً أَوْ دُونَهَا أَوْ فَوْقَهَا بِقَلِيلٍ عَلَى الِاخْتِلَافِ فِي وَفَاةِ أَبِي الطُّفَيْلِ وَإِنِ اعْتُبِرَ ذَلِكَ مِنْ بَعْدِ وَفَاتِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَكُونُ مِائَةَ سَنَةٍ أَوْ تِسْعِينَ أَوْ سَبْعًا وَتِسْعِينَ وَأَمَّا قَرْنُ التَّابِعِينَ فَإِنِ اعْتُبِرَ مِنْ سَنَةِ مِائَةٍ كَانَ نَحْوَ سَبْعِينَ أَوْ ثَمَانِينَ وَأَمَّا الَّذِينَ بَعْدَهُمْ فَإِنِ اعْتُبِرَ مِنْهَا كَانَ نَحْوًا مِنْ خَمْسِينَ فَظَهَرَ بِذَلِكَ أَنَّ مُدَّةَ الْقَرْنِ تَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ أَعْمَارِ أَهْلِ كُلِّ زَمَانٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ وَاتَّفَقُوا أَنَّ آخِرَ مَنْ كَانَ مِنْ أَتْبَاعِ التَّابِعِينَ مِمَّنْ يُقْبَلُ قَوْلُهُ مَنْ عَاشَ إِلَى حُدُودِ الْعِشْرِينَ وَمِائَتَيْنِ وَفِي هَذَا الْوَقْتِ ظَهَرَتِ الْبِدَعُ ظُهُورًا فَاشِيًا وَأَطْلَقَتِ الْمُعْتَزِلَةُ أَلْسِنَتَهَا وَرَفَعَتِ الْفَلَاسِفَةُ رُءُوسَهَا وَامْتُحِنَ أَهْلُ الْعِلْمِ لِيَقُولُوا بِخَلْقِ الْقُرْآنِ وَتَغَيَّرَتِ الْأَحْوَالُ تَغَيُّرًا شَدِيدًا وَلَمْ يَزَلِ الْأَمْرُ فِي نَقْصٍ إِلَى الْآنِ وَظَهَرَ قَوْلُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَفْشُو الْكَذِبُ ظُهُورًا بَيِّنًا حَتَّى يَشْمَلَ الْأَقْوَالَ وَالْأَفْعَالَ

وَالْمُعْتَقَدَاتِ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ قَوْلُهُ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ أَيِ الْقَرْنُ الَّذِي بَعْدَهُمْ وَهُمُ التَّابِعُونَ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ وَهُمْ أَتْبَاعُ التَّابِعِين"۔

مفہوم: اس حدیث میں نبی ﷺ کے "قرن" سے مراد صحابہ ہیں (یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کا سارا زمانہ)، نبی ﷺ کا یہ فرمان پہلے گذرا کہ "مجھے اولاد آدم کے بہترین زمانے میں مبعوث کیا گیا"، اور ایک روایت میں ہے کہ "اس امت کا بہترین زمانہ وہ ہے جس میں مجھے مبعوث کیا گیا"، اور آپ ﷺ کی بعثت اور آخری صحابی کی وفات کے درمیان کم وبیش 120 سال کا زمانہ ہے، اور اگر آپ ﷺ کی وفات کے بعد سے شمار کیا جائے تو یہ تقریباً 90 سے 100 سال کی مدت بنتی ہے، پھر تابعین کا زمانہ اگر 100 سال بعد سے شروع کیا جائے تو وہ تقریباً 70 سے 80 سال بنتا ہے، اور اس کے بعد تقریباً 50 سال تبع تابعین کا زمانہ ہوگا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "قرن" کی مدت ہر زمانے کے لوگوں کی اوسط عمروں کی بنا پر مختلف ہوتی ہے، اور اس بات پر اتفاق ہے کہ آخری تبع تابعی جن کی بات قبول کی جاتی تھی تقریباً 220 ہجری تک زندہ رہے، اور اسی زمانہ میں فتنے ظاہر ہونا شروع ہوئے... الخ۔

(فتح الباری، ج7ص6، دار المعرفة بیروت)

محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ (م597ھ) لکھتے ہیں:

"الْقرن: مِقْدَار التَّوَسُّط فِي أَعمار أهل الزَّمَان، فَهُوَ فِي كل قوم على قدر أعمارهم- واشتقاقه من الاقتران، فَهُوَ الْمِقْدَار الَّذِي يقْتَرن فِيهِ بَقَاء أهل ذَلِك الزَّمَان فِي الْأَغْلَب..."۔

یعنی قرن سے مراد کسی بھی زمانہ کے لوگوں کی اوسط عمر جتنا زمانہ ہے، لہٰذا یہ ہر قوم میں ان کی عمروں کے حساب سے ہوتا ہے... الخ۔

(كشف المشكل من حديث الصحيحين، ج1،ص291، طبع الرياض)

لہٰذا لعل شاہ صاحب کا قرن اول کی تحدید بعثت نبوی سے سنہ 8ھ تک، قرن ثانی کی تعیین سنہ 8ھ

سے سنہ 26ھ تک، اور قرن ثالث کا تعین سنہ 26ھ سے سنہ 44ھ تک کرنا ان کا اپنا مفروضہ اور خیال ہے اور اس کی تائید نہ احادیث کے مفہوم سے ہوتی ہے اور نہ ہی شارحین کی تشریحات سے، یہ محض لعل شاہ صاحب کا "ڈھکوسلہ" ہے اور اس کا مقصد صرف یہ باور کروانا ہے کہ سنہ 44ھ پر "خیر القرون" کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور "شر القرون" کی ابتدا ہو چکی تھی، اگرچہ سنہ 44ھ میں صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد زندہ موجود تھی فیاللعجب!

حدیث "اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس سال چلے گی"

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے مسند احمد کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا اردو ترجمہ یوں کیا ہے کہ:

"حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس سال چلے گی، جو ہلاک ہو گئے وہ پس راستہ ہے ہلاک شدگان کا اور اگر باقی رہ گئے تو ان کا دین ستر برس تک مستقیم رہے گا (یعنی بعد اس کے دین میں رخنے پیدا ہو جائیں گے)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 260)

پھر اس روایت پر لعل صاحب نے یوں تبصرہ فرمایا ہے کہ:

"آپ فرماتے ہیں کہ اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس سال تک چلے گی، اس پیشگوئی میں جس زمانہ کا تذکرہ ہے اس کی ابتداء پیشگوئی کے وقت سے ہے اور انتہاء استخلاف یزید سے ہے، گویا اس میں دو دوسرے قرنوں کی طرف اشارہ ہے اور ستر برس ابتدائے بعثت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی موت تک کا زمانہ ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 361)

غور فرمائیں! کس طرح لعل شاہ صاحب پہلے خود اپنے مفروضے بناتے ہیں، اس کے بعد احادیث کا مفہوم اپنے مفروضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں ہمارا سوال ہے کہ اس حدیث میں "پینتیس یا چھتیس" سے مراد سنہ 35ھ یا سنہ 36ھ کیوں نہیں لیا جا سکتا؟ اور یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کا زمانہ مراد ہے؟ جبکہ یہ قرین قیاس بھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے

ساتھ ہی فتنوں کا دور شروع ہوتا ہے، اور پھر لعل شاہ صاحب نے کس بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ ان پینتیس یا چھتیس سال کی ابتدا "پیشگوئی کے وقت سے ہے اور انتہاء استخلاف یزید سے ہے"؟ یعنی وہ کہنا چاہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہ بات سنہ 9ھ یا سنہ 10ھ میں فرمائی تھی کیونکہ لعل شاہ صاحب کی تحقیق کے مطابق استخلاف یزید کا قضیہ سنہ 44ھ کا ہے، تو ان کے پاس کیا دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بات نو یا دس ہجری میں ہی فرمائی تھی؟

اور پھر حیرت ہے کہ پینتیس یا چھتیس سال کی ابتداء تو وہ نو یا دس ہجری سے لے رہے ہیں تا کہ اسلام کی چکی کو استخلاف یزید یعنی ان کی تحقیق کے مطابق سنہ 44ھ میں روک دیں، لیکن اسی حدیث میں آگے جو "ستر سال" کا ذکر ہے اس کی ابتداء وہ "ابتدائے بعثت" بتا رہے ہیں، تا کہ اس کی انتہاء سنہ 60ھ یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر کر کے اس کے بعد دین کو "مستقیم" کی پٹری سے اتار دیں۔

اور ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنوا محققین بڑے شد و مد کے ساتھ ایسی روایات پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ "ساٹھ سال" سے پناہ مانگا کرتے تھے اور وہاں وہ بے دھڑک اس سے مراد "سنہ 60 ہجری" لیتے ہیں اور اس سے ثابت کرتے ہیں کہ اس حدیث میں یزید کی خلافت سے پناہ کا ذکر ہے، سوال ہے کہ وہاں "ساٹھ سال" سے، بعثت سے ساٹھ سال یا پیشگوئی کے وقت سے ساٹھ سال یا آپ ﷺ کے وصال کے بعد ساٹھ سال والے امکان ان حضرات کے ذہن میں کیوں نہیں آتے؟

بارہ خلفاء تک اسلام کے غالب رہنے کی روایت

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے اس حدیث پر کلام کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ "بارہ خلفاء کے زمانہ میں دین غالب اور مستقیم رہے گا"، ہم اس پر پہلے بھی تفصیل سے لکھ چکے ہیں، تاہم یہاں لعل شاہ صاحب کی تحریر سے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جو بڑے غور طلب ہیں، ملاحظہ فرمائیں، اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس روایت پر دو سوال وارد ہوتے ہیں، ایک یہ کہ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ الخلافة بعدي ثلاثون سنة ثم تكون ملكا (یعنی خلافت میرے بعد صرف تیس سال ہوگی، اس کے بعد بادشاہت ہوگی) اور وہ حدیث

اس روایت کے خلاف ہے کیونکہ ان تیس برسوں میں صرف خلفاء راشدین الاربعہ اور کچھ مہینے وہ ہیں جن میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی ہے گویا منجملہ پانچ خلیفہ ہوئے پھر بارہ کیسے درست ہوگئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تیس برس خلافت جو حدیث میں مذکور رہے تو اس سے مراد خلافت نبوت ہے، اور ایک روایت میں تصریح ہے کہ" خلافة النبوة بعدي ثلاثون سنة "اور بارہ خلفاء میں خلافت نبوت شرط نہیں.... الخ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 261و262)

لعل شاہ صاحب نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب پر کوئی اعتراض یا اس کا رد نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جواب سے اختلاف نہیں رکھتے، لیکن آگے وہ خود اپنی تحقیق ان الفاظ میں لکھتے ہیں کہ :

".... پس ضروری ہے کہ ان بارہ خلفاء سے مراد وہ اصحاب خلافت لئے جائیں گے جن کی خلافت علی منہاج النبوۃ ہوئی، اب رہی یہ بات کہ ان کی تعداد الخلفاء الراشدین کے سمیت ہے یا ان کے علاوہ، تو اس پر کوئی فیصلہ کن حکم نہیں لگایا جاسکتا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلافة النبوة بعدي ثلاثون سنة کے بعد کیا ہوگا؟ آیا یہ دین ختم ہوجائے گا اور کوئی خلیفہ نہ ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دین قیامت تک مستقیم رہے گا اور (الطائفة من امتي ظاهرين على الحق) دین کے قیام کا سبب ہوں گے، خلیفے بہتیرے ہوں گے، لیکن وہ خلفاء قیامت تک صرف بارہ ہوں گے جن کی خلافت راشدہ ہوگی اور وہ تیس سالہ خلافت النبوۃ کی نظیر ہوگی واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم الکتاب"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 264و265)

غور فرمائیں! یہاں لعل شاہ صاحب نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس امت میں بارہ خلیفے ایسے ہوں گے جن کی خلافت" خلافت راشدہ" ہوگی اور" خلافۃ النبوۃ" کی نظیر یعنی اس جیسی ہوگی، تو پھر" خلافت تیس برس ہوگی" کا یہ مطلب بیان کرنا کہ" خلافت راشدہ اور خلافت علی منہاج النبوۃ یا خلافت نبوت صرف تیس سال ہوگی" کیونکر درست ہوا؟ نیز" خلافت راشدہ" کو صرف چار میں منحصر کرنا کیسے صحیح ہوا؟

واضح رہے کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کی" بارہ خلفاء" والی حدیث، تیس سالہ خلافت والی حدیث سے کئی درجے زیادہ صحیح ہے، اس پر یا اس کے کسی راوی پر کسی نے کلام نہیں کیا، جبکہ" الخلافة بعدي ثلاثون سنة " والی روایت صحیحین کی نہیں اور کئی اہل علم نے اس روایت اور اس کے راویوں پر کلام کیا ہے، بعض نے تو صاف لکھا ہے کہ" یہ صحیح نہیں" (جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں) اس لئے احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے اس" بارہ خلفاء" والی حدیث کو مقدم رکھا جائے گا۔

استخلاف یزید (یعنی یزید کی" نامزدگی")

جیسا کہ آپ شروع میں پڑھ آئے ہیں کہ سید لعل شاہ صاحب بخاری صاحب نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر نقد کرنے کے لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ایک غیر مستند اور" ابو مخنف" کے طریق سے نقل کردہ روایت کو بنیاد بنایا اور عنوان باندھا کہ:

" تنقيح ما نكر به على معاوية رضى الله عنه" ان امور کی تنقیح جن کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر نکیر کی گئی ہے۔

اور پھر اپنی بات یہاں سے شروع کی کہ :

" حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں:وقد رُوِي عن الحسن البصري انه كان ينقم على معاوية اربعة اشياء قتاله علياً وقتله حجر ابن عدي واستلحاقه زياد ابن ابيه ومبايعته ليزيد ابنه. حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر چار چیزوں کی نقمت کرتے تھے، حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جنگ کرنا اور حجر بن عدی کو قتل کرنا اور زیاد ابن ابیہ کے نسب کو اپنے باپ ابوسفیان سے لاحق کرنا اور اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانا. البدایۃ والنہایۃ صفحہ 130 جلد 8"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 134و135)

تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر" اپنی نکیرات" کو آگے بڑھاتے ہوئے لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ 273 پر" استخلاف یزید" کا عنوان دیا ہے اور پھر لکھا ہے :

”چوتھی وہ چیز جس کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر نکیر کی گئی ہے، یزید کی نامزدگی کا قضیہ ہے، اور اسی مسئلہ کی تنقیح ہمارا اصل مقصود ہے، اور یہیں سے ہماری کتاب کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے، اس مسئلہ کی تنقیح کے لئے سب سے اہم مقدمہ تاریخ استخلاف یزید ہے اور اسی مقدمہ کو مؤرخین و مؤلفین نے اس بحث میں زیادہ قابل توجہ اور لائق التفات خیال نہ کیا، اتفاق سے اس مسئلہ میں ہماری تحقیق تمام مؤرخین کے خلاف واقع ہوئی ہے... الخ“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 271و272)

ملاحظہ فرمائیں! لعل شاہ صاحب نے اسی مسئلہ کو اپنی کتاب کا ”اصل مقصود“ بتایا ہے، اس لئے ہم بھی اس پر قدرے تفصیل سے لکھیں گے۔

لعل شاہ صاحب نے ایک خاص مقصد کے تحت تمام مؤرخین کی مخالفت کرتے ہوئے مختلف تانے بانے بُن کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یزید کی ولی عہدی کی تحریک سنہ 44ھ میں شروع ہوئی تھی (یعنی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے چار سال بعد)، جبکہ اگر سوچا جائے تو یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی کہ اس کے لئے بال کی کھال اتاری جائے، لیکن چونکہ لعل شاہ صاحب کا مقصد یزید کی ولی عہدی کو (بزعمِ خویش) سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا اور سنگین جرم باور کروانا ہے تو اس کی ”سنگینی“ میں اضافے کے لئے اس پر کئی ورق سیاہ کیے گئے، یہ ہماری رائے نہیں بلکہ خود لعل شاہ صاحب نے اپنی ”تحقیق جدید“ پیش کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے اس نے ان کے باطن کو طشت از بام کر کے رکھ دیا ہے، لکھتے ہیں:

”ہمارے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سنہ 41ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہو کر عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہیں اور سنہ 44ھ میں عصبیت مُضر کی پشت پناہی میں اپنے بیٹے کو نامزد کر دیتے ہیں اور تادم زیست اس سے زیادہ کسی مسئلہ کو اہم نہیں سمجھا، جلیل القدر صحابہ پہلے ہی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے، کچھ صحابہ اثارتِ فتنہ اور تفریق امت کے اندیشہ سے خاموش ہو گئے، بعض کی آواز سفک دماء اور خونریزی کے خوف سے حلقوم میں اٹک کر رہ گئی، کچھ رؤساء مناصب کی وجہ سے مجبور تھے، بعض کی زبانیں نقرئی مہروں سے داغ دی گئیں اور بعض کی دہن دوزی لقمہ ہائے چرب سے کر دی گئی اور بعض کو حرص و آز نے ایسا اندھا کر دیا

تھا کہ ملک کے طول وعرض میں رواں دواں اور استحکام ولایت یزید کے لئے کوشاں تھے، مناصب وعہود کی خاطر وفود کے وفود دمشق بھیجے جاتے ہیں، آخر ان کی سعی نامشکور بار آور ہوتی ہے اور یزید ابن معاویہ جس کے ہاتھوں امت کی تباہی مقدر ہو چکی تھی پوری امت پر مسلط کر دیا جاتا ہے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 316)

دیکھیے! لعل شاہ صاحب نے کس طرح اپنے اندر کا گند انڈیلا ہے، نہ صرف سیدنا معاویہ ﷜ (جنہیں وہ خود بھی صحابی لکھتے ہیں) پر تبرا کیا گیا ہے بلکہ اس وقت موجود صحابہ وتابعین کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے کہ امت کی تباہی کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور ان میں سے کچھ اثارت فتنہ کے خوف سے خاموش رہے، بعض کی آواز خوف کی وجہ سے حلقوم میں اٹک کر رہ گئی، کچھ اپنے مناصب کی وجہ سے مجبور تھے، بعض کی زبانیں مال ودولت سے بند کر دی گئیں اور کچھ کو حرص نے اندھا کر دیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی دشمن صحابہ ذاکر اپنے امام باڑے میں مجلس پڑھ رہا ہے، غور فرمائیں! بتایا جا رہا ہے کہ اس امت کے بہترین لوگوں کا یہ حال تھا کہ ان کے سامنے امت کی تباہی کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور وہ اپنے مصالح کے تحت چپ چاپ دیکھتے رہے، اور چودہ سو سال بعد سید لعل شاہ نامی "محقق" کے دل میں امت کا درد جاگا ہے اور وہ یہ سبائیانہ تخیلات پیش کر رہے ہیں کہ صحابہ تو اثارت فتنہ اور سفک دماء کے خوف سے خاموش تھے، سوال یہ ہے کہ ان صحابہ کے دلوں کا حال لعل شاہ صاحب تک کیسے پہنچا؟ کیا ان پر وحی نازل ہوئی؟ یا ان صحابہ نے خود کہیں یہ کہا کہ ہم اثارت فتنہ اور خوں ریزی کے خوف سے یا لالچ کی وجہ سے خاموش تھے؟ یہ دعویٰ بلا دلیل صرف لعل شاہ صاحب نے ہی نہیں کیا بلکہ اور بھی کئی حضرات نے یہ شوشہ چھوڑا ہے اور سیدنا معاویہ ﷜ کے ہمنوا جمہور صحابہ کرام پر یہ بہتان لگایا ہے کہ وہ اثارت فتنہ اور سفک دماء کے خوف سے خاموشی کے ساتھ امت کی تباہی دیکھتے رہے اور کچھ نہ بولے، البتہ لعل شاہ صاحب نے دو قدم آگے بڑھائے ہیں اور یہ انکشاف کیا ہے کہ کچھ صحابہ وتابعین ایسے بھی تھے جن کے منہ مال ودولت سے بھر کر بند کر دیے گئے اور کچھ وہ بھی تھے جو مناصب اور عہدوں کی حرص کی خاطر یزید کی ولی عہدی میں کوشاں رہے۔

لعل شاہ صاحب کی اس جسارت پر مزید تبصرہ ہم آگے کریں گے، سر دست صرف یہ بتانا مقصود ہے

کہ انہوں نے ایسا صرف یہ باور کروانے کے لئے لکھا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیس سالہ دورِ خلافت میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف یزید کی نامزدگی کی طرف ہی توجہ رکھی اور یہی کام سب سے اہم سمجھا، البتہ وہ یہ بتانا بھول گئے کہ پھر بحری بیڑوں کی تیاری، اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی مضبوطی، بلادِ روم پر پے در پے حملے، خراسان، ترکستان، سجستان، سمرقند و بخاریٰ، طبرستان و سندھ اور بلادِ افریقہ کی فتوحات، اور خوارج کی سرکوبی وغیرہ سب کچھ کس کی توجہ سے سرانجام پایا؟ کیا لعل شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ:

"انہوں نے اپنے زمانہ خلافت میں بے شمار لشکر مختلف علاقوں کی طرف بھیجے اور بہت سی فتوحات ہوئیں.."۔

(استخلافِ یزید، صفحہ 250)

اور

"بلا ریب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہزار ہا میلوں کا رقبہ فتح ہوا اور اس پر اسلام کے پرچم لہرائے.."۔

(استخلافِ یزید، صفحہ 253)

تو اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیس سالہ دورِ خلافت میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف یزید کی نامزدگی کی طرف ہی توجہ رکھی اور یہی کام سب سے اہم سمجھا، تو یہ بے شمار لشکر کون ترتیب دیتا تھا اور ہزار ہا میلوں کا رقبہ کس کی توجہ سے فتح ہوا؟

کیا یزید کی ولی عہدی کی تحریک سنہ 44ھ میں شروع ہوئی؟

بہرحال! آئیے دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی یزید کی ولی عہدی کی تحریک سنہ 44ھ میں شروع ہوئی؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ کسی کام کی تجویز پیش سامنے آنا، اس سے متعلق مشورہ ہونا اور پھر اس تجویز پر عمل درآمد کرنا یہ سب الگ چیزیں ہیں، ممکن ہے کوئی کسی بات کی تجویز دے لیکن اس کی اس تجویز کو اس وقت عملی جامہ نہ پہنایا جائے، بلکہ کئی سال بعد اس طرف توجہ دی جائے، اس لئے بفرضِ مُحال اگر ایک منٹ کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سنہ 44ھ یا اس کے آس پاس کسی نے یزید کو ولی عہد بنانے کی بات کی ہو، لیکن اس وقت وہ بات آئی گئی ہو گئی ہو اور دس بارہ سال تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس پر

کوئی سنجیدہ اقدام نہ کیا گیا ہو، یہاں تک کہ سنہ 56ھ آگیا جس میں اکثر مؤرخین کی تحقیق کے مطابق یزید کی ولی عہدی کے مسئلے کو باقاعدہ عملی شکل دینے کے لئے اقدامات شروع کیے گئے ہوں تو اس میں کیا عجیب بات ہے؟۔

اس لئے مشورہ، تجویز اور باقاعدہ اس پر عمل درآمد سب چیزوں کا ایک ہی وقت میں ہونا کیونکر ضروری ہے؟ مؤرخین نے جو استخلاف یزید کی تاریخ یا سال لکھا ہے وہ مؤخر الذکر یعنی عملی طور پر یزید کی ولی عہدی کے لئے اقدام کا وقت لکھا ہے کہ اس سال سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھی صحابہ و تابعین کے ساتھ اس بارے میں باقاعدہ صلاح مشورے شروع کیے اور اس بات کو آگے بڑھایا، اب یہاں خواہ مخواہ یہ ضد کر کے بیٹھ جانا کہ نہیں صاحب! یہ سب تو سنہ 44ھ سے ہی شروع ہو گیا تھا اور پھر اس مفروضے کو درست ثابت کرنے کے لئے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی یہ لکھنا پڑے کہ:

> ... البتہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 49ھ متقاضی ہے کہ سنہ 44ھ میں یزید کی نامزدگی نہیں ہو سکتی کیونکہ بالاتفاق یزید کی ولایت عہد کی تحریک حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی، سو گزارش ہے کہ حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) کی سن وفات میں اختلاف ہے ... (آگے مختلف کتب کے حوالے دینے کے بعد لکھا ہے)... سنہ 41ھ، سنہ 42ھ، سنہ 44ھ کے اقوال اگرچہ مؤرخین نے قیل سے ذکر کئے ہیں لیکن درحقیقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات انہی سنین میں واقع ہوئی ہے بلکہ سنہ 41ھ پر بعض روایات سے بھی استناد کیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات مؤرخین ایک قول کو قیل سے ذکر کرتے ہیں لیکن بعد تحقیق و تفتیش وہی قول اصح ترین ثابت ہوتا ہے اور مشہور و معروف قول واقعتاً درست نہیں ہوتا....“۔
>
> (ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 281و282)

غور فرمائیں! صرف اس لئے کہ پہلے لعل شاہ صاحب نے اپنے ذہن میں تمام مؤرخین کے برعکس یہ مفروضہ گھڑ لیا کہ یزید کی نامزدگی سنہ 44ھ میں ہوئی، اب مشکل پیش آئی کہ یزید کی نامزدگی تو سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی وفات کے بعد ہوئی تھی تو شاہ صاحب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کی تاریخ کے بارے میں بھی مشہور و معروف اقوال کو ترک کرتے ہوئے ”قیل“ کے ساتھ بیان کردہ اقوال کو درست ثابت کر رہے ہیں کیونکہ اگر

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بارے میں مشہور و معروف اقوال (اکثر مؤرخین کے مطابق سنہ 49ھ، ایک روایت کے مطابق 50ھ اور ایک روایت کے مطابق 51ھ) کو لیا جائے تو پھر لعل شاہ صاحب کی اپنے اوہام کی بنیاد پر اٹھائی گئی یہ عمارت کہ یزید کی نامزدگی سنہ 44ھ میں کردی گئی تھی دھڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ خود یہ لکھ چکے ہیں کہ :

"قضیہ استخلاف یزید، حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) کی وفات کے بعد پیش ہوا یہ ایک تاریخی مسلمہ ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 275)

بہر حال! سر دست بتانا یہ مقصود ہے کہ لعل شاہ صاحب کا طریقہ یہی سمجھ آتا ہے کہ وہ پہلے اپنے ذہن میں مفروضے تیار کرتے ہیں اور پھر ان مفروضوں کو درست ثابت کرنے کے لئے دلائل تراشتے ہیں، یا کوئی ضعیف اور شاذ قول تلاش کر کے اسے صحیح ترین ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں، اب آئیے ان کی اس "نئی تحقیق" کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کب ہوئی؟

سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کب ہوئی؟ اکثر مؤرخین کے مطابق سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 49ھ میں ہوئی، جس کا اقرار خود لعل شاہ صاحب نے بھی کیا ہے۔

(دیکھیں: تاريخ خليفة بن خياط، ص 209، دار طيبة، الرياض / تهذيب الكمال للمزي، ج 6ص256، مؤسسة الرسالة بيروت / انساب الاشراف للبلاذري، ج 3ص299، دار الفكر بيروت / سير اعلام النبلاء للذهبي، ج 4ص486، مؤسسة الرسالة بيروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا سن وفات 50ھ لکھا ہے۔

(فتح البارى، ج 7ص95، المكتبة السلفية)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول سنہ 51ھ کا نقل کیا ہے۔

(سير اعلام النبلاء، ج 3ص277، مؤسسة الرسالة)

ابن عبد البر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ (م 463ھ) نے لکھا ہے کہ:

" ومات الحسن بن علي رضي الله عنهما بالمدينة واختلف في وقت وفاته، فقيل: مات سنة تسع وأربعين. وقيل: بل مات في ربيع

الأول من سنة خمسين بعد ما مضى من إمارة معاوية عشر سنين. وقيل: بل مات سنة إحدى وخمسين"۔

سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی وفات مدینہ میں ہوئی، آپ کی وفات کے وقت میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ سنہ 49ھ میں ہوئی، ایک قول ہے کہ ربیع الاول سنہ 50ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دس سال گذرنے کے بعد میں ہوئی، ایک قول سنہ 51ھ کا بھی ہے۔

(الاستیعاب في معرفة الاصحاب، ج 1ص233، دار الفکر بیروت)

حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ (م 571ھ) نے مختلف سندوں کے ساتھ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے سن وفات کے بارے میں روایات نقل کی ہیں جن میں 48ھ، 49ھ، 50ھ، 51ھ، 56ھ، 57ھ اور یہاں تک کہ 58ھ کے بھی اقوال ملتے ہیں۔

(تاریخ دمشق، ج13ص299تا305، دار الفکر بیروت)

لعل شاہ صاحب اپنی کتاب میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی "تقویم تاریخی" کے حوالے بھی دیتے ہیں، اس میں بھی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کا سال 49ھ ہی لکھا ہے۔

(تقویم تاریخی، عبدالقدوس ہاشمی، ص13 طبع دوم، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد)

اوپر مذکور علماء و مؤرخین میں سے کسی نے بھی "ہیثم بن عدی" کی طرف منسوب سنہ 44ھ والا قول ذکر نہیں کیا، یہ قول ہمیں امام طبرانی کی "المعجم الکبیر" میں ملتا ہے لیکن اسے نقل کرنے کے ساتھ ہی امام طبرانی نے لکھا ہے: "وَخُولِفَ" یعنی اس قول کی مخالفت کی گئی ہے یا اسے قبول نہیں کیا گیا، اور اس کے بعد امام طبرانی نے 48، 49 اور 50 ہجری کے اقوال نقل کیے ہیں۔

(المعجم الکبیر للطبراني، ج 3ص25، مکتبة ابن تیمیة، القاهرة)

اس کے ساتھ یہ بات بھی مسلم اور معروف ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی (خود لعل شاہ صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی جو اس وقت مدینہ کے عامل تھے۔ استخلاف یزید، صفحہ 284) اور یہ

بات بھی کتب تاریخ میں ثابت ہے کہ سنہ 44ھ میں مدینہ کے والی حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نہیں تھے بلکہ سنہ 42ھ سے 49ھ کے ابتدائی مہینوں تک مدینہ کے والی مروان بن الحکم تھے، چنانچہ امام طبری نے سنہ 42ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

"وولّى معاوية في هذه السنة مروان بن الحكم المدينة"۔

اس سال (یعنی 42ھ میں) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان بن الحکم کو مدینہ کا والی بنایا۔

(تاریخ الطبری، ج 5ص 172، دار المعارف)

اور پھر سنہ 49ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

"وفيها عزل مُعَاوِيَة مَرْوَان بن الحكم عن الْمَدِينَة فِي شهر ربيع الأول.وأمّر فِيهَا سَعِيد بن الْعَاصِ عَلَى الْمَدِينَة فِي شهر ربيع الآخر،وقيل فِي شهر ربيع الأول،وكانت ولاية مَرْوَان كلها بِالْمَدِينَةِ لمعاوية ثمان سنين وشهرين"۔

اس سال (یعنی 49ھ) کے ربیع الاول کے مہینے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان بن الحکم کو مدینہ کی ولایت سے معزول کرکے اسی ماہ یا ربیع الآخر میں سعید بن العاص کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا، یوں مدینہ پر مروان کی ولایت کا یہ زمانہ آٹھ سال اور دو ماہ پر محیط رہا۔

(تاریخ الطبری، ج5ص232، دار المعارف)

ثابت ہوا کہ سنہ 42ھ سے لے کر ربیع الاول 49ھ تک مدینہ کے والی بدستور مروان بن الحکم رہے، لہٰذا اگر اس عرصہ میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی ہو تو حضرت سعید بن العاص کا بطور والی مدینہ ان کی نماز جنازہ پڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ سعید بن العاص سنہ 49ھ تا 53ھ/54ھ مدینہ کے والی رہے اور یہی بات قرین قیاس ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات اسی عرصہ کے دوران ہوئی۔

تنبیہ

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کچھ کتب میں ملتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران میں مدینہ منورہ کی ولایت وگورنری دو افراد مروان بن الحکم اور سعید بن العاص کے درمیان ہی

تبدیل ہوتی رہی، اور لکھا ہے کہ دونوں دو دو بار مدینہ کے والی رہے، لیکن اگر تحقیق کی جائے تو سعید بن العاص کا اس عرصہ کے دوران صرف ایک بار مدینہ کا والی ہونے کا ذکر ملتا ہے اور وہ زمانہ ہے سنہ 49ھ تا 54ھ کا، ان سے پہلے سنہ 42ھ تا 49ھ مروان رہے اور ان کے بعد بھی سنہ 54ھ تا 57ھ مروان ہی رہے، پھر سنہ 58ھ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ تھے، چنانچہ امام خلیفہ بن خیاط رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مختلف شہروں کے قاضیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اَلْمَدِينَة: استقضى مَرْوَان عَلَيْهَا عَبْد اللهِ بْن نَوْفل بْن الْحَارِث وَلم يزل قَاضِيا عَلَيْهَا حَتَّى عزل مَرْوَان سنة ثَمَان وَأَرْبَعين ثمَّ ولي سعيد بْن الْعَاصِ فاستقضى أَبَا سَلمَة ابْن عَبْد الرَّحْمَن بْن عَوْف فَلم يزل قَاضِيا حَتَّى عزل سعيد بْن الْعَاصِ وَولي مَرْوَان ابْن الحكم الثَّانِيَة سنة أَربع وَخمسين فاستقضى مَرْوَان بْن الحكم مُصعب بْن عَبْد الرَّحْمَن بْن عَوْف فَلم يزل قَاضِيا عَلَيْهَا حَتَّى عزل مَرْوَان سنة سبع وَخمسين فِي آخر ذِي الْقعدَة وَولي الْوَلِيد بْن عتبَة بْن أَبِي سُفْيَان فاستقضى ابْن زَمعَة العامري حَتَّى مَاتَ مُعَاوِيَة"۔

مروان نے عبداللہ بن نوفل بن حارث کو مدینہ کا قاضی بنایا اور وہ مروان کے سنہ 48ھ میں معزول ہونے تک مدینہ کے قاضی رہے۔ پھر سعید بن العاص والی بنے تو انہوں نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کے بیٹے ابوسلمہ کو منصب قضا پر بٹھایا، وہ سنہ 54ھ میں سعید بن العاص کے معزول ہونے اور دوبارہ مروان کے والی بننے تک قاضی رہے۔ پھر مروان نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کے بیٹے مصعب کو مدینہ کا قاضی بنایا، وہ وہاں کے قاضی رہے یہاں تک کہ آخر ذی القعدہ سنہ 57ھ میں مروان کی معزولی کے بعد ان کی جگہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان مدینہ کے والی بن گئے، پس انہوں نے ابن زمعہ العامری کو مدینہ کا قاضی مقرر کیا اور حضرت معاویہ کی وفات تک وہی رہے۔

(تاریخ خلیفۃ بن خیاط، صفحہ 228، دار طیبۃ الریاض)

یہاں امام خلیفہ بن خیاط نے یہ تو ذکر کیا ہے کہ سنہ 48ھ تک حضرت معاویہ ﷜ کی طرف سے مدینہ کے والی مروان بن الحکم رہے، لیکن ان سے پہلے سعید بن العاص کی ولایت کا ذکر نہیں کیا، ممکن ہے حضرت معاویہ ﷜ کی خلافت کے پہلے سال یعنی 41ھ میں مختصر مدت کے لئے سعید بن العاص مدینہ کے والی رہے ہوں، جیسا کہ لعل شاہ صاحب نے ہی ابن عبد البر اور شاہ معین الدین کے حوالے سے حضرت معاویہ ﷜ کی خلافت کے بالکل ابتدائی ایام میں مختصر مدت کے لئے ان کے والی مدینہ ہونے کا حوالہ دیا ہے (استخلاف یزید، صفحہ 283و284)۔ چنانچہ ابن عبد البر کی عبارت یوں ہے :

"ولما قتل عثمان لزم سعيد بن العاص هذا بيته، واعتزل أيام الجمل وصفين، فلم يشهد شيئا من تلك الحروب، فلما اجتمع الناس على معاوية، واستوثق له الأمر ولاه المدينة، ثم عزله وولاه مروان، وكان يعاقب بينه وبين مروان بن الحكم في أعمال المدينة"۔

سیدنا عثمان ﷜ کے قتل کے بعد سعید بن العاص اپنے گھر میں بیٹھ رہے اور جنگ جمل و صفین میں سے کسی بھی لڑائی میں شریک نہیں ہوئے، یہاں تک کہ جب لوگ حضرت معاویہ ﷜ پر متفق ہو گئے اور ان کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے سعید بن العاص کو مدینہ کا والی بنایا، پھر کچھ عرصہ بعد انہیں ہٹا کر مروان کو والی بنا دیا، حضرت معاویہ ﷜ ان دونوں (یعنی سعید بن العاص اور مروان بن الحکم) کو ایک دوسرے کی جگہ مدینہ کی ذمہ داری دیتے رہتے تھے۔

(الاستيعاب في معرفة الاصحاب، ج1ص 374، دار الفكر بيروت)

یہی بات شاہ معین الدین ندوی نے بھی لکھی ہے جسے لعل شاہ صاحب نے یوں نقل کیا ہے :

"استقرار حکومت کے بعد امیر معاویہ ﷜ نے ان کو (سعید بن العاص) مدینہ کا عامل بنایا لیکن پھر کچھ دنوں کے بعد ان کو معزول کر کے ان کی جگہ مروان کو مقرر کر دیا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 284 / سیر الصحابہ از شاہ معین الدین، ج 4 ص 322، دارالاشاعت کراچی)

لیکن سنہ 44ھ میں سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے مدینہ کا والی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس وقت مدینہ کے والی مروان تھے، لہٰذا اگر سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی وفات سنہ 42ھ تا سنہ 48ھ کسی بھی سال مانی جائے تو چونکہ اس تمام عرصہ میں مدینہ کے والی مروان بن الحکم تھے لہٰذا یہ بات کسی طرح درست نہیں بنتی کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ والی مدینہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے پڑھائی ہو، خود لعل شاہ صاحب نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ :

"سنہ 50ھ میں مروان بن الحکم مدینہ کے عامل نہیں تھے، وہ سنہ 48ھ میں معزول ہوئے اور سنہ 54ھ میں دوبارہ بحال ہوئے، سنہ 49ھ تا سنہ 54ھ مدینہ کے عامل سعید بن العاص تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 300و301)

لیکن یہ نہیں بتایا کہ سنہ 41ھ تا 48ھ کے عرصہ میں مدینہ کا عامل ان دونوں بزرگوں میں سے کون کب سے کب تک رہا؟ تاہم، ہم نے باحوالہ ثابت کر دیا ہے کہ سنہ 49ھ میں معزول کیے جانے تک مروان بن الحکم مسلسل تقریباً آٹھ سال دو ماہ مدینہ کے والی رہے جس سے معلوم ہوا کہ سنہ 42ھ سے وہی عامل چلے آرہے تھے، یوں سنہ 44ھ میں مروان ہی عامل تھے نہ کہ سعید بن العاص، لہٰذا یہی بات قرین قیاس ہے کہ سعید بن العاص نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ سنہ 49ھ تا 54ھ کے دوران ہی پڑھائی تھی، لہٰذا مؤرخین کا وہی قول درست اور صحیح ہے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 49ھ یا اس کے بعد ہوئی ہے۔

الغرض! نہ جانے لعل شاہ صاحب کو کیا مجبوری پیش آگئی کہ وہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بارے میں سنہ 44ھ والا شاذ قول لینے پر ہی مصر ہیں؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے ہی اس لئے تھے کہ اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ بنوا سکیں؟ لیکن انہوں نے یہ عقدہ حل نہیں کیا کہ کیا سنہ 44ھ میں مدینہ کے والی سعید بن العاص تھے؟ خود انہوں نے محمود احمد عباسی کی ایک بات پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے:

"محمود عباسی صاحب نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بارے میں تو مروان بن الحکم کے عہد امارت کو یاد فرمایا ہے کہ جب دوبارہ عامل مدینہ مقرر ہوئے تو سنہ 54ھ میں حضرت

حفصہ رضی اللہ عنہا کا جنازہ پڑھایا لیکن یہ ذہول کر گئے کہ سنہ 50ھ کی بات ہو رہی ہے اور سنہ 50ھ میں مروان بن الحکم مدینہ کے عامل نہیں تھے، وہ سنہ 48ھ میں معزول ہوئے اور سنہ 54ھ میں دوبارہ بحال ہوئے، سنہ 49ھ تا سنہ 54ھ مدینہ کے عامل سعید بن العاص تھے.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 300و301)

تو بالکل اسی طرح لعل شاہ صاحب نے بڑی شدومد کے ساتھ اس قول کی صحت کا دعویٰ تو کر دیا کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 44ھ میں ہوگئی تھی، لیکن یہ ذہول کر گئے کہ اس وقت مدینہ کے عامل سعید بن العاص نہیں بلکہ مروان بن الحکم تھے، تو پھر بطور والی مدینہ نماز جنازہ مروان کو ہی پڑھانا چاہئے تھی نہ کہ سعید بن العاص کو۔

اور آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ لعل صاحب نے لکھا ہے :

"اس مسئلہ کی تنقیح کے لئے سب سے اہم مقدمہ تاریخ استخلاف یزید ہے اور اسی مقدمہ کو مؤرخین و مؤلفین نے اس بحث میں زیادہ قابل توجہ اور لائق التفات خیال نہ کیا، اتفاق سے اس مسئلہ میں ہماری تحقیق تمام مؤرخین کے خلاف واقع ہوئی ہے....... الخ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 271و272)

لعل شاہ صاحب بمقابلہ تمام مؤرخین

اب لعل شاہ صاحب کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

"تاریخ استخلاف یزید میں مؤرخین کے دو قول ملتے ہیں سنہ 50ھ اور سنہ 56ھ، اول الذکر قول کو جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور ثانی الذکر کو ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا، دیکھو: تاریخ الخلفاء، ص150، تاریخ طبری، ص 169 ج6، ابن اثیر، ص 423 ج3، البدایۃ والنہایۃ، ص79 ج1 (غالباً ج8۔ناقل) میرے احاطہ علم میں کوئی تیسرا قول نہیں، تاہم تاریخی حقائق کے پیش نظر متذکرہ بالا دونوں قول غلط ہیں استخلاف یزید کی تجویز کس تاریخ کو پیش کی گئی اور بیعتِ استخلاف کس تاریخ کو تکمیل تک پہنچی؟ اس میں کوئی حتمی اور قطعی

دلیل تو نہیں مگر جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے سنہ 44ھ کے کسی مہینے میں تجویز پیش ہوئی اور سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کرلی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

تبصرہ :

اولاً لعل شاہ صاحب نے خود اقرار کیا ہے کہ تاریخ استخلاف یزید میں مؤرخین کے صرف دو قول ملتے ہیں سنہ 50ھ اور سنہ 56ھ، لیکن لعل شاہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ دونوں قول غلط ہیں۔

ثانیاً، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ استخلاف یزید کی تجویز کب پیش کی گئی اور بیعت استخلاف (یعنی ولی عہدی کی بیعت) کب مکمل ہوئی؟ اس میں کوئی حتمی اور قطعی دلیل نہیں ہے، لیکن وہ کہتے ہیں کہ میری ذاتی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ سنہ 44ھ میں کسی وقت کا ہے۔

ثالثاً لعل شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی تحقیق کے مطابق سنہ 59ھ کے آخر تک مدینہ کے چند حضرات کے علاوہ باقی تمام لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کرلی تھی (لعل شاہ صاحب نے طوعاً و کرہاً کے الفاظ لکھے ہیں، اس پر ہم آگے بات کریں گے کہ "کرہاً" کی کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں؟)۔

لعل شاہ صاحب نے تمام مؤرخین کے بالعکس جو اپنی "نادر تحقیق" پیش کی ہے اس کی بنیاد جن امور پر رکھی ہے ان کا خلاصہ یہ ہے :

1) بقول لعل شاہ صاحب، اکثر مؤرخین کی رائے میں ولی عہدی کی تجویز سب سے پہلے حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) نے پیش کی تھی۔

2) اس وقت مدینہ کے گورنر یا عامل مروان بن حکم تھے۔

3) اس وقت عبدالرحمن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہما) زندہ تھے، کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے اس تجویز کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔

4) یہ بھی ایک تاریخی مسلّمہ ہے کہ یہ قضیہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد پیش ہوا تھا۔

5) یہ بھی مسلّم ہے کہ اسی سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فضا ہموار کرنے کے لئے مدینہ تشریف لائے تھے۔

پھر لعل شاہ صاحب نے اپنا مقدمہ اس طرح بنایا ہے کہ :

1) استخلاف یزید کی سب سے پہلے تجویز دینے والے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 50ھ یا سنہ 49ھ میں ہوگئی تھی۔

2) اسی طرح (بقول لعل شاہ صاحب) مشہور قول کے مطابق حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر (رضی اللہ عنہما) کی وفات سنہ 53ھ اور بعض کے نزدیک سنہ 55ھ میں ہوئی تھی، نیز لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی وفات سنہ 58ھ میں بتائی ہے مگر وہ کسی صورت درست نہیں ہو سکتی۔

3) یہ بات مسلّم ہے کہ جس سال استخلاف یزید کا قضیہ پیش آیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اسی سال فضا ہموار کرنے کے لئے مدینہ تشریف لائے تھے۔

(ملخصاً : استخلاف یزید، صفحہ 274 تا 277)

4) لعل شاہ صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کی تحقیق کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فضا ہموار کرنے کے لئے سنہ 44ھ میں حج کے لئے تشریف لائے۔

(مفہوم: استخلاف یزید، صفحہ 281)

<u>تبصرہ :</u>

سب سے پہلے ایک بات ذہن نشین رہے کہ لعل شاہ صاحب کبھی "تجویز" کے الفاظ بولتے ہیں اور کبھی "استخلاف یزید کے قضیہ" کے اور کبھی "بیعت استخلاف کی تکمیل" کے، وہ خود بھی اس بات کے قائل نہیں کہ جس وقت یہ تجویز سامنے آئی اسی وقت یا اسی سال فوراً یزید کی ولی عہدی کی بیعت بھی مکمل ہوگئی بلکہ انہوں نے جو اپنی تحقیق پیش کی ہے وہ بھی یہ ہے کہ :

"جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے سنہ 44ھ کے کسی مہینے میں تجویز پیش ہوئی اور سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کر لی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

یعنی یہ معاملہ زیر بحث آنے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں بقول لعل شاہ صاحب تقریباً 15 سال لگے، لہٰذا اس بات کی تحقیق میں بال کی کھال اتارنے کی وجہ ہمیں سمجھ نہیں آسکی کہ آخر لعل شاہ صاحب

کیوں یہ ثابت کرنے پر بضد ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے تین چار سال بعد ہی یزید کو ولی عہد بنانے کی تحریک شروع کر دی تھی؟ ایک ہی بات سمجھ آتی ہے اور وہ ہے استخلاف یزید کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا بڑا گناہ بنا کر پیش کرنا، جس کا اظہار خود لعل شاہ صاحب کے قلم سے بھی نکل گیا ہے اور جسے انہوں نے اپنے مطالعہ کا حاصل بتایا ہے، جو ہم پہلے بھی نقل کر آئے ہیں کہ :

"ہمارے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سنہ 41ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہو کر عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہیں اور سنہ 44ھ میں عصبیت مُضر کی پشت پناہی میں اپنے بیٹے کو نامزد کر دیتے ہیں اور تادم زیست اس سے زیادہ کسی مسئلہ کو اہم نہیں سمجھا، جلیل القدر صحابہ پہلے ہی سیاست سے دست کش ہو چکے تھے، کچھ صحابہ اثارتِ فتنہ اور تفریق امت کے اندیشہ سے خاموش ہو گئے، بعض کی آواز سفک دماء اور خونریزی کے خوف سے حلقوم میں اٹک کر رہ گئی، کچھ روساء مناصب کی وجہ سے مجبور تھے، بعض کی زبانیں نقرئی مہروں سے داغ دی گئیں اور بعض کی دہن دوزی لقمہ ہائے چرب سے کر دی گئی اور بعض کو حرص و آز نے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ ملک کے طول و عرض میں رواں دواں اور استحکام ولایت یزید کے لئے کوشاں تھے، مناصب وعہود کی خاطر وفود کے وفود دمشق بھیجے جاتے ہیں، آخر ان کی سعی نامشکور بار آور ہوتی ہے اور یزید ابن معاویہ جس کے ہاتھوں امت کی تباہی مقدر ہو چکی تھی پوری امت پر مسلط کر دیا جاتا ہے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 316)

کیا واقعی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز دی؟

اب آئیے اس پہلی بات کا جائزہ لیتے ہیں جو لعل شاہ صاحب نے اپنے مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے کہ:

"اکثر مؤرخین کی رائے میں سب سے پہلے ولی عہدی کی تجویز حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) نے پیش کی تھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

تبصرہ :

عجیب بات ہے کہ یہاں لعل شاہ صاحب نے نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا ہے، نہ کوئی روایت پیش کی ہے، صرف یہ لکھ دیا ہے کہ" اکثر مؤرخین کی رائے میں" ۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جس روایت میں یہ بات مذکور ہے وہ غیر مستند ہے، چنانچہ تاریخ طبری میں سنہ 56ھ کے واقعات کے ضمن میں" عامر بن الشعبی رحمۃ اللہ علیہ " کی ایک روایت ملتی ہے جس کی سند یوں ہے :

"حَدَّثَنِي الْحَارِثُ، قَالَ:حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، قَالَ:حَدَّثَنَا أَبُو إِسْمَاعِيلَ الهمداني وعلي بن مُجَاهِدٍ، قَالا :قَالَ الشَّعْبِيّ..... الی آخر الرواية"۔

اور پھر جو روایت ہے اس کا اردو میں خلاصہ یہ ہے کہ :

"حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر بڑھاپے کی وجہ سے کوفہ کی گورنری سے استعفاء دے دیا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے منظور کر لیا اور ان کی جگہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کرنا چاہا، حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات بری لگی، انہوں نے دوبارہ منصب پانے کے لئے یزید سے مل کر اسے خوش کرنے کی کوشش کی اور اسے ولی عہد بننے کی ترغیب دی، یزید نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس تجویز کا ذکر کیا، انہوں نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو بلوا کر اس تاکید کے ساتھ دوبارہ کوفہ کا گورنر بنا دیا کہ وہ لوگوں کو یزید کی بیعت کے لئے آمادہ کریں"۔

(تاريخ الطبري، ج 5ص301، دار المعارف مصر / البداية والنهاية نقلاً عن الطبرى، ج 8 ص115، وزارة الاوقاف قطر / یہ قصہ ابن الاثیر نے بھی بلا سند ذکر کیا ہے الكامل في التاريخ، ج 3 ص97، دارالكتاب العربي بيروت)

نوٹ : طبری، ابن کثیر اور ابن الاثیر تینوں نے یہ قصہ سنہ 56ھ کے واقعات میں ذکر کیا ہے نہ کہ سنہ 44ھ کے واقعات میں، لہٰذا اگر لعل شاہ صاحب کو اس سے یہ ثابت کرنا ہے کہ یزید کی ولی عہدی کی اولین تجویز حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے پیش کی تھی تو انہیں یہ بھی تسلیم کرنا ہو گا کہ ان مؤرخین نے یہ بات سنہ 56ھ کے واقعات کے ضمن میں نقل کی ہے۔

بہرحال! اس کہانی کی سند ہمیں صرف تاریخ طبری میں ملتی ہے، باقی جس نے بھی نقل کیا ہے طبری سے ہی کیا ہے، اور طبری کی سند میں "شعبی" سے روایت کرنے والا ایک راوی ہے "علی بن مجاہد"، اگر تو اس سے مراد "علی بن مجاہد بن رفیع الکابلی" ہے تو اس کے بارے میں امام یحییٰ بن معین نے فرمایا: "كان يضع الحديث وكان صنّف كتاب المغازي فكان يضع للكل اسناداً" وہ حدیث گھڑا کرتا تھا، اس نے ایک کتاب المغازی لکھی تھی اور ہر بات کی سند گھڑا کرتا تھا۔ امام ابوحاتم رازی نے امام یحییٰ بن معین کے حوالے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ: "علي بن مجاهد كذّاب" کہ علی بن مجاہد بڑا جھوٹا ہے۔ امام ذہبی نے ایک مجہول راوی "ابو روح" کے تذکرہ میں لکھا ہے "تفرد عنه علي بن مجاهد أحد الضعفاء" اس (ابو روح) سے صرف علی بن مجاہد نے روایت کی ہے جو کہ ضعیف راویوں میں سے ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھیں: تهذيب التهذيب، ج7ص377، دائرة المعارف، الهند/ ميزان الاعتدال، ج3ص163و ج5ص241، دار الرسالة بيروت)

اور اگر اس "علی بن مجاہد" سے مراد یہ "کابلی" نہیں بلکہ کوئی اور ہے تو پھر وہ مجہول ہے، اسی طرح اس سند کے دوسرے راوی "ابو اسماعیل الہمدانی" کا تعارف بھی ہمیں نہیں ملا لہٰذا وہ بھی مجہول ہے۔

(نیز دیکھیں: صحيح و ضعيف تاريخ الطبري، ج 9ص 126، دار ابن كثير بيروت)

علاوہ ازیں اس پوری روایت پر غور کریں تو اس روایت کو گھڑنے والے نے صریح غلطیاں کی ہیں، اگر تو طبری کی روایت کے مطابق حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے کمزوری اور بڑھاپے کی وجہ سے خود اپنا استعفاء پیش کیا تھا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس عہدے کی خواہش نہیں تھی، تو پھر جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی اپنی خواہش کے مطابق ان کا استعفاء قبول فرما لیا تو انہیں یکدم دوبارہ گورنری کی خواہش کیوں ہوتی؟ پھر اگر بالفرض انہیں دوبارہ گورنری لینی ہی تھی تو یہ سب کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی؟ وہ صاف صاف اپنا استعفاء واپس لے سکتے تھے، یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایت من گھڑت ہے۔

البتہ ابن الاثیر نے "الکامل" میں اس قصے کو اضافی مرچ مسالے لگا کر بلا سند نقل کیا ہے، اس میں کہانی یوں بنائی گئی ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو کسی طرح معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ انہیں کوفہ کی گورنری

سے معزول کرکے ان کی جگہ سعید بن العاص کا تقرر کرنا چاہتے ہیں، تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر خود ہی جھوٹ موٹ کمزوری کا بہانہ کرکے استعفاء پیش کردیتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ لگے کہ میں خود اس گورنری کو ناپسند کرتا ہوں... پھر انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی تحریک شروع کی.... وغیر ذلك من الخرافات"۔

(الكامل في التاريخ، ج 3ص97، دارالكتاب العربي بيروت)

ہمیں اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ ابن الاثیر نے اس کہانی کی کوئی سند سرے سے ذکر ہی نہیں کی۔

بلکہ خود لعل شاہ صاحب کو بھی اس کہانی کے جھوٹا ہونے کا احساس تھا تو انہوں نے یہاں بات کو دوسری طرف گھما دیا ہے اور اپنے تخیل سے ایک افسانہ ترتیب دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

"حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے یہ تحریک کیوں پیش کی؟ تو اس بارہ میں بعض مؤرخین کا یہ بیان ہے کہ اپنی معزولی کے خوف سے خائف ہو کر انہوں نے یہ چکر چلایا ہے، یہ قطعاً غلط اور اصلاً بے بنیاد ہے، سنہ 44ھ میں ان کے عزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حقیقت لاکھوں پردوں میں مستور ہو مگر متجسس نگاہیں اسے پا لیتی ہیں، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں ابتدائے خلافت سے ہی جانشینی کے تذکرے ہوتے تھے اور یزید کی نامزدگی کی امنگیں بیدار ہو رہی تھیں..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 286)

پھر اس افسانے میں مزید رنگ بھرتے ہوئے اور اپنے تخیلات بلکہ "اضغاث احلام" کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے، لکھتے ہیں :

"...سنہ 44ھ میں استلحاق زیاد کا قضیہ پیش آیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات اس سے قبل ہو چکی تھی، زیاد عرب کے مشہور مدبروں میں سے ایک تھا جن کی سیاست ضرب المثل تھی، یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے درجہ کا معروف سیاسی مدبّر، شجاعت و بسالت اور امور سلطنت میں زبردست بصیرت کا مالک تھا، عمرو ابن

العاص رضی اللہ عنہ المتوفیٰ 43ھ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنا بھائی بنالیا، اس طرح ایک باندی کا بچہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے نسب کے ساتھ منسلک ہو کر بیتِ ابی سفیان رضی اللہ عنہ کا ایک فرد بن گیا، نوشتۂ تقدیر تو پورا ہی ہو کر رہتا ہے، مگر عالم اسباب میں زیاد کے لئے اپنی قابلیت اور صلاحیت کے پیش نظر مسند خلافت تک پہنچنے کی ساری راہیں کھل چکی تھیں، یہ بات شاید حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے بھی ناگوار تھی اور عین ممکن ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی بصیرت نے بھی یہ بات سمجھ لی ہو کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی حیات کسی بھی شخص کی جانشینی کے لئے رکاوٹ تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بوقت مصالحت معاملہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف مفوض کر دیا تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے ۔ عهد للحسن بالامر من بعده (البدایہ والنہایہ ص 80 ج 8) وہ رکاوٹ اب دور ہو چکی تھی اب زیاد کی کاٹ کا حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے بغیر کوئی دوسرا شخص نہ تھا، حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بھی زیاد کے تغلب کو ناپسند فرماتے تھے شاید اس لئے کہ زیاد اپنے تین بھائیوں کی معیت میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ پر زنا کی شہادت دینے کے لئے پیش ہوئے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں حاضری کے بعد زیاد توقف کر گیا، نصاب پورا نہ ہونے کی وجہ سے بقیہ تینوں اشخاص پر امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حدِ قذف جاری کی اور حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کے ماسوا تینوں تائب ہو گئے، البتہ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ اپنی شہادت پر قائم رہے، کچھ طبعی خلش حضرت مغیرہ کے قلب میں تھی، پس انہوں نے یزید کی ولایت عہد کی تحریک کھڑی کر دی، چنداں بعید نہیں کہ یہ تحریک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایماء پر کی گئی ہو، یزید کی نامزدگی سے زیاد کے آگے بڑھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں... "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 288و289)

کیا کوئی حاکم اپنے بعد کسی کو ولی عہد مقرر نہیں کر سکتا؟

قارئین محترم! ہمیں اس "لعل شاہی" افسانے پر تبصرہ کرنے کی چنداں ضرورت تو نہیں کہ یہ سب لعل شاہ صاحب کا اپنا تخیل ہے، جب سرے سے یہ بات ہی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ یزید کی ولی عہدی کی

تحریک حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے پیش کی تھی تو اس کی بنیاد پر قائم کی گئی عمارت بھی بناء الفاسد علی الفاسد کے قبیل سے ہے، لیکن لعل صاحب کے اس افسانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جیسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کرکے شرعی طور پر کسی ناجائز یا حرام کا ارتکاب کیا ہو، اسی لئے تو وہ یہ افسانے بنا رہے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں شروع ہی سے یزید کی نامزدگی کی امنگیں بیدار تھیں اور پھر زیاد کو خلافت تک پہنچنے سے روکنے کے لئے خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ تحریک شروع کی یا ان کے ہی ایماء پر شروع کی گئی، لیکن اس افسانے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، ایک تو اس لئے کہ قرآن وسنت میں مسلمانوں کا حاکم یا امیر مقرر کرنے کا کوئی خاص طریقہ کار نہیں مقرر کیا گیا اور نہ ہی ایک حاکم یا خلیفہ کا اپنے بعد کسی کو (چاہے اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو) جانشینی کے لئے نامزد کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، اسی لئے پہلے چاروں خلفائے راشدین کا عمل الگ الگ نظر آتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد مسلمانوں میں خلافت کے معاملے پر اختلاف پیدا ہوگیا، انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں اپنے امیر کے انتخاب کے لیے اجتماع کیا، جس کی خبر حضرت عمر اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کو پہنچی، وہ دونوں وہاں پہنچے اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر ان کی بیعت کرلی، اور پھر باقی مسلمانوں نے بھی ان کی بیعت کی۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت کے لئے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو باقاعدہ نامزد کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چھ لوگوں کی کمیٹی تشکیل دے دی کہ وہ آپس میں مشورہ کرکے کسی ایک کو خلیفہ بنالیں، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جن حالات میں اور جس طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی اور پھر صحابہ کرام کے درمیان جو مشاجرات ہوئے وہ سب تفصیل کتب حدیث وتاریخ میں منقول ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر جب قاتلانہ حملہ ہوا اور آپ کی شہادت سے پہلے آپ کے رفقاء نے آپ سے پوچھا کہ: اگر آپ شہید ہوجائیں تو کیا ہم حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلیں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"لَا آمُرُكُمْ وَلَا أَنْهَاكُمْ" میں نہ تو اس کا حکم دیتا ہوں، نہ اس سے منع کرتا ہوں۔

(تاريخ الطبري، ج5ص146و 147، دار المعارف مصر / البداية والنهاية، ج7ص543، وزارة الاوقاف، قطر)

تو معلوم ہوا کہ شریعت مطہرہ میں امیر یا خلیفہ کے تقرر کا کوئی خاص طریقہ نہیں بتایا گیا بلکہ حالات و واقعات کے مطابق جو مناسب ہو اسی طریقے سے حاکم مقرر ہو سکتا ہے، نیز اگر شرعی قوانین اور آئین کی رو سے بیٹے کو باپ کی جگہ پر حاکم یا خلیفہ مقرر کرنا ممنوع یا ناجائز ہوتا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صریح طور پر یہ فرما کر منع فرما دیتے کہ باپ کے بعد بیٹا خلیفہ نہیں بن سکتا، لیکن آپ نے یوں فرمایا کہ "میں نہ اس سے منع کرتا ہوں، نہ حکم دیتا ہوں"، پھر حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو اس دور کے اکابرین نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قائم مقام کیسے منتخب کر لیا؟ انہیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ اس طرح امت ایک غلط راہ پر چل پڑے گی؟ بلکہ روایات میں اس طرح موجود ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تدفین سے فراغت کے بعد خود سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دی اور بلایا، چنانچہ ابن سعد نے امام شعبی سے روایت کیا ہے کہ :

"أَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ صَلَّى عَلَى عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ فَكَبَّرَ عَلَيْهِ أَرْبَعَ تَكْبِيرَاتٍ ،وَدُفِنَ عَلِيٌّ بِالْكُوفَةِ عِنْدَ مَسْجِدِ الْجَمَاعَةِ فِي الرَّحَبَةِ مِمَّا يَلِي أَبْوَابَ كِنْدَةَ قَبْلَ أَنْ يَنْصَرِفَ النَّاسُ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ، ثُمَّ انْصَرَفَ الْحَسَنُ بنُ عَلِيٍّ مِنْ دَفْنِهِ فَدَعَا النَّاسَ إِلَى بَيْعَتِهِ فَبَايَعُوه"۔

حضرت حسن بن علی (رضی اللہ عنہما) نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی اور چار تکبیرات کہیں، اور اس سے قبل کہ لوگ نماز فجر پڑھ کے لوٹتے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی جامع مسجد کے پاس ہی ایک کھلی جگہ میں جو قبیلہ بنی کندہ کے دروازوں کے ساتھ ہے، دفن کر دیا گیا، پھر جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کی تدفین کر کے لوٹے تو آپ نے لوگوں کو اپنی بیعت کی طرف بلایا پس لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔

(الطبقات الکبری، ج3ص36، مکتبة الخانجی القاهرة)

اس سے واضح ہو گیا کہ باپ کے بعد بیٹے کو حاکم بنانا جائز ہے یہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں۔

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ "ولی عہدی" پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"......وقد عرف ذلك من الشّرع بإجماع الأمّة على جوازه وانعقاده

إذ وقع بعهد أبي بكر رضي الله عنه لعمر بمحضر من الصّحابة وأجازوه وأوجبوا على أنفسهم به طاعة عمر رضي الله عنه وعنهم وكذلك عهد عمر في الشّورى إلى السّتّة بقيّة العشرة وجعل لهم أن يختاروا للمسلمين ففوّض بعضهم إلى بعض حتّى أفضى ذلك إلى عبد الرّحمن بن عوف فاجتهد وناظر المسلمين فوجدهم متّفقين على عثمان وعلى عليّ فآثر عثمان بالبيعة على ذلك لموافقته إيّاه على لزوم الاقتداء بالشّيخين في كلّ ما يعنّ دون اجتهاده فانعقد أمر عثمان لذلك وأوجبوا طاعته والملأ من الصّحابة حاضرون للأولى والثّانية ولم ينكره أحد منهم فدلّ على أنّهم متّفقون على صحّة هذا العهد عارفون بمشروعيّته.والإجماع حجّة كما عرف ولا يتّهم الإمام في هذا الأمر وإن عهد إلى أبيه أو ابنه لأنّه مأمون على النّظر لهم في حياته فأولى أن لا يحتمل فيها تبعة بعد مماته، خلافا لمن قال باتهامه في الولد والوالد أو لمن خصّص التّهمة بالولد دون الوالد فإنّه بعيد عن الظنّة في ذلك كلّه لا سيّما إذا كانت هناك داعية تدعو إليه من إيثار مصلحة أو توقّع مفسدة فتنتفي الظنّة في ذلك رأسا كما وقع في عهد معاوية لابنه يزيد وإن كان فعل معاوية مع وفاق النّاس له حجّة في الباب...."۔

خلاصہ: شریعت مطہرہ میں اجماع سے ولی عہدی کا جواز و انعقاد ثابت ہے کیونکہ صحابہ کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا ولی عہد مقرر فرمایا، اور اسے تمام صحابہ نے بالاتفاق منظور فرمایا، اور سب نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اطاعت اپنے اوپر واجب و لازم سمجھی۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عشرہ مبشرہ میں سے باقی رہ جانے والے چھ صحابہ کو مجلس شوریٰ کے لئے بطور ارکان نامزد فرمایا اور انہیں مسلمانوں کا امام

چلنے کا اختیار سونپ دیا۔ پھر ان میں سے بھی بعض (تین) نے اپنے اختیارات باقی (تین) کے حوالے کر دیے (اور خود دست بردار ہو گئے)۔ پھر ان تین میں سے بھی دو نے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو انتخاب خلیفہ کے لئے اختیار دے دیا، چنانچہ انہوں نے انتخاب امام کے لئے بہت جدو جہد کی اور اس سلسلے میں مسلمانوں سے فرداً فرداً مشورہ کیا اور سب کو حضرت علی و حضرت عثمان (رضی اللہ عنہما) پر متفق پایا۔ آخر کار آپ نے بیعت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجیح دی، کیونکہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں بنسبت اپنے اجتہاد کے حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کو ضروری سمجھتے تھے۔ الغرض! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بالاتفاق خلیفہ چن لیا گیا اور ان کی اطاعت لازم تسلیم کر لی گئی، اور اس موقع پر وہ صحابہ بھی موجود تھے جو حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت میں موجود تھے، لیکن اس تقرر کے خلاف کسی نے لب کشائی نہیں کی، جس سے معلوم ہوا کہ یہ سب اس تقرر پر راضی تھے اور اس کی صحت کے قائل تھے، اور یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ صحابہ کا اجماع حجت ہے۔

اور اس سلسلے میں امام (خلیفہ و حاکم) پر بدگمانی روا نہیں اگرچہ وہ اپنے باپ یا بیٹے کو ہی ولی عہد بنا جائے، جب امام کی زندگی میں مسلمانوں کے تمام امور میں اسے قابل اعتماد تسلیم کیا گیا ہے تو وہ بدرجہ اولیٰ کوئی ایسا کام کر کے فوت نہ ہو گا جو قابل اعتراض ہو۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو باپ اور بیٹے کی ولی عہدی کے سلسلے میں امام پر بدگمانی کرتے ہیں، حالانکہ کسی صورت میں بھی بدگمانی نہیں پیدا ہونی چاہئے، خصوصاً جبکہ ولی عہدی کسی مصلحت کے پیش نظر یا کسی فساد سے بچنے کی غرض سے عمل میں لائی گئی ہو، ایسی صورت میں تو کسی بدگمانی کا وہم بھی پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا گیا، کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل لوگوں کے اتفاق کی وجہ سے اس معاملہ میں ان کیلئے حجت تھا۔

(مقدمہ تاریخ ابن خلدون، الفصل الثلاثون في ولاية العهد، ج1ص262و 263، دار الفكر بيروت)

واضح رہے کہ لعل شاہ صاحب بخاری نے انہی علامہ ابن خلدون کے بارے میں لکھا ہے:

"تاریخ کے بارہ میں علامہ ابن خلدون کو محقق تسلیم کیا گیا ہے، خصوصا مقدمہ ابن خلدون بڑی

گرانمایہ کتاب ہے، تاریخی واقعات کا فلسفیانہ ربط علامہ ابن خلدون کی خصوصیات میں سے ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 67)

لہٰذا یہاں بھی حالات کے ضمن میں ولی عہدی کے ذریعے تقررِ خلیفہ کے طریق کار کو ہی اپنایا گیا، اور یہ صرف اکیلے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ نہ تھا بلکہ صحابہ کرام و تابعین عظام کی اکثریت ان کی رائے سے متفق تھی اور صرف چند صحابہ ایسے تھے جو اس رائے (یعنی باپ کے بعد بیٹے کی نامزدگی) سے متفق نہ تھے جن میں سے سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر، سیدنا عبداللہ بن عمر، سیدنا حسین اور سیدنا عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہم) صرف چار صحابہ کے نام ذکر کیے جاتے ہیں، بعض نے پانچواں نام سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی لیا ہے لیکن ان کے بیعت نہ کرنے کے ثبوت میں نہ تو ان کا کوئی قول و فعل تاریخ میں ملتا ہے اور نہ وہ ان مذکورہ چار صحابہ کے ساتھ اس سلسلے میں کہیں نظر آتے ہیں، چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سنہ 56ھ کے واقعات کے ضمن میں اسی ولی عہدی کی بیعت کے بارے میں لکھتے ہیں :

""فَلَمَّا مَاتَ زِيَادٌ، وَكَانَتْ هَذِهِ السَّنَةُ، شَرَعَ مُعَاوِيَةُ فِي نَظْمِ الْبَيْعَةِ لِيَزِيدَ وَالدُّعَاءِ إِلَيْهَا، وَعَقَدَ الْبَيْعَةَ لِوَلَدِهِ يَزِيدَ، وَكَتَبَ إِلَى الْآفَاقِ بِذَلِكَ، فَبَايَعَ لَهُ النَّاسُ فِي سَائِرِ الْأَقَالِيمِ، إِلَّا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ وَالْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَابْنَ عَبَّاسٍ فَرَكِبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى مَكَّةَ مُعْتَمِرًا..."۔

اور جب اسی سال (یعنی 56ھ میں) زیاد کی وفات ہوگئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے یزید کی باقاعدہ بیعت کے لئے کہنا شروع کیا، اس کے لئے انہوں نے تمام علاقوں کی طرف لکھ بھیجا، پس سوائے عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے باقی تمام صوبوں اور علاقوں کے لوگوں نے یہ بیعت کر لی تھی، تو اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(البداية والنهاية، ج8ص116، وزارة الاقاف، قطر)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"وَلَمَّا أُخِذت الْبَيْعَةُ لِيَزِيدَ فِي حَيَاةِ مُعَاوِيَةَ، كَانَ الْحُسَيْنُ مِمَّنِ امْتَنَعَ مِنْ مُبَايَعَتِهِ هُوَ وَابْنُ الزُّبَيْرِ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ وَابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ، ثُمَّ مَاتَ ابْنُ أَبِي بَكْرٍ وَهُوَ مُصَمِّمٌ عَلَى ذَلِكَ، فَلَمَّا مَاتَ مُعَاوِيَةُ سَنَةَ سِتِّينَ وَبُويِعَ لِيَزِيدَ، بَايَعَ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَصَمَّمَ عَلَى الْمُخَالَفَةِ الْحُسَيْنُ وَابْنُ الزُّبَيْرِ"۔

جب سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی زندگی میں یزید کی (ولی عہدی کی) بیعت لی گئی تو سیدنا حسین، سیدنا ابن زبیر، سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر، سیدنا ابن عمر اور سیدنا ابن عباس (رضی اللہ عنہم) اس بیعت سے رکے رہے، پھر سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی وفات اسی حال میں ہوگئی، لیکن جب سنہ 60ھ میں سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی وفات ہوئی اور یزید کی (خلافت کی) بیعت لی گئی تو سیدنا ابن عمر اور سیدنا ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے بیعت کرلی، جبکہ سیدنا حسین اور سیدنا ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) اپنی مخالفت پر قائم رہے"۔

(البداية والنهاية، جلد 8ص 219، وزارة الاوقاف،قطر)

مؤرخ طبری نے بھی سنہ 56ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

"وفيها دعا مُعَاوِيَة الناس إِلَى بيعة ابنه يَزِيد من بعده، وجعله ولي العهد"۔

اسی سال (یعنی 56ھ میں) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے اپنے بیٹے یزید کی بیعت کے لئے کہا اور اسے ولی عہد بنایا۔

(تاريخ الطبري، ج5ص301،دار المعارف مصر)

اور آگے لکھا ہے:

"لما مات زياد دعا مُعَاوِيَة بكتاب فقرأه عَلَى الناس باستخلاف يَزِيد، إِن حدث بِهِ حدث الموت فيزيد ولي عهد، فاستوسق لَهُ

الناس عَلَى البيعة ليزيد غير خمسة نفر"۔

جب زیاد کی وفات ہوگئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک تحریر منگوائی اور لوگوں کے سامنے پڑھی (جس میں لکھا تھا کہ) اگر مجھے موت آجائے تو یزید ولی عہد ہوگا، پس تمام لوگ یزید کی بیعت پر جمع و متفق ہو گئے، سوائے پانچ لوگوں کے۔

(تاريخ الطبري، ج5ص303،دار المعارف)

خود لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی سوائے مدینہ کے چند حضرات کے عامۃ الناس نے یزید کی بیعت کرلی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں :

"سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کرلی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

اس لئے یزید کی جانشینی کو ایک قسم کا "گناہ" اور" جرم" بنا کر پیش کرنا اور پھر افسانے تراشنا اور اس کی آڑ میں سیدنا معاویہ اور ان کے ہمنوا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعنہ زنی کرنا کہ وہ تو شروع سے اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور انہوں نے فلاں وفلاں کا راستہ روکنے کے لئے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر تحریک چلائی، ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں، ہاں اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ عمل شریعت نے حرام اور ناجائز قرار دیا ہے تو پھر الگ بات ہے، لیکن پھر بھی یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ معاملہ حرام یا ناجائز ہوتا تو پھر کیا یہ تسلیم کیا جائے کہ نعوذ باللہ اس وقت کے صحابہ کرام و تابعین کی قریب بالکلّ اکثریت نے ایک غلط اور ناجائز کام پر اتفاق کرلیا؟ اس پر مزید کلام آگے آرہا ہے۔

اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب" البدایۃ والنہایۃ" کا سنہ 56ھ کے واقعات کے تحت ایک حوالہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ :

"فَرَكِبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى مَكَّةَ مُعْتَمِرًا..." یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے مدینہ روانہ ہوئے۔

(البداية والنهاية، ج 8ص 116، وزارة الاقاف، قطر)

اس سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ حضرت معاویہ ؓ نے ولی عہدی کی بیعت سے الگ رہنے والے ان چار یا پانچ حضرات سے مذاکرت کے لئے جو سفر کیا تھا وہ "عمرہ" کا سفر تھا، نہ کہ "حج" کا، اور یہ سفر سنہ 56ھ میں ہوا تھا نہ کہ سنہ 44ھ میں، ہاں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت معاویہ ؓ کا یہ سفر سنہ 56ھ میں ہوا تو اس میں ذکر ہے کہ اس سفر کے دوران جن حضرات کے ساتھ ان کی بات چیت ہوئی ان میں حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر ؓ بھی تھے، جبکہ کتب تاریخ میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر ؓ کی وفات سنہ 56ھ سے پہلے ہو چکی تھی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر ؓ کے سن وفات کے بارے میں بھی مختلف اقوال مذکور ہیں، مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ لکھتے ہیں :

" قال ابن سعد وغير واحد: مات سنة ثلاث وخمسين. وقال يحيى بن بكير: سنة أربع. وقال أبو نعيم: سنة ثلاث. وقيل خمس، وقيل ست، وقال أبو زرعة الدمشقيّ: مات سنة قدم معاوية المدينة لأخذ البيعة ليزيد، وماتت عائشة بعده بسنة، سنة تسع وخمسين. وقال ابن حبّان: مات سنة ثمان. وقال البخاري :مات قبل عائشة وبعد سعد.."۔

ابن سعد وغیرہ کا قول ہے کہ ان کی وفات سنہ 53ھ میں ہوئی، یحییٰ بن بکیر کا کہنا ہے کہ سنہ 54ھ میں ہوئی، ابونعیم نے سنہ 53ھ بتائی ہے، ایک قول 55ھ کا بھی ہے، ابوزرعۃ دمشقی نے کہا کہ آپ کی وفات اس سال ہوئی جس سال حضرت معاویہ ؓ یزید کی بیعت لینے کے لئے مدینہ تشریف لائے، اور حضرت عائشہ ؓ کی وفات آپ کے ایک سال بعد سنہ 59ھ میں ہوئی تھی، ابن حبان کا قول بھی یہی ہے کہ ان کی وفات سنہ 58ھ میں ہوئی، امام بخاری نے کہا کہ آپ کی وفات سیدنا عائشہ ؓ سے پہلے اور حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کے بعد ہوئی تھی..۔

(الاصابة في تمييزالصحابة، ج6ص515و 516، دارهجر، القاهرة)

حافظ ابن حجر نے امام بخاری کے جس قول کا حوالہ دیا ہے وہ (التاريخ الكبير، ج5ص242،

دار الكتب العلمية بيروت) پر موجود ہے، اس میں ذکر ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی وفات حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بعد ہوئی تھی، اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات کے بارے میں بھی مختلف اقوال مذکور ہیں، ابن عبدالبر قرطبی لکھتے ہیں :

"واختلف في وقت وفاته. فَقَالَ الواقدي: توفي سنة خمس وخمسين وهو ابن بضع وسبعين سنة- وَقَالَ أبو نعيم: مات سعد بن أبي وقاص سنة ثمان وخمسين، وَقَالَ الزبير، والحسن بن عثمان، وعمرو بن علي الفلاس: توفي سعد بن أبي وقاص سنة أربع وخمسين، وهو ابن بضع وسبعين سنة- وَقَالَ الفلاس: وهو ابن أربع وسبعين سنة- وذكر أبو زرعة، عن أحمد بن حنبل قَالَ: توفي سعد بن أبي وقاص، وهو ابن ثلاث وثمانين سنة في إمارة معاوية بعد حجته الأخرى"-

خلاصہ: حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات کب ہوئی؟ اس میں اختلاف ہے، واقدی نے کہا کہ آپ کی وفات سنہ 55ھ میں ہوئی، ابونعیم کا کہنا ہے کہ آپ سنہ 58ھ میں فوت ہوئے، زبیر، حسن بن عثمان اور عمرو بن الفلاس کے مطابق آپ کا سن وفات 54ھ ہے، اور ابوزرعۃ نے امام احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے کہ سعد بن ابی وقاص کی وفات تراسی سال کی عمر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دوسرے حج کے بعد ہوئی تھی۔

(الاستيعاب في معرفة الاصحاب، ج1ص366و367، دار الفكر بيروت)

تنبیہ

مندرجہ بالا حوالے میں امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا جو قول بیان ہوا ہے اس میں ایک بات توجہ طلب ہے، اس میں ہے کہ "حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دوسرے حج کے بعد ہوئی"، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک نہیں بلکہ دو حج کیے تھے، چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے :

"وَقَالَ ابْنِ وَهْبٍ عَنْ يُونُسَ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: حج معاوية بالناس فِي أَيَّامِ خِلَافَتِهِ مَرَّتَيْنِ، وَكَانَتْ أَيَّامُهُ عِشْرِينَ سَنَةً إِلَّا شَهْرًا. وَقَالَ أَبُو بَكْرِ بْنُ عَيَّاشٍ: حَجَّ بِالنَّاسِ مُعَاوِيَةُ سَنَةَ أَرْبَعٍ وَأَرْبَعِينَ، وَسَنَةَ خَمْسِينَ- وَقَالَ غَيْرُهُ :سَنَةَ إِحْدَى وَخَمْسِينَ فَاللَّهُ أَعْلَمُ"۔

امام زہری سے مروی ہے کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے اپنے دور خلافت میں دو بار حج کیا، اور آپ کی خلافت کا زمانہ ایک ماہ کم بیس سال تھا، ابو بکر بن عیاش نے کہا کہ: حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے پہلا حج سنہ 44ھ میں کیا اور پھر دوسرا حج سنہ 50ھ میں کیا، ایک قول یہ بھی ہے کہ (دوسرا حج) سنہ 51ھ میں کیا تھا، واللہ اعلم۔

(البداية والنهاية، ج8ص193، وزارة الاوقاف قطر)

ابن الاثیر الجزری نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وفات کے حوالے سے لکھا ہے :

"وتوفي سعد بن أَبِي وقاص سنة خمس وخمسين، قاله الواقدي، وقال أَبُو نعيم الفضل بْن دكين: مات سنة ثمان وخمسين، وقال الزبير، وعمرو بْن عَلِيٍّ، والحسن بْن عثمان: توفي سعد سنة أربع وخمسين"۔

واقدی کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 55ھ میں ہوئی، ابو نعیم فضل بن دکین کے قول کے مطابق آپ سنہ 58ھ میں فوت ہوئے، زبیر، عمرو بن علی اور حسن بن عثمان کا کہنا ہے کہ آپ کی وفات سنہ 54ھ میں ہوئی تھی۔

(اسد الغابة، ج2ص452، دار الكتب العلمية بيروت)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جن کی وفات سنہ 58ھ میں ہوئی، اور لکھتے ہیں:

"وَكَانَتْ وَفَاتُهُ فِي هَذَا الْعَامِ فِي قَوْلِ كَثِيرٍ مِنْ عُلَمَاءِ التَّارِيخِ"۔

مؤرخین کی کثیر تعداد کا کہنا ہے کہ ان کی وفات اسی سال (یعنی 58ھ) میں ہوئی۔

(البداية والنهاية، وفيات سنة 58هـ ، ج8ص130، وزارة الاوقاف قطر)

جبکہ لعل شاہ صاحب نے نہ جانے کس بنیاد پر لکھ دیا ہے کہ :

"سنہ 55ھ کا قول زیادہ صحیح ہے"

(استخلاف یزید، صفحہ 282)

اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے جنازے میں شرکت فرمائی تھی، اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 55ھ میں ہوئی تھی لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 55ھ میں ہوئی۔ (حوالہ بالا)

جبکہ آپ نے دیکھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 55ھ میں ہونے کا قول بھی اختلافی ہے، ایک قول سنہ 58ھ کا بھی ہے اور ایک قول اس سال وفات ہونے کا بھی ہے جس سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے تشریف لائے تھے یعنی 56ھ۔

نیز اس سے بھی صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وفات تک (باقرار لعل شاہ صاحب سنہ 55ھ تک) زندہ تھے، اس سے قطعی طور یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ ان کی وفات بھی اسی سال ہو گئی تھی؟

قصہ مختصر یہ کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی وفات کے بارے میں بھی ایک ہی قول نہیں بلکہ امام ابوزرعہ رازی کے قول میں صراحت ہے کہ ان کی وفات اس سال ہوئی جس سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کی ولی عہدی پر بات کرنے کے لئے مکہ و مدینہ تشریف لائے تھے (اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صرف ایک بار سنہ 56ھ میں ہی تشریف لائے تھے) اور امام ابن حبان کے قول میں ان کی وفات 58ھ میں بیان ہوئی ہے، لہٰذا لعل شاہ صاحب کا یہ طریق انتہائی نامناسب ہے کہ جہاں تو انہوں نے اپنے مفروضے کو درست ثابت کرنا ہوتا ہے تو وہ جمہور مؤرخین کی بات کو چھوڑ کر ایک شاذ قول کو صحیح ترین ثابت کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جیسے انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کا سال کھینچ

تان کرسنہ 44ھ بنانے کی کوشش کی ہے، بلکہ حسب ضرورت وہ تمام مؤرخین کی تحقیق کو بیک جنبش قلم غلط لکھ کر اپنی نئی تحقیق کے درست ہونے پر بھی اصرار کرتے نظر آتے ہیں، اور جہاں ان کے مفروضے کے خلاف کوئی قول مذکور ہوتو وہ اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

الغرض! سید لعل شاہ صاحب نے اپنے سنہ 44ھ والے مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے جو بنیاد کھڑی کی تھی کہ چونکہ یزید کی جانشینی کا قضیہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کا ہے، اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات (ایک شاذ قول کے مطابق) سنہ 44ھ میں ہوئی، نیز یزید کی ولی عہدی کی تجویز چونکہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے دی تھی، اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 50ھ میں ہوگئی تھی، لہٰذا ثابت ہوا کہ یزید کی ولی عہدی کا واقعہ سنہ 44ھ کا ہے، یہ بنیاد ہی ہوائی مفروضوں پر کھڑی ہے، کیونکہ مؤرخین کی اکثریت کے نزدیک نہ ہی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 44ھ میں ہوئی اور نہ ہی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ یہ تجویز سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ نے دی تھی۔

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ابتدا سے ہی یزید کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے؟

مؤرخین نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ شروع میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی اپنی ذاتی رائے اور سوچ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرح چھ حضرات پر مشتمل ایک مجلس بنانے کی تھی کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بنالیا جائے، ان میں یزید کا نام اشارتاً وکنایۃً بھی شامل نہ تھا، چنانچہ :

"حضرت قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ مجھے زیاد نے ایک کام سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا، جب میں اپنا کام نمٹا چکا تو میں نے عرض کی: یا امیر المؤمنین! آپ کے بعد خلیفہ کون ہوگا؟"، آپ کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا: یکون بین جماعۃ۔ کہ میرے بعد خلافت ایک جماعت کے درمیان ہوگی اور لوگ چن لیں گے (پھر خود ہی اس جماعت کے یہ نام گنائے) قریش کے شریف النفس آدمی سعید بن العاص، حیاء و پرہیزگاری اور سخاوت میں قریش کے جوان عبداللہ بن عامر، شریف پیشوا حسن بن علی، قاری قرآن، عالم دین اور حدود

شرعیہ کے پابند مروان بن الحکم، مرد فقیہ عبداللہ بن عمر اور ذہین و ہوشیار عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم "۔

(تاريخ ابی زرعة الدمشقی، ص 300، دار الكتب العلمية بيروت / البداية والنهاية، ج 8 ص 361، وزارة الاوقاف قطر)

غور فرمائیں! ان چھ ناموں میں نہ یزید کا نام ہے اور نہ ہی زیاد کا، جس کے بارے میں لعل شاہ صاحب نے افسانہ گھڑا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کا راستہ روکنے کے لئے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر یہ چال چلی (مفہوم یہی ہے)، اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان چھ ناموں میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا نام بھی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جلیل القدر تابعی حضرت قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے یہ ملاقات سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سے پہلے کی ہے (جو کہ جمہور مؤرخین کے نزدیک سنہ 49ھ میں ہوئی) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم سنہ 49ھ تک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں یزید کی جانشینی کا خیال بھی نہیں تھا، یزید کی ولی عہدی کی بات سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہی سامنے آئی، جس کا اقرار خود لعل شاہ صاحب کو بھی ہے لیکن وہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی سن وفات کھینچ کر سنہ 44ھ میں لانا چاہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ایک شاذ قول کے علاوہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

کیا یزید کی نامزدگی کسی ذاتی مفاد کے تحت کی گئی؟

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمان جس باہمی خانہ جنگی اور آپس کی جس خونریزی سے گذرے تھے اس کے پیش نظر ہر دور اندیش اور مدبر حکمران کی طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی چاہتے تھے کہ ایسے اقدام کیے جائیں کہ ان کے بعد خانہ جنگی کا خطرہ نہ رہے اور پھر کوئی بحران نہ پیدا ہو جائے، اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی وفات کے بعد بدلتے حالات کے پیش نظر انہوں نے اپنے رفقاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مشاورت سے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا تا کہ ان کے بعد اس مسئلہ پر ایک بار پھر مسلمانوں کی تلواریں جمل و صفین کی طرح آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بے نیام نہ ہونے پائیں، اب رہا یہ سوال کہ اپنے بیٹے کو ہی خلافت کے لئے نامزد کیوں کیا؟ کسی اور کو کیوں نہ کیا؟ تو اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالرحمن بن محمد ابن خلدون الاشبیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"والّذي دعا معاوية لإيثار ابنه يزيد بالعهد دون من سواه إنّما هو مراعاة المصلحة في اجتماع النّاس واتّفاق أهوائهم باتّفاق أهل الحلّ والعقد عليه حينئذ من بني أميّة إذ بنو أميّة يومئذ لا يرضون سواهم وهم عصابة قريش وأهل الملّة أجمع وأهل الغلب منهم فآثره بذلك دون غيره ممّن يظنّ أنّه أولى بها وعدل عن الفاضل إلى المفضول حرصا على الاتّفاق واجتماع الأهواء الّذي شأنه أهمّ عند الشّارع"۔

خلاصہ : جو چیز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دوسروں کی جگہ یزید کو ولی عہد بنانے کا محرک بنی، وہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی، بنو امیہ کے ارباب حل و عقد اس پر متفق تھے، اس وقت وہ اپنے علاوہ کسی پر راضی نہیں تھے، وہ قریش کا سب سے مضبوط گروہ تھے اور اہل ملت کی اکثریت انہی سے تعلق رکھتی تھی، اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ترجیح دی اور افضل کی جگہ غیر افضل کو چنا، یہ اتحاد اور اتفاق رائے کے لئے ہی کیا جس کی شریعت میں بہت اہمیت ہے۔

(مقدمة تاريخ ابن خلدون، ج1ص263، دارالفكر بيروت)

سید لعل شاہ بخاری صاحب نے غالباً اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو فاسق و فاجر جانتے ہوئے اس کی نامزدگی کیسے کردی تھی؟ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (م 1377ھ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"ہاں ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت خفیہ طور پر فسق و فجور میں مبتلا ہو، مگر ان کو اس کے فسق و فجور کی اطلاع نہ ہو یا یہ جد و جہد ارا کین خاندان کی طرف سے کی گئی ہو اور یزید بھی اس میں کوشاں رہا ہو الخ (مکتوبات ص 266 حصہ اول)۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: کیوں نہ کہا جائے کہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے نامزد نہیں کیا بلکہ خود یزید اور اس کے اعوان نے اس کے لئے کوشش کی تھی (یہ لوگ متقی نہ تھے ملوکیت پسند تھے) عام

مسلمان بالخصوص اہل حجاز اس کے خلاف تھے(مکتوبات ص 250 حصہ اول)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 289)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے اپنا تبصرہ یوں کیا ہے کہ:

"راقم السطور کہتا ہے کہ یہ احتمال اقرب الی الحق ہے کہ یہ نامزدگی حضرت معاویہ ﷛ کی طرف سے ہوئی، لیکن اس وقت یزید معلن بالفسق نہیں تھا، کیونکہ قضیہ نامزدگی سنہ 44ھ میں پیش آیا اور اس وقت یزید المولود سنہ 26ھ یا سنہ 27ھ جوانی کے ابتدائی مرحلہ میں تھا اور دمشق میں بھی تقریباً نو وارد تھا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 289)

<u>تبصرہ:</u>

ہم تو یہی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قضیہ ولی عہدی کے وقت یزید کے فسق کے افسانے چھیڑنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ پھر اگر اس وقت یزید کے فسق و فجور کا کوئی اتا پتا نہ تھا تو سیدھا یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ" اس وقت اس کے فسق کا کوئی ثبوت نہیں ملتا" ؟ یہ کیوں کہا جاتا کہ"ممکن ہے وہ خفیہ طور پر فسق و فجور میں مبتلا ہو، یا وہ معلن بالفسق نہیں تھا" ؟ ہمارے خیال میں اس کی وجہ وہی غلط فہمی یا مغالطہ ہے کہ ولی عہدی کی بیعت سے جن چار یا پانچ حضرات نے اختلاف کیا تھا اس کا سبب یزید کا ذاتی کردار یا اس کا فسق و فجور ہی تھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان چاروں یا پانچوں حضرات کا یہ اختلاف یزید کے ذاتی کردار سے متعلق نہ تھا بلکہ ولی عہدی والے طریق کار سے متعلق تھا، ان کا کہنا یہ نہ تھا کہ ہم یزید کی بیعت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ فاسق و فاجر یا نالائق و نااہل ہے، بلکہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں اس کی بیعت میں تامل اس لئے ہے کہ جس طریقے سے اس کو خلیفہ نامزد کیا گیا ہے سرے سے وہ طریقہ ہی غلط ہے،" ہرقلیۃ" و" کسرویۃ" یعنی رومی و فارسی طریقہ ہے، پھر جب اس سلسلہ میں سیدنا معاویہ ﷛ خود مدینہ منورہ تشریف لائے اور ان حضرات سے اس معاملہ میں گفتگو کی تو اُن سے بھی اِن حضرات نے اختلاف ولی عہدی والے طریق کار کے نکتہ پر ہی کیا، یزید کے ذاتی فسق و عدل کا نام اشارتاً بھی کوئی اپنی زبان پر نہ لایا۔

اگر کسی کے پاس کوئی ایسا مستند ثبوت ہے کہ ان حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد یزید کا ذاتی

کرداریا اس کا فسق و فجور بتایا ہو تو وہ سامنے آنا چاہئے، لعل شاہ صاحب نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ (ان کے خیال میں) یزید کی نامزدگی سنہ 44ھ میں مانی جائے تو اس وقت یزید کی عمر تقریباً 18 سال بنتی ہے، اور یہ حضرات یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت تک یزید کا فسق و فجور ظاہر نہ تھا، تو پھر ان موشگافیوں کی کیا ضرورت ہے کہ "ممکن ہے وہ خفیہ طور پر فسق و فجور میں مبتلا ہو" یا "وہ علی الاعلان فسق نہیں کیا کرتا تھا"؟ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اس وقت تک اس کے فسق کی کوئی دلیل یا ثبوت نہیں؟

یہ تو بات تھی یزید کے لئے ولی عہدی کی بیعت کے موقع کی (جو لعل شاہ صاحب کے نزدیک سنہ 44ھ کا واقعہ ہے لیکن اکثر مؤرخین کے نزدیک سنہ 56ھ یا کم از کم سنہ 50ھ کے بعد کے کسی زمانے کا واقعہ ہے) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سنہ 60ھ میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب موقع آیا یزید کی بیعت خلافت کا، تو اُس وقت تک ولی عہدی سے اختلاف کرنے والے ان حضرات میں سے ایک یعنی سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما تو جنت کو سدھار چکے تھے، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور بعض مؤرخین کے مطابق سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہر دو نے یزید کی بیعت کر لی تھی، باقی صرف دو یعنی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہی ابھی تک اپنی رائے پر قائم تھے، جب ان سے خلافت یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو بیعت انہوں نے اگرچہ اس وقت بھی نہ کی لیکن اپنے اس تخلف کی بنیاد یزید کے فسق و فجور کو اب بھی قرار نہیں دیا، بلکہ جب اُس وقت کے گورنر مدینہ ولید بن عتبہ نے ان دونوں بزرگوں کو بلا کر ان کے سامنے یزید کی بیعت کی بات رکھی تو عام روایات کے مطابق سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے تو یہ فرمایا کہ :

> "مجھ جیسا آدمی چھپ کر بیعت نہیں کیا کرتا اور پھر تم بھی تو میری اس خفیہ بیعت کو کافی نہ سمجھو گے بلکہ علانیہ کا بھی مطالبہ کرو گے، اس لئے جب تم اور لوگوں کو بیعت کے لئے بلاؤ تو ہمیں بھی بلا بھیجنا تا کہ معاملہ ایک ہی دفعہ میں نمٹ جائے"۔

(تاریخ الطبري، ج5ص339تا 341، دار المعارف)

رہے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تو وہ ایک دن کی مہلت لے کر راتوں رات مکہ مکرمہ نکل گئے، اس کے سوا کچھ اور انہوں نے بھی نہ کہا نہ کیا۔

(ایضاً)

لیکن ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ گورنرِ مدینہ کی طرف سے طلبِ بیعت کے جواب میں دونوں ہی بزرگوں نے یہ فرمایا تھا کہ :

"مثلنا لا يبايع سراً ولكنا نبايع على رؤس الناس اذا اصبحنا فرجعا إلى بيوتهما، وخرجا من ليلتهما إلى مكة"۔

کہ ہم جیسے آدمی خفیہ بیعت نہیں کیا کرتے ، ہم تو بوقت صبح لوگوں کے سامنے (علی الاعلان) بیعت کریں گے۔ وہاں سے یہ حضرات اپنے گھروں کو لوٹے، پھر (کچھ اور سوچ کر صبح کا انتظار کیے بغیر) راتوں رات ہی مکہ مکرمہ کی طرف نکل گئے۔

(الاستيعاب في معرفة الاصحاب، ج1ص237، دار الفكر بيروت)

اور آگے چلیں تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مدینہ منورہ سے مکہ جانے اور پھر وہاں سے عراق کی طرف خروج کے دوران بھی کسی موقع پر ان سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے یزید کے ذاتی کردار یا اس کے فسق و فجور کا کوئی تذکرہ کیا ہو یا اپنے اختلاف کی بنیاد اسے قرار دیا ہو، پورے ذخیرہ تاریخ میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی، خود لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"حضرت حسین ابن علی (رضی اللہ عنہما) نے یزید کی بیعت سے کیوں انکار کیا اور کیوں خروج پر آمادہ ہوئے، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ میں اس امر کو واضح کر دیا جو انہوں نے میدان کربلا میں اپنے ساتھیوں کے سامنے دیا تھا جسے بہت سے اہل السیر والتواریخ نے کتابوں میں نقل کیا ہے..."

پھر لعل صاحب نے متعدد کتابوں (احياء العلوم للغزالي، تهذيب تاريخ ابن عساكر، الروض الباسم اور تاريخ الاسلام للذهبى) کے حوالے سے اس خطبے کے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا اردو ترجمہ یوں کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"....میرے ساتھ جو معاملہ درپیش ہوا ہے تم دیکھ رہے ہو دنیا بدل گئی ہے اور منکرات کا ظہور ہوا، اس کے معروف نے پشت پھیر لی، جب کہ اس میں تلچھٹ کے سوا کیوں نہ رہا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق عمل نہیں کیا جاتا اور باطل سے روکا نہیں جاتا، مومن اللہ کی لقاء میں رغبت

رکھتا ہے اور تحقیق میں موت کو سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو ندامت اور نحوست سمجھتا ہوں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 402و403)

قطع نظر اس سے کہ اس بات کا راوی "ابومخنف لوط بن یحییٰ" ہے (دیکھیں: تاریخ ابن عساکر، ج14ص217، دار الفکر) یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ بقول لعل شاہ صاحب، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے میدان کربلا میں آخری وقت اپنے ساتھیوں کے سامنے جو خطبہ دیا تھا، اس میں بھی کہیں یہ نہیں فرمایا کہ میں یزید کے خلاف اس لئے نکلا ہوں کہ وہ فاسق وفاجر اور شرابی ہے۔

بلکہ اس کے برعکس صحیح روایت بتاتی ہے کہ مقام کربلاء میں جب ان کا ابن زیاد کے آدمیوں سے آمنا سامنا ہوتا ہے اور مذاکرات کا دور چلا تو کتب تاریخ میں یہ بات ملتی ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے جو تجاویز رکھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ:

"فناشدهم الْحُسَيْن اللَّه والإسلام أن يسيروه إِلَى أَمِير الْمُؤْمِنِين، فيضع يده فِي يده"۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے انہیں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر فرمایا کہ مجھے امیر المؤمنین کے پاس جانے دو، میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔

(تاریخ طبری، عن حُصین بن عبدالرحمن بسند صحیح، ج5،ص392، دارالمعارف مصر)

تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یزید کی بیعت نہ کرنے کا سبب اس کا فسق وفجور یا ذاتی کردار تھا تو اب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر رضامندی کیوں فرمائی؟

بہرحال! اس پر مزید کلام آگے آئے گا، سردست صرف یہ غلط فہمی دور کرنا ہے کہ جن چار یا پانچ صحابہ نے یزید کی ولی عہدی کی تجویز سے اختلاف کیا یا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اس کی بیعتِ خلافت سے الگ رہے ان کے اس اختلاف کا سبب یزید کا ذاتی کردار یا اس کا فسق وفجور ہرگز نہ تھا، ورنہ یہ بات ان کی زبان سے کہیں تو منقول ہوتی، لہٰذا اگر لعل شاہ صاحب کی یہ بات درست مانی جائے کہ سنہ 44ھ تک یزید کا فسق ظاہر نہ تھا تو پھر انہیں جواب دینا چاہئے تھا کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اس کی بیعت کیوں نہیں

کی تھی؟اور اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت بھی یزید فاسق ہی تھا لیکن اس کے والد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کے فسق کی کوئی خبر نہ تھی بلکہ وہ خفیہ طور پر فسقیہ کام کیا کرتا تھا تو ایسا دعویٰ کرنے والے کو یہ بتانا ہوگا کہ اس کے اس خفیہ فسق کا اسے کیسے علم ہوا؟، اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر دمشق میں موجود سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے بیٹے کے فسق کی بھنک نہ پڑسکی تو وہاں سے کئی سو میل دور مدینہ میں بیٹھے چار یا پانچ حضرات کو کیسے خبر ہوگئی؟ اب یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ ان حضرات کی مخالفت کی وجہ یزید کا فسق و فجور یا اس کا ذاتی کردار نہیں تھا، بصورت دیگر حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ اس اعتراض کو نہیں اٹھا سکتی کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کے فسق و فجور کی خبر رکھتے ہوئے اس کی نامزدگی کر دی تھی۔

درست بات یہی ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہو کر جن لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کو قبول کیا، ان کا موقف بھی خلاف شریعت نہ تھا، جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا گیا اس وقت اس کا عاقل، بالغ، مسلمان، صحت مند اور قریشی ہونا ایسے حقائق ہیں جن پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، اس وقت تک اس کا کسی قسم کی بدکاری یا فسق و فجور میں ملوث ہونے کا کوئی قابل اعتماد ثبوت بھی نہیں، اور ایسی ہی چیزیں ہیں جن کا ایک حاکم یا خلیفہ میں ہونا ضروری ہے، پھر وہ جہادی مہمات کا قائد اور امیر حج بھی رہ چکا تھا جس سے اس کی جنگی اور انتظامی صلاحیت بھی کسی نہ کسی درجہ میں ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس وقت اس کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے خلافت کے لئے اس کی اہلیت مان لینے کی گنجائش موجود تھی۔

لعل شاہ صاحب نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا ہے تو انہی کا ایک حوالہ ہم بھی نقل کیے دیتے ہیں جو لعل شاہ صاحب کی اس تحقیق کو غلط ثابت کرتا ہے کہ یزید کی ولی عہدی کا قضیہ سنہ 44ھ کا ہے، مولانا مدنی لکھتے ہیں :

> "یزید کو متعدد معارک جہاد میں بھیجنے اور جزائر بحر ابیض اور بلاد ہائے ایشیائے کوچک کے فتح کرنے حتیٰ کہ خود استنبول (قسطنطنیہ) پر بڑی بڑی افواج سے حملہ کرنے وغیرہ میں آزمایا جا چکا تھا، تاریخ شاہد ہے کہ معارک عظیمہ میں یزید نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اس کے فسق و فجور کا علانیہ ظہور ان کے سامنے نہ ہوا تھا..."۔
>
> (مکتوبات شیخ الاسلام، ج 1 ص 267، مطبع معارف اعظم گڑھ)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کی ولی عہدی کا قضیہ یزید کی سرکردگی میں جزائر بحر ابیض اور قسطنطنیہ پر حملوں کے بعد پیش آیا تھا، اس سے بھی لعل شاہ صاحب کا یہ مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ یزید کی نامزدگی سنہ 44ھ میں ہوئی تھی، کیونکہ یزید کی سرکردگی میں جو مہمات بھیجی گئیں وہ سب سنہ 44ھ کے بعد کی ہیں، مثلاً سنہ 49ھ کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"فِيهَا غَزَا يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ بِلَادَ الرُّومِ حَتَّى بَلَغَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَمَعَهُ جَمَاعَةٌ مِنْ سَادَاتِ الصَّحَابَةِ، مِنْهُمُ ابْنُ عُمَرَ، وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَابْنُ الزُّبَيْرِ، وَأَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ- وَقَدْ ثَبَتَ فِي " صَحِيحِ الْبُخَارِيِّ " أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:أَوَّلُ جَيْشٍ يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ ،فَكَانَ هَذَا الْجَيْشُ أَوَّلَ مَنْ غَزَاهَا"۔

سنہ 49ھ میں ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے یزید نے بلاد روم پر چڑھائی کی یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک جا پہنچے اور ان کے ساتھ معزز صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی جن میں ابن عمر، ابن عباس، ابن زبیر، ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) بھی شامل تھے، اور صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلا وہ لشکر جو قیصر روم کے شہر پر حملہ آور ہوگا ان کی مغفرت کردی گئی، پس یہی وہ پہلا لشکر تھا جس نے اس شہر پر حملہ کیا۔

(البداية والنهاية، ج 8ص 31، وزارة الاوقاف قطر)

جبکہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس بات کا ذکر سنہ 50ھ کے واقعات میں کیا ہے:

"وَفِيهَا غَزْوَةُ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ، كَانَ أَمِيرُ الْجَيْشِ إِلَيْهَا يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ، وَكَانَ مَعَهُ وُجُوهُ النَّاسِ، وَمِمَّنْ كَانَ مَعَهُ أَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ"۔

اسی سال (یعنی سنہ 50ھ میں) غزوہ قسطنطنیہ ہوا، اس لشکر کے امیر حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے بیٹے یزید تھے، اور ان کے ساتھ بہت سے سرکردہ لوگ تھے جن میں ایک حضرت ابو ایوب

انصاری ﷛ بھی تھے۔

(تاريخ الاسلام للذهبي، ج 2ص 390، دارالغرب الاسلامي بيروت)

بلکہ یہ بھی منقول ہے کہ سیدنا حسین بن علی (﵄) بھی اس غزوہ میں یزید کی زیر امارت شریک ہوئے، چنانچہ حافظ ابن کثیر ﷫ نے لکھا ہے :

"وَلَمَّا تُوُفِّيَ الْحَسَنُ كَانَ الْحُسَيْنُ يَفِدُ إِلَى مُعَاوِيَةَ فِي كُلِّ عَامٍ فَيُعْطِيهِ وَيُكْرِمُهُ، وَقَدْ كَانَ فِي الْجَيْشِ الَّذِينَ غَزَوُا الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ مَعَ ابْنِ مُعَاوِيَةَ يَزِيدَ"۔

حضرت حسن ﷛ کی وفات کے بعد سیدنا حسین ﷛ حضرت معاویہ ﷛ کے پاس ہر سال آیا کرتے تھے اور حضرت معاویہ ﷛ آپ کو عطاء و اکرام سے نوازتے، آپ حضرت معاویہ ﷛ کے بیٹے یزید کے ساتھ اس لشکر میں بھی شریک تھے جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔

(البداية والنهاية، ج8ص219، وزارة الاوقاف قطر)

اس بات کا ذکر حافظ ابن عساکر ﷫ نے بھی کیا ہے:

"ووفد على معاوية وتوجه غازيا إلى القسطنطينية في الجيش الذي كان أميره يزيد بن معاوية"۔

(حضرت حسین ﷛) حضرت معاویہ ﷛ کے پاس آئے اور اس لشکر میں جہاد قسطنطنیہ کے لئے روانہ ہوئے جس لشکر کے امیر یزید بن معاویہ تھے۔

(تاريخ مدينة دمشق، ج14ص111، دار الفكر بيروت)

نیز مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ غزوۂ قسطنطنیہ کے دوران جب حضرت ابوایوب انصاری ﷛ بیمار ہوگئے تو یزید نے ان کی بیمار پرسی کی اور آپ نے یزید کو بعض وصیتیں کیں، اور جب آپ اسی غزوہ میں فوت ہوگئے تو یزید نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، چنانچہ حافظ ابن کثیر ﷫ نے سیدنا ابوایوب انصاری ﷛ کے تعارف میں لکھا ہے:

"وَكَانَ فِي جَيْشِ يَزِيدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ وَإِلَيْهِ أَوْصَى، وَهُوَ الَّذِي صَلَّى عَلَيْهِ"۔

(البداية والنهاية، ج 8ص 79، وزارة الاوقاف قطر)

نوٹ : یزید کی سرکردگی میں غزوۂ قسطنطنیہ کس سال ہوا؟ اس بارے میں کتب تاریخ میں سنہ 49ھ تا 52ھ کے اقوال ملتے ہیں (لعل شاہ صاحب 52ھ بتاتے ہیں)، لیکن کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ یہ غزوہ سنہ 49ھ سے پہلے ہوا تھا، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَقَدْ كَانَ يَزِيدُ أَوَّلُ مَنْ غَزَا مَدِينَةَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ فِي سَنَةِ تِسْعٍ وَأَرْبَعِينَ. فِي قَوْلِ يَعْقُوبَ بْنِ سُفْيَانَ. وَقَالَ خَلِيفَةُ بْنُ خَيَّاطٍ :سَنَةَ خَمْسِينَ "۔

یزید سب سے پہلے شخص تھے جنہوں نے قسطنطنیہ شہر پر حملہ کیا (یعنی جن کی سرکردگی میں پہلا حملہ ہوا)، اور یہ یعقوب بن سفیان کے قول کے مطابق سنہ 49ھ کا واقعہ ہے اور خلیفہ بن خیاط کا کہنا ہے کہ یہ سنہ 50ھ کا واقعہ ہے۔

(البداية والنهاية، ج8ص323، وزارة الاوقاف قطر)

اب قابل غور بات یہ ہے کہ اگر لعل شاہ صاحب کی "تحقیق انیق" کے مطابق یزید کی ولی عہدی کا قضیہ سنہ 44ھ میں شروع ہوا اور ان کے بقول اسی سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لئے تشریف لے گئے اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سمیت ان چار حضرات سے ان کی بات چیت ہوئی جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس تجویز سے اختلاف کیا تھا، تو کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کے سات آٹھ سال بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دوسرے سادات صحابہ اسی یزید کی امارت میں جہاد کے لئے تشریف لے جاتے ہیں؟ یا اس بات کی کوئی دلیل محکم ہے کہ یزید کی سرکردگی میں جو لشکر قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا تھا اور جس میں سیدنا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات بھی ہوئی تھی، وہ واقعہ سنہ 44ھ سے پہلے کا ہے؟

لعل شاہ صاحب کی مستدلہ ایک حکایت کا جائزہ

لعل شاہ صاحب بخاری نے اپنے اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کی تحریک سنہ 44ھ میں شروع کی تھی، ایک حکایت اور صحیح بخاری کی دو روایات

سے بھی استدلال کیا ہے، چنانچہ" ایک حکایت سے استناد" کا عنوان دے کر لکھتے ہیں:

"انہی ایام سے ایک حکایت وابستہ ہے جسے المحب الطبری نے الریاض النضرۃ میں نقل فرمایا ہے، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (جو عشرہ مبشرہ کے فرد ہیں) کے بیٹے نے روایت کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان ابن الحکم کو لکھا کہ وہ ان کے بیٹے یزید کے لئے ولایت عہد کی بیعت لیں۔ رجل شامی نے (جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خط لے کر آیا تھا) دریافت کیا کہ تجھے کون سی چیز روکے ہوئے ہے کیوں بیعت لینے میں دیر کر رہے ہو؟ مروان نے کہا کہ مجھے سعید بن زید کی انتظار ہے کہ وہ سید اہل البلد ہے جب وہ بیعت کرلیں گے تو سب بلا تردد بیعت کرلیں گے، اس رجل شامی نے کہا کہ انہیں میں بلا لاتا ہوں (حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ مدینے سے باہر مقام عقیق میں رہائش رکھتے تھے) چنانچہ وہ شامی حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، راوی حدیث ابن سعید فرماتے ہیں کہ میں اپنے باپ کے پاس تھا، شامی نے کہا چلئے اور بیعت کیجئے، حضرت سعید نے فرمایا تو چلا جا میں عنقریب آؤں گا اور بیعت کرلوں گا (شاید حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے تلخ لہجے میں جواب دیا ہو جس سے انکار کا پہلو بھی نکل سکتا تھا کہ اس شامی نے نہایت برافروختہ ہو کر کہا) کہ چلئے ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا، حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو میری گردن مارتا ہے؟ والله انك لتدعوني الى اقوام ان قاتلتُهم على الاسلام ۔تو مجھے ان اقوام کی طرف دعوت دیتا ہے کہ میں نے ان سے اسلام پر قتال کیا ہے. پس وہ شامی (مایوس ہو کر) مروان کے پاس لوٹ آیا اور ساری داستان سنائی، مروان نے اسے کہا کہ خاموش رہ (یعنی حضرت سعید کے انکار کی خبر کسی دوسرے شخص کو نہ ہونے پائے)۔انہی دنوں میں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا (کسی نچلے راوی کا بیان ہے میں گمان کرتا ہوں کہ شاید وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں) پس انہوں نے وصیت فرمائی کہ میری نماز جنازہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ پڑھائیں، جب جنازہ، جنازہ گاہ میں حاضر ہوا، شامی نے مروان کو کہا کہ تو جنازہ پڑھانے میں کیوں توقف کرتا ہے؟ مروان نے جواب دیا کہ جنازہ وہ شخص پڑھائے گا جس کی گردن مارنے کا تو نے ارادہ کیا تھا کیونکہ ام المؤمنین نے اسکو وصیت کی

تھی۔(الریاض النضرۃ،ص 409ج2)"۔

(استخلاف یزید،صفحہ 290و291)

اس اقتباس میں بین القوسین جو کچھ لکھا ہے اور جس کے نیچے ہم نے لائن لگادی ہے، وہ لعل شاہ صاحب کا اضافہ ہے، اصل روایت میں یہ الفاظ نہیں، مثلاً لعل شاہ صاحب نے "رجل شامی" کے بارے میں اضافہ کیا ہے کہ" وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خط لے کر آیا تھا" جبکہ یہ بات سرے سے اس روایت میں موجود نہیں، اسی طرح اس حکایت میں جو ذکر ہے کہ مروان نے اس شامی سے کہا کہ" اسکت" یعنی خاموش رہو، تو لعل شاہ صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ" یعنی حضرت سعید کے انکار کی خبر کسی اور کو نہ ہونے پائے" یہ بھی لعل شاہ صاحب کی اپنی بات ہے ورنہ اس حکایت میں کہیں بھی نہیں کہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے بیعت سے انکار کیا ہو یا کہا ہو کہ میں بیعت نہیں کروں گا، بلکہ اس حکایت میں تو یہ ہے کہ" میں عنقریب آؤں گا اور بیعت کرلوں گا"، نیز جو اس حکایت میں ذکر ہے کہ روایت بیان کرنے والے نے کہا" فماتت أم المؤمنين أظنها زينب "کہ ام المؤمنین کا انتقال ہوگیا میرا خیال ہے کہ وہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں، تو لعل شاہ صاحب نے اس پر گرہ لگائی ہے کہ" یہ کسی نچلے راوی کا بیان ہے" یہ بات بھی اس روایت میں نہیں کہ" یہ کسی نچلے راوی کا بیان ہے"۔ نیز لعل شاہ صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ یہ روایت" حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے روایت کی ہے"، لیکن اس بیٹے کا نام نہ اس روایت کی سند میں ہے اور نہ ہی لعل شاہ صاحب نے کوئی نام لکھا ہے۔

بہرحال بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اس روایت کو ابن عساکر نے بھی نقل کیا ہے اور اس روایت میں تصریح کی ہے کہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ حضرت سعید میری نماز جنازہ پڑھائیں (تہذیب ابن عساکر، ص169ج6) امام بیہقی نے دونوں روایتیں نقل کی ہیں، دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حاکم کے علاوہ کوئی دوسرا پڑھائے، اور اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ هذا اصح کہ یہ روایت پہلی روایت کی نسبت زیادہ صحیح ہے. فقہ حنفی کی بہت سی کتابوں میں بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ملتا ہے، شیخ عبد القادر لکھتے ہیں: ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ میری نماز جنازہ سعید بن جبیر پڑھائیں (غنية

الطالبین، ص 771 آخری سطر)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 291و292)

نوٹ از ناقل: لعل شاہ صاحب نے امام بیہقی کی جن دو روایتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے پہلی روایت میں ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کا نام مذکور ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی۔ نیز شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا جو حوالہ لعل شاہ صاحب نے نقل کیا ہے اس میں "سعید بن زید" کے بجائے "سعید بن جبیر" ہے۔

بہر حال! یہ حکایت نقل کر کے لعل شاہ صاحب نے اپنا مقدمہ اس طرح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان روایات میں ام المؤمنین کی تعیین کرنے میں محدثین نے غلطی کی ہے، اس کی صحیح تعیین کے لئے ان امہات المؤمنین کو تلاش کرنا ہوگا جن کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہوئی ہو، پھر لعل شاہ صاحب اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے متعلق نہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا وصیت کر سکتی تھیں اور نہ ہی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، کیونکہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہو چکی تھی، اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات سنہ 59ھ یا سنہ 61ھ میں ہوئی تھی اور اس وقت حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بقید حیات نہیں تھے کیونکہ ان کی وفات سنہ 51ھ میں ہو چکی تھی، ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں ہو سکتیں کیونکہ ثابت ہے کہ ان کی نماز جنازہ مروان بن الحکم نے پڑھائی تھی، لعل شاہ صاحب کے بقول یہاں ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی نہیں ہو سکتیں کیونکہ اگرچہ ان کی وفات سنہ 51ھ میں ہوئی لیکن اسی سال ان سے پہلے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ فوت ہو چکے تھے، پھر لعل شاہ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان ام المؤمنین سے مراد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہی ہو سکتی ہیں اور لکھا ہے کہ" ہمارا دعویٰ ہے کہ انہوں نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے متعلق وصیت کی تھی۔ انہی کی نماز جنازہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے پڑھائی، اگرچہ کتابوں میں ان کے نماز جنازہ پڑھانے والے کا نام مذکور نہیں" ان کی وفات سنہ 44ھ میں ہوئی تھی۔ (لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سنہ 44ھ میں ہی مروان بن الحکم کو یزید کی ولی عہدی کی بیعت لینے کا حکم دیا تھا)۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 292و293)

تبصرہ :

لعل شاہ صاحب بخاری نے یہ حکایت محب الدین الطبری (م 694ھ) کی کتاب "الرياض النضرة في مناقب العشرة" کے حوالے سے نقل کی ہے، وہاں اس حکایت کی کوئی سند مذکور نہیں بلکہ محب الطبری نے یہ حکایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :

"أخرجه البغوي في معجمه والفضائلي؛ وخرج ابن الضحاك منه قصة البيعة، وقال:سأل أهل المدينة ....ألخ ... ولم يذكر قصة الصلاة على الجنازة"۔

اس کو بغوی نے اپنی معجم میں اور فضائلی نے روایت کیا ہے، ابن الضحاک نے بھی اس میں سے صرف بیعت والا قصہ ذکر کیا ہے لیکن نماز جنازہ والی بات ذکر نہیں کی۔

(الرياض النضرة، ج4ص343، دار الكتب العلمية بيروت)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محب الطبری نے یہ حکایت امام بغوی کی "معجم الصحابة" سے نقل کی ہے، اور جب ہم امام بغوی کی کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں اس روایت کی سند یوں مذکور ہے :

" حدثنا وهب بن بقية أخبرنا [خالد بن عبد الله] عن عطاء بن السائب عن محارب بن دثار عن ابن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل ....الى آخر الرواية"

(معجم الصحابة للبغوي، ج3ص63و 64، مكتبة دار البيان الكويت)

نوٹ: اس روایت کی سند میں جو عطاء بن السائب سے روایت کرنے والے راوی کا نام" خالد بن عبداللہ" لکھا ہے، محقق کتاب کے مطابق امام بغوی کی کتاب میں یہ نام واضح نہیں تھا اور انہوں نے یہ نام امام ذہبی کی "سير اعلام النبلاء" سے لیا ہے، نیز اس سند میں" محارب بن دثار" حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے جن بیٹے سے روایت کر رہا ہے وہ مجہول ہیں، یعنی اس" بیٹے" کا نام مذکور نہیں۔

لعل شاہ صاحب نے ابن عساکر اور بیہقی کے حوالے بھی دیے ہیں تو ابن عساکر کی" تاریخ دمشق" میں یہ حکایت اسی طرح ہے جیسے" الرياض النضرة" اور" معجم الصحابة للبغوى" میں ہے لیکن اس کی

سند یوں ہے :

"أخبرنا أبو القاسم بن السمرقندي أنا أبو الحسين بن النقور أنا عيسى بن علي أنا عبد الله بن محمد نا وهب بن بقية أنا خالد بن عبد الله عن عطاء بن السائب عن محارب بن دثار عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل...الی آخر الروایة"۔

(تاريخ دمشق، ج21،ص88، دار الفكر بيروت)

اس سند میں "محارب بن دثار" بلاواسطہ "سعید بن زید" سے روایت کررہا ہے، یعنی درمیان میں "بیٹے" کا واسطہ مذکور نہیں، یوں یہ سند "منقطع" ہے، لیکن اس روایت میں جنازہ کی وصیت کرنے والی ام المؤمنین کا نام "زینب" ہی مذکور ہے۔

حافظ ابن عساکر نے آگے دو تین مزید روایات بھی اسی سے متعلق نقل کی ہیں جن سب کی سند میں بھی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے "بیٹے" کا ذکر نہیں بلکہ "محارب بن دثار" کا قول ہی مذکور ہے، لیکن ان میں سے ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :

"قال وأنا عبد الله بن محمد حدثني جدي نا جرير عن عطاء بن السائب عن محارب بن دثار قال لما توفيت أم سلمة أوصت أن يصلي عليها سعيد بن زيد وكان أمير المدينة يومئذ مروان..."۔

یعنی "محارب بن دثار" کا بیان ہے کہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پڑھائیں۔

اور اس سے اگلی روایت میں یہ مذکور ہے کہ وصیت کرنے والی ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

(تاريخ دمشق، ج21ص89، دار الفكر بيروت)

لعل شاہ صاحب نے خود بھی تسلیم کیا ہے کہ :

"اس روایت کو ابن عساکر نے بھی نقل کیا ہے اور اس روایت میں تصریح کی ہے کہ ام المؤمنین

ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ حضرت سعید (رضی اللہ عنہ) میری نماز جنازہ پڑھائیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 291)

اسی طرح لعل شاہ صاحب نے "بیہقی" کا حوالہ بھی دیا ہے، تو آئیے دیکھتے ہیں امام بیہقی نے کیا حکایت نقل کی ہے:

"أَخْبَرَنَا أَبُو الْحُسَيْنِ بْنُ الْفَضْلِ الْقَطَّانُ، بِبَغْدَادَ، أنبأ عَبْدُ اللهِ بْنُ جَعْفَرِ بْنِ دَرَسْتَوَيْهِ، ثنا يَعْقُوبُ بْنُ سُفْيَانَ، ثنا ابْنُ عُثْمَانَ يَعْنِي عَبْدَانَ، عَنْ أَبِي حَمْزَةَ السُّكَّرِيِّ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ، عَنْ مُحَارِبِ بْنِ دِثَارٍ، قَالَ: مَاتَتْ أُمُّ الْمُؤْمِنِينَ أَظُنُّهَا مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا فَأَوْصَتْ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَيْهَا سَعِيدُ بْنُ زَيْدٍ"۔

"وَرَوَاهُ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ، عَنْ مُحَارِبِ بْنِ دِثَارٍ، أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَوْصَتْ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَيْهَا سِوَى الْإِمَامِ وَهَذَا أَصَحُّ"۔

(السنن الكبرى للبيهقي، ج4ص46و 47، دار الكتب العلمية بيروت)

یہ دو روایتیں ہیں، پہلی روایت کے مطابق "محارب بن دثار" کا کہنا ہے کہ میرا گمان ہے کہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پڑھائیں۔ اور دوسری روایت کے مطابق یہی "محارب بن دثار" کہتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ امام (یعنی والی مدینہ) کے علاوہ کوئی اور پڑھائے۔

اس پر امام بیہقی نے تبصرہ فرمایا ہے کہ: یہ دوسری روایت والی بات زیادہ صحیح ہے (کہ وصیت کرنے والی ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں)۔

یاد رہے! ان دونوں روایتوں میں یزید کی بیعت والا قصہ کہیں مذکور نہیں، نیز صرف وصیت کا ذکر ہے، یہ ذکر نہیں کہ اس کے بعد ان ام المؤمنین کی وفات کے وقت ان کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی اور

جنازے کے وقت کیا بات چیت ہوئی۔

ایسی ہی روایت "مستدرک حاکم" میں بھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

"أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ أَحْمَدَ بْنِ بَالَوَيْهِ الْعَفْصِيُّ، ثنا مُحَمَّدُ بْنُ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي شَيْبَةَ، ثنا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ، ثنا خَالِدٌ، وَجَرِيرٌ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ، قَالَ: كُنَّا قُعُودًا مَعَ مُحَارِبِ بْنِ دِثَارٍ، فَقَالَ: حَدَّثَنِي ابْنٌ لِسَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ: أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ، أَوْصَتْ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَيْهَا سَعِيدُ بْنُ زَيْدٍ خَشْيَةَ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَيْهَا مَرْوَانُ بْنُ الْحَكَم "۔

محارب بن دثار کا بیان ہے کہ مجھے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے نے یہ بات بتائی تھی کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نماز جنازہ حضرت سعید بن زید پڑھائیں، انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ان کی نماز جنازہ مروان بن الحکم نہ پڑھا دیں۔

(المستدرك للحاكم، ج4ص21، دار الكتب العلمية بيروت، امام ذہبی نے "تلخيص المستدرك" میں اس روایت کو حذف کر دیا)

اس روایت میں بھی صرف ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی جنازہ سے متعلق وصیت کا ذکر ہے، یہ ذکر نہیں کہ جنازہ کس نے پڑھایا یا جنازہ کے موقع پر شامی آدمی اور مروان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت پر یوں تبصرہ کیا ہے:

" رَوَى عَطَاءُ بنُ السَّائِبِ، عَنْ مُحَارِبِ بنِ دِثَارٍ: أن أم سلمة أوصت أن يصلي عليها سَعِيْدُ بنُ زَيْدٍ أَحَدُ العَشَرَةِ وَهَذَا مُنْقَطِعٌ وَقَدْ كَانَ سَعِيْدٌ تُوُفِّيَ قَبْلَهَا بِأَعْوَامٍ فَلَعَلَّهَا أوصت في وقت ثم عوفيت وتقدمها هو"۔

یعنی محارب بن دثار سے روایت ہے کہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کی نماز جنازہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ پڑھائیں۔

(امام ذہبی فرماتے ہیں): یہ روایت منقطع ہے، نیز حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی وفات ام المؤمنین ام

سلمہ ﷢ سے پہلے ہو چکی تھی، ہوسکتا ہے کہ ام المؤمنین نے کسی وقت (اپنی بیماری میں) ایسی وصیت کی ہو اور پھر وہ تندرست ہوگئی ہوں، اور حضرت سعید ﷜ ان سے پہلے فوت ہو گئے ہوں۔

(سير اعلام النبلاء للذهبي، ج2ص208، مؤسسة الرسالة بيروت)

خلاصۂ کلام یہ کہ اس حکایت کا دارومدار جس سند پر ہے وہ آخر میں جا کر" عطاء بن السائب" اور "محارب بن دثار" پر ختم ہوتی ہے، یا بعض کتب میں" حضرت سعید بن زید ﷜ کے ایک بیٹے" (جن کا نام کہیں مذکور نہیں) پر جا کر ختم ہوتی ہے، پھر بعض نے اس حکایت میں یزید کی بیعت اور شامی آدمی والا قصہ نقل کیا ہے اور بعض نے صرف ام المؤمنین کی وصیت کا ذکر کیا ہے، پھر ام المؤمنین کا نام کسی روایت میں حضرت زینب ہے تو کہیں حضرت میمونہ اور کہیں حضرت ام سلمہ (﷢) جبکہ روایت کرنے والا راوی ایک ہی ہے جس کا نام ہے"محارب بن دثار"۔

یوں اس حکایت کی سند میں جہاں حضرت سعید بن زید ﷜ کے بیٹے کا ذکر ہے (جن سے محارب بن دثار روایت کر رہے ہیں) وہ بیٹے معلوم نہیں کون ہیں؟ ان کا نام کہیں بھی نہیں ملتا یعنی" مجہول راوی" ہیں، دوسرا محارب بن دثار سے روایت کرنے والے جو راوی" عطاء بن السائب" ہیں ان کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کا اتفاق ہے کہ یہ آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اسی لیے ان کے بارے میں امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ :

"من سمع منه قديما فسماعه صحيح ومن سمع منه حديثا لم يكن بشيء سمع منه قديما سفيان وشعبة وسمع منه حديثا جرير وخالد وإسماعيل وعلي بن عاصم"۔

جس نے ان سے پہلے زمانہ میں حدیث سنی اس کا سماع صحیح ہے، اور جس نے بعد میں (یعنی اختلاط اور سوء حافظہ کے بعد) سنی وہ احادیث کچھ بھی نہیں، اور پہلے زمانہ میں ان سے سفیان اور شعبہ نے حدیث سنی ہے، جبکہ (اختلاط اور سوء حفظ کے بعد والے زمانے میں) ان سے جریر، خالد، اسماعیل اور علی بن عاصم نے سنی ہے۔

امام یحییٰ بن سعید نے کہا :

"لا يحتج به" ان کی حدیث سے حجت نہ پکڑی جائے۔

امام بخاری نے کہا :

"أحاديث عطاء بن السائب القديمة صحيحة"۔

عطاء بن سائب کی پرانی (یعنی زمانہ اختلاط اور سوء حفظ سے پہلے کی) احادیث صحیح ہیں (یعنی زمانہ اختلاط والی صحیح نہیں۔ ناقل)

امام نسائی نے کہا:

"ثقة في حديثه القديم، لكنه تغير"۔

جو اِن کی پرانی احادیث ہیں ان میں وہ ثقہ ہیں، لیکن بعد میں ان کے حافظہ میں تغیر واقع ہوگیا تھا۔

امام یحییٰ بن معین سے منقول ہے کہ :

"وجميع من سمع من عطاء سمع منه في الاختلاط الا شعبة والثوري"

سوائے شعبہ اور سفیان ثوری کے ان کے باقی سب شاگردوں کا سماع عطاء بن سائب سے اختلاط کے زمانہ کا ہی ہے۔

امام عجلی کا کہنا ہے کہ:

"فأما من سمع منه بآخره فهو مضطرب الحديث منهم هشيم وخالد الواسطي"۔

جس جس نے ان سے ان کی آخری عمر میں حدیث سنی ہے، تو ان کی حدیث میں اضطراب ہے، اور ان آخری عمر میں سننے والوں میں ہشیم اور خالد واسطی بھی ہیں۔

"وذكر العقيلي أن حماد بن سلمة ممن سمع منه بعد الاختلاط۔ قال ابن القطان: وكذلك جرير وخالد بن عبد الله وابن علية وعلي بن عاصم وبالجملة أهل البصرة فإن أحاديثهم عنه مما سمع

بعد الاختلاط لأنه قدم عليهم في أخرة عمره"۔

عقیلی نے ذکر کیا ہے کہ حماد بن سلمہ ان میں سے ہیں جنہوں نے عطاء بن سائب سے اختلاط کے بعد حدیث سنی ہے، ابن قطان نے کہا کہ: اسی طرح جریر، خالد بن عبداللہ، ابن علیہ، علی بن عاصم کا سماع بھی اختلاط کے بعد کا ہے، بلکہ تمام اہل بصرہ کا سماع ان سے اختلاط کے بعد کا ہی ہے کیونکہ وہ بصرہ میں آخری عمر میں آئے تھے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں: میزان الاعتدال، ج3ص70، دار المعرفة بيروت / تهذيب التهذيب، ج7ص203، دائرة المعارف، الهند / كتاب المختلطين للعلائي، ص 82، مكتبة الخانجي القاهرة)

اور اس روایت میں "عطاء بن السائب" سے روایت کرنے والا "خالد عبداللہ الواسطی" ہی ہے، یا کہیں "جریر" ہے، جن دونوں کے بارے میں تصریح ہے کہ ان دونوں کا سماع عطاء بن السائب سے اختلاط کے بعد کا ہے، لہٰذا امام احمد بن حنبل کے مطابق یہ روایت "ليس بشيء" (کچھ بھی نہیں) نیز شدید قسم کی مضطرب بھی ہے۔ پھر اوپر حوالہ گذرا کہ امام ذہبی نے اس روایت کو "منقطع" بتایا ہے۔

اس پر عجوبہ یہ کہ لعل شاہ صاحب اس غیر ثابت اور منقطع روایت سے استناد کرتے ہیں اور اس میں موجود شدید اضطراب کو جانتے مانتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی تعیین میں محدثین نے غلطی کی ہے، سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے متعلق نہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا وصیت کر سکتی تھیں اور نہ ہی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، البتہ یہ ممکن ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی وصیت غیر امام کی کی ہو مگر وہ غیر امام سعید بن زید رضی اللہ عنہ نہیں ہیں..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 292)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں مذکورہ ام المؤمنین کی تعیین محدثین یا شارحین نے نہیں کی بلکہ اس روایت کو بیان کرنے والا مرکزی راوی کہیں ام المؤمنین زینب رضی اللہ عنہا کا نام لیتا ہے تو کہیں ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کا اور کہیں ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہ کا، یہ نام روایت میں موجود ہیں، بعد میں کسی شارح یا محدث نے نہیں بیان کیے، تو اگر لعل شاہ صاحب کے نزدیک یہ روایت قابل استناد ہے تو انہیں اس سے کیوں اختلاف ہے کہ ان تینوں امہات المؤمنین میں سے ہی کوئی مراد ہیں؟

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے اپنی تحقیق یوں پیش کی ہے کہ :

"ان ام المؤمنین سے مراد صرف سیدہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہما ہی ہو سکتی ہیں اور انہی نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے متعلق وصیت کی تھی اور انہی کی نماز جنازہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی وفات سنہ 44ھ میں ہوئی تھی"۔

(ملخصاً : استخلاف یزید، صفحہ 293)

لیکن لعل شاہ صاحب نے اس پر نہ کوئی روایت پیش کی ہے اور نہ ہی کسی شارح کا قول یا حوالہ لکھا ہے، صرف اپنا مفروضہ ہی پیش کیا ہے کہ چونکہ کتابوں میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی نماز جنازہ پڑھانے والے کا نام مذکور نہیں لہذا ثابت ہوا کہ ان کی نماز جنازہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے ہی پڑھائی تھی۔

جبکہ ہم کہتے ہیں کہ لعل شاہ صاحب کی مستدلہ یہ ساری حکایت ہی غیر مستند اور ناقابل استدلال ہے، اس کی حیثیت ایک قصہ کہانی سے زیادہ نہیں، اس سے لعل شاہ صاحب کا یہ دعویٰ کسی صورت ثابت نہیں ہوتا کہ یزید کی ولی عہدی کا قضیہ سنہ 44ھ میں پیش آیا۔

صحیح بخاری کی دو روایات سے لعل شاہ صاحب کے استدلال کا جائزہ

لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں :

"اصل میں ہمارے ادعاء کی اساس دو روایتوں پر ہے، یہی دو روایتیں تاریخِ انعقاد استخلاف اور کیفیتِ بیعتِ استخلاف کی آئینہ دار ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 294)

اور پھر انہوں نے پہلی روایت یہ نقل کی ہے :

"عَنْ يُوسُفَ بْنِ مَاهَكَ، قَالَ:كَانَ مَرْوَانُ عَلَى الحِجَازِ اسْتَعْمَلَهُ مُعَاوِيَةُ فَخَطَبَ، فَجَعَلَ يَذْكُرُ يَزِيدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ لِكَيْ يُبَايَعَ لَهُ بَعْدَ أَبِيهِ، فَقَالَ لَهُ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ شَيْئًا، فَقَالَ: خُذُوهُ، فَدَخَلَ بَيْتَ عَائِشَةَ فَلَمْ يَقْدِرُوا، فَقَالَ مَرْوَانُ: إِنَّ هَذَا الَّذِي أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ،

{وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا أَتَعِدَانِنِي} ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ مِنْ وَرَاءِ الحِجَابِ:مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِينَا شَيْئًا مِنَ القُرْآنِ إِلَّا أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ عُذْرِي"۔

(ترجمہ ازلعل شاہ صاحب) یوسف بن ماہک سے روایت ہے فرماتے ہیں مروان حجاز پر حاکم تھا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے عامل مقرر کیا تھا پس خطبہ دیا اور یزید بن معاویہ کا تذکرہ کیا تاکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد یزید کی بیعت کی جائے (ولی عہدی کی) عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے کوئی چیز کہی، پس مروان نے کہا کہ اسے پکڑو، وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر داخل ہو گئے، پس لوگ اب اس کے پکڑنے پر قادر نہ ہو سکے، پس مروان نے کہا یہ وہی ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا) حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اندر پردے سے فرمایا : ہمارے بارے میں قرآن میں کچھ نازل نہیں ہوا مگر یہ کہ اللہ نے میرا عذر نازل فرمایا۔

(استخلاف یزید، صفحہ 294و295)

یہ روایت نقل کرنے کے بعد لعل شاہ صاحب کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اس روایت میں جو مذکور ہے کہ" فَقَالَ لَهُ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ شَيْئًا" کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے مروان سے کچھ کہا، اس" شَيْئًا" کی وضاحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کیوں نہیں کی؟ چنانچہ لکھتے ہیں :

"اے کاش! اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (شَيْئًا) کی وضاحت کر دیتے تو ہمیں کسی دوسری طرف مراجعت کی ضرورت نہ رہتی، لغوی طور پر شیئاً کے دو معنی کئے جا سکتے ہیں، کوئی معمولی شے یا کوئی عظیم شے، لیکن عقلی طور پر یہاں معمولی شے مراد نہیں لی جا سکتی کیونکہ خطبہ کے دوران حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا بول اٹھنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے لئے خاموش رہنا ناقابل برداشت تھا، پس انہوں نے کسی معمولی چیز کے ساتھ تکلم نہ کیا ہوگا، کوئی ایسی گراں اور ناگوار بات کہی ہوگی جس سے مروان بن الحکم مشتعل ہو گیا اور غصہ کو ضبط نہ کر سکا اور حکم دیا خذوہ اسے پکڑو، ام المؤمنین کو مداخلت کرنا پڑی اور مروان کی تکذیب میں انہیں بھی بولنا پڑا نیز

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق سے مدینہ آنے کی زحمت گوارا کرنی پڑی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 295)

تبصرہ:

سب سے پہلے یہ عرض ہے کہ امام بخاری اس روایت میں لفظ "شیئاً" کی وضاحت کیسے کر دیتے؟ کیا ان پر وحی نازل ہوتی تھی؟ جتنی روایت ان کو ملی اتنی انہوں نے نقل کر دی، ان میں لعل شاہ صاحب کی طرح بغض معاویہ نہ تھا کہ اپنی طرف سے کوئی مفروضہ بنا کر "شیئاً" کی وضاحت کر دیتے۔

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ لعل شاہ صاحب آخر اس روایت سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ اس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو صرف یہ کہ مدینہ منورہ کے عامل مروان بن الحکم نے کسی خطبہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے یزید کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات کر دی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد اس کی بیعت کر لی جائے یا اسے خلیفہ بنا دیا جائے اور حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے مروان کی اس بات سے اختلاف کیا (اور یہ سب مانتے ہیں کہ یزید کی ولی عہدی کی تجویز کے وقت جن تین چار صحابہ کرام نے اختلاف کیا ان میں ایک حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر بھی تھے)، نیز اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوران خطبہ مروان کی بات سے صرف عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے اختلاف کیا تھا، حاضرین میں سے کسی اور صحابی یا تابعی نے کوئی بات کی ہو اس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں۔

نہ تو اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کو لکھا تھا کہ وہ لوگوں سے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لیں، ممکن ہے یہ بات مروان نے اپنی طرف سے کہی ہو، اور نہ ہی اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مروان نے یہ خطبہ سنہ 44ھ میں دیا تھا، اور نہ ہی کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر اور مروان بن الحکم کے درمیان ہونے والی اس نوک جھونک کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق سے مدینہ آنا پڑا۔

ہاں اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت مدینہ کے عامل مروان بن الحکم تھے، اور اس وقت ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی بقید حیات تھیں۔

تو ہم پہلے باحوالہ ذکر کر آئے ہیں کہ حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے سن وفات کے بارے میں

بھی مختلف اقوال مذکور ہیں جن میں امام ابوزرعہ دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ہے کہ آپ کی وفات اس سال ہوئی جس سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کی بیعت لینے کے لئے مدینہ تشریف لائے، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات آپ کے ایک سال بعد سنہ 59ھ میں ہوئی تھی، ابن حبان کا قول بھی یہی ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی وفات سنہ 58ھ میں ہوئی، امام بخاری نے کہا کہ آپ کی وفات ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہلے اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بعد ہوئی تھی۔

(الاصابة في تمييزالصحابة، ج6ص215و 216،دارهجر، القاهرة)

اسی طرح جیسا کہ پہلے بیان ہوا، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سنہ 58ھ کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جن کی وفات اس سال میں ہوئی، چنانچہ لکھتے ہیں:

"وَكَانَتْ وَفَاتُهُ فِي هَذَا الْعَامِ فِي قَوْلِ كَثِيرٍ مِنْ عُلَمَاءِ التَّارِيخِ" ۔علماء تاریخ کی کثیر تعداد کا کہنا ہے کہ ان کی وفات اسی سال (یعنی 58ھ) میں ہوئی۔

(البداية والنهاية، وفيات سنة 58هـ ، ج8ص130، وزارة الاوقاف قطر)

دوسری طرف خود لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ:

"حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سنہ 55ھ میں فوت ہوئے اور مسلم اور مؤطا کی صحیح روایات میں ثابت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے جنازے میں شرکت کی.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 282)

جس سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ کم از کم سنہ 55ھ میں حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما زندہ تھے، ان کی وفات سنہ 55ھ کے بعد ہی ہوئی تھی، یہ الگ بات ہے کہ لعل شاہ صاحب نے نہ جانے کس بنیاد پر ان کی وفات سنہ 55ھ میں ہی ہونے کو زیادہ صحیح لکھ دیا ہے (استخلاف یزید، صفحہ 282)، انہیں امام ابوزرعہ کا قول کیوں صحیح نہ لگا جس میں ہے کہ ان کی وفات اس سال ہوئی جس سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لائے تھے؟ (یہ آنا سنہ 55ھ کے بعد ہی ہوگا کیونکہ لعل شاہ صاحب کے اقرار کے مطابق حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر

رضی اللہ عنہما سنہ 55ھ میں زندہ سلامت تھے) یا انہیں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی بات صحیح کیوں نہ لگی کہ" مؤرخین کی کثیر تعداد کا کہنا ہے کہ ان کی وفات سنہ 58ھ میں ہوئی تھی" ؟

اور یہ بات بھی تمام مؤرخین کے نزدیک مسلّم ہے کہ سنہ 54ھ تا 57ھ مدینہ کے والی مروان بن الحکم تھے، نیز سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اس عرصہ میں بقید حیات تھیں، انکی وفات مشہور قول کے مطابق رمضان سنہ 58ھ میں ہوئی (الاصابۃ، ج 14 ص 34، دار ہجر القاہرۃ)۔

لہٰذا اقرین قیاس یہی ہے کہ مروان بن الحکم کے خطبہ کے دوران حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر کے بولنے والا واقعہ اسی عرصے میں پیش آیا جس وقت اکثر مؤرخین کے نزدیک یزید کی ولی عہدی کی بیعت لینے کا قضیہ شروع ہوا اور یہ سنہ 56ھ یا اس کے بعد کا واقعہ ہے۔

الغرض! اس روایت سے بھی کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ سنہ 44ھ کا ہے لیکن لعل شاہ صاحب پھر بھی اپنے مفروضے پر بضد ہیں اور لکھتے ہیں:

> "اصل اصیل حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد میں فوت ہوئے اس وقت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ عامل مدینہ تھے، انہوں نے ہی نماز جنازہ پڑھائی، پھر وہ اسی سال معزول ہوگئے، ان کی جگہ مروان بن الحکم مقرر ہوئے، <u>سنہ 44ھ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے معاً بعد قضیہ استخلاف یزید پیش آیا</u> اور جب مروان بن الحکم نے مدینہ میں وہ مشہور خطبہ دیا کہ عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بول اٹھنے سے ہنگامہ ہوگیا تو خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لئے تشریف لائے اور مدینہ میں تقریر کی جس کا تفصیلی ذکر عنقریب ہی آئندہ سطور میں آرہا ہے...."۔
>
> (استخلاف یزید، صفحہ 284)

اس مفروضے کو اگر درست مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 44ھ میں ہوئی اور اس وقت مدینہ کے عامل حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ تھے اور انہی نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی کیونکہ لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ" سنہ 44ھ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے معاً بعد قضیہ استخلاف یزید پیش آیا اور اسی سال یعنی سنہ 44ھ میں ہی سعید بن العاص کو معزول کر کے ان کی جگہ مروان بن

الحکم کو مدینہ کا عامل بنایا گیا"، جبکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ سنہ 41ھ کے آخر سے لے کر سنہ 48ھ تک لگاتار بلا کسی انقطاع کے مدینہ کے عامل مروان بن الحکم تھے (جیسا کہ پہلے مفصل بیان ہوا)، حضرت سعید بن العاص اس دوران ایک دن کے لئے بھی مدینہ کے عامل نہیں رہے، پھر نہ جانے لعل شاہ صاحب بخاری نے یہ "اصل اصیل حقیقت" کہاں سے دریافت کی ہے کہ سعید بن العاص کو سنہ 44ھ میں معزول کر کے مروان بن الحکم کو مدینہ کا عامل بنایا گیا؟

لعل شاہ صاحب کی مستدلہ صحیح بخاری کی دوسری روایت

لعل شاہ صاحب نے اپنے دعوے (بلکہ مفروضے) پر صحیح بخاری کی جس دوسری روایت سے استدلال کیا ہے وہ یہ ہے :

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى حَفْصَةَ وَنَسْوَاتُهَا تَنْطُفُ، قُلْتُ: قَدْ كَانَ مِنْ أَمْرِ النَّاسِ مَا تَرَيْنَ، فَلَمْ يُجْعَلْ لِي مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ، فَقَالَتْ: الحَقْ فَإِنَّهُمْ يَنْتَظِرُونَكَ، وَأَخْشَى أَنْ يَكُونَ فِي احْتِبَاسِكَ عَنْهُمْ فُرْقَةٌ، فَلَمْ تَدَعْهُ حَتَّى ذَهَبَ، فَلَمَّا تَفَرَّقَ النَّاسُ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ قَالَ: مَنْ كَانَ يُرِيدُ أَنْ يَتَكَلَّمَ فِي هَذَا الأَمْرِ فَلْيُطْلِعْ لَنَا قَرْنَهُ، فَلَنَحْنُ أَحَقُّ بِهِ مِنْهُ وَمِنْ أَبِيهِ، قَالَ حَبِيبُ بْنُ مَسْلَمَةَ: فَهَلَّا أَجَبْتَهُ؟ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ: فَحَلَلْتُ حُبْوَتِي، وَهَمَمْتُ أَنْ أَقُولَ: أَحَقُّ بِهَذَا الأَمْرِ مِنْكَ مَنْ قَاتَلَكَ وَأَبَاكَ عَلَى الإِسْلاَمِ، فَخَشِيتُ أَنْ أَقُولَ كَلِمَةً تُفَرِّقُ بَيْنَ الجَمْعِ، وَتَسْفِكُ الدَّمَ، وَيُحْمَلُ عَنِّي غَيْرُ ذَلِكَ، فَذَكَرْتُ مَا أَعَدَّ اللَّهُ فِي الجِنَانِ، قَالَ حَبِيبٌ: حُفِظْتَ وَعُصِمْتَ"۔

(صحيح البخاري، باب غزوة الخندق وهي الاحزاب)

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کی زلفوں میں اس وقت پانی لپک رہا تھا، میں نے عرض کیا آپ لوگوں کا حال دیکھ رہی ہیں کہ میرا اس امر میں کوئی حصہ نہیں کیا

گیا، آپ نے فرمایا وہاں جاؤ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے اور میں اندیشہ کرتی ہوں کہ تیرے رک جانے میں انتشار پیدا نہ ہو جائے پس انہوں نے نہ چھوڑا یہاں تک کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ وہاں چلے گئے، پس جب لوگ متفرق ہو گئے (یعنی ایک رائے میں جمع نہ ہوسکے) تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، فرمایا جو شخص اس امر میں بولنا چاہے تو سر اٹھائے ہم ان سے اور ان کے باپ سے امر خلافت کے زیادہ حقدار ہیں، حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا پس کیوں جواب نہ دیا آپ نے؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اپنا جوہ کھولا اور پختہ ارادہ کیا کہ کہوں کہ اس امر خلافت کا تجھ سے زیادہ حقدار وہ شخص ہے جس نے تجھ سے اور تیرے باپ سے اسلام کے لئے جنگ کی تھی پس میں نے اندیشہ کیا کہ کہیں ایسی بات نہ کہہ دوں جو مجمع میں انتشار پیدا کر دے اور خونریزی ہو جائے اور میرے اس مقصد کو نہ پا کر کچھ اور نہ سمجھ لیں میں نے ان نعمتوں کا خیال کیا جو اللہ نے جنتوں میں تیار کی ہیں اور خاموش رہا ہوں، حبیب رضی اللہ عنہ نے کہا آپ محفوظ ہو گئے اور بچ گئے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 296 و 297)

نوٹ: لعل شاہ صاحب نے روایت کے عربی الفاظ جو نقل کیے ہیں ان میں کمی بیشی ہے تاہم ان کا کیا ہوا اردو ترجمہ ہی ہم نے نقل کیا ہے، اس اردو ترجمہ میں لعل شاہ صاحب نے وہ الفاظ اپنی طرف سے اضافہ کیے جن کے نیچے ہم نے خط کھینچا ہے، روایت میں صرف "أمر" یعنی "معاملہ" کے الفاظ ہیں، لعل شاہ صاحب نے اسے "امر خلافت" بنا دیا، اسی طرح روایت میں "فلما تفرق الناس" ہے یعنی" جب لوگ منتشر ہو گئے" لعل شاہ صاحب نے اس کا مطلب "یعنی ایک رائے میں جمع نہ ہو سکے" اپنی طرف سے بیان کیا ہے۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے محمود احمد عباسی صاحب کے حوالے سے یہ بات بیان کی ہے کہ ان کے مطابق یہ اجتماع مدینہ میں ہوا تھا اور یہ یزید کی ولی عہدی سے متعلق تھا لعل شاہ صاحب بھی ان دو باتوں سے اتفاق کرتے ہیں لیکن یہ اجتماع کب ہوا؟ اس پر ان کا محمود عباسی صاحب سے اختلاف ہے، محمود عباسی صاحب نے یہ واقعہ سنہ 50ھ کا بتایا لیکن لعل شاہ صاحب کا اصرار ہے کہ یہ واقعہ سنہ 44ھ کا ہے اور اس بات کے لئے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ام المؤمنین سیدہ

حفصہ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں، اورام المؤمنین کی وفات سنہ 45ھ کی ہے لہٰذا یقیناً یہ واقعہ سنہ 45ھ سے پہلے کا ہی ہوسکتا ہے۔

(دیکھیں :استخلاف یزید، صفحہ 297 تا299)

تبصرہ :

لعل شاہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ" یہ حدیث ولایت عہد یزید کے سلسلہ میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے" (استخلاف یزید، صفحہ 299) لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہاں محمود احمد عباسی اور لعل شاہ صاحب بخاری دونوں نے غلطی کھائی ہے، نہ اس بات کی کوئی قطعی دلیل ہے کہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے اور نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ اس میں جس معاملے کا ذکر ہے وہ خلافت یا یزید کی ولی عہدی کا معاملہ تھا، یوں تو لعل شاہ صاحب ایسی متعدد صحیح روایات اور مسلمہ تاریخی حقائق میں بال کی کھال اتارتے ہیں جو ان کے مفروضوں سے ٹکراتے ہوں، جیسے مثلاً صحیح بخاری کی اس حدیث کے بارے میں جس میں پہلے بحری غزوہ کرنے والے لشکر کے جنتی ہونے اور غزوہ قسطنطنیہ پر پہلی لشکرکشی کرنے والوں کے لئے مغفرت کا ذکر ہے یہ تک لکھ دیا ہے کہ :

"میرا دعویٰ ہے کہ یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ راوی کی خود ساختہ ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 320)

اور اسی حدیث کے بارے میں لکھا کہ :

"صحیح بخاری کی اس روایت کے کچھ اور مخفی گوشوں کو روشنی میں لانے کی ضرورت تھی لیکن:

بخاری کے ادب سے کی بخاری نے نہ غوّاصی

وگرنہ اس سمندر میں بہت سے تھے لولوَ لا لأ

(استخلاف یزید، صفحہ 330)

کیونکہ اُس حدیث سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا جنتی ہونا معلوم ہوتا تھا اور ان کے بیٹے یزید سمیت ان تمام لوگوں کے لئے مغفرت کی بشارت ثابت ہوتی تھی جو شہر قسطنطنیہ پر سب سے پہلے حملے میں شریک ہوئے، اور یہ دونوں باتیں لعل شاہ صاحب کو کسی طرح قبول نہ تھیں اس لئے انہوں نے اس حدیث کو ہی راوی کی من گھڑت بتادیا۔

لیکن اس زیر بحث روایت کے بارے میں نہ ان کے ذہن میں کوئی اشکال آیا، نہ انہوں نے اپنی غواصی اور تحقیق عمیق کے موتی بکھیرے، اس لئے آئیے پہلے اس روایت کے متن کا جائزہ لے لیتے ہیں، اس روایت میں کئی باتیں قابل غور ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کے متن میں کئی اشکال ہیں۔

سب سے پہلا اشکال، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس خطبہ کے موقع ومحل سے متعلق ہے جو اس روایت میں مذکور ہے، یعنی یہ کہ انہوں نے یہ خطبہ کب اور کہاں دیا تھا؟ سو اس بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کی تفصیل میں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، صحیح بخاری کی اسی روایت کے تحت لکھتے ہیں :

"وَوَقَعَ فِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ فِي هَذَا الْحَدِيثِ فَلَمَّا تَفَرَّقَ الْحَكَمَانِ وَهُوَ يُفَسِّرُ الْمُرَادَ وَيُعَيِّنُ أَنَّ الْقِصَّةَ كَانَتْ بِصِفِّينَ وَجَوَّزَ بَعْضُهُمْ أَنْ يَكُونَ الْمُرَادُ الِاجْتِمَاعَ الْأَخِيرَ الَّذِي كَانَ بَيْنَ مُعَاوِيَةَ وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَرِوَايَةُ عَبْدِ الرَّزَّاقِ تَرُدُّهُ وَعَلَى هَذَا تَقْدِيرُ الْكَلَامِ فَلَمْ تَدَعْهُ حَتَّى ذَهَبَ إِلَيْهِمْ فِي الْمَكَانِ الَّذِي فِيهِ الْحَكَمَانِ فَحَضَرَ مَعَهُمْ فَلَمَّا تَفَرَّقُوا خَطَبَ مُعَاوِيَةُ..... ألخ- وَأَبعد من ذَلِك قَول بن الْجَوْزِيِّ فِي كَشْفِ الْمُشْكِلِ أَشَارَ بِذَلِكَ إِلَى جَعْلِ عُمَرَ الْخِلَافَةَ شُورَى فِي سِتَّةٍ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ مِنَ الْأَمْرِ شَيْئًا فَأَمَرَتْهُ بِاللِّحَاقِ قَالَ وَهَذَا حِكَايَةُ الْحَالِ الَّتِي جَرَتْ قَبْلُ وَأَمَّا قَوْلُهُ فَلَمَّا تَفَرَّقَ النَّاسُ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ كَانَ هَذَا فِي زَمَنِ مُعَاوِيَةَ لَمَّا أَرَادَ أَنْ يَجْعَلَ ابْنَهُ يَزِيدَ وَلِيَّ عَهْدِهِ كَذَا قَالَ وَلَمْ يَأْتِ لَهُ بِمُسْتَنَدٍ وَالْمُعْتَمَدُ مَا صَرَّحَ بِهِ فِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ..."۔

(فتح الباري، ج7ص403، دار المعرفة بيروت)

خلاصہ: عبدالرزاق نے معمر کے واسطے سے جو روایت ذکر کی ہے اس کے مطابق اس حدیث میں یہ صراحت بھی ہے کہ "جب حکمین الگ ہوئے" یوں ان الفاظ نے مراد واضح کردی اور اس بات کی تصریح کردی کہ یہ واقعہ صفین کا ہے، بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ اس

وقت کا ہے جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے درمیان میں (صلح کے سلسلے میں) آخری ملاقات ہوئی تھی، لیکن عبدالرزاق کی روایت اس بات کو رد کرتی ہے...... اور اس سے بھی زیادہ بعید ابن جوزی کا قول ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس بات کا اشارہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بنائی گئی چھ رکنی شوریٰ میں ان کا کوئی دخل نہ رکھنے سے متعلق تھا، اور دوسری بات کہ جب لوگ منتشر ہو گئے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، یہ اس وقت سے متعلق ہے جب انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا تھا (ابن حجر کہتے ہیں) ابن جوزی نے اس بات کی کوئی مستند دلیل نہیں پیش کی، لہٰذا قابل اعتماد بات وہی ہے جس کی تصریح معمر بن راشد سے عبدالرزاق کی روایت میں ہے۔

یوں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو اس قول کا رد کر دیا جس میں اس واقعہ کو سیدنا معاویہ اور سیدنا حسن (رضی اللہ عنہما) کے درمیان صلح کے وقت کا بتایا گیا تھا، اس کے بعد "ابن جوزی" کی اس بات کو کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا، بے دلیل بتا کر رد کر دیا، جبکہ سید لعل شاہ صاحب ابن جوزی کی اس غیر مستند بات کو لے کر چل رہے ہیں، رہی مصنف عبدالرزاق کی وہ روایت جس کی طرف حافظ ابن حجر نے اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ ہے :

"عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ مَعْمَرٌ: وَأَخْبَرَنِي ابْنُ طَاوُسٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى حَفْصَةَ وَنَوْسَاتُهَا تَنْطِفُ، فَقُلْتُ: قَدْ كَانَ مِنْ أَمْرِ النَّاسِ مَا تَرَيْنَ، وَلَمْ يُجْعَلْ لِي مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ قَالَتْ: فَالْحَقْ بِهِمْ، فَإِنَّهُمْ يَنْتَظِرُونَكَ، وَالَّذِي أَخْشَى أَنْ يَكُونَ فِي احْتِبَاسِكَ عَنْهُمْ فُرْقَةٌ۔ فَلَمْ تَدَعْهُ حَتَّى يَذْهَبَ، فَلَمَّا تَفَرَّقَ الْحَكَمَانِ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ فَقَالَ: مَنْ كَانَ مُتَكَلِّمًا فَلْيُطْلِعْ قَرْنَهُ"۔

(مصنف عبدالرزاق بتحقيق العلامة حبيب الرحمن الأعظمي، ج 5ص 483حديث نمبر 9779/ نیز امام ذہبی نے بھی انہی الفاظ کی زیادتی کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے، دیکھیں: سیر اعلام النبلاء، ج 3ص 226، مؤسسة الرسالة)

نوٹ: عبدالرزاق الصنعانی (م 211ھ) امام بخاری کے استاذ ہیں، لعل شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے کہ" یاد رہے عبدالرزاق امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہے اور صحیح بخاری میں اس سے ایک سو سے زائد روایات مروی ہیں" (استخلاف یزید صفحہ 583)۔

آپ نے دیکھا کہ اس روایت میں صاف طور پر" فلما تفرّق الحکمان" کی صراحت ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ صحیح بخاری کی روایت میں جو" فلما تفرّق الناس" ہے اس سے مراد تحکیم کے لئے جمع لوگوں کا منتشر ہونا ہے اور یہ خطبہ والا واقعہ تحکیم کے فوراً بعد کسی وقت کا ہے، اور اس وقت تو یزید کی ولی عہدی یا بیعت کا دور دور تک کہیں کوئی اتا پتا نہ تھا۔ نیز مصنّف عبدالرزاق کی اس روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا" مَنْ كَانَ مُتَكَلِّمًا فَلْيُطْلِعْ قَرْنَه" اگر کوئی آدمی کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنا سر اٹھائے، اس روایت میں" ھذا الامر" کے الفاظ نہیں، نیز اس کے بعد یہ الفاظ بھی نہیں کہ" ہم ان سے اور ان کے باپ سے اس امر کے زیادہ حقدار ہیں"۔

نیز صحیح بخاری کی روایت میں ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ بھی ہیں کہ انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: الحَقْ فَإِنَّهُمْ يَنْتَظِرُونَكَ (ان کے پاس جاؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان" اجتماع کرنے والوں" نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر بلاوا بھیجا تھا، اس بات کی تائید بھی مصنف عبدالرزاق کی ہی ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے جو معمر بن راشد کے واسطے سے امام زہری سے مروی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"......فَلَمَّا حُكِّمَ الْحَكَمَانِ فَاجْتَمَعَا بِأَذْرُحَ، وَافَاهُمَا الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ، وَأَرْسَلَ الْحَكَمَانِ إِلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، وَإِلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الزُّبَيْرِ، وَوَافَى رِجَالًا كَثِيرًا مِنْ قُرَيْشٍ"۔

جب دو آدمی فیصل بنا دیے گئے اور وہ" اَذرُح" کے مقام پر جمع ہوئے تو حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) بھی وہاں پہنچ گئے اور ان حکمین نے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہم) کو خاص طور پر بلاوا بھیجا اور ان کے علاوہ قریش کے بہت سے لوگ بھی پہنچے۔

(مصنف عبدالرزاق الصنعانی، ج5ص452)

اس سے مزید تاکید ہوتی ہے کہ یہ اجتماع قضیہ تحکیم کے وقت کا ہے، یاد رہے! جب ایک روایت کی تشریح دوسری صحیح روایت سے ہو جائے تو وہاں کسی شارح کے اپنے قول کی ضرورت نہیں رہتی، اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لیے اسی قول کو صحیح فرمایا ہے جس کی تائید مصنف عبد الرزاق کی روایت کر رہی ہے، لہٰذا اس واقعہ کو یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے ساتھ جوڑنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس بارے میں محمود عباسی اور لعل شاہ صاحب، دونوں نے غلطی کھائی ہے۔

ع اسپ تازی بھی کھاجاتا ہے ٹھوکر گا ہے

حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کب ہوئی؟

دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ صحیح بخاری کی زیرِ بحث حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ بیان کرنا اور ان کا "هلّا أجبته" کہنا مذکور ہے، جبکہ علماءِ اسماء الرجال اور اربابِ سیر نے حضرت حبیبؓ بن مسلمہ کی وفات سنہ 42ھ میں بتائی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وقال ابن سعد: لم يزل مع معاوية في حروبه، ووجّهه إلى أرمينية واليا فمات بها سنة اثنتين وأربعين ولم يبلغ خمسين"۔

ابن سعد کا قول ہے کہ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ جنگوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں آرمینیا کا والی بنا کر بھیجا اور وہیں سنہ 42ھ میں ان کی وفات ہو گئی، ان کی عمر پچاس سال بھی پوری نہ ہوئی۔

(الاصابة في تمييزالصحابة، ج2ص466، دار هجر، القاهرة)

ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں:

"ثُمَّ وَجَّهَهُ إِلَى أَرْمِينِيَةَ وَالِيًا عَلَيْهَا. فَمَاتَ بِهَا سَنَةَ اثْنَتَيْنِ وَأَرْبَعِينَ وَلَمْ يَبْلُغْ خَمْسِينَ سَنَةً"۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں (یعنی حبیب بن مسلمہ کو) آرمینیا کا والی بنا کر بھیجا، پس ان کی

وفات وہیں سنہ 42ھ میں ہوگئی اور وہ پچاس سال کی عمر تک نہ پہنچ سکے۔

(الطبقات الكبرى لابن سعد، ج6ص541، مكتبة الخانجي القاهرة)

نیز ابن سعد نے یہیں چند سطریں پہلے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً 12 سال تھی۔

ابن عبدالبر القرطبی، خلیفہ بن خیاط، ابن الأثیر الجزری، امام بغوی، امام حاکم اور حافظ ابن حجر (وغیرہم) سب نے ان کی وفات کا سال 42ھ ہی لکھا ہے اور کسی نے بھی ان کے وفات کے سال میں کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا۔

(الاستيعاب، ج1ص193، دار الفكر بيروت / أُسد الغابة، ج1ص681، دار الكتب العلمية بيروت / معجم الصحابة للبغوي، ج2ص118، دار البيان الكويت / تاريخ خليفة بن خياط، ص205، دار طيبة الرياض /المستدرك للحاكم، ج3ص390، دار الكتب العلمية بيروت / تهذيب التهذيب، ج2ص191، دائرة المعارف حيدر آباد،الهند)

لعل شاہ صاحب کی ایک تلبیس

لعل شاہ صاحب کو اچھی طرح علم تھا کہ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی سن وفات میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ تقریباً تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی وفات 42ھ میں ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے تلبیس پیدا کرنے کے لئے امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی "تاریخ الاسلام" کے حوالے سے یہ لکھ دیا کہ:

"سنئے حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات میں اختلاف ہے، بعض نے سنہ 42ھ لکھی اور بعض نے سنہ 44ھ اور بعض نے کہا پچاس کو نہیں پہنچ سکے۔ تاریخ الاسلام للذہبی ص 209 ج2"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 300)

یہ بات درست ہے کہ "تاریخ الاسلام" میں یہ بات اسی طرح لکھی ہے لیکن یہاں جو امام ذہبی نے لکھا ہے کہ بعض نے ان کی وفات کا سال سنہ 44ھ بتایا ہے یہ کسی کا شاذ قول ہوگا واللہ اعلم، ہم نے جن مصادر کا پہلے حوالہ دیا ہے ان میں سے کسی ایک میں بھی سنہ 44ھ والا قول مذکور نہیں، امام ذہبی نے خود اپنی دوسری کتاب "سير اعلام النبلاء" میں بھی صرف ایک ہی قول یعنی سنہ 42ھ میں وفات والا ذکر کیا ہے اور کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"وَوَلِيَ أَرْمِينِيَةَ لِمُعَاوِيَةَ، فَمَاتَ بِهَا، سَنَةَ اثْنَتَيْنِ وَأَرْبَعِيْنَ" ۔
وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آرمینیا کے والی رہے اور وہیں سنہ 42ھ میں ان کی وفات ہوگئی۔

(سیراعلام النبلاء، ج3ص189، مؤسسة الرسالة بیروت)

پھر لعل شاہ صاحب نے یہاں اس تلبیس کی کوشش کی ہے کہ" پچاس تک نہ پہنچنے" کا مطلب یہ ہے کہ حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 50ھ سے پہلے کسی بھی وقت ہوئی تھی، جبکہ یہ بات مؤرخین نے اس طرح لکھی ہے کہ" ان کی عمر پچاس سال تک نہ پہنچ سکی" یعنی وہ عمر کے پچاس سال پوری کرنے سے پہلے ہی وفات پاگئے، اب معلوم نہیں لعل شاہ صاحب سے یہاں واقعی چوک ہوگئی یا انہوں نے جان بوجھ کر" پچاس سال عمر نہ ہونے" کو یہ بنادیا کہ" وہ پچاس ہجری کو نہ پہنچ سکے" تاکہ وہ ان کی وفات کے سال میں اختلاف ثابت کرسکیں اور ان کی وفات سنہ 44ھ تا50ھ کے زمانہ میں ثابت کرسکیں؟

الغرض! سوال یہ ہے کہ اگر حضرت حبیب ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 42ھ میں ہو چکی تھی تو یقیناً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ بات اس سے پہلے ہی بتائی ہوگی، اور یقیناً یہ واقعہ اس سے بھی پہلے کا ہوگا، اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت سنہ 41ھ سے شروع ہوئی تھی، لیکن لعل شاہ صاحب تو یہ سب کچھ سنہ 44ھ میں ثابت کررہے ہیں، یا کم ازکم وہ یہ ثابت کردیتے کہ سنہ 41ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد سے حضرت حبیب ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات یعنی سنہ 42ھ تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کا سفر کب کیا اور اسی میں یہ خطبہ دیا جو لعل شاہ صاحب کے دعوے کے مطابق یزید کی ولی عہدی سے متعلق ہے؟

اور اگر بالفرض لعل شاہ صاحب بخاری کی یہی بات مان لی جائے کہ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 44ھ میں ہوئی تھی، تو پھر دوسری طرف لعل شاہ صاحب کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ:

" واضح حقیقت ہے کہ قضیہ استخلاف یزید سنہ 44ھ میں پیش آیا اور اسی سال مدینہ میں اجتماع قبل از حج ہوا اور اس کی کاروائی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہما کو ان کی زندگی کے آخری دنوں میں سنائی ہو شاید سنہ 44ھ میں ہی برموقعہ حج سنائی ہو"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 300)

اور ظاہر ہے حج کا مہینہ یعنی ذی الحج، اسلامی سال کا آخری مہینہ ہوتا ہے، تو اب کیا لعل شاہ صاحب پر لازم نہ تھا کہ وہ پہلے یہ ثابت کرتے کہ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سنہ 44ھ کے حج تک زندہ تھے اور پھر اسی ماہ ذی الحج سنہ 44ھ ختم ہونے سے پہلے ان کی وفات ہوگئی؟ اور وفات بھی مکہ و مدینہ میں سے کہیں ہوئی آرمینیا وغیرہ میں نہیں ہوئی۔ پھر وہ یہ بھی ثابت کرتے کہ سنہ 44ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حج سے پہلے مدینہ گئے تھے اور بعد میں حج کے لئے مکہ تشریف لے گئے تھے۔

ایک اشکال یہ بھی ہے کہ بخاری کی اس روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ خطبہ اس وقت دیا جب لوگ چلے گئے تھے، مجمع چھٹ گیا تھا (فلما تفرق الناس)، تو اگر اس واقعہ کو یزید کی ولی عہدی کے اعلان کے ساتھ جوڑا جائے تو تاریخی روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کا اعلان جس طرح بھی کیا، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور ان کی طرح اس ولی عہدی سے اختلاف کرنے والے ان کے دیگر ساتھیوںؓ کی موجودگی میں کیا تھا، اس اعلانِ عام کے وقت نہ یہ حضرات بولے تھے اور نہ سارے مجمع میں سے کوئی اور شخص ہی بولا تھا، خواہ اس لئے کہ بولنے سے جماعت میں پھوٹ پڑ جانے اور خون ریزی شروع ہو جانے کا خطرہ تھا (کما فی روایۃ البخاری)، یا وجہ جو بھی ہو، یہ معاملہ جس طرح بھی طے پایا، پا گیا تھا، لوگ چلے گئے تھے، مجمع چھٹ گیا تھا، جو کچھ ہونا تھا ہو گیا تھا، حضرت معاویہؓ نے جو کچھ کرنا تھا، جس طرح بھی کیا، کر ڈالا تھا، سوال یہ ہے کہ جھگڑے اور اختلاف والی بات کا مجمع عام میں فیصلہ ہو چکنے یا اعلان ہو چکنے اور لوگوں کے جا چکنے کے بعد حضرت معاویہؓ کو بیٹھے بٹھائے (بقول لعل شاہ صاحب) اس اشتعال انگیز اور چبھتے ہوئے خطبے کی آخر کیا سوجھی اور کیوں سوجھی؟ یہ تو "آبلا گلے پڑ، نہیں پڑتی تو بھی پڑ" کے بمصداق، لڑائی جھگڑے اور فتنے فساد نیز جماعت میں اس تفرقہ پردازی اور خون ریزی کو دعوت دینے والی بات تھی جس سے بچنے کے لئے حضرت ابن عمرؓ وغیرہ لب کشائی سے باز رہے تھے، ایسے مواقع میں تو معمولی سے معمولی سمجھ بوجھ والا آدمی بھی ایسی اختلافی بات، ختم ہو چکنے کے بعد دوبارہ اس کو چھیڑنا اور اٹھانا پسند نہیں کیا کرتا، چہ جائیکہ حضرت معاویہؓ جیسا یکے از دہاۃ العرب، جہاں دیدہ اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ انسان؟

پھر یہ بھی کتب تاریخ میں ہی لکھا ہے کہ اُس دور کی ساری اسلامی مملکت کی قریب بالکلّ اکثریت، ولی عہدی کی معاملے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے متفق ہوگئی تھی، چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حصر کے ساتھ

بیان کیا ہے کہ:

"...فَبَايَعَ لَهُ النَّاسُ فِي سَائِرِ الْأَقَالِيمِ، إِلَّا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ وَالْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَابْنَ عَبَّاسٍ فَرَكِبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى مَكَّةَ مُعْتَمِرًا..."۔

سوائے عبد الرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے باقی تمام صوبوں اور علاقوں کے لوگوں نے یہ بیعت کرلی تھی، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(البداية والنهاية، ج8ص116، وزارة الاوقاف، قطر)

لہٰذا حضرت معاویہؓ اگر چاہتے تو اسی وقت یزید کی ولی عہدی کا اکثریتی فیصلہ سنا سکتے تھے لیکن انہوں نے اس ارادے سے کہ فیصلہ اتفاقی ہو جائے ان چار حضرات سے بھی اس سلسلہ میں گفتگو کی، جب وہ حضرات متفق نہ ہوئے تو تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہؓ نے ان حضرات کی موجودگی میں ہی اکثریتی فیصلہ سنا دیا، ان حضرات کے اختلاف سے حضرت معاویہؓ کے فیصلے پر کوئی قابل ذکر منفی اثر نہیں پڑا، ان کے اتفاق کے بغیر بھی ان کا مقصد حاصل اور پورا ہو گیا، جب حضرت معاویہؓ کا مقصد ان حضرات کے بغیر بھی حاصل تھا تو سوال یہ ہے کہ پھر ان کو ایسا تعریضانہ خطبہ دینے کی آخر مجبوری ہی کیا پیش آ گئی تھی؟

ایک اشکال یہ بھی ہے کہ یزید کی ولی عہدی کے موقع پر زیرِ بحث مسئلہ ولی عہدی کا ہی تھا، کسی کے قومی و خاندانی استحقاقِ خلافت یا اس کی احقّیت بالخلافت کا مسئلہ زیرِ بحث تو کیا ہوتا اس کا تو دور دور تک کہیں نام ونشان تک بھی نہ تھا، نیز یزید کے مقابلہ میں کوئی اور خلافت کا نہ تو امیدوار یا دعویدار تھا اور نہ عہدۂ خلافت کے لئے متعدد خاندانوں کے متعدد امیدواروں کے درمیان کسی قسم کا کوئی مقابلہ ہی ٹھنا ہوا تھا، نہ اس موقع پر کسی نے کسی قسم کے خاندانی وقومی استحقاقِ خلافت یا احقّیت بالخلافت کا کوئی اعتراض ہی اٹھایا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر اور ان کے ہمنوا تین یا چار صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا بھی اختلاف یہ نہ تھا کہ ایک خلیفہ کے بعد دوسرا خلیفہ بھی اسی خاندان (مثلاً بنی امیہ) کا کیوں بنایا جا رہا ہے، بلکہ ان کا اختلاف یہ تھا کہ ایک خلیفہ کی موجودگی اور حیات میں

ہی دوسرے خلیفہ کے لئے بیعت کیوں لی جارہی ہے، خصوصاً جبکہ وہ موجودہ خلیفہ کا اپنا بیٹا بھی ہے، بلکہ حافظ سیوطیؒ کی تاریخ الخلفاء کی روایت کے مطابق تو ان حضرات کو یزید کی بیعت سے بھی انکار نہ تھا بلکہ وہ، بیک وقت دو خلیفوں کی بیعت سے اختلاف کر رہے تھے، چنانچہ انہوں نے حضرت معاویہؓ سے فرمایا تھا :

" بیک وقت آپ دونوں باپ بیٹوں کی بیعت نہیں کی جاسکتی، آپ بذاتِ خود اگر امارت (خلافت) سے اکتا چکے ہیں تو ایک طرف ہو جائیے پھر اپنے بیٹے کو آگے لائیے ہم اسی کی بیعت کرلیں گے (هلُمّ ابنك فلنبايعه)"۔

(تاريخ الخلفاء، ص327، وزارة الاوقاف قطر)

یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) نے یزید کی بیعت کرلی تھی اور آخر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر راضی ہوگئے تھے، اگر بات کسی قوم قبیلے کے قومی و خاندانی استحقاقِ خلافت یا اس کی احقّیت بالخلافت کی ہوتی تو یہ حضرات، یزید کی بیعت نہ کرتے نہ اس پر کبھی راضی ہوتے۔

تو ولی عہدئ یزید کے موقع پر جب کسی کا قومی و خاندانی استحقاقِ خلافت سرے سے زیرِ بحث ہی نہ آیا تھا تو حضرت معاویہؓ نے اپنے اس خطبہ میں بالکل بے موقع و بے محل اور بالکل بے جوڑ اس کا ذکر آخر کیوں چھیڑا؟ کیا وہ، خطبہ کی موضوعِ بحث سے مطابقت و عدم مطابقت جیسی موٹی سی بات بھی نہ سمجھتے تھے؟

پھر ایک اشکال یہ بھی ہے کہ اس روایت کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بات کا اپنے دل میں جو جواب سوچا تھا اس کے الفاظ "احق بهذا الامر من قاتلك واباك على الاسلام" منقول ہیں، جن کا مفہوم ہے کہ" اس امر کا زیادہ حق دار وہ ہے جس نے آپ سے اور آپ کے باپ سے اسلام پر جنگ کی"، اس جملے میں اس قتال یا ان جنگوں کی طرف اشارہ ہے جن میں مسلمانوں کے مقابل کفار کے لشکر میں حضرت معاویہ اور ان کے والد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہما رہے ہوں، جبکہ یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے (حالت کفر میں بھی) مسلمانوں کے مقابل کفار کے لشکر میں شامل ہو کر کسی جنگ میں حصہ لیا ہو۔

ہم ابھی اس روایت کی مزید تفصیل میں نہیں جارہے یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ ہم لعل شاہ صاحب کی طرح "بال کی کھال" نہیں اتار رہے، سر دست ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ لعل شاہ صاحب کا یہ دعویٰ کہ یہ واقعہ سنہ 44ھ کا ہے اور مدینہ کا ہے اور اس کا تعلق یزید کی ولی عہدی سے ہے یہ اس روایت سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اسی روایت کے دوسرے طریق میں" فلما تفرق الحكمان" کے الفاظ نے لعل شاہ صاحب کی ان تمام موشگافیوں کا بھی قلع قمع کر دیا ہے جو انہوں نے" فلما تفرق الناس" کی توجیہ میں ذکر کی ہیں، وہ خود بھی اس روایت کے بعض الفاظ سے پریشان ہیں چنانچہ وہ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت نقل کر کے اپنے باطن کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"ممکن ہے شاہ صاحب کا مطلب یہ ہو کہ اصل عبارت اس طرح تھی فلما اجتمعوا خطب معاوية اور زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ شاہ صاحب کا مطلب یہ ہو کہ اصل عبارت اس طرح تھی فلما خطب معاوية تفرق الناس کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، لوگ بھاگ گئے، کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خطبہ نہایت تہدید آمیز تھا گویا زبردستی بیعت لینا چاہتے تھے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 307)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب اپنا مافی الضمیر یوں انڈیلتے ہیں کہ :

" راقم الحروف نے ان الفاظ کا جو معنی سمجھا وہ یہ ہے کہ جب لوگ متفرق ہو گئے یعنی ایک رائے پر مجتمع نہ ہو سکے تب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا، خطبے کے متن کا ضروری حصہ امام بخاری نے ضبط کیا، صحیح بخاری کی اسی زیر بحث روایت میں ہے قال من كان يريد ان يتكلم في هذا الامر فليطلع قرنه فلنحن احق به منه ومن ابيه کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص اس بارے میں کلام کرنا چاہتا ہے وہ سر اٹھائے بھلا ہم اس خلافت کے زیادہ مستحق ہیں اس سے بھی اور اس کے باپ سے بھی۔ قرین قیاس ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما اس مجلس میں موجود نہ تھے، ورنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی موجودگی میں یہ تہدید آمیز و اشتعال انگیز کلمات نہیں کہہ سکتے تھے .... بھلا ان کی موجودگی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کلمات مذکورہ جو نہایت درجہ تحقیر آمیز ہیں کیونکر کہہ سکتے

ہیں، حاشاوکلاہر گز نہیں، ہمارے خیال میں یہ کلمات تعریض ہیں، عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ پر جو مروان کے خطبہ میں بول اٹھے تھے، یا ممکن ہے یہ تعریض ہو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حسین ابن علی رضی اللہ عنہما پر، تاہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس قول میں فلنحن احق به منه ومن ابيه کا جملہ نازیبا ہے کیونکہ اس کی زد ابوبکر، عمر اور علی (رضی اللہ عنہم) پر پڑتی ہے"۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 307و308)

اور اس سے پہلے وہ لکھ چکے ہیں کہ:

"جو تہدید آمیز تقریر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کی اس کے لب ولہجہ اور الفاظ کی کرختگی سے نمایاں ہوتا ہے کہ وہ نہایت غصہ میں تھے اور مدمقابل کو سامنے آنے کی دعوت جس تحکمانہ انداز میں دی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت عہد کا قضیہ مشورے سے طے کرنا نہیں چاہتے تھے، سطوتِ حکومت سے متغلبانہ طریق پر منوانا چاہتے تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 303)

قارئین محترم! یہ ہے اس روایت کو پیش کرنے سے لعل شاہ صاحب کی اصل غرض وغایت، کھینچ تان کر آخر ان کی تان یہاں آکر ٹوٹی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی منوانے کے لئے یہ دھمکی آمیز اور اشتعال انگیز الفاظ کہے تھے، اور وہ زور زبردستی سے اپنی حکومت اور طاقت کے بل بوتے پر یہ بات منوانا چاہتے تھے، اگر حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید (رضی اللہ عنہما) جیسے کبار صحابہ وہاں موجود ہوتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایسے الفاظ کہنے کی جرات نہ ہوتی، اور لعل شاہ صاحب کے خیال میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) پر زد پڑتی ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں اپنے خطبہ میں حضرات ابوبکر وعمر وعلی رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسے نازیبا الفاظ کہے اور کسی ایک صحابی نے نہ انہیں ٹوکا اور نہ انہیں جواب دیا، ظاہر ہے وہاں اکیلے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تو نہیں تھے، سنہ 44ھ میں مدینہ منورہ میں کئی کبار صحابہ اور بھی تھے۔

چلیں اور صحابہ کرام تو (بقول لعل شاہ صاحب) خوں ریزی کے خوف، یا لالچ وغیرہ کسی اور وجہ سے خاموش رہے ہوں گے، لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ وہ تین حضرات تو وہاں یقیناً موجود رہے ہوں گے

جن کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس بارے میں مکالمہ ہوا تھا، میری مراد سیدنا عبدالرحمن بن ابی بکر، سیدنا عبداللہ بن زبیر اور سیدنا حسین بن علی (رضی اللہ عنہم) سے ہے، کیا یہ حضرات بھی یہ "تہدید آمیز کرخت الفاظ" سن کر خاموش رہے؟ جب کہ ان کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنی اختلافی رائے کا برملا اظہار کرنا کتب تاریخ میں مذکور ہے، اب اس اجتماع میں انہیں کس بات کا خوف تھا؟

چلیں باقیوں کو رہنے دیں، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما تو وہ ہیں جو والیِ مدینہ مروان بن الحکم کے خطبہ کے دوران بول پڑے تھے اور بقول لعل شاہ صاحب اسی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ آنا پڑا تھا، تو وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ان "تہدید آمیز" الفاظ پر کیوں نہ بولے؟ کیا وہ اس وقت مدینہ منورہ میں نہیں تھے؟

لعل شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> "چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے یہی کچھ سمجھا اور اشارتِ فتنہ اور خونریزی کے اندیشہ سے خاموش ہو گئے۔ روایت میں بھی اہل محفل کا خاموش رہنا تو مذکور ہے مگر کسی صاحب کا رضیتُ کہنا اور بیعت کے لئے دست دراز کرنا ثابت نہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 303)

تو سوال یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ تو اشارتِ فتنہ اور خونریزی کے خوف سے خاموش رہے (اور بعد میں انہوں نے یزید کی بیعت خلافت بھی کر لی)، باقی لوگوں نے اگر "رضیتُ" نہیں کہا تو کیا "انکرتُ" کہا؟ پورے ذخیرہ کتب میں ولی عہدی کے قضیہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کرنے والے آپ کو صرف چار یا پانچ نام ہی ملیں گے، خود لعل شاہ صاحب نے اقرار کیا ہے کہ:

> " سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کر لی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

یہاں "چند زعمائے مدینہ" سے مراد یقیناً وہی تین یا چار حضرات ہیں، تو لعل شاہ صاحب نے یہ دعویٰ کس بنیاد پر کیا ہے کہ ان تین چار حضرات کے علاوہ باقی "عامۃ الناس" نے بیعت کر لی تھی"؟ یقیناً انہوں نے

اپنی فہم وفراست (Common Sense) کی بنیاد پر ہی یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب اس قضیہ میں اختلافی رائے رکھنے والوں کا ناموں کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کے سوا باقی اکثریت کی رائے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے موافق تھی۔ یہاں یہ مطالبہ کرنا کہ باقی تمام لوگوں سے یہ ثابت کیا جائے کہ انہوں نے "رضیتُ" کہا ہو، یا دلیل دی جائے کہ انہوں نے "بیعت کے لئے دست دراز کیا" یہ نہایت غیر معقول مطالبہ ہے، جبکہ خود لعل شاہ صاحب بھی مانتے ہیں کہ "بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے بیعت کرلی تھی"۔

یاد رہے! لعل شاہ صاحب نے "فلما تفرق الناس" (جب لوگ منتشر ہو گئے) کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ:

"جب لوگ متفرق ہو گئے یعنی ایک رائے پر مجتمع نہ ہو سکے تب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 307)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ کے وقت بھرپور مجمع تھا، یقیناً اس میں وہ تمام لوگ موجود تھے جو اس مسئلہ میں اختلافی رائے رکھتے تھے، اور اگر بقول لعل شاہ صاحب یہ اجتماع حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ولایت عہد کا قضیہ حل کرنے کے لئے بلایا تھا تو قرین قیاس یہی ہے کہ انہوں نے مدینہ میں موجود تمام کبار وصغار صحابہ کرام کو دعوت دی ہوگی اور ان میں خاص طور پر ان حضرات کی موجودگی ضرور یقینی بنائی ہوگی جنہوں نے اس قضیہ میں اپنی اختلافی آراء کا برملا اظہار کیا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما سے تو ایسا کوئی اختلاف ثابت ہی نہیں، تو وہ بالفرض اس اجتماع میں نہ بھی ہوتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

پھر لعل شاہ صاحب نے یہاں بھی روایت کے جملے "هذا الامر" کا معنیٰ "خلافت" کیا ہے، یہی ان کی غلطی کی بنیاد ہے، انہوں نے "تفرق الناس" پر اٹھنے والے اشکال کو حل کرنے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں تو کی ہیں، نیز حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کو سنہ 44ھ یا 50ھ تک لیجانے کے لئے تلبیس کا سہارا بھی لیا ہے، لیکن ان کا ذہن اس طرف کیوں نہ گیا کہ اس "هذا الامر" سے کچھ اور بھی تو مراد ہو سکتا ہے؟ جبکہ یقیناً ان کی نظر سے "فتح الباری" کا یہ مقام ضرور گذرا ہوگا جس میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "فلما تفرق الحکمان" والی

روایت کا حوالہ دے کر یہ بات لکھی ہے کہ یہ واقعہ تحکیم کے فوراً بعد کا ہے۔

کیا" هذا الامر " سے مراد خلافت وحکومت ہے؟

آئیے ایک نظر اس طرف بھی ڈالتے ہیں کہ کیا" هذا الامر " سے مراد" خلافت" ہے یا اس کا مطلب کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ نیز کیا واقعی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی پر تعریض کی تھی؟ پیش کردہ روایت میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

"فَلَمْ يُجْعَلْ لِي مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ" ۔

یعنی اس معاملہ میں میرے لئے کچھ نہیں رکھا گیا ہے، اس کا جو مفہوم لعل شاہ صاحب نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ" اجلاس میں بعض اہم شخصیتوں کو حاضر ہونے کی دعوت نہیں دی گئی تھی (استخلاف یزید، صفحہ 302) یہ نہ جانے کن الفاظ کا ترجمہ ہے؟ دراصل لعل شاہ صاحب یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ یہ اجتماع بھرپور نہ تھا، کئی اکابر صحابہ اس میں موجود نہ تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

" مدینہ شہر میں اکابر صحابہ کی موجودگی بھی محل نظر ہے، بہت سے صحابہ نے دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کرلی تھی، اصحاب بدر و بیعت رضوان میں سے چند ہی صحابہ زندہ تھے، مدینہ کے اجتماع میں ان کی حاضری معلوم نہ ہوسکی" ۔

(استخلاف یزید، صفحہ 303و304)

لعل شاہ صاحب نے یہ بات خاص طور پر اسی لئے لکھی ہے کہ سوال اٹھتا تھا کہ چلو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے تو فتنہ کے خوف سے خاموشی اختیار کی، مدینہ کے باقی صحابہ، خاص طور پر وہ صحابہ جن سے صراحت کے ساتھ یزید کی ولی عہدی کی تجویز کی علی الاعلان مخالفت منقول ہے ان میں سے کوئی کیوں نہ بولا؟ تو لعل صاحب کہنا چاہتے ہیں کہ کئی صحابہ نے تو دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کرلی تھی اور اصحاب بدر و اصحاب رضوان میں سے جو صحابہ کرام زندہ تھے ان کی اس اجتماع میں حاضری معلوم نہ ہوسکی۔

یہ بھی لعل شاہ صاحب کا اپنا تخیل ہی ہے، ورنہ (جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ یہ اجتماع یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں تھا اور مدینہ میں ہوا تھا، اور ان کے ہی بقول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک جتنا اہم یہ قضیہ تھا

اتنا کوئی اور نہ تھا، اور خاص طور پر اس مسئلے کے لئے دمشق سے سفر کر کے وہاں تشریف لائے تھے) تو کیسے ممکن ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں موجود کبار و صغار صحابہ کو نہ بلایا ہو؟ کیا وہ مدینہ کے عام غیر معروف لوگوں سے بیعت لینے کے لئے یہاں تشریف لائے تھے؟ یا حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سمیت ان حضرات سے بات چیت کے لئے آئے تھے جنہوں نے ولی عہدی کی تجویز کی کھل کر مخالفت کی تھی؟ لہٰذا قرین قیاس یہی ہے (اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ یہ اجتماع اسی ولی عہدی والے قضیے سے متعلق تھا) کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے تمام صحابہ کرام کو ضرور بلایا ہوگا، لیکن زیر بحث روایت میں کسی ایک کا بھی کھڑے ہو کر ان کے سامنے اپنی اختلافی رائے کا اظہار کرنا مذکور نہیں، تو سوال اپنی جگہ قائم رہا کہ وہ سب کس وجہ سے خاموش رہے؟

بہرحال! حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کے اصل عربی الفاظ میں "خلافت و امارت" کا لفظ موجود نہیں ہے اس لئے "هذا الامر" سے حکومت یا خلافت مراد لینے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ یہاں مسلمانوں کے معاملات بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور ممکن ہے ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا جملہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بطور شکوہ نہیں بلکہ بطور حکایت کہا ہو۔ یعنی آپ مذکورہ اجتماع میں شرکت نہ کرنے کی وجہ بتا رہے تھے کہ مسلمانوں کے معاملات سے متعلق انہیں کوئی ذمہ داری نہیں سونپی گئی ہے اس لئے ان کا اس اجتماع میں شریک ہونا ضروری نہیں ہے۔

لہٰذا اس جملہ کا یہ مفہوم مراد لینا کہ وہ اس بات کا شکوہ کر رہے تھے کہ انہیں خلافت و امارت کی کوئی ذمہ داری کیوں نہیں دی گئی، ہمارے خیال میں ان الفاظ کا یہ مفہوم درست نہیں ہے کیونکہ یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے پوری زندگی میں کبھی بھی خلافت و امارت کی خواہش کی ہی نہیں۔ لہٰذا خلافت و امارت نہ پانے پر وہ شکوہ کیونکر کر سکتے ہیں؟

علاوہ ازیں خود ان کے والد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی اشارہ تھا کہ ان کے فرزند ارجمند عبداللہ رضی اللہ عنہ کے لئے خلافت و امارت مناسب نہیں، لہٰذا یہ کیسے مان لیا جائے کہ اپنے والد محترم کی منشاء کے خلاف بلکہ اپنے معروف مزاج کے خلاف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خلافت و امارت نہ ملنے پر شکویٰ کریں؟

اور بعض روایات میں تو آتا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی

کو خلیفہ بنا رہے تھے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد لوگوں نے آپ کو لالچ دی اور دھمکایا بھی لیکن کسی بھی صورت میں آپ خلیفہ بننے پر راضی نہ ہوئے۔

چنانچہ محمد بن سعد (م 230ھ) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ:

"لَمَّا قُتِلَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ قَالُوا لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ: إِنَّكَ سَيِّدُ النَّاسِ وَابْنُ سَيِّدٍ فَاخْرُجْ نُبَايِعْ لَكَ النَّاسَ. قَالَ: إِنِّي وَاللَّهِ لَئِنِ اسْتَطَعْتُ لا يُهَرَاقُ فِي سَبَبِي مِحْجَمَةٌ مِنْ دَمٍ. فَقَالُوا: لَتَخْرُجَنَّ أَوْ لَنَقْتُلَنَّكَ عَلَى فِرَاشِكَ. فَقَالَ لَهُمْ مِثْلَ قَوْلِهِ الأَوَّلِ. قَالَ الْحَسَنُ: فَأَطْمَعُوهُ وَخَوَّفُوهُ فَمَا اسْتَقْبَلُوا منه شيئا حتى لحق بالله"۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ آپ لوگوں کے بڑے ہیں اور ایک بڑی شخصیت کے فرزند ہیں پس نکلیں ہم آپ کے لئے لوگوں سے بیعت لیتے ہیں، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میری حتی المقدور کوشش ہے کہ میری وجہ سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہایا جائے (اس لئے آپ نے انکار کر دیا)، تو انہوں نے کہا کہ: اگر آپ نہیں نکلیں گے تو ہم آپ کو آپ کے بستر پر ہی قتل کر دیں گے، لیکن آپ نے پھر بھی پہلے والا جواب دیا۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو لالچ بھی دیا اور ڈرایا دھمکایا بھی لیکن انہیں آپ کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملا۔

(الطبقات الكبرى، ج4ص141، مكتبة الخانجي القاهرة)

اب قابل غور ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بغیر مانگے خلافت دی جا رہی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا، اس پر انہیں راضی کرنے کے لئے مال و دولت کی لالچ دی گئی اس پر آپ نے ٹھکرا دیا۔ پھر آپ کو دھمکی دی گئی اور جبراً خلیفہ بنانے کی کوشش کی گئی لیکن اس کے باوجود بھی آپ تیار نہ ہوئے۔ ایسے جلیل القدر صحابی کے بارے میں بغیر کسی واضح اور صریح دلیل کے ہم کیسے مان لیں کہ وہ خلافت و امارت نہ پانے پر شکویٰ کر رہے تھے؟ لہٰذا اس کی مناسب توجیہ یہی ہے کہ اگر اس روایت میں مذکور بات عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہی تھی تو بطور شکویٰ نہیں بلکہ بطور حکایت کہی ہوگی۔

اس لئے کیوں نہ یوں کہا جائے کہ جس اجتماع کا ذکر اس روایت میں ہے وہ کوئی ایسا اجتماع تھا جس میں سیدنا علی وسیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کے بیچ اختلاف کو ختم کرنے کے لئے صحابہ وتابعین اکٹھا ہونے والے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی (جیسا کہ مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے گذرا) لیکن آپ اس اجتماع میں شرکت نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ مسلمانوں کے سیاسی معاملات سے متعلق ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی، اسی لئے انہوں نے اپنی بہن رضی اللہ عنہا سے کہا کہ میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے اس لئے مجھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر ان کی بہن رضی اللہ عنہا نے انہیں سمجھایا کہ آپ اس اجتماعِ اکابر واعیان میں ضرور شرکت کریں، لوگوں کے لئے آپ کی رائے بہت اہمیت رکھے گی ممکن ہے آپ کے ذریعہ لوگوں میں صلح ہو جائے اس لئے آپ ضرور جائیں۔ یہ سن کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اس اجتماع میں شریک ہو گئے۔

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود کو حضرت ابو بکر، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) سے زیادہ خلافت کا حقدار سمجھتے تھے

جہاں تک بات ہے اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کی کہ :

”فَلَنَحْنُ أَحَقُّ بِهِ مِنْهُ وَمِنْ أَبِيه“ کہ ہم اس معاملہ میں اس سے اور اس کے باپ سے زیادہ حقدار ہیں....“

اور جن کلمات کو لعل شاہ صاحب نے تہدید آمیز، اشتعال انگیز اور نازیبا بتا کر یہ لکھا ہے کہ ان کی زد حضرات ابو بکر وعمر وعلی رضی اللہ عنہم پر پڑتی ہے، تو اس جملہ سے متعلق درج ذیل تین چیزیں سمجھنے کی ہیں

(1) اس جملے سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کس کو مراد لیا ہے؟

(2) اس جملہ میں جسے مراد لیا گیا ہے اس کے باپ کا حوالہ کس معنی میں ہے؟

(3) اس جملہ میں جس معاملہ سے متعلق بات کہی گئی ہے وہ معاملہ کون سا ہے؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی مراد

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس جملہ سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مختلف لوگوں نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے، بعض کے بقول سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں اور بعض کے بقول حضرت

ابن عمر اور ان کے والد رضی اللہ عنہما مراد ہیں ۔لیکن یہ دونوں باتیں بے دلیل ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی تخصیص کے عمومی طور پر یہ بات کہی ہے کیونکہ اول تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ عام ہیں دوسرے یہ کہ حضرت حسن یا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں ،تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ انہیں کیوں مراد لے سکتے ہیں؟

اور بعض روایات میں جو یہ ہے کہ اس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف تھا، تو یہ وضاحت صحابی ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ نیچے کے کسی راوی نے اپنی طرف سے یہ وضاحت کی ہے ،لہٰذا یہ معتبر نہیں ہے۔

بالخصوص جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف پروپیگنڈے سے کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ان کے کلام کا ایسا مطلب لے لیا گیا جو ان کی مراد تھی ہی نہیں مثلاً ایک موقع پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے متعلق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بات کہی جس کا مطلب بعض حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یزید کی بیعت نہ کرنے پر قتل کرنے کے ارادہ کا اظہار کیا تھا ۔لیکن جب دیگر حضرات نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں وضاحت طلب کی تو آپ نے اس افواہ پر حیرانی ظاہر کی اور اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں نے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا ہے میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتا ۔لہٰذا جب تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اپنے الفاظ میں صراحت نہ ملے ہم کسی دوسرے کی بات پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام قطعاً نہیں لگا سکتے ۔

رہی بات یہ کہ پھر حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جواب نہ دینے کی وجہ کیوں پوچھی جب کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ ان کی طرف نہیں تھا ؟ تو ممکن ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بیان کے لہجہ میں عدم اتفاق ظاہر ہوا ہو اس لئے ان سے جواب نہ دینے کی وجہ پوچھی گئی ۔لہٰذا ان سے یہ سوال بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ انہیں کی طرف تھا۔

خلاصہ یہ کہ اصل روایت کے اندر کسی بھی معین شخص کی طرف اشارہ کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس جملہ میں بغیر کسی شخص کے تعین کے عمومی طور پر اپنی بات کہی ہے۔

باپ کے حوالہ کا مفہوم

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اس جملہ میں عام شخص کی بات کرتے ہوئے اس کے باپ کا بھی

ذکر کیا ہے اسے عام طور سے حقیقت پر محمول کیا گیا ہے لیکن یہاں سیاق سے یہی ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے باپ کے حوالہ میں حقیقت مراد نہیں لی ہے بلکہ بطور محاورے کے یہ بات کہی ہے. چناں چہ اہل عرب کبھی کبھی بات میں تاکید پیدا کرنے کے لئے بطور محاورہ کسی شخص کا تذکرہ اس کے باپ کے ساتھ بھی کر دیتے تھے مثلاً کہتے ہیں :فلان افضل منك و من ابيك ۔یعنی فلاں تم سے اور تمہارے باپ سے بھی افضل ہے۔ اور یہاں باپ سے موازنہ مقصود نہیں ہوتا ۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا آپ فقیہ نہیں ہیں تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا :

"واللہ لأنا أفقه منك و من أبيك"

اللہ کی قسم! میں تم سے اور تمہارے باپ سے بھی زیادہ فقیہ ہوں

(أنساب الأشراف للبلاذري، ج4ص54، دار الفكر بيروت)

یہاں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے باپ کے حوالے میں حقیقت مراد نہیں لی ہے بلکہ بطور مبالغہ و محاورہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے والد کی طرف اشارہ کیا ہے ورنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ ہرگز نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ خود کو مبشّر بالجنہ اور جلیل القدر صحابی حضرت زبیر بن عوّام رضی اللہ عنہ سے بھی بڑا فقیہ بتلائیں۔

یا بالفاظ دیگر، اگر ایک منٹ کے لئے لعل شاہ صاحب کا یہ مفروضہ ہی مان لیا جائے کہ یہ الفاظ یزید کی ولی عہدی کے قضیہ سے متعلق ہیں تو بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ "نحن احق به منه ومن ابيه" محاورے کے طور پر بولے گئے ہیں، اور محاورہ کہتے ہیں اس کلمہ یا کلام کو جسے اہلِ زبان نے اس کے لغوی معنٰی سے ہٹ کر کسی خاص معنٰی کے لئے مخصوص کرلیا ہو، پھر وہ کلمہ یا کلام، اُن اہل زِبان کے ہاں اس مخصوص معنٰی ومفہوم میں ہی استعمال ہوا کرتا ہے اس کا اصلی معنٰی اور لغوی معنٰی مراد نہیں ہوا کرتا، مثلاً اُردو میں کہا جاتا ہے "سونے پر سہاگا" اس کا لغوی معنٰی ظاہر ہے، مگر محاورے میں وہ مراد نہیں ہوتا بلکہ مراد ہوتا ہے "نفع پر نفع"، "رونق پر رونق"، اسی طرح کہتے ہیں "ہاتھ پر سرسوں جمانا" اس کا لغوی معنٰی تو ہے "ہاتھ پر سرسوں ٹکانا، ٹھہرانا" لیکن محاورے میں اس کا معنٰی ہوتا ہے "مشکل کام کو فوراً انجام دینا" یا "طلسم باندھنا اور شعبدہ دکھانا"، یا مثلاً "قرطاسِ ابیض" کا لفظ بولا جاتا ہے، اس کا لغوی معنٰی تو ہے "سفید کاغذ" لیکن محاورے میں اس تحریر کو کہتے ہیں جو حکومت کی طرف سے اطلاع عام کے لئے شائع کی جاتی ہے۔

ایسے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مذکورہ الفاظ کا بھی لغوی معنیٰ تو اگرچہ وہی ہے جو بیان کیا جاتا ہے مگر محاورے میں ایسے الفاظ کسی بات یا مضمون کو زوردار اور مؤکد بنانے کے لئے استعمال ہوا کرتے ہیں، چنانچہ اُردو میں بھی کہتے ہیں" تیرے باپ سے بھی لوں گا" یعنی ضرور لوں گا،کبھی نہ چھوڑوں گا"، یا کہتے ہیں " تیرے باپ کا کیا اجارہ ہے" یعنی"تو دخل کیوں دیتا ہے،تو دخل دینے والا کون ہوتا ہے"۔اسی طرح یہاں بھی (اگراس کو یزید کی ولی عہدی کے ساتھ ہی جوڑا جائے تو) حضرت معاویہ ؓ کے ان الفاظ کا لغوی معنیٰ مراد نہ تھا، نہ کسی خاص فرد یا افراد کی طرف کوئی اشارہ تھا، بلکہ یزید کی ولی عہدی کا جو قریب بالکلّ اکثریتی فیصلہ یا اعلان کیا گیا تھا اس کو زوردار اور مؤکد بنانا مقصود تھا،مطلب یہ تھا کہ پورے غوروخوض اور رائے مشورے سے جو فیصلہ یا اعلان کیا گیا ہے اس سلسلے کا بس یہ آخری فیصلہ ہے،اب اس میں کسی بھی بڑے یا چھوٹے کے کہنے سننے سے کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقصد تو بس اتنا ہی تھا، آگے اس کو اگر بالفرض حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مخصوص افراد کی طرف اشارہ سمجھے تو یہ ان کا ایک طبعی وفطری ردِّعمل تھا،چونکہ ولی عہدی کے معاملہ میں اختلاف کرنے والے چار پانچ حضرات میں سے ایک یہ بھی رہے،اس لئے ممکن ہے وہ سمجھے ہوں کہ حضرت معاویہ ؓ کا اشارہ شاید ہماری طرف ہے، جیسے مثلاً دو آدمی آپس میں کوئی سرگوشی کرتے ہوئے کسی تیسرے آدمی کو دیکھنے لگیں تو اس کو خیال گزرنے لگتا ہے کہ یہ میرے بارے میں ہی کوئی سرگوشی کررہے ہیں، حالانکہ وہ اپنی کوئی بات کررہے ہوتے ہیں۔

تنبیہ : یہ بات لعل شاہ صاحب کے مفروضے کو درست فرض کرکے کی گئی ہے، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ اس خطبے کے یزید کی ولی عہدی کے قضیہ سے متعلق ہونے کی کوئی دلیل یا قرینہ اس روایت میں نہیں بلکہ دوسری روایت میں صراحت ہے کہ یہ تحکیم کے فوراً بعد کی بات ہے۔

اور اگر کسی کی پھر بھی ضد ہو کہ نہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ مخصوص افراد کی طرف ہی تھا تو پھر بھی ہم کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر، وغیرہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف نہ تھا بلکہ ان سبائی مفسدوں کی طرف تھا جن کے وجودِ نامسعود کا مقصدِ وحید ہی اسلامی نظامِ خلافت کو تاخت وتاراج کرنا تھا، جو اس کے لئے اپنے وجود کے روزِ اول سے ہی سرگرمِ عمل، نیز اسلام واہلِ اسلام خصوصاً خلفاء اسلام کے خلاف اپنی مفسدانہ ومنافقانہ

ریشہ دوانیوں میں مصروف چلے آرہے تھے۔ جنہوں نے حضرت عثمان اور حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کے خونِ ناحق سے اپنے ناپاک ہاتھ رنگین کیئے، مسلمانوں میں جمل وصفین جیسے فتنے اٹھائے، جو ریحانۃ النبی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے محض اس لئے دشمن ہو گئے اور ان کو "یا عار المؤمنین"، "یا مُذِلَّ المؤمنین" اور "یا مُسوِّد وجوه المؤمنین" جیسے گستاخانہ القاب سے نوازنے لگ گئے کہ انہوں نے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی اور خواہش کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے ان فتنہ پردازوں کے تفریق بین المؤمنین کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا۔ پھر یہ لوگ ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑ گئے، ان کو خلیفہ وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑکانا شروع ہو گئے، انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا، چنانچہ لعل شاہ صاحب نے بھی اقرار کیا ہے کہ عراق کے کچھ شرپسندوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی، چنانچہ وہ "البدایۃ والنہایۃ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حسین رضی اللہ عنہ کو دعوت دی کہ آپ معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں لیکن حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) مستقیم رہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 311)

تو یوں وقتی طور پر یہ لوگ بظاہر دُم دبا کر بیٹھ گئے، مگر پس پردہ اپنی یہودی الاصل سبائیانہ سازشوں میں مصروف رہے۔

ان کی یہ تمام فساد انگیزیاں اور فتنہ پردازیاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے تھیں، علاوہ ازیں کتابوں میں آتا ہے کہ خلافتِ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ میں جب وہ شام کے گورنر تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سبائی مفسدوں کی قیادت کو راہ پر لانے کی غرض سے شام ان کی نگرانی میں بھیج دیا تھا تو اس عرصہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان سے ذاتی طور پر واسطہ پڑ چکا تھا اور وہ ان کے ناپاک عزائم ومقاصد سے خوب اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔

شہادۃِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے لے کر یہاں تک کی ان کی مفسدانہ کارستانیوں کے پیشِ نظر کچھ بعید نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے معاملہ میں بھی مسلمانوں میں پھوٹ اور اختلاف کی ڈوری بھی یہ مفسد ہی پس

پردہ کہیں بیٹھے ہلاتے رہے ہوں، جیسے انگریز نے جب غیر منقسم ہندوستان پر قبضہ کیا اور اپنی حکمرانی کو طول دینے کے لئے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمت عملی اپنائی تو کہنے والے کہا کرتے تھے کہ "اگر کہیں سمندر کی تہ میں دو مچھلیاں لڑ رہی ہوں تو اس میں بھی انگریز کا ہاتھ سمجھو"، بس کچھ ایسا ہی حال اُس دور کے سبائی مفسدوں کا سمجھنا چاہئے کہ وہ بھی "لڑاؤ، خلافت مٹاؤ" والا شر انگیز پروگرام لے کر مسلمانوں کی صفوں میں منافقانہ گھسے اور ان میں ایسی سر پھٹول ڈالی کہ اُس دور کا کوئی کہنے والا اگر یہ کہتا تو بالکل بجا کہتا کہ " دنیا کے جس کونے میں بھی دو مسلمان آپس میں لڑ رہے ہوں، سمجھ لو کہ ان کی لڑائی میں سبائی مفسدوں کا ہاتھ ہے"۔

سبائی مفسدوں کی ان تمام ریشہ دوانیوں کے پیش نظر یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ حضرت معاویہ ؓ کا اشارہ اگر تھا تو ان سبائی مفسدوں کی طرف ہی تھا، حضرت عبداللہ بن عمرو غیرہ حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی طرف ہرگز ہرگز نہ تھا، سامنے چونکہ یہی حضرات ؓ تھے، سبائی مفسد سامنے نہ تھے بلکہ پس پردہ تھے اس لئے ممکن ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ذہن اپنے حضرات کی طرف گیا، سبائیوں کی طرف نہ گیا۔

متعلقہ معاملہ کی نوعیت

پھر عام طور سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہاں خلافت و حکومت کے معاملہ میں بات چل رہی ہے، حالانکہ اس بات کی کوئی قطعی دلیل اس روایت میں نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ روایات میں "الامر" خلافت کے لئے بھی بولا گیا ہے لیکن ہر جگہ اس لفظ سے خلافت ہی مراد نہیں ہوتی ہے اور یہاں بھی قرین قیاس یہی ہے کہ یہ خلافت کے معنی میں نہیں کیونکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقصد خود کو خلیفہ بنانا نہیں تھا بلکہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا تھا۔ لہٰذا یہاں پر معاملہ سے مراد وہ معاملہ ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مشن تھا اور وہ تھا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص۔ اسی معاملہ کے بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بات کہی ہے کہ میں ہر بولنے والے اور اس کے باپ سے اس معاملے میں زیادہ حقدار ہوں۔ یعنی خون عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کے بارے میں۔ اور یہ بات درست ہے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ حق دار سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

اور دوسری طرف بالکل صحیح روایت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ اعتراف و اقرار ثابت ہے کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے افضل نہیں، نہ ہی خلافت میں ان کے مخالف ہیں اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ خلافت

کے حقدار ہیں بلکہ ان کا مقصد صرف قاتلین عثمان سے قصاص لینا ہے، چنانچہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ یحییٰ بن سلیمان الجعفی رحمۃ اللہ علیہ (م 237ھ/ 238ھ) کی "کتاب صفین" کے حوالے سے یہ روایت ذکر کی ہے کہ:

"حدثنا يعلى بن عبيد، عن أبيه، قال: جاء أبو مسلم الخولاني وأناس إلى معاوية، وقالوا: أنت تنازع عليا، أم أنت مثله؟ فقال: لا والله، إني لأعلم أنه أفضل مني، وأحق بالأمر مني، ولكن ألستم تعلمون أن عثمان قتل مظلوما، وأنا ابن عمه، والطالب بدمه، فائتوه، فقولوا له، فليدفع إلي قتلة عثمان، وأسلم له. فأتوا عليا، فكلموه، فلم يدفعهم إليه"۔

ابو مسلم الخولانی اور کئی دوسرے لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے کہا: آپ علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرتے ہیں کیا؟ یا خود کو انکی طرح سمجھتے ہیں؟ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں! اللہ کی قسم! مجھے پتہ ہے کہ علی رضی اللہ عنہ مجھ سے افضل ہیں، اور خلافت کے مجھ سے زیادہ حقدار ہیں، لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ عثمان رضی اللہ عنہ مظلومانہ قتل کئے گئے، اور میں ان کا چچا زاد بھائی ہوں اور ان کے خون کا طالب ہوں، لہٰذا تم لوگ علی رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ قاتلین عثمان کو میرے حوالے کر دیں میں ان کی خلافت تسلیم کر لیتا ہوں۔ پھر یہ حضرات سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے بات کی لیکن علی رضی اللہ عنہ نے قاتلین عثمان کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے نہیں کیا۔

(سير أعلام النبلاء للذهبي، ج3ص140، مؤسسة الرسالة بيروت)

غور کریں کس طرح سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ صاف لفظوں میں کہہ رہے کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے افضل نہیں ہیں اور نہ خلافت میں ان سے زیادہ حقدار ہیں بلکہ وہ صرف قاتلین عثمان سے قصاص چاہتے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالعزیز پرہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ:

"خطوط من علي خير من آل أبي سفيان..."

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ تو رہے ایک طرف، ان کا نقشِ پا تک بھی (صرف معاویہ اور ابوسفیان سے نہیں بلکہ) ابوسفیان کی ساری آل اولاد سے افضل ہے۔

(الناهية عن طعن امير المؤمنين معاوية، ص 60، غراس للنشر والتوزيع الكويت)

نیز نقل کیا ہے کہ :

"أن رجلا سأل معاوية عن مسألة فقال: اسأل عنها عليا فهو أعلم، فقال: يا أمير المؤمنين جوابك فيها أحب إلي من جواب علي، قال: بئسما قلت، لقد كرهت رجلا كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعزه بالعلم عزا، ولقد قال له: أنت مني بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لا نبي بعدي، وكان عمر رضي الله عنه إذا أشكل عليه شيء أخذ منه. وأخرجه آخرون بنحوه وزاد بعضهم: قم لا أقام الله رجليك، ومحا اسمه من الديوان، ولقد كان عمر يسأله ويأخذ عنه ولقد شهدته إذا اشكل عليه قال: ههنا علي رضي الله عنه؟

ایک شخص نے حضرت معاویہؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا، انہوں نے فرمایا : حضرت علیؓ سے پوچھ لو، اس نے کہا : مجھے آپ کا جواب، مرتضوی جواب سے زیادہ پسند ہے، اس پر حضرت معاویہؓ نے اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تم نے بہت بری بات کہی ہے، تم نے اس شخصیت کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جنہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے علم کی بنا پر معزز سمجھتے تھے، اور اللہ کے رسول نے آپ سے فرمایا: اے علی! تیری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی مسئلہ درپیش آتا تو ان سے دریافت فرماتے یہ روایت مسند احمد کے علاوہ دوسری کتب میں بھی مروی ہے، اور بعض نے کچھ زیادہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سائل سے کہا: یہاں سے اٹھ جا، اللہ، تیرے پاؤں اٹھنے کے قابل نہ چھوڑے، پھر بیت المال سے وظیفہ پانے والوں کے رجسٹر سے اس کا نام کٹوا دیا اور کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے پوچھا کرتے تھے اور ان سے

استفادہ کیا کرتے تھے، میں نے خود دیکھا ہے کہ جب حضرت عمر ؓ کو کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو آپ پوچھتے: کیا علی (ؓ) یہاں موجود ہیں؟

(ایضا ص 58)

اسی طرح امام مالک ؒ نے روایت کیا ہے کہ:

"عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ رَجُلاً مِنْ أَهْلِ الشَّأْمِ يُقَالُ لَهُ ابْنُ خَيْبَرِيٍّ، وَجَدَ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلاً فَقَتَلَهُ،أَوْ قَتَلَهُمَا معاً، فَأَشْكَلَ عَلَى مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ الْقَضَاءُ فِيهِ- فَكَتَبَ إِلَى أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ يَسْأَلُ لَهُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ عَنْ ذلِكَ- فَسَأَلَ أَبُو مُوسَى عَنْ ذلِكَ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ:إِنَّ هذَا لَشَيْءٌ مَا هُوَ بِأَرْضِي-عَزَمْتُ عَلَيْكَ لَتُخْبِرَنِي- فَقَالَ أَبُو مُوسَى: كَتَبَ إِلَيَّ مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ اَن أَسْأَلَكَ عَنْ ذلِكَ- فَقَالَ عَلِيٌّ:أَنَا أَبُو حَسَنٍ! إِنْ لَمْ يَأْتِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَلْيُعْطَ بِرُمَّتِهِ"-

سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ ابن خیبری نامی ایک شامی شخص نے اپنے بیوی کے ساتھ (بدکاری کرتے ہوئے) ایک شخص کو پایا پھر اسے یا دونوں کو قتل کر ڈالا، تو حضرت معاویہ ؓ کے لئے اس میں فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے (عراق میں موجود) ابوموسی اشعری ؓ کو خط لکھا کہ وہ ان کے لئے اس مسئلہ میں حضرت علی ؓ سے جواب حاصل کر لیں، چنانچہ حضرت ابوموسی اشعری ؓ نے حضرت علی ؓ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے پوچھا کہ یہ واقعہ میرے علاقہ میں تو پیش نہیں آیا پہلے تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ یہ کہاں کا واقعہ ہے؟ اس پر حضرت ابوموسی اشعری ؓ نے (پوری بات عرض کرتے ہوئے) کہا کہ: حضرت معاویہ ؓ نے مجھے خط لکھا ہے کہ میں ان کے لئے آپ سے یہ مسئلہ دریافت کرلوں۔ تو حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ: میں ابوحسن ہوں (یعنی میرا خیال درست نکلا کہ یہ ہمارے علاقہ کا واقعہ نہیں ہے خیر مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ) اگر قاتل چار گواہ نہیں لاتا ہے تو اس کے قتل کا معاملہ مقتول کے

ورثاء کے حوالے کر دیا جائے (وہ قصاص یا دیت میں سے جو چاہیں مطالبہ کر سکتے ہیں)۔

(موطأ مالك، ج3ص556، مجموعة فرقان، دبي)

معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سیاسی اختلاف کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضل وکمال اور ان کے علم کے نہ صرف قائل تھے بلکہ ان سے استفادہ بھی کرتے تھے۔

چنانچہ مالکی فقیہ أبو الوليد سليمان بن خلف بن سعد بن أيوب القرطبي الباجي الأندلسي (م474ھ) اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَهَذَا يَدُلُّ عَلَى فَضْلِهِ وَتَوَقُّفِهِ فِيمَا لَا يَعْلَمُهُ وَسُؤَالُهُ عَنْ ذَلِكَ مَنْ يَثِقُ بِعِلْمِهِ وَيَتَسَبَّبُ إِلَيْهِ بِكُلِّ مَا يُمْكِنُهُ، وَإِنْ كَانَ الْمَسْئُولُ مُنَابِذًا لَهُ"۔

یہ واقعہ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو جس مسئلہ کا علم نہیں ہوتا تھا اس میں آپ توقف کرتے تھے اور ان لوگوں سے سوال کرتے تھے جن کے علم پر آپ کو اعتماد ہوتا تھا اور اس کے لئے ہر ممکن راستہ اختیار کرتے خواہ ایسے لوگوں سے ہی کیوں نہ پوچھنا پڑے جو (کسی معاملے میں) آپ سے اختلاف رکھتے ہوں۔

(المنتقىٰ شرح الموطأ، ج5ص285، مطبعة السعادة مصر)

دوسری طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسے ہی پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات رکھتے تھے، چنانچہ روایت ہے کہ صفین سے واپسی پر فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ، لَا تَكْرَهُوا إِمَارَةَ مُعَاوِيَةَ. فَإِنَّكُمْ لَوْ فَقَدْتُمُوهُ رَأَيْتُمُ الرُّءُوسَ تَنْدُرُ عَنْ كَوَاهِلِهَا كَأَنَّهَا الْحَنْظَلُ۔

اے لوگو! تم، معاویہؓ کی امارت کو ناپسند مت کرو، کیونکہ اگر تم نے ان کو کھو دیا تو تم سروں کو ان کے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گرتے دیکھو گے جس طرح حنظل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔

(البداية والنهاية، ج8ص190، وزارة الاوقاف قطر)

حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

اور ایسے ہی تعلقاتِ محبت ومودّت اور معاملاتِ شفقت وعقیدت، حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان بھی تھے، جو تاریخ کے صفحات میں ثبت ہیں، ان کا یہاں ذکر باعث طِوالت ہوگا، بطور اختصار ایک حوالہ نقل کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"فَلَمَّا اسْتَقَرَّتِ الْخِلَافَةُ لِمُعَاوِيَةَ كَانَ الْحُسَيْنُ يَتَرَدَّدُ إِلَيْهِ مَعَ أَخِيهِ الْحَسَنِ، فَكَانَ مُعَاوِيَةُ يُكْرِمُهُمَا إِكْرَامًا زَائِدًا، وَيَقُولُ لَهُمَا: مَرْحَبًا وَأَهْلًا. وَيُعْطِيهِمَا عَطَاءً جَزِيلًا ...."۔

جب حضرت معاویہؓ کی خلافت کو استقرار حاصل ہوگیا تو حضرت حسینؓ اپنے بھائی حضرت حسنؓ کے ہمراہ، حضرت معاویہؓ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے، حضرت معاویہؓ ان دونوں بھائیوں کا بہت زیادہ اکرام کیا کرتے تھے، اوران کی آؤ بھگت کیا کرتے تھے، نیز انہیں گراں قدر عطیات وہدایا بھی دیا کرتے تھے۔

(البداية والنهاية، ج 8ص 219، وزارة الاوقاف قطر)

نیز لکھتے ہیں :

"وَلَمَّا تُوُفِّيَ الْحَسَنُ كَانَ الْحُسَيْنُ يَفِدُ إِلَى مُعَاوِيَةَ فِي كُلِّ عَامٍ فَيُعْطِيهِ وَيُكْرِمُهُ، وَقَدْ كَانَ فِي الْجَيْشِ الَّذِينَ غَزَوُا الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ مَعَ ابْنِ مُعَاوِيَةَ يَزِيدَ، فِي سَنَةِ إِحْدَى وَخَمْسِينَ"۔

اور حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد بھی حضرت حسینؓ ہر سال حضرت معاویہؓ کے پاس آیا کرتے تھے پس آپ ان کا اکرام کیا کرتے تھے اور انہیں عطیات دیا کرتے تھے، اور حضرت حسینؓ ، حضرت معاویہؓ کے بیٹے یزید کے ساتھ اس لشکر میں بھی شامل تھے جس نے سنہ 51ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔

(البداية والنهاية، ج 8ص 219، وزارة الاوقاف قطر)

یہ ایک نمونہ ہے ان حضرات کے آپس میں خوشگوار، اخلاص ومحبت اور شفقت وعقیدت بھرے تعلقات کا، ایک دوسرے کے بارے میں پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا، نیز ایک دوسرے کی دل وجان سے تعظیم وتکریم کا، ایسی صورت میں یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر اور ان کے والد، نیز حضرت حسین اور ان کے والد حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کو مراد لیتے اور نشانہ بناتے ہوئے "نحن احق به منه ومن ابيه" والی چبھتی ہوئی تعریض کی ہوگی۔

ان صاف اور صریح بیانات کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود کو خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ بخاری کی روایت میں انہوں نے جس معاملہ میں خود کو زیادہ حقدار کہا ہے وہ خلافت کا معاملہ نہیں بلکہ کوئی اور معاملہ تھا اور قرین قیاس یہی ہے کہ یہ قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کا معاملہ ہے اور بے شک اس میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

جہاں تک بات ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مرتبہ ومقام اور عزت واحترام کی تو خود لعل شاہ صاحب نے جہاں یہ بات لکھی ہے کہ:

> "یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھرانے میں ابتدائے خلافت سے ہی جانشینی کے تذکرے ہوتے تھے اور یزید کی نامزدگی کی امنگیں بیدار ہورہی تھیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 286)

وہاں اسی صفحے پر دلیل کے طور پر محمود احمد عباسی کی طرف سے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ ایک روایت کو ہی پیش کیا ہے اور اس روایت پر کوئی جرح نہیں کی، آیئے دیکھتے ہیں وہ روایت کیا ہے؟

"وَقَالَ ابْنُ أَبِي الدُّنْيَا: حَدَّثَنَا أَبُو كُرَيْبٍ، ثَنَا رِشْدِينُ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْحَارِثِ، عَنْ بُكَيْرِ بْنِ الْأَشَجِّ، اَنَّ مُعَاوِيَةَ قَالَ لِيَزِيدَ ابْنِهِ: كَيْفَ تُرَاكَ فَاعِلًا إِنْ وُلِّيتَ؟ قَالَ: يُمَتِّعُ اللّٰهُ بِكَ. قَالَ: لَتُخْبِرَنِّي. قَالَ: كُنْتُ وَاللّٰهِ يَا أَبَهْ عَامِلًا فِيهِمْ عَمَلَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ. فَقَالَ مُعَاوِيَةُ: سُبْحَانَ اللّٰهِ! يَا سُبْحَانَ اللّٰهِ! ! وَاللّٰهِ يَا بُنَيَّ لَقَدْ جَهَدْتُ عَلَى سِيرَةِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، فَمَا أَطَقْتُهَا فَكَيْفَ بِكَ وَسِيرَةِ عُمَرَ"۔

ایک دفعہ حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید سے پوچھا کہ اگر تم کو حکومت ملے تو تم اسے کیسے چلاؤ گے؟، یزید نے پہلے تو معذرت چاہی پھر حضرت معاویہؓ کے اصرار پر کہا: اے ابا جان! اللہ کی قسم، میں عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے طرز پر حکومت کروں گا۔

حضرت معاویہؓ نے فرمایا: سبحان اللہ! بیٹے! اللہ کی قسم میں تو کوشش کے باوجود اس معاملے میں عثمانؓ بن عفان کی سیرت کی پیروی نہ کرسکا پھر کہاں تُو اور کہاں سیرتِ عمرؓ کی پیروی؟۔

(البداية والنهاية، ج 8ص 364، وزارة الاوقاف قطر)

تو بھلا ایسے اقرار کے بعد بھی یہ سوچا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ خلافت وامارت کا حق دار سمجھتے ہوں؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ، ان کے ماں باپ اور ان کی آل اولاد سبھی لوگ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دلی عقیدت ومحبت رکھتے، ان کا بہت زیادہ احترام واکرام کرتے، ان کو ہر طرح سے لائق اتباع اور ہر لحاظ سے اپنا مقتداو پیشوا جانتے اور مانتے تھے، اس سارے گھرانے کے دلی جذبات ان کے بارے میں نہایت ہی پاکیزہ، عقیدت مندانہ اور نیاز مندانہ تھے۔

دوسری طرف سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں حضرت معاویہؓ کی قدر ومنزلت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے ان کے بھائی "یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما" کے انتقال کے بعد ان کو شام کا گورنر بنادیا اور پھر اپنی زندگی بھر انہی کو وہاں رکھا، معزول یا تبدیل نہ کیا بلکہ وقتاً فوقتاً ان کی حدودِ ولایت بڑھاتے ہی رہے، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں اور والیوں کے تقرر کے معاملہ میں انتہائی محتاط تھے، جب تک کسی شخص پر مکمل اطمینان واعتماد نہ ہوجاتا اسے کسی مقام یا علاقے کا امیر وحاکم نہ بناتے تھے، پھر گورنروں پر کڑی نظر بھی رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں پر گرفت کیا کرتے تھے، معمولی معمولی بے ضابطگیوں اور شکایتوں پر ان کو معزول یا تبدیل کردیا کرتے تھے، نیز کسی گورنر کو مدۃِ معینہ سے زیادہ ایک جگہ نہ رہنے دیتے تھے بلکہ گورنروں کی برابر تبدیلیاں کرتے رہتے تھے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے واحد گورنر ہیں جن کو اپنے سارے دورِ خلافت میں معزول

کیا نہ تبدیل، بلکہ ان کا اعتماد ان پر روز بروز بڑھتا ہی رہا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سارے دورِ فاروقی میں کسی طرف سے بھی ان کے خلاف کوئی ایسی شکایت دربارِ فاروقی نہ پہنچی تھی جو اُن کی معزولی کا سبب ہوتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر مقرر کرنا، پھر آخر حیات تک انہیں اسی عہدے پر باقی رکھنا، معزول یا تبدیل نہ کرنا، ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان پر مکمل اعتماد تھا، اور آپ کی نظر میں ان کی بہت قدر و منزلت اور وقعت تھی۔

ایک بار سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو آپ نے فرمایا:

"دَعُوا فَتَى قُرَيْشٍ وَابْنَ سَيِّدِهَا، إِنَّهُ لَمَنْ يَضْحَكُ فِي الْغَضَبِ وَلَا يُنَالُ مِنْهُ إِلَّا عَلَى الرِّضَا، وَمَنْ لَا يَأْخُذُ مِنْ فَوْقِ رَأْسِهِ إِلَّا مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْهِ"۔

قریش کے اس گبھرو اور سردارِ قریش کے اس سپوت کی مذمت سے ہمیں معاف رکھو، وہ تو وہ ہے کہ غصہ میں ہنستا (یعنی انتہائی بردبار) ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے، بغیر اس کی رضامندی کے حاصل نہیں کیا جاسکتا، اور اس کے سر پر کی چیز اس کے قدموں میں جھکے بغیر نہیں لے جاسکتی (یعنی انتہائی غیور اور شجاع بھی ہے)۔

(البداية والنهاية، ج8،ص181، وزارة الاوقاف قطر /
الاستيعاب، ج2،ص245، دار الفكر بيروت)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

کچھ ایسا ہی حال آپس میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہم) کا بھی تھا، یہ دونوں حضرات بھی ایک دوسرے کے فضل و شرف کے نہ صرف معترف تھے بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کیا کرتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"قَالَ مُعَاوِيَةُ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، مَا أَنَا بِخَيْرِكُمْ، وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّي؛ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ، وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو، وَغَيْرُهُمَا مَنْ

الْأَفَاضِلِ، وَلَكِنْ عَسَى أَنْ أَكُونَ أَنْفَعَكُمْ وِلَايَةً، وَأَنْكَاكُمْ فِي عَدُوِّكُمْ، وَأَدَرَّكُمْ حَلْبًا"۔

اے لوگو! میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں، تمہارے درمیان مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عمرو اور ان جیسے اور بزرگ، لیکن امید ہے کہ میں باعتبارِ حکومت تمہارے لئے زیادہ سودمند، تمہارے دشمنوں کے لئے زیادہ تکلیف دہ اور مالی اعتبار سے تمہارے لئے زیادہ منافع بخش ثابت ہوں گا۔

(البداية والنهاية، ج 8ص 194، وزارة الاوقاف قطر)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قائدانہ صلاحیتوں کے معترف تھے، چنانچہ آپ سے منقول ہے کہ :

"…. عَنْ جَبَلَةَ بْنِ سُحَيْمٍ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ، يَقُولُ: مَا رَأَيْتُ بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَسْوَدَ مِنْ مُعَاوِيَةَ….."۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معاویہؓ سے بڑھ کر سرداری کے لائق کوئی نہیں دیکھا۔

اس پر پہلے گذرے خلفاء کا ذکر کر کے پوچھا گیا کہ: کیا وہ حضرات ان سے بڑھ کر نہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: "كانوا والله خيرا من مُعَاوِيَة، وَكَانَ مُعَاوِيَة أسود منهم"۔ اللہ کی قسم! باعتبار مرتبہ تو یہی حضرات بہتر تھے معاویہؓ سے، مگر سرداری میں معاویہؓ ان سے بڑھ کر تھے۔

(السنة لابی بکر الخلال، ج 2ص442، دار الراية، الرياض/
البداية والنهاية، ج 8ص 195، وزارة الاوقاف قطر /
الاستيعاب، ج 2ص 245، دار الفكر بيروت)

نوٹ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اسی طرح کی رائے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی صحیح سند کے ساتھ مروی ہے، چونکہ لعل شاہ صاحب نے اس کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ" حافظ ابن کثیر نے یہ روایت کہاں سے لی ہے ان کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکا، عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں اس روایت کو تخریج

نہیں کیا ومن ادعی فعلیه البیان" (استخلاف یزید، صفحہ 595) اس لئے ہم اس روایت کی سند اور جن کتابوں میں ہے ان کے نام لکھ دیتے ہیں، روایت یہ:

"أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنْ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ، يَقُولُ: مَا رَأَيْتُ رَجُلًا كَانَ أَخْلَقَ لِلْمُلْكِ مِنْ مُعَاوِيَةَ..."۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حکمرانی سے ایسی مناسبت رکھنے والا (گویا کہ جو پیدا ہی حکمرانی کے لئے کیا گیا ہو) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔

(جامع معمر بن راشدمطبوع مع مصنف عبدالرزاق، ج 11ص453،المجلس العلمی الهند / الأمالي في آثار الصحابة لعبد الرزاق الصنعانی، ص74،مكتبة القرآن القاهرة / الآحاد والمثاني لابن ابی عاصم، ج 1ص378،دار الراية الرياض / السنة لابی بکر الخلّال، ج2ص440، دار الراية الرياض)

آمدم برسر مطلب! لہٰذا جو لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے جملے میں مستعمل لفظ "اب" (باپ) کو حقیقی معنی میں لیتے اور معاملہ کو خلافت کا معاملہ مانتے ہیں اور اس جملہ کا روئے سخن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سمجھتے ہیں۔ وہ غور کریں کہ جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ خود کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ خلافت کا حقدار نہیں سمجھتے جو چوتھے خلیفہ ہیں تو بھلا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خود کو عبداللہ بن عمر کے والد عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ خلافت کا حقدار کیسے سمجھ سکتے ہیں جو بالاتفاق دوسرے خلیفہ ہیں؟ اور جب وہ اپنے بیٹے یزید سے یہ کہتے ہیں کہ " بیٹا! اللہ کی قسم تیرا باپ تو کوشش کے باوجود اس معاملے میں عثمانؓ بن عفان کی سیرت کی پیروی نہ کرسکا پھر کہاں تُو اور کہاں سیرتِ عمرؓ کی پیروی؟"، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے زیادہ خلافت کا حق دار بتائیں؟

اب رہی بات یہ کہ پھر حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جواب نہ دینے کی وجہ کیوں پوچھی جب کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ ان کی طرف نہیں تھا؟ تو جیسا کہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ ممکن ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کے لہجہ میں عدم اتفاق ظاہر ہوا ہو اس لئے ان سے جواب نہ دینے کی وجہ پوچھی گئی۔ لہٰذا ان سے یہ سوال اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ انہی کی طرف تھا۔

اور رہا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا عدم اتفاق، تو ممکن ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی انہی حضرات کو زیادہ حقدار سمجھتے ہوں جو اسلام لانے کے اعتبار سے پہلے ہوں۔ لیکن جس انداز سے جواب ان کے ذہن میں آیا تھا اس سے لوگوں کو غلط فہمی ہو سکتی تھی اور کچھ لوگ ان کی منشا کے خلاف کچھ اور ہی مطلب اخذ کر سکتے تھے اس لئے ابن عمر رضی اللہ عنہ نے خاموشی اختیار کی جیسا کہ خود انہوں نے خاموشی اختیار کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا:

"وَيُحْمَلُ عَنِّي غَيْرُ ذَلِكَ" یعنی میری بات کا مطلب میری منشا کے خلاف نہ لیا جانے لگے۔

افسوس کہ جس غلط فہمی سے لوگوں کو بچانے کے لئے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب نہیں دیا آج لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں اور لعل شاہ صاحب جیسے حضرات لوگوں کو اسی غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ بھلا سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے والد کو ان سے زیادہ خلافت کا حقدار ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ کبھی بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ابن عمر رضی اللہ عنہ کے والد سے اختلاف رہا ہی نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کج فہمی پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَقِيلَ أَرَادَ عُمَرَ وَعَرَّضَ بِابْنِهِ عبد الله وَفِيه بُعد لِأَنَّ مُعَاوِيَةَ كَانَ يُبَالِغُ فِي تَعْظِيمِ عُمَرَ"۔

اور کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مراد لیا اور ان کے بیٹے ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بات بہت بعید ہے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حد سے زیادہ تعظیم کیا کرتے تھے۔

(فتح الباری، ج 7ص 404، المکتبة السلفية)

اس لئے درست بات یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مراد لیا ہے نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، بلکہ سرے سے حق خلافت ہی کی بات نہیں کی ہے۔ بلکہ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کی بات کی ہے اور اس معاملہ میں بغیر کسی کی تعیین کے خود کو سب سے زیادہ حقدار کہا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور اگر اس سے بھی ایک درجہ مزید نیچے اتر کر یہ تک بھی فرض کر لیا جائے کہ حضرت معاویہؓ کا اشارہ

حضرت عبداللہ بن عمر اور ان کے والد حضرت عمر، نیز حضرت حسن اور ان کے والد حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کی طرف ہی تھا تو پھر سوابقِ اسلامیہ کے حوالہ سے نہ تھا بلکہ قریش میں عُہدوں کی پرانی خاندانی تقسیم کے حوالہ سے تھا، ملاحظہ ہو۔

قریش اور ان کی خاندانی تقسیم

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قریش ایک بڑا قبیلہ تھا، رسول اللہ ﷺ کے بارہویں دادا فہر بن مالک "قریش" کہلاتے تھے (نسب قريش لمصعب الزبيري،"ولدالنضر بن كنانة"، ص12، دارالمعارف مصر) ان کی اولاد بھی "قریش" کے نام سے موسوم ہے جو بعد میں کئی قبیلوں میں منقسم ہوئی جس میں بنوقُصی، بنو عدی، بنو تیم، بنو سہم اور بنو زہرہ جیسے خاندان آتے ہیں، فہر کی اولاد میں "قُصَيّ" نے مکہ میں اپنا اثر ورسوخ قائم کیا اس لئے انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے، ان سے پہلے مکہ پر بنو بکر اور بنوخزاعہ نے قبضہ کیا ہوا تھا، قصی نے انہیں مکہ سے باہر دھکیل دیا اور مکہ کی ریاست پر بنو قصی کا قبضہ ہو گیا جو کہ قریش کی ہی ایک شاخ تھی (سيرة ابن هشام، ج1ص142وما بعد،دار الكتاب العربي بيروت) پس بنو قصی کو اس لحاظ سے قریش میں بہت عزت حاصل ہوئی۔

قصی کے بیٹے عبد مناف اور عبد الدار تھے اور یہ بنو قصی کہلاتے ہیں، عبد مناف کے کئی بیٹے تھے، عبد الشمس، مُطّلب، عمرو (ہاشم) اور نوفل۔ اور یہ بنو عبد مناف کہلاتے ہیں۔ ماہر انساب مصعب بن عبداللہ الزبیری (م 236ھ) نے "نسب قریش" میں لکھا ہے کہ ہاشم اور عبد الشمس دونوں جڑواں تھے اور ہاشم کا اصل نام "عَمرو" تھا۔ عبد الشمس کی اولاد کو "عبشمی" اور ہاشم کی اولاد کو "ہاشمی" کہا جاتا ہے۔ پھر آگے ہاشم کے بیٹے عبد المطلب ہیں اور عبد الشمس کے بیٹے امیہ ہیں، ان امیہ کی اولاد کو "بنو امیہ" کہا جاتا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کے پردادا ہاشم اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے پردادا عبد الشمس سگے جڑواں بھائی ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ کے دادا عبد المطلب اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے دادا اُمیہ آپس میں چچازاد بھائی ہیں۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں یہ اتنی قریبی رشتہ داری ہے، اسی لئے ہاشم اور امیہ کی اولاد ایک دوسرے کے "ابن عم" یعنی چچازاد کہلاتے تھے۔ پھر امیہ کے ایک بیٹے حرب تھے، اور حرب کے بیٹے ابوسفیان رضی اللہ عنہ تھے۔ اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ

کے بیٹے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔امیہ کے دوسرے بیٹے ابوالعاص تھے اور ابوالعاص کے ایک بیٹے عفان ہیں کہ جن کے بیٹے پھر خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔

قصی کی اولاد میں مکہ کی ریاست دس شعبوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔بنو ہاشم کے پاس حاجیوں کی خدمت کا شعبہ آیا جو سب سے افضل شمار ہوتا تھا اس لئے ان میں خدمت خلق اور نرم دلی بہت زیادہ ملے گی۔بنو امیہ کے حصے میں قیادت اور سپہ سالاری کا شعبہ آیا تھا اور جاہلیت کی معروف جنگ" جنگ فجار" میں بھی جو اہل مکہ اور اہل طائف کے مابین ہوئی تھی، اہل مکہ کی طرف سے سپہ سالار حرب بن امیہ تھے(سيرة ابن هشام، ج1ص 211/ اخبار مكة للأزرقي، ج1ص184)۔حرب کے بعد ان کے بیٹے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس منصب کے حامل ہوئے۔مسلمان ہونے تک قریش کے یہی علمبردار تھے۔جنگ بدر کے وقت یہ مکہ میں موجود نہیں تھے بلکہ شام سے واپس آرہے تجارتی قافلے کے سربراہ تھے اور اسے بچا بھی لائے تھے کیونکہ قافلوں کی سرداری بھی اسی خاندان میں تھی، اس لئے بدر میں ان کی جگہ بنو عبد شمس ہی کے ممتاز رکن عتبہ بن ربیعہ جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے خسر تھے قریش کے علمبردار تھے۔جنگ احد میں پھر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہی اہل مکہ کی طرف سے سپہ سالار تھے۔اسی طرح دوسرے شعبے قریش کے دیگر خاندانوں میں تقسیم کیے گئے۔

(شعبوں کی تقسیم کی تفصیل کے لئے دیکھیں: تفسير التحرير والتنوير۔ محمد الطاهر بن محمد بن محمد الطاهر بن عاشور التونسي، ج10ص144، دار التونسية للنشر تونس)۔

جیسا کہ بیان ہوا، ہاشم کا اصل نام "عمرو" تھا، یہ بڑے معزز اور دولت مند تھے، حاجیوں کی ضیافت کے لئے روٹیوں کو چُورکر کرشوربہ ملا کر کھلانے کا طریقہ رائج کیا جس کی وجہ سے ان کا نام" ہاشم" (چُورنے والا) پڑ گیا(اخبار مكة لمحمدبن عبدالله الازرقي، ج1ص179)۔آپ ایک تجارتی سفر میں ملک شام جارہے تھے راستہ میں یثرب (موجودہ مدینہ منورہ) میں ٹھہرے اور یہاں خاندان بنو نجار کی خاتون سلمیٰ بنت عمرو سے نکاح کیا۔سلمیٰ حاملہ تھیں کہ یہ شام کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں ان کا انتقال ہوگیا۔سلمیٰ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، اس پیدائشی یتیم کے سر کے بال سفید تھے،لوگوں نے اس کا نام" شیبہ" (بوڑھا) رکھ دیا۔یہ بچہ اپنی ننھیال میں قریب دس بارہ سال تک پرورش پاتا رہا۔مکہ والوں کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ہاشم کے بعد ان کے سگے بھائی "مُطّلب" ان کے منصب کے وارث ہوئے۔جب انہیں علم ہوا کہ ان کے بھائی کا ایک بیٹا

یثرب میں ہے تو یہ وہاں گئے اور اپنے یتیم بھتیجے کو مکہ لے آئے اور بڑے پیار و محبت کے ساتھ پرورش کی۔ لوگ عام طور پر سمجھنے لگے کہ یہ مُطّلب کا غلام ہے اور اس کو" عبد المُطّلب " کہنے لگے۔ مُطّلب انہیں بتاتے تھے کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ پھر مُطّلب نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں اور ہاشم (عمرو) کے دیگر بیٹوں کو چھوڑ کر لیاقت اور اہلیت کی بنا پر عبد المُطّلب کو ہاشمی مناصب کا وارث بنایا۔ عبد المُطّلب نے آگے چل کر جو اعزاز حاصل کیا اس پر ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء ہی کہا جاسکتا ہے۔

عبد المُطّلب بن ہاشم اور حرب بن امیہ میں بڑی دوستی تھی۔ عبد المُطّلب کی بیٹی صفیہ کا نکاح حرب کے بیٹے حارث سے ہوا تھا، اور بیٹے عبد العزیٰ (ابولہب) کا نکاح حرب کی بیٹی ام جمیل سے ہوا تھا۔ یہ ابولہب اور ام جمیل وہی معتوب و مغضوب میاں بیوی ہیں جن کے بارے میں سورہ لہب نازل ہوئی جن میں خاوند" بنو ہاشم" سے اور بیوی" بنو امیہ" سے ہے۔

یہ مختصر طور پر بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کا پس منظر بیان کیا گیا، مزید تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ ممکن ہے کسی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے بارے میں یہ اعتراض آیا ہو کہ ان میں تو حکومت کی اہلیت ہی نہیں تو اس کے جواب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سارے تاریخی پس منظر میں یہ بات کہی ہو کہ قریش میں جدی پشتی طور پر سپہ سالاری، سرداری اور علمبرداری کا شعبہ بنو امیہ کے پاس رہا تھا۔

کیا امام یا حاکم کا اپنے زمانے میں سب سے افضل ہونا ضروری ہے؟

یہاں ایک اور مسئلہ کی وضاحت ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل السنۃ کے ہاں احقّیت بالخلافۃ کا معیار اسبقیت و افضلیت نہیں ہے بلکہ امورِ مملکت میں مہارت ہے، چنانچہ شرائطِ خلافت کا جامع جو شخص مصالحِ امامت کی معرفت، مقاصدِ خلافت کے اجراء پر قدرت اور امورِ مملکت میں مہارت زیادہ رکھتا ہو، وہ اہل السنۃ کے نزدیک اُس اسبق و افضل سے خلافت کے زیادہ لائق ہے جو امورِ مذکورہ میں اس شخص جتنا ماہر نہ ہو، چنانچہ علماء عقائد نے تصریح کی ہے کہ :

"ولا یشترط فی الامام ان یکون معصوماً ...... ولا ان یکون افضل من أهل زمانه"۔

امام یعنی حاکم کے لئے نہ معصوم ہونا شرط ہے اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ وہ اپنے زمانے کے

لوگوں میں سب سے افضل ہو۔

(شرح العقائد النسفية، ص 361 ، مكتبة البُشرىٰ كراتشى)

مولانا عبدالعزیز پرہارویؒ اس کی شرح میں رقمطراز ہیں :

"لأن اعظم مدار السلطنة هو علىٰ المهارة بأمور الدنيا لا على المهارة بالعلم الشرعي وكثرة العبادة"۔

کیونکہ سلطنت یعنی حکومت چلانے کا دارومدار دنیاوی امور میں مہارت پر ہے، علمِ شرعی میں مہارت اور کثرتِ عبادت پر نہیں۔

(النبراس، شرح شرح العقائد، ص 321، طبع آستانه)

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن محمد بن حبیب البصری البغدادی الشہیر بالماوردی رحمۃ اللہ علیہ (م450ھ) لکھتے ہیں :

"وَقَالَ الْأَكْثَرُ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَالْمُتَكَلِّمِينَ: تَجُوزُ إِمَامَتُهُ وَصَحَّتْ بَيْعَتُهُ، وَلَا يَكُونُ وُجُودُ الْأَفْضَلِ مَانِعًا مِنْ إِمَامَةِ الْمَفْضُولِ إِذَا لَمْ يَكُنْ مُقَصِّرًا عَنْ شُرُوطِ الْإِمَامَةِ، كَمَا يَجُوزُ فِي وِلَايَةِ الْقَضَاءِ تَقْلِيدُ الْمَفْضُولِ مَعَ وُجُودِ الْأَفْضَلِ"۔

اکثر فقہاء و متکلمین کا قول یہ ہے کہ (افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی) امامت جائز ہے اور اس کی بیعت صحیح ہے، اور افضل کا وجود اس بات سے مانع نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ مفضول میں امامت کی شروط میں کوتاہی نہ پائی جائے، جیسا کہ قضا کے معاملہ میں افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کو قاضی بنانا جائز ہے۔

(الاحكام السلطانية، ص 9، الباب الأول في عقد الإمامة، دار ابن قتيبة الكويت)

گورنروں اور فوجی افسروں کے تقرر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو کہ :

1......حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہ، صلح حدیبیہ اور غزوۂ خیبر کے درمیانی عرصہ میں مسلمان ہوئے، آپ

ﷺ نے ان کو بحرین کا گورنر مقرر فرمایا، آنحضرت ﷺ کی وفات تک اسی عہدے پر رہے۔

(الاصابة، ترجمة ابانؓ بن سعید)

2......حضرت سعید بن سعید رضی اللہ عنہ، فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے مسلمان ہوئے، فتح مکہ کے دن، آنحضرت ﷺ نے ان کو سوقِ مکہ پر عامل مقرر فرمایا۔

(الاصابة، ترجمة سعیدؓ بن سعید)

3......حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، فتح مکہ کی رات مسلمان ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کو نجران کا گورنر مقرر فرمایا جس پر وہ آنحضرت ﷺ کی وفات تک برقرار رہے۔

(الاصابة، ترجمة ابی سفیان رضی الله عنه)

4......حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ، فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو مکہ مکرمہ کا گورنر بنادیا۔ وہ اس وقت سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھے۔

(الاصابة، ترجمة عتاب بن اسید رضی الله عنه)

5......حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ، فتح مکہ کے بعد سنہ 9ھ میں وفد ثقیف میں آکر مسلمان ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کو طائف کا گورنر مقرر فرمایا وہ اپنے وفد کے لوگوں میں سے عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔

(الاصابة، ترجمة عثمان بن ابی العاص رضی الله عنه)

6......حیاتِ مبارکہ کے بالکل آخری دنوں میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا جس میں ابوبکر وعمر، سعد وسعید اور ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہم) جیسے اجلّہ صحابہ ان کے ماتحت تھے، اور خود حضرت اسامہؓ کی عمر اس وقت اٹھارہ/بیس سال تھی۔

پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اُس دور یعنی خیر القرون کے تمام صحابہؓ وتابعین اور خاص وعام تمام مسلمانوں کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا اور مانا، حالانکہ اسلام میں ان سے اسبق وافضل حضرات موجود تھے۔

❀❀❀

مسئلہ استخلاف یعنی نامزدگی و جانشینی کا مسئلہ

قاضی ابویعلی محمد بن الحسین بن محمد بن خلف ابن الفراء (م 458ھ) حاکم وقت کی طرف سے اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ويجوز للإمام أن يعهد إلى إمام بعده، ولا يحتاج في ذلك إلى شهادة أهل الحل والعقد وذلك لأن أبا بكر عهد إلى عمر رضي الله عنهما، وعمر عهد إلى ستة من الصحابة رضي الله عنهم، ولم يعتبرا في حال العهد شهادة أهل الحل والعقد"۔

یعنی امام کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بعد کسی کو ولی عہد بنا دے اور اس کے لئے اسے اہل حل وعقد کی شہادت (یعنی ان کی موجودگی اور منظوری) کی ضرورت نہیں، کیونکہ حضرت ابو بکر ﷛ نے حضرت عمر ﷛ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا، اور حضرت عمر ﷛ نے اپنے بعد چھ صحابہ کو مقرر کیا (کہ انہی میں سے ایک کو اگلا خلیفہ بنایا جائے) اور ان دونوں (یعنی حضرت ابوبکر و عمر ﷠) نے اس کے لئے اہل حل وعقد کی موجودگی یا منظوری کی ضرورت نہیں سمجھی۔

(الاحكام السلطانية للقاضى ابي يعلى الفراء، ص 25، دار الكتب العلمية بيروت)

اور آگے لکھتے ہیں :

"ويجوز أن يعهد إلى من ينتسب إليه بأبوة أو بنوة، إذا كان المعهود له على صفات الأئمة..."۔

اور امام یا حاکم کے لئے جائز ہے کہ وہ جسے اپنا جانشین یا ولی عہد بنائے وہ اس کا بیٹا یا باپ ہو بشرطیکہ وہ صفات امامت کا حامل ہو۔

(ایضاً، ص 25)

خود لعل شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے:

"اگر کوئی خلیفہ، وقت کا امام اپنی زندگی میں کسی کو اپنا جانشین مقرر کردے تو شرعاً یہ استخلاف درست ہے یا نہیں؟ خلافت کی اصل صورت تو مشورے کا طریقہ ہے، مگر استخلاف بھی شرعاً

درست ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آخری وقت میں حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کو نامزد کیا تھا اور بحکم حدیث علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين طریقہ استخلاف بھی سنت قرار پایا، البتہ اس استخلاف کی شرعی حیثیت کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ امت کا متفق علیہ امام اگر کسی کو نامزد کر دیتا ہے تو اس کا فیصلہ شرعاً نافذ ہو جاتا ہے اور امت پر اس کی بیعت لازم ہو جاتی ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ پہلے خلیفہ کی نامزدگی محض ایک تجویز کی حیثیت رکھتی ہے، خلیفہ کا یہ فعل درحقیقت ایک گواہی ہے اس کی اہلیت کی، مگر امت کے اہل حل وعقد اگر شوریٰ سے مسترد کر دینا چاہیں انہیں یہ حق بھی حاصل ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 538)

نیز لکھا ہے کہ:

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر امام وقت دیانت داری سے اپنے بیٹے کو اہل سمجھے تو از روئے شریعت مطہرہ وہ مجاز ہے کہ اپنے بیٹے کو نامزد کر دے۔ ابن الخلدون نے اپنے مقدمہ میں اس مسئلے پر مبسوط بحث کی ہے، نیز قاضی ابوبکر ابن العربی نے بھی اس کی توثیق کی ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 538و539)

علامہ ابن خلدون کی اس بارے میں مفصل عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہے، لیکن یہاں لعل شاہ صاحب نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے کہ:

"یہ خیال درحقیقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدافعت کے جذبہ کے تحت پیدا ہوا ہے کہ ایک صحابی کی طرف غیر شرعی فعل کے ارتکاب کی نسبت اس کی عدالت پر حرف رکھنے کے مترادف ہے۔ لیکن راقم السطور نے (یعنی لعل شاہ صاحب نے۔ناقل) جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کی ساری کوششیں توجيه القائل بما لايرضى به القائل کی مصداق ہیں، بیٹے کی نامزدگی نہ کتاب وسنت رسول کے مقرر کردہ دستور اساسی کے مطابق ہے، نہ سنت خلفاء

الراشدین کے موافق....“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 539)

تو اس پر ہم عرض کرتے ہیں کہ کیا قرآن وسنت میں کوئی ایسی دلیل ہے جس سے ثابت ہو کہ کسی خلیفہ یا امام کے لئے اپنے بیٹے کی نامزدگی کرنا ناجائز یا خلاف شریعت ہے؟ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور آپ کی شہادت سے پہلے آپ کے رفقاء نے آپ سے پوچھا کہ: اگر آپ شہید ہوجائیں تو کیا ہم حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلیں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

”لَا آمُرُكُمْ وَلَا أَنْهَاكُم“ میں نہ تو اس کا حکم دیتا ہوں، نہ اس سے منع کرتا ہوں۔

(تاريخ الطبري، ج5ص146و 147، دار المعارف مصر / البداية والنهاية، ج7ص543، وزارة الاوقاف، قطر)

تو اگر باپ کے بعد بیٹے کی بیعت حرام ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ یوں نہ فرماتے، بلکہ صریح طور پر یہ فرماتے کہ: ”میں تمہیں اس بات سے روکتا ہوں کہ میرے بعد میرے بیٹے کی بیعت کی جائے“، نیز اگر باپ کی طرف سے بیٹے کی نامزدگی خلاف شریعت عمل ہوتا تو پھر معدودے چند حضرات کے سوا امت کی اکثریت نے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی تھی کیا وہ تمام صحابہ وتابعین کتاب و سنت کے دستوراساسی اور خلاف شریعت عمل کے مرتکب ہوئے تھے؟ خود لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

”سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کرلی“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

یہ ”عامۃ الناس“ صحابہ وتابعین ہی تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ زمانہ خیر القرون میں امت کی قريب الكل ”اکثریت ایک ”غیر شرعی“ اور ”کتاب وسنت کے دستوراساسی“ کے مخالف کام پر متفق و مجتمع ہوجائے؟ اور آگے چلیں تو پھر خلافت بنی امیہ، خلافت بنی عباس، خلافت عثمانیہ وغیرہ تمام خلافتیں بھی خلاف شریعت اور کتاب وسنت کے اساسی دستور کی مخالف قرار پائیں گی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان خلافتوں کے زمانے میں موجود علماء وفقہاء امت نے باپ کے بعد بیٹے کی نامزدگی کو خلاف شریعت یا ناجائز نہیں بتایا اور نہ اس پر

اعتراض کیا۔

پھر کاش لعل شاہ صاحب یہ بھی بتادیتے کہ خلافت وحکومت کے بارے میں وہ کون سا" دستور اساسی" ہے جو قرآن وسنت نے مقرر کیا ہے؟

کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد گوشہ نشیں ہو جانا

لعل شاہ صاحب یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس اجتماع میں (جس کا ذکر صحیح بخاری کی روایت میں ہے) اکابر صحابہ موجود نہیں تھے لکھتے ہیں کہ:

"مدینہ شہر میں اکابر صحابہ کی موجودگی بھی محل نظر ہے، بہت سے صحابہ نے دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کرلی تھی، اصحاب بدر واصحاب رضوان میں سے چند ہی صحابہ زندہ تھے، مدینہ کے اس اجتماع میں ان کی حاضری معلوم نہ ہوسکی۔ جن دو جلیل القدر صحابہ کے اسماء کی عباسی صاحب نے تصریح کی ہے یعنی سعید ابن زید اور سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہما)، کسی روایت میں ان کی موجودگی کی صراحت نہیں بلکہ قرائن وشواہد ایسے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بزرگوار اس مجلس میں تشریف نہ لائے تھے کیونکہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کچھ صحابہ ملتزم بیوت ہوگئے تھے اور سیاسی امور میں انہوں نے کچھ دلچسپی نہ لی، چنانچہ حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں: اما انّ رجالاً من اهل البدر لزموا بيوتهم بعد قتل عثمان فلم يخرجوا اِلّا الى قبورهم کہ اصحاب بدر میں سے کچھ لوگ خانہ نشین ہوگئے تھے قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد پس وہ گھروں سے نہ نکلے مگر اپنی قبروں کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ مرتے دم تک سیاست سے دست کش رہے...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 303و304)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے ابن قتیبہ کی" المعارف" اور سید نور الحسن شاہ بخاری صاحب کی کتاب "عادلانہ دفاع" کے حوالے سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان امور سے بھی لاتعلق رہے جو حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان پیش آئے، نہ ہی آپ تحکیم کے قضیہ میں شامل ہوئے

۔اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے صحیح مسلم کی ایک روایت نقل کی ہے کہ:

"حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے جانوروں اونٹوں وغیرہ کی نگرانی کرتے تھے، ایک دن کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے عمر ابن سعد کو آتے ہوئے دیکھا۔ حضرت نے اپنے بیٹے کو دیکھ کر فرمایا: میں اس راکب کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ عمر بن سعد اترا اور کہا: آپ اونٹوں اور بکریوں میں اترے پڑے ہیں اور لوگ بادشاہت میں تنازعہ کر رہے ہیں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے میں مارا اور فرمایا: خاموش! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں خدا ترس، مستغنی مزاج، زاہد بندے کو"۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 305)

پھر اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"اس روایت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کا تنازع محض بادشاہت میں تھا، نیز عمرو (عمر۔ناقل) بن سعد جاہ پرست تھا ملک گیری اور سلطنت کی ہوس رکھتا تھا اور حضرت سعد بن وقاص (ابی وقاص۔ناقل) رضی اللہ عنہ ان تمام تنازعات و سیاسیات سے قطع تعلق کر کے مدینہ سے باہر اونٹوں اور بکریوں کی نگرانی کرتے تھے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 306)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب اپنی طرف سے ان تمام باتوں کو یزید کی ولی عہدی کے قضیہ سے یا اس کی خلافت سے جوڑ رہے ہیں، اور اسی سیاق میں لکھ رہے ہیں کہ" لوگوں کا تنازع محض بادشاہت میں تھا" لیکن اگر غور کریں (جیسا کہ خود لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ جو صحابہ گوشہ نشین ہوئے تھے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہو گئے تھے) تو لعل شاہ صاحب کی پیش کردہ صحیح مسلم کی روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ جمل و صفین جیسی جنگیں جو اس زمانہ میں ہوئی تھیں وہ بھی "محض بادشاہت کا تنازع تھا"، جبکہ یہ بات لعل شاہ صاحب بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ کبار صحابہ ان تنازعات میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ خانہ نشین ہو گئے تھے، نیز یہ بات بھی مسلم ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ بھی نہیں دیا تھا، تو

اگر کوئی اسی روایت سے یہ نتیجہ نکالے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی "بادشاہت" کے لئے جنگیں کیں تو کیا لعل شاہ صاحب اس سے اتفاق کریں گے؟؟، واضح رہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وفات اصح قول کے مطابق سنہ 55ھ میں ہوئی، چنانچہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَامِرِ بنِ سَعْدٍ، قَالَ: كَانَ سَعْدٌ آخِرَ المُهَاجِرِيْنَ وَفَاةً۔ قَالَ المَدَائِنِيُّ، وَأَبُو عُبَيْدَةَ، وَجَمَاعَةٌ: تُوُفِّيَ سَنَةَ خَمْسٍ وَخَمْسِيْنَ۔ رَوَى: نُوْحُ بنُ يَزِيْد، عَنْ إِبْرَاهِيْمَ بنِ سَعْدٍ: أَنَّ سَعْداً مَاتَ وَهُوَ ابْنُ اثْنَتَيْنِ وَثَمَانِيْنَ سَنَةً، فِي سَنَةِ سِتٍّ وَخَمْسِيْنَ۔ وَقِيْلَ: سَنَةَ سَبْعٍ۔ قَالَ أَبُو نُعَيْمٍ المُلاَئِيُّ: سَنَةَ ثَمَانٍ وَخَمْسِيْنَ، وَتَبِعَهُ قَعْنَبُ بنُ المحرزِ، وَالأَوَّلُ هُوَ الصَّحِيْحُ"۔

زہری نے عامر بن سعد سے نقل کیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سب سے آخر میں وفات پانے والے تھے، مدائنی، ابوعبیدہ اور لوگوں کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ان کی وفات سنہ 55ھ میں ہوئی، جبکہ نوح بن یزید نے ابراہیم بن سعد سے نقل کیا ہے کہ آپ کی وفات سنہ 56ھ میں ہوئی اور آپ کی عمر 82 سال ہوئی۔ آپ کی وفات کا سال 57ھ بھی بتایا گیا ہے، ابونعیم ملائی اور قعنب بن محرز نے سنہ 58ھ بتایا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ صحیح بات پہلی ہے (کہ آپ کی وفات سنہ 55ھ میں ہوئی۔ ناقل)۔

(سیر اعلام النبلاء، ج1ص123و 124، مؤسسة الرسالة بیروت)

تو لعل شاہ صاحب کی پیش کردہ صحیح مسلم کی روایت میں "بادشاہت پر" جس جھگڑے یا تنازع کا ذکر ہے وہ یقیناً ان کی وفات سے پہلے کا ہی ہوگا، اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہونے والی جنگیں ہی تھیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات تک ایسی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جبکہ لعل شاہ صاحب نے حافظ ابن کثیر کے حوالے سے یہ بات خود ہی پیش کر دی ہے کہ اہل بدر کے کچھ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہی سے اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے تھے، اور نکلے تو اپنی قبروں کی طرف۔ تو کیا لعل شاہ صاحب یہ تسلیم کریں گے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے

درمیان ہونے والی جنگیں "بادشاہت" کے لئے تھیں؟ ورنہ یہ بتانا ہوگا کہ اصحاب بدر، خاص طور پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ ان تنازعات میں کیوں گوشہ نشین رہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک اثر کی حقیقت

بعض لوگ "طبقات ابن سعد" کے حوالے سے امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک قول پیش کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"هَذَا الْأَمْرُ فِي أَهْلِ بَدْرٍ مَا بَقِيَ مِنْهُمْ أَحَدٌ، ثُمَّ فِي أَهْلِ أُحُدٍ مَا بَقِيَ مِنْهُمْ أَحَدٌ، وَفِي كَذَا وَكَذَا، وَلَيْسَ فِيهَا لِطَلِيقٍ وَلَا لِوَلَدِ طَلِيقٍ وَلَا لِمُسْلِمَةِ الْفَتْحِ شَيْءٌ"۔

جب تک اہل بدر میں سے کوئی ایک بھی باقی ہے تو امارت وخلافت اس کا حق ہے، پھر اہل اُحد کا جب تک ان میں سے کوئی ایک باقی رہے، پھر فلاں وفلاں غزوہ والوں کا، اور اس پر کسی طلیق یا اس کے بیٹے یا ان لوگوں کا جو فتح مکہ میں مسلمان ہوئے کوئی حق نہیں۔

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد، ج3ص317، مکتبۃ الخانجی مصر)

تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ "طبقات ابن سعد" میں اس کی سند یوں مذکور ہے:

"أَخْبَرَنَا عَفَّانُ بْنُ مُسْلِمٍ قَالَ:أَخْبَرَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ حُسَيْنِ بْنِ عِمْرَانَ عَنْ شَيْخٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبْزَى عَنْ عُمَرَ"۔

اس سند میں "عبدالرحمن بن ابزیٰ" سے روایت کرنے والا راوی مجہول ہے جسے ابن سعد نے "شیخ" سے بیان کیا ہے، لہٰذا یہ اثر ضعیف اور غیر مستند ہے۔

خلاصہ کلام

اختصار کی کوشش کے باوجود بات طویل ہوگئی، بتانا یہ مقصود تھا کہ:

(1) لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کی جس روایت پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی ہے اس روایت سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی تحریک سنہ 44ھ میں شروع کی۔

(2) اس روایت میں کوئی ایسی تصریح نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے جس خطبے کا اس میں ذکر ہے وہ

سنہ 44ھ اور مدینہ منورہ میں دیا گیا تھا۔ بلکہ مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں اسی روایت کے الفاظ میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ تحکیم کے فوراً بعد کسی وقت کا ہے۔

(3) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا خاموش رہنا تو اس روایت سے ثابت ہے، لیکن اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ حاضرین میں سے بھی کوئی ایک شخص (باقرارِ لعل شاہ صاحب) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اس "توہین آمیز تقریر" پر نہیں بولا، نہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے کچھ کہا، نہ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کچھ بولے۔ جبکہ دوسری طرف کتب تاریخ میں ان حضرات کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس قضیہ میں ہونے والے مکالمے منقول ہیں جن میں ان حضرات نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کھل کر اپنی اختلافی رائے کا اظہار کیا، اس وقت تو انہیں کسی کا خوف یا ڈر نہیں تھا۔

(4) اس روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ" هذا الامر" سے مراد ضرور خلافت وحکومت ہے۔ اگر کسی نے اس سے خلافت یا حکومت مراد لی ہے وہ اس کا اپنا اجتہاد واستنباط ہے۔ نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ اس خطبہ کا تعلق استخلاف یزید سے ہے۔

(5) اس روایت میں حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہما کے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کا ذکر ہے، جبکہ حضرت حبیب مسلمہ رضی اللہ عنہما کی وفات سنہ 42ھ میں آرمینیا کے مقام پر ہو چکی تھی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ سنہ 44ھ کا نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے پہلے کا ہے۔

(6) صحابہؓ کے آپس کے معاملات میں دھرنا مار کر اور ضد کر کے ہی نہیں بیٹھ جانا چاہیئے بلکہ بات بنتی بنا کر آگے چلنا چاہیئے، یہی ان کی شان کے لائق ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ثنا یافتہ اور اس کی طرف سے فضل وبزرگی کے سند یافتہ ہیں۔ اہل السنۃ کا مسلک بھی یہی ہے کہ صحابہؓ سے متعلق اگر کوئی ایسی ویسی بات کہیں کسی وجہ سے آ گئی ہو تو اس کو بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے نہ کہ خواہ مخواہ بگاڑنے کی، شارح صحیح مسلم امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی رحمہ اللہ نے کیا خوب بات لکھی ہے :

"وَلَسْنَا نَقْطَعُ بِالْعِصْمَةِ إِلَّا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِمَنْ شَهِدَ لَهُ بِهَا لَكِنَّا مَأْمُورُونَ بِحُسْنِ الظَّنِّ بِالصَّحَابَةِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ وَنَفْيِ كُلِّ رَذِيلَةٍ عَنْهُمْ وَإِذَا انْسَدَّتْ طُرُقُ تَأْوِيلِهَا نَسَبْنَا الْكَذِبَ إِلَى

رُوَاتِهَا"۔

ہم نبی ﷺ اور جن کے معصوم ہونے کی آپ نے گواہی دی ہے (یعنی ملائکہ۔ناقل) ان کے علاوہ کسی اور کی عصمت کے ہرگز قائل نہیں، لیکن ہم اس بات کے مامور ہیں کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے، اور ان سے ہر بُری بات (جو ان کے شایان شان نہ ہو۔ناقل) کی نفی کی جائے اور اگر (کسی روایت میں موجود۔ناقل) ایسی کسی بات کی کسی معقول تاویل کے تمام راستے مسدود ہو جائیں تو (پھر بھی ہم صحابی سے اعتراض کو دور کریں گے۔ناقل) اور اس روایت کے راویوں کی طرف جھوٹ کی نسبت کریں گے۔

(شرح صحيح مسلم للنووي، ج12ص72، دار احياء التراث العربي بيروت)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور یزید کی بیعت

لعل شاہ صاحب نے" ایک شبہہ کا ازالہ" کا عنوان باندھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کی بیعت کی تھی وہ بطیب خاطر نہیں کی تھی بلکہ" اثارتِ فتنہ" کے خوف سے کی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:

"حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما یزید کی ولی عہدی کے زبردست مخالف تھے بعد وفات معاویہ (رضی اللہ عنہ) جب یزید نے عنان حکومت سنبھالی اور لوگ طوعاً و کرہاً اس کی بیعت پر مجتمع ہو گئے تو انہوں نے بھی اثارتِ فتنہ کے خوف سے بیعت کر لی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 309)

نیز لکھتے ہیں:

"عادت مبارکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ تھی کہ کسی کام میں پہل نہیں کرتے تھے ایسے معاملات میں، چنانچہ بیعت کرنے میں بھی متاخر تھے اور بیعت توڑنے میں بھی توقف کیا۔ اسی وجہ سے عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور مروان بن الحکم میں سے کسی کی بیعت نہیں کی، اور جب عبدالملک پر حکومت مستقر ہو گئی تو پھر ان کی بیعت بشرط اطاعۃ اللہ و رسولہ کر لی تھی، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یزید ان کے نزدیک اہل تھا اور وہ اسے خلیفۂ راشد سمجھتے تھے جیسا کہ عباسی صاحب (یعنی

محمود احمد عباسی۔ناقل) کا خیال ہے یا بطیب خاطر بیعت کی تھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 309 و 310)

مزید لکھتے ہیں:

"انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی زبردست مخالفت کی اور مرگ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد جب انہیں خلافت یزید کی بیعت کا کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا: اذا بايع الناس وما يبق غيري بايعتُ وكانوا يتخوفونه۔جب سب لوگ بیعت کرلیں گے کوئی میرے بغیر نہیں رہے گا تو میں بھی بیعت کرلوں گا اور وہ انہیں ڈراتے دھمکاتے تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 310)

تنبیہ

یہاں لعل شاہ صاحب نے "يتخوّفونه" کا ترجمہ غلط کیا ہے، عربی میں "تخوّف" کا معنیٰ "ڈرانا دھمکانا" نہیں ہوتا بلکہ "کسی چیز کے وقوع سے ڈرنا اور خوف کھانا" ہوتا ہے، جیسے "التخوف من المرض" (بیماری کا خوف) یا "التخوف من خسارة عمل" (کسی کام میں نقصان کا ڈر) یا "التخوف من وقوع حادث" (کسی حادثے کے وقوع پذیر ہونے کا ڈر) وغیرہ۔ہاں اگر الفاظ یوں ہوتے کہ "وكانوا يُخَوِّفونه" (جو کہ "تخويف" سے ہے) تو پھر وہ مطلب بنتا جو لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے۔لیکن "وكانو يتخوّفونه" کا درست معنیٰ یہ بنے گا کہ "انہیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں خوف تھا" (کہ کہیں وہ بیعت سے انکار نہ کردیں)۔

پھر لعل شاہ صاحب نے اپنے ان دعووں کے حق میں ابن قتیبہ الدینوری، شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا حسین علی وغیرہ کی عبارات پیش کی ہیں اور پھر لکھا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ اہل شام یزید کے استخلاف پر رضامند تھے، مگر اہل حجاز اور اہل عراق اور دیگر بلاد کے باشندوں کے متعلق کہنا کہ انہوں نے بطیب خاطر بیعت کی تھی یہ تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہے اور اہل التحقیق اکابر کا تمسخر اڑانا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 315)

مندرجہ بالا اقتباسات میں لعل شاہ صاحب نے جو دعوے کیے ہیں وہ یہ ہیں:

(1) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پہلے یزید کی ولی عہدی کے زبردست مخالف تھے۔

(2) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد انہوں نے اثارتِ فتنہ کے خوف سے یزید کی بیعت کرلی تھی۔

(3) انہوں نے یہ بیعت "بطیب خاطر" (یعنی خوش دلی سے) نہیں کی تھی۔

(4) لعل شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک یزید اہل تھا۔

(5) لعل شاہ صاحب نے اقرار کیا ہے تمام لوگ یزید کی بیعت پر مجتمع ہو گئے تھے، البتہ ان کا کہنا ہے کہ یہ اجماع واتفاق "طوعاً و کرہاً" ہوا تھا۔

(5) ان کا کہنا ہے کہ" اہل شام نے تو یزید کی بیعت رضامندی سے کی تھی، مگر اہل حجاز اور اہل عراق اور دیگر بلاد کے باشندوں کے متعلق کہنا کہ انہوں نے بطیب خاطر بیعت کی تھی یہ تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہے اور اہل التحقیق اکابر کا تمسخر اڑانا ہے"۔

تبصرہ:

جہاں تک لعل شاہ صاحب کا یہ لکھنا ہے کہ" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پہلے یزید کی ولی عہدی کے "زبردست" مخالف تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد انہوں نے اثارتِ فتنہ کے خوف سے یزید کی بیعت کرلی تھی"، تو اس پر عرض ہے کہ یہ بات درست نہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یزید کے ولی عہدی والے قضیہ میں "زبردست" مخالفت کی تھی، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ جن چار یا پانچ لوگوں نے اس مسئلہ پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا اصحابہ کرام سے اختلاف کیا اور ان کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس بارے میں مکالمہ ہوا، ان میں سب سے نرم الفاظ میں اپنا موقف پیش کرنے والے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تھے، چنانچہ کتب تاریخ میں (ان روایات کی اسناد سے قطع نظر) جہاں یہ مذکور ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان تین چار حضرات کے ساتھ یزید کی ولی عہدی سے متعلق بات چیت یا مذاکرات کیے جو اختلافی رائے رکھتے تھے، ان میں سب سے نرم جواب حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے دیا" فكلّمه بكلام هو آلين من كلام

صاحبہ" پس آپ نے اپنے ساتھی سے زیادہ نرم لہجے میں بات کی۔انہوں نے فرمایا : "فو الله لو أن الأمة اجتمعت بعدك عَلَى عبد حبشي لدخلت فِيمَا تدخل فِيهِ الأمة" اللہ کی قسم،اگر آپ کے بعد امت ایک حبشی غلام پر بھی اکٹھی ہو جائے تو میں اسی راستے میں داخل ہو جاؤں گا جس میں امت داخل ہو گی، اس کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے گھر تشریف لے گئے، دروازہ بند کرلیا،لوگ آتے مگر آپ ملاقات نہ کرتے" ثُمَّ خرج فأتى منزله فأطبق بابه، وجعل الناس يجيئون فلا يأذن لَهُمْ" (تاریخ الطبری، ج5ص 304، حوادث سنة 56ھ) اور البدایۃ کے الفاظ ہیں کہ آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"إِذَا بَايَعَهُ النَّاسُ كُلُّهُمْ بَايَعْتُهُ، وَلَوْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا مُجَدَّعَ الْأَطْرَافِ"۔

جس کی تمام لوگ بیعت کریں گے میں بھی اس کی بیعت کرلوں گا اگرچہ وہ ایسا غلام ہی کیوں نہ ہو جس کے کان اور ناک کٹے ہوئے ہوں۔

(البداية والنهاية،ج8ص116، حوادث سنه 56ھ،وزارة الاوقاف قطر)

نہ جانے لعل شاہ صاحب نے یہ بات کہاں سے نکال لی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یزید کی ولی عہدی والے قضیہ میں" زبردست " مخالفت کی تھی،انہوں نے اس بات کا کوئی تاریخی حوالہ بھی پیش نہیں کیا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد انہوں نے جو یزید کی بیعت کی وہ بطیب خاطر نہیں کی تھی بلکہ صرف اثارتِ فتنہ کے خوف سے کی تھی،اور اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یزید ان کے نزدیک اہل تھا"، یہ بات خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی صحیح سند سے منقول نہیں بلکہ لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنواؤں کا اپنا خیال اور مفروضہ ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہیں نہیں فرمایا کہ" میں نے اثارتِ فتنہ کے خوف سے بیعت کی تھی اور میرے نزدیک یزید امارت کے لئے نااہل ہے"،اپنے اندر کی وضاحت صحابہؓ خود ہی کرسکتے تھے کوئی اور نہ ان کے اندر کی وضاحت کرسکتا ہے اور نہ کسی کو اس کا حق ہی پہنچتا ہے۔اس لئے اول تو لعل شاہ صاحب کو خود حضرت ابن عمرؓ سے یہ وضاحت نقل کرنی چاہیے تھی لیکن انہوں نے نہ تو ان سے کوئی اس قسم کی تصریح نقل کی ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور ہی قابل اعتماد و قابل قبول اور مطابق

اصول دلیل دی ہے۔ابن قتیبہ، شاہ عبدالعزیز دہلوی یا مولانا حسین علی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی اگر یہ بات لکھی ہے تو انہوں نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ اپنی رائے لکھی ہے۔

ثانیاً خود لعل شاہ صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی" سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً (یزید کی ولی عہدی کی) بیعت کرلی تھی" (استخلاف یزید، صفحہ 274)۔تو سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے" اثارتِ فتنہ" یا کسی اور" خوف" سے ہی بیعت کرنی تھی تو انہوں نے اس کے لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کا انتظار کیوں کیا؟ جب ان کی زندگی میں قریب بالکلّ اکثریت نے یزید کی بیعت کرلی تھی تو وہ بھی اسی وقت کرلیتے؟

لہٰذا یہ" اثارتِ فتنہ کا خوف" یا" یزید کو نااہل سمجھنے" جیسی باتیں بعد کے لوگوں کی اپنی رائے تو ہو سکتی ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور یزید کی بیعت کرنے والے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسا کچھ ثابت نہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے طرز عمل کے بارے میں علماء نے اتنا ہی لکھا ہے (جس کا کچھ حصہ لعل شاہ صاحب نے بھی نقل کیا ہے) کہ:

"وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فِي تِلْكَ الْمُدَّةِ امْتَنَعَ أَنْ يُبَايِعَ لِابْنِ الزُّبَيْرِ أَوْ لِعَبْدِ الْمَلِكِ كَمَا كَانَ امْتَنَعَ أَنْ يُبَايِعَ لِعَلِيٍّ أَوْ مُعَاوِيَةَ ثُمَّ بَايَعَ لِمُعَاوِيَةَ لَمَّا اصْطَلَحَ مَعَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَاجْتَمَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ وَبَايَعَ لِابْنِهِ يَزِيدَ بَعْدَ مَوْتِ مُعَاوِيَةَ لِاجْتِمَاعِ النَّاسِ عَلَيْهِ ثُمَّ امْتَنَعَ مِنَ الْمُبَايَعَةِ لأحد حَالَ الِاخْتِلَافِ إِلَى ان قتل بن الزُّبَيْرِ وَانْتَظَمَ الْمُلْكُ كُلُّهُ لِعَبْدِ الْمَلِكِ فَبَايَعَ لَهُ حِينَئِذٍ" ۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان کے مابین کشمکش کے عرصہ میں) ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک دونوں کی بیعت سے رُکے رہے، جیسے (زمانہ فتنہ میں) وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کی بیعت سے الگ رہے تھے، پھر انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت تب کی تھی جب ان کی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح

ہوگئی اور تمام لوگوں کا ان کی خلافت پر اجتماع واتفاق ہوگیا۔ پھر انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے یزید کی بیعت بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد تب کی جب اس کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوگیا۔ پھر اس کے بعد زمانہ اختلاف میں وہ کسی کی بھی بیعت سے رُکے رہے یہاں تک کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما قتل ہوگئے اور حکومت مکمل طور پر عبدالملک بن مروان کے زیرانتظام آگئی تو پھر (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) نے ان کی بیعت کرلی۔

(فتح الباری، ج13ص195، المکتبة السلفية)

”یتخوّفونه“ یا ”لا یتخوّفونه“؟

لعل شاہ صاحب نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”...مرگ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد جب انہیں یزید کی بیعت کا کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا: اذا بایع الناس ومابیق غیری بایعتُ وکانوا یتخوفونه۔البدایة والنهایة ص148ج 8۔ جب سب لوگ بیعت کرلیں گے کوئی میرے بغیر نہیں رہے گا تو میں بھی کرلوں گا اور وہ انہیں ڈراتے دھمکاتے تھے“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 310)

”البدایۃ والنہایۃ“ میں یہ روایت ”هشام بن محمد الكلبی عن ابي مخنف لوط بن یحییٰ“ کے واسطے سے نقل کی گئی ہے (البداية والنهاية، ج8ص213،وزارة الاوقاف قطر) اور اس میں لفظ ہیں ”وکانوا یتخوّفونه“ جن کا ترجمہ لعل شاہ صاحب نے کیا ہے کہ ”وہ انہیں ڈراتے دھمکاتے تھے“ (جس کا غلط ہونا ہم بیان کرآئے ہیں) لیکن جب ہم یہی روایت اس کے اصل مصدر ”تاریخ طبری“ میں دیکھتے ہیں تو وہاں الفاظ یوں ہیں:

"ولكن إذا بايع الناس ولم يبق غيري بايعت، قَالَ: فتركوه وكانوا لا يتخوّفونه"۔

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا) جب لوگ بیعت کرلیں گے اور میرے بغیر اور کوئی نہیں بچے

گا تو میں بھی بیعت کرلوں گا، راوی کہتا ہے کہ: انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مزید تعرض نہ کیا کیونکہ ان کی طرف سے انہیں کوئی خوف یا اندیشہ نہیں تھا۔

(تاريخ الطبرى، ج5ص342، دار المعارف مصر)

اسی طرح "ابن الاثیر" نے بھی یہی الفاظ نقل کیے ہیں:

"ثُمَّ إِنَّ الْوَلِيدَ أَرْسَلَ إِلَى ابْنِ عُمَرَ لِيُبَايِعَ فَقَالَ: إِذَا بَايَعَ النَّاسُ بَايَعْتُ، فَتَرَكُوهُ وَكَانُوا لَا يَتَخَوَّفُونَهُ"۔

پھر (والی مدینہ) ولید بن عتبہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف بیعت کرنے کے لئے پیغام بھیجا تو آپ نے فرمایا: جب لوگ بیعت کرلیں گے تو میں بھی کرلوں گا، پس انہوں نے انہیں رہنے دیا اور انہیں ان کی طرف سے کوئی ڈر یا خوف وخطر نہیں تھا۔

(الكامل في التاريخ، ج3ص130، دار الكتاب العربي بيروت)

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اول تو یہ روایت ہی سند کے اعتبار سے ناقابل اعتماد ہے کیونکہ اسے روایت کرنے والے "ہشام بن محمد کلبی" اور "ابومخنف" جیسے راوی ہیں، ثانی الذکر کے بارے میں تو خود لعل شاہ صاحب اس بات سے کلی طور پر اتفاق کرتے ہیں کہ:

"وہ رافضی اور کذاب ہے اور اس کا نام ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ روایت جھوٹی ہے"۔

(اظہار حقیقت پر بصیرت افروز تبصرہ، ص21، زیرعنوان "چند متفق علیہا امور")

اور اول الذکر (ہشام بن محمد کلبی) بھی "رافضی، متروک اور ناقابل اعتبار ہے" (ميزان الاعتدال، ج5ص60، دار الرسالة العالمية، دمشق) لیکن روایت کی اسنادی حیثیت سے قطع نظر، اہم بات یہ ہے کہ بقول لعل شاہ صاحب، البدایۃ والنہایۃ کا ماخذ "امام طبری اور حافظ ابن عساکر کی کتابیں ہیں" (استخلاف یزید، صفحہ 66) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت بھی "تاریخ طبری" سے لی ہے، اور تاریخ طبری میں الفاظ ہیں کہ "انہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا"۔ البدایۃ والنہایۃ میں غلطی سے "وکانوا یتخوّفونہ" لکھا گیا ہے جس کا ترجمہ بالکل الٹ بنتا ہے۔

نیز "البدایۃ والنہایۃ" میں اسی جگہ جہاں سے لعل شاہ صاحب نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں، آگے یہ بھی

بیان ہے کہ:

"لَمْ يَكُنِ ابْنُ عُمَرَ بِالْمَدِينَةِ حِينَ قَدِمَ نَعْيُ مُعَاوِيَةَ، وَإِنَّمَا كَانَ هُوَ وَابْنُ عَبَّاسٍ بِمَكَّةَ. فَلَقِيَهُمَا وَهُمَا مُقْبِلَانِ مِنْهَا، الْحُسَيْنُ وَابْنُ الزُّبَيْرِ، فَقَالَا: مَا وَرَاءَكُمَا؟ قَالَا: مَوْتُ مُعَاوِيَةَ وَالْبَيْعَةُ لِيَزِيدَ. فَقَالَ لَهُمَا ابْنُ عُمَرَ: اتَّقِيَا اللَّهَ، وَلَا تُفَرِّقَا بَيْنَ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِينَ - وَقَدِمَ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ إِلَى الْمَدِينَةِ، فَلَمَّا جَاءَتِ الْبَيْعَةُ مِنَ الْأَمْصَارِ بَايَعَا مَعَ النَّاسِ"۔

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر آئی تو حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ عباس (رضی اللہ عنہما) مدینہ میں نہیں تھے بلکہ مکہ میں تھے، جب حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) مدینہ سے مکہ کی طرف آئے تو حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے ان سے پوچھا کہ: تمہارے پیچھے (یعنی مدینہ میں) کیا حالات ہیں؟ تو انہوں نے کہا: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر آچکی ہے اور یزید کی بیعت لی جارہی ہے (اس لئے ہم وہاں سے نکل آئے ہیں ۔ناقل)، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: تم دونوں اللہ سے ڈرو! اور مسلمانوں کی جماعت کے درمیان تفرقہ مت ڈالو! اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) دونوں مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے اور جب دوسرے شہروں سے (یزید کی) بیعت آچکی تو ان دونوں نے بھی لوگوں کے ساتھ بیعت کرلی۔

(البداية والنهاية، ج8ص214و 215، وزارة الاوقاف قطر)

نہ جانے لعل شاہ صاحب نے یہ بات کیوں چھوڑ دی؟

رہا لعل شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ:

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک یزید اہل تھا"۔

تو اس پر عرض ہے کہ کیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے خود کہیں یہ کہا تھا کہ "یزید خلافت کے لئے نااہل

ہے" ؟ یا یہ کہا تھا کہ " ہے تو وہ نااہل، میں صرف اشارتِ فتنہ کے خوف سے اس نااہل کی بیعت کر رہا ہوں" ؟ لعل شاہ صاحب نے ایسی کوئی تصریح بھی تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل نہیں کی بلکہ اپنی بات ان کے ذمہ لگائی ہے جبکہ اصولاً انہیں چاہئے تھا کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ بات ثابت کرتے۔

پھر لعل شاہ صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"اہل شام نے تو یزید کی بیعت رضامندی سے کی تھی، مگر اہل حجاز اور اہل عراق اور دیگر بلاد کے باشندوں کے متعلق کہنا کہ انہوں نے بطیب خاطر بیعت کی تھی یہ تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہے اور اہل التحقیق اکابر کا تمسخر اڑانا ہے"۔

یہ بھی لعل شاہ صاحب کا اپنا خانہ ساز مفروضہ ہے، اوپر ہم حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب" فتح الباری" کے حوالے سے یہ نقل کر آئے ہیں کہ" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت تب کی جب اس کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوگیا" اب آئیے ہم آپ کو مزید بتاتے ہیں کہ تاریخی حقائق کیا ہیں اور" اہل التحقیق" نے اس پر کیا لکھا ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اکثر شارحین نے" بارہ خلفاء" والی حدیث کی شرح میں ان بارہ خلفاء کے نام بھی گنوائے ہیں، اسی سلسلے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ نقل ہو چکا ہے کہ:

"فِي بَعْضِ طُرُقِ الْحَدِيثِ الصَّحِيحَةِ كُلُّهُمْ يَجْتَمِعُ عَلَيْهِ النَّاسُ وَإِيضَاحُ ذَلِكَ أَنَّ الْمُرَادَ بِالِاجْتِمَاعِ انْقِيَادُهُمْ لِبَيْعَتِهِ وَالَّذِي وَقَعَ أَنَّ النَّاسَ اجْتَمَعُوا عَلَى أَبِي بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرَ ثُمَّ عُثْمَانَ ثُمَّ عَلِيٍّ إِلَى أَنْ وَقَعَ أَمْرُ الْحَكَمَيْنِ فِي صِفِّينَ فَسُمِّيَ مُعَاوِيَةُ يَوْمَئِذٍ بِالْخِلَافَةِ ثُمَّ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَى مُعَاوِيَةَ عِنْدَ صُلْحِ الْحَسَنِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى وَلَدِهِ يَزِيدَ وَلَمْ يَنْتَظِمْ لِلْحُسَيْنِ أَمْرٌ بَلْ قُتِلَ قَبْلَ ذَلِكَ ثُمَّ لَمَّا مَاتَ يَزِيدُ وَقَعَ الِاخْتِلَافُ إِلَى أَنِ اجْتَمَعُوا عَلَى عبد الْملك بن مَرْوَان بعد قتل بن الزُّبَيْرِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى أَوْلَادِهِ الْأَرْبَعَةِ الْوَلِيدِ ثُمَّ سُلَيْمَانَ ثُمَّ يَزِيدَ

ثُمَّ هِشَامٍ وَتَخَلَّلَ بَيْنَ سُلَيْمَانَ وَيَزِيدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَهَؤُلَاءِ سَبْعَةٌ بَعْدَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ وَالثَّانِي عَشَرَ هُوَ الْوَلِيدُ بْنُ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ لَمَّا مَاتَ عَمُّهُ هِشَامٌ ..."

(خلاصہ) بعض صحیح طرق حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ان بارہ خلفاء پر لوگوں کا اتفاق و اجتماع بھی ہو گا، اس سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی بیعت کریں گے، اور واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کا اجتماع حضرت ابو بکر، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی (رضی اللہ عنہم) پر ہوا، پھر ان کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوا، پھر ان کے بیٹے یزید بن معاویہ پر ہوا، پھر یزید کی وفات کے بعد اختلاف رہا، یہاں تک کہ پھر لوگ حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے قتل کے بعد، عبد الملک بن مروان پر مجتمع ہوئے، پھر عبد الملک کے چاروں بیٹوں ولید، سلیمان، یزید اور ہشام پر اجتماع ہوا، ان کے درمیان عمر بن عبد العزیز بھی آتے ہیں، تو خلفاء راشدین کے بعد یہ سات خلفاء ہوئے، اور بارہواں خلیفہ ولید بن یزید بن عبد الملک ہوا جس پر لوگوں کا اجتماع ہوا جب اس کا چچا ہشام فوت ہو گیا۔

(فتح الباری، ج 13ص 214، دار المعرفة بیروت)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا حوالہ بھی آپ پہلے پڑھ چکے کہ:

"وفي لفظ :لا يزال الإسلام عزيزا إلى اثني عشر خليفة كلهم من قريش وهكذا كان، فكان الخلفاء :أبو بكر ، وعمر ، وعثمان، وعلي، ثم تولى من اجتمع الناس عليه وصار له عز ومنعة:معاوية، وابنه يزيد، ثم عبد الملك وأولاده الأربعة، وبينهم عمر بن عبد العزيز. وبعد ذلك حصل في دولة الإسلام من النقص ما هو باق إلى الآن ، فإن بني أمية تولوا على جميع أرض الإسلام ، وكانت الدولة في زمنهم عزيزة"۔

اور اس حدیث کے بعض الفاظ ہیں: "اسلام غالب رہے گا بارہ خلفاء تک جو سب کے سب

قریش سے ہوں گے" اور ایسے ہی ہوا چنانچہ یہ خلفاء اس طرح تھے، ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ان کے بعد جن پر امت جمع رہی اور اس کے لئے عزت و طاقت رہی، وہ معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے یزید، پھر عبد الملک اور پھر اس کے چاروں بیٹے اور ان کے درمیان عمر بن عبد العزیز بھی تھے۔ اور اس کے بعد اسلامی حکومت میں نقص آ گیا جو آج تک باقی ہے، اور بنو امیہ نے تمام عالم اسلام پر حکومت کی اور اسلامی حکومت ان کے زمانے میں مضبوط تھی"۔

(منهاج السنة، جلد8، صفحه 238، طبع السعودية)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"علمائے اہل سنت میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفاء میں سے بارہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی اور وہ متقی تھے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ کی بنا پر خلفائے راشدین اور بنو امیہ میں سے ان بارہ خلفاء کو گناتے ہیں جن کی خلافت پر تمام امت کا اجماع رہا یعنی حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہم)، یزید، عبد الملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبد العزیز، یزید ثانی، ہشام"۔

(سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد2، صفحہ 393، ادارہ اسلامیات پاکستان)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سنہ 56ھ کے واقعات کے ضمن میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"... فَبَايَعَ لَهُ النَّاسُ فِي سَائِرِ الْأَقَالِيمِ، إِلَّا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ وَالْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَابْنَ عَبَّاسٍ فَرَكِبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى مَكَّةَ مُعْتَمِرًا..."۔

سوائے عبد الرحمن بن ابی بکر، عبد اللہ بن عمر، حسین بن علی، عبد اللہ بن زبیر اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے باقی تمام صوبوں اور علاقوں کے لوگوں نے یہ بیعت کر لی تھی، تو حضرت معاویہ

رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(البداية والنهاية، ج8ص116، وزارة الاقاف، قطر)

مؤرخ ابن جریر طبری نے بھی لکھا ہے:

"لما مات زياد دعا مُعَاوِيَة بكتاب فقرأه عَلَى الناس باستخلاف يَزِيد، إِن حدث بِهِ حدث الموت فيزيد ولي عهد،فاستوسق لَهُ الناس عَلَى البيعة ليزيد غير خمسة نفر"۔

جب زیاد کی وفات ہوگئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک تحریر منگوائی اور لوگوں کے سامنے پڑھی (جس میں لکھا تھا کہ) اگر مجھے موت آجائے تو یزید ولی عہد ہوگا، پس تمام لوگ یزید کی بیعت پر جمع و متفق ہوگئے، سوائے پانچ لوگوں کے۔

(تاريخ الطبري، ج5ص303،دار المعارف)

یہ محققین و مؤرخین" مولانا حسین علی"، "مولانا مناظر احسن گیلانی" اور" شاہ عبدالعزیز دہلوی" سے بہت پہلے کے ہیں، ان سب نے صراحت کی ہے کہ" یزید ان خلفاء میں سے ہے جن کی خلافت پر لوگوں کی قریب الکل اکثریت کا اجتماع و اتفاق ہوگیا تھا" (ولی عہدی والی پہلی بیعت پر چار یا پانچ لوگوں کا اختلاف ہی منقول ہے جو خلافت کی بیعت تک صرف دو حضرات تک رہ گیا) اور کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اہل شام نے تو رضامندی سے بیعت کی تھی مگر اہل حجاز، اہل عراق اور دیگر بلاد کے لوگوں نے خوشی اور طیب خاطر سے بیعت نہیں بلکہ ڈر کر یا مجبوراً بیعت کی تھی۔ تو کیا لعل شاہ صاحب خود تاریخی حقائق کو مسخ کر کے" اہل التحقیق" مؤرخین کا تمسخر نہیں اڑا رہے؟ اور بیعت کرنے والوں کی طرف اپنی بات منسوب نہیں کر رہے؟

لعل شاہ صاحب اس ساری بحث سے ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

اگر غور کیا جائے تو یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کی نامزدگی اور اسے ولی عہد بنانے کی تجویز سب سے پہلے کس نے دی؟ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز کس سال ہوا؟ بس اتنا جاننا کافی

ہے کہ یزید کی ولی عہدی کی بات ہوئی اور اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صحابہ کرام سے مشاورت بھی ہوئی، جن حالات واسباب کے پیش نظر اسے ولی عہد بنایا گیا ان کا ذکر بھی علامہ ابن خلدون وغیرہ نے تفصیلاً کیا ہے۔اور بالآخر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی (سوائے چار یا پانچ صحابہ کرام کے) باقی لوگوں نے ولی عہدی کی تجویز سے اتفاق کرلیا اور اس کی بیعت کرلی،اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب یزید نے عنانِ حکومت سنبھالی تو سوائے دو حضرات (حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم) کے باقی لوگوں نے اس کی بیعت خلافت کرلی تھی (لعل شاہ صاحب نے اقرار کیا ہے کہ: "لوگ اس کی بیعت پر طوعاًو کرہاً مجتمع ہو گئے تھے" ۔استخلاف یزید، صفحہ 309)

لیکن پھر لعل شاہ صاحب نے اس بات پر اتنے ورق کیوں سیاہ کیے کہ یہ معاملہ سنہ 44ھ میں شروع ہوا تھا اور اسے مکمل ہونے میں تقریباً سولہ سال لگے،اس کی وجہ خود لعل شاہ صاحب نے یوں بیان کی ہے:

> "ہماری تحقیق کے مطابق سنہ 44ھ میں تحریک شروع ہوئی اور آخری وقت تک پوری تندہی سے جملہ وسائل و ذرائع کو بروئے کار لا کر سعی کی گئی تاہم (پھر۔ناقل) بھی کسر باقی رہ گئی اور یزید کی بیعت ولایتِ عہد کی تکمیل نہ ہوسکی،آخر اتنا وقت کیوں صرف ہوا؟ اگر بطیبِ قلب بیعت ہوتی تو امیر المؤمنین کا ایک فرمان جاری کر دینا کافی ہوتا۔تاریخ استخلاف یزید کی تعیین اور کیفیتِ استخلاف کی بحث میں اطناب سے کام لیا گیا تا کہ عصر حاضر کے مدعیان تحقیق کے بانگ دہل دعاویٰ کا ابطال بخوبی ہوجائے جو کہتے ہیں کہ یزید ابن معاویہ کی خلافت پر اس طرح اجماع ہوا تھا کہ پہلے کسی کی خلافت پر ایسا اجماع نہیں ہوا اور صحابہ نے بطیب خاطر یزید کی بیعت کی تھی"۔
>
> (استخلاف یزید، صفحہ 315و316)

<u>**تبصرہ:**</u>

لعل شاہ صاحب کے دل میں اگر بُغضِ معاویہ رضی اللہ عنہ موج زن نہ ہوتا تو وہ یوں بھی لکھ سکتے تھے کہ:

"اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ زبردستی یزید کی ولی عہدی کی بیعت لینا چاہتے تو بطور امیر المؤمنین

ان کا ایک فرمان جاری کر دینا ہی کافی ہوتا لیکن آپ نے زور وزبردستی سے کام نہ لیا، بلکہ جن چار یا پانچ حضرات نے ان کی اس تجویز سے اختلاف کیا تھا ان کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے خاص طور پر شام سے حجاز تشریف لے گئے اور ان سے بھی زبردستی بیعت نہ لی، یہی وجہ ہوئی کہ بیعت مکمل ہونے میں اتنا وقت لگا"۔

اور یہی حقیقت بھی ہے، جمہور مؤرخین کی تحقیق کی مطابق یزید کی ولی عہدی کی تجویز سیدنا حسن ﷛ کی وفات کے بعد یعنی سنہ 50ھ یا اس کے بعد سامنے آئی لیکن اس پر باقاعدہ عمل درآمد اور بیعت لینے کا عمل سنہ 56ھ میں شروع ہوا اور مکمل ہو گیا کسی سے زبردستی یا تلوار کے زور پر بیعت نہیں لی گئی، ورنہ ان چار یا پانچ حضرات کو بھی مجبور کر کے یا ڈرا دھمکا کر ان سے بیعت لے لی جاتی جن کا اختلاف کرنا کتب تاریخ میں مذکور ہے۔

لیکن برا ہو بغض کا کہ صرف یہ باور کروانے کے لئے کہ یزید کی ولی عہدی کی تجویز کی سوائے اہل شام کے باقی تمام صوبوں کے لوگوں نے مخالفت کی اور ان سے بیعت لینے میں سولہ سترہ سال لگ گئے، یہ سارا افسانہ بنایا گیا کہ یہ قضیہ سنہ 44ھ میں شروع ہوا۔

پھر جیسا کہ بیان ہوا، خود لعل شاہ صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

" سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کر لی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

اسے کہتے ہیں" دودھ دینا مگر مینگنیاں ڈال کر"۔ یہ تو اقرار کر لیا کہ مدینہ کے چند حضرات (جن کی تعداد چار یا پانچ تھی) کے علاوہ باقی تمام لوگوں نے حضرت معاویہ ﷛ کی زندگی میں ہی یزید کی بطور ولی عہد بیعت کر لی تھی، لیکن ساتھ "طوعاً و کرہاً" لکھ کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جیسے سب نے اپنی مرضی اور خوشی سے بیعت نہیں کی تھی بلکہ ان میں ایسے بھی تھے جن کو مجبور کر کے ان سے زبردستی بیعت لی گئی یا انہوں نے کسی اور مصلحت یا لالچ کی وجہ سے بیعت کر لی تھی۔

یہاں ہمارا سوال ہے کہ یہ بتایا جائے کہ کس علاقے کے لوگوں سے زبردستی بیعت لی گئی؟ کیا انہوں

نے عالم ارواح سے چودہ سو سال بعد لعل شاہ صاحب کو پیغام بھیج کر بتایا کہ "ہم نے اپنی مرضی سے بیعت نہیں کی تھی بلکہ مجبوراً کی تھی"؟ پھر فرض کریں کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں کسی خاص علاقے کے لوگوں نے "کرہاً" بیعت کی تھی، تو جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو ان علاقوں میں یزید کے خلاف بغاوت کیوں نہ ہوئی؟ جب کہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات (رجب سنہ 60ھ) سے لے کر ذوالحجہ سنہ 63ھ تک (تین سال پانچ ماہ میں) واقعۂ کربلا کو نکال کر، یزید کے خلاف کسی صوبے یا علاقے میں کوئی خروج نہیں ہوا، اور یہ واقعۂ کربلا بھی کوئی باقاعدہ بغاوت نہیں تھی بلکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو انہی لوگوں نے عراق بلا کر بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا جو پہلے بھی کئی بار فتنہ کی آگ بھڑکا چکے تھے، پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے حادثہ فاجعہ کے بعد بھی تین سال تک کہیں کوئی خروج یا احتجاج نہیں ہوا۔ یزید کے خلاف اوّلین باقاعدہ خروج یا بغاوت ہمیں ذوالحجہ 63ھ میں نظر آتی ہے جب مدینہ کے کچھ لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ کر اور اس کے گورنر "عثمان بن محمد بن ابی سفیان"، نیز مدینہ میں رہنے والے تمام بنوامیہ کو نکال کر مدینہ پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنے دو امیر مقرر کر کے ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی جسے "واقعہ حرہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے (جس پر ہم آگے بات کریں گے)۔

کیا صحابہ کرام کو "بہترین امت" نہیں قرار دیا گیا؟

کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے بہترین امت قرار نہیں دیا اور انہیں اس کی وجہ یہ نہیں بتائی گئی کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہو؟ (كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ)؟

پھر ہمارا سوال ہے کہ کیا احادیث نبویہ میں نہی عن المنکر کی بلند ترین صورت یہ بیان نہیں کی گئی کہ برائی کو بزورِ بازو کچل دیا جائے اور اس سے ادنیٰ صورت زبان سے منع کرنے کی اور اس سے بھی کم تر صورت برائی کو صرف دل سے بُرا سمجھنے کی بیان کی گئی ہے (مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ. صحیح مسلم) تو اس دور کے صحابہ کرام و تابعین عظام نے "نہی عن المنکر" کا فریضہ انجام دیا تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تو اللہ نے صحابہ کرام کو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنا پر بہترین امت قرار دیا تھا تو کیا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) وہ درست نہیں

تھا؟اور اگر انہوں نے نہی عن المنکر سے کام لیا تھا تو انہوں نے اس کی کون سی صورت اختیار فرمائی تھی؟ اگر وہ برائی کو بزورِ بازو روکنے کی صلاحیت سے محروم ہو کر نہی عن المنکر کے کمتر یا کم ترین درجے پر آجانے پر مجبور ہو گئے تھے تو کیا جب قرآن میں انہیں بہترین امت قرار دیا گیا تھا تو اللہ کو معلوم تھا یا نہیں کہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اصحاب اس ناگفتہ بہ حالت پر آجائیں گے؟ آج اگر کوئی غیر مسلم ہم سے پوچھ لے کہ جس زمانے میں" امت کی تباہی کی بنیاد رکھی جارہی تھی" اور سوائے چار یا پانچ کے تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باقی تمام صحابہ نہ صرف بے بس، مجبور، مقہور اور لاچار ہو کر خاموش تماشائی بنے رہے ہوں (بقول لعل شاہ صاحب "اشارتِ فتنہ کے خوف سے خاموش رہے") بلکہ عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) جیسے صحابی یزید کی بیعت توڑنے سے سختی سے منع فرما رہے ہوں اور حضرت زین العابدین اور حضرت محمد بن الحنفیہ (رحمۃ اللہ علیہما) جیسے تابعین بھی اپنے گھروں میں بند ہو گئے ہوں تو کیا تمہارے نبی نے اسی زمانے کو" خیر القرون" اور تمہارے اللہ نے انہی اصحاب کو بہترین امت قرار دیا تھا؟ اگر یہ زمانہ" خیرالقرون" تھا تو بتاؤ" شرّالقرون" کیا ہوتا ہے؟ تو ایسے سوالوں کا کیا جواب ہوگا؟ تو کیا یہ صورت حال ہمارے لئے قابل فخر ہوگی یا شرمناک ہوگی؟

لعل شاہ صاحب کا ایک اقرار اور ایک تلبیس

لعل شاہ صاحب، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

" پس اشارت فتنہ کے خوف میں بیعت کرلی، جب لوگ ان پر (یعنی یزید اور عبدالملک بن مروان وغیرہ پر۔ناقل) مجتمع ہو گئے تھے لیکن انہیں خلیفہ راشد نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں وہ بادشاہ ہی سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص کے سوال کے جواب میں ان کا قول صحیح بخاری میں ضبط ہے: لیس بقتالکم علی الملك ۔ہماری جنگ تمہاری طرح بادشاہی کے لئے نہیں تھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 311)

یہاں لعل شاہ صاحب نے یہ اقرار تو کرلیا کہ یزید پر لوگ مجتمع و متفق ہو گئے تھے، اور اس اجتماع و اتفاق کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت کی تھی۔ رہا لعل شاہ صاحب کا یہ مفروضہ کہ یہ بیعت" اشارتِ فتنہ" کے خوف میں کی گئی تھی، تو جیسے پہلے بیان ہوا یہ لعل شاہ صاحب کی اپنی بات ہے، وہ جب تک اس کی تصریح

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نہیں دکھا دیتے اس بات کی کوئی حیثیت نہیں۔

لیکن یہاں لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کے حوالے سے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے، بظاہر پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات یزید کی بیعت سے متعلق فرمائی تھی، کیونکہ لعل شاہ صاحب اس قول کو اس بات کی دلیل میں لائے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ "یزید اور عبدالملک کو خلیفۂ راشد نہیں سمجھتے تھے بلکہ بادشاہ سمجھتے تھے" لیکن صحیح بخاری کی یہ پوری روایت دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات خاص یزید کے بارے میں نہیں فرمائی تھی بلکہ "قتال فتنہ" (یعنی زمانۂ فتنہ کے دوران ہونے والی جنگوں) کے بارے میں فرمائی تھی، چنانچہ روایت کے الفاظ یہ ہیں، حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ:

"خَرَجَ عَلَيْنَا أَوْ إِلَيْنَا ابْنُ عُمَرَ، فَقَالَ رَجُلٌ :كَيْفَ تَرَى فِي قِتَالِ الفِتْنَةِ؟ فَقَالَ:وَهَلْ تَدْرِي مَا الفِتْنَةُ؟ كَانَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَاتِلُ المُشْرِكِينَ، وَكَانَ الدُّخُولُ عَلَيْهِمْ فِتْنَةً وَلَيْسَ كَقِتَالِكُمْ عَلَى المُلْكِ"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہمارے پاس تشریف لائے تو ایک آدمی نے سوال کیا: مسلمانوں کے باہمی فتنہ اور جنگ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (غالباً وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ مسلمانوں کی ان آپس کی جنگوں میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟) تو آپ نے فرمایا: تجھے معلوم بھی ہے فتنہ کیا چیز ہے؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے قتال فرمایا کرتے تھے اور اس جہاد سے مقصود اہل ایمان کی آزمائش کرنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ تمہاری ملک وسلطنت کی خاطر جنگ کی طرح نہیں ہوتی تھی۔

(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله وقاتلوهم حتی لاتکون فتنة ویکون الدین کله لله)

اس روایت میں کوئی ایسی تصریح بلکہ اشارہ تک نہیں کہ یہ بات یزید کی خلافت کے بارے میں فرمائی گئی، بلکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شروع ہونے والے زمانۂ فتنہ کی جنگوں سے متعلق ہی معلوم ہوتی ہے، تو اگر لعل شاہ صاحب کا اس روایت سے کیا گیا یہ استدلال درست تسلیم کرلیا جائے کہ "حضرت ابن

عمر رضی اللہ عنہ قتال فتنہ کرنے والوں کو خلیفہ راشد نہیں سمجھتے تھے بلکہ بادشاہ ہی سمجھتے تھے" تو پھر کیا یہ بھی سمجھا جائے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک جمل و صفین کی جنگیں بھی دین کے لئے نہیں تھیں بلکہ بادشاہی اور سلطنت کے لئے تھیں؟ کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ان جنگوں سے بھی الگ رہے تھے۔ لہٰذا لعل شاہ صاحب کا خوامخواہ اس روایت کو یزید کی بیعت پر منطبق کرنا ان کی ایک تلبیس ہی ہے۔

یہی نہیں، لعل شاہ صاحب نے ایک اور حدیث کے کچھ الفاظ لے کر انہیں بھی اسی مسئلہ کے ساتھ جوڑ دیا ہے، چنانچہ آنجناب لکھتے ہیں:

"...اور یزید بن معاویہ جس کے ہاتھوں امت کی تباہی مقرر ہو چکی تھی پوری امت پر مسلط کر دیا جاتا ہے، اس طرح صادق المصدوق پیغمبر کی پیشگوئی سچی ہو جاتی ہے کہ (يهلك الناس هذا الحي من قريش) کہ لوگوں کو قریش کا یہ قبیلہ ہلاک کرے گا۔ اور بالآخر لوگوں کے سامنے وہ منظر آ ہی گیا جسے بیان کرتے ہوئے زبان نبوت مرتعش ہو گئی تھی، آپ نے فرمایا تھا لو اعتزل الناس عنهم کاش لوگ ان سے جدا ہو جاتے۔ صحیح بخاری ص 1040 ج 2"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 316)

ہمیں نہیں معلوم کہ یزید کے ہاتھوں کون سی امت تباہ ہو گئی؟ اگر پہلی صدی ہجری میں ہی امت کی تباہی مقدر ہو چکی تھی تو پھر نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے کہ" میری امت کے سب سے بہتر لوگ میرے زمانے والے ہیں، پھر وہ جو اُن سے ملے ہوئے ہیں اور پھر وہ جو اُن سے ملے ہوئے ہیں" جس کی عام فہم تشریح علماء نے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے کی ہے۔ نیز ان احادیث صحیحہ کا کیا کریں گے جن میں بیان ہے کہ امت میں ایسے بارہ خلفاء ہوں گے جو سب قریشی ہوں گے، جن کے زمانے میں اسلام غالب اور مضبوط رہنے کی پیشگوئی کی گئی اور جن کی تشریح میں شارحین نے ان خلفاء کے نام بھی گنوائے ہیں جن میں یزید کو بھی شمار کیا ہے؟ (حوالے پہلے گذر چکے)۔

اب آئیے وہ حدیث شریف دیکھتے ہیں جسے لعل شاہ صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید اور ان کے خاندان پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ :يُهْلِكُ النَّاسَ هَذَا الحَيُّ مِنْ قُرَيْشٍ قَالُوا :فَمَا تَأْمُرُنَا؟قَالَ:لَوْ أَنَّ النَّاسَ اعْتَزَلُوهُمْ۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا اس قبیلہ قریش کے (بعض آدمی) لوگوں کو ہلاک و برباد کردیں گے۔صحابہ نے عرض کیا : ایسے وقت کے لئے آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کاش لوگ ان سے بس الگ ہی رہتے۔

(صحيح البخاري، باب علامات النبوة في الاسلام)

اس حدیث شریف میں صرف ایک پیشگوئی کی گئی ہے، جیسے دوسری احادیث میں ایسی پیشگوئی کی گئی ہے کہ بارہ خلفاء یا امیر ایسے ہوں گے جن کے زمانے میں اسلام غالب اور مضبوط رہے گا اور ان میں سے ہر ایک پر امت متفق و مجتمع ہوگی اور وہ سب قریشی ہوں گے۔ یہ ایک عمومی بات کی گئی ہے، نہ یہاں بنوامیہ کا ذکر ہے اور نہ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے بیٹے یزید کی ہی کوئی تصریح ہے۔اگر کسی نے اس سے مراد کوئی خاص زمانہ یا کوئی خاص شخصیت لی ہے تو وہ اس تشریح کرنے والے کی رائے ہے، اور یہ بات اہل علم کے ہاں مسلم ہے کہ حدیث کی تشریح میں شارح جو کہتا ہے وہ شارح کا اپنا قول اور اس کا استنباط ہوتا ہے اسے حدیث شریف یا فرمان نبوی نہیں کہہ سکتے۔

لہٰذا لعل شاہ صاحب کا اس حدیث کو یزید کی ولی عہدی پر چسپاں کرنا یہ انہی کا ذاتی کارنامہ ہے، حدیث شریف میں ایسی کوئی بات یا اشارہ نہیں۔چونکہ لعل شاہ صاحب نے آگے اپنی کتاب کے صفحہ 377 پر اسی مندرجہ بالا روایت کو دوبارہ پیش کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ" اس میں یزید کے ظلم اور اس کے فسق کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے" اس لئے ہم اس پر مفصل کلام اسی مقام پر کریں گے ان شاءاللہ۔

❁❁❁

حدیث قسطنطنیہ اور یزید

اپنی کتاب کے صفحہ 317 پر سید لعل شاہ صاحب بخاری نے عنوان باندھا ہے "کیا یزید جنتی ہے؟" اور پھر ان لوگوں پر رد کرتے ہوئے جنہوں نے صحیح بخاری کی ایک حدیث سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے اور یزید کے مغفور ہونے پر استدلال کیا تھا، اپنی بات یہاں سے شروع کرتے ہیں:

"گذارش ہے کہ اللہ رب العزت اگر اپنی رحمت سے یزید کی مغفرت فرما کر اسے جنت میں جاگزیں فرمائے تو نہ اس کی رحمت میں کچھ قصور ہے اور نہ اس کی جنت میں کچھ ضیق اور تنگی ہے، اس کی رحمت غیر محدود اور جنت بے حد وسیع ہے وہ غفور رحیم بھی ہے اور فعال لما یرید بھی۔ مگر جہاں تک ضابطہ کا تعلق ہے، کسی شخص معین کے لئے جنت کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو علام الغیوب ضمائر وستائر پر مطلع اور خواتیم اعمال سے خبردار ہے یا اس کا رسول بذریعہ وحی اطلاع پا کر بتلا سکتا ہے۔ امت میں صحابہ کرام کا جو مقام رفیع ہے کسی پر مخفی نہیں لیکن بجز ان صحابہ کے جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی تصریح کی ہے کہ وہ جنتی ہیں، کسی کو حتمی طور پر جنتی نہیں کہہ سکتے۔ اہل السنہ کے شعار میں اس امر کو بھی شمار کیا گیا ہے کہ کسی پر قطعی طور پر جنتی یا جہنمی ہونے کا حکم لگانے سے اجتناب کرتے ہیں جیسا کہ ہم مقدمہ میں نہایت بسط سے بیان کر آئے ہیں، دیکھئے مقدمہ صفحہ 29"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 317)

اور جب ہم لعل شاہ صاحب کی کتاب کا صفحہ 29 دیکھتے ہیں تو وہاں انہوں نے اہل سنت کے جو شعار لکھے ہیں ان میں سے چھٹے نمبر پر یہ بھی لکھا ہے:

"والالطاعة لامیرین: یعنی دونوں امیروں کی اطاعت کرنی، حاکم عادل ہو یا ظالم اس کی اطاعت ضروری ہے"۔

پھر آگے "تنبیہ" کے تحت لکھا ہے:

"حاکم کی اطاعت ضروری ہے بشرطیکہ وہ معصیت کا حکم نہ دے ورنہ لاطاعة لمخلوق في

معصیۃ الخالق۔حاکم فاسق کے خلاف خروج اور بغاوت جائز نہیں ہے جب تک وہ کفر بواح یعنی ظاہر کفر کا ارتکاب نہ کرے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 29)

اور اسی صفحے پر شعار نمبر سات کے تحت دوسری تنبیہ لکھتے ہیں کہ:

"....ہم مسلمانوں کے ساتھ بموافق شرع احکام شرع کا سا معاملہ کریں گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مسلمانوں کے لئے جنت کے امیدوار ہیں اور جنت کی دعا کرتے ہیں، لیکن کسی کو قطعی طور پر جنتی نہیں کہہ سکتے جب تک اللہ کے پیغمبر ﷺ نے اسے جنتی نہ کہا ہو"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 29 و 30)

تبصرہ:

یہاں پہلے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ چلیں مان لیا کہ ہم کسی متعین شخص کو قطعی جنتی اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک اللہ تعالیٰ یا اس کے پیغمبر ﷺ نے نہ کہا ہو اور یہ اہل سنت کا شعار ہے۔لیکن کسی کے سر بغیر شرعی شہادت وثبوت کے قطعی فسق وفجور وشراب نوشی جیسے الزامات تھوپ دینا یہ کس کا شعار ہے؟ اور پھر جو لعل شاہ صاحب نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ:

"ہم مسلمانوں کے ساتھ بموافق شرع احکام شرع کا سا معاملہ کریں گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مسلمانوں کے لئے جنت کے امیدوار ہیں اور جنت کی دعا کرتے ہیں"۔

تو کیا یزید کے لئے (جسے لعل شاہ صاحب مسلمان ہی سمجھتے ہیں) مغفرت یا جنت کی دعا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور اسے "جہنمی" کہنے والا اہل سنت سے خارج شمار ہوگا یا نہیں؟ نیز لعل صاحب کے بیان کردہ اہل سنت کے شعار نمبر 6 کے مطابق یزید کے خلاف خروج اور بغاوت ناجائز سمجھی جائے گی یا جائز؟ کیونکہ وہ بھی یزید کو "فاسق" ہی کہتے ہیں، کافر نہیں کہتے، یا اگر اس نے کسی کفر بواح یعنی ظاہر کفر کا ارتکاب کیا تھا تو وہ بتایا جائے۔

الغرض! ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی متعین شخص کو حتمی طور پر جنتی نہیں کہہ سکتے تو کسی کو حتمی طور پر جہنمی اور لعنتی بھی نہیں کہہ سکتے، نہ ہی شریعت کے مقرر کردہ اصول وضوابط پورا کیے بغیر کسی کو فاسق وفاجر اور

زانی وشرابی کہہ سکتے ہیں،شریعت کے قوانین سب کے لئے برابر ہیں۔

دوسری بات یہ کہ لعل شاہ صاحب نے جوکسی کو قطعی جنتی یا جہنمی کہہ سکنے یا نہ کہہ سکنے کی بات کی ہے اس کا تعلق کسی متعین شخص کونام لے کر جنتی یا جہنمی کہنے سے ہے۔لیکن اگر قرآن یا کسی حدیث صحیح میں کسی متعین شخص کا نام لئے بغیر یوں کہا گیا ہوکہ مثلاً جوفلاں عمل کرے گاوہ جنت میں جائے گا،تو یہ بھی جنت کی بشارت ہے۔اب جس کے بارے میں بھی یہ ثابت ہوجائے کہ اس نے وہ جنت میں لیجانے والا کام کیاہے تو اسے جنتی کہنا در اصل اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کی بات کی بنیاد پر ہی شمار ہوگا۔

اسی طرح اگراللہ تعالیٰ یااس کے رسول ﷺ نے عمومی طور پرکسی خاص گروہ یاجماعت کے بارے میں یہ بشارت دی ہوکہ ان کی مغفرت کردی گئی تواس جماعت یا گروہ میں شامل ہر ہر فرد کووہ بشارت شامل ہوگی اورانہیں"مغفور"کہنا اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ یااس کے رسول ﷺ کی بشارت کی بنا پر ہی ہوگا۔

جنت یا مغفرت کی بشارت کبھی"فرد معیّن" کے لئے ہوتی ہے اورکبھی"عدد معیّن" کے لئے ہوتی ہے،دونوں صورتوں میں"معیّن" بشارت ہوتی ہے۔اس لئے جب"عدد معیّن" کے لئے بشارت ہوتواس کے ہرفرد کوجنتی یا مغفور کہا جاسکتاہے،اللہ تعالیٰ نے"اہل بدر" کے لئے جو جنت کی بشارت دی وہ"عدد معین" کی بشارت ہے اورآپ ﷺ نے اس کے ایک فرد حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو بھی اس کا مصداق مانا اورفرمایا:

"إِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا، وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يَكُونَ قَدِ اطَّلَعَ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ"۔(صحيح البخاری)

انہوں نے بدر میں شرکت کی ہے اورتمہیں کیاپتہ کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر کے معاملات یاان کے دلوں پر آگاہ ہوااوراس کے بعد فرمایا: تم کیسا بھی عمل کرو میں نے تمہاری مغفرت کردی ہے۔

معلوم ہوا کہ"عدد معیّن" کے لئے اگر جنت کی بشارت ہوتو اس"عدد" کے کسی بھی"فرد"کو جنتی کہا جاسکتاہے۔

توزیر بحث حدیث میں جس"جیش" کے لئے" قَدْ أَوْجَبُوا "کہا گیا تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے

امیر تھے اور جس لشکر کو" مَغْفُورٌ لَهُمْ" کہا گیا ہے وہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں گیا تھا (یا کم از کم وہ اس لشکر میں شامل تھا)، اور یہ بشارت" عدد معیّن" کے لئے بشارت ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَأَوَّلُ جَيْشٍ غَزَاهَا كَانَ أَمِيرُهُمْ يَزِيدَ، وَالْجَيْشُ عَدَدٌ مُعَيَّنٌ لَا مُطْلَقٌ"۔

جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس کے امیر یزید تھے اور جیش" عدد معیّن ہے نہ کہ مطلق"۔

(منهاج السنة، ج4ص572، السعودية)

حدیث قسطنطنیہ اور لعل شاہ صاحب کی تحقیق جدید

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ:

"حَدَّثَنِي إِسْحَاقُ بْنُ يَزِيدَ الدِّمَشْقِيُّ، حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ، قَالَ: حَدَّثَنِي ثَوْرُ بْنُ يَزِيدَ، عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، أَنَّ عُمَيْرَ بْنَ الأَسْوَدِ العَنْسِيَّ، حَدَّثَهُ أَنَّهُ أَتَى عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ وَهُوَ نَازِلٌ فِي سَاحَةِ حِمْصَ وَهُوَ فِي بِنَاءٍ لَهُ، وَمَعَهُ أُمُّ حَرَامٍ قَالَ: عُمَيْرٌ، فَحَدَّثَتْنَا أُمُّ حَرَامٍ: أَنَّهَا سَمِعَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ البَحْرَ قَدْ أَوْجَبُوا، قَالَتْ أُمُّ حَرَامٍ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنَا فِيهِمْ؟ قَالَ: أَنْتِ فِيهِمْ، ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ، فَقُلْتُ: أَنَا فِيهِمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: لَا"۔

عمیر بن اسود عنسی نے بیان کیا کہ وہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب آپ کا قیام حمص کے ساحل پر اپنے ہی ایک مکان میں تھا اور آپ کے ساتھ (آپ کی زوجہ) حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ عمیر نے بیان کیا کہ ہم سے ام حرام رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ

میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو سمندری سفر کر کے جہاد کے لئے جائے گا، اس نے (اپنے لئے رحمت و مغفرت یا جنت) واجب کر لی ہے۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! میں بھی ان کے ساتھ ہوں گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، تم بھی ان کے ساتھ ہو گی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (یعنی قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا، وہ مغفور ہے (یعنی اس میں شامل تمام لوگ بخشے ہوئے ہوں گے)۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں بھی ان کے ساتھ ہوں گی؟ آپ ﷺ فرمایا کہ: نہیں۔

(صحیح البخاری، باب ما قیل في قتال الروم)

اس روایت کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اپنی اپنی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے مثلاً:

امام ابن ابی عاصم (م 287ھ) نے "الآحاد والمثانی، ج6ص98، دار الرایة" میں اسے یوں روایت کیا ہے "حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ ثنا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ ثنا ثَوْرُ بْنُ يَزِيدَ عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ" (یعنی "حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا" سے روایت کرنے والے راوی کا نام "عُمَير بن الأسود" کے بجائے "عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ" لکھا ہے)۔ یہ بات ذہن میں رہے، آگے "راویوں" کی بحث میں اس کا ذکر آئے گا۔

امام ابن ابی عاصم (م 287ھ) نے ہی "کتاب الجهاد، ج2ص662دار الرایة الریاض" میں اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے "حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ، عَنْ ثَوْرِ بْنِ يَزِيدَ، عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ،أَنَّهُ حَدَّثَهُ أَنَّهُ أَتَى عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ وَهُوَ فِي سَاحِلِ حِمْصَ فِي بِنَاءٍ لَهُ، وَمَعَهُ امْرَأَتُهُ أُمُّ حَرَامٍ، فَحَدَّثَتْنَا أُمُّ حَرَامٍ" لیکن اس روایت میں صرف اتنا ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "إِنَّ أَوَّلَ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُو هَذَا الْبَحْرَ قَدْ أَوْجَبُوا. قَالَتْ أُمُّ حَرَامٍ:يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَأَنَا فِيهِمْ؟ قَالَ:وَأَنْتِ فِيهِمْ" کہ میری امت میں سے سب سے پہلا وہ لشکر جو سمندری جہاد کرے گا انہوں نے (جنت یا مغفرت) واجب کر لی، حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے

پوچھا: اللہ کے رسول! کیا میں ان میں شامل ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: ہاں تم ان میں ہوگی۔ نیز اس سند میں بھی "عُمير بن الأسود" کے بجائے "خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ" ہے۔

امام ابوبکر الآجری (م 360ھ) نے "كتاب الشريعة، ج 5ص2440، دار الوطن الرياض" میں اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے: "حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ قَالَ حَدَّثَنِي ثَوْرُ بْنُ يَزِيدَ عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ" (اس سند میں بھی "عُمير بن الأسود" کے بجائے "عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ" ہے)۔

امام طبرانی (م 360ھ) نے "المعجم الكبير، ج25ص133، مكتبة ابن تيمية القاهرة" اور "مسند الشاميين، ج1ص257، مؤسسة الرسالة بيروت" میں یہ روایت مکمل سند کے ساتھ نقل کی ہے، "المعجم الكبير" کی سند میں "خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ" ہے اور "مسند الشاميين" کی سند میں "خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، عَنْ عُمَيْرِ بْنِ الْأَسْوَدِ الْعَنْسِيِّ" کے الفاظ ہیں۔

امام طبرانی نے ہی "المعجم الاوسط، ج7ص48، دار الحرمين القاهرة" میں اس سند سے روایت کیا ہے "حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ هَارُونَ، نَا سُلَيْمَانُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، ثَنَا أَيُّوبُ بْنُ حَسَّانَ الْجُرَشِيُّ، ثَنَا ثَوْرُ بْنُ يَزِيدَ، عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ الْعَنْسِيِّ، عَنْ أُمِّ حَرَامٍ بِنْتِ مِلْحَانَ" اس روایت میں صرف اتنا ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "رَأَيْتُ أَوَّلَ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَرْكَبُونَ الْبَحْرَ قَدْ أَوْجَبُوا" میں نے اپنی امت میں سے پہلے لشکر کو (خواب میں) دیکھا جو سمندر پر سواری کر رہے ہیں، تحقیق انہوں نے (جنت یا مغفرت) واجب کر لی۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: "فَقُلْتُ يَارَسُولَ اللَّهِ، ادْعُ اللَّهَ أَنْ أَكُونَ مَعَهُمْ، فَقَالَ: اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا فِيهِم" میں نے کہا اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا فرمائیں کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں، پس آپ نے یوں دعا فرمائیں: اے اللہ! اسے بھی ان میں سے کر دے۔

امام حاکم (م 405ھ) نے "المستدرك، ج4، ص599و600، دار الكتب العلمية بيروت" میں یہ حدیث اس سند کے ساتھ روایت کی ہے "أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ الْمُؤَمَّلِ بْنِ الْحَسَنِ، ثَنَا الْفَضْلُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، ثَنَا نُعَيْمُ بْنُ حَمَّادٍ، ثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ، ثَنَا ثَوْرُ بْنُ يَزِيدَ،

عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، حَدَّثَنِي عُمَيْرُ بْنُ الْأَسْوَدِ" ۔امام ذہبی نے"تلخیص المستدرك" میں اس روایت کو"علی شرط البخاري ومسلم"لکھا ہے۔

حافظ ابونعیم اصفہانی (م430ھ) نے"حلية الاولياء وطبقات الاصفياء، ج5ص156، دار الفكر بيروت" اور"معرفة الصحابة، ج6ص3481، دار الوطن للنشر، الرياض) میں اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے "عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ، أَنَّهُ حَدَّثَهُ أَنَّهُ، أَتَى عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ وَهُوَ بِسَاحِلِ حِمْصَ فِي مَالِهِ وَمَعَهُ امْرَأَتُهُ أُمُّ حَرَامٍ بِنْتُ مِلْحَانَ، قَالَ ابْنُ الْأَسْوَدِ :فَحَدَّثَتْنَا أُمُّ حَرَامٍ" ،اس میں بھی"عُمير بن الاسود" کے بجائے"عمرو بن الاسود" ہے۔

امام ابوبکر البیہقی (م458ھ) نے"دلائل النبوة، ج6ص452، دار الكتب العلمية بيروت" میں یہ حدیث روایت کی ہے۔

امام بغوی (م516ھ) نے"شرح السنة، ج13ص312، المكتب الاسلامی دمشق" میں بھی اپنی سند کے ساتھ نقل کی ہے۔

مندرجہ بالا تمام کتب میں یہ روایت مکمل سند کے ساتھ موجود ہے پھر حیرت ہے کہ لعل شاہ صاحب نے نہ جانے کس بنا پر یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ:

"صحیح بخاری کی یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ امام بخاری کے سوا کسی محدث نے روایت نہیں کی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 319)

اور لکھتے ہیں:

"کسی محدث نے اس روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دینے کا حوصلہ نہیں کیا، نہ جانے امام بخاری کے دربار میں یہ کیسے بار پا گئی..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 328)

بہر حال، صحیح بخاری کی اس حدیث میں سب سے پہلے سمندری جہاد کرنے والے اور سب سے پہلے

قیصر کے شہر پر حملہ کرنے والے دونوں لشکروں کے لئے بشارت کا بیان ہے، اگرچہ حدیث میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یا یزید بن معاویہ کا نام مذکور نہیں، لیکن مؤرخین وشارحین حدیث نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سب سے پہلے سمندری جہاد والے لشکر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر سب سے پہلے حملہ کرنے والے لشکر میں یزید بن معاویہ شامل تھے، بلکہ یزید تو اس لشکر کے امیر تھے، چند حوالے ملاحظہ فرمائیں:

شارح بخاری ابن بطّال ابو الحسن علی بن خلف القرطبی رحمۃ اللہ علیہ (م 449ھ) اس حدیث کی تشریح میں امام مہلّب بن احمد بن ابی صفرہ الاسدی الاندلسی رحمۃ اللہ علیہ (م 435ھ) کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

"قال المهلب:من هذا الحديث فضل لمعاوية لأنه أول من غزا الروم وابنه يزيد غزا مدينة قيصر"۔

مہلب نے کہا کہ: اس حدیث سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت نکلتی ہے کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے روم پر (سمندری) حملہ کیا تھا، اور ان کے بیٹے یزید نے قیصر کے شہر پر (پہلا) حملہ کیا تھا۔

(شرح صحيح البخاري لابن بطال، ج5ص107، مكتبة الرشد،الرياض)

ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ نے مہلب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر کوئی تبصرہ یا ردّ نہیں کیا۔

شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (م 852ھ) نے بھی اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے امام مہلب کا قول یوں نقل کیا ہے کہ:

"قَالَ الْمُهَلَّبُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ مَنْقَبَةٌ لِمُعَاوِيَةَ لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ غَزَا الْبَحْرَ وَمَنْقَبَةٌ لِوَلَدِهِ يَزِيدَ لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ غَزَا مَدِينَةَ قَيْصَرَ" ۔

مہلب نے کہا ہے کہ اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے، کیوں کہ سب سے پہلے انہوں نے سمندری لڑائی لڑی، اور ان کے بیٹے یزید کے لئے بھی منقبت ہے، کیوں کہ یزید ہی نے سب سے پہلے مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا۔

(فتح الباری، ج6ص102، المكتبة السلفية)

اگرچہ حافظ ابن حجر نے امام مہلب کے اس قول کے جواب میں ابن التین اور ابن المنیر کے

حوالے سے یہ بات ذکر کی ہے کہ حدیث میں مذکور عمومی بشارت میں یزید کے شامل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی خاص دلیل کی وجہ سے اس سے خارج نہیں ہوسکتا، کیونکہ اہل علم میں سے کسی کا اس بات میں اختلاف نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا "مغفور لهم" فرمانا (یعنی مغفرت کی بشارت دینا) اس بات سے مشروط ہے کہ اس لشکر میں شامل لوگ مغفرت کے اہل ہوں، مثلاً اگر اس لشکر میں شامل لوگوں میں سے کوئی بعد میں مرتد ہوگیا تو وہ بالاتفاق اس عمومی بشارت میں داخل نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ مغفرت کی بشارت ان کے لئے ہے جنہوں نے مغفرت کی شرطیں پوری کی ہوں گی۔

مگر ہم عرض کرتے ہیں کہ ابن التین اور ابن المنیر کی یہ تاویل بے دلیل اور محض تحکم ہے، کیونکہ ان کی یہ تاویل اسی حدیث پر منحصر نہیں، بلکہ قرآن وسنت کی جتنی نصوص میں بھی کسی کے لئے مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے تو وہاں یہ تاویل کی جاسکتی ہے۔ دوسرا کس دلیل قطعی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یزید مغفرت کا اہل نہیں تھا؟ کیا نعوذ باللہ وہ اس غزوہ کے بعد مرتد ہوگیا تھا؟ یا اس کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا تھا؟

لیکن جہاں تک قسطنطنیہ شہر پر سب سے پہلے حملہ کرنے والے لشکر کا تعلق ہے تو ابن المنیر اور ابن التین سمیت کسی نے بھی مہلب کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا بلکہ حافظ ابن حجر نے صریح طور پر یہیں آگے لکھا ہے:

"فَإِنَّهُ كَانَ أَمِيرَ ذَلِكَ الْجَيْشِ بِالِاتِّفَاقِ"۔

(یزید) اس (پہلے) لشکر کا امیر تھا، اس پر سب کا اتفاق ہے۔

(فتح الباری، ج6ص103، المكتبة السلفية)

نوٹ: امام مہلب رحمہ اللہ نے بھی صحیح بخاری کی شرح لکھی تھی (سیر اعلام النبلاء، ج17ص579، مؤسسة الرسالة) اور حافظ ابن حجر "فتح الباری" میں ان کے اقوال بہت زیادہ ذکر کرتے ہیں۔

تنبیہ

لعل شاہ صاحب نے امام مہلب کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"سب سے پہلے جس شخص نے حدیث قسطنطنیہ سے منقبت یزید کا استخراج کیا وہ محدث المہلب ہے، محدثین نے اس استدلال اور استخراج کو مردود قرار دیا..."۔

پھر اس پر علامہ قسطلانی (م 923ھ) کا تبصرہ نقل کرتے ہیں کہ :

"هذا جاء على طريق الحمية لبني امية" کہ یہ استدلال بنی امیہ کی بیجا حمیت کا آئینہ دار ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 349)

اس کے بعد لکھا ہے:

محدثین نے المہلب کو ملامت کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب شاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی نے تحریر کیا (ہم صرف لعل شاہ صاحب کا اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ناقل):

"مغفور لہم قول سے بعض لوگوں نے یزید کی نجات پر دلیل حاصل کی کیونکہ من جملہ اس جیش کے تھا بلکہ وہ ان کا رأس اور پیش رو تھا جیسے کہ تواریخ گواہی دیتی ہیں۔اور صحیح یہ ہے کہ اس روایت سے نہیں ثابت ہوتا مگر یہ کہ اس کے پہلے گناہ معاف ہو جائیں جو اس غزوہ سے پہلے کئے ہیں کیونکہ جہاد کفارات سے ہے اور کفارہ کی شان یہ ہے کہ پہلے گناہوں کے آثار کو مٹاتا ہے۔ہاں اگر مغفور لہم کے ساتھ الیٰ یوم القیامۃ کا اضافہ ہوتا تو یزید کی نجات پر دلالت کرتا اور جب ایسا نہیں ہے تو نجات بھی دلیل نہیں بلکہ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے ان قبائح کے ارتکاب میں جو اس نے اس جنگ کے بعد کئے، قتل حسین (رضی اللہ عنہ) اور مدینہ طیبہ کی بربادی اور شرب خمر پر اصرار، اگر اللہ چاہے تو معاف کردے اور چاہے تو عذاب دے جیسا کہ تمام عاصیوں کے بارہ میں ضابطہ ہے۔علاوہ ازیں وہ حدیثیں جو اس شخص کی شان میں وارد ہوئی ہیں جس نے عترۃ طاہرہ کا استخفاف کیا اور حرم میں الحاد کیا اور سنت کو تبدیل کیا وہ روایتیں اس عموم کے لئے مخصص ہیں اگر بالفرض اسے اول جیش میں شامل مانا جائے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 349 تا 351)

اور پھر نتیجہ یوں نکالتے ہیں کہ:

"بے راہ روی کے نتائج۔غور کیا آپ نے کہ محدثین کرام نے کس طرح مہلب کی تردید کی اور کس طرح یزید کے بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی توضیح فرمائی، مگر مہلب اور اس کے متبعین نے اپنی

کجروی کی بنا پر خواہ مخواہ روایت کو کھینچ تان کر یزید پر راست کرنے کی کوشش کی.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 351)

تبصرہ:

اس پر ہم عرض کرتے ہیں کہ امام مہلب چوتھی/ پانچویں صدی ہجری کے ہیں (ان کی وفات 435ھ کی ہے) اب ان کی تردید نویں ہجری کے علامہ قسطلانی سے نقل کی جارہی ہے اور وہ تردید بھی بلا دلیل اور اور تحکمانہ ہے کہ مہلب کا استدلال بنی امیہ کی بیجا حمیت کی وجہ سے ہے، اس کے جواب میں اگر کوئی کہے کہ علامہ قسطلانی کی یہ بات بنی امیہ کے بارے میں ان کے بیجا تعصب اور دشمنی کی آئینہ دار ہے تو اس کا کیا جواب ہوگا؟ جب علامہ قسطلانی خود بھی صحیح بخاری کی اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلے حملہ کرنے والے لشکر کا امیر یزید ہی تھا (حوالہ آگے آرہا ہے) تو اگر محدث مہلب نے اس سے استدلال کرلیا تو کون سی قیامت آگئی؟ کیا کوئی ایسی حدیث بھی ہے جس میں ہو کہ" اس پہلے لشکر میں شامل تمام لوگوں کی مغفرت کردی گئی سوائے یزید کے"؟ یا حدیث میں ایسی کوئی شرط یا قید ہے کہ اس لشکر والوں کے اس غزوہ سے پہلے کے گناہ تو بخش دیے گئے، بعد والے نہیں؟ یہ قیود و شروط بھی تو شارحین کی اپنی ذاتی آراء ہی ہیں، حدیث کے الفاظ تو عام ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہم محدث مہلب کے استنباط و دلیل کو تو ضرور غلط اور" کجروی" کہیں اور علامہ قسطلانی و دیگر بعد والوں کی رائے کو قطعی طور پر درست کہیں؟ آگے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب" جامع المسانيد والسنن" کا حوالہ آرہا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

"حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ وہ یزید بن معاویہ کے ساتھ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، اور یہ پہلا لشکر تھا جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا، اور اس لشکر والوں کے لئے جنت اور مغفرت کی بشارت دی گئی"۔

(جامع المسانيد والسُّنَن الهادي لأقوم سَنَن، ج9ص39، دار خضر بيروت)

تو کیا حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی" کج روی" کا طعنہ دیا جائے گا؟

جہاں تک شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کا تعلق ہے جو لعل شاہ صاحب نے نقل کی ہے، تو شاہ صاحب نے پہلے تو یہ بات تسلیم کی ہے کہ جس لشکر کو" مغفور لهم" کہا گیا ہے یزید اسی لشکر کا حصہ تھا بلکہ اس کا پیش

رو تھا، پھر انہوں نے محدث مہلب کی بات کی بالکلیہ نفی نہیں کی بلکہ صرف عموم کی نفی کر کے یزید کی مغفرت کا معاملہ اللہ کی مشیت پر چھوڑ دیا۔ یہ ان کی رائے ہے اور وہ جو چاہے رائے رکھ سکتے ہیں، لیکن حدیث میں اگر "مغفور لهم" کے ساتھ "الی یوم القیامة" کا اضافہ نہیں تو ایسا کوئی لفظ بھی نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ" صرف اس غزوہ سے پہلے والے گناہوں کی مغفرت کر دی گئی"۔

اور شاہ صاحب نے جو یزید پر قتل حسین (رضی اللہ عنہ)، مدینہ کی بربادی، سنت کی تبدیلی اور شرب خمر پر اصرار کے الزامات عائد کیے ہیں، اس کی انہوں نے ضابطہ کے مطابق کوئی دلیل نہیں پیش کی، لہٰذا یہ بھی شاہ صاحب کی اپنی رائے ہی ہے جب تک ان باتوں کو اصول وضوابط شرعیہ اور قانون شہادت کے مطابق ثابت نہ کیا جائے تب تک یہ الزامات ہی رہیں گے۔ نیز اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہوں تو کیا اللہ تعالیٰ ان اعمال کی مغفرت نہیں کر سکتے؟

اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب محدث مہلب کی تردید میں تو ان کے کئی سو سال بعد پیدا ہونے والے علامہ قسطلانی و شاہ ولی اللہ کے اقوال پیش کر رہے ہیں لیکن خود وہ تمام محدثین و مؤرخین و شارحین کے برعکس صحیح بخاری کی اس حدیث کو راوی کی خود ساختہ ہونے کے مدعی ہیں، بالفاظ دیگر وہ امام بخاری سمیت ان تمام شارحین ومؤرخین کی تحقیق کو غلط بتا رہے ہیں جنہوں نے صحیح بخاری کی اس حدیث کو صحیح مانا ہے۔ نیز وہ تمام محدثین، شارحین اور مؤرخین کے برعکس یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ کرنے والے لشکر میں یزید شامل نہ تھا (تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

الغرض! بتانا یہ مقصود ہے کہ جسے محدث مہلب کی بات سے اختلاف ہے وہ اختلاف کرے، بہت سی باتوں میں شارحین ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، لیکن اختلاف دلیل کے ساتھ کیا جائے، ایسے نہیں کہ "مہلب نے بنی امیہ کی حمیت میں یہ بات کہی ہے" جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے ظاہری الفاظ مہلب کی بات کی ہی تائید کرتے ہیں، اور یزید کو اس بشارت سے نکالنے کے لئے جو تاویلات کی جاتی ہیں ان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کو محدود کر دیا جائے کہ وہ سب کو بخش سکتا ہے لیکن یزید کی مغفرت نہیں کر سکتا، کیا یزید کافر تھا کہ اس کی بخشش نہیں ہو سکتی؟۔ اور پھر ایسا بھی نہیں کہ یزید کی معیت میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا سارا لشکر بنو امیہ پر مشتمل تھا بلکہ خود علامہ قسطلانی نے بھی لکھا ہے کہ اس میں متعدد کبار صحابہ شریک تھے (حوالہ

آگے آرہا ہے) تو پھر یہاں" بنی امیہ کی حمیت" کا طعنہ دینا ہماری سمجھ سے بالا تر ہے۔اب آگے چلتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"وَقَدْ كَانَ يَزِيدُ أَوَّلُ مَنْ غَزَا مَدِينَةَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ ...."۔

یزید سب سے پہلا وہ شخص تھا جس نے قسطنطنیہ شہر پر حملہ کیا۔

(البداية والنهاية، ج8ص323، وزارة الاوقاف قطر)

اوراس سے پہلے سنہ 49ھ کے واقعات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فِيهَا غَزَا يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ بِلَادَ الرُّومِ حَتَّى بَلَغَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَمَعَهُ جَمَاعَةٌ مِنْ سَادَاتِ الصَّحَابَةِ، مِنْهُمُ ابْنُ عُمَرَ، وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَابْنُ الزُّبَيْرِ، وَأَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ۔ وَقَدْ ثَبَتَ فِي صَحِيحِ الْبُخَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَوَّلُ جَيْشٍ يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ، فَكَانَ هَذَا الْجَيْشُ أَوَّلَ مَنْ غَزَاهَا"۔

اسی سال یزید نے بلاد روم پر حملہ کیا یہاں تک کہ وہ قسطنطنیہ تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ معزز صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی جن میں ابن عمر، ابن عباس، ابن الزبیر اور ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) بھی تھے۔اور صحیح بخاری میں یہ حدیث ثابت شدہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلا وہ لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا ان کی مغفرت کر دی گئی، پس یہی (یعنی یزید کی سربراہی والا) وہ پہلا لشکر تھا۔

(البداية والنهاية، ج8ص31، وزارة الاوقاف قطر)

غور فرمائیں! حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ یزید کی امارت میں ہونے والے غزوہ قسطنطنیہ کا ذکر کر کے ساتھ ہی صحیح بخاری کی اس حدیث کو بیان کر رہے ہیں جس میں مغفرت کی بشارت ہے، اگر یہ لشکر مغفرت کا اہل نہیں تھا تو انہوں نے یہاں یہ حدیث کیوں ذکر کی؟

یہی حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسری کتاب میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"كانت وفاته وهو محاصر القسطنطينية مع يزيد بن معاوية وهو أول جيش غزاها، وهم مبشرون بالجنة والمغفرة، وأمر بدفنه إلى جانب السور، وأن يخفوا أثره..."۔

(حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ) کی وفات اس وقت ہوئی جب وہ یزید بن معاویہ کی معیت میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، اور وہی پہلا لشکر تھا جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا، اور اس لشکر والوں کے لئے جنت اور مغفرت کی بشارت دی گئی، اور (یزید نے) حکم دیا کہ آپ کو (شہر) کی فصیل کے پاس لے جا کر دفن کیا جائے اور اور قبر کی جگہ خفیہ رکھی جائے۔

(جامع المسانيد والسُّنَن الهادي لأقوم سَنَن، ج9ص39، دار خضر بيروت)

ملاحظہ فرمائیں! یہاں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کرنے والے لشکر کے بارے میں صریح طور پر لکھ رہے ہیں کہ" وهم مبشرون بالجنة والمغفرة " انہیں جنت اور مغفرت کی بشارت دی گئی، اور یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ یہ وہی لشکر تھا جو یزید کی معیت میں تھا۔

شارح بخاری امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی لکھتے ہیں:

"وكان أول من غزا مدينة قيصر يزيد بن معاوية ومعه جماعة من سادات الصحابة كابن عمرو بن عباس وابن الزبير وأبي أيوب الأنصاري، وتوفي بها سنة اثنتين وخمسين من الهجرة"۔

اور سب سے پہلے قیصر کے شہر (یعنی قسطنطنیہ) پر یزید بن معاویہ نے حملہ کیا اور اس کے ساتھ اس وقت معزز صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی جیسے ابن عمر، ابن عباس، ابن الزبیر اور ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہم)، اور (حضرت ابوایوب انصاری) کی وفات وہیں سنہ 52ھ میں ہوئی۔

(ارشاد السارى، ج5ص104، المطبعة الاميرية، بولاق مصر)

پھر یہیں امام قسطلانی نے لکھا ہے کہ:

"واستدلّ به المهلب على ثبوت خلافة يزيد وأنه من أهل الجنة لدخوله في عموم قوله مغفور لهم"۔

(شارح بخاری) امام مہلب (بن احمد بن ابی صفرہ الاسدی) نے اس حدیث سے یزید کی خلافت کے ثابت ہونے اور اس کے جنتی ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ وہ "مغفور لهم" کی عام بشارت میں داخل ہے۔

(ارشاد الساری، ج5ص104،المطبعة الامیریة، بولاق مصر)

غور فرمائیں! علامہ قسطلانی نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ مدینہ قیصر پر سب سے پہلے حملہ کرنے والا لشکر وہی تھا جو یزید کی سرکردگی میں تھا اور اس کے ساتھ متعدد صحابہ کرام بھی تھے، انہوں نے نہ اس کا انکار کیا اور نہ ہی بخاری کی حدیث کو "خود ساختہ" کہا۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں :

"وَأَوَّلُ جَيْشٍ غَزَاهَا كَانَ أَمِيرَهُمْ يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ وَكَانَ مَعَهُ أَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ"۔

سب سے پہلا وہ لشکر جس نے اس (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا تھا اس کے امیر یزید بن معاویہ تھے اور ان کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

(مجموع الفتاویٰ،ج3ص413،السعودیة)

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"وَأَوَّلُ جَيْشٍ غَزَاهَا كَانَ أَمِيرَهُمْ يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ وَكَانَ مَعَهُ فِي الْغُزَاةِ أَبُو أَيُّوبِ الْأَنْصَارِيُّ وَتُوُفِّيَ هُنَاكَ وَقَبْرُهُ هُنَاكَ إِلَى الْآنِ"۔

سب سے پہلا وہ لشکر جس نے (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا اس کے امیر یزید بن معاویہ تھے اور اس کے ساتھ حملہ کرنے والوں میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے، اور ان کی وفات وہیں ہوگئی اور آج تک ان کی قبر وہاں موجود ہے۔

(مجموع الفتاویٰ،ج4ص475،السعودیة)

ایک اور جگہ یہی بات دہراتے ہیں:

"وَأَوَّلُ جَيْشٍ غَزَاهَا كَانَ أَمِيرَهُ يَزِيدُ"۔

سب سے پہلا لشکر جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس کے امیر یزید بن معاویہ تھے۔

(مجموع الفتاویٰ، ج4ص486، السعودیۃ)

ایک مقام پر یہ تفصیل بیان کرتے ہیں کہ:

"كَانَ الْمُسْلِمُونَ قَدْ غَزَوْا القسطنطينية غَزْوَتَيْنِ: الْأُولَى فِي خِلَافَةِ مُعَاوِيَةَ أَمَرَ فِيهَا ابْنَهُ يَزِيدَ وَغَزَا مَعَهُ أَبُو أَيُّوبٍ الْأَنْصَارِيُّ الَّذِي نَزَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي دَارِهِ لَمَّا قَدِمَ مُهَاجِرًا إِلَى الْمَدِينَةِ وَمَاتَ أَبُو أَيُّوب فِي تِلْكَ الْغَزْوَةِ وَدُفِنَ إِلَى جَانِبِ القسطنطينية ......وَالْغَزْوَةُ الثَّانِيَةُ فِي خِلَافَةِ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ مَرْوَانَ"۔

مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر دو بار حملہ کیا، پہلا حملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ہوا جب انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو حکم دے کر بھیجا اور اس غزوہ میں یزید کے ساتھ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، وہی ابو ایوب رضی اللہ عنہ کہ جن کے گھر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت قیام فرمایا تھا جب آپ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تھے، چنانچہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی وفات اسی غزوے میں ہوگئی اور آپ کی تدفین قسطنطنیہ کے پاس ہی کر دی گئی ..... اور (قسطنطنیہ پر) دوسرا حملہ خلیفہ عبد الملک بن مروان کی خلافت کے زمانے میں ہوا۔

(ملخصاً: مجموع الفتاویٰ، ج18ص352، السعودیۃ)

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

"وَلِهَذَا كَانَ الصَّحَابَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ يَغْزُونَ مَعَ يَزِيدَ وَغَيْرِهِ، فَإِنَّهُ غَزَا الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ فِي حَيَاةِ أَبِيهِ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَكَانَ مَعَهُمْ فِي الْجَيْشِ أَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَذَلِكَ الْجَيْشُ أَوَّلُ جَيْشٍ غَزَا الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یزید وغیرہ کے ساتھ (یعنی ان کی سرکردگی میں) جہاد کے لئے نکلا کرتے تھے، چنانچہ جب اس نے اپنے والد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو اس

کے ساتھ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے،اور یہی وہ پہلا لشکر تھا جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔

(منهاج السنة، ج4ص544، السعودية)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سنہ 50 ھ کے واقعات میں غزوہ قسطنطنیہ کاذکر یوں کیا ہے :

"وَفِيهَا غَزْوَةُ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ، كَانَ أَمِيرَ الْجَيْشِ إِلَيْهَا يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ، وَكَانَ مَعَهُ وُجُوهُ النَّاسِ، وَمِمَّنْ كَانَ مَعَهُ أَبُو أَيُّوبُ الأَنْصَارِيُّ رضی اللہ عنہ "۔

اوراس سال غزوہ قسطنطنیہ ہوا،اورامیر لشکر یزید بن معاویہ تھے،اوران کے ساتھ ممتاز ومعروف لوگ تھے،انہی میں سے ایک سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

(تاريخ الاسلام ، ج2ص391، دار الغرب الاسلامي بيروت)

واضح رہے کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے کسی سال کے واقعات میں قسطنطنیہ پر کسی حملے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسرے مقام پر" یزید" کاذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لَهُ عَلَى هَنَاتِهِ حَسَنَةٌ، وَهِيَ غَزْوُ القُسْطَنْطِيْنِيَّةِ، وَكَانَ أَمِيْرَ ذَلِكَ الجَيْشِ، وَفِيْهِم مِثْلُ أَبِي أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ"۔

یزید کی کوتاہیوں کے باوجود اس کی ایک نیکی بھی ہے اور وہ قسطنطنیہ پر حملہ ہے،یزید اس لشکر کا امیر تھا اوراس لشکر میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ جیسے لوگ شامل تھے۔

(سير اعلام النبلاء، ج4ص36، مؤسسة الرسالة بيروت)

غور فرمائیں! امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ حالانکہ یزید کو مطعون ومعتوب سمجھتے ہیں مگر اس کے باوجود غزوہ قسطنطنیہ والے لشکر کا امیر ہونا یزید کی نیکی بتارہے ہیں،یقیناًوہ اسی صحیح بخاری کی حدیث کی بنا پر ہی ایسا فرمارہے ہیں اور یہ تسلیم کر کے فرمارہے ہیں کہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا سب سے پہلا لشکر وہی تھا جو یزید کی امارت میں گیا تھا۔

یہ تو ہو گئے قدیم شارحین ومؤرخین، اب چند حوالے بعد والوں کے بھی ملاحظہ فرمالیں:

بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (م 1297ھ) نے بھی اپنے ایک مکتوب میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ حضرت اُم حرام رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکورہ بشارت یزید اوراس کے ساتھیوں کے ذریعے ظہور میں آئی، لکھتے ہیں:

"دوسرے خواب کا مصداق یہی یزید اوراس کے ساتھی ظہور میں آئے چنانچہ تاریخ جاننے والوں اور حدیث پڑھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہے...."۔

(قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار العلوم ص ۱۷۴، ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (م 1403ھ) نے بھی اگرچہ محمود احمد عباسی کا جواب دیتے ہوئے اس حدیث میں تاویلات کی ہیں اوراس میں قیود و شرائط لگائی ہیں لیکن اصولی طور پر انہوں نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ:

"ہمیں نہ حدیث سے انکار ہے اور نہ اس سے کہ یزید اس کے عموم میں داخل ہے، اگر وہ اس غزوہ میں شامل تھا.."۔

(شہید کربلا اور یزید، صفحہ 169، ادارہ اسلامیات لاہور)

نیز لکھا کہ:

"یہ حدیث عام ہے اور بلا شبہ اس کا وعدہ مغفرت بھی جہاد قسطنطنیہ کے ہر شریک کے لئے عام ہے جن میں یزید بھی داخل ہے..."۔

(شہید کربلا اور یزید، صفحہ 170)

امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر نوّر اللہ مرقدہ (م 1430ھ) نے بھی ایک استفسار کے جواب میں کہ "کیا یزید کا اوّل جیش میں شامل ہونا جناب کے ہاں محقق ہے؟"، لکھا:

"یزید اس لشکر میں شریک تھا بلکہ قائد تھا، جب کہ بخاری کی روایت میں تصریح موجود ہے"۔(۲۶ ذوالقعدہ ۱۴۱۷ ہجری/ ۲۵ مارچ ۱۹۹۷ء)

نوٹ : شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی تحریر مع دستخط کا عکس ہمارے پاس محفوظ ہے، اور یہ بات متعدد مجلات میں شائع بھی ہو چکی ہے۔

محقق اہل سنت حضرت مولانا محمد نافع صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م 1436ھ) نے بھی قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کرنے والے لشکر کا امیر "یزید بن معاویہ" کو ہی بتایا ہے، لکھتے ہیں:

"غزوہ قسطنطنیہ ایک مشہور غزوہ ہے اور یہ سنہ 51 ہجری میں پیش آیا تھا اور بقول بعض 49 ہجری میں اس کا وقوع ہوا تھا، اور اس میں بڑے بڑے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی ہے......"۔

آگے لکھتے ہیں:

"......اس غزوہ کا امیر جیش یزید بن معاویہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس غزوہ میں بڑی کامیابی عطا فرمائی اور اہل اسلام کو رومیوں کے مقابلے میں عظیم فتح نصیب فرمائی، اور مسلمان غالب آگئے، اور غزوہ ہذا میں شریک ہونے والوں کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے (مغفور لهم) کی بشارت پہلے ہی دی جا چکی تھی، اس بناء پر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس غزوہ میں شرکت کو سعادت سمجھتے ہوئے شمولیت اختیار کی......"۔

پھر "مختصر تاریخ ابن عساکر" اور "البدایہ والنہایہ" کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ:

"...... 51 ہجری میں جب غزوہ قسطنطنیہ پیش آیا تو اس اسلامی لشکر کا امیر یزید بن معاویہ تھا، اور اس غزوہ میں (بمع دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ بھی شریک و شامل ہوئے تھے"۔

(ملخصاً: فوائد نافعہ، ج2 ص210 و211)

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے بھی قسطنطنیہ پر لشکر کشی کرنے والا لشکر وہی بتایا ہے جو یزید بن معاویہ کی قیادت میں گیا تھا، چنانچہ اپنے بیس ملکوں کے سفرنامہ "جہانِ دیدہ" میں لکھتے ہیں:

قسطنطنیہ پر حملے:

"جب سے رومی بادشاہ قسطنطین نے تیسری صدی عیسوی میں عیسائی مذہب قبول کر کے اس شہر کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا، اُس وقت سے اس کا نام "قسطنطنیہ" ہو گیا تھا، اور یہ بیک وقت بازنطینی

سلطنت اور عیسائی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا، اور اس کی یہی اہمیت تھی جس کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے اس شہر پر جہاد کرنے والے لشکر کو مغفرت کی بشارت دی تھی"۔

(اس کے بعد مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے حضرت اُم حرام رضی اللہ عنہا سے مروی یہی صحیح بخاری کی حدیث نقل فرمائی ہے اور پھر لکھا ہے) :

"آنحضرت ﷺ کی یہ دونوں بشارتیں اس طرح پُوری ہوئیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبرص پر حملہ کیا، یہ تاریخ اسلام میں پہلی بحری مہم تھی، اور اس میں حضرت اُمّ حرام رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے ساتھ لشکر میں شامل ہوئیں۔ یہ جنگی مہم اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اہل قبرص نے مسلمانوں سے صلح کرلی، اور جب واپس ہونے لگے تو حضرت اُمّ حرام رضی اللہ عنہا ایک گھوڑے پر سوار ہونا چاہتی تھیں کہ اچانک گھوڑا بدک گیا، اور اس نے آپ کو زمین پر گرا دیا، آپ اس زخم سے جان بر نہیں ہوسکیں، اور وہیں پر جامِ شہادت نوش کیا، اس کے بعد جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کیا۔ اس حملے میں بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل تھے جن میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی داخل ہیں۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے قسطنطنیہ کا پہلا محاصرہ تھا جو کافی مدت جاری رہا اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اسی محاصرے کے دوران بیمار ہوکر وفات پاگئے اور قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے مدفون ہوئے جس کا واقعہ ان شاء اللہ آگے ذکر کروں گا"۔

(جہانِ دیدہ، ص319 و 320، ادارۃ المعارف کراچی)

پھر آگے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں جو پہلا لشکر قسطنطنیہ پر حملے کے لئے روانہ کیا اس میں آپ بھی شامل تھے جس کا تذکرہ شروع میں کرچکا ہوں۔ محاصرہ طویل ہوا تو آپ بیمار ہوگئے، یزید آپ کی بیمار پرسی کے لئے حاضر ہوئے، اور آپ سے پوچھا کہ کوئی

خدمت بتائیے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: بس میری ایک خواہش ہے، اور وہ یہ کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش کو گھوڑے پر رکھ کر دشمن کی سرزمین میں جتنی دور تک لے جانا ممکن ہو، لے جانا، اور وہاں لے جا کر دفن کرنا۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی تو یزید نے آپ کی وصیت پر عمل کیا، اور قسطنطنیہ کی دیوار کے قریب آپ کو دفن کیا گیا"۔

(ایضاً ص355و356)

تنبیہ

یزید کی سرکردگی میں ہونے والا غزوۂ قسطنطنیہ کس سال ہوا؟ اس بارے میں کتب تاریخ میں سنہ 49ھ، 50ھ، 51ھ اور 52ھ کے اقوال ملتے ہیں، لیکن اس بات میں تقریباً تمام قدیم و جدید شارحین و مؤرخین وعلماء کا اتفاق ہے کہ "قسطنطنیہ" شہر پر سب سے پہلا حملہ وہی تھا جو یزید کی امارت میں تھا۔ البتہ بعض علماء نے حدیث کے الفاظ "مغفور لھم" پر کلام کیا ہے اور یزید کو اللہ کی مغفرت سے محروم ثابت کرنے کے لئے دُوراز کار تاویلات کی ہیں جن کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن یہ بات ابھی ہمارے زیر بحث نہیں۔

صحیح بخاری کی حدیث کے بارے میں لعل شاہ صاحب کا موقف

آپ نے دیکھا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں سب سے پہلے سمندری غزوہ پر جانے والے اور سب سے پہلے قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرنے والے دونوں لشکروں کے لئے بشارت مذکور ہے، اگرچہ اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یا ان کے بیٹے یزید کا نام مذکور نہیں کیونکہ یہ بشارتیں صرف ان لشکروں کے سپہ سالاروں کے لئے نہیں تھیں بلکہ ان میں شامل تمام افراد کے لئے تھیں۔ اور تقریباً تمام قدیم شارحین ومؤرخین کا اتفاق ہے کہ سب سے پہلا سمندری غزوہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ہوا، اسی طرح قسطنطنیہ شہر پر سب سے پہلا حملہ ان کے بیٹے یزید کی امارت میں ہوا۔ حتیٰ کہ وہ حضرات جو کسی نہ کسی طرح یزید کو اس بشارت سے خارج کرنا چاہتے ہیں انہوں نے بھی مختلف تاویلات تو کی ہیں مگر ان میں سے بھی کسی نے اس بات

سے انکار نہیں کیا کہ قسطنطنیہ شہر پر سب سے پہلا حملہ یزید کی سر کردگی میں ہوا تھا۔

لیکن لعل شاہ صاحب بخاری نے یہاں بھی تمام شارحین و مؤرخین سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی نرالی تحقیق پیش کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"...اس روایت میں یزید ابن معاویہ کا نام نہیں ہے، پس اس روایت سے یزید کے جنتی ہونے پر استدلال اس طریقہ پر کیا گیا ہے کہ یزید اول جیش کا فرد تھا بلکہ سالار تھا اور حدیث سے ثابت ہے کہ اول جیش مغفور ہے پس ثابت ہوا کہ یزید جنتی ہے۔ گویا دلیل دو مقدموں سے مرکب ہے، منطقی اصطلاح میں صغریٰ یہ ہے کہ یزید اول جیش میں داخل ہے اور کبریٰ یہ ہے کہ اول جیش مغفور ہے۔ پہلا مقدمہ تاریخ سے ثابت ہے اور دوسرا مقدمہ حدیث بخاری سے ثابت ہے۔ پس نتیجہ واضح ہے کہ یزید جنتی ہے۔ مجھے دلیل کے دونوں مقدمے تسلیم نہیں۔ ہر دو مقدموں پر میری جرح ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 319)

پھر لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کی اس حدیث کے متعلق یوں فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ:

"صحیح بخاری کی یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ امام بخاری کے سوا کسی محدث نے روایت نہیں کی تفرد به البخاري دون الكتب الستة (فتح الباری، ص 223 ج 6) فلہٰذا اس روایت پر محدثانہ انتقاد اور محققانہ کلام کی گنجائش ہے۔ <u>میرا دعویٰ ہے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ راوی کی خود ساختہ ہے۔ آنحضور ﷺ نے</u> اول جیش۔ اوجبوا۔ مدینة قیصر۔ مغفور لهم <u>کے الفاظ نہیں فرمائے</u>"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 319 و 320)

<u>تبصرہ:</u>

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کو جنت میں جانے سے روکنے کے لئے کس طرح لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کی اس روایت کو ہی "خود ساختہ" (موضوع) قرار دے

دیا۔آج تک کسی مفسر، محدث، مؤرخ اور شارح کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ صحیح بخاری کی حدیث کو"خود ساختہ" لکھے، جن شارحین کو یہ منظور نہیں کہ اللہ تعالیٰ یزید کی مغفرت فرمائے، انہوں نے بھی یزید کو اس بشارت سے خارج کرنے کے لئے مختلف تاویلات تو کیں لیکن کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث کو ہی "موضوع و خود ساختہ" قرار دے دیا جائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے خود اپنی کتاب کے مقدمہ میں کتب احادیث کا تعارف کرواتے ہوئے زیر عنوان "صحیحین کا مقام" لکھا ہے:

" بخاری و مسلم صحت، شہرت و مقبولیت میں جملہ کتب سے فائق ہیں وهما اصح الكتب بعد القرآن (تقریب النواوی، ص41)۔ پھر بخاری کا پایہ مسلم سے بھی بلند ہے چنانچہ کہا جاتا ہے اصح الكتب بعد كتاب الله البخاري (مقدمہ فیض الباری، ص30) مولانا بدر عالم صاحب نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ صحیحین کی روایات للقطع ہیں یا نہیں اور پھر ایک طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں وبعد اللَّتَيَّا والتي ان اخبار الصحيحين لا تخلو عن افادة القطع الا في موضع يمنع عنه مانع۔ترجمہ: چھوٹی بڑی بات کے بعد خلاصہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایات مفید للقطع سے خالی نہیں ہیں مگر بعض مقامات پر جہاں کوئی خاص مانع موجود ہو۔(مقدمہ فیض الباری، ص46)۔مولانا لکھتے ہیں کہ بعض ناسمجھ اپنی لاعلمی کی بنا پر احادیث بخاری پر استہزاء کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی اس روش سے دین کی اساس منہدم ہو رہی ہے کیونکہ صحیحین کی احادیث پر اعتبار نہیں کریں گے تو دین کہاں سے حاصل کریں گے۔اللہ تعالیٰ اس کجروی سے محفوظ رکھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 39و40)

ہم اس پر مزید عرض کرتے ہیں کہ امامین ہمامین بخاریؒ و مسلمؒ نے اپنی اپنی صحیح میں جن راویوں سے اصول میں احتجاج کیا ہے ان سب کے ثقہ، معتمد اور قابل قبول ہونے پر جمہور ائمہ کا اتفاق ہے، ہاں جو روایات انہوں نے بطور متابعات وشواہد ذکر کی ہیں ان کے راویوں میں کہیں کلام کی گنجائش مل سکتی ہے، چنانچہ امام ابن الصلاحؒ لکھتے ہیں :

"أَوَّلُ مَنْ صَنَّفَ الصَّحِيحَ الْبُخَارِيُّ أَبُو عَبْدِ اللهِ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْجُعْفِيُّ مَوْلَاهُمْ، وَتَلَاهُ أَبُو الْحُسَيْنِ مُسْلِمُ بْنُ الْحَجَّاجِ......وَكِتَابَاهُمَا أَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ اللهِ الْعَزِيزِ......ثُمَّ إِنَّ كِتَابَ الْبُخَارِيِّ أَصَحُّ الْكِتَابَيْنِ صَحِيحًا، وَأَكْثَرُهُمَا فَوَائِدَ...."۔

سب سے پہلے جس نے صرف صحیح احادیث پر مشتمل کتاب لکھی وہ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری ہیں، پھر ان کے بعد امام مسلم بن الحجاج نے صحیح لکھی......اوران دونوں کی کتابیں (یعنی صحیح بخاری وصحیح مسلم) اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتابیں ہیں......پھر ان دونوں کتابوں میں سے صحیح بخاری صحت میں برتر ہے اور فوائد سے بھرپور ہے۔

(ملخصاً :علوم الحديث (مقدمة ابن الصلاح) ، ص 17و 18)

پھر آگے لکھتے ہیں :

"لم يستوعبا الصحيح في صحيحيهما ولا التزما ذلك،فقد رُوينا عن البخاري أنه قال:ما أدخلتُ في كتابي الجامع إلّا ما صَحَّ وتركتُ من الصِّحاح لحال الطول، ورُوينا عن مسلمٍ أنه قال :ليس كل شيء عندي صحيحٌ وضعته ههنا يعني في كتابه الصحيح"۔

ایسی بات نہیں ہے کہ ان دونوں (بخاری ومسلم) نے تمام صحیح احادیث اپنی صحیحین میں لکھ دی ہیں اور نہ ہی ان دونوں نے ایسا کوئی التزام کیا ہے،ہمیں امام بخاریؒ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ آپ نے خود فرمایا کہ: میں نے اپنی کتاب میں صرف وہی چیز داخل کی ہے جو صحیح ہے، جبکہ میں نے بہت سی صحیح احادیث طوالت کے خوف سے ترک کر دی ہیں (یعنی اپنی کتاب میں نقل نہیں کیں)۔ اسی طرح ہمیں امام مسلمؒ سے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا: ایسی بات نہیں ہے کہ میں نے ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح ہے اُسے اپنی کتاب میں رکھ دیا ہے۔(یعنی دونوں اماموں نے اپنی اپنی صحیح میں صرف صحیح روایات نقل کرنے کا تو التزام کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف وہی احادیث صحیح ہیں جو ان دونوں کتابوں میں ہیں اور

ان کے علاوہ کوئی صحیح حدیث نہیں۔ناقل)۔

(علوم الحديث (مقدمة ابن الصلاح) ص19)

صحیح بخاری کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ لکھتے ہیں :

"ورَویٰ الاِسماعِيليُ عنه قال :لم أُخرِج في هذا الكتابِ اِلّا صَحِيحاً،وَما تَركتُ من الصحيحِ أكثر. قال الاِسماعيلي:لأنه لو أخرج كل صحيح عنده لَجَمعَ في الباب الواحدِ حديث جماعة من الصحابةِ ولذَكَرَ طريق كل واحدٍ منهم اذا صحت فيصير كتاباً كبيراً جداً"۔

اسماعیلی نے امام بخاریؒ سے روایت کیا ہے کہ امام نے فرمایا: میں نے اِس کتاب (یعنی صحیح بخاری) میں وہی روایت ذکر کی ہے جو صحیح ہے،اور جو صحیح روایات میں نے ترک کر دی ہیں (یعنی اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیں) وہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔اسماعیلی کہتے ہیں کہ اگر امام بخاریؒ وہ تمام روایات نقل کرتے جو اُن کے نزدیک صحیح ہیں تو آپ کو ہر ایک باب میں صحابہؓ کی ایک جماعت کی احادیث ان کی اسناد کے ساتھ ذکر کرنا پڑتیں اس طرح یہ ایک بہت بڑی کتاب بن جاتی۔

(هدي الساري مقدمة فتح الباري ، ص 7، المكتبة السلفية)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

"وَقَالَ أَبُو جعْفَر مَحْمُود بن عَمْرو الْعقيلِيّ لما ألف البُخَارِيّ كتاب الصَّحِيح عرضه على أَحْمد بن حَنْبَل وَيحيى بن معِين وعَلى بن الْمَدِينِيّ وَغَيرهم فاستحسنوه وشهدوا لَهُ بِالصِّحَّةِ الا فِي أَرْبَعَة أَحَادِيث قَالَ الْعقيلِيّ وَالْقَوْل فِيهَا قَول البُخَارِيّ وَهِي صَحِيحَة"۔

امام ابوجعفر محمود بن عمرو العُقیلی کا بیان ہے کہ جب امام بخاریؒ نے صحیح بخاری تالیف کی تو اسے امام احمد بن حنبلؒ،امام یحییٰؒ بن معین اور امام علیؒ بن المدینی وغیرہم پر پیش کیا،ان تمام

لوگوں نے انہیں دادِ تحسین دی اور کتاب کے صحیح ہونے کی گواہی دی سوائے چار حدیثوں کے، عقیلی کہتے ہیں کہ ان چار حدیثوں میں بھی امام بخاریؒ کی بات ہی درست ہے اور یہ صحیح ہیں"۔

(هدي الساري مقدمة فتح الباري ، ص 7، المكتبة السلفية)

پھر فرماتے ہیں :

"تقرر أنه التزم فيه الصحة وأنه لا يورد فيه الا حديثاً صحيحاً"۔

یہ بات ثابت شدہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں صحت کا التزام کیا ہے اور اس میں صرف صحیح حدیث ہی ذکر کرتے ہیں۔

(هدي الساري مقدمة فتح الباري ، ص 8)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں (اردو ترجمہ پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے) :

"ہر انصاف پسند کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ "صحیح" کے مصنف کا کسی راوی سے حدیث نقل کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ راوی اس کے نزدیک عادل، ضابط اور قابل اعتماد ہے، اور پھر جمہور ائمہ نے ان دونوں کتابوں کا نام صحیحین رکھا ہے، یہ گویا جمہور کی طرف سے ان دونوں کتابوں میں موجود ان تمام راویوں کی تعدیل کا اقرار ہے جن سے (بخاری ومسلم) نے اصول میں روایت لی ہے، البتہ وہ راوی جن کی روایات انہوں نے متابعات وشواہد اور تعلیقات میں ذکر کی ہیں ان میں مختلف درجات کے راوی پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ پر ضبط وغیرہ کے حوالے سے کلام کی گنجائش ہے لیکن اس کے باوجود ان کا صدق ثابت ہے۔ لہٰذا اگر صحیحین کے راویوں میں سے کسی پر کسی نے طعن یا جرح کی ہے تو وہ امام (بخاری و مسلم) کی تعدیل کے مقابلے پر ہے پس وہ جرح صرف اس صورت میں قابل قبول ہوگی جب مفسر ہو اور اس کا ایسا واضح سبب بیان کیا جائے جو اس راوی کی عدالت اور ضبط کو واقعی داغدار کرے...... کیونکہ مختلف ائمہ کے نزدیک اسبابِ جرح میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے، ایک امام کے نزدیک ایک جرح راوی کو داغدار کرتی ہے تو دوسرے کے نزدیک نہیں کرتی، شیخ ابوالحسن مقدسیؒ اس شخص کے بارے میں جس کی روایت صحیح میں لائی گئی ہے کہا کرتے تھے کہ

وہ پُل پر سے گزر گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بارے میں کسی قسم کی جرح قابل التفات نہیں"۔

(خلاصہ :هدي الساري مقدمة فتح الباري، ص 384)

شارح صحیح مسلم امام یحییٰ بن شرف النووی ؒ (م676ھ) لکھتے ہیں :

"اِتَّفَقَ العُلَمَاء عَلیٰ اَنَّ اَصَحَّ الکُتُبِ بعد القُرآنِ العَزِیزِ الصَّحِیحَانِ البخاري ومُسلِم وتَلَقَّتهُمَا الاُمَّةُ بِالقُبُولِ"

علماء محدثین متأخرین اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتابیں امام بخاری و مسلم کی صحیحین ہیں اور ان دونوں کتابوں کو امت کی تلقی بالقبول بھی حاصل ہے۔

(المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج ، ج 1ص 14، طبع مصر)

پھر آگے امام نووی فرماتے ہیں کہ صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح حاصل ہے، کیونکہ امام بخاری کی شرائط زیادہ سخت ہیں، اس کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"امام مسلم ؒ کے نزدیک مُعَنعَن سند (یعنی وہ سند جس میں ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راوی سے "عَن" کے ساتھ روایت بیان کرے) متصل سمجھی جائیگی اگر صرف یہ ثابت ہو جائے کہ روایت کرنے والا اور جس سے روایت کی جارہی ہے دونوں ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں، اگرچہ ان دونوں کی ملاقات ثابت نہ ہو۔ جبکہ امام بخاری ؒ کے نزدیک "مُعَنعَن" سند میں دونوں کا صرف ایک زمانے میں ہونا کافی نہیں بلکہ ان دونوں کی ملاقات کا ثابت ہونا بھی ضروری ہے"

(ملخصاً :المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج ، ج 1ص 14)

امام نووی ؒ کی اس بات سے ایک اور بات بھی واضح ہوگئی کہ صحیح بخاری کی وہ تمام احادیث جن سے امام بخاری نے اصول میں حجت پکڑی ہے اگر ان میں سے کسی حدیث کی سند میں "عن" آیا ہے تو بھی کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں کیونکہ امام بخاری نے اس وقت تک وہ سند ذکر نہیں کی جب تک یقین نہیں کر لیا کہ ان دونوں راویوں کی ملاقات ثابت ہے۔

حافظ شمس الدین الذہبیؒ (م 748ھ) لکھتے ہیں :

"شیخان (یعنی بخاری و مسلم) نے جن راویوں سے احادیث کی تخریج کی ہے ان کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم وہ جن سے انہوں نے اصول میں احتجاج کیا ہے، اور دوسری قسم ان راویوں کی جن کی روایات متابعات و شواہد کے طور پر لائے ہیں ۔ اب وہ جن سے انہوں نے (اصول میں) حجت پکڑی ہے چند ایسے ہوں گے جن کی نہ ہی توثیق کی گئی ہے اور نہ ہی ان پر کوئی جرح کی گئی ہے تو ایسے راوی ثقہ ہیں ان کی حدیث مضبوط ہے ۔ کچھ ایسے ہوں گے جن سے انہوں نے حجت پکڑی ہے لیکن اس راوی کے بارے میں کلام کیا گیا ہے (یعنی اس پر جرح کی گئی ہے ۔ ناقل) اب یا تو ایسا ہوگا کہ اس پر جرح تعصب کی بناء پر کی گئی ہوگی جبکہ جمہور کے نزدیک وہ راوی ثقہ ہے تو ایسے راوی کی حدیث بھی قوی اور مضبوط ہے ۔ اور یا اس راوی کے حفظ و تلیین سے متعلق جو کلام کیا گیا ہے وہ واقعی معتبر ہوگا تو اس صورت میں بھی اس راوی کی حدیث حسن کے درجے سے نیچے نہیں ہوگی جو کہ صحیح کا سب سے نچلا درجہ ہے ۔ پس اللہ کا شکر ہے کہ صحیحین (یعنی صحیح بخاری و صحیح مسلم) میں ایسا کوئی راوی نہیں جس سے امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے اصول میں حجت پکڑی ہے اور اس کی روایات ضعیف ہوں بلکہ (تمام) یا تو حسن ہیں یا صحیح ہیں" ۔

(ملخصاً :الموقظة فی علم مصطلح الحدیث ، ص 79- 80، دار البشائر بیروت)

حافظ محمد بن عبدالرحمن السخاویؒ (م 902ھ) نے امام ابو اسحاق ابراہیم بن محمد اسفرائنیؒ (م 418ھ) کا قول نقل کیا ہے، آپ نے فرمایا :

"اَھلُ الصنعةِ مُجمَعُون علیٰ اَنَّ الاَخبَارَ الَّتِی اِشتَمَلَ عَلَیھَا الصَّحِیحَان مَقطُوعٌ بِصِحَّةِ اُصُولِھا و مُتُونِھا وَلَا یَحصلُ الخِلَافُ فِیھا بِحَالٍ وَاِن حَصَلَ فَذٰلِکَ خِلَافٌ فِی طُرُقِھا ورُوَا تِھا" ۔

فن حدیث کے ماہرین کا اس پر اجماع ہے کہ صحیحین کے تمام اصول و متون قطعاً صحیح ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ احادیث کی سندوں اور راویوں کے اعتبار

سے ہے۔

(فتح المغيث بشرح الفية الحديث، ج 1ص 93، دار المنهاج۔ الرياض)

یہی بات شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی النكت على كتاب ابن الصلاح، ج 1 ص 377 میں نقل کی ہے۔

مسند الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م 1176ھ) لکھتے ہیں :

"أَمَّا الصَّحِيحَانِ فَقَدِ اتَّفَقَ الْمُحَدِّثُونَ عَلَىٰ أَنَّ جَمِيعَ مَا فِيهِمَا مِنَ الْمُتَّصِلِ الْمَرْفُوعِ صَحِيحٌ بِالْقَطْعِ، وَأَنَّهُمَا مُتَوَاتِرَانِ إِلَىٰ مُصَنِّفِيهِمَا، وَأَنَّ كُلَّ مَنْ يُهَوِّنُ أَمْرَهُمَا فَهُوَ مُبْتَدِعٌ مُتَّبِعٌ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ"۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم کے بارے میں تمام محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل اور مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک بالتواتر پہنچی ہیں۔ جو ان کی عظمت نہ کرے وہ بدعتی ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔

(حجة الله البالغة، ج 1ص 232، دار الجيل بيروت)

مسند احمد وسنن ترمذی کے محقق علامہ احمد محمد شاکرؒ (م 1377ھ) لکھتے ہیں :

"محققین علماء حدیث کے نزدیک یہ بات بلاشبہ حق ہے کہ صحیحین (یعنی صحیح بخاری وصحیح مسلم) کی تمام احادیث صحیح ہیں، نہ ان کی کسی حدیث میں کوئی طعن ہے اور نہ ہی کوئی ضعف ہے، اور جو امام دارقطنیؒ وغیرہ نے کچھ احادیث پر تنقید کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چند احادیث صحت کے اُس اعلیٰ مرتبہ کو نہیں پہنچتیں جس کا التزام دونوں اماموں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے، ورنہ ان احادیث کے فی نفسہ صحیح ہونے میں کسی کو بھی اختلاف نہیں"۔

(ملخصاً :الباعث الحثيث ، حاشية، ص 33، دار الكتب العلمية بيروت)

علامہ محمد انور شاہ کاشمیریؒ (م 1352ھ) لکھتے ہیں:

"واعلم انه انعقد الاجماع على صحة البخاري ومسلم، الّاانّ مسلماً يشتمل عندي على الحسان ايضاً"۔

جان لو کہ (صحیح) بخاری اور (صحیح) مسلم کی (روایات کی) صحت پر اجماع ہے، لیکن میری رائے میں (فرق یہ ہے کہ) صحیح مسلم میں حسن روایات بھی ہیں (جبکہ صحیح بخاری کی تمام روایات صحیح ہیں۔ناقل)۔

پھر امام دار قطنیؒ کی طرف سے صحیح بخاری کی بعض روایات کی سندوں پر تنقید کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ ان الدار قطنی تتبَّع علی البخاریِّ فی أزید من مائة موضع، ولم یستطع أن یتکلم اِلّا فی الاسانید بالوصل والارسال غیر موضع واحد ... (الی ان قال) ... وَوَجھُه أنَّ الدّار قطنی یمشی علی القَوَاعِدِ المُمَھَّدَةِ عِندَھُم، فَیُنَازِعُه مِن القَوَاعِدِ، وَشَأنُ البخاریِّ أرفَعُ مِن ذٰلِکَ فَاِنَّه یَمشِی عَلٰی اجتِھَادِه..."۔

امام دار قطنی نے امام بخاری پر سو سے زائد مقامات پر تتبع کیا ہے (یعنی تنقید کی ہے) لیکن سوائے ایک مقام کے باقی ہر جگہ صرف سندوں کے وصل وارسال پر ہی کلام کر سکے ہیں (حدیث کے متن یا مضمون پر کوئی اعتراض نہیں کر سکے)......(آگے فرماتے ہیں)...... امام دارقطنی قواعد مصطلحہ پر چلتے ہیں اور انہی قواعد کی بنا پر اختلاف کرتے ہیں، مگر امام بخاری کا مقام اس سے کہیں بلند ہے وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتے ہیں (یعنی امام بخاری تو بجائے خود امام و مجتہد ہیں وہ جو بات کہیں وہ بذات خود ایک قانون اور اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ناقل)۔

(فیض الباری علی صحیح البخاری، ج 1ص 52، دار الکتب العلمیة بیروت)

الغرض! صحیح بخاری کی کسی حدیث کو" راوی کی خود ساختہ" یا" موضوع" کہنا تو دور، علماء حدیث تو صحیح بخاری کی کسی حدیث کو "ضعیف" ماننے کے لئے بھی تیار نہیں بلکہ اس کتاب کی صحت پر اجماع بتا رہے ہیں، ایک اکیلے پندرھویں صدی ہجری کے" بخاری" لعل شاہ صاحب بخاری ہیں جو صرف اس لئے کہ کہیں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید جنت میں نہ چلے جائیں اور ان کی مغفرت نہ ہو جائے، صحیح بخاری کی حدیث کو

ہی ”خود ساختہ“ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

صحیحین کی روایات کا انکار تعصب (لعل شاہ صاحب)

اور تعجب کی بات یہ بھی ہے کہ خود لعل شاہ صاحب ایک جگہ محمود احمد عباسی صاحب پر چوٹ کرتے ہوئے سرخی لگاتے ہیں ”تعصب نے اندھا کر دیا۔ صحیحین کی روایات کا انکار“ اور پھر لکھتے ہیں :

”عباسی صاحب نے بڑی بے باکی سے بہت سی احادیث صحیحہ کا انکار کیا، بخاری، مسلم، ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی، مسند امام احمد، بیہقی اور طبرانی کی روایات جن کا استقصاء دشوار ہے انکار کیا ہے، بعض روایات کا صراحتاً انکار کیا اور بعض روایات کے مضامین کو باطل، لغو اور ،واہی قرار دیا... “۔

(استخلاف یزید، صفحہ 620)

اور اسی سیاق میں صحیح بخاری کی ایک حدیث پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”عباسی صاحب نے اس ایک حدیث کو کیا ٹھکرایا گویا صحیح بخاری کے تین صفحات پر پانی پھیر دیا اور یہی حال صحیح مسلم کا بھی ہوا، قارئین کرام کی مرضی پر منحصر ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات کو برقرار رکھ کر محمود عباسی کے بیس صفحات کو لغو قرار دیں یا عباسی صاحب کی کاوش کی قدر کریں اور بخاری و مسلم کے سوا چار صفحات پر خط تنسیخ کھینچ دیں، بہر حال ہم صحیح بخاری کی روایات کو عباسی صاحب کے مزعومات پر قربان نہیں کر سکتے .... (آگے دوسری روایات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں)..... یہ روایات جنہیں عباسی صاحب نے وضع کہنے کی شرمناک جسارت کی ہے بخاری و مسلم کی روایتیں ہیں“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 622)

تو ہم بھی لعل شاہ صاحب کے یہی الفاظ انہیں لوٹاتے ہیں کہ :

”لعل شاہ صاحب نے بڑی بے باکی سے صحیح بخاری کی صحیح حدیث کا انکار کیا اور اس کے الفاظ

کو خود ساختہ قرار دیا، اب یہ قارئین کرام کی مرضی پر منحصر ہے کہ امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری کی روایت کو برقرار رکھ کر لعل شاہ بخاری کی کتاب کے بارہ صفحات (استخلاف یزید، صفحہ 319 تا 330) کو لغو قرار دیں یا لعل شاہ صاحب کی کاوش کی قدر کریں اور بخاری کی حدیث پر خط تنسیخ کھینچ دیں، بہر حال ہم صحیح بخاری کی روایت کو لعل شاہ صاحب کے مزعومات پر قربان نہیں کر سکتے یہ روایت جسے لعل شاہ صاحب نے خود ساختہ کہنے کی شرمناک جسارت کی ہے بخاری کی روایت ہے"۔

صحیح بخاری کی حدیث کو "خود ساختہ" ثابت کرنے کے لئے لعل شاہ صاحب کے دلائل کا جائزہ

آئیے اب ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کی اس روایت کو "راوی کی خود ساختہ" ثابت کرنے کے لئے پیش کیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

(1) یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ کسی دوسرے محدث نے روایت نہیں کی۔

(2) حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے ایک روایت بواسطہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ بھی مروی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کا تذکرہ ہے جو آپ نے حضرت ام حرام کے گھر میں دیکھا، اور اس روایت میں یہ الفاظ نہیں۔

(3) یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔

(4) جب یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں تو حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت کے الفاظ محکم اور پائیدار ہیں اور عمیر بن الاسود کا بیان من گھڑت اور نا قابل اعتبار ہے۔

(5) حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت کے سارے راوی مدنی ہیں اور عمیر کی روایت کے سارے راوی شامی ہیں اور اہل شام کی روایت سے اہل مدینہ کی روایت ارجح واقوی ہے۔

(6) حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور گھر کے فرد ہیں جبکہ عمیر ابن الاسود اجنبی ہیں۔

(7) حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور عمیر تابعی المخضرم ہیں۔

(8) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کو راویوں نے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہے، بخلاف عمیر بن الاسود کی روایت کے کہ کوئی ضمانت نہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کے الفاظ ضبط کیے ہیں۔

(9) عمیر بن الاسود سے یہ روایت بیان کرنے والا ایک ہی شاگرد خالد ابن معدان ہے، جبکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان کے متعدد شاگرد روایت کرتے ہیں۔

(10) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کو تمام محدثین نے بالاتفاق قبول کیا ہے جبکہ عمیر بن الاسود کی روایت کو امام بخاری کے سوا کسی محدث نے روایت نہیں کیا۔

(ملخصاً، استخلافِ یزید، صفحہ 324و325)

تبصرہ

جہاں تک لعل شاہ صاحب کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ صحیح بخاری کی عمیر بن الاسود والی روایت ان الفاظ کے ساتھ کسی اور محدث نے روایت نہیں کی، اول تو یہ دعویٰ ہی باطل ہے، ہم پہلے ان تمام کتب حدیث کے نام لکھ آئے ہیں جن میں یہ روایت انہی الفاظ کے ساتھ مکمل سند کے ساتھ موجود ہے۔ اور اگر بالفرض یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ دنیا کی کسی اور کتاب میں نہ بھی ہوتی تو بھی کسی روایت کو "خود ساختہ" ثابت کرنے کا یہ معیار لعل شاہ صاحب کا "خود ساختہ" ہے، اصول حدیث میں ایسا کوئی ضابطہ نہیں کہ "اگر کوئی روایت صرف صحیح بخاری میں ہو اور کسی دوسرے محدث نے اسے اپنی کتاب میں روایت نہ کیا ہو تو وہ ضعیف یا خود ساختہ شمار ہوگی"۔

رہی یہ بات کہ آنحضرت ﷺ کے ایسے ہی ایک خواب کا تذکرہ ایک دوسری روایت میں بھی ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، اور اس روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میری امت کے کچھ لوگ مجھ پر پیش کیے گئے جو اللہ کی راہ میں سمندر کے وسط میں جنگ کرنے والے ہیں جیسے بادشاہ تختوں پر سوار ہوتے ہیں (اس روایت میں سب سے پہلے سمندری جہاد کرنے والوں اور قیصر کے شہر پر سب سے پہلا حملہ کرنے والوں کے لئے کسی قسم کی بشارت کا ذکر نہیں)، لہٰذا ثابت ہوا کہ صحیح بخاری کی وہ روایت جس میں اس بشارت کا ذکر ہے وہ خود ساختہ ہے۔ تو اس پر عرض ہے کہ اولاً تو قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا کہ یہ تمام روایات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں درست نہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کے خود لعل شاہ

صاحب نے ہی"مصنف عبدالرزاق اور مسند احمد" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"حضرت عطا ابن یسار سے روایت ہے کہ یہ خواب آنحضور ﷺ نے امرءۃ حذیفہ (یعنی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ۔ناقل) کے گھر بھی دیکھا جس کے الفاظ تقریباً تقریباً وہی ہیں جو انس عن ام حرام کے الفاظ ہیں.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 323)

اسی طرح خود لعل شاہ صاحب نے"سنن ابی داوٗد" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"حضرت عطاء ابن یسار نے بھی حضرت ام حرام سے یہی الفاظ نقل کیے ہیں"

(استخلاف یزید، صفحہ 322)

پھر اسی صفحے پر لعل شاہ صاحب نے"مسند احمد" کے حوالے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"یہ خواب حضور ﷺ نے اپنی ایک بیوی کے ہاں بھی دیکھا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 322)

تو ظاہر ہے"ام حرام"،"امرءۃ حذیفہ" اور"زوجۃ الرسول" تینوں الگ الگ شخصیات ہیں، پھر ان تینوں کے ہاں دیکھا گیا خواب"ایک ہی واقعہ" کیسے ہوسکتا ہے؟

تو آئیے پہلے"سنن ابی داوٗد"،"مصنف عبدالرزاق" اور"مسند احمد" کی روایات کے الفاظ پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں کہ کیا ان سب روایات کے الفاظ ایک ہی ہیں؟

<u>مسند احمد کی روایت:</u>

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: بَيْنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْتِ بَعْضِ نِسَائِهِ، إِذْ وَضَعَ رَأْسَهُ فَنَامَ، فَضَحِكَ فِي مَنَامِهِ. فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ قَالَتْ لَهُ امْرَأَةٌ مِنْ نِسَائِهِ: لَقَدْ ضَحِكْتَ فِي مَنَامِكَ. فَمَا أَضْحَكَكَ؟ قَالَ " أَعْجَبُ مِنْ نَاسٍ مِنْ أُمَّتِي يَرْكَبُونَ هَذَا الْبَحْرَ هَوْلَ الْعَدُوِّ، يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ " فَذَكَرَ لَهُمْ خَيْرًا كَثِيرًا"۔

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) اس اثنا میں کہ حضور ﷺ اپنی بعض بیویوں کے ہاں تھے آپ سر رکھ کر سوئے پس خواب کی حالت میں ہنسے، جب بیدار ہوئے تو آپ کی ایک بیوی نے دریافت کیا حضور آپ خواب میں ہنس رہے تھے کونسی چیز ہنسی کا باعث ہوئی آپ نے فرمایا میں تعجب کر رہا تھا اپنی امت کے بعض لوگوں سے جو اس سمندر پر سوار ہو کر اللہ کی راہ میں دشمنوں کے گرد گھیرا ڈالے جہاد کر رہے تھے پس آپ نے ان کے لئے خیر کثیر کا ذکر کیا۔

(مسند احمد، ج4صفحہ454، مؤسسة الرسالة بيروت/استخلاف یزید، ص322)

نوٹ: اس روایت میں الفاظ ہیں" هول العدو" جنہیں لعل شاہ صاحب نے" حول العدو" بنا دیا ہے اور اس کا ترجمہ" دشمن کے گرد گھیرا ڈالے" کیا ہے، جبکہ روایت میں" هول العدو" ہے جس کا ترجمہ" دشمنوں کے لئے خوف بن کر" ہے۔

بہر حال آپ الفاظ پر غور کریں، ذکر ہے کہ سمندر میں جہاد کرنے والوں کے لئے آپ ﷺ نے خیر کثیر کا ذکر کیا۔ یہاں" جیسے بادشاہ تختوں پر سوار ہوں" کے الفاظ نہیں ہیں۔

سنن ابی داؤد کی روایت:

"حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ مَعِينٍ، حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ يُوسُفَ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ أُخْتِ أُمِّ سُلَيْمٍ الرُّمَيْصَاءِ قَالَتْ: نَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَيْقَظَ وَكَانَتْ تَغْسِلُ رَأْسَهَا فَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَتَضْحَكُ مِنْ رَأْسِي؟ قَالَ: لَا، وَسَاقَ هَذَا الْخَبَرَ يَزِيدُ وَيَنْقُصُ، قَالَ أَبُو دَاوُدَ: الرُّمَيْصَاءُ أُخْتُ أُمِّ سُلَيْمٍ مِنَ الرَّضَاعَةِ"۔

عطاء بن یسار، ام سلیم کی بہن" رمیصاء" سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ نبی ﷺ سوئے اور پھر بیدار ہوئے اور ہنس رہے تھے اس وقت وہ (یعنی" رمیصاء"۔ ناقل) اپنا سر دھو رہی تھیں، تو انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ میرا سر دیکھ کر ہنس رہے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، اور پھر (راوی نے) یہی حدیث کمی بیشی کے ساتھ بیان کی (جو

اس سے پہلے امام ابو داوٗد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ناقل)، امام ابو داوٗد کہتے ہیں کہ" رمیصاء" ام سلیم کی رضاعی بہن تھیں۔(یہ حضرت ام حرام ہی کا نام ہے۔ناقل)۔

(سنن ابي داود، باب الغزو في البحر، ج3ص7، بيروت)

اس روایت میں راوی کے اس حدیث کو الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ بیان کرنے کا ذکر ہے۔

مصنف عبدالرزاق کی روایت:

یہی "سنن ابی داوٗد" والی روایت "مصنف عبدالرزاق" میں یوں ہے:

"عَنْ مَعْمَرٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، أَنَّ امْرَأَةَ حُذَيْفَةَ قَالَتْ: نَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ فَقُلْتُ: تَضْحَكُ مِنِّي يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: لَا وَلَكِنْ مِنْ قَوْمٍ مِنْ أُمَّتِي يَخْرُجُونَ غُزَاةً فِي الْبَحْرِ، مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الْمُلُوكِ عَلَى الْأَسِرَّةِ ثُمَّ نَامَ، ثُمَّ اسْتَيْقَظَ أَيْضًا فَضَحِكَ۔ فَقُلْتُ: تَضْحَكُ مِنِّي يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَقَالَ: لَا، وَلَكِنْ مِنْ قَوْمٍ يَخْرُجُونَ مِنْ أُمَّتِي غُزَاةً فِي الْبَحْرِ فَيَرْجِعُونَ قَلِيلَةً غَنَائِمُهُمْ مَغْفُورًا لَهُمْ قَالَتْ: ادْعُ اللَّهَ لِي أَنْ يَجْعَلَنِي مِنْهُمْ۔ قَالَ: فَدَعَا لَهَا، قَالَ فَأَخْبَرَنَا عَطَاءُ بْنُ يَسَارٍ قَالَ: فَرَأَيْتُهَا فِي غَزَاةٍ غَزَاهَا الْمُنْذِرُ بْنُ الزُّبَيْرِ إِلَى أَرْضِ الرُّومِ وَهِيَ مَعَنَا فَمَاتَتْ بِأَرْضِ الرُّومِ"۔

(مصنف عبدالرزاق، ج 5ص 284، بتحقيق حبيب الرحمن الاعظمی، الهند)

غور فرمائیں! یہ وہی سنن ابی داوٗد والی سند ہے "عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ" لیکن اس میں ایک تو "ام حرام یا رمیصاء" کے بجائے "امرءة حذيفة" (یعنی حذیفہ کی زوجہ) کا ذکر ہے کہ "عطاء بن یسار" ان سے روایت کر رہے ہیں، اور دوسرا اس روایت میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندری جہاد کرنے والوں کے بارے میں فرمایا "فَيَرْجِعُونَ قَلِيلَةً غَنَائِمُهُمْ مَغْفُورًا لَهُمْ" کہ وہ بہت کم مال غنیمت لے کر لوٹیں گے لیکن ان کی مغفرت کر دی گئی۔

تنبیہ: لعل شاہ صاحب نے مندرجہ بالا"مصنف عبدالرزاق" کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہی خواب آنحضور ﷺ نے ایک اور صحابیہ حضرت امرءۃ حذیفہ رضی اللہ عنہا کے گھر بھی دیکھا تھا،اس کے الفاظ بھی حضرت انس عن ام حرام کی روایت جیسے ہیں" (مصنف عبدالرزاق، ص285 ج5۔مسند احمد،ص435 ج6)۔

(استخلاف یزید،صفحہ 326و327)

لعل شاہ صاحب کی یہ بات درست نہیں، کیونکہ مصنف عبدالرزاق کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سمندری جہاد کرنے والوں کے بارے میں فرمایا" فَيَرْجِعُونَ قَلِيلَةً غَنَائِمُهُمْ مَغْفُورًا لَهُمْ "کہ وہ بہت کم مال غنیمت لے کرلوٹیں گے لیکن ان کی مغفرت کردی گئی۔جبکہ حضرت انس عن ام حرام والی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔

تو اب لعل شاہ صاحب"سنن ابی داوٗد" اور"مصنف عبدالرزاق" میں سے کس روایت کو" راوی کی خود ساختہ"کہیں گے؟ جبکہ سند دونوں کی ایک ہی ہے اور لعل شاہ صاحب نے ان دونوں کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں،لیکن"مصنف عبدالرزاق" میں" مغفور لهم" کی بشارت کا بھی ذکر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے"ابو داوٗد" کی روایت کا ذکر کرنے کے بعد اسی"مصنف عبدالرزاق" کی روایت کا حوالہ دے کر لکھا ہے:

"وَقد أخرجه عبد الرز اق مِنَ الْوَجْهِ الَّذِي أَخْرَجَهُ مِنْهُ أَبُو دَاوُدَ فَقَالَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ امْرَأَةً حَدَّثَتْهُ وَسَاقَ الْمَتْنَ وَلَفْظُهُ يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ فِي قِصَّةٍ أُخْرَى غَيْرِ قِصَّةِ أُمِّ حَرَامٍ فَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(مفہوم) اس روایت کو عبدالرزاق بھی اسی سند کے ساتھ لائے ہیں جس کے ساتھ ابوداوٗد نے بیان کیا ہے،لیکن عبدالرزاق کی روایت کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ ام حرام رضی اللہ عنہا والے واقعہ کے علاوہ کوئی اور واقعہ ہے،اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

(فتح الباری، ج 11ص73، دار المعرفة بيروت)

تو ثابت ہوا کہ سمندری جہاد سے متعلق وہ تمام روایات جن میں آنحضرت ﷺ کے خواب کا تذکرہ

ہے،ایک ہی واقعہ سے متعلق نہیں بلکہ یہ متعدد الگ الگ واقعات ہیں۔لہٰذا لعل شاہ صاحب کا ان تمام روایات کو قطعیت کے ساتھ ایک ہی واقعہ سے متعلق قرار دینا بلا دلیل ہے۔اب جب یہ ثابت ہوگیا کہ ایسی تمام روایات ایک ہی واقعہ سے متعلق نہیں، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور عطاء بن یسار والی روایت میں بیان کردہ واقعہ الگ ہو اور عمرو بن الاسود عن ام حرام والی روایت میں بیان کردہ واقعہ الگ ہو؟ پھر ان دونوں کے درمیان تقابل و تعارض باور کروا کر ایک روایت کو "راوی کی خود ساختہ" قرار دینے کی آخر کیا ضرورت پیش آ گئی؟

پھر جیسا کہ آپ نے دیکھا "سنن ابی داوٗد" اور "مصنف عبدالرزاق" کی روایتیں جن کی سند ایک ہی ہے، لیکن دونوں میں الفاظ کا واضح فرق ہے، "سنن ابو داوٗد" میں " فيرْجِعُونَ قَلِيلَةً غَنَائِمُهُمْ مَغْفُورًا لَهُمْ " (وہ بہت کم مال غنیمت لے کر لوٹیں گے لیکن ان کی مغفرت کردی گئی) کے الفاظ نہیں، جبکہ اسی سند کے ساتھ جو روایت مصنف عبدالرزاق میں ہے اس میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

علاوہ ازیں، لعل شاہ صاحب، عمير بن الاسود عن ام حرام والی روایت کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جس روایت کے مخالف و متناقض بتا کر رد کرنے کے درپے ہیں، اس حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت میں بھی ایک جگہ ہے کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کے گھر سوئے تھے کہ آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے"، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ" آپ وہاں ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ آپ ہنسے" (یعنی سوئے نہیں تھے)، اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہی ایک روایت میں ذکر ہے کہ" حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک دیکھ رہی تھیں کہ آپ سو گئے پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے" جبکہ دوسری روایات میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک دیکھ رہی تھیں، بلکہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سونے یا قیلولہ کرنے کا ذکر ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"فَدَخَلَ عَلَيْهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَطْعَمَتْهُ وَجَعَلَتْ تَفْلِي رَأْسَهُ، فَنَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ"۔

(صحيح البخارى، باب الدعاء بالجهاد والشهادة للرجال والنساء)

"نَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا قَرِيبًا مِنِّي، ثُمَّ اسْتَيْقَظَ يَتَبَسَّمُ"۔

(صحيح البخارى، باب فضل من يصرع في سبيل الله فمات فهو منهم)

"دَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى ابْنَةِ مِلْحَانَ، فَاتَّكَأَ عِنْدَهَا، ثُمَّ ضَحِكَ"۔

(باب غزوة المرأة في البحر)

"اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَوْمًا فِي بَيْتِهَا، فَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ يَضْحَكُ"۔

(صحيح البخارى،باب ركوب البحر)

"فَدَخَلَ يَوْمًا فَأَطْعَمَتْهُ، فَنَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ اسْتَيْقَظَ يَضْحَكُ"۔

(صحيح البخارى، باب من زار قوماً فقال عندهم)

یہ مختلف الفاظ صرف حضرت انس ؓ سے مروی روایات سے ہی نقل کیے گئے ہے جو صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر موجود ہیں، اب اگر یہ سب روایات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں تو لعل شاہ صاحب کو یہاں بھی اپنی تحقیق کے دریا بہانے چاہئے تھے کہ کون سا واقعہ درست ہے؟ آپ ﷺ حضرت ام حرام ؓ کے ہاں سوئے تھے یا صرف تکیہ لگائے بیٹھے تھے؟ پھر حضرت ام حرام ؓ آپ ﷺ کا سر مبارک دیکھ رہی تھیں (جس کا ترجمہ لعل شاہ صاحب نے ''آپ کی جوئیں دیکھنا شروع کر دیں'' کیا ہے (استخلاف یزید، صفحہ 320) یا حضرت ام حرام آپ کا سر نہیں دیکھ رہی تھیں؟

اسی طرح ''سنن ابی داوٗد'' وغیرہ میں حضرت ام حرام ؓ سے ایک اور روایت بھی مروی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَكَّارٍ الْعَيْشِيُّ، حَدَّثَنَا مَرْوَانُ، ح وحَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيمِ الْجَوْبَرِيُّ الدِّمَشْقِيُّ الْمَعْنَى، قَالَ: حَدَّثَنَا

مَرْوَانُ، أَخْبَرَنَا هِلَالُ بْنُ مَيْمُونٍ الرَّمْلِيِّ، عَنْ يَعْلَى بْنِ شَدَّادٍ، عَنْ أُمِّ حَرَامٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: الْمَائِدُ فِي الْبَحْرِ الَّذِي يُصِيبُهُ الْقَيْءُ لَهُ أَجْرُ شَهِيدٍ، وَالْغَرِقُ لَهُ أَجْرُ شَهِيدَيْنِ"۔

یعلیٰ بن شدّاد حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جس کو سمندری سفر کے دوران (چکر آنے کی وجہ سے) قئے آئے اس کے لئے ایک شہید جتنا اجر ہے اور جو اس دوران غرق ہو جائے اس کے لئے دو شہیدوں کے برابر اجر ہے۔

(سنن ابي داود، ج3ص7، باب فضل الغزو في البحر، مكتبة الصيداء بيروت)

امام ابو داوٗد رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو" باب فضل الغزو في البحر" (سمندری جہاد کی فضیلت) میں ہی لائے ہیں، یہی روایت" مسند حمیدی" اور" المعجم الكبير للطبرانی" وغیرہ کتب میں بھی موجود ہے جس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ:

"فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ ادْعُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يَجْعَلَنِي مِنْهُمْ، قَالَ: اللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا مِنْهُم، فَغَزَتِ الْبَحْرَ فَلَمَّا خَرَجَتْ رَكِبَتْ دَابَّتَهَا فَسَقَطَتْ فَمَاتَتْ"۔

(حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں) میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے بھی ان میں شامل کر دے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ اسے بھی ان میں شامل کر دے، پس آپ بحری غزوہ کے لئے نکلیں تو اسی دوران آپ اپنی سواری سے گر گئیں اور آپ کی وفات ہو گئی۔

(مسند الحميدي، ج1ص343، دمشق / المعجم الكبير، ج25ص133، القاهرة / الآحاد والمثاني لابن ابي عاصم، ج6ص100، الرياض / السنن الكبرى للبهقي، ج4ص547، بيروت)

تو ثابت ہوا کہ ممکن ہے کسی روایت میں کوئی راوی یا صحابی مکمل الفاظ نہ بیان کرے بلکہ مختصر الفاظ بیان کر دے، اور کسی دوسرے مقام پر اسی روایت میں اضافے کے ساتھ مکمل الفاظ بیان کر دے یا اسی واقعہ میں بیان کردہ دوسرے الفاظ بیان کر دے جو کسی دوسرے کے سامنے بیان نہیں کیے تھے، یا یہ روایات مختلف

واقعات سے متعلق ہوں، اور دونوں روایتوں کے الفاظ میں کوئی ایسا تعارض یا تضاد بھی نہ ہو بلکہ دونوں باتوں کا جمع ہونا ممکن ہو اور سنداً دونوں روایات صحیح بھی ہوں تو پھر کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ دونوں روایتوں کو ایک دوسرے کی معارض بتا کر ان میں سے ایک کو "خود ساختہ" قرار دیا جائے؟ صرف اس لئے کہ کسی ایک روایت کے الفاظ "پندرھویں صدی" کے کسی محقق کے مفروضوں اور خیالات سے مطابقت نہیں رکھتے؟

باقی رہا یہ فلسفہ کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت کے سارے راوی مدنی ہیں اور عمیر بن الاسود عن ام حرام رضی اللہ عنہا کے راوی شامی ہیں، اس لئے اہل مدینہ کی روایت ارجح و اقویٰ ہے، تو اس پر عرض ہے کہ یہ بات تب آئے گی جب دونوں روایتوں میں کوئی تعارض ہو، کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت میں کہیں یہ بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندری جہاد کرنے والوں کے مغفور لهم ہونے کی نفی فرمائی اور عمرو بن الاسود والی روایت اس کا اثبات کر رہی ہے؟ جبکہ ہم اوپر "مصنف عبد الرزاق" سے "عطاء بن يسار عن امرأة حذيفة" کی سند والی روایت نقل کر آئے ہیں جس میں "مغفور لهم" کے الفاظ بھی ہیں، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں باتیں فرمائی ہوں کہ آپ کو خواب میں وہ لوگ ایسے نظر آئے جیسے بادشاہ تختوں پر سوار ہوں، اور پھر آپ نے ان کے مغفور لہم ہونے کی بشارت بھی دی ہو، اور روایت بیان کرتے وقت حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے کہیں ایک بات بیان فرمائی اور کہیں دوسری بیان فرمائی، اور دونوں باتیں بیک وقت جمع ہوسکتی ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ان دونوں روایتوں کے درمیان "تعارض" کا خیال لعل شاہ صاحب سے پہلے گذرے محدثین، شارحین اور مؤرخین امت کو نہ آیا، ان میں سے تو کسی نے صحیح بخاری کی "عمیر بن الاسود عن ام حرام" والی حدیث کو "راوی کی خود ساختہ" نہیں کہا، بلکہ وہ اس روایت کی بنیاد پر یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ یہ پیشگوئی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کے ہاتھوں پوری ہوئی (جس کے حوالے پہلے گذر چکے) پھر ان میں سے کچھ نے یزید کو اس بشارت سے خارج کرنے کے لئے "مغفور لهم" کی تاویلات تو کی ہیں، لیکن کسی نے اس روایت کو "خود ساختہ" کہنے کی ہمت نہیں کی۔ یہ خیال لعل شاہ صاحب جیسے عالی دماغ کو ہی سوجھا کیونکہ وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے کے حق میں کوئی مثبت بات سامنے آئے۔

باقی رہی یہ دلیل کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور عمیر بن الاسود تابعی ہیں، لہٰذا عمیر بن الاسود والی روایت "خود ساختہ" ہے تو اس پر عرض ہے کہ یہ واقعہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، اور عمیر بن الاسود اپنی طرف سے نہیں بیان کر رہے بلکہ انہی ام حرام سے روایت کر رہے ہیں بلکہ یہ بھی بیان کر رہے ہیں کہ انہوں نے حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے یہ بات حمص کے ساحل پر ان کے گھر میں اور ان کے خاوند حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں سنی تھی، لہٰذا یہاں صحابی و تابعی اور بھانجے و اجنبی کی بحث چھیڑنے کا کوئی مقصد نہیں، ہاں اگر تابعی اس روایت کو "مرسل" بیان کرتے تو اور بات تھی۔

اسی طرح لعل شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ "حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کو راویوں نے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہے، بخلاف عمیر بن الاسود کی روایت کے کہ کوئی ضمانت نہیں کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ضبط کیے ہیں" اور "عمیر بن الاسود سے یہ روایت بیان کرنے والا ایک ہی شاگرد خالد ابن معدان ہے" بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا، دونوں روایتوں کو آگے راویوں نے بیان کیا ہے، تو کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت آگے روایت کرنے والے "معصوم عن الخطأ والنسيان" تھے کہ ان کے بارے میں لعل شاہ صاحب کے پاس کوئی ضمانت ہے اور عمیر بن الاسود یا ان سے آگے بیان کرنے والے "غیر معصوم" تھے؟

باقی عمیر بن الاسود سے آگے بیان کرنے والے اگر اکیلے "خالد بن معدان" بھی ہیں تو کیا ہوا؟ کیا وہ ثقہ نہیں؟ ان کا نام "خالد بن معدان بن أبي كريب الكلاعي أبو عبد الله الشامي الحمصي" ہے اور یہ تابعی ہیں، ان سے منقول ہے کہ "میں نے 70 صحابہ کرام کو پایا ہے، دور نہ جائیں (تهذيب التهذيب، ج3ص118، طبع دائرة المعارف حیدر آباد دکن) میں ان کا تعارف دیکھ لیں، ان کے ثقہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تضعیف کی طرف اشارہ کیا ہے؟

لعل شاہ صاحب نے ایک شوشہ یہ بھی چھوڑا ہے کہ:

"امام بخاری نے بھی "باب ما قيل في قتال الروم" بصیغہ مجہول تعبیر کر کے شاید اس کی تضعیف کی طرف اشارہ کر دیا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 325)

نیز لکھتے ہیں:

”راقم السطور کہتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ وہ ضعیف روایت پر ترجمۃ الباب قائم نہیں کرتے، جیسا کہ شیخ شیخنا الانور نوّر اللہ مرقدہ کی تحقیق ہے یا ترجمۃ الباب قائم کرتے ہیں مگر اس کی تضعیف پر اشارہ کر دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث قسطنطنیہ کی اس روایت پر کیا ہے“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 329 و 330)

تو اس پر عرض ہے کہ صحیح بخاری میں اسی طرح کے اور ابواب بھی ہیں:

بَابُ مَا قِيلَ فِي الزَّلَازِلِ وَالآيَاتِ

بَابُ مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُسْلِمِينَ

بَابُ مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ

بَابُ مَا قِيلَ فِي اللَّحَّامِ وَالجَزَّارِ

بَابُ مَا قِيلَ فِي شَهَادَةِ الزُّورِ

بَابُ مَا قِيلَ فِي دِرْعِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالقَمِيصِ فِي الحَرْبِ

بَابُ مَا قِيلَ فِي لِوَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بَابُ مَا قِيلَ فِي الجَرَسِ وَنَحْوِهِ فِي أَعْنَاقِ الإِبِلِ

تو کیا ان ابواب کے تحت آنے والی تمام احادیث ضعیف ہیں؟ اور امام بخاری نے ان ابواب میں ”قیل“ بصیغہ مجہول لا کر ان کی تضعیف کی طرف اشارہ کیا ہے؟ بات مکمل کرنی چاہیے اور واضح لکھنا چاہئے کہ صحیح بخاری میں ان تمام ابواب کے تحت آنے والی احادیث ضعیف ہیں یا راویوں کی خود ساختہ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے خواہ مخواہ صحیح بخاری کی دو روایات کے درمیان ایک ”خود ساختہ“ تعارض بتا کر حدیث قسطنطنیہ کو ”خود ساختہ“ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اس ”نادر تحقیق“ میں قدیم محدثین، شارحین اور مؤرخین میں سے کوئی بھی ان کا ہمنوا نظر نہیں آتا، شاید ان کا علم حدیث و اصول حدیث ناقص تھا اور لعل شاہ صاحب کا کامل؟

کیا حدیث قسطنطنیہ کی سند محل نظر ہے؟

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے ایک نیا نکتہ تراشا ہے اور زیر عنوان" سند حدیث بھی محل نظر ہے" لکھتے ہیں:

"وجوہ ترجیحہ مذکورہ کے علاوہ بھی عمیر ابن الاسود کی روایت میں کلام ہے کیونکہ آج تک محدثین عمیر ابن الاسود راوی کا حدود اربعہ مشخص نہیں کرسکے۔ محدثین نے اس امر میں اختلاف کیا ہے عمیر ابن الاسود اور عمرو ابن الاسود الگ الگ شخصیتیں ہیں یا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں والراجح التفرقة (فتح الباری ص65 ج6)"۔

اگر عمرو اور عمیر الگ الگ شخصیتیں ہوں تو عمرو ابن الاسود راوی ثقہ ہے اور عمیر ابن الاسود راوی مجہول ہے، کیونکہ اس کا ایک ہی شاگرد خالد ابن معدان ہے، کم از کم دو شاگردوں سے جہالت مرتفع ہوتی ہے عدالت پھر بھی ثابت نہیں ہوتی... (آگے مقدمہ ابن الصلاح کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں)... سارے ذخیرہ احادیث میں عمیر سے اس روایت کے سوا کوئی دوسری روایت مروی نہیں (مگر یہ ایک روایت بھی کوئی تھوڑا کارنامہ نہیں ہے، یزید ابن معاویہ کے لئے جنت کا پروانہ حاصل کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے اور عمیر کے سوا کوئی دوسرا اسے کیسے انجام دے سکتا ہے)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 327 و 328، نیز دیکھیں صفحہ 496)

تبصرہ:

ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ یہاں لعل شاہ صاحب نے بہت بڑا مغالطہ دیا ہے اور انتہائی قسم کی تلبیس سے کام لیا ہے، پہلی بات یہ ہے کہ محدثین اور علماء اسماء الرجال میں ہرگز اس بات میں اختلاف نہیں پایا جاتا کہ "عمرو ابن الاسود اور عمیر ابن الاسود الگ الگ شخصیتیں ہیں یا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں"، بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ "عمرو ابن الاسود اور عمیر ابن الاسود" ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ "عمرو بن الاسود" کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

عمرو بن الأسود العنسي ويقال الهمداني أبو عياض ويقال أبو عبد

الرحمن الدمشقي ويقال الحمصي سكن داريا وهو عمير بن الأسود، روى عن عُمَرَ وابنِ مسعود ومعاذ بن جبل وعبادة بن الصامت والعرباض بن سارية ومعاوية وعبد الله بن عمرو بن العاص وجنادة بن أبي أمية وأبي هريرة وعائشة وأم حرام بنت ملحان وجماعة وعنه ابنه حكيم بن عمير ومجاهد وخالد بن معدان وشريح بن عبيد وكثير بن أبي كثير ونصر بن علقمة وإبراهيم بن مسلم الهجري وزياد بن فياض على خلاف في ذلك وغيرهم ....."۔

عمرو ابن الاسود العنسی، انہیں ہمدانی بھی کہا جاتا ہے (ان کی کنیت) ابو عیاض ہے اور کہا جاتا ہے کہ (کنیت) ابو عبد الرحمن تھی، یہ دمشقی ہیں اور انہیں حمصی بھی کہا جاتا ہے، یہ (دمشق کے قریب) "داریا" نامی جگہ میں سکونت پذیر رہے اور یہی عمیر بن الاسود ہیں، انہوں نے حضرت عمر، ابن مسعود، معاذ بن جبل، عبادۃ بن الصامت، عرباض بن ساریہ، معاویہ، عبداللہ بن عمرو بن العاص، جنادۃ بن ابی امیہ، ابو ہریرۃ، عائشۃ، ام حرام بنت ملحان (رضی اللہ عنہم) اور ان کے علاوہ ایک جماعت سے روایت کی ہے اور ان سے ان کے بیٹے حکیم بن عمیر، مجاہد، خالد بن معدان، شریح بن عبید، کثیر بن ابی کثیر، نصر بن علقمہ، ابراہیم بن مسلم الہجری، زیاد بن فیاض وغیرہ نے روایت کی ہے۔

(تهذيب التهذيب، ج8ص4، دائرة المعارف انڈیا)

اور یہی نہیں بلکہ آگے یہ بھی تصریح کی ہے کہ:

"ومما يؤيد أن عمير بن الأسود هو عمرو بن الأسود ما أخرجه البخاري عن يحيى بن إسحاق بن يزيد والطبراني عن أحمد بن المعلى عن هشام بن عمار كلاهما عن يحيى بن حمزة عن ثور بن يزيد عن خالد بن معدان عن عمير بن الأسود عن أم حرام

الحديث هذه رواية البخاري وفي رواية الطبراني عمرو بن الأسود"۔

(مفہوم) اور اس بات کی تائید کہ عمیر بن الاسود ہی عمرو بن الاسود ہے اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام بخاری اور امام طبرانی دونوں نے یحیی بن حمزة عن ثور بن یزید عن خالد بن معدان عن عمیر بن الأسود عن أم حرام کی سند سے روایت کی ہے، بخاری کی روایت میں (راوی کا نام) "عمیر بن الاسود" ہے جبکہ طبرانی کی روایت میں "عمرو بن الاسود" ہے۔

(تهذيب التهذيب، ج8ص6، دائرة المعارف انڈیا)

واضح رہے کہ ہم اس بحث کے شروع میں حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے مروی اسی زیر بحث روایت کی تخریج مختلف کتب حدیث سے باحوالہ کر آئے ہیں، وہاں ہم نے ہر حوالے کے ساتھ وضاحت کردی ہے کہ کس کتاب میں راوی کا نام "عمرو بن الاسود" مذکور ہے اور کس کتاب میں "عمیر بن الاسود" ہے، جبکہ اس سے نیچے کی سند (یحیی بن حمزة عن ثور بن یزید عن خالد بن معدان) اور روایت کا متن سب کتب میں ایک ہی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ "عمرو بن الاسود" اور "عمیر بن الاسود" ایک ہی راوی ہے۔

نیز یہاں امام طبرانی (م360ھ) کا ذکر آیا ہے تو آپ روایت کی تخریج میں ملاحظہ کر چکے کہ انہوں نے "المعجم الکبیر" (ج25 ص133) میں یہ روایت بیان کرتے ہوئے حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والے راوی کا نام "عمرو بن الاسود" بتایا ہے اور اپنی دوسری کتاب "مسند الشامیین" (ج1 ص257) میں یہی روایت اسی مکمل سند کے ساتھ بیان کرتے ہوئے نام "عمیر بن الاسود" بتایا ہے، یعنی امام طبرانی نے یہ روایت دونوں ناموں سے بیان کی ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی راوی کے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ہی دوسرے مقام پر "عمیر بن الاسود العنسی" کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عمير بن الأسود العنسيّ: بالنون ويقال الهمدانيّ، ويقال عمرو، وهو بالتصغير أشهر، وهو والد حكيم بن عمير، يكنى أبا عياض،

وأبا عبد الرحمن، سكن داريا من دمشق، وسكن حمص أيضا"۔

عمیر بن الاسود عنسی، انہیں ہمدانی بھی کہا جاتا ہے، اور انہی کو عمرو بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ تصغیر (یعنی "عمیر") کے ساتھ زیادہ مشہور ہیں، یہ حکیم بن عمیر کے والد ہیں، ان کی کنیت ابو عیاض اور ابو عبد الرحمن تھی، یہ دمشق کے علاقے داریا میں رہے اور حمص میں بھی رہے۔

(الاصابة في تمييز الصحابة، ج8ص229، دار هجر القاهرة)

اور اسی مقام پر آگے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

وقد روى البخاري عن إسحاق بن يزيد، عن يحيى بن حمزة، عن ثور بن يزيد ، عن خالد بن معدان، عن عمير بن الأسود، عن أم حرام قصة ركوبها للبحر، وأخرجها الطّبرانيّ من طريق هشام بن عمار، عن يحيى بن حمزة بهذا السند، فقال عمرو بن الأسود"۔

(مفہوم) امام بخاری نے "إسحاق بن يزيد، عن يحيى بن حمزة، عن ثور بن يزيد ، عن خالد بن معدان، عن عمير بن الأسود، عن أم حرام" کے طریق سے ان کے سمندری سفر کا قصہ روایت کیا ہے اور یہی قصہ امام طبرانی نے اسی سند کے ساتھ "هشام بن عمار عن يحيى بن حمزة" کے واسطے سے روایت کیا ہے لیکن انہوں نے (عمیر بن الاسود کے بجائے) عمرو بن الاسود کہا ہے۔

(الاصابة في تمييز الصحابة، ج8ص230، دار هجر القاهرة)

لعل شاہ صاحب کے ایک مغالطے کا ازالہ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لعل شاہ صاحب کے ایک مغالطے کا ازالہ بھی کر دیا جائے جو انہوں نے یہ لکھ کر دیا ہے کہ:

"محدثین نے اس امر میں اختلاف کیا ہے عمیر ابن الاسود اور عمرو ابن الاسود الگ الگ شخصیتیں ہیں یا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں والراجح

التفرقة (فتح الباری، ص65 ج6)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 327و328)

یعنی لعل شاہ صاحب یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ محدثین کا اختلاف اس بات میں ہے کہ عمیر بن الاسود اور عمرو بن الاسود ایک ہی شخصیت ہیں یا الگ الگ، اور حافظ ابن حجر نے اسی بارے میں لکھا ہے کہ راجح بات یہ ہے کہ یہ الگ الگ شخصیتیں ہیں، جبکہ حافظ ابن حجر نے یہ بات "عمرو بن الاسود" اور "عمیر بن الاسود" کے الگ الگ ہونے کے بارے میں نہیں کہی، فتح الباری کی مکمل عبارت یہ ہے:

"قَوْلُهُ عُمَيْرُ بْنُ الْأَسْوَدِ الْعَنْسِيُّ بِالنُّونِ وَالْمُهْمَلَةِ وَهُوَ شَامِيٌّ قَدِيمٌ يُقَالُ اسْمُهُ عَمْرٌو وَعُمَيْرٌ بِالتَّصْغِيرِ لَقَبُهُ وَكَانَ عَابِدًا مُخَضْرَمًا وَكَانَ عُمَرُ يُثْنِي عَلَيْهِ وَمَاتَ فِي خِلَافَةِ مُعَاوِيَةَ وَلَيْسَ لَهُ فِي الْبُخَارِيِّ سِوَى هَذَا الْحَدِيثِ عِنْدَ مَنْ يُفَرِّقُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَبِي عِيَاضٍ عَمْرِو بْنِ الْأَسْوَدِ وَالرَّاجِحُ التَّفْرِقَةُ"۔

(مفہوم) عُمير بن الاسود العنسی، یہ پرانے شامی ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کا نام "عمرو" ہے اور "عُمیر" ان کا لقب ہے، یہ عابد گذار اور مخضرم تھے (اصطلاح محدثین میں "مخضرم" اس تابعی کو کہا جاتا ہے جس نے زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام یعنی نبی ﷺ کا زمانہ، دونوں پائے لیکن شرف صحابیت نہ حاصل کر سکے۔ناقل) حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کی تعریف فرمایا کرتے تھے، آپ کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی، ان کی صحیح بخاری میں اس حدیث کے علاوہ کوئی اور حدیث نہیں ان لوگوں کے خیال میں جنہوں نے ان کے درمیان اور "ابوعیاض عمرو بن الاسود" کے درمیان فرق کیا ہے، اور راجح بات یہی ہے کہ ان دونوں (یعنی "ابوعیاض عمرو بن الاسود" اور اس روایت میں جو "عمیر بن الاسود" ہیں) کے درمیان فرق کیا جائے۔

(فتح الباری، ج6ص102، دار هجر القاهرة)

ملاحظہ فرمائیں! اولاً تو یہاں یہ نہیں بیان ہو رہا ہے کہ "عمیر بن الاسود" اور "عمرو بن الاسود" الگ

الگ شخصیتیں ہیں یا ایک ہی شخصیت ہیں، بلکہ یہ بیان ہو رہا ہے کہ بخاری کی اس روایت میں جس راوی کا ذکر ہے انہی کی کنیت "ابوعیاض" ہے یا "ابوعیاض" کنیت والے ان کے ہم نام دوسرے ہیں، تو حافظ ابن حجر بتا رہے ہیں کہ کچھ لوگوں نے "ابوعیاض" کنیت والے راوی کو الگ بتایا ہے اور یہی بات راجح ہے (جبکہ دونوں ثقہ ہی ہیں)۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ بھی "عمرو بن الاسود" کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"عمرو بن الاسود العنسي الداراني الزاهد وهو عمير عن عمر ومعاذ والكبار وعنه ابنه حكيم وخالد بن معدان ومجاهد..."۔

عمرو بن الاسود عنسی دارانی جو زاہد تھے، اور یہی عمیر ہیں، انہوں نے حضرت عمر، حضرت معاذ اور دوسرے کبار صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے روایت کی ہے اور ان سے ان کے بیٹے حکیم اور خالد بن معدان اور مجاہد نے روایت کی ہے۔

(الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة للذهبي، ج 2ص72، دار القبلة جدة)

یہی امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"عَمْرُو بنُ الأَسْوَدِ العَنْسِيُّ وَيُقَالُ لَهُ عُمَيْرُ بنُ الأَسْوَدِ، أَبُو عِيَاضٍ وَيُقَالُ أَبُو عَبْدِ الرَّحْمَنِ الحِمْصِيُّ، نَزِيْلُ دَارِيَّا، أَدْرَكَ الجَاهِلِيَّةَ وَالإِسْلاَمَ، وَكَانَ مِنْ سَادَةِ التَّابِعِيْنَ دِيْناً وَوَرَعاً، حَدَّثَ عَنْ عُمَرَ، وَابْنِ مَسْعُوْدٍ، وَأَبِي الدَّرْدَاءِ، وَعُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِ، وَأُمِّ حَرَامٍ بِنْتِ مِلْحَانَ الشَّهِيْدَةِ، وَالعِرْبَاضِ بنِ سَارِيَةَ، وَغَيْرِهِم. حَدَّثَ عَنْهُ مُجَاهِدٌ، وَخَالِدُ بنُ مَعْدَانَ، وَأَبُو رَاشِدٍ الحُبْرَانِيُّ، وَيُوْنُسُ بنُ سَيْفٍ، قَالَ أَبُو زُرْعَةَ الدِّمَشْقِيُّ، وَأَبُو الحَسَنِ بنُ سُمَيْعٍ عَمْرُو بنُ الأَسْوَدِ هُوَ عُمَيْرٌ، يُكْنَى أَبَا عِيَاضٍ"۔

(خلاصہ) عمرو بن الاسود عنسی، انہی کو عمیر بن الاسود کہا جاتا ہے، ان کی کنیت ابوعیاض ہے اور

ابوعبدالرحمن بھی بتائی جاتی ہے، حمص کے رہنے والے تھے اور داریا میں جا کر بس گئے، انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے پائے ہیں، ان کا شمار دین اور تقویٰ کے اعتبار سے بڑے تابعین میں ہوتا ہے، انہوں نے (حضرات صحابہ) عمر، ابن مسعود، ابوالدرداء، عبادہ بن صامت، ام حرام بنت ملحان شہیدہ، عرباض بن ساریہ وغیرہم (رضی اللہ عنہم) سے روایت بیان کی ہے، اور ان سے مجاہد، خالد بن معدان، ابوراشد حُبرانی اور یونس بن سیف روایت کرتے ہیں۔

(سير اعلام النبلاء، ج 4ص79، مؤسسة الرسالة بيروت)

نوٹ: "داریا" دمشق کے مضافات میں (تقریباً آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر) ایک قصبہ کا نام ہے۔(معجم البلدان للياقوت الحموي، ج2ص431، دار صادر بيروت)۔

الغرض! لعل شاہ صاحب نے جو مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ "عمرو بن الاسود راوی ثقہ ہے اور عُمير بن الاسود راوی مجہول ہے" یہ نرا مغالطہ ہی ہے، اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ مغالطہ دے رہے ہیں اس لئے انہوں نے یہ لکھ دیا کہ:

"بعض محدثین نے اس بنا پر کہ عمرو اور عمیر ایک شخصیت کے دو نام ہیں بعض روایات میں اسماء رد و بدل کر دیے ہیں جیسا کہ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ہشیار رہیں کہیں مغالطہ میں مبتلا نہ ہو جائیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 329)

ملاحظہ فرمائیں! لعل شاہ صاحب کس طرح اپنے مغالطے بلکہ تلبیس پر پردہ ڈالنے کے لئے محدثین اور علماء اسماء الرجال پر مغالطہ میں مبتلا ہونے یا مغالطہ دینے کا الزام لگا رہے ہیں، یعنی امام بخاری، امام ابن ابی عاصم، امام ابوبکر الآجری، امام طبرانی، امام حاکم، امام ابونعیم اصفہانی، امام ابوبکر بیہقی، امام بغوی، حافظ ابن حجر اور امام ذہبی (رحمہم اللہ) جیسے ائمہ محدثین کو تو غلطی لگ گئی اور وہ ناموں میں رد و بدل کر بیٹھے اور پندرھویں صدی ہجری کے "محدث اعظم واہ کینٹ" کو تو مغالطہ لگ ہی نہیں سکتا۔ يا للعجب۔

آخر میں عرض ہے کہ اگر بالفرض لعل شاہ صاحب کے اس شوشے کو ایک لمحے کے لئے درست بھی تسلیم کر لیا جائے کہ "عمیر بن الاسود مجہول راوی ہے" تو اس روایت کی تخریج میں ہم متعدد کتب کے حوالے نقل

کرآئے ہیں جہاں راوی کا نام "عمرو بن الاسود" ہے، اور لعل شاہ صاحب خود تسلیم کرچکے کہ "عمرو بن الاسود ثقہ ہے"۔ تو ان روایات کو لعل شاہ صاحب کس بنیاد پر رد کریں گے؟

کیا سارے ذخیرۂ حدیث میں "عمیر بن الاسود" سے کوئی دوسری روایت مروی نہیں؟

لعل شاہ صاحب نے "جوش مغالطہ دہی" میں یہ دعویٰ بھی کردیا ہے کہ:

"سارے ذخیرۂ احادیث میں عُمیر (یعنی "عُمیر بن الاسود"۔ ناقل) سے اس روایت کے سوا کوئی دوسری روایت مروی نہیں (مگر یہ ایک روایت بھی کوئی تھوڑا کارنامہ نہیں ہے، یزید ابن معاویہ کے لئے جنت کا پروانہ حاصل کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے اور عُمیر کے سوا کوئی دوسرا اسے کیسے انجام دے سکتا ہے)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 328)

اور اس سے پہلے وہ یہ لکھ آئے ہیں کہ:

"عمیر بن الاسود راوی مجہول ہے کیونکہ اس کا ایک ہی شاگرد خالد ابن معدان ہے، کم از کم دو شاگردوں سے جہالت مرتفع ہوتی ہے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 328)

تو لعل شاہ صاحب کے اس دعوے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جیسے انہوں نے سارے ذخیرۂ حدیث کا مطالعہ کررکھا ہے، ورنہ وہ اتنی قطعیت اور جزم کے ساتھ ایسا دعویٰ نہ کرتے، اب آئیے دیکھتے ہیں کیا واقعی "عمیر بن الاسود" سے اس روایت کے سوا کوئی اور روایت مروی نہیں؟ اور کیا ان سے روایت کرنے والا صرف ایک ہی شاگرد" خالد بن معدان" ہی ہے، اس کے علاوہ ان کا کوئی شاگرد نہیں؟

سنن ابن ماجہ کی ایک روایت ہے:

"حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمْزَةَ، قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَلْقَمَةَ نَصْرُ بْنُ عَلْقَمَةَ، عَنْ عُمَيْرِ بْنِ الْأَسْوَدِ، وَكَثِيرِ بْنِ مُرَّةَ

الْحَضْرَمِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ: لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي قَوَّامَةً عَلَى أَمْرِ اللَّهِ، لَا يَضُرُّهَا مَنْ خَالَفَهَا "۔

نصر بن علقمہ عمیر بن الاسود اور کثیر بن مرۃ حضرمی سے اور وہ دونوں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم (یعنی دین) پر قائم رہے گی، انہیں کسی کی مخالفت کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

(سنن ابن ماجه، باب اتباع سنة رسول الله، ج1ص5،دار احياء الكتب العربية)

غور کریں! مندرجہ بالا روایت میں "عمیر بن الاسود" اور "کثیر بن مرۃ حضرمی" سے روایت کرنے والے راوی کا نام "ابو علقمہ نصر بن علقمہ" مذکور ہے اور وہ دونوں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں (یعنی یہاں "خالد بن معدان" کے علاوہ دوسرا شاگرد ہے) جبکہ "چودھویں صدی کے محدث اعظم" لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"عمیر بن الاسود راوی مجہول ہے کیونکہ اس کا ایک ہی شاگرد خالد ابن معدان ہے، کم از کم دو شاگردوں سے جہالت مرتفع ہوتی ہے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 328)

اسی طرح امام طبرانی نے "مسند الشامیین" میں ایک روایت نقل کی ہے:

" حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَمْزَةَ، حَدَّثَنِي أَبِي، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ ثَوْرِ بْنِ يَزِيدَ، عَنْ يُونُسَ بْنِ سَيْفٍ، عَنْ عُمَيْرِ بْنِ الْأَسْوَدِ، أَنَّهُ سَأَلَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مِنْ أَيْنَ أُهِلُّ؟ قَالَ: مِنْ حَيْثُ أَهَلَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ "۔

یونس بن سیف، عمیر بن الاسود سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ میں (حج یا عمرہ کے لئے) تلبیہ کہاں سے پکاروں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جہاں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تلبیہ پکاری تھی، یعنی ذوالحلیفہ (کے میقات) سے۔

(مسند الشاميين للطبراني،ج1ص281)

اس روایت میں" عمیر بن الاسود" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کررہے ہیں اور ان سے روایت کرنے والے کا نام " یونس بن سیف" مذکور ہے۔ یہ تیسرا شاگرد ہوگیا۔

یہ دو روایتیں ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہیں جن میں " عُمیر بن الاسود" کے خالد بن معدان کے علاوہ مزید دو شاگرد اُن سے روایت کررہے ہیں، اور وہ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے کبار صحابہ سے روایت کررہے ہیں اور ان روایات میں ان کا نام بھی "عُمیر بن الاسود" مذکور ہے، جب کہ لعل شاہ صاحب نے ان پر یہ طنز بھی کیا ہے کہ:

" اور تعجب ہے کہ عُمیر کو بھی زندگی بھر کوئی مرد استاد نہ مل سکا کہ بالآخر عبادہ ابن الصامت کے حرم سرائے میں داخل ہو کر حضرت ام حرام سے سند فراغت حاصل کی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 328)

حیرت ہے کہ تعصب اور عناد کے اثر کی وجہ سے " محدث واہ کینٹ" کی نظر سے حدیث کی مشہور کتاب "سنن ابن ماجہ" کی روایت بھی نہیں گزری اور دعویٰ وہ کررہے ہیں سارے ذخیرۂ حدیث کو چھاننے کا؟ نیز ان کی نظر سے کتب اسماء الرجال میں " عُمیر بن الاسود" کا تعارف بھی نہیں گذرا جس میں ان لوگوں کے نام لکھے ہیں جن سے " عمیر بن الاسود" روایت کرتے ہیں اور ان کے نام بھی مذکور ہیں جو اُن سے روایت کرتے ہیں۔

لعل شاہ صاحب کا جلیل القدر تابعی پر طنز

لعل شاہ صاحب نے جلیل القدر تابعی " عمیر بن الاسود" پر یہ طنز بھی کیا ہے کہ:

" یزید کے لئے جنت کا پروانہ حاصل کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ عُمیر کے سوا کوئی دوسرا کیسے انجام دے سکتا تھا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 328)

نوٹ: " عمیر بن الاسود" کو لعل شاہ صاحب نے " تابعی المخضرم" تسلیم کیا ہے (دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 324 اور صفحہ 496)۔

تو اس پر عرض ہے کہ اولاً تو اس طنز میں لعل شاہ صاحب یہ اقرار کررہے ہیں کہ صحیح بخاری کی یہ زیر

بحث روایت اگر صحیح ہو تو اس سے یزید کے لئے جنت کا پروانہ حاصل ہوتا ہے، ورنہ اسے "عُمیر بن الاسود" کا کارنامہ کہنے کا کیا مطلب؟

ثانیاً عرض ہے کہ کیا جنت و جہنم کے پروانے دینے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے لعل شاہ صاحب کو دے رکھا ہے جو وہ فیصلہ کیے بیٹھے ہیں کہ یزید جنت میں نہیں جاسکتا اور اس کے لئے انہیں صحیح بخاری کی حدیث کو "خود ساختہ" ثابت کرنے پر ورق سیاہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے؟ یا لعل شاہ صاحب کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ کسی مسلمان کو جنت میں جانے سے روک سکتے ہیں؟

ثالثاً عرض ہے کہ تمام محدثین، شارحین اور مؤرخین کے برعکس صحیح بخاری کی اس زیر بحث روایت کو "راوی کی خود ساختہ" بتانا یہ بھی ایک کارنامہ بلکہ عظیم جسارت ہے اور یہ کارنامہ سید لعل شاہ صاحب بخاری (محدثِ واہ کینٹ) کے سوا بھلا کون انجام دے سکتا تھا؟

لیکن اس پر بھی لعل شاہ صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا، آگے بالکل منکرین حدیث جیسا انداز اپناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تعجب ہے کہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کو اٹھارہ برس کی طویل مدت میں ایک نامحرم شخص (یعنی عمیر بن الاسود۔ناقل) کے سوا کوئی تلمیذ رشید نہ مل سکا کہ اسے (اول جیش یغزون مدینۃ قیصر) کی روایت بیان کرکے عہدہ برآ ہو جائیں، اور تعجب ہے کہ عمیر کو بھی زندگی بھر کوئی مرد استاد نہ مل سکا کہ بالآخر عبادہ ابن الصامت کے حرم سرائے میں داخل ہو کر حضرت ام حرام سے سند فراغت حاصل کی انا للہ وانا الیہ راجعون"۔
>
> (استخلاف یزید، صفحہ 328و329)

لعل شاہ صاحب کے اس انداز بیاں پر ہم بھی "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" ہی پڑھ سکتے ہیں، انہوں نے تو منکرین حدیث کا کام ہی آسان کر دیا، وہ بھی کئی احادیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ صرف فلاں ایک صحابی سے مروی ہے، کیا نبی کریم ﷺ نے اتنے سالوں میں صرف اس ایک صحابی سے ہی یہ بات بیان کی تھی؟

یہاں ہم صحیح بخاری کی سب سے پہلی حدیث "انما الاعمال بالنیات" کی مثال دیتے ہیں، یہ

حدیث صرف ایک صحابی سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، صحیح بخاری میں اس کی سند یوں ہے:

"حَدَّثَنَا الحُمَيْدِيُّ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الزُّبَيْرِ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الأَنْصَارِيُّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ، أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ، يَقُولُ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى المِنْبَرِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.... الحديث"۔

(صحيح البخارى، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم)

جیسا کہ بیان ہوا، یہ حدیث صرف ایک صحابی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، اور بیان بھی برسر منبر کرتے ہیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صرف ایک راوی علقمہ بیان کرتے ہیں اور علقمہ سے بھی صرف محمد بن ابراہیم اور ان سے آگے بھی صرف یحییٰ بن سعید الانصاری بیان کرتے ہیں ان سے آگے متعدد لوگ بیان کرتے ہیں۔

شارح بخاری امام احمد بن محمد بن ابی بکر القسطلانی رحمۃ اللہ علیہ (م 923ھ) اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وهذا الحديث أحد الأحاديث التي عليها مدار الإسلام، قال أبو داود: يكفي الإنسان لدينه أربعة أحاديث "الأعمال بالنيات"..........وقال الشافعي وأحمد إنه يدخل فيه ثلث العلم.."۔

(خلاصہ) یہ حدیث ان احادیث میں سے ایک ہے جن پر اسلام کا دارومدار ہے، امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ انسان کو اپنے دین سے متعلق چار حدیثیں ہی کافی ہیں (ان میں سے ایک انما الاعمال بالنیات ہے).... امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس حدیث میں علم کا ایک تہائی حصہ پایا جاتا ہے۔

(ارشاد الساري لشرح صحيح البخاري، ج1ص56، مصر)

اب اگر کوئی سوال کرے کہ اتنی اہم حدیث جس کے بارے میں امام قسطلانی نے لکھا کہ یہ ان احادیث میں سے ہے جن پر اسلام کا مدار ہے، وہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایک صحابی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بتائی؟ اور پھر روایت کے مطابق راوی علقمہ بن وقاص اللیثی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث تب سنی جب آپ نے برسر منبر بیان فرمائی، جس کا مطلب ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جمعہ وغیرہ کا کوئی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور سامعین میں کئی لوگ تھے، پھر کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ پورے ذخیرۂ حدیث میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے آگے روایت کرنے والے صرف ایک راوی علقمہ بن وقاص ہی ہیں، اور تعجب در تعجب یہ ہے کہ علقمہ نے بھی یہ حدیث اپنے صرف ایک شاگرد محمد بن ابراہیم تیمی کو سنائی، اور پھر محمد بن ابراہیم نے بھی صرف ایک شاگرد یحییٰ بن سعید انصاری کو سنائی، تو ہمیں نہیں معلوم کہ لعل شاہ صاحب اس کا کیا جواب دے پاتے؟ ممکن ہے وہ اس حدیث کو بھی "راوی کی خود ساختہ" ہی قرار دے دیتے۔

الغرض! بتانا یہ مقصود ہے کہ ضروری نہیں کہ اگر کوئی حدیث سننے والے متعدد لوگ ہیں تو آگے بیان بھی وہ سب کے سب کریں، یا اگر بہت سوں نے بیان کی ہے تو ضروری نہیں کہ ان سب کی روایات بھی محدثین ضبط تحریر میں لے آئے ہوں، محدث کا کام یہ ہے کہ اسے جس سند سے کوئی حدیث پہنچی اس نے کتاب میں اسی سند کے ساتھ ذکر کر دی، اس سے یہ قطعی نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ وہ حدیث محدث کی بیان کردہ سند میں مذکور صحابی یا تابعی کے علاوہ کسی دوسرے صحابی یا تابعی نے سنی ہی نہیں تھی ورنہ وہ سب لوگ ضرور بیان کرتے اور ان سب کی روایات محدثین تک پہنچتیں بھی اور پھر وہ یہ سب روایات نقل بھی کرتے؟

رہا لعل شاہ صاحب کا یہ طنز کہ "حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کو ایک نامحرم شخص کے سوا کوئی تلمیذ نہ مل سکا" تو ہم پہلے اس حدیث کی تخریج میں "سنن ابی داؤد" اور "مسند حمیدی" وغیرہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کر چکے ہیں جس میں حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے "یعلیٰ بن شداد" نامی راوی روایت کر رہے ہیں، اور جو روایت کے الفاظ ہیں وہ ان کے سوا کوئی دوسرا راوی نہیں بیان کرتا، تو کیا یہاں بھی ایسا ہی طنز کیا جائے گا؟

لعل شاہ صاحب کی ایک اور لاعلمی یا غلط بیانی

اور تو اور، لعل شاہ صاحب کو صحیح بخاری کی اس روایت پر اتنا غصہ ہے کہ وہ بار بار یہ غلط بیانی کرتے ہیں کہ:

"عمیر بن الاسود کی روایت کو امام بخاری کے سوا کسی محدث نے روایت نہیں کیا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 325)

نیز لکھتے ہیں:

"کسی محدث نے اس روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دینے کا حوصلہ نہیں کیا نہ جانے امام بخاری کے دربار میں یہ کیسے بار پا گئی.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 328)

جبکہ ہم گزشتہ صفحات میں باحوالہ ان کتب حدیث کے نام ذکر کر آئے ہیں جن میں یہی روایت موجود ہے جو "محدث واہ کینٹ" کے اس دعوے کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ" گر نہ بیند بروز شپرہ چشم، چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟ "مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دن کی روشنی میں بھی چمگادڑ کی طرح دیکھنے سے قاصر ہے تو اس میں سورج کی روشنی کا کیا قصور ہے؟

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ اور لعل شاہ صاحب کی تلبیس

لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

" امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں کہیں بھی اس روایت (یعنی حدیث قسطنطنیہ۔ناقل) کا حوالہ دیا، اس راوی (یعنی "عُمیر بن الاسود" ۔ناقل) کو ابن عمر کے نام سے ذکر کیا ہے، خدا جانے ماجرا کیا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 329)

جبکہ واقعہ یوں ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہرگز تابعی "عمیر بن الاسود" کو" ابن عمر" نہیں لکھا بلکہ انہوں نے سہواً یہ لکھ دیا ہے کہ یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے واسطے

سے مروی ہے، اس لئے انہوں نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے غلطی سے "عن ابن عمر" لکھ دیا (جبکہ اس حدیث کو بیان کرنے والی صحابیہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا ہیں)، اور یہ ایک عام فہم بات ہے کہ فرمان رسول ﷺ کا حوالہ دیتے ہوئے عام طور پر یوں ہی کہا جاتا ہے کہ" فلاں صحابی سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یوں فرمایا"۔ یعنی صحابی کا نام لے کر حدیث بیان کر دی جاتی ہے، اس لئے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے راوی یعنی صحابی کا نام غلطی سے" ام حرام" کے بجائے" ابن عمر" لکھ دیا (یا کاتب کی غلطی سے یوں لکھا گیا)۔ لیکن" محدث واہ کینٹ" کی تلبیس ملاحظہ فرمائیں کہ وہ یہ تاثر دے رہے ہیں کہ جیسے حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحابی سے نچلے راوی" عمیر بن الاسود" کا نام" ابن عمر" لکھا ہے۔ بہرحال! یہ حافظ ابن تیمیہ کا صحابی کے نام میں سہو اور نسیان ہے، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ثابت شدہ ہے (جس کے حوالے ہم پہلے نقل کر آئے ہیں) کہ حافظ ابن تیمیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور صاف لکھا ہے کہ" قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا سب سے پہلا لشکر وہی تھا جو یزید کی سرکردگی میں گیا تھا"۔

صحیح بخاری کی روایت کے مخفی گوشے جو روشن نہ کیے جا سکے

آگے" محدث واہ کینٹ" لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ :

" صحیح بخاری کی اس روایت کے کچھ اور مخفی گوشوں کو روشنی میں لانے کی ضرورت تھی مگر :

بخاری کے ادب سے کی بخاری نے نہ غوّاصی
وگرنہ اس سمندر میں بہت تھے لولوئے لالاً

(استخلاف یزید، صفحہ 330)

تو چونکہ" امام بخاری صغیر" سید لعل شاہ صاحب نے بڑے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ادب کے پیش نظر مزید غوّاصی نہیں کی جس کی وجہ سے دنیا نہ جانے کتنے علمی و تحقیقی جواہر پاروں سے محروم رہ گئی (جس کے کچھ نمونے آپ دیکھ چکے) اس لئے ہم بھی آگے چلتے ہیں۔

لعل شاہ صاحب بخاری اور چودھری غلام احمد پرویز بٹالوی

صحیح بخاری کی زیر بحث روایت (حدیث قسطنطنیہ) کو خود ساختہ ثابت کرنے کے لئے لعل شاہ

صاحب پہلے تو اس حدیث سے یزید کی مغفرت کی بشارت کا ذکر کرنے والوں کو (جس میں امام مہلب اور حافظ ابن کثیر بھی آتے ہیں) "بے راہ روی" اور "کج روی" کا طعنہ دیتے ہیں اور پھر یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ اس روایت سے جنت اور مغفرت کی بشارت نکالنے کی وجہ سے منکرین حدیث کے لئے انکار حدیث کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔اور دلیل کے طور پر غلام احمد پرویز کی کتاب "قرآنی فیصلے، صفحہ 157" کی درج ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:

"اگر تاریخ کا اس سے زیادہ دلچسپ واقعہ سننا ہو تو وہ بھی سن لیجئے، بخاری شریف میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا وہ بخشا جائے گا اوّل جیش یغزون مدینة قیصر مغفور لھم۔صحیح بخاری ص 410۔اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس کے ایک دستہ کا سالار یزید ابن معاویہ تھا، فرماتے ہیں کہ واقعہ کربلا، بخاری شریف کی بشارت جنت اور قسطنطنیہ پر لشکر کشی کے تاریخی بیانات میں آپ تطبیق کی کون سی صورت پیدا کریں گے، اگر آپ اس کی کوئی صورت پیدا کر بھی لیں تو ان لوگوں سے پوچھئے کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں جو ایک طرف بخاری شریف کو دین تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف یزید پر لعنت بھیجنے کو جزو عقیدہ قرار دیتے ہیں...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 351و352)

پھر لعل شاہ صاحب نے پرویز کی اس بات پر اپنا تبصرہ یوں کیا ہے کہ:

"راقم السطور نے جب پہلی بار قرآنی فیصلے کی مندرجہ بالا عبارت پڑھی پھر حدیث قسطنطنیہ دیکھی، حاشیہ بخاری کا مطالعہ کیا، حضرت مولانا احمد علی المحدث السہارنپوری کی تحریر کی روشنی میں اپنے ہاتھ سے مندرجہ ذیل نوٹ لکھا:۔

تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ایجاب اور غفران کے معانی میں فرق ہے، ایجاب بلاشبہ یقینی ہے اور غفران شرائط مغفرت کے ساتھ مشروط اور معلق ہے یا پہلے گناہوں سے متعلق ہے"۔

پھر محشی موصوف علیہ الرحمۃ کے ایک اور حاشیہ سے رہنمائی حاصل کی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

وقد حدّث عنها انس هذا الحديث باتمّ من هذا السياق (حاشیہ صحیح بخاری، ص409) کہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے یہی حدیث علی وجہ الاتم والاکمل بیان کی ہے"

پس میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت دیکھی، اول نگاہ میں معلوم کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں اور یہی روایت اصل اور محکم ہے اور عمیر بن الاسود کی روایت کے الفاظ اس کے طبع زاد ہیں، پس حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کو چھوڑ کر عمیر کی روایت کے درپے ہونا فاما الذين في قلوبهم زيغ کے زمرہ میں داخل ہونے کے مترادف ہے.. "۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 352 و353)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب نے اپنی طرف سے غلام احمد پرویز کے اعتراض کا جواب یوں دے دیا ہے کہ صحیح بخاری کی عمیر بن الاسود والی روایت "طبع زاد" ہے اور اس روایت کو وہی لوگ صحیح سمجھتے ہیں کہ جن کے دلوں میں کجی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو پرویز کا اعتراض تو پھر بھی باقی رہے گا، کیونکہ عمیر بن الاسود والی حدیث بھی تو بخاری میں ہی ہے، لعل شاہ صاحب اسے بخاری سے باہر تو نہیں نکال سکے، اور اگر مزید غور کیا جائے تو لعل شاہ صاحب حضرت انس رضی اللہ عنہ والی روایت کو محکم کہہ کر اور عمیر کی حدیث کو طبع زاد (یا "خود ساختہ") کہہ کر الٹا چودھری غلام احمد پرویز کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں، وہ بھی یہی کہتا ہے کہ حدیث طبع زاد ہے، لعل شاہ صاحب نے کون سا جواب اسے دیا؟ پھر پرویز تو اور بھی بہت سی احادیث میں ایسے فرضی تضادات دکھا کر حدیث کے انکار کے لئے راہ ہموار کرتا ہے تو کیا ان سب احادیث کو "طبع زاد" کہہ کر ان کا انکار کر دیا جائے؟

پھر "محدث واہ کینٹ" اور "بخاری صغیر" سید لعل شاہ صاحب کو تو "اول نگاہ" میں معلوم ہو گیا کہ عمیر بن الاسود والی روایت کے الفاظ راوی کے طبع زاد ہیں، لیکن ان تمام محدثین و شارحین اور مؤرخین کا کیا کرنا ہے جنہوں نے عمیر بن الاسود والی حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ یزید کی سرکردگی میں ہی ہوا تھا؟ (جن کے حوالے پہلے نقل ہو چکے) اور (بقول لعل شاہ صاحب) اس حدیث سے

جنت یا مغفرت کی بشارت نکالنے والے (جیسے محدث "المهلب" اور "حافظ ابن کثیر") اگر کج روی اور بے راہ روی کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو مختلف تاویلات کا سہارا لے کر ان کی بات سے اختلاف کرنے اور (بقول پرویز) یزید پر لعنت بھیجنے کو جزوعقیدہ سمجھنے والوں کی "سلامت روی" پر کون سی وحی الہٰی موجود ہے؟ ان کو کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کسی مسلمان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ فیصلے کریں کہ اس کی مغفرت ہو ہی نہیں سکتی اور پھر خواہ مخواہ حدیث شریف میں بے جا اور دُور از کار تاویلات کریں یا اپنی طرف سے اسے مشروط و مقید کریں؟

جبکہ خود لعل صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

"اللہ رب العزت اگر اپنی رحمت سے یزید کی مغفرت فرما کر اسے جنت میں جا گزیں فرمائے تو نہ اس کی رحمت میں کچھ قصور ہے اور نہ اس کی جنت میں کچھ ضیق اور تنگی ہے، اس کی رحمت غیر محدود اور جنت بے حد وسیع ہے وہ غفور رحیم بھی ہے اور فعال لما یرید بھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 317)

کیا یزید، قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے پہلے لشکر میں شامل نہیں تھا؟

صحیح بخاری کی حدیث پر "عمل جراحی" کرنے کے بعد لعل شاہ صاحب دوسرے مقدمے کی طرف آئے ہیں، چنانچہ تمام مؤرخین کے برعکس یہاں بھی ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے جس لشکر کا سالار یزید تھا وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا پہلا نہیں بلکہ آخری لشکر تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"مسلم ہے کہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے اس لشکر کا سالار تھا جس میں سیدنا ابو ایوب الانصاری شریک تھے مگر وہ اول جیش نہیں تھا، وہ دور خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا آخری جیش تھا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 330)

پھر آگے لکھتے ہیں کہ:

"نیز روایات میں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ جس جیش میں حضرت ابوایوب شریک تھے اس کا سالار کون تھا، ابو داؤد میں دو روایتیں ہیں جن میں تصریح ہے کہ جس لشکر میں حضرت ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ تھے اس کا سالار عبدالرحمن ابن خالد بن ولید تھا..."

(استخلاف یزید، صفحہ 330و331)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے سنن ابی داؤد سے دو روایتوں کا حوالہ دیا ہے، آئیے پہلے وہ دو روایتیں دیکھتے ہیں:

<u>سنن ابی داؤد کی پہلی روایت:</u>

"حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ السَّرْحِ، حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ، عَنْ حَيْوَةَ بْنِ شُرَيْحٍ، وَابْنِ لَهِيعَةَ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ، عَنْ أَسْلَمَ أَبِي عِمْرَانَ قَالَ: غَزَوْنَا مِنَ الْمَدِينَةِ نُرِيدُ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَعَلَى الْجَمَاعَةِ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ، وَالرُّومُ مُلْصِقُو ظُهُورِهِمْ بِحَائِطِ الْمَدِينَةِ، فَحَمَلَ رَجُلٌ عَلَى الْعَدُوِّ، فَقَالَ النَّاسُ: مَهْ مَهْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، يُلْقِي بِيَدَيْهِ إِلَى التَّهْلُكَةِ، فَقَالَ أَبُو أَيُّوبَ: إِنَّمَا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ فِينَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ لَمَّا نَصَرَ اللَّهُ نَبِيَّهُ، وَأَظْهَرَ الْإِسْلَامَ قُلْنَا: هَلُمَّ نُقِيمُ فِي أَمْوَالِنَا وَنُصْلِحُهَا، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ- فَالْإِلْقَاءُ بِالْأَيْدِي إِلَى التَّهْلُكَةِ أَنْ نُقِيمَ فِي أَمْوَالِنَا وَنُصْلِحَهَا وَنَدَعَ الْجِهَادَ، قَالَ أَبُو عِمْرَانَ: فَلَمْ يَزَلْ أَبُو أَيُّوبَ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى دُفِنَ بِالْقُسْطَنْطِينِيَّةِ"۔

(سنن ابي داؤد، ج4ص166، بتحقيق شعيب الارنؤوط، دار الرسالة دمشق)

اسلم ابوعمران روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ مدینہ منورہ سے جہاد کے لئے روانہ ہوئے، ہم قسطنطنیہ جانا چاہتے تھے اور عبدالرحمن بن خالد بن ولید ہمارے امیر جماعت تھے، رومی لوگ

اپنی پشت شہر کی فصیل کی طرف کیے (ہمارے مدمقابل تھے)، مسلمانوں میں سے ایک شخص نے دشمن پر حملہ بول دیا تو لوگوں نے کہا: رکو، ٹھہرو! لاالہ الا اللہ یہ شخص اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے تو حضرت ابو ایوب انصاری ؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہم انصار ہی کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی نصرت فرمائی اور اسلام کو غالب کر دیا تو ہم نے کہا: چلو اب ذرا اپنے اموال و جائیداد میں رک جائیں اور ان کو درست کر لیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ ہلاکت میں ڈالنا یہ تھا کہ ہم اپنے مالوں میں رک جائیں، ان کی اصلاح میں مشغول ہو جائیں اور جہاد چھوڑ دیں۔ ابو عمران کہتے ہیں: چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری (ؓ) اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں مدفون ہوئے۔

سنن ابی داؤد کی دوسری روایت:

"حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ، قَالَ:حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ وَهْبٍ، قَالَ:أَخْبَرَنِي عَمْرُو بْنُ الْحَارِثِ، عَنْ بُكَيْرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْأَشَجِّ، عَنِ ابْنِ تِعْلَى، قَالَ: غَزَوْنَا مَعَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ، فَأُتِيَ بِأَرْبَعَةِ أَعْلَاجٍ مِنَ الْعَدُوِّ فَأَمَرَ بِهِمْ فَقُتِلُوا صَبْرًا. قَالَ أَبُو دَاوُدَ:قَالَ لَنَا غَيْرُ سَعِيدٍ، عَنِ ابْنِ وَهْبٍ، فِي هَذَا الْحَدِيثِ قَالَ: بِالنَّبْلِ صَبْرًا. فَبَلَغَ ذَلِكَ أَبَا أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيَّ فَقَالَ :سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَى عَنْ قَتْلِ الصَّبْرِ. فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ كَانَتْ دَجَاجَةٌ مَا صَبَرْتُهَا. فَبَلَغَ ذَلِكَ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ فَأَعْتَقَ أَرْبَعَ رِقَابٍ"۔

(سنن ابي داؤد،ج4ص323،بتحقيق شعيب الارنؤوط، دار الرسالة دمشق)

(مفہوم از لعل شاہ صاحب) عبد الرحمن بن ابی یعلیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے عبد الرحمن ابن الخالد کی معیت میں جہاد کیا پس دشمن کے چار قوی مرد گرفتار کر کے لائے گئے پس عبد الرحمن ابن

خالد کے حکم سے قتل کیئے گئے، حضرت ابوایوب الانصاری کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ كَانَتْ دَجَاجَةٌ مَاصَبَرْتُهَا۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مرغی بھی ہوتی تو میں اسے صبراً قتل نہ کرتا پس حضرت عبدالرحمن نے چار غلام آزاد کروائے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 331و332)

تنبیہ

لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ" عبدالرحمن بن یعلیٰ روایت کرتے ہیں" جبکہ اس روایت میں" ابن تِعلیٰ"(عبید بن تِعلیٰ) ہے، اگر کسی نسخے میں" عبدالرحمن بن یعلیٰ"لکھا گیا ہے تو وہ درست نہیں۔

الغرض! لعل شاہ صاحب سنن ابی داوٗد کی مندرجہ بالا دو روایات کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ:

"ابو داوٗد کی یہ روایتیں نہایت واضح اور قاطع ہیں کہ جس لشکر میں حضرت ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ تھے اس کے سالار عبدالرحمن ابن خالد تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 332)

تبصرہ

اگر بات کو خواہ مخواہ الجھانا مقصود ہو تو الگ بات ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سنن ابی داوٗد کی پہلی روایت میں عبدالرحمن بن خالد بن ولید کو اس جماعت کا امیر بتایا گیا ہے جو جماعت مدینہ منورہ سے نکلی تھی، چنانچہ اس روایت کے الفاظ ہیں "غَزَوْنَا مِنَ الْمَدِينَةِ نُرِيدُ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَعَلَى الْجَمَاعَةِ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ" کہ ہم لوگ مدینہ سے جہاد کے لئے روانہ ہوئے، ہمارا ارادہ قسطنطنیہ جانے کا تھا اور عبدالرحمن بن خالد بن ولید ہمارے امیر جماعت تھے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحمن بن خالد صرف اس جماعت کے امیر تھے جو مدینے سے روانہ ہوئی تھی، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اسی روایت کے دوسرے طرق میں دیگر علاقوں سے آنے والی جماعتوں کے ساتھ ان کے امیر کا بھی ذکر ہے، چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں:

"أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَاتِمٍ، أَخْبَرَنَا حِبَّانُ، أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ، عَنْ

حَيْوَةَ، أَخْبَرَنِي يَزِيدُ بْنُ أَبِي حَبِيبٍ، حَدَّثَنَا أَسْلَمُ أَبُو عِمْرَانَ، قَالَ: كُنَّا بِالْقُسْطَنْطِينَةِ، وَعَلَى أَهْلِ مِصْرَ عُقْبَةُ بْنُ عَامِرٍ، وَعَلَى أَهْلِ الشَّامِ فَضَالَةُ بْنُ عُبَيْدٍ....الی آخر الروایة"۔

اسلم ابوعمران بیان کرتے ہیں کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے اور اہل مصر کے امیر عقبہ بن عامر تھے اور اہل شام کے امیر فضالہ بن عبید تھے...۔

(السنن الكبرى للنسائي، ج10ص28، مؤسسة الرسالة بيروت ،وسنده صحيح)

ملاحظہ فرمائیں! اس روایت میں اہل مصر کی جماعت کا امیر عقبہ بن عامر اور اہل شام کی جماعت کا امیر فضالہ بن عبید انصاری کو بتلایا گیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ جس طرح اہل مصر کی جماعت کے لئے اور اہل شام کی جماعت کے لئے ایک ایک امیر بنایا گیا، ٹھیک اسی طرح مدینے سے نکلنے والی جماعت کے لئے کوئی امیر ہونا چاہئے اور وہ عبدالرحمن بن خالد بن ولید ہی تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ سنن ابی داوٗد کی روایت میں عبدالرحمن بن خالد کی جس امارت کا ذکر ہے وہ ذیلی امارت تھی اور اس کا تعلق خاص اہل مدینہ ہی سے تھا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پورے لشکر کے امیر تھے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر عبدالرحمن بن خالد پورے لشکر کے عمومی امیر تھے تو ان کا تذکرہ صرف اہل مدینہ کی جماعت کے ساتھ کیوں ہوا؟ اور جس روایت میں اہل مصر اور اہل شام کی بات آئی تو ان کے ساتھ ان کا ذکر کیوں نہ کیا گیا؟ کیا یہ ان کے امیر نہیں تھے؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر اہل مدینہ کے ذکر کے ساتھ ان کا بھی ذکر کیا گیا کیونکہ یہ عمومی امیر تھے، تو اہل مصر اور اہل شام کے ذکر کے ساتھ بھی ان کا ذکر ہونا چاہئے تھا، کیوں کہ یہ ان کے بھی تو عمومی امیر تھے، لیکن اس روایت کے تمام طرق کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ بعض میں تو ان کی امارت کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ دیگر لوگوں (عقبہ بن عامر اور فضالہ بن عبید) کی امارت کا ذکر ہے، جس کی یہی وجہ ہے کہ جس روایت میں جس جگہ کی جماعت کا ذکر آیا ،ان کے امیر کا بھی بتایا گیا۔ چنانچہ جس روایت میں اہل شام اور اہل مصر کا ذکر آیا، اس میں ان کے امیروں کا بھی ذکر کیا گیا، اور جس روایت میں اہل مدینہ کا ذکر آیا، اس میں ان کے امیر یعنی عبدالرحمن بن خالد کا ذکر ہوا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ راویوں کا انداز بیان اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس روایت میں ذیلی امراء کا ذکر ہے یعنی الگ الگ جماعت کے الگ الگ امیروں کا ذکر ہے اور یہ ذیلی امارت ہے اور خاص حلقے

تک محدود ہے۔

رہی یہ بات کہ پھر اس لشکر کا مرکزی اور عمومی امیر کون تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لشکر کے عمومی اور مرکزی امیر وسالار یزید بن معاویہ تھے، سنن ابی داؤد کی مندرجہ بالا روایت کے کسی بھی طریق میں عمومی طور پر پورے لشکر کا ذکر ہوا ہی نہیں بلکہ ہر طریق میں جزوی طور پر لشکر کی بعض جماعتوں کا ذکر ہوا ہے، کسی میں اہل مدینہ کا ذکر ہے تو کسی میں اہل مصر اور اہل شام کا، تو جس جس جماعت کا ذکر ہوا، خاص اس جماعت کے امیر کا بھی تذکرہ کر دیا گیا، اور چونکہ اس روایت کے کسی بھی طریق میں پورے لشکر کا اجتماعی تذکرہ نہیں ہوا اس لئے پورے لشکر کے مرکزی امیر کا تذکرہ بھی نہیں ہوا، لیکن اگر سنن ابی داؤد کی اسی روایت کے آخری حصے پر غور کیا جائے تو اس میں یہ صراحت ہے کہ:

”قَالَ أَبُو عِمْرَانَ: فَلَمْ يَزَلْ أَبُو أَيُّوبَ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ حَتَّى دُفِنَ بِالْقُسْطَنْطِينِيَّةِ"۔

ابو عمران کہتے ہیں: چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہ) اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں مدفون ہوئے“۔

اس جملے سے پتہ چلا کہ اسی غزوے میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ مسلسل جہاد کرتے ہوئے فوت ہو گئے تھے اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ صراحت ہے کہ جس غزوے میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، اس کے امیر یزید بن معاویہ تھے:

"قَالَ مَحْمُودُ بْنُ الرَّبِيعِ :فَحَدَّثْتُهَا قَوْمًا فِيهِمْ أَبُو أَيُّوبَ صَاحِبُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزْوَتِهِ الَّتِي تُوُفِّيَ فِيهَا، وَيَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ عَلَيْهِمْ بِأَرْضِ الرُّومِ "۔

(مفہوم) محمود بن ربیع نے بیان کیا کہ میں نے یہ حدیث ان لوگوں کے سامنے بیان کی جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، یعنی روم کی سرزمین پر ہونے والے اس غزوہ کے دوران جس میں آپ کی وفات ہو گئی تھی اور فوج کے

سالار یزید بن معاویہ تھے"۔

(صحيح البخاري، بَابُ صَلاَةِ النَّوَافِلِ جَمَاعَةً)

نوٹ: صحیح بخاری کی اسی روایت کے بارے میں لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"مسلّم ہے کہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے اس لشکر کا سالار تھا جس میں سیدنا ابو ایوب الانصاری شریک تھے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 330)

الغرض! لعل شاہ صاحب کی طرف سے پیش کردہ سنن ابی داوٗد کی روایت کے آخری حصے کے ساتھ صحیح بخاری کی مندرجہ بالا تصریح سامنے رکھی جائے تو روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سنن ابی داوٗد کی روایت میں جس لشکرِ قسطنطنیہ کا ذکر ہے یہ وہی لشکر ہے جس کے امیر الامراء (کمانڈر اِن چیف) یزید بن معاویہ تھے اور جس میں حضرت ابو ایوب خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔

تنبیہ

بعض لوگ سنن ابی داوٗد کی روایت کے آخر حصے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اس غزوے سے واپس آگئے ہوں اور بعد میں یزید بن معاویہ کے ساتھ دوبارہ لشکر قسطنطنیہ میں شریک ہوئے ہوں اور اس بعد والے غزوہ میں ان کی وفات ہوئی ہو۔

تو عرض ہے کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں، اول تو کسی بھی روایت میں یہ نہیں ملتا کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ارض روم سے واپس آگئے تھے اور یزید کے ساتھ دوبارہ لشکرِ قسطنطنیہ میں شریک ہوئے تھے۔ ثانیاً کسی بھی روایت میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے دو بار لشکر قسطنطنیہ میں شرکت کی ہے، بلکہ اسی سنن ابو داوٗد والی روایت کے ہی ایک طریق میں یہ الفاظ ہیں:

"عن أبي عمران التجيبي قال فلم يزل أبو أيوب يجاهد في سبيل الله حتى غزا القسطنطينية وتوفي بها فدفن بها"۔

ابو عمران نے کہا: چنانچہ حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہ) اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے،

یہاں تک کہ قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی اور وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

(تاريخ دمشق لابن عساكر، ج16ص62، دار الفكر بيروت)

اس روایت کے یہ الفاظ قابل غور ہیں" حتى غزا القسطنطينية" یعنی یہاں تک کہ انہوں نے قسطنطنیہ میں جہاد کیا، مطلب یہ کہ اس سے پہلے انہوں نے قسطنطنیہ پہنچ کر جہاد نہیں کیا تھا، جس سے ثابت ہوا کہ ان کے جہاد کی آخری کڑی لشکر قسطنطنیہ میں شرکت اور وفات تھی اور اس سے قبل وہ قسطنطنیہ تک نہیں پہنچ سکے تھے۔

نوٹ: تاریخ دمشق کی اس روایت کی سند میں معمولی ضعف ہے، لیکن چونکہ یہی مفہوم دیگر روایات کا بھی ہے اس لئے اس روایت کے الفاظ سے دوسری روایات کا مفہوم طے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

دوسرا یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ سنن ابی داؤد کی روایت کے جو آخری الفاظ ہیں کہ" چنانچہ حضرت ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہ) اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں مدفون ہوئے" ان کا یہی مفہوم ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ "لشکر قسطنطنیہ میں وفات تک جہاد کرتے رہے"، یہاں آپ رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی میں مسلسل جہاد کرنے کا ذکر نہیں ہو رہا، اور اگر بالفرض اس سے آپ رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی میں مسلسل جہاد والا مفہوم بھی لیا جائے تو اس سے ہمارا بیان کردہ مفہوم اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے، کیونکہ ہم لشکرِ قسطنطنیہ کو آپ رضی اللہ عنہ کی جہادی سرگرمی کی آخری کڑی مان رہے ہیں تو تسلسل کا حکم تب ہی لگ سکتا ہے جب عین حکم کے وقت وفات متحقق ہو جائے، اگر اس غزوے (بقول لعل شاہ صاحب" عبدالرحمن بن خالد بن ولید کی امارت والے غزوے") میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی ہی نہیں تو پھر اسی مناسبت سے یہ کیسے کہہ دیا گیا کہ وہ مسلسل جہاد کرتے رہے، جب کہ ابھی ان کی زندگی باقی ہے اور مزید غزوات کے مواقع ممکن ہیں اور معلوم نہیں کہ ان میں آپ رضی اللہ عنہ کی شرکت ہوگی یا نہیں؟ یقیناً اس طرح کی شہادت اسی وقت کی مناسبت سے دی جاسکتی ہے جو حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت ہو، اگر یہ وفات کا وقت نہیں تھا تو پھر یہ شہادت اسی غزوے کی مناسبت سے دی جانی چاہئے جو آپ رضی اللہ عنہ کا آخری غزوہ ہو۔ بھلا کسی درمیانی غزوے میں یہ کہنے کی کیا مناسبت ہے کہ آپ زندگی بھر جہاد کرتے رہے؟

بہر حال! ہماری نظر میں لعل شاہ صاحب کی پیش کردہ سنن ابی داؤد کی روایت کے آخری ٹکڑے کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ اس میں جہاد قسطنطنیہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی دائمی شرکت اور وفات بتائی

گئی ہے اور یہاں ان کے سابقہ غزوات کا ذکر نہیں۔لہٰذا سنن ابی داؤد میں جس غزوے کا ذکر ہے یہی غزوہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا آخری غزوہ تھا اور اسی کے عام اور مرکزی سالار و امیر یزید بن معاویہ تھے، دیگر علاقوں سے اس لشکر میں شامل ہونے والی جماعتوں کے ذیلی امراء بھی تھے، جن میں سے اہل مدینہ کے امیر عبدالرحمن بن خالد، اہل مصر کے عقبہ بن عامر اور اہل شام کے فضالہ بن عبید تھے۔

لعل شاہ صاحب کا ایک اور مغالطہ

لعل شاہ صاحب نے بات کو مزید الجھانے کے لئے لکھا ہے کہ:

”حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں مختلف کتب کے حوالہ جات سے لکھتے ہیں کہ جس لشکر میں حضرت ابوایوب الانصاری تھے اس لشکر کا سالار یزید ابن فضالہ ابن عبید تھا“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 332)

یہاں بھی لعل شاہ صاحب نے ایک بہت بڑا مغالطہ دیا ہے، ایک تو معاملے کو الجھانے کے لئے اپنی طرف سے ”فضاله بن عبيد“ کی جگہ ”يزيد بن فضاله بن عبيد“ لکھ دیا، دوسرا تفسیر ابن کثیر کی مکمل عبارت نقل نہیں کی کیونکہ اس سے ہی معلوم ہو جاتا کہ یہاں ”ذیلی امراء“ کی بات ہو رہی ہے، تفسیر ابن کثیر کی عبارت یہ ہے:

"....وَلَفْظُ أَبِي دَاوُدَ عَنْ أَسْلَمَ أَبِي عِمْرَانَ: كُنَّا بِالْقُسْطَنْطِينِيَّةِ وعلى أهل مصر عقبة بن عامر، وعلى أهل الشام رجل، يريد فَضَالَةَ بْنَ عُبَيْدٍ"۔

ترجمہ: (حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ متعدد کتب کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں) اور ابوداؤد کے لفظ ہیں کہ: اسلم ابوعمران سے روایت ہے کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے اور اہل مصر پر عقبہ بن عامر امیر تھے، اور اہل شام پر ایک اور آدمی تھے (حافظ ابن کثیر وضاحت کرتے ہیں کہ) اس آدمی سے ان کی مراد ”فضالہ بن عبید“ سے ہے۔

(تفسير ابن كثير، ج1ص528و 529، دار طيبة ، السعودية)

نوٹ: یہاں غالباً حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے سہو ہوا ہے کہ انہوں نے روایت کے جو الفاظ نقل کیے ہیں انہیں "ابو داوٗد" کی طرف منسوب کیا ہے، جبکہ اگرچہ یہ الفاظ تو اسی روایت کے دوسرے طرق میں آتے ہیں (جیسے "السنن الكبرىٰ للنسائي" میں) لیکن ابو داوٗد کے نہیں، یا ممکن ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سنن ابی داوٗد کا جو نسخہ ہو اس میں یہی الفاظ ہوں۔

بہر حال! غور کا مقام ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے اس حوالے میں صرف اہل مصر اور اہل شام کے امراء کا ذکر ہے، اہل مدینہ یا ان کے امیر کا ذکر نہیں، جبکہ لعل شاہ صاحب اپنی طرف سے یہ مغالطہ دے رہے ہیں کہ "جس لشکر میں حضرت ابو ایوب الانصاری تھے اس لشکر کا سالار یزید ابن فضالہ بن عبید تھا"۔ جبکہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تو مدینہ سے آئے تھے، انہیں اہل مدینہ کے امیر کے تحت ہونا چاہیئے تھا۔

یزید بن فضالہ یا فضالہ بن عبید؟

ثانیاً تفسیر ابن کثیر میں یا ان تمام کتب میں سے کسی کتاب میں بھی جن کے حوالے سے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کی ہے "يزيد ابن فضاله بن عبيد" نام کا کہیں کوئی ذکر نہیں، بلکہ جہاں بھی اہل شام کے امیر کا ذکر ہے وہاں "فضاله بن عبيد" ہی ہے، شاید لعل شاہ صاحب کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ حافظ ابن کثیر نے جو "رجل" کی وضاحت" يريد فَضَالة بْنَ عُبَيد" سے کی ہے تو اس "يُرِيدُ" کو انہوں نے "يزيد" سمجھ لیا اور پھر اسے "یزید بن فضالہ بن عبید" بنا دیا تاکہ معاملے کو مزید الجھایا جا سکے۔ واللہ اعلم۔

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی مغالطے پر بنیاد رکھتے ہوئے لعل شاہ صاحب نے اپنی طرف سے "تطبیق" یوں دینے کی کوشش کی ہے کہ:

> "روایات کے اس شدید اختلاف کو دور کر کے انہیں ایک نقطہ پر جمع کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ ان کے تطابق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ مدنی لشکر کے امیر عبدالرحمن ابن خالد ہوں اور سارے لشکر کے سالار یزید ابن فضالہ ہوں اور صحیح بخاری میں یزید ابن معاویہ کا نام جو ضمنی طور پر آگیا ہے وہ ابراہیم ابن سعد راوی کی سبقت لسانی سے آگیا ہو، ابو عوانہ نے تصریح کی ہے کہ (خرجنا في غزاة مع يزيد ابن معاوية) کے الفاظ ابراہیم ابن سعد راوی کے سوا کسی دوسرے راوی کے نہیں ہیں (مسند ابی عوانہ، ص12 ج1)۔ ابراہیم راوی اگرچہ ثقہ

ہے اور اصحاب الستۃ نے اس سے روایت کی ہے لیکن تاہم بھی مختلف فیہ راوی ہے اور بعض ائمہ اس کی تضعیف کی طرف بھی مائل ہوئے ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 332و333)

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ یہاں بھی لعل شاہ صاحب نے "مغالطہ در مغالطہ" دیا ہے، ایک تو انہوں نے نہ جانے "فضالہ بن عبید" کا "یزید" نامی بیٹا کہاں سے نکال لیا؟ جبکہ تفسیر ابن کثیر سمیت کسی بھی کتاب میں لشکر قسطنطنیہ میں شامل اہل شام کے دستے کے امیر کا نام "یزید بن فضالہ" کہیں مذکور نہیں بلکہ صرف "فضالہ بن عبید" ہی ملتا ہے۔ لہٰذا یہاں خواہ مخواہ ابراہیم بن سعد کی سبقت لسانی کی کہانی بنانا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

دوسرا امام ابو عوانة يعقوب بن إسحاق الإسفراييني (م316ھ) نے ہرگز یہ تصریح نہیں کی کہ "(خرجنا في غزاة مع يزيد ابن معاوية) کے الفاظ ابراہیم ابن سعد راوی کے سوا کسی دوسرے راوی کے نہیں ہیں"، اصل میں امام ابوعوانہ رحمۃ اللہ علیہ نے "عقیل" اور "ابراہیم بن سعد" دونوں کے واسطے سے ایک روایت بیان کی ہے، اس روایت میں ان دونوں راویوں کے الفاظ میں کچھ اختلاف ہے، اس اختلاف کو بیان کرتے ہوئے ابوعوانہ کہتے ہیں کہ ابراہیم بن سعد نے یوں بیان کیا ہے کہ:

قَالَ مَحْمُودُ بْنُ الرَّبِيعِ :فَخَرَجْنَا فِي غَزَاةٍ مَعَ يَزِيدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ مَعَنَا أَبُو أَيُّوبَ الأَنْصَارِيُّ فَحَدَّثْتُ هَذَا الْحَدِيثَ"۔

محمود بن ربیع نے کہا کہ ہم یزید بن معاویہ کے ساتھ غزوے میں نکلے اور ہمارے ساتھ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے تو میں نے یہ حدیث بیان کی۔

(مسند ابی عوانة، ج1ص22و 23، دارالمعرفة بيروت)

اور پھر یہیں آگے امام ابوعوانہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"وَهَذَا لَفْظُ إِبْرَاهِيمَ بْنِ سَعْدٍ وَهُوَ أَتَمُّهُمَا حَدِيثًا"۔

یہ ابراہیم بن سعد کے الفاظ ہیں اور ان کی حدیث دونوں (یعنی عقیل اور ابراہیم) میں سے زیادہ مکمل اور تام ہے۔

(مسند ابي عوانة، ج1ص23)

ملاحظہ فرمائیں! کیا یہاں کوئی ایسی بات ہے کہ" خرجنا في غزاة مع يزيد بن معاوية کے الفاظ ابراہیم بن سعد راوی کے سوا کسی دوسرے راوی کے نہیں ہیں"؟ بلکہ یہاں صرف دو راویوں "عقیل" اور "ابراہیم بن سعد" کی بات ہو رہی ہے اور پھر امام ابوعوانہ ابراہیم بن سعد کی بیان کردہ روایت کو "اتم" بتا کر گویا اسے راجح بتا رہے ہیں۔

لیکن لعل شاہ صاحب "شوق اثباتِ تعارض" میں پہلے اپنی طرف سے ایک فرضی نام" یزید بن فضالہ بن عبید" تخلیق کرتے ہیں اور پھر صحاح ستہ کے ثقہ راوی ابراہیم بن سعد کے بارے میں شک پیدا کرتے ہیں کہ ان سے سبقت لسانی ہوگئی کہ انہوں نے "یزید بن فضالہ" کی جگہ "یزید بن معاویہ" کہہ دیا اور پھر ابراہیم بن سعد پر جرح بھی کر دیتے ہیں کہ بعض ائمہ ان کی تضعیف کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ بناء الفاسد علی الفاسد اور مغالطہ در مغالطہ کی اس سے بڑی مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

الغرض! حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں بیان کردہ اس روایت میں کوئی نئی بات نہیں بیان ہوئی، اس میں بھی" فضالہ بن عبید" کو صرف اہل شام کا امیر بتایا گیا ہے نہ کہ لشکر قسطنطنیہ کا عمومی اور مرکزی امیر۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس لشکر قسطنطنیہ میں شامل اہل مدینہ کے امیر عبدالرحمن بن خالد بن ولید، اہل مصر کے عقبہ بن عامر اور اہل شام کے فضالہ بن عبید تھے، اور ان سب کے اوپر لشکر کے عمومی امیر یعنی" قائد عام" یزید بن معاویہ تھے، اور اسی غزوے کی آخری مہم یا آخری کڑی اس لشکر کا قسطنطنیہ تک پہنچنا اور وہاں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا وفات پانا ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں کوئی الجھاؤ یا اشکال نہیں، خود لعل شاہ صاحب کو بھی شاید اس بات کا ادراک تھا کہ وہ جسے تعارض یا الجھاؤ بنا کر پیش کر رہے ہیں، بات ایسی نہیں، اسی لئے انہوں نے زیرِ عنوان" تطبیق کی دوسری صورت" لکھا ہے:

"دوسری وجہ تطبیق یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قسطنطنیہ پر حملہ آور لشکروں میں سے ایک لشکر کا سالارِ اعلیٰ یزید ابن معاویہ ہو اور اسی لشکر کے شامی دستہ پر یزید بن فضالہ یا فضالہ ابن عبید ہوں (لعل شاہ صاحب کے دماغ میں ابھی تک" یزید بن فضالہ" محو استراحت ہے۔ ناقل) اور مدنی دستہ پر عبدالرحمن ابن خالد ہوں اور ابوایوب رضی اللہ عنہ مدنی دستہ میں شامل ہوں۔ امام بخاری کے احترام کے پیش نظر ہم دوسری صورت کو ترجیح دیتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ یزید ابن معاویہ

اس جیش کا سالار تھا جس کے مدنی دستہ میں حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ شامل تھے اور اس کے امیر عبدالرحمن ابن خالد تھے"۔

مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ پہلا لشکر نہیں تھا بلکہ عہد معاویہ میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکروں میں وہ آخری لشکر تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قسطنطنیہ پر مختلف جیوش نے مختلف امراء کی قیادت میں حملے کیئے ہیں اسی لئے مؤرخین کو اشتباہ واقع ہوا ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 333)

ملاحظہ فرمائیں! لعل شاہ صاحب نے بالکل وہی تطبیق پیش کی ہے جو ہم پیش کر آئے ہیں، اور یہی تطبیق درست اور حقائق و واقعات کے مطابق ہے۔

لیکن اپنے اس بیان کے دوسرے حصے میں لعل شاہ صاحب نے جو نیا دعویٰ کیا ہے کہ یہ لشکر عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا پہلا نہیں بلکہ آخری لشکر تھا۔ ہم ان کے اس دعوے کو بلا دلیل سمجھتے ہیں اور اس سے ہرگز متفق نہیں، اس لئے لعل شاہ صاحب کے اس دعوے کا بھی تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

کیا قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا سب سے پہلا لشکر یزید بن معاویہ کا نہیں تھا؟

اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے بھی لعل شاہ صاحب نے متعدد حوالے دے کر "مغالطہ" دینے کی کوشش کی ہے اور سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی اپنی تحقیق ایک جگہ کچھ ہے اور چار پانچ صفحات کے بعد تبدیل ہو جاتی ہے، پہلے یہ ملاحظہ فرمائیں، لعل شاہ صاحب متعدد حوالے نقل کرنے کے بعد نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں قسطنطنیہ پر پہلا حملہ سنہ 48ھ میں سردیوں کے موسم میں بحری راستہ سے ہوا تھا اور اس جیش کے سالار سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ تھے چنانچہ مؤرخین و محدثین نے اس کی تصریح کی ہے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 340)

اور پھر کچھ مزید حوالے نقل کر کے صرف پانچ صفحے بعد لکھتے ہیں:

"اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ حال تھا ان لشکروں کا جنہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قسطنطنیہ پر حملے کیئے تھے ان میں سب سے پہلا حملہ سنہ 48ھ میں سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کی امارت میں ہوا، اور سب سے آخری حملہ یزید ابن معاویہ کی امارت میں۔ مگر سب سے پہلا حملہ قسطنطنیہ پر سنہ 48ھ میں نہیں ہوا تھا بلکہ از روئے تحقیق اس سے بہت پہلے سنہ 32ھ میں ہو چکا تھا اور اس لشکر کے امیر خود امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 345)

قارئین محترم! ان دونوں اقتباسات میں لعل شاہ صاحب نے اپنی تحقیق کا نچوڑ بیان کیا ہے، لیکن ایک جگہ بتاتے ہیں کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ سنہ 48ھ میں سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کی امارت میں ہوا تھا، اور پانچ صفحے بعد بتاتے ہیں کہ سب سے پہلا حملہ سنہ 32ھ میں خود حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں ہوا تھا۔ یعنی وہ خود بھی کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے کہ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کب ہوا تھا؟

بہرحال! آئیں اب لعل شاہ صاحب کے ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو انہوں نے اپنے اس "مفروضے" کو ثابت کرنے کے لئے پیش کیے ہیں کہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں جس لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا اور جس میں سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور ان کی وفات اسی غزوہ میں ہوئی تھی، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا پہلا لشکر نہیں تھا بلکہ آخری لشکر تھا۔

سب سے پہلے لعل شاہ صاحب نے ایک بہت بڑا مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے (ان کے بعد بھی متعدد لوگوں نے یہی مغالطہ دیا ہے) وہ مغالطہ یہ ہے کہ یہ حضرات کتب تاریخ سے وہ حوالے پیش کرتے ہیں جن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں (جس میں گورنری اور خلافت دونوں دور شامل ہیں) مطلق ارضِ روم پر حملوں کا ذکر ہے، یا کسی حوالے میں "مضیق قسطنطنیہ" (یعنی آبنائے قسطنطنیہ) تک کسی لشکر کے پہنچنے کا ذکر ہے، اور پھر یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو "قسطنطنیہ" پر سب سے پہلا حملہ تو فلاں سنہ میں ہوا تھا، جبکہ صحیح بخاری کی زیر بحث حدیث میں مذکور دوسری بشارت میں نہ "ارض روم" پر حملے کا ذکر ہے اور نہ ہی "آبنائے قسطنطنیہ" تک پہنچنے والے لشکر کا ذکر ہے، بلکہ خاص "مدینۃ قیصر" (قسطنطنیہ) پر حملہ کرنے والے لشکر کا ذکر ہے اور اسی لشکر کے

بارے میں بشارت مذکور رہے، چنانچہ لعل شاہ صاحب بھی زیر عنوان "قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کب ہوا"، اپنی بات یوں شروع کرتے ہیں کہ:

"اس سلسلہ میں بھی مؤرخین کا بیان مختلف ہے، شیخ محمد الخضری لکھتے ہیں سنة 48ھ جهز معاوية جيشاً عظيماً لفتح قسطنطنيه کہ سنہ 48ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے ایک عظیم لشکر روانہ کیا (المحاضرات الامم الاسلامیۃ، ص114 ج2)۔ حافظ ابن کثیر سنہ 49ھ وقیل سنہ 50ھ (البدایۃ والنہایۃ ص29 ج8، تحقیق مزید ص28) ابن اثیر اور طبری بھی سنہ 49ھ کے قائل ہیں، کامل ابن اثیر ص231 ج3، طبری ص131 ج 4۔ عباسی صاحب کا بیان بھی مختلف ہے سنہ 49ھ (خلافت معاویہ و یزید، ص24، تحقیق مزید 230 و ص545) سنہ 50ھ (تحقیق مزید، ص24)۔ مؤرخین کے اس اختلاف کے بارے میں عباسی صاحب لکھتے ہیں: چونکہ متعدد سالوں تک جہادی مہمیں بحری کمانڈروں کے علاوہ امیر یزید کی قیادت میں جاری رہیں اس لئے مؤرخین کے بیان کردہ سنین اور بحری جنرلوں کے ناموں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے (خلافت معاویہ و یزید، ص432)۔ عباسی صاحب کا یہ بیان نہایت وقیع اور حقیقت افروز ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مؤرخین پر التباس حقیقت کی ایک وجہ بھی ہے کہ ناصبیوں نے یزید ابن معاویہ پر حدیث قسطنطنیہ کو راست کرنے کے لئے جو کھینچ تان کی ہے اس کے سبب بھی حقیقت قیل وقال میں پنہاں ہو کر رہ گئی ہے، مگر کچھ ذرائع ایسے بھی ہیں جن کے طفیل حقیقت آشکارا ہو سکتی ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 333 و 334)

<u>تبصرہ:</u>

سب سے پہلے یہ ذہن میں رہے، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ غزوۂ قسطنطنیہ کس سال ہوا؟ اس بارے میں مؤرخین کے اقوال مختلف ہیں، کتب میں سنہ 49ھ تا 52ھ کے اقوال ملتے ہیں، لیکن ایک بات میں یہ تمام مؤرخین متفق ہیں کہ یہ لشکر یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں ہی گیا تھا یا کم از کم وہ اس لشکر میں شامل تھا

۔مثلاً لعل شاہ صاحب نے سب سے پہلے جو شیخ محمد الخضری کی کتاب" محاضرات تاریخ الامم الاسلامیۃ" سے ایک سطر نقل کی ہے کہ" سنہ 48ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے ایک عظیم لشکر روانہ کیا" اس سے آگے کے الفاظ یہ ہیں:

"وكان على الجيش سفيان بن عوف وأمر ابنه يزيد أن يغزو معهم وكان في هذا الجيش ابن عباس وابن عمر وابن الزبير وابو ايوب الانصاري وغيرهم وعبدالعزيز بن زرارة الكلابي فساروا حتى بلغوا القسطنطينية ...."۔

یہ لشکر سفیان بن عوف کی زیر قیادت تھا اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے اپنے بیٹے یزید کو بھی ان کی معیت میں جہاد کرنے کا حکم دیا، اور اس لشکر میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی تھے، نیز عبدالعزیز بن زرارہ الکلابی بھی تھے، پس یہ روانہ ہوئے یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک پہنچ گئے.."۔

(محاضرات تاريخ الامم الاسلامية، ج2ص114، طبع مصر)

ہم ابھی اس بات سے صرفِ نظر کرتے ہیں کہ شیخ محمد الخضری کا یہ بیان کس حد تک درست ہے کہ اس لشکر کے امیر حضرت سفیان بن عوف تھے، ابھی ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شیخ محمد الخضری نے اسی لشکر میں یزید بن معاویہ اور متعدد کبار صحابہ کرام کے شامل ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ تو اگر لعل شاہ صاحب کے مطابق یہی قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا پہلا لشکر تھا تو اسی حوالے میں یزید بن معاویہ کا اس لشکر میں شامل ہونا بھی مذکور ہے، اور صحیح بخاری کی حدیث میں" مغفور لهم" والی بشارت اس لشکر میں شامل تمام افراد کے لئے ہے۔

اسی طرح مؤرخ طبری اور حافظ ابن کثیر وغیرہ نے بھی اس غزوۂ قسطنطنیہ کے سال میں مختلف اقوال ذکر کیے ہیں اور ایسا اختلاف بہت سے تاریخی واقعات میں ہونا عام بات ہے لیکن مؤرخین نے ساتھ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ (سال جو بھی ہو) یہ لشکر یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں گیا تھا اور یہی قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا سب سے پہلا لشکر تھا اور اس کے ساتھ صحیح بخاری کی حدیث کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ (حوالے پہلے گذر چکے)۔

لیکن لعل شاہ صاحب کو یہاں بھی "ناصبیت" یاد آگئی اور وہ اس غزوے کے سال میں اختلاف کی وجہ "ناصبیوں" کی طرف سے حدیث قسطنطنیہ کو یزید پر چپاں کرنے کی کوشش قرار دے رہے ہیں، یعنی دوسرے لفظوں میں وہ تمام مؤرخین جنہوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث "أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُم" " کا مصداق وہی لشکر ہے جو یزید کی معیت میں قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا تھا اور وہی پہلا لشکر تھا، وہ تمام لعل شاہ صاحب کے نزدیک "ناصبی" ہوئے۔

لعل شاہ صاحب کے "حقیقت آشکارا" کرنے کے ذرائع

چنانچہ لعل شاہ صاحب، حقیقت کو آشکارا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم ان شاء اللہ العزیز تاریخی مسلمات اور خود عباسی صاحب (یعنی "محمود احمد عباسی" ۔ناقل) کے معترفات سے ثابت کریں گے کہ یزید ابن معاویہ اوّل جیش میں شامل نہیں تھا، وہ دور خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے تمام لشکروں میں آخری لشکر کا سالار تھا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 334)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے اس بات کی جو دلیل یا ثبوت پیش کیا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارض روم پر سولہ مرتبہ فوج کشی کی چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فاغزا معاوية ارض الروم ستة عشر غزوة (البدایہ والنہایہ، ص133 ج8) ایک لشکر سردیوں میں جاتا اور وہ واپس آتا، دوسرا گرمیوں میں جاتا اور وہ واپس آتا، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: كان يغزو في سنة مرّتين مرّة في الصيف ومرّة في الشتاء (البدایہ والنہایہ، ص137 ج8)..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 334و335)

پھر اسی بات کی تائید میں لعل شاہ صاحب نے محمود احمد عباسی صاحب کی کتابوں سے متعدد حوالے نقل کیے ہیں جن میں "رومیوں کے خلاف حملوں" یا "رومی عیسائیوں کے خلاف حملوں" کے الفاظ ہیں اور پھر لعل شاہ صاحب نے نتیجہ یوں نکالا ہے کہ:

”عباسی صاحب کی تصریحات کے بموجب عہد خلافت معاویہ میں قسطنطنیہ پر حملہ آور لشکروں کی تعداد آٹھ بنتی ہے اور یہی قرین قیاس ہے کہ سات سالوں میں سولہ حملے ہوئے تو چار سالوں میں بہر حال آٹھ حملے قسطنطنیہ پر ہوئے ہوں گے جن میں چار شواتی اور چار صوائف ہیں“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 336)

اور لکھتے ہیں:

”ان آٹھ لشکروں میں سے یزید ابن معاویہ صرف ایک لشکر کا سالار تھا، سارے جیوش اس کی قیادت میں نہیں تھے...“

(استخلاف یزید، صفحہ 337)

پھر انہوں نے مختلف تاریخی حوالے اس پر پیش کیے ہیں کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات کس سال ہوئی تھی جس میں پہلے تسلیم کیا ہے کہ ان کی وفات میں اختلاف کیا گیا ہے، بعض نے سنہ 50ھ اور بعض نے سنہ 51ھ اور بعض نے سنہ 52ھ لکھی ہے۔ لیکن لعل شاہ صاحب راجح اور صحیح قول سنہ 52ھ والا بتاتے ہیں (دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 337 تا 339) اور آخر میں یوں نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

”محدثین و مؤرخین کے مندرجہ بالا بیان سے ناظرین کرام نے معلوم کر لیا ہو گا کہ یزید ابن معاویہ نے قسطنطنیہ پر سنہ 52ھ میں حملہ کیا تھا (یعنی جب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات اسی حملے کے دوران ہوئی تھی اور ان کی وفات کا سال 52ھ ہے تو معلوم ہوا کہ یزید نے قسطنطنیہ پر حملہ اسی سال کیا تھا۔ ناقل)، سنہ 52ھ میں صائفہ (یعنی گرمیوں کا حملہ۔ ناقل) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکروں میں آخری لشکر تھا پس معلوم ہوا کہ یزید ابن معاویہ آخری لشکر کا سالار تھا، اول جیش میں شرکت اسے نصیب نہیں ہوئی“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 339)

<u>تبصرہ:</u>

اولاً آپ نے غور کیا کہ لعل شاہ صاحب نے یہاں کیا مغالطہ دیا ہے؟ انہوں نے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

کی کتاب "البدایۃ والنہایۃ" کے حوالے سے جو یہ نقل کیا ہے کہ:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارض روم پر سولہ مرتبہ فوج کشی کی چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فاغزا معاویۃ ارض الروم ستۃ عشر غزوۃ"۔

اس عبارت میں "ارض روم" "یعنی" رومی سرزمین" پر سولہ حملوں کا ذکر ہے نہ کہ اس سرزمین کے ایک شہر "قسطنطنیہ" پر حملوں کا، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی دعویٰ کرے کہ ہندوستان نے پاکستان کے خاص شہر مثلاً کراچی پر اتنے حملے کیے اور دلیل کے طور پر یہ پیش کیا جائے کہ" ہندوستان نے پاکستان کی سرزمین پر اتنے حملے کیے" یعنی دعویٰ خاص ہے اور اس پر دلیل عام پیش کی جارہی ہے، تو لعل شاہ صاحب کو اگر ضابطے کی دلیل دینی تھی تو کوئی ایسا حوالہ لاتے جس میں ہوتا کہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومی سلطنت کے شہر قسطنطنیہ پر سولہ مرتبہ فوج کشی کی" پھر یہ ثابت کرتے کہ یہ تمام لشکر قسطنطنیہ شہر کے دروازے تک پہنچے اور اس کے بعد یہ ثابت کرتے کہ قسطنطنیہ تک پہنچ کر شہر پر حملہ آور ہونے والے ان سولہ لشکروں میں یزید کی سرکردگی میں ہونے والا حملہ فلاں نمبر پر تھا۔ ہاں اگر لعل شاہ صاحب کے نزدیک اس وقت کی ساری" رومی سلطنت" کو "قسطنطنیہ" ہی کہا جاتا تھا تو الگ بات ہے، لیکن یہ واقعہ اور حقیقت کے خلاف ہے۔

ثانیاً، آئیے دیکھتے ہیں کہ لعل شاہ صاحب کے پیش کردہ حوالے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا لکھا ہے اور اس کی کیا سند ذکر کی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"وَقَالَ أَبُو زُرْعَةَ عَنْ دُحَيْمٍ عَنِ الْوَلِيدِ عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ، قَالَ: لَمَّا قُتِلَ عُثْمَانُ لَمْ يَكُنْ لِلنَّاسِ غَازِيَةٌ تَغْزُو، حَتَّى كَانَ عَامُ الْجَمَاعَةِ فَأَغْزَا مُعَاوِيَةُ أَرْضَ الرُّومِ سِتَّ عَشْرَةَ غَزْوَةً، تَذْهَبُ سَرِيَّةٌ فِي الصيف ويشتوا بِأَرْضِ الرُّومِ، ثُمَّ تَقْفِلُ وَتَعْقُبُهَا أُخْرَى، وَكَانَ فِي جملة من أغزى ابْنُهُ يَزِيدُ وَمَعَهُ خَلْقٌ مِنَ الصَّحَابَةِ، فَجَازَ بِهِمُ الْخَلِيجَ، وَقَاتَلُوا أَهْلَ الْقُسْطَنْطِينِيَّةِ عَلَى بَابِهَا، ثم قفل بهم راجعا إلى الشام..."۔

ابوزرعہ نے دحیم سے، انہوں نے ولید سے اور انہوں نے سعید بن عبدالعزیز (تنوخی) سے روایت کیا ہے کہ: جب حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) شہید ہوگئے اور لوگوں میں اختلاف ہوگیا تو لوگوں کے پاس دشمن کے خلاف لڑنے کے لئے کوئی فوج ہی نہ تھی، یہاں تک کہ جب "عام الجماعۃ" آگیا (یعنی جب ساری امت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہوگئی) تو پھر حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے غزوات شروع کیے، چنانچہ آپ نے سرزمین روم پر سولہ لشکر بھیجے، ایک لشکر موسم گرما میں جاتا اور موسم سرما بھی گزارتا، پھر واپس آتا، پھر اس کے بعد دوسرا لشکر اس مہم پر نکلتا، اور ان میں سے ایک لشکر وہ بھی تھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں بھیجا اور اس کے ساتھ صحابہ کرام کی ایک جماعت بھی تھی، پس یزید انہیں لے کر خلیج (یعنی "خلیج قسطنطنیہ" ۔ناقل) پار کرگیا اور انہوں نے قسطنطنیہ کے دروازے پر پہنچ کر اہل قسطنطنیہ سے قتال کیا پھر واپس آگیا۔

(البدایۃ والنہایۃ، ج8ص193، وزارۃ الاوقاف قطر)

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو امام ابوزرعہ دمشقی رحمۃ اللہ علیہ (م 281ھ) کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور اس کی پوری سند بھی ذکر کی ہے، یہ روایت امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ میں اسی سند کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے کچھ الفاظ مختلف ہیں، آئیے ہم اصل کتاب سے بھی یہ روایت دیکھ لیتے ہیں:

"حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنِ الْوَلِيدِ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ قَالَ: لَمَّا قُتِلَ عُثْمَانُ، وَاخْتَلَفَ النَّاسُ، لَمْ تَكُنْ لِلنَّاسِ غَازِيَةٌ، وَلَا صَائِفَةٌ، حَتَّى اجْتَمَعَتِ الْأُمَّةُ عَلَى مُعَاوِيَةَ سَنَةَ أَرْبَعِينَ، وَسَمَّوْهَا سَنَةَ الْجَمَاعَةِ، قَالَ سَعِيدُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ: فَأَغْزَا مُعَاوِيَةُ الصَّوَائِفَ، وَشَتَّاهُمْ بِأَرْضِ الرُّومِ سِتَّ عَشْرَةَ صَائِفَةً، تَصِيفُ بِهَا وَتَشْتُو، ثُمَّ تُقْفِلُ وَتَدْخُلُ مُعَقِّبَتُهَا، ثُمَّ أَغْزَاهُمْ مُعَاوِيَةُ ابْنَهُ يَزِيدَ فِي سَنَةِ خَمْسٍ وَخَمْسِينَ فِي جَمَاعَةٍ مِنْ أَصْحَابِ

رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّى جَازَ بِهِمِ الْخَلِيجَ، وَقَاتَلُوا أَهْلَ الْقُسْطَنْطِينِيَّةِ عَلَى بَابِهَا، ثُمَّ قَفَلَ"

(تاریخ ابی زرعة الدمشقی، ص 41و 42، دار الکتب العلمیة بیروت)

اس روایت کے آخری الفاظ کا ترجمہ یوں ہے کہ:

" پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سنہ 55ھ میں صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اپنے بیٹے یزید بن معاویہ کو ان کی طرف بحر و بر کے راستے سے بھیجا، یہاں تک کہ یہ لشکر خلیج پار کر گیا اور اس نے قسطنطنیہ کے دروازے تک پہنچ کر اہل قسطنطنیہ سے قتال کیا، پھر واپس آگیا"۔

نوٹ: تاریخ ابی زرعہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں جو لشکر خلیج قسطنطنیہ پار کر کے قسطنطنیہ کے دروازے پر پہنچا تھا وہ ارض روم پر پہلے ہوئے سولہ حملوں کے بعد سترہواں حملہ تھا، جبکہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ بھی انہی سولہ حملوں میں شامل ہے۔

بہرحال اولاً، جیسا کہ بیان ہوا، اس روایت میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہونے والے یہ سولہ حملے قسطنطنیہ شہر پر تھے، بلکہ اسی روایت میں صراحت ہے کہ ان حملوں کے بعد صرف اور صرف ایک حملہ ایسا تھا جو قسطنطنیہ پر ہوا تھا اور جس میں اسلامی لشکر آبنائے قسطنطنیہ پار کر کے قسطنطنیہ کے دروازے پر پہنچا تھا اور یہ حملہ وہی تھا جو یزید بن معاویہ کی امارت میں ہوا تھا" ثُمَّ أَغْزَاهُمْ مُعَاوِيَةُ ابْنُهُ يَزِيد" کے الفاظ پر دوبارہ غور کریں، اس میں یہی بیان ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے روم کی سرزمین پر کئی لشکر بھیجے اور ان سب کے بعد پھر ایک لشکر یزید کی امارت میں بھیجا، اس لشکر نے سرزمین روم میں اس قدر پیش قدمی کی کہ قسطنطنیہ کے دروازے تک پہنچ گیا، انہی الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے کوئی لشکر بھی قسطنطنیہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

لیجیے! خود لعل شاہ صاحب کی پیش کردہ روایت سے بھی ثابت ہو گیا کہ قسطنطنیہ شہر پر سب سے پہلا حملہ یزید ہی نے کیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یزید سے پہلے رومی سرزمین پر جتنی بار بھی لشکر کشی ہوئی ہے، ان میں سے کوئی بھی لشکر قسطنطنیہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

تنبیہ

یہاں فائدے کے لئے ہم اس روایت سے متعلق دو باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں:

پہلی یہ کہ آپ نے دیکھا امام ابوزرعہ کی روایت کے مطابق یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا لشکر سنہ 55ھ میں گیا تھا، لہٰذا امام ابوزرعہ نے یہیں آگے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات کا سال بھی سنہ 55ھ لکھا ہے۔

دوسری بات یہ بتانی ہے کہ لعل شاہ صاحب نے امام ابوزرعہ کے حوالے سے البدایۃ والنہایۃ کی جس روایت کو دلیل بنایا ہے وہ سنداً صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس روایت کو بیان کرنے والے "سَعِيْدُ بنُ عَبْدِ العَزِيْزِ التَّنُوْخِيُّ" کی پیدائش سنہ 90ھ میں یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے تقریباً تیس سال بعد ہوئی، امام ذہبی لکھتے ہیں "وُلِدَسَنَةَ تِسْعِيْنَ" (سير اعلام النبلاء، ج8ص32، مؤسسة الرسالة بيروت) لہٰذا یہ روایت منقطع ہے۔ پھر اس روایت کے دوسرے راوی "الوليد بن مسلم الدمشقي" مشہور مدلّس ہیں، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں مدلسین کے چوتھے طبقہ میں شمار کیا ہے جن کی "عنعنه" والی روایات بالاتفاق ناقابل قبول ہوتی ہیں (طبقات المدلسين، ص51)، حافظ ابن العراقی، برہان الدین سبط ابن العجمی اور حافظ ابن حجر نے انہیں "تدلیس تسویہ" سے متصف قرار دیا (كتاب المدلسين لابن العراقي، ص99، دار الوفاء مصر / التبيين لاسماء المدلسين،ص60، دار الكتب العلمية بيروت / تقريب التهذيب،ص584، دار الرشيد،حلب/ اسماء المدلسين للسيوطي، ص102، دار الجيل بيروت)۔

لیکن اس کے باوجود، لعل شاہ صاحب کی مستدلہ اسی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں صرف ایک لشکر قسطنطنیہ کے دروازے تک پہنچا تھا اور یہ وہی لشکر تھا جو یزید بن معاویہ کی امارت میں گیا تھا۔

بات البدایۃ والنہایۃ کی چلی ہے تو آئیے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی تحقیق پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں، لکھتے ہیں:

"ثُمَّ قُتِلَ عَلِيٌّ فَاسْتَقَلَّ مُعَاوِيَةُ بِالْأَمْرِ سَنَةَ إِحْدَى وَأَرْبَعِينَ، وَكَانَ يَغْزُو الرُّومَ فِي كُلِّ سَنَةٍ مَرَّتَيْنِ، مَرَّةً فِي الصَّيْفِ وَمَرَّةً فِي الشِّتَاءِ،

وَيَأْمُرُ رَجُلًا مِنْ قَوْمِهِ فَيَحُجُّ بِالنَّاسِ، وحج هو سَنَةَ خَمْسِينَ، وَحَجَّ ابْنُهُ يَزِيدُ سَنَةَ إِحْدَى وخمسين، وفيها أو في الَّتِي بَعْدَهَا أَغْزَاهُ بِلَادَ الرُّومِ فَسَارَ مَعَهُ خَلْقٌ كَثِيرٌ مِنْ كُبَرَاءِ الصَّحَابَةِ حَتَّى حَاصَرَ الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَقَدْ ثَبَتَ فِي الصَّحِيحِ: أَوَّلُ جَيْشٍ
يغزو القسطنطينية مغفور لهم"۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو اس کے بعد سنہ 41ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے۔ آپ ہر سال روم پر دو بار لشکر کشی کیا کرتے تھے، ایک بار گرمیوں میں اور ایک بار سردیوں میں، نیز اپنی قوم کے کسی آدمی کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو حج کروائے (یعنی امام حج بنایا کرتے تھے۔ناقل) چنانچہ سنہ 50ھ میں خود انہوں نے حج کروایا اور (اس سے اگلے سال) سنہ 51ھ میں ان کے بیٹے یزید نے حج کروایا، اور اسی سال (یعنی 51ھ میں) یا اس سے اگلے سال (یعنی 52ھ میں) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے (یعنی یزید کو) بلاد روم پر حملے کے لئے بھیجا پس اس کے ساتھ کبار صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد بھی روانہ ہوئی یہاں تک کہ اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا، اور صحیح (بخاری) میں یہ حدیث ثابت شدہ ہے کہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) میری امت کا سب سے پہلا وہ لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوگا ان کی مغفرت کر دی گئی"۔

(البداية والنهاية، ج8ص185، وزارة الاوقاف قطر)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی اس تحقیق کے مطابق یزید بن معاویہ کو" امام حج" بھی بنایا گیا (جس کا لعل شاہ صاحب انکار کرتے ہیں) نیز معلوم ہوا کہ بلاد روم پر حملہ کرنے والا یہی پہلا لشکر تھا جو قسطنطنیہ تک پہنچا، ورنہ حافظ ابن کثیر کو یہاں صحیح بخاری کی بشارت والی حدیث کا حوالہ اس لشکر کے ساتھ دینے کی کیا ضرورت تھی؟

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ" ارض روم" یا" بلاد روم" پر ہونے والے حملوں کو" قسطنطنیہ" پر حملے باور کروانا یہ ایک مغالطے کے سوا کچھ نہیں۔ ورنہ اسی" البدایہ والنہایہ" میں یہیں یہ بھی ذکر ہے کہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے

سنہ 19ھ میں حضرت عمر ؓ کی خلافت کے میں "قیساریہ" نامی شہر فتح کیا تھا، نیز خلافتِ عثمان ؓ میں سنہ 25ھ یا 27ھ یا 28ھ میں (علی اختلاف الاقوال) انہوں نے "قبرص" فتح کرلیا تھا، ملاحظہ فرمائیں:

"وَقَالَ اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ: فَتَحَ مُعَاوِيَةُ قَيْسَارِيَّةَ سَنَةَ تِسْعَ عَشْرَةَ فِي دَوْلَةِ عُمَرَ بْنِ الخطاب. وقال غيره: وفتح قبرص سنة خمس وقيل سَبْعٍ، وَقِيلَ ثَمَانٍ وَعِشْرِينَ فِي أَيَّامِ عُثْمَانَ"۔

(البداية والنهاية، ج8ص184، وزارة الاوقاف قطر)

اور "قیساریہ" و "قبرص" بھی تو سرزمین روم کے ہی علاقے تھے تو پھر کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ حضرت معاویہ ؓ نے پہلے سنہ 19ھ میں "قسطنطنیہ" فتح کیا اور پھر سنہ 25ھ یا 27ھ یا 28ھ میں بھی دوبارہ "قسطنطنیہ" فتح کیا تھا؟ ہرگز نہیں۔

معلوم ہوا کہ "بلاد روم" یا "ارض روم" عام ہے اور "قسطنطنیہ" ایک خاص شہر ہے، لہٰذا "ارض روم" یا "بلاد روم" پر حملوں کو "قسطنطنیہ پر حملہ" بنا کر پیش کرنا اور پھر یزید بن معاویہ والے حملے کو "قسطنطنیہ پر آخری حملہ" بتانا صرف تلبیس اور مغالطہ دہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

لعل شاہ صاحب کا ایک اور مغالطہ

لعل شاہ صاحب نے "ایک اور دلیل" کے عنوان سے ایک نیا مغالطہ بھی دیا ہے، چنانچہ رقم طراز ہیں:

"علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں، سنہ 50ھ میں بوطیانوس کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا طیباریوس بادشاہ ہوا، اس کی حکومت سات برس رہی، اسی کے زمانے میں یزید ابن معاویہ نے بسر کردیِ عساکرِ اسلامیہ قسطنطنیہ پر چڑھائی کی، ایک مدت تک اسے محاصرے میں رکھا، ابو ایوب الانصاری ؓ اس کے حصار میں شہید ہوئے اور وہیں دفن کردیے گئے، محاصرہ کے چند دنوں کے بعد یزید ابن معاویہ اور طیباریوس قیصر کی اس امر پر صلح ہوگئی کہ شام کے کل کنائس (گرجے) معطل کردیے جائیں اور کوئی شخص حضرت ابو ایوب الانصاری ؓ کی قبر سے تعرض نہ کرے، اس مصالحت کے ہوجانے سے اسلامی لشکر واپس آگیا (ترجمہ تاریخ ابن

خلدون،کتاب ثانی جلد دوم ص 129)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 339)

لعل شاہ صاحب اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"ابن الخلدون کی مندرجہ بالا تصریح سے صاف طور پر ثابت ہوگیا کہ یزید کا یہ حملہ عہدِ معاویہ رضی اللہ عنہ میں قسطنطنیہ پر آخری حملہ تھا، اس کے بعد مصالحت کی وجہ سے حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ۔

(استخلاف یزید، صفحہ 340)

تبصرہ:

پہلی بات یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے تاریخ ابن خلدون کی عبارت کا ترجمہ غلط کیا ہے، ابن خلدون کے عربی الفاظ یہ ہیں:

"وفي أيامه غزا يزيد بن معاوية القسطنطينية في عساكر المسلمين وحاصرها مدّة ثم أفرج عنها. واستشهد أبو أيوب الأنصاري في حصارها ودفن في ساحتها. ولما قفل عنها توعدهم بتعطيل كنائسهم بالشام إن تعرّضوا لقبره"۔

(تاریخ ابن خلدون،عربی، ج2ص270، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: اور اس (طیباریوس) کے زمانہ میں ہی یزید بن معاویہ نے عساکر اسلامیہ کے ساتھ قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی اور ایک مدت تک اس کا محاصرہ کیے رکھا، پھر محاصرہ ختم کر دیا، اسی محاصرے کے دوران حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کے (باہر) کھلی جگہ میں مدفون ہوئے، اور جب حملہ بند کر دیا (یعنی لشکر اسلام واپس ہونے لگا) تو (یزید بن معاویہ) نے دشمن کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر سے کوئی چھیڑ چھاڑ کی تو شام میں ان کے تمام گرجے بند کر دیے جائیں گے"۔

جبکہ لعل شاہ صاحب نے آخری الفاظ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"محاصرہ کے چند دنوں کے بعد یزید ابن معاویہ اور طیباریوس قیصر کی اس امر پر صلح ہوگئی کہ شام کے کل کنائس (گرجے) معطل کردیے جائیں اور کوئی شخص حضرت ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ کی قبر سے تعرض نہ کرے، اس مصالحت کے ہوجانے سے اسلامی لشکر واپس آگیا"۔

یعنی تاریخ ابن خلدون میں یہ ذکر ہے کہ یزید نے رومی عیسائیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے ہمارے جانے کے بعد حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کی تو یاد رکھنا! شام میں موجود تمہارے تمام گرجے بند کردیے جائیں گے۔ یعنی کسی قسم کی کوئی مصالحت یا صلح نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ لعل شاہ صاحب کے ترجمے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یزید نے عیسائیوں کے ساتھ اس بات پر صلح کی تھی کہ شام میں تمام گرجے بند کردیے جائیں گے اور کوئی حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی قبر سے تعرض نہ کرے۔ ظاہر ہے دونوں باتوں کے مفہوم میں بڑا فرق ہے۔

تنبیہ

علامہ ابن خلدون کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران شہید ہوئے تھے" واستشهد أبو أيوب الأنصاري في حصارها"، یہ بات بھی محل نظر ہے، کیونکہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ دوران جنگ زخم کھا کر شہید نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی وفات طبعی ہوئی تھی، واللہ اعلم۔

ثانیاً لعل شاہ صاحب نے اس عبارت سے جو نتیجہ نکالا ہے کہ" اس سے ثابت ہوگیا کہ یہ حملہ عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں قسطنطنیہ پر آخری حملہ تھا، اس کے بعد مصالحت کی وجہ سے حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"، یہ کیسے نکالا ہے؟ جبکہ ابن خلدون کی عبارت میں نہ مصالحت کے کسی قسم کے معاہدے کا کوئی ذکر ہے بلکہ دھمکی کا ذکر ہے، اور نہ ہی یہ ذکر ہے کہ اس کے بعد عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں ارض روم پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ تو اس سے یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ" مصالحت کی وجہ سے حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"؟ پھر کیا مسلمانوں نے اس کے بعد ارض روم یا قسطنطنیہ پر کوئی حملہ نہیں کیا؟ یا لعل شاہ صاحب کی مزعومہ مصالحت صرف" قسطنطنیہ شہر" کے ساتھ خاص تھی؟ (جبکہ لعل شاہ صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں " ارض روم" پر ہونے والے سولہ حملوں کو "قسطنطنیہ" پر حملہ ہی باور کرواتے ہیں، جیسا کہ پہلے بیان ہوا) کیونکہ خود علامہ ابن خلدون نے اس غزوہ کے بعد

بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ارض روم پر متعدد حملوں کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

"دخل بسر بن أرطاة سنة اثنتين وخمسين أرض الروم وشتّى بها وقيل رجع ونزل هنالك سفيان بن عوف الأزديّ فشتّى بها وتوفي هنالك انتهى. وغزا بالصائفة محمد بن عبد الله الثقفيّ، ثم دخل عبد الرحمن ابن أمّ الحكم سنة ثلاث وخمسين إلى أرض الروم وشتّى بها وافتتحت في هذه السنة رودس، فتحها جنادة بن أبي أميّة الأزديّ........ ثم دخل سنة أربع وخمسين الى بلاد الروم محمد بن مالك وشتى بها وغزا بالصائفة ابن يزيد السلميّ، وفتح المسلمون جزيرة أروى قرب القسطنطينيّة......... وفي سنة خمس وخمسين كان شتّى سفيان بن عوف بأرض الروم......وفي سنة ست وخمسين كان شتّى جنادة بن أبي أميّة...... وفي سنة سبع وخمسين كان شتّى عبد الله بن قيس بأرض الروم...... وفي سنة ثمان وخمسين كان شتّى عمر بن مرّة الجهنيّ بأرض الروم، وغزا في البحر جنادة بن أميّة، وفتح المسلمون في هذه السنة حصن كفخ من بلاد الروم، وعليهم عمير بن الحباب السلمي....... وفي سنة ستين غزا مالك بن عبد الله سويّة وملك جنادة بن أبي أمية رودس وهدم مدينتها"۔

(خلاصہ) سنہ 52ھ (گرمیوں) میں بسر بن ارطاۃ (رضی اللہ عنہ) سرزمین روم میں داخل ہوئے اور وہیں سردی کا موسم گزارا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ واپس آگئے تھے اور ان کی جگہ سردیوں میں سفیان بن عوف ازدی گئے تھے اور وہیں ان کی وفات ہوگئی۔ پھر سنہ 53ھ میں عبدالرحمن بن ام الحکم سرزمین روم میں داخل ہوئے اور سردیاں وہیں گزاریں، اسی سال جنادہ بن ابی امیہ ازدی نے "رودس" فتح کیا۔ پھر سنہ 54ھ کی سردیوں میں محمد بن مالک نے ارض روم پر لشکر

کشتی کی اور گرمیوں میں ابن یزید سلمی نے، اور مسلمانوں نے قسطنطنیہ کے قریب جزیرہ " اروی" فتح کیا۔ اور سنہ 55ھ کی سردیاں سفیان بن عوف نے ارض روم میں گزاریں۔ سنہ 56ھ کی سردیوں میں جنادہ ابن ابی امیہ نے حملہ کیا۔ سنہ 57ھ سردیوں میں عبداللہ بن قیس نے اور سنہ 58ھ میں عمر بن مرۃ جہنی نے۔ اسی سال مسلمانوں نے بلاد روم میں " کَفَخ" نامی قلعہ فتح کیا تھا۔ سنہ 60ھ میں مالک بن عبداللہ نے " سُوَیّہ" پر حملہ کیا اور جنادہ بن ابی امیہ نے " رودس" پر قبضہ کیا اور اس کے شہر کو گرا دیا.. "۔

(ملخصاً: تاریخ ابن خلدون، عربی، ج3ص22و 23، دار الفکر بیروت)

لہٰذا اگر قیصر روم (بوطیانوس) کے ساتھ سنہ 50ھ کے قریب مصالحت ہوگئی تھی اس شرط پر کہ شام میں عیسائیوں کے تمام گرجے بند کر دیے جائیں اور وہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر سے تعرض نہیں کریں گے تو پھر اس کے بعد قیصر روم کی سرزمین پر تقریباً ہر سال (حسب معمول) حملے کیوں ہوتے رہے؟ صلح کا معاہدہ کس نے توڑا تھا؟ قیصر روم نے یا مسلمانوں نے؟

ثالثاً لعل شاہ صاحب نے ابن خلدون کا حوالہ پیش کرنے کے بعد آگے لکھا ہے:

" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں قسطنطنیہ پر پہلا حملہ سنہ 48ھ میں سردیوں کے موسم میں بحری راستے سے ہوا تھا اور جیش کے سالار سفیان ابن عوف رضی اللہ عنہ تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 340)

پھر اس کے لئے انہوں نے متعدد مزید حوالے نقل کیے ہیں جن پر ہم آگے بات کریں گے، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ابن خلدون نے تو یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ:

"ثم دخل بسر بن أرطاة أرضهم سنة ثلاث وأربعين ومشى بها وبلغ القسطنطينيّة"۔

کہ سنہ 43ھ میں بسر بن ارطاۃ (رضی اللہ عنہ) ارض روم میں داخل ہوئے اور قسطنطنیہ تک جا پہنچے"۔

(تاریخ ابن خلدون، عربی، ج3ص11، دار الفکر بیروت)

تو کیا لعل شاہ صاحب کو علامہ ابن خلدون کی اس بات سے اتفاق نہ تھا جو وہ "قسطنطنیہ پر پہلا حملہ"

سنہ 48ھ میں بتا رہے ہیں؟

لعل شاہ صاحب کے پیش کردہ مزید حوالوں کا جائزہ

اب آئیے اس جگہ لعل شاہ صاحب نے جو مزید حوالے نقل کیے ہیں ان کا جائزہ لیتے ہیں، سب سے پہلے انہوں نے حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ کی کتاب "الاصابۃ، ص 54 ج 2" کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"جب سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ نے ارض روم پر حملہ کیا، باب الذہب تک پہنچے، اہل قسطنطنیہ نکلے، انہوں نے کہا: واللّٰه ما ندري أخطأتم الحساب، أم كذب الكتاب، أم استعجلتم المقدّر؟ فإنّا وانتم نعلم أنها ستفتح، ولكن ليس هذا زمانها۔ اللہ کی قسم ہم نہیں جانتے کہ آیا تم حساب کتاب میں خطا کر گئے ہو یا کتاب جھوٹی ہو گی یا تم نے معیار (میعاد۔ ناقل) مقررہ سے تعجیل کی ہے کہ ہم اور تم دونوں فریقین جانتے ہیں کہ قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ عنقریب فتح کیا جائے گا لیکن اس کا یہ وقت نہیں ہے"۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے علامہ بدر الدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح بخاری "عمدۃ القاری" کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

"قيل سير مُعَاوِيَة جَيْشًا كثيفاً مَعَ سُفْيَان بن عَوْف إِلَى الْقُسْطَنْطِينِيَّة" کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک جیش سفیان ابن عوف رضی اللہ عنہ کی معیت میں قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا"۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 340)

تبصرہ:

اولاً، مندرجہ بالا دونوں حوالوں میں صرف یہ ذکر ہے کہ سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کی معیت میں کوئی لشکر بھیجا گیا تھا لیکن یہ کب یا کس سن میں بھیجا گیا تھا؟ یہ یہاں مذکور نہیں۔

ثانیاً، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی سند بھی یہیں ذکر کی ہے، جو یہ ہے:

"وروى ابن عائذ، من طريق صفوان بن عمرو، عن الفرج بن محمد، عن بعض أشياخه، قال: كنّا مع سفيان بن عوف الغامديّ

سارين بأرض الرّوم، فأغار على باب الذّهب،حتى خرج أهل القسطنطينية..الخ"۔

(الاصابة، ج4ص378، دار هجر القاهرة)

یعنی ابن عائذ نے صفوان بن عمرو کے واسطے سے فرج بن محمد (بعض روایات میں" فرج بن یحمد" ہے) سے، اور اس نے اپنے بعض (نامعلوم ومجھول) مشائخ سے یہ بات بیان کی ہے۔

اس روایت کی مکمل سند حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ (م 571ھ) نے یوں بیان کی ہے:

"أخبرنا أبو محمد بن الأكفاني بقراءتي عليه نا عبد العزيز بن أحمد أنا أبو محمد بن أبي نصر أنا أبو القاسم بن أبي العقب أنا أحمد بن إبراهيم القرشي نا ابن عائذ نا الوليد بن مسلم نا إسماعيل بن عياش عن صفوان بن عمرو عن الفرج بن يحمد عن بعض أشياخه قال كنا مع سفيان بن عوف الغامدي...الخ"۔

(تاریخ دمشق، ج21ص350، دارالفکر بیروت)

اور یہ سند سخت ضعیف ہے،" فرج بن محمد" یا" فرج بن یحمد" نے اپنے جس" شیخ" سے یہ بات نقل کی ہے اس کا نام نہیں لیا،لہٰذا وہ راوی" مجھول" ہے اس کا نام تک معلوم نہیں۔اسی طرح اس کی سند میں" ولید بن مسلم دمشقی" ہیں جن کے بارے میں پہلے گذرا کہ یہ" تدلیس تسویہ" سے متصف ہیں، اور ایسے مدلس کے لئے سند کے تمام طبقات میں سماع یا تحدیث کی صراحت کرنا ضروری ہوتا ہے جو کہ اس سند میں انہوں نے نہیں کی۔

ثالثاً،علامہ عینی نے یہ بات" قیل" کے ساتھ ذکر کی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بات ضعیف ہے، انہوں نے اس کی کوئی سند بھی ذکر نہیں کی۔تاہم انہوں نے آگے بلا دلیل ایک اور بات بھی لکھی ہے کہ:

" وَكَانَ فِي ذَلِك الْجَيْش ابْن عَبَّاس وَابْن عمر وَابْن الزبير وَأَبُو أَيُّوب الْأَنْصَارِيّ وَتُوفِّي أَبُو أَيُّوب فِي مُدَّة الْحصار. قلت:الْأَظْهر أَن

هَؤُلَاءِ السادات من الصَّحَابَة كَانُوا مَعَ سُفْيَان هَذَا وَلم يَكُونُوا مَعَ يزِيد بن مُعَاوِيَة، لِأَنَّهُ لم يكن أَهلا أَن يكون هَؤُلَاءِ السادات فِي خدمته"

(سفیان بن عوف کی سرکردگی میں) جانے والے لشکر میں ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اور ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) بھی شامل تھے اور حضرت ابوایوب (رضی اللہ عنہ) کی وفات اسی لشکر کی طرف سے کیے گئے محاصرے کے دوران ہوئی۔ میں (یعنی" علامہ عینی") کہتا ہوں کہ: بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ معزز صحابہ کرام سفیان بن عوف (رضی اللہ عنہ) کی معیت میں گئے تھے نہ کہ یزید بن معاویہ کی معیت میں، کیونکہ یزید اس بات کے لائق ہی نہیں تھا کہ یہ معزز لوگ اس کے ماتحت ہوتے۔

(عمدة القاری، ج14ص198، دار احیاء التراث العربي بيروت)

ہم بصد احترام عرض کرتے ہیں کہ یہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کا نرا تحکم ہے، کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات اس غزوے میں ہوئی تھی جو یزید کی سرکردگی میں گیا تھا۔ نیز جس وقت یہ غزوہ ہوا، اس وقت یزید کی شخصیت و کردار پر کسی کو کوئی ایسا اعتراض یا اشکال نہیں تھا کہ اسے قیادت و امارت کے لئے نااہل قرار دیا جائے، ہاں اگر علامہ عینی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس غزوہ میں یزید تو شریک تھا لیکن لشکر کی امارت اس کے پاس نہیں بلکہ سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس تھی تو الگ بات ہے، لیکن اس صورت میں پھر کم از کم یہ تسلیم تو کرنا پڑے گا کہ یزید" اول جیش" میں شامل تھا۔

آگے لعل شاہ صاحب نے ایک بار پھر شیخ محمد الخضری کا حوالہ دیا ہے کہ:

"سنہ 48ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک عظیم لشکر فتح قسطنطنیہ کے لئے تیار کیا اور اس جیش کے امیر سفیان ابن عوف تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 340 و 341)

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ شیخ محمد الخضری نے یہیں آگے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"یہ لشکر سفیان بن عوف کی زیر قیادت تھا اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے اپنے بیٹے یزید کو بھی

ان کی معیت میں جہاد کرنے کا حکم دیا، اور اس لشکر میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی تھے، نیز عبدالعزیز بن زرارہ الکلابی بھی تھے، پس یہ روانہ ہوئے یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک پہنچ گئے.."۔

(محاضرات تاریخ الامم الاسلامیة، ج2ص114، طبع مصر)

لہٰذا لعل شاہ صاحب کے خیال میں اگر یہی قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والا سب سے پہلا لشکر تھا تو پھر انہیں اس میں یزید بن معاویہ کی شمولیت بھی تسلیم کرنا ہوگی۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

"السید احمد ابن ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وفي سنة تسع واربعين وقيل ثمان واربعين سيّر معاوية جيشاً كثيفاً الى بلاد الروم للغزو وجعل عليهم سفيان ابن عوف"۔

"سنہ 49ھ میں اور کہا گیا ہے کہ سنہ 48ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک کثیر لشکر بلاد روم کی طرف برائے غزوہ روانہ کیا اور اس پر سفیان ابن عوف کو سالار مقرر کیا"۔(الفتوحات الاسلامیۃ، ص161)۔

(استخلاف یزید، صفحہ 341)

اور پھر ایک اور کتاب "تاریخ دول الاسلام، ص165" سے یہ حوالہ نقل کرتے ہیں کہ:

"وفي سنة 49 ارسل معاوية جيشاً كثيفاً مع سفيان ابن عوف لافتتاح القسطنطنية"۔

"سنہ 48ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک عظیم جیش سفیان ابن عوف کی معیت میں روانہ کیا قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے پس وہ جرار لشکر کے ساتھ چلے یہاں تک کہ قسطنطنیہ کی دیواروں تک پہنچ گئے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 341)

تبصرہ:

سب سے پہلے ہم یہ وضاحت کر دیں کہ کتاب "الفتوحات الاسلامیة" کے مصنف کا نام "السید احمد ابن ذہبی" نہیں (جیسا کہ لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے) بلکہ یہ کتاب "السید احمد بن زینی بن احمد بن عثمان دحلان (م1303ھ) کی تصنیف ہے۔

اس کے بعد عرض ہے کہ لعل شاہ صاحب نے اس کتاب سے جو عبارت نقل کی ہے اس کے متصل بعد اگلی عبارت یہ ہے:

"وكان في الجيش عبدالله بن عباس وابن عمر وابن الزبير وابوايوب الانصاري ويزيد بن معاوية فأغلوا في بلاد الروم وحاصروا القسطنطينية واقتتل المسلمون والروم قتالاً شديداً واستشهد ابو ايوب رضي الله عنه ودُفن بالقرب من سورها..."

(جس لشکر کا سالار سفیان بن عوف کو مقرر کیا گیا) اس میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) اور یزید بن معاویہ بھی شامل تھے، پس یہ لشکر بلاد روم میں پیش قدمی کرتا رہا اور انہوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا، اور مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان شدید لڑائی ہوئی اور حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہ) شہید ہو گئے جنہیں شہر کی فصیل کے قریب ہی دفن کر دیا گیا۔

(الفتوحات الاسلامية بعد مضي الفتوحات النبوية، ج1ص162، مطبعة السعادة مصر)

معلوم نہیں لعل شاہ صاحب نے یہ والی عبارت کیوں نقل نہیں کی؟ شاید اس لئے کہ اس سے یزید بن معاویہ کا بھی اسی لشکر میں شامل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

تنبیہ

مندرجہ بالا عبارت سے بھی علامہ ابن خلدون کی عبارت کی طرح بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جنگ کے دوران زخمی ہو کر شہید ہوئے تھے، جبکہ یہ بات درست نہیں، آپ نے محاصرے کے دوران طبعی وفات پائی تھی۔

جہاں تک دوسری کتاب "تاریخ دول الاسلام" کی بات ہے تو لعل شاہ صاحب نے اس کے مصنف کا نام نہیں لکھا، اس کا نام ہے "رزق الله منقريوس الصدفي"، یہ صاحب مصر کے قبطی عیسائی تھے اور ان کی وفات 1356ھ مطابق 1908ء کے قریب ہوئی۔ اور شاید اسی وجہ سے کہ یہ عیسائی تھے انہوں نے یہیں آگے "سفیان بن عوف" کے لشکر کے بارے میں یہ افسانہ بھی لکھا ہے کہ:

"(خلاصہ) جب یہ لشکر قسطنطنیہ کی فصیل کے قریب پہنچا تو رومیوں نے اس پر ایسی خاص قسم کی آگ برسانا شروع کر دی جو جہاں لگتی تھی پھر بجھتی نہیں تھی، یہاں تک کہ ساحل پر لنگر انداز اسلامی بحری بیڑا سارا کا سارا مکمل طور پر جل کر تباہ ہو گیا، اور اسلامی لشکر نے اس غزوہ میں بہت بھاری نقصان اٹھایا اور شاہِ روم نے انہیں اس شرط پر جانے دیا کہ وہ اسے تیس سال کا خراج دیں گے.. وخسر الجيش الاسلامي في هذه الغزوة خسائر جمة ورجع بخفي حنين بعد نال منه ملك الروم صلحاً أن يدفع له خراج ثلاثين سنة.."۔

(تاريخ دول الاسلام، ج1ص49، مطبعة الهلال، مصر)

لیجئے! موصوف لکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے سپہ سالار نے شہنشاہ روم کو تیس سال کا خراج دینے کی شرط قبول کر کے اپنی اور اپنے لشکر کی جان بچائی، اب معلوم نہیں لعل شاہ صاحب نے اس "عیسائی" مصنف کی یہ عبارت بھی دیکھی تھی یا نہیں؟ اور کیا وہ اس کی اس کہانی سے بھی متفق ہیں یا نہیں؟ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر لعل شاہ صاحب کو کیا مجبوری پیش آئی کہ انہیں ایسی غیر مستند اور رطب و یابس پر مشتمل کتابوں کے حوالے دینے پڑے؟

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے ایک اور کتاب "النجوم الزاہرۃ" کا حوالہ بھی دیا ہے کہ:

"سنہ 49ھ آپ نے قسطنطنیہ کی جانب زبردست لشکر روانہ کیا جس کا سپہ سالار سفیان ابن عوف کو مقرر فرمایا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 341)

جب ہم نے اس کتاب کو دیکھا تو اس کتاب میں یہیں اگلی عبارت میں ایک من گھڑت افسانے کا بھی ذکر ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو بھی اس (سفیان بن عوف والے) لشکر میں شامل ہونے کا حکم دیا لیکن یزید نے پس وپیش سے کام لیا اور جان چھڑانے کی کوشش کی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی مزید اصرار نہ کیا... فامسك عنه ابوه...اسی دوران (خبر آئی کہ سفیان بن عوف کے لشکر کو ”فرقدونہ“ کے مقام پر) بھوک اور شدید بیماری کا سامنا ہے، جس پر یزید نے ایسے شعر کہے جن کا مفہوم تھا کہ : مجھے کوئی فکر نہیں کہ لوگ فرقدونہ کے مقام پر بھوک اور بیماری سے مر رہے ہیں، جبکہ میں دیر مران نامی جگہ میں کمروں میں تکیہ لگائے آرام کر رہا ہوں اور میرے پاس ام کلثوم بھی ہے (”ام کلثوم بنت عبداللہ بن عامر بن کریز“ یزید کی بیوی تھی۔ناقل)، جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے بیٹے کے ان اشعار کا پتہ چلا تو انہوں نے قسم کھائی کہ وہ یزید کو بھی سفیان کے پاس ارضِ روم اسی جگہ بھیجیں گے تاکہ جو تکالیف دوسرے لوگوں کو لاحق ہوئی ہیں وہ اسے بھی لاحق ہوں۔پس یزید اپنی معیت میں ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوگیا، اس لشکر میں ابن عباس، ابن عمر، ابن عمرو، ابن زبیر اور ابوایوب انصاری اور دوسرے لوگ بھی شامل تھے (رضی اللہ عنہم)، پس انہوں نے پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک جا پہنچے..الخ“۔

(النجوم الزاهرة في ملوك مصر والقاهرة، ج1ص134و 135، مصر)

ہم آگے اس پر بات کریں گے کہ یہ افسانہ جس روایت کی بنیاد پر بنایا گیا وہ جھوٹی، من گھڑت اور یزید بن معاویہ پر سبائی تہمت ہے، سر دست ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ”النجوم الزاہرۃ“ کا حوالہ پیش کرتے ہوئے بھی لعل شاہ صاحب نے ڈنڈی ماری ہے اور اگلی بات نقل نہیں کی جس میں یزید بن معاویہ کے سفیان بن عوف کے لشکر کی مدد کے لئے ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ ہونے اور پھر پیش قدمی کرتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچنے کا ذکر ہے۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے ایک حوالہ یہ نقل کیا ہے :

”تیسرا حملہ سنہ 48ھ مطابق سنہ 668ء، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسطنطنیہ پر بری و بحری فوج روانہ

کی، سپہ سالار ابوسفیان بن عوف (درست "سفیان بن عوف" ہے۔ناقل) تھے"۔(معاویہ از ابوالنصر، ص136)۔

(استخلاف یزید، صفحہ 342)

ہم نے جب لبنانی مصنف "عمر ابوالنصر" (1888ء-1960ء) کی یہ کتاب دیکھی تو انکشاف ہوا کہ اس حوالے میں بھی لعل شاہ صاحب نے نامکمل عبارت نقل کی ہے، اس سے آگے یہیں یہ الفاظ بھی ہیں:

"...وأمر ابنه يزيد ان يغزو معهم وكان في هذا الجيش ابن عباس وابن عمر وابن الزبير وابو ايوب الانصاري وغيرهم"۔

یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر جہاد کرے، اس لشکر میں ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اور ابوایوب انصاری وغیرہ (رضی اللہ عنہم) بھی تھے"۔

(معاوية بن ابي سفيان-عمر ابوالنصر، ص70، المطبعة الوطنية بيروت)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے ایک دوسرے لبنانی مصنف "انیس زکریا النصولی" (1902ء-1957ء) کی کتاب کا حوالہ بھی نقل کیا ہے اور اس حوالے میں خود لعل شاہ صاحب نے نقل کیا ہے کہ:

"آپ نے بلاد روم (اناضول) کی طرف ایک بڑا بھاری لشکر بھیجا تھا اور سفیان بن عوف کو سپہ سالار بنایا تھا اور اپنے بیٹے یزید کو اس کے ساتھ روانہ کیا تھا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 342)

اور آخر میں لعل شاہ صاحب نے "شاہ معین الدین" (1903ء-1973ء) کی کتاب "سیر الصحابة" کا حوالہ یوں نقل کیا ہے:

"اس سلسلے میں انہوں نے سنہ 49ھ میں بڑے ساز وسامان کے ساتھ ایک لشکر جرار سفیان ابن عوف کی ماتحتی میں قسطنطنیہ روانہ کیا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 342)

اس حوالے میں ایک تو سنہ 48ھ کے بجائے سنہ 49ھ ہے، دوسرا جب ہم نے اس کتاب کی

طرف رجوع کیا تو اسی صفحے پر اسی غزوے کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب نے بھی لکھا ہے:

"حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اسی مہم میں وفات پائی، وفات سے پہلے یزید نے پوچھا کہ کوئی وصیت ہو تو ارشاد فرمائیں، اس کی تعمیل کی جائے گی، فرمایا دشمن کی سرزمین سے (قریب) جہاں تک لے جاسکو لے جا کر دفن کر دینا، چنانچہ اس وصیت پر عمل کیا گیا اور میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لاش مشعل کی روشنی میں قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے لے جا کر دفن کر دی گئی"۔

(سیر الصحابہ، ج 4 ص 69، دار الاشاعت کراچی)

تو ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ اول تو جس روایت کی بنیاد پر حافظ ابن حجر وغیرہ نے سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کے حملے کا ذکر کیا ہے وہ روایت ہی سنداً صحیح نہیں، اور اگر قبول بھی کی جائے تو جن مصنفین نے سنہ 48ھ یا 49ھ میں سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کے لشکر کا ذکر کیا ہے انہوں نے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اسی لشکر میں دوسرے صحابہ کرام اور یزید بن معاویہ بھی شامل تھے، اور بعض نے اسی غزوے میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہونے کا بھی ذکر کیا ہے، اور یہ بات تو لعل شاہ صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جس غزوہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تھی اس میں یزید شامل تھا (وہ اسے امیر لشکر تسلیم کریں یا نہ کریں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ "مغفور لھم" کی بشارت صرف امیرِ لشکر کے لئے نہیں بلکہ اس لشکر میں شامل تمام لوگوں کے لئے ہے)۔

چنانچہ لعل شاہ صاحب کو بھی اس بات کا علم تھا کہ ان کے پیش کردہ حوالوں میں اسی لشکر میں یزید بن معاویہ کا شامل ہونا بھی مذکور ہے، تو اب بات کو مزید الجھانے کے لئے لکھتے ہیں:

"مندرجہ بالا عبارات سے اتنی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قسطنطنیہ پر پہلے حملہ آور لشکر کے سپہ سالار سفیان بن عوف تھے، یزید ابن معاویہ نہ تھے، البتہ ان میں سے بعض کتابوں میں تصریح ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو بھی اس لشکر میں روانہ کیا تھا اور حضرت ابو ایوب الانصاری و دیگر صحابہ بھی اس لشکر میں شریک تھے۔ سو گزارش ہے کہ یہ نتیجہ ہے اختلاط روایات

کا، ورنہ جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے کہ یزید ابن معاویہ آخری لشکر کا سالار تھا، وہ پہلے لشکروں میں شامل نہ تھا اور سیدنا ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ اس لشکر میں شریک تھے جو سنہ 52ھ میں یزید ابن معاویہ کی امارت میں روانہ ہوا تھا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 342و343)

<u>تبصرہ:</u>

یعنی لعل شاہ صاحب خود تسلیم کر رہے ہیں کہ انہوں نے اپنا یہ دعویٰ ثابت کرنے کے لئے کہ "قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ سنہ 48ھ میں ہوا تھا اور اس لشکر کے سالار سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ تھے" جو حوالے پیش کیے ہیں ان میں روایات خلط ملط ہو گئی ہیں اور اصل حقیقت کھو گئی ہے۔ کاش لعل شاہ صاحب وہ "روایات" بھی ذکر کر دیتے جن کے "اختلاط" کی وجہ سے انہی کی پیش کردہ عبارات کے مصنفین غلطی کا شکار ہوئے تو ہمیں یہ معلوم کرنے میں آسانی ہو جاتی کہ "اختلاط روایات" کیسے ہوا ہے؟

پھر لعل شاہ صاحب نے ایک بار پھر جو یہ دعویٰ دہرایا ہے کہ:

" ثابت ہو چکا ہے کہ یزید ابن معاویہ آخری لشکر کا سالار تھا"۔

تو عرض ہے کہ ان کا یہ دعویٰ ابھی تک صرف دعویٰ ہی ہے بلکہ ان کا مفروضہ ہی ہے، انہوں نے کوئی ایک حوالہ بھی ایسا نہیں پیش نہیں کیا جس میں یہ تصریح ہو کہ "حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران سنہ 52ھ میں قسطنطنیہ پر ہونے والا حملہ آخری حملہ تھا" اور نہ ہی وہ ایسی کوئی تصریح پیش کر سکے ہیں کہ "سنہ 52ھ سے پہلے یزید کسی لشکر میں شامل نہیں تھا"۔ جبکہ ہم پہلے "تاریخ ابن خلدون" کے حوالے سے ذکر کر آئے ہیں کہ سنہ 52ھ کے بعد بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے سال (سنہ 60ھ) تک ارض روم پر حملے ہوتے رہے، (اور لعل شاہ صاحب کے نزدیک "ارض روم" پر حملے قسطنطنیہ پر حملے ہی شمار ہوتے ہیں)۔ نیز لعل شاہ صاحب نے اپنے حق میں جو حوالے پیش کیے ہیں ان ہی میں سنہ 52ھ سے پہلے روانہ ہونے والے لشکر میں یزید بن معاویہ کے شریک ہونے کی صراحت ہے۔

یاد رہے! جیسا کہ پہلے بیان ہوا، یزید کی ماتحتی میں جانے والا لشکر کس سال گیا؟ اس پر مؤرخین کا ہرگز اتفاق نہیں ہے، بلکہ قدیم کتب تاریخ میں سنہ 49ھ سے سنہ 52ھ تک مختلف اقوال ملتے ہیں، اسی طرح

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات کس سال میں ہوئی؟ اس میں بھی مختلف اقوال ہیں جس کا اقرار خود لعل شاہ صاحب نے بھی کیا ہے (دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 237و238)۔

لعل شاہ صاحب کا ایک اور مغالطہ

جیسا کہ معلوم ہوا، لعل شاہ صاحب کے اپنے پیش کردہ حوالوں میں سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ والے لشکر میں یزید بن معاویہ کی شمولیت کا بھی ذکر موجود تھا جس سے لعل شاہ صاحب کے مفروضے کی ساری عمارت زمیں بوس ہوتی تھی تو اس سے بچنے کے لئے پہلے تو انہوں نے اسے "اختلاط روایات کا نتیجہ" قرار دے کر جان چھڑانے کی کوشش کی، لیکن وہ جانتے تھے کہ انہوں نے یہ ہوا میں تیر چلایا ہے، تو پھر انہوں نے ایک نیا مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ فرمائیں، عنوان لکھتے ہیں:

"ابن اثیر اور ابن خلدون نے حقیقت بے نقاب کر دی"

اور پھر رقمطراز ہیں:

"کسی حد تک یہ بھی صحیح ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو اس لشکر میں جانے کا حکم دیا تھا، مگر یزید نے اس حکم کی تعمیل میں سستی کی اور اس لشکر کا ساتھ نہ دیا، چنانچہ ابن اثیر اور ابن خلدون لکھتے ہیں..."۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے وہی افسانہ بیان کیا ہے جو ہم پہلے "النجوم الزاہرہ" کے حوالے سے نقل کر آئے ہیں اور جس میں ہے کہ:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پہلے یزید کو بھی سفیان بن عوف کے لشکر کے ساتھ جانے کا حکم دیا تھا لیکن وہ ٹال مٹول کر کے نہ گیا، پھر جب اس لشکر کے بارے میں خبر آئی کہ انہیں بھوک اور شدید بیماری کا سامنا ہے، تو یزید نے ایسے شعر کہے جن کا مفہوم تھا کہ: مجھے کوئی فکر نہیں کہ لوگ فرقدونہ کے مقام پر بھوک اور بیماری سے مر رہے ہیں، جبکہ میں دیر مران نامی جگہ میں کمروں میں تکیہ لگائے آرام کر رہا ہوں اور میرے پاس (میری بیوی) ام کلثوم بھی ہے، جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے بیٹے کے ان اشعار کا پتہ چلا تو انہوں نے قسم کھائی کہ وہ یزید کو بھی سفیان

کے پاس ملک روم اسی جگہ بھیجیں گے تا کہ جو تکالیف دوسرے لوگوں کو لاحق ہوئی ہیں وہ اسے بھی لاحق ہوں، پس اپنی معیت میں ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوگیا، اس لشکر میں ابن عباس، ابن عمر، ابن عمرو، ابن زبیر اور ابوایوب انصاری اور دوسرے لوگ بھی شامل تھے (رضی اللہ عنہم)، پس انہوں نے پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک جا پہنچے..الخ"۔

لیکن یہاں بھی لعل شاہ صاحب نے حوالہ تو ابن اثیر کی "الکامل فی التاریخ" اور "تاریخ ابن خلدون" کا دیا ہے لیکن بات ادھوری ہی نقل کی ہے۔ چنانچہ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ:

"فَسَارَ وَمَعَهُ جَمْعٌ كَثِيرٌ أَضَافَهُمْ إِلَيْهِ أَبُوهُ، وَكَانَ فِي هَذَا الْجَيْشِ ابْنُ عَبَّاسٍ وَابْنُ عُمَرَ وَابْنُ الزُّبَيْرِ وَأَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ وَغَيْرُهُمْ وَعَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ زُرَارَةَ الْكِلَابِيُّ، فَأَوْغَلُوا فِي بِلَادِ الرُّومِ حَتَّى بَلَغُوا الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ.."۔

پس (یزید) روانہ ہوا اور اس کے والد (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) نے اس کے ساتھ ایک بہت بڑی جماعت بھی کردی، اس لشکر میں ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر، ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) اور دوسرے حضرات کے علاوہ عبدالعزیز بن زرارہ الکلابی بھی تھے، یہ لوگ بلاد روم میں پیش قدمی کرتے ہوئے قسطنطنیہ تک جا پہنچے.."۔

(الكامل في التاريخ، ص479و 480، بيت الافكار الدولية، الرياض)

نوٹ: ابن اثیر نے یہ واقعہ سنہ 49ھ یا سنہ 50ھ کا بتایا ہے (نہ کہ سنہ 48ھ کا)۔

بلکہ ابن اثیر نے آگے یہ بھی بیان کیا ہے کہ:

"ثُمَّ رَجَعَ يَزِيدُ وَالْجَيْشُ إِلَى الشَّامِ وَقَدْ تُوُفِّيَ أَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ عِنْدَ الْقُسْطَنْطِينِيَّةِ فَدُفِنَ بِالْقُرْبِ مِنْ سُورِهَا"۔

پھر یزید اور لشکر شام واپس لوٹے، جبکہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی (اسی مہم میں) وفات ہوگئی تھی اور انہیں قسطنطنیہ کی فصیل کے پاس ہی دفن کردیا گیا تھا"۔

(ایضاً)

اسی طرح ابن خلدون نے بھی یزید کے جانے کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے:

"فأوغلوا في بلاد الروم وبلغوا القسطنطينيّة وقاتلوا الروم عليها، فاستشهد أبو أيوب الأنصاري ودفن قريبا من سورها ورجع يزيد والعساكر إلى الشام"۔

پس وہ بلاد روم میں پیش قدمی کرتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ گئے اور رومیوں سے جنگ کی، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوگئی اور انہیں قسطنطنیہ کی دیوار کے پاس ہی دفن کر دیا، اور یزید مع افواج کے شام واپس لوٹ آیا۔

(تاریخ ابن خلدون، ج3ص12، دار الفکر بیروت)

نوٹ: ابن خلدون نے یہ واقعہ سنہ 50ھ کا بتایا ہے (نہ کہ سنہ 48ھ کا)، نیز ان کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جنگ کے دوران شہید ہوئے تھے، جبکہ باقی تمام مؤرخین ان کی بیماری اور طبعی وفات کا ذکر کرتے ہیں۔

الغرض! لعل شاہ صاحب نے ان دونوں کتابوں سے حوالے نقل کرتے ہوئے ادھوری عبارات نقل کی ہیں صرف یہ تاثر دینے کے لئے کہ یزید نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم کے باوجود اس کی تعمیل نہیں کی اور اس لشکر کا ساتھ نہیں دیا تھا، بلکہ انتہائی تلبیس کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ام کلثوم یزید کی بیوی کا نام ہے، عساکر اسلامیہ بھوک اور وباء میں مبتلا ہیں اور جناب یزید ابن معاویہ دیر مران میں انتہائی تعیش اور فرحت و انبساط میں گا رہا ہے کہ میری بلا سے کہ کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے

معشوق ہو بغل میں جلسے ہوں مے کشی کے
اپنے لئے یہی ہیں سامان دل لگی کے

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب مسطورہ اشعار سنے تو شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا اور دوبارہ لشکر میں شریک ہونے کا حکم دیا، اندازہ ہے کہ یہاں ہی اس نے درخواست پیش کی کہ (تولني الصائفة) کہ مجھے صائفہ (یعنی "گرمیوں والے لشکر"۔ناقل) کی ولایت عنایت فرمائیں،

درخواست میں دو مطالبے ہیں، ایک یہ کہ میں بحری لڑائی نہیں لڑوں گا، اور دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ مجھے لڑائی میں ماتحتی میں جانا گوارا نہیں ہے۔ تب سنہ 52ھ میں گرمیوں کے موسم میں بری لشکر کے سپہ سالار بن کر قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے اور اسی لشکر میں حضرت ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے، وہیں انہوں نے وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے.. "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 344)

ملاحظہ فرمائیں! ایک طرف تو لعل شاہ صاحب ابن الاثیر، ابن خلدون اور لبنانی و مصری قبطی مصنفین کے حوالوں پر حوالے پیش کرتے ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلے حملہ کرنے والے لشکر کے سالار سفیان بن عوف تھے، لیکن جب انہی حوالوں سے یزید بن معاویہ کا ایک بڑے لشکر کے ساتھ سفیان بن عوف کی مدد کے لئے نکلنا اور قسطنطنیہ تک پیش قدمی کرنا بھی ثابت ہوتا ہے تو لعل شاہ صاحب وہاں اپنے "اندازے" اور "مفروضے" پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس بات کو نہیں مانتے۔ شاید اسے ہی کہتے ہیں:

میٹھا میٹھا ہَپ ہَپ کڑوا کڑوا تُھو تُھو

یہ افسانہ ہی من گھڑت اور جھوٹا ہے

اب آئیے ہم بتاتے ہیں کہ عساکر اسلامیہ کے بھوک و بیماری میں مبتلا ہونے کی خبر پر یزید کے اشعار کہنے اور پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اسے زبردستی غزوہ میں بھیجنے کا سارا افسانہ ہی جھوٹا، من گھڑت اور "سبائی الفکر" لوگوں کی تہمت ہے، ابن خلدون، ابن اثیر اور لعل شاہ صاحب کے "معتبر ترین" لبنانی و مصری مؤرخین میں سے کسی نے بھی اس واقعہ کی سند ذکر نہیں کی، ہم اس روایت کی استنادی حیثیت واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ افسانہ کہاں سے لیا گیا؟

دراصل یہ کہانی احمد بن یحییٰ البلاذری (م 279ھ) نے نقل کی ہے، آئیے اس کی سند دیکھتے ہیں:

"حَدَّثَنِي أَبُو مَسْعُودٍ الْكُوفِيُّ عَنْ عَوَانَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ :أَغْزَى مُعَاوِيَةُ النَّاسَ فِي سَنَةِ خَمْسِينَ وَعَلَيْهِمْ سُفْيَانُ بْنُ عَوْفٍ وَأَمَرَ يَزِيدَ بِالْغَزْوِ

فَتَثَاقَلَ وَاعْتَلَّ فَأَمْسَكَ عَنْهُ...الخ"۔

مجھ سے ابو مسعود کوفی نے بیان کیا، اس نے عوانہ (بن الحکم) سے اور اس نے اپنے والد (حکم) سے کہ حضرت معاویہ نے سنہ 50ھ میں لوگوں کو غزوے کے لئے بھیجا تو اس کا امیر سفیان بن عوف کو بنایا اور یزید کو حکم دیا کہ وہ بھی ان میں شامل ہو، لیکن یزید نے ٹال مٹول کیا اور شامل نہیں ہوا... (آگے وہی یزید کی شعر گوئی کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو علم ہونے اور ان کے قسم کھانے کا بیان ہے کہ میں یزید کو بھی وہاں بھیجوں گا خواہ یہ مر ہی کیوں نہ جائے)"۔

(انساب الاشراف للبلاذري، ج5ص93و 94، دارالفكر بيروت)

اس سند میں جو "ابو مسعود کوفی" ہے یہ مجہول راوی ہے، ہمیں اس کا تعارف کہیں نہیں ملا، دوسرا راوی "عوانہ بن الحکم" ہے، اس کی توثیق بھی کہیں نہیں ملتی، امام ذہبی نے بھی اتنا لکھا ہے:

"أخباريٌّ مشهور عراقيٌّ ...... وَقَلَّ أَنْ رَوَى حديثًا مسنَدًا، ولهذا لم يُذكر بجرح ولا تعديل، والظاهر أَنَّهُ صدوق"۔

تاریخی روایات بیان کرنے والا مشہور عراقی ہے، بہت کم روایتیں سند کے ساتھ بیان کرتا ہے اسی لئے نہ اس پر کوئی جرح ملتی ہے اور نہ اس کی تعدیل ملتی ہے، ظاہری طور پر لگتا ہے کہ یہ صدوق ہے۔

(تاريخ الاسلام للذهبي، ج4ص174، دار الغرب الاسلامي)

حافظ ابن حجر اسی "عوانہ بن الحکم" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"كان أبوه عبدا خياطا وأُمُّه أَمَة وهو كثير الرواية عن التابعين قلَّ أن روى حديثا مسندا وأكثر المدائني عنه"۔

اس کا باپ ایک غلام تھا جو کہ درزی تھا اور اس کی ماں ایک باندی تھی، وہ تابعین سے بہت سی باتیں روایت کرتا ہے لیکن بہت کم ایسا ہے کہ اس نے کوئی بات مسند بیان کی ہو، مدائنی نے اس سے بہت زیادہ روایات لی ہیں۔

(لسان الميزان بتحقيق شيخ ابي غدة،ج6ص247، دار البشائر الاسلامية)

یعنی"عوانہ بن الحکم" کی تعدیل وتوثیق کہیں نہیں ملتی نیز اس کی اکثر روایات غیر مسند ہی ہوتی ہیں۔اسی طرح"عوانہ" کا باپ یعنی"حکم" بھی نامعلوم اور مجہول ہے،وہ ایک غلام تھا جو درزی کا کام کرتا تھا،اس کے علاوہ اس کا کوئی تعارف نہیں ملتا۔لہٰذا یہ روایت من گھڑت اور جھوٹی ہے۔

نوٹ: حافظ ابن عساکر نے بھی اس سے ملتی جلتی ایک روایت دوسری سند سے نقل کی ہے جس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جب یزید کو خبر ملی کہ فرقدونہ میں اسلامی لشکر بھوک اور شدید بیماری کا شکار ہوا ہے اس وقت وہ شراب نوشی میں مصروف تھا اور ایک گانے والی اسکے پاس گا رہی تھی (تاریخ دمشق،ج65 ص405)اس کو بیان کرنے والا"محمد بن داب" نامی راوی ہے جو کہ"کذاب" اور جھوٹا ہے۔

(الجرح والتعديل لابن ابي حاتم، ج7ص250، حيدرآباد دكن / تهذيب الكمال، ج25ص172، مؤسسة الرسالة بيروت / الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة،ج2ص169، دار القبلة، جدة / المغني في الضعفاء للذهبي، ج2ص192، قطر / تهذيب التهذيب، ج9ص 153)۔

یاد رہے! تاریخ ابن عساکر کی ایسی ہی روایات سے متعلق حافظ ابن کثیر نے ایک اصولی بات لکھی ہے کہ:

"وَقَدْ أَوْرَدَ ابْنُ عَسَاكِرَ أَحَادِيثَ فِي ذَمِّ يَزِيدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ كُلُّهَا مَوْضُوعَةٌ لَا يصح شئ مِنْهَا.."۔

ابن عساکر نے یزید کی مذمت میں بہت سی روایات نقل کی ہیں جو سب موضوع اور من گھڑت ہیں،ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔

(البداية والنهاية، ج8ص327، وزارة الاوقاف قطر)

اسی طرح"ابو الفرج الاصفہانی" (م356ھ) نے اس طرح کی ایک روایت نقل کی ہے جس کی سند یوں ہے:

"أخبرني علي بن سليمان الأخفش قال:حدثني السكري والمبرد عن دماذ أبي غسان،واسمه رفيع بن سلمة عن أبي عبيدة ...."۔

(كتاب الأغاني، ج17،ص151، دار صادر بيروت)

یہ سند بھی شدید قسم کی ضعیف بلکہ باطل ہے، "ابوغسان رفیع بن سلمة دماذالعبدي اللبابي" انتہائی بدزبان قسم کا شاعر تھا، چنانچہ اس کے بارے میں یاقوت بن عبداللہ الحموی (م626ھ) لکھتے ہیں:

"وكان شاعرا هجّاء خبيث اللسان" یعنی یہ لوگوں کی برائیاں بیان کرنے والا (ہجوگو) خبیث زبان والا ایک شاعر تھا۔

(إرشاد الأريب إلى معرفة الأديب، ج3ص1307، دار الغرب الاسلامي بيروت)

نیز یہ بات بیان کرنے والے راوی "ابوعبیده مَعمر بن المُثنى التيمي" کی اپنی پیدائش ہی سنہ 110ھ کی ہے (سير اعلام النبلاء، ج9ص445، الرسالة)، جبکہ قسطنطنیہ پر حملے کا جو واقعہ وہ بیان کر رہا ہے وہ اس کی پیدائش سے کم و بیش ساٹھ سال پہلے کا ہے، لہٰذا یہ معلوم نہیں کہ اس نے یہ بات کس کے واسطے سے بیان کی ہے۔

اور یہ بات میں ذہن میں رہے کہ یزید کے بارے میں یہ کہنا کہ جب اسے فرقدونہ میں اسلامی لشکر کی بھوک اور شدید بیماری کی خبر ملی تو اس وقت وہ شراب نوشی میں مصروف تھا یا اس نے انتہائی تعیش اور فرحت میں اشعار گائے، یہ ایسی بات ہے جسے ثابت کرنے کے لئے اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہونا ضروری ہے جس نے اسے ایسا کرتے دیکھا، اور حالت یہ ہے کہ ابن اثیر و ابن خلدون نے تو اس واقعہ کی سند بھی ذکر کرنے کی زحمت نہیں کی، اور جس نے سند ذکر کی ہے اس سند کا حال آپ کے سامنے ہے۔

پھر جنہوں نے اس من گھڑت اور جھوٹے واقعہ کو نقل کیا ہے، وہ ساتھ یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس واقعہ کا علم ہونے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے اور انہوں نے یزید کو سختی کے ساتھ ارض روم میں موجود لشکر کی مدد کے لئے روانہ ہونے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ایک بہت بڑا لشکر بھی کر دیا جس میں متعدد صحابہ کرام بھی تھے اور یہ لشکر شام سے روانہ ہو کر پیش قدمی کرتا ہوا قسطنطنیہ تک جا پہنچا، لیکن لعل شاہ صاحب کو یہ بات بھی ہضم نہیں ہوتی اور وہ اپنا "اندازہ" بتاتے ہیں کہ یزید پھر بھی نہ گیا اور اس نے دو مطالبے رکھے کہ ایک تو میں بحری لڑائی نہیں لڑوں گا اور دوسرا میں کسی کا ماتحت بن کر نہیں جاؤں گا، تب اسے بعد کے زمانہ یعنی سنہ 52ھ میں بری لشکر کا سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا اور وہ قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا۔

خلاصہ کلام یہ کہ لعل شاہ صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ سنہ 48ھ

میں ہوا اور اس لشکر کی قیادت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، جن کتابوں کے حوالے پیش کئے، ان میں سے کسی بھی کتاب میں اس افسانے کی کوئی سند مذکور نہیں، اور جس روایت کی بنیاد پر یہ بات لکھی گئی، جب ہم نے اس روایت کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ روایت ہی صحیح نہیں، پھر اسی روایت میں صریح طور پر یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کی مدد کے لئے یزید کی قیادت میں ایک دوسرا بڑا لشکر روانہ کیا تھا جو قسطنطنیہ تک جا پہنچا، لیکن لعل شاہ صاحب اپنے ہی پیش کردہ حوالوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور اپنا "اندازہ" لگاتے ہیں کہ یزید اس لشکر کی مدد کے لئے نہیں گیا تھا۔

لعل شاہ صاحب کی "تحقیق مزید"

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اپنی کتاب کے صفحہ 344 تک تو لعل شاہ صاحب نے اس بات کو ثابت کرنے پر زور لگایا کہ:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں قسطنطنیہ پر پہلا حملہ سنہ 48ھ میں سردیوں کے موسم میں بحری راستہ سے ہوا تھا اور اس جیش کے سالار سفیان ابن عوف رضی اللہ عنہ تھے، چنانچہ مؤرخین ومحدثین نے اس کی تصریح کی ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 340)

لیکن پھر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے اسی کتاب کے صفحہ 345 پر اپنے اس سابقہ دعوے کو غلط قرار دیتے ہوئے نئی تحقیق پیش کر دی، چنانچہ لکھا کہ:

"اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ حال تھا ان لشکروں کا جنہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قسطنطنیہ پر حملے کئے تھے، ان میں سے پہلا حملہ سنہ 48ھ میں سفیان ابن عوف رضی اللہ عنہ کی امارت میں ہوا، اور سب سے آخری حملہ یزید ابن معاویہ کی امارت میں۔ مگر سب سے پہلا حملہ قسطنطنیہ پر سنہ 48ھ میں نہیں ہوا تھا بلکہ از روئے تحقیق اس سے بہت پہلے سنہ 32ھ میں ہو چکا تھا اور لشکر کے امیر خود امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 345)

ملاحظہ فرمائیں! لعل شاہ صاحب نے تقریباً چھ صفحات یہ ثابت کرنے کے لئے سیاہ کیے کہ قسطنطنیہ پر

سب سے پہلا حملہ سنہ 48ھ میں سفیان بن عوف کی ماتحتی میں ہوا تھا،لیکن پھر وہ خود اپنے اس دعوے کو غلط قرار دے کرنیا دعویٰ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

"....مگر سب سے پہلا حملہ قسطنطنیہ پر سنہ 48ھ میں نہیں ہوا تھا،بلکہ از روئے تحقیق اس سے بہت پہلے سنہ 32ھ میں ہو چکا تھا اور اس لشکر کے امیر خود امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے"۔

ظاہر ہے جب آپ کی تحقیق کا مقصد صحیح بات تک پہنچنا نہ ہو بلکہ اپنے خود ساختہ مفروضوں اور تخیلات کو درست ثابت کرنا ہو،اور غرض وغایت یزید بن معاویہ کے لئے مغفرت کے دروازے بند کرنا ہو، چاہے اس کے لئے صحیح بخاری کی متفقہ صحیح روایت کو بھی" راوی کی خود ساختہ" ہی کیوں نہ قرار دینا پڑے،تو پھر ایسے ہی لعل وگوہر معرض وجود میں آتے ہیں۔بہر حال! آئیے مؤرخِ شہیر لعل شاہ صاحب کی اس"تحقیق مزید" کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں۔

چنانچہ لعل شاہ صاحب نے اب یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ سنہ 32ھ میں ہوا تھا،یہ حوالے پیش کیے ہیں کہ:

"حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:وَفِيهَا(سنة32ھ)غَزَا مُعَاوِيَةُ بِلَادَ الرُّومِ حَتَّى بَلَغَ الْمَضِيقَ مَضِيقَ القسطنطنية۔اور سنہ 32ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلاد روم پر چڑھائی کی یہاں تک کہ خلیج قسطنطنیہ تک پہنچ گئے"۔(البدایۃ والنہایۃ،ص159ج7)۔

حافظ صاحب ہی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"قَالُوا:وَكَانَ عَامَ غَزَاةِ الْمَضِيقِ يَعْنِي مَضِيقَ القسطنطنية فِي سَنَةِ ثِنْتَيْنِ وَثَلَاثِينَ فِي اَيّامِه فَكَانَ هُوَ الْأَمِيرُ عَلَى النَّاسِ عَامَئِذٍ۔کہتے ہیں کہ خلیج قسطنطنیہ کی جنگ سنہ 32ھ میں ہوئی،حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں اور وہ خود اس سال لوگوں پر امیر تھے"۔(البدایۃ والنہایۃ،ص159ج7)۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

"وفيها (سنة32ھ)كانت وقعة المضيق بالقرب من قسطنطنية وأميرُها معاوية۔کہ سنہ 32ھ میں قسطنطنیہ کے قریب خلیج قسطنطنیہ میں جنگ واقع ہوئی اور سالار جیش

حضرت معاویہ تھے"۔(تاریخ الاسلام للذہبی)۔

السید احمد زینی دحلان (دحلان۔ناقل) لکھتے ہیں:

"وفي اثنتين وثلاثين غزا معاوية ابن ابي سفيان مضيق القسطنطنية۔سنہ 32ھ میں حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے خلیج قسطنطنیہ میں جنگ کی"۔(الفتوحات الاسلامیۃ،ص 57)۔

(استخلاف یزید،صفحہ 345و346)

<u>تبصرہ:</u>

اس بارے میں پہلے تو یہ عرض ہے کہ یہ بات سب سے پہلے امام طبری نے ذکر کی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"سنة اثنتين وثلاثين:ذكر مَا كَانَ فِيهَا من الأحداث المذكورة۔فمن ذَلِكَ غزوة مُعَاوِيَة بن أَبِي سُفْيَانَ المضيق، مضيق القسطنطينية، وَمَعَهُ زوجته عاتكة ابنة قرطة بن عبد عَمْرو بن نوفل بن عبد مناف۔ وقيل: فاختة، حَدَّثَنِي بِذَلِكَ أَحْمَد بْن ثَابِت، عمن ذكره، عن إِسْحَاق، عن أبي معشر"۔

سنہ 32ھ (اس سال میں مذکور واقعات کا بیان) ان میں سے ایک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مضیق قسطنطنیہ کا غزوہ ہے۔آپ کے ساتھ آپ کی اہلیہ عاتکہ بنت قرطہ بن عبد عمرو بن نوفل بن عبد مناف تھیں۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فاختہ تھیں۔

(امام طبری لکھتے ہیں) مجھ سے اس روایت کو احمد بن ثابت نے بیان کیا ہے، انہوں نے اپنے کسی استاذ سے، انہوں نے اسحاق سے اور انہوں نے ابو معشر سے۔

(تاريخ الطبري، ج4ص304، دار المعارف مصر)

اس روایت میں امام طبری کا استاذ "احمد بن ثابت بن عتاب الرازی المعروف بفرخویه" ہے اور یہ جھوٹا شخص ہے، امام ابن ابی حاتم رازی نے ابو العباس بن عبد اللہ الطہرانی (م 469ھ) سے نقل

کیا ہے کہ: لا يشكّون أن فرخويه كذاب یعنی محدثین کو (احمد بن ثابت) "فرخویہ" کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔

(الجرح والتعديل، ج2ص44، حيدرآباد دكن / تاريخ دمشق، ج71ص 47/ الضعفاء والمتروكون لابن الجوزي، ج1ص67، دارالكتب العلمية بيروت) / ميزان الاعتدال، ج1ص116، دار الرسالة العالمية بيروت)

پھر احمد بن ثابت کے استاذ کا نام مذکور نہیں کہ وہ کون ہے؟ اسی طرح "ابو معشر" (نجيح بن عبدالرحمن السندي المدنى) کی بھی امام یحییٰ بن سعید القطان سمیت متعدد ائمہ نے تضعیف کی ہے ۔(يحيىٰ بن سعيد لا يحدث عن ابي معشر ويضعفه ويضحك إذا ذكره) یعنی یحییٰ بن سعید القطان ابو معشر سے روایت نہیں لیتے تھے اور اسے ضعیف قرار دیتے تھے، جب اس کا تذکرہ ہوتا تو ہنستے تھے۔

(الجرح والتعديل لابن ابي حاتم، ج8ص494، حيدرآباد دكن / الكامل في ضعفاء الرجال، ج8ص311، دارالكتب العلمية بيروت / الطبقات الكبرى لابن سعد، ج5ص418، دار صادر بيروت / الضعفاء والمتروكون للنسائي، ص101، درالوعي، حلب)

یوں یہ روایت سخت قسم کی ضعیف ہے، اور حافظ ابن کثیر وغیرہ نے غالباً طبری سے ہی یہ بات نقل کی ہے۔

"مضيق قسطنطنيه" کہاں واقع ہے؟

دوسری بات یہ کہ لعل شاہ صاحب کے پیش کردہ ان تمام حوالوں میں" مدينة قسطنطنية" (یعنی قسطنطنیہ شہر) تک لشکر کے پہنچنے کا ذکر نہیں بلکہ "مضیق قسطنطنیہ" (یعنی" آبنائے قسطنطنیہ") تک پہنچنے کا ذکر ہے، "مضيق" عربی کا لفظ ہے جس کا ترجمہ اردو میں" تنگ راستہ" کیا جا سکتا ہے۔

اب ذرا "قسطنطنیہ" (آج کے" استنبول") کے محل وقوع پر ایک نظر ڈالنا بھی ضروری ہے، قدیم شہر قسطنطنیہ، آبنائے باسفورس، بحیرہ مرمرہ اور شاخِ زرین (گولڈن ہارن) نامی سمندروں میں گھرا ہوا ہے اور اس کے صرف مشرقی جانب خشکی ہے۔

اگر شام کے ساحل کی طرف سے بحیرہ روم کے سمندری راستے سے یہاں پہنچنا ہو تو "جزیرۂ قبرص" کے پاس سے ہوتے ہوئے جزیرہ" روڈس" کی سمت چلتے ہوئے" بحیرہ ایجیئن" میں داخل ہو کر بہت

سے چھوٹے بڑے جزائر کے قریب سے گذرتے ہوئے سمندر کے ایک بہت ہی تنگ آبی درہ میں سے گذر کر "بحیرہ مرمرہ" میں داخل ہوتے ہیں، اس گذرگاہ کو" درّہ دردنیل" کہا جاتا ہے جو بحیرہ ایجیئن کو بحیرہ مرمرہ سے ملاتی ہے۔ یہ آبی درّہ بحیرہ اسود کے لیے ایک اہم سمندری راستہ ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً 60 کلومیٹر (38 میل) اور چوڑائی تقریباً سوا کلومیٹر سے چھ کلومیٹر تک ہے۔

اس آبی گذرگاہ کے بعد" بحیرہ مرمرہ" آتا ہے جو" آبنائے باسفورس" کے ذریعے بحر اسود سے ملا ہوا ہے،" آبنائے باسفورس" ترکی کے یورپی حصے (روم ایلی) اور ایشیائی حصے (اناطولیہ) کو جدا کر کے یورپ اور ایشیا کے درمیان سرحد قائم کرتی ہے۔ اسی آبنائے کو" آبنائے استنبول" یا" آبنائے قسطنطنیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بین الاقوامی جہاز رانی کے لیے استعمال ہونے والی دنیا کی سب سے تنگ آبنائے ہے (اور پہلے بیان ہوا کہ بحیرہ مرمرہ، درّہ دردنیل کے ذریعے بحیرہ ایجیئن سے منسلک ہے جو بحیرہ روم سے ملا ہوا ہے)۔ یہ آبنائے باسفورس تقریباً 30 کلومیٹر طویل ہے اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی شمالی داخلی راستے پر 3 ہزار 700 میٹر ہے اور کم از کم چوڑائی تقریباً 700 میٹر ہے۔

آبنائے باسفورس (یا" آبنائے قسطنطنیہ") کے بحیرہ مرمرہ کی جانب والے داخلی راستے کے بائیں جانب سمندر کی ایک پتلی سی شاخ ایک سینگ کی شکل میں مشرق کی جانب جاتی ہے جسے" گولڈن ہارن" (شاخِ زریں) کہا جاتا ہے۔ قدیم قسطنطنیہ کی بندرگاہ سمندر کی اسی شاخ کے اندر واقع تھی۔ جب سنہ 1453ء میں فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد الفاتح نے شہر کا محاصرہ کیا تو اہل قسطنطنیہ نے اس" شاخ زریں" کے باسفورس میں گرنے والے دہانے پر لوہے کا بڑا سا زنجیر باندھا ہوا تھا جس کی وجہ سے کوئی بحری جہاز باسفورس سے اس سمندری شاخ میں داخل نہیں ہوسکتا تھا، تو سلطان محمد الفاتح نے اسی سمندری شاخ میں جنگی کشتیاں پہنچانے کے لئے ایسا فیصلہ کیا جو دنیا کی تاریخ میں منفرد اور محیر العقول واقعہ بن گیا، اس نے باسفورس کے مغربی ساحل سے جنگی کشتیاں خشکی پر چڑھا کر تقریباً دس میل کا فاصلہ طے کر کے شاخ زریں کے بالائی جنوبی کنارے پر پہنچایا (جو علاقہ آج کل" قاسم پاشا" کہلاتا ہے) اور وہاں سے کشتیوں کو شاخ زریں کے پانی میں اتار دیا۔

اسی" گولڈن ہارن" یا" شاخ زریں" میں بہت آگے جا کر قدیم قسطنطنیہ شہر کے دوسری طرف وہ قبرستان واقع ہے جس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔

اب یہ سمجھنا ہے کہ وہ "مضیق قسطنطنیہ" کیا ہے جس کا ذکر لعل شاہ صاحب کے پیش کردہ حوالوں میں ہے؟ بادی النظر میں اس سے مراد وہ تنگ آبی درہ ہے جسے "درۂ دردنیل" کہا جاتا ہے اور جو بحیرۂ روم کو بذریعہ بحیرۂ ایجیئن، بحیرۂ مرمرہ کے ساتھ ملاتا ہے، اور شام کی طرف سے آتے ہوئے اسی سے گذر کر قسطنطنیہ کی جانب پہنچا جاسکتا ہے۔"مضیق" کے لفظ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بہت تنگ آبی گذرگاہ کا ذکر ہے، اگر یہاں "مضیق قسطنطنیہ" سے مراد" آبنائے باسفورس" ہوتا تو پھر "مضیق" تک پہنچنے کا ذکر نہ ہوتا بلکہ سیدھا "قسطنطنیہ" تک پہنچنے کا ذکر ہوتا کیونکہ قدیم قسطنطنیہ شہر کا مغربی کنارہ تو بحیرۂ مرمرہ کے ساتھ لگتا ہے اور" آبنائے باسفورس" کے دہانے سے پہلے دائیں جانب واقع ہے، اس کے بعد" شاخ زریں" اندر کی جانب داخل ہوتی ہے۔

لہٰذا کتب تاریخ میں جہاں کسی لشکر کے "مضیق قسطنطنیہ" تک پہنچنے کا ذکر ہے (قسطنطنیہ شہر تک پہنچنے کا ذکر نہیں) اس سے مراد" درۂ دردنیل" کی تنگ آبی گذرگاہ تک پہنچنا ہے نہ کہ قسطنطنیہ شہر تک پہنچنا۔

اور اگر بالفرض اس "مضیق قسطنطنیہ" سے مراد" آبنائے باسفورس" بھی لیا جائے تو ان حوالوں سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ لشکر صرف" آبنائے باسفورس" تک ہی گیا تھا، اور چونکہ اس طرف سے قسطنطنیہ شہر پر حملہ ناممکن تھا اس لیے وہیں سے واپس ہوگیا۔

الغرض! لعل شاہ صاحب نے جیسے" بلاد روم" پر ہونے والے حملوں کو "قسطنطنیہ شہر" پر حملے باور کروایا، اسی طرح وہ "مضیق قسطنطنیہ" تک پہنچنے کو" مدینۃ قسطنطنیہ" پر حملہ باور کروا کر تلبیس پیدا کرنا چاہتے ہیں، ورنہ جن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے حوالے انہوں نے پیش کیے ہیں وہ بھی جانتے تھے کہ "مضیق قسطنطنیہ" تک پہنچنا، قسطنطنیہ تک پہنچنا یا اس پر حملہ کرنا نہیں کیونکہ انہی کی عبارات پہلے نقل ہوچکیں جن میں انہوں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

"وَقَدْ كَانَ يَزِيدُ أَوَّلُ مَنْ غَزَا مَدِينَةَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ ....."۔

یزید سب سے پہلا وہ شخص تھا جس نے قسطنطنیہ شہر پر حملہ کیا۔

(البداية والنهاية، ج8ص323، وزارة الاوقاف قطر)

اور اس سے پہلے سنہ 49ھ کے واقعات کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فِيهَا غَزَا يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ بِلَادَ الرُّومِ حَتَّى بَلَغَ قُسْطَنْطِينِيَّةَ.

وَمَعَهُ جَمَاعَةٌ مِنْ سَادَاتِ الصَّحَابَةِ، مِنْهُمْ ابْنُ عُمَرَ، وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَابْنُ الزُّبَيْرِ، وَأَبُو أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيُّ۔ وَقَدْ ثَبَتَ فِي صَحِيحِ الْبُخَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:أَوَّلُ جَيْشٍ يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ ،فَكَانَ هَذَا الْجَيْشُ أَوَّلَ مَنْ غَزَاهَا"۔

اسی سال یزید نے بلاد روم پر حملہ کیا یہاں تک کہ وہ قسطنطنیہ تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ معزز صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی جن میں ابن عمر، ابن عباس، ابن الزبیر اور ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہم) بھی تھے۔اور صحیح بخاری میں یہ حدیث ثابت شدہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلا وہ لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا ان کی مغفرت کر دی گئی، پس یہی (یعنی یزید کی سربراہی والا) وہ پہلا لشکر تھا۔

(البداية والنهاية، ج8ص31، وزارة الاوقاف قطر)

یہی حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسری کتاب میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"كانت وفاته وهو محاصر القسطنطينية مع يزيد بن معاوية وهو أول جيش غزاها، وهم مبشرون بالجنة والمغفرة، وأمر بدفنه إلى جانب السور، وأن يخفوا أثره…"۔

(حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ) کی وفات اس وقت ہوئی جب وہ یزید بن معاویہ کی معیت میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، اور وہی پہلا لشکر تھا جو قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا، اور اس لشکر والوں کے لئے جنت اور مغفرت کی بشارت دی گئی، اور (یزید نے) حکم دیا کہ آپ کو (شہر) کی فصیل کے پاس لے جا کر دفن کیا جائے اور قبر کی جگہ خفیہ رکھی جائے۔

(جامع المسانيد والسُّنَن الهادي لأقوم سَنَن، ج9ص39، دار خضر بيروت)

ثابت ہوا کہ جن حافظ ابن کثیر کے حوالے لعل شاہ صاحب نے پیش کیے ہیں، ان کے نزدیک بھی "بلاد روم" پر حملے یا "مضیق قسطنطنیہ" تک پہنچنے کا مطلب "قسطنطنیہ شہر" پر حملہ ہرگز نہیں، سب سے پہلے جس لشکر

نے" شہر قسطنطنیہ" پر حملہ کیا وہ وہی لشکر تھا جو یزید بن معاویہ کی ماتحتی میں گیا تھا۔

مزید وضاحت کے لئے اس کی مثال یوں سمجھیں کہ خلیج فارس (جسے آج کل خلیج عربی بھی کہا جاتا ہے) اس کے اندر جانے کے لیے "مضیق ہرمز" سے گذرنا پڑتا ہے، اس خلیج فارس کے ایک جانب ایران کا علاقہ ہے اور دوسری جانب دبئی، ابوظبی، قطر، بحرین، بصرہ اور کویت وغیرہ کی بندرگاہیں ہیں، ان سب بندرگاہوں تک بحری راستے سے جانے کے لیے لازمی ہے کہ خلیج فارس میں داخل ہوا جائے، اور اس کا ایک ہی راستہ ہے جو "مضیق ہرمز" کہلاتا ہے، اب کسی کتاب میں لکھا ہو کہ " فلاں لشکر کراچی سے چلا اور "مضیق ہرمز" تک جا پہنچا، تو کیا اس سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ " وہ لشکر دبئی پہنچ گیا" یا وہ "کویت کی بندرگاہ" تک جا پہنچا؟؟ ہرگز نہیں، لہٰذا صرف "مضیق قسطنطنیہ تک پہنچنے" کی عبارت سے یہ ثابت کرنا کہ یہ لشکر قسطنطنیہ شہر تک پہنچ گیا تھا اور شہر پر حملہ یا اس کا محاصرہ بھی کیا تھا کسی طرح درست نہیں۔ جبکہ صحیح بخاری کی حدیث میں متعین طور پر قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملے کرنے والے لشکر کے لئے بشارت کا ذکر ہے۔

لعل شاہ صاحب کی آخری کوشش

لعل شاہ صاحب اس بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گذشتہ سطور میں قارئین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ یزید کے وجوب جنت ومغفرت کی دلیل جن دو مقدموں پر موقوف تھی وہ ھباءً منثوراً ہو چکے ہیں، یزید کی اول جیش میں شرکت بھی باطل ہو چکی ہے اور اول جیش کا مغفور لھم ہونا بھی فرمودۂ رسول سے ثابت نہ ہوسکا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 346)

تبصرہ:

گزشتہ سطور میں ہم نے بھی صحیح بخاری کی حدیث پر لعل شاہ صاحب کی طرف سے کیے جانے والے "عمل جراحی" اور قسطنطنیہ پر اولین حملہ کرنے والے لشکر کے بارے میں ان کے "تضادات" سے بھرپور مفروضوں کا مکمل پوسٹ مارٹم کر دیا ہے اور ان کا باطل ہونا ثابت کر دیا ہے، لعل شاہ صاحب تو اس بات کا بھی فیصلہ نہ کر سکے کہ قسطنطنیہ پر سب سے پہلا حملہ سنہ 48ھ میں ہوا تھا یا سنہ 32ھ میں؟

علاوہ ازیں، جو حوالے انہوں نے اپنا "مفروضہ" ثابت کرنے کے لئے پیش کیے، انہی حوالوں میں یہ بھی تصریح ہے کہ یزید بھی اس لشکر میں شامل تھا، لیکن لعل شاہ صاحب نے حوالے پیش کرتے وقت ناقص عبارات پیش کیں، لیکن انہیں احساس تھا کہ اگر کسی نے ان کے پیش کردہ حوالوں کو اصل مصادر میں دیکھ لیا تو ان کی تلبیس کا پردہ چاک ہو جائے گا تو مجبوراً اور بادل نخواستہ انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ:

"البتہ بعض کتابوں نے تصریح کی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو بھی اس لشکر میں روانہ کیا تھا اور حضرت ابو ایوب الانصاری و دیگر صحابہ بھی اس لشکر میں شریک تھے، سو گذارش ہے کہ یہ نتیجہ ہے اختلاط روایات کا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 342)

یعنی دوسرے لفظوں میں وہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ جن حوالوں سے وہ اپنے مفروضے ثابت کرتے پائے گئے ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ "اختلاط روایات" کا نتیجہ ہے اور ان حوالوں سے کوئی قطعی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ لعل شاہ صاحب نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر کوئی حملہ نہیں ہوا، بلکہ ان کا "مفروضہ" یہ ہے کہ اس کا حملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قسطنطنیہ پر سب سے آخری حملہ تھا، نیز وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام بھی شامل تھے۔

بہر حال، لعل شاہ صاحب یزید کو "ناقابل مغفرت" ثابت کرنے کے لئے اپنا آخری پتّا یوں پھینکتے ہیں:

"حدیث قسطنطنیہ کے مطالب میں تین احتمالات ہیں (واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال) جب احتمال آجائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے..."

(استخلاف یزید، صفحہ 346)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے اپنی طرف سے تین احتمالات ذکر کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"پہلا احتمال یہ ہے کہ (اول جیش) سے مراد (اول جیش فاتح) ہو کہ قسطنطنیہ کا فاتح پہلا لشکر

مغفور ہے، مطلق بول کر مقید کا ارادہ کرنا قرائن کی موجودگی میں جائز ہے.....اصل میں آنحضور ﷺ نے فاتحین قسطنطنیہ کے لئے نعم الامیر ونعم الجیش کے کلمات مدحیہ فرمائے تھے .....

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ایجاب وغفران میں فرق ہے، روایت میں پہلے لشکر کے متعلق لفظ اوجبوا اور دوسرے کے لئے لفظ مغفور لھم ہے، دونوں کا تقابل ظاہر کرتا ہے کہ دونوں کے معانی میں فرق ہو، یعنی اگر روایت صحیح ہو تو پہلا لشکر یقیناً جنتی ہے مگر دوسرا لشکر مغفور لہم ہے، ان کے پہلے گناہ معاف ہیں، مگر ان کے وجوب جنت اور آئندہ گناہوں کی معافی کی ضمانت نہیں...

تیسرا احتمال یہ ہے کہ اول جیش کا عموم اگرچہ یزید اس میں شامل ہے، مگر تخصیص کے دلائل نے اسے خارج کر دیا ہے پس اول جیش عام مخصوص عنہ البعض ہو گیا، تحقیق کے دلائل وہ روایات ہیں جو ہم آئندہ چل کر (ولایت یزید ارشادات نبی ﷺ کے آئینہ میں) کے عنوان کے تحت بیان کریں گے... "۔

(خلاصہ: استخلاف یزید، صفحہ 346 تا 348)

تبصرہ:

ہمارا سوال یہ ہے کہ آخر لعل شاہ صاحب کے پاس کون سی ایسی نص صریح و قطعی تھی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی بخشش کر سکتے ہیں لیکن یزید بن معاویہ کی مغفرت نہیں ہو سکتی، اور صحیح بخاری کی "مغفور لہم" والی بشارت چونکہ اس نص قطعی سے ٹکراتی تھی اس لئے انہیں اس تعارض کو دور کرنے کے لئے اتنے ورق سیاہ کرنے پڑے، یہاں تک کہ صحیح بخاری کی روایت کو بھی "خود ساختہ" قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا؟ یا کیا یزید کافر تھا کہ اس کی مغفرت ممکن نہیں؟ یا (خدانخواستہ) اس کی موت کفر پر ہوئی تھی؟ جب لعل شاہ صاحب خود بھی اسے "فاسق" (یعنی "گنہگار مسلمان") ہی سمجھتے اور لکھتے ہیں تو کون سا آسمان گر جاتا یا زمین پھٹ جاتی اگر یہ لکھ دیا جاتا کہ:

"اگر قسطنطنیہ پر سب سے پہلے حملہ کرنے والے لشکر میں یزید بھی شامل تھا تو حدیث شریف میں

بیان کردہ بشارت کی روشنی میں اللہ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ اس عمل کی وجہ سے وہ اس کی لغزشیں اور گناہ (اگر کوئی ہوں) معاف کردے اور اسے جنت میں داخل کردے، آخر صحیح احادیث میں اس بدکردار عورت کی مغفرت کا بھی تو ذکر ہے جس نے ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کے مارے کنویں کے گرد گھوم رہا تھا، لیکن اس کی پانی تک رسائی ممکن نہیں ہوئی، چنانچہ اس عورت نے اپنا موزہ نکالا اسے پانی سے بھرا اور کتے کو پلادیا لہٰذا اللہ نے اس عمل کی وجہ سے اس عورت کی مغفرت فرمادی (متفق علیہ)، تو اگر غزوۂ قسطنطنیہ میں شرکت کی وجہ سے اللہ یزید بن معاویہ کی مغفرت فرمادے تو یہ اس کا اختیار ہے یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء "۔

لیکن معلوم نہیں یزید کو مغفرت سے محروم کرنے کے لئے کیوں زور لگایا جاتا ہے؟ جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کو یہ اختیار ہی نہیں کہ وہ یزید کی مغفرت کرسکے۔ کیا اہل سنت اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ہر مسلمان نے آخر کار جنت میں چلے جانا ہے؟ اگر اللہ معاف فرمادیں تو فبھا، ورنہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر مسلمان جنت میں داخل ہوجائے گا، کیا یزید کا معاملہ دوسرے مسلمانوں سے الگ ہوگا؟ اور پھر ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ مغفرت اور بخشش کی زیادہ ضرورت تو گنہ گاروں اور خطا کاروں کو ہی ہوگی؟

رہی بات لعل شاہ صاحب کے "حدیث قسطنطنیہ" کے مطالب میں تین احتمالات نکالنے کی، تو اس پر عرض ہے کہ سب سے پہلے سوچنا چاہئے کہ نبی کریم ﷺ نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے اولین لشکر میں شامل لوگوں کے لیے جو "مغفور لھم" فرمایا، یہ اللہ کی وحی کی بنا پر فرمایا تھا یا اپنے اجتہاد سے؟ اگر اللہ کی وحی سے فرمایا تھا اور یقیناً یہی واقعہ ہے تو اگر یزید اس پہلے لشکر کا امیر (یا اس میں شامل تھا) تو اسے "مغفور لھم" کی بشارت سے کیونکر اور کیسے خارج کیا جاسکتا ہے؟ واضح رہے کہ حدیث میں اشارتاً بھی کسی قسم کا کوئی استثناء نہیں، اور نہ ہی یہ بشارت مشروط ہے، اور اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے تھا کہ اس لشکر میں کون کون لوگ شریک ہوں گے، اس کے باوجود غیر مشروط طور پر ان کی مغفرت کا پروانہ اپنے نبی کی زبان سے جاری فرمایا، لہٰذا اگر کسی نے اپنی طرف سے اس حدیث میں قیود وشرائط یا استثناءات کا اضافہ کیا ہے یا اپنے ذہن سے کوئی احتمالات نکالے ہیں تو وہ حدیث کا حصہ نہیں بلکہ ان حضرات کا اپنا استنباط اور رائے ہے، اور اپنی طرف سے حدیث کے معانی و

مفہوم کو مقید کرنا ہے، ایسی قیود و شرائط کا درجہ حدیث کا نہیں کہ انہیں ماننا ضروری ہو۔ جواب تو ان شرائط و قیود لگانے والوں یا احتمالات نکالنے والوں کو دینا ہے کہ آخر وہ یزید بن معاویہ کو اللہ کی مغفرت سے محروم کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ اور کیا ان کے پاس کوئی ایسی نص قطعی موجود ہے کہ ساری دنیا کے گنہگاروں کی مغفرت ممکن ہے لیکن یزید بن معاویہ کی مغفرت و بخشش ممکن نہیں؟

عجیب مضحکہ خیز قسم کے احتمالات نکالے جا رہے ہیں کہ" احتمال ہے کہ مغفرت کی بشارت مقیّد ہو اور قسطنطنیہ پر سب سے پہلے حملہ کرنے والے لشکر سے مراد قسطنطنیہ فتح کرنے والا پہلا لشکر ہو" ۔کیا اللہ تعالیٰ (جس کی وحی سے نبی کریم ﷺ نے یہ بشارت دی) کے علم میں یہ احتمالات نہ تھے؟ اگر تھے تو پھر نعوذ باللہ عمداً اس بات کو مبہم رکھا گیا کہ بشارت تو " سب سے پہلے فاتح لشکر" کے بارے میں تھی لیکن بیان کرتے ہوئے" حملہ کرنے والے اولین لشکر" کا ذکر کر دیا گیا۔

اسی طرح" مغفور لھم" جو کہ حدیث میں مطلق آیا ہے، اس کے ساتھ یہ قید لگانا کہ" اس کے پہلے گناہ معاف ہیں، مگر آئندہ کے گناہوں کی ضمانت نہیں" ، یہ بھی اللہ کے علم پر اعتراض کے مترادف ہے، اول تو حدیث میں ایسی کوئی قید نہیں، دوسرا اور کسی کو علم ہو یا نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے علم میں تو یہ بات ضرور تھی، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے اپنے نبی کی زبان اقدس سے یہ بشارت دیتے ہوئے ساتھ یہ کیوں نہ ذکر کر دیا کہ" ان کے صرف پہلے گناہوں کی مغفرت کر دی گئی" ، جبکہ کئی احادیث میں آپ ﷺ نے خود ایسی قید لگائی ہے، مثلاً لیلۃ القدر میں قیام اور عبادت کرنے پر بشارت دی کہ:

"غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ"۔

یعنی اس کے پہلے گناہوں کی مغفرت کر دی جائے گی۔

(صحیح البخاری، باب قیام لیلة القدر من الایمان)

اسی طرح قیامِ رمضان پر بھی انہی الفاظ میں بشارت دی گئی:

"غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ"۔

اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔

(صحیح البخاري، باب تطوع قیام رمضا ن من الایمان)

ایک حدیث میں ہے:

”مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هَذَا، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لاَ يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ“۔

جس نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا اور پھر دو رکعت نماز پڑھی، جس میں اس نے اپنے جی میں کوئی بات نہ کی، اللہ تعالی اس کے گزشتہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے۔

(صحيح البخاري، باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً)

ایک حدیث میں ہے:

”إِذَا قَالَ أَحَدُكُمْ: آمِينَ، وَقَالَتِ المَلاَئِكَةُ فِي السَّمَاءِ: آمِينَ، فَوَافَقَتْ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ“۔

جب تم میں سے کوئی آمین کہے، اور فرشتوں نے بھی (اسی وقت) آسمان میں (آمین کہی) اس طرح ایک کی آمین دوسرے کی آمین کے ساتھ مل گئی تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

(صحیح البخاری، باب فضل التامين)

تو پھر کیا وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیث قسطنطنیہ میں ”ما تقدم من ذنبه“ کی قید نہیں بیان فرمائی؟

یہاں اس بات کی وضاحت ایک بار پھر کرنا ضروری ہے کہ بشارتیں دو قسم کی ہوتی ہیں، پہلی قسم کی بشارت کا تعلق مخصوص اعمال سے ہوتا ہے اور دوسری قسم کی بشارت کا تعلق مخصوص افراد یا جماعت سے ہوتا ہے، پہلی قسم کی بشارت کا مقصد مخصوص اعمال کی فضیلت بتلانا ہوتا ہے اور دوسری قسم کی بشارت کا مقصد مخصوص افراد یا جماعت کی فضیلت بتلانا ہوتا ہے۔

جو بشارت کسی مخصوص عمل سے متعلق ہوتی ہے، اس عمل کا تعلق کسی شخصیت یا جماعت یا کسی خاص زمانے یا علاقے سے نہیں ہوتا، بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام لوگوں کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس عمل کے تقاضوں کو پورا کر کے اس پر دی گئی بشارت کے مستحق بن جائیں، جیسے مثلاً حج اور نماز و روزہ وغیرہ

پر دی گئی بشارتیں۔

لیکن بشارت کی دوسری قسم جس میں مخصوص افراد یا جماعت سے متعلق بشارت ہوتی ہے، وہ صرف خاص افراد اور خاص جماعت ہی کے لئے ہوتی ہے، اسی طرح وہ خاص زمانے اور خاص علاقے کے لئے ہوتی ہے۔اس بشارت میں خاص زمانے یا خاص علاقے کے خاص افراد یا خاص جماعت کو متعین کر دیا جاتا ہے، اور ان افراد یا جماعت کی حقیقت اور ان کی پوری زندگی سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، لہٰذا ان افراد یا اس جماعت کے کسی فرد کے اس بشارت سے اخراج یا خروج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے علم میں (نعوذ باللہ) نقص لازم آئے گا جو محال ہے۔

نیز پہلی قسم کی بشارت میں شرط کی صورت میں فضیلت بیان ہوتی ہے، جب شرط پائی جائے گی، تبھی فضیلت حاصل ہوگی، لیکن دوسری قسم کی بشارت میں خبر کی صورت میں فضیلت بیان ہوتی ہے، اور اللہ و رسول کی خبر کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔

بشارت کی ان دونوں قسموں کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی سمجھنا چاہئے کہ حدیث قسطنطنیہ میں جو بشارت دی گئی ہے، وہ دوسری قسم سے ہے، یعنی اس بشارت کا تعلق مخصوص افراد یا جماعت کی فضیلت بتانا ہے، یعنی اس کا تعلق ایک مخصوص زمانے اور علاقے سے ہے اور اس میں افراد و جماعت کا تعین کر دیا گیا ہے۔ان افراد کی پوری حقیقت اللہ کے علم میں ہے، اور اس میں جو خبر ہے وہ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی۔اسی بات کی طرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ:

"وَأَوَّلُ جَيْشٍ غَزَاهَا كَانَ أَمِيرُهُمْ يَزِيدَ، وَالْجَيْشُ عَدَدٌ مُعَيَّنٌ لَا مُطْلَقٌ..."۔

سب سے پہلا وہ لشکر جس نے اس (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا اس کا امیر یزید تھا، اور لشکر ایک معیّن اور خاص عدد پر مشتمل ہوتا ہے، یہ عام نہیں ہے۔

(منهاج السنة، ج4ص572، السعودية)

رہا یہ احتمال کہ اول جیش کے عموم میں اگرچہ یزید بھی شامل ہے مگر تخصیص کے دلائل نے اسے خارج کر دیا ہے، لہٰذا اول جیش" عام مخصوص منہ البعض" ہو گیا۔

تو عرض ہے کہ اگر تو اس "تخصیص" کے کوئی ایسے قطعی دلائل موجود ہیں جن میں صراحت ہو کہ یزید بن معاویہ کی مغفرت ناممکن ہے یا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں فرمائیں گے، تو وہ پیش کیے جاتے، لیکن لعل شاہ صاحب نے جن روایات کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے کہ" جو ہم آئندہ چل کر بیان کریں گے" ان میں نہ یزید کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی ایسی کوئی بات ہے کہ اس کی مغفرت نہیں ہو سکتی۔ ہم ان روایات کا جائزہ اپنے مقام پر لیں گے۔

یہاں تک لعل شاہ صاحب کی طرف سے صحیح بخاری کی حدیث پر کیے گئے "عمل جراحی" اور اس پر لعل شاہ صاحب کی طرف سے دیے گئے مغالطوں اور اٹھائے گئے شکوک وشبہات اور بے جا تاویلات و احتمالات کا جائزہ مکمل ہوا۔

فسق یزید کی بحث

لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ 369 پر "ظلم یزید اور فسق یزید" کا عنوان دے کر نئی بحث شروع کی ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صحابہ کرام کا یزید کی امارت میں غزوہ میں شریک ہونا یا اس کی اقتدا میں نمازیں ادا کرنا اور اس کی بیعت کرنا یہ سب اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یزید فاسق نہیں تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

> "ان چیزوں سے رشدِ یزید اور عدالتِ یزید کا اثبات نہیں ہو سکتا، فسق امیر کی وجہ سے جہاد اور حج ترک نہیں کیا جا سکتا، اس بارے میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک فتویٰ شرح السیر الکبیر ص 108 کے حوالے سے آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ حکام کے محدثات مکروھہ جہاد سے مانع نہیں ہیں... (پھر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ)... امام اگر فاسق ہو اور اس میں ظلم اور معصیت پائی جاتی ہو تو بھی اس پر خروج جائز نہیں (مگر کہ اس میں کفر پوری طرح ظاہر ہو) اس کے مظالم پر صبر کرنا چاہیے، اس تسلسل سے انہوں نے اہل السنۃ کا مذہب اس طرح نقل فرمایا کہ ائمہ جور کی اطاعت بھی جب وہ اللہ کی اطاعت کا حکم دیں واجب ہے،

اگر وہ نماز پڑھائیں تو ان کے پیچھے نمازیں پڑھیں، عیدین اور جمعات کی امامت میں ان کی اقتدا کریں، جہاد اور امر بالمعروف میں ان کا تعاون کریں وگرنہ شعائر اسلامیہ مٹ جائیں گے اور امور شرعیہ میں بالکل تعطل پیدا ہو جائے گا.... خود عباسی صاحب (یعنی محمود احمد عباسی۔ناقل) نے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت سے اس مسئلہ پر استشہاد کیا ہے کہ اہل السنۃ والجماعت کا مشہور مذہب یہی ہے کہ ائمہ پر خروج اور قتال بالسیف جائز نہیں سمجھتے اگرچہ وہ ظالم ہوں (بحوالہ منہاج السنۃ) اور منہاج السنۃ کے اسی صفحہ پر اس سے ذرا متصل پہلے احناف کا مسلک لکھا ہے لانری الخروج علی الائمۃ ولوجاروا ہم ائمہ کے خلاف خروج جائز نہیں سمجھتے، اگرچہ وہ ظلم کریں۔

جب عباسی صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ فسق امام کی وجہ سے خروج جائز نہیں جب تک کفر بواح کا ظہور نہ ہو تو ان ہی ائمہ جور کی اقتداء میں نمازیں پڑھی جائیں، ان کی معیت میں جہاد کیا جائے اور اگر وہ حج کریں تو ان کی امارت میں حج کیا جائے، تو صحابہ کا جہاد قسطنطنیہ میں یزید کی سرکردگی میں شریک ہونا کس طرح دلیل بن سکتا ہے عدالت یزید پر۔امارت حج تو جیسے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یزید کے لئے کسی سال بھی ثابت نہیں ہوتی لیکن اگر بالفرض ایسا ہوتا تو کیا صحابہ فسق یزید کی وجہ سے حج ترک کر دیتے...”۔

(خلاصہ: استخلاف یزید، صفحہ 369 تا 371)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب کی تحریر کا لب لباب یہ ہے کہ یزید اس وقت بھی فاسق ہی تھا جب اس کی سرکردگی میں غزوۂ قسطنطنیہ ہوا، اسی لئے تو وہ اس بات پر حوالے پیش کر رہے ہیں کہ فاسق کی امارت میں جہاد وغیرہ ہو سکتا ہے۔اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ غزوۂ قسطنطنیہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوا تھا (بقول لعل شاہ صاحب یہ غزوہ سنہ 52ھ میں ہوا تھا، جیسا کہ پہلے گذرا)، یعنی لعل شاہ صاحب کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت بھی سب کو معلوم تھا کہ یزید فاسق و فاجر اور ظالم ہے، لیکن چونکہ فاسق کی امارت میں جہاد وغیرہ کیا جا سکتا ہے اس لئے صحابہ کرام نے جانتے بوجھتے ہوئے ”ایک فاسق“ کی سرکردگی میں جہاد کیا۔

اس پر ہمارا سوال ہے کہ یزید کے تخت خلافت پر بیٹھنے سے پہلے کے زمانے میں اس کے فاسق و ظالم ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کیا یزید کی امارت میں جہاد کرنے والے کسی صحابی نے یہ بات کہی کہ "سمجھتے تو ہم اسے فاسق ہی ہیں لیکن چونکہ فاسق کی سرکردگی میں جہاد کیا جاسکتا ہے اس لئے ہم نے اس کی امارت میں جہاد کیا"؟ یا لعل شاہ صاحب کو اس بات کا الہام ہوا ہے؟ پھر کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا گیا اس وقت بھی اس کا فسق و فجور معروف تھا؟ اور مسئلہ یہ ہے کہ باختیار خود فاسق و فاجر کو خلیفہ بنانا مسلمانوں کے لیے گناہ ہے، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ کی شرائط بیان کرتے ہوئے ایک شرط یہ بیان کی ہے کہ:

"خلیفہ عادل ہو، کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا اور صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہ ہو"۔

(ازالۃ الخفاء، مترجم اردو، ج 1 ص 20)

اور پھر ساری شرائط ذکر کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ:

"اگر کسی ایسے کو خلیفہ بنائیں جس میں یہ شرائط نہ پائے جاتے ہوں تو اس کی خلافت کے بانی گناہگار ہوں گے"۔

(حوالہ مذکورہ، صفحہ 23)

جس سے ثابت ہوا کہ کسی ایسے شخص کو جان بوجھ کر خلیفہ بنانا جو کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا نہ ہو (جسے فاسق کہا جاتا ہے) یہ گناہ کا کام ہے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"وَعَنْ بَعْضِهِمْ لَا يَجُوزُ عَقْدُ الْوِلَايَةِ لِفَاسِقٍ ابْتِدَاءً فَإِنْ أَحْدَثَ جَوْرًا بَعْدَ أَنْ كَانَ عَدْلًا فَاخْتَلَفُوا فِي جَوَازِ الْخُرُوجِ عَلَيْهِ وَالصَّحِيحُ الْمَنْعُ إِلَّا أَنْ يَكْفُرَ فَيَجِبُ الْخُرُوجُ عَلَيْهِ۔

اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ فاسق کی ولایت کا انعقاد کرنا (یعنی اسے حاکم بنانا) جائز ہی نہیں، ہاں اگر (حاکم بننے کے وقت تو وہ عادل تھا) لیکن بعد میں اس سے ظلم ظہور پذیر ہوا تو پھر اس میں

اختلاف ہے کہ اس کے خلاف خروج جائز ہے یا نہیں، لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس کے خلاف خروج بھی منع ہی ہے، مگر یہ کہ وہ کفر اختیار کرے تو پھر اس کے خلاف خروج واجب ہے۔

(فتح الباری، ج13ص8، دار المعرفة بیروت)

لہٰذا یزید کے فسق و فجور کا علم ہوتے ہوئے، اسے ولی عہد مقرر کرنے اور اس کی بیعت کرنے والے صحابہ پر یہ اعتراض بہر حال آتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایک فاسق کو والی بنایا (جو کہ گناہ کا کام ہے) تو اس طرح ان صحابہ کا دفاع کیسے ممکن ہے؟

یہ اشکال خود لعل شاہ صاحب کے ذہن میں تھا اسی لئے تو وہ آگے لکھتے ہیں کہ:

"یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ بوقت ولی عہدی سنہ 44ھ تک یزید کا فسق ظاہر نہیں ہوا تھا، جب اس کا فسق ظاہر ہوا تو صحابہ کرام اس بارے میں مختلف ہو گئے کہ اس کی بیعت سے نکل جائیں یا اس پر مستقیم رہیں، آئندہ سطور میں اس کی تفصیل آئے گی۔ چنانچہ اہل مدینہ کی اکثریت نے اسی فسق کی بنا پر ربقہ اطاعت یزید اتار دیا تھا اور خلع بیعت کا اعلان کر دیا تھا، البتہ بعض اشخاص پھر بھی بیعت پر مستقیم رہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 372)

نوٹ: یہ لعل شاہ صاحب کا خود ساختہ مفروضہ ہے کہ ولی عہدی کی بیعت کا قضیہ سنہ 44ھ کا ہے، جس کا باطل ہونا ہم ثابت کر آئے ہیں، ورنہ اکثر مؤرخین کے نزدیک یزید کی ولی عہدی کی بیعت سنہ 56ھ یا اس کے بعد کا واقعہ ہے۔

اب غور کریں کس طرح مغالطہ دیا جاتا ہے کہ جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا گیا اس وقت اس کا فسق "ظاہر نہیں ہوا تھا" یعنی جن صحابہ کرام نے اسے ولی عہد بنایا اور اس کی بیعت کی ان پر تو یزید کا فسق ظاہر نہ ہوا، لیکن کئی صدیوں بعد ان لوگوں کو اللہ نے وحی کر کے بتایا ہے کہ "فاسق تو وہ اس وقت بھی تھا، صرف اس کا فسق ظاہر نہیں ہوا تھا"۔ جبکہ لکھنا یہ چاہیے تھا کہ "جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا گیا اس وقت اس کے فسق کا کوئی نام و نشاں نہ تھا"، لیکن چونکہ ان لوگوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ یزید اپنی ماں کے پیٹ سے ہی فاسق و فاجر بن کر پیدا ہوا تھا اس لئے ایسی عبارات لکھتے ہیں کہ "اس کا فسق چھپا ہوا تھا" یا "ظاہر نہ ہوا تھا"۔

پھر اس پر دوسرا مغالطہ یہ دیا جاتا ہے کہ جب پوچھا جائے کہ" پھر یزید کا فسق ظاہر کب ہوا تھا؟" تو اس کے جواب میں بھی مختلف باتیں کی جاتی ہیں، لعل صاحب تو ایک دم چھلانگ لگا کر واقعہ حرہ پر پہنچ گئے (جو سنہ 63ھ کے آخر میں ہوا) اور لکھتے ہیں کہ:

"جب اس کا فسق ظاہر ہوا تو صحابہ کرام اس بارے میں مختلف ہو گئے کہ اس کی بیعت سے نکل جائیں یا اس پر مستقیم رہیں، آئندہ سطور میں اس کی تفصیل آئے گی۔ چنانچہ اہل مدینہ کی اکثریت نے اسی فسق کی بنا پر ربقہ اطاعت یزید اتار دیا تھا اور خلع بیعت کا اعلان کر دیا تھا"۔

(حوالہ بالا)

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یزید کا فسق واقعہ حرہ یا اس سے کچھ پہلے ہی ظاہر ہوا تھا اور پھر صحابہ کرام کا اختلاف ہوا کہ اس کی بیعت قائم رکھیں یا توڑ دیں، کیونکہ یزید کی بیعت توڑنے یا باقی رکھنے کی بات تو اسی وقت سامنے آئی تھی۔

لیکن کچھ حضرات نے نہ جانے کس بنیاد پر یہ دعویٰ کر دیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوتے ہی راتوں رات یزید کا فسق ہر طرف مشہور و معروف ہو گیا تھا، چنانچہ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ، یزید کے خلاف کھڑے ہی تب ہوئے تھے جب اس کا فسق تمام لوگوں پر نمایاں ہو چکا تھا، ملاحظہ فرمائیں:

"جب یزید کا فسق و فجور اس کے دور کے سب لوگوں پر نمایاں ہو گیا تو کوفہ کے اہل بیت کی جماعت نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اہل کوفہ کے پاس تشریف لے آویں، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ اب یزید کے خلاف کھڑے ہو جانا متعین ہے اس کے فسق کی وجہ سے"۔

(شہید کربلا و یزید، ص 85 و 86، ادارہ اسلامیات لاہور)

قاری صاحب کا ابن خلدون کی اس بات کو اپنی دلیل کے طور پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کو درست سمجھتے ہیں اور اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید کا فسق تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے فوراً بعد ہی نمایاں ہو چکا تھا اور اس کے چرچے دمشق سے نکل کر حجاز و عراق تک پہنچ چکے تھے، اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

کا عراق کی طرف خروج یزید کے فسق کی وجہ سے ہی تو تھا۔ جبکہ یہ بات حقائق اور واقعات کے خلاف ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

الغرض! عرض یہ کرنا ہے کہ لعل شاہ صاحب ہوں یا قاری محمد طیب قاسمی صاحب یا ان کی تحقیق سے اتفاق کرنے والے دیگر حضرات، یہ سب ہمیں یہی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے (دیگر صحابہ کے مشورے سے) جس وقت یزید کو ولی عہد مقرر کیا اس وقت اس کا فسق ظاہر نہیں ہوا تھا، تاہم قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس کا فسق واقعہ کربلا (یعنی محرم 61ھ) سے پہلے ہی ہر طرف نمایاں ہو چکا تھا جس کی وجہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اس کے خلاف نکلے (ظاہر ہے اگر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا یزید کے خلاف خروج اس کے فسق و فجور کی وجہ سے تھا تو واقعہ کربلا سے پہلے اس کے فسق کا مشہور و معروف ہونا ماننا پڑے گا)، جبکہ لعل شاہ صاحب کے نزدیک جب یزید کا فسق ظاہر ہوا تو صحابہ کرام میں اس کی بیعت توڑنے یا قائم رکھنے میں اختلاف ہوا، اور یہ واقعہ ذی الحج سنہ 63ھ کا ہے (جب واقعہ حرہ ہوا)۔ دونوں باتوں میں تضاد ہے، یاد رہے! لعل شاہ صاحب نے قاری محمد طیب قاسمی صاحب کی کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ”محمود عباسی کے افکار کے رد میں جناب حکیم الامت قاری محمد طیب قاسمی صاحب نے ایک کتابچہ بعنوان ”شہید کربلا اور یزید“ تصنیف فرمایا ہے، اس کتابچہ کا ایک ایک حرف ہمارے مدعا کی تصدیق کرتا ہے اور یزید کی تفسیق اور عباسی تکذیب اس مقالے کا اصل مقصد ہے، بلکہ یوں سمجھیے کہ ہم نے اس کتاب (یعنی ”استخلاف یزید“۔ ناقل) میں حکیم الامت کے مدعا کی ہی تکمیل کی ہے فللہ الحمد والمنۃ“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 446)

بہر حال! اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے وقت اس کا فسق ظاہر نہ تھا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سمیت جن چار یا پانچ صحابہ کرام کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی، ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟ ظاہر ہے اس وقت ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ فسق یزید تو ہو نہیں سکتی کہ اس وقت تک ” وہ ظاہر نہ تھا“، اس سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا، کیونکہ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یزید کی ولی عہدی سے اولین اختلاف کرنے والے حضرات

کے اختلاف کی وجہ یزید کا کردار یا اس کا فسق و فجور ہر گز نہ تھا بلکہ والد کے بعد بیٹے کی جانشینی کا طریقۂ کار تھا جسے یہ چار یا پانچ صحابہ کرام درست نہ سمجھتے تھے۔

بہر حال! جب یہ حضرات خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کا فسق چھپا ہوا تھا، ظاہر نہ تھا، تو پھر غزوہ قسطنطنیہ یا حج کے بارے میں یہ کہانیاں کیوں سنائی جاتی ہیں کہ" فاسق کی امارت میں جہاد اور اس کی امامت میں حج ہو سکتا ہے"، سیدھا یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ" اس وقت یزید فاسق نہ تھا" یا" اس کے فسق کا کوئی اتا پتا نہ تھا" ؟

کیا فسق یزید متفق علیہ ہے؟

لعل شاہ صاحب نے عنوان باندھا ہے"فسق یزید متفق علیہ ہے" اور پھر لکھتے ہیں:

" بہر حال جن صحابہ و تابعین نے بیعت توڑی تھی انہوں نے یزید کو فاسق و فاجر سمجھ کر بیعت توڑی تھی اور جو بیعت پر ثابت رہے مثلاً عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وہ اس لئے کہ بیعت توڑنا غدر ہے اور یہ جائز نہیں خواہ امیر فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ جملہ صحابہ میں اختلاف خلع بیعت میں تھا، عدالت یزید اور فسق یزید کا قضیہ زیر بحث نہیں تھا، فسق یزید بہر حال مجمع علیہ تھا، اور بعد میں بھی لعنت یزید کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے، ظلم یزید اور فسق یزید متفق علیہ رہا۔ اگر کتب تاریخ میں اس کے خلاف کوئی مواد پایا جاتا ہے تو وہ نواصب کی بے سند اور منقطع روایات ہیں، کوئی پختہ اور صحیح روایت نہیں ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 376 و 377)

تبصرہ:

یہ وہ مغالطہ ہے جو اکثر سبائی الفکر لوگ دیتے ہیں کہ تمام صحابہ کرام کے نزدیک یزید کا فسق و فجور متفق علیہ اور اجماعی تھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف ایک دعویٰ ہے اس کی آج تک کسی نے کوئی دلیل نہیں دی، حالانکہ ضابطے کی دلیل تو یہاں یہ تھی کہ خود ان صحابہؓ سے ہی یہ تصریح نقل کی جائے کہ:

"ہمیں یزید کے فاسق ہونے میں کوئی شک نہیں، ہم اس کی بیعت پر قائم اور اس کے خلاف خروج کے منکر اس لئے نہیں کہ ہم اس کو خلافت کا اہل اور غیر فاسق جانتے مانتے ہیں بلکہ محض اس لئے ہیں کہ اس سے فتنہ اٹھے گا اور قتل وقتال ہوگا اور امام چاہے فاسق ہو، اس کے خلاف خروج پھر بھی جائز نہیں"۔

کیونکہ یزید کی بیعت انہوں نے کی تھی (لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ" سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کرلی تھی"۔استخلاف یزید، صفحہ 274) وہی اس پر قائم بھی رہے تھے، انہوں نے ہی اس کے خلاف خروج سے خود بھی انکار کیا اور دوسروں کو بھی نہ صرف یہ کہ سختی کے ساتھ اس سے منع کیا تھا بلکہ اطاعتِ امام اور لزوم جماعت کی دعوت بھی دی تھی۔

اگر یزید باتفاق صحابہ فاسق و فاجر ہوتا، تو حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابی اس فاسق و فاجر کے ساتھ ہرگز نہ لگے رہتے، ہماری عقیدت اس بات کو کسی طرح قبول نہیں کرتی کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما جیسے صحابی، ایک شرابی، زانی اور بے نمازی امیر کی مجلسوں میں برابر شریک ہوں گے، اس کی طرف سے سفارت کی خدمت انجام دیں گے اور اس کے مشیر بن کر اس کی حکومت کو تقویت پہنچائیں گے۔

اسی طرح ہماری عقل اس بات کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی کہ ایک شرابی و بے نمازی و زانی کی بیعت توڑنے والوں کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے فقیہ مجتہد، عالم باعمل اور متقی و پرہیزگار صحابی یہ حدیث سنانے لگ جائیں کہ:

"جو امام کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لے گا وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی، اور جو اس حال میں مرے کہ اس کی گردن میں امام کی بیعت کا قلادہ نہ ہو، وہ جاہلیت کی موت مرا"۔

اس موقع پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اس حدیث کو سنانا صریح دلیل اس بات کی ہے کہ وہ یزید کو فاسق و فاجر نہیں سمجھتے تھے، اگر فاسق و فاجر سمجھتے تو یہ حدیث نہ سناتے، بلکہ یہ فرماتے کہ ایسے فاسق و فاجر کی بیعت توڑ دینا جائز تو ضرور ہے، مگر بڑے فتنہ کا اندیشہ ہے، اس لئے یہ اقدام نامناسب ہے۔لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یزید کو فاسق مجاہر اور شریعت کا بیخ کن سمجھتے ہوئے یہ حدیث سنائی تھی، تو پھر ذرا دل پر ہاتھ رکھ

کر بتایا جائے کہ کیا اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ امیر یا امام چاہے جیسا بھی بدکردار ہو، اس کی بیعت توڑنا خدا سے بلا حجت ملنا اور جاہلیت کی موت مرنا ہے؟ (یہ حدیث آگے آرہی ہے)

لہٰذا جب تک خود ان صحابہ کرام سے یہ تصریح نہیں دکھائی جاتی اس وقت تک یہ محض لعل شاہ صاحب کا اپنا خیال ہی رہے گا جس کا کوئی واضح ثبوت یا کوئی واضح قرینہ صارفہ عن الظاہر انہوں نے بیان نہیں کیا، یہ انہوں نے مبایعین صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر کی بات کی ہے اور اپنے اندر کی بات وہ صحابہ خود ہی بتا سکتے تھے، تیرہ چودہ سو سال بعد قاری محمد طیب قاسمی صاحب مرحوم یا لعل شاہ صاحب نہیں بتا سکتے اور نہ ہی ایسی بے ثبوتی و بے قرینہ بات کسی اور کے لیے واجب التسلیم ہی ہے، ورنہ اس کی مثال تو ایسے ہوگی جیسے آج کل کے مبتدعین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوپر اوپر سے بشر تھے اندر سے نور تھے، یا جیسے روافض کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اوپر اوپر سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی بیعت کی تھی، اندر سے وہ ان کو غاصب اور ظالم ہی سمجھتے تھے، تو کیا لعل شاہ صاحب بھی یہی بتانا چاہتے ہیں کہ صحابہؓ نے جو یزید کو خلیفہ بنایا اور مانا تھا، اس کی بیعت و اطاعت کی تھی، اس کے خلاف خروج نہ کیا تھا، دوسروں کو بھی اس سے منع کیا اور اطاعتِ امام ولزومِ جماعت کی دعوت دی تھی تو یہ سب کچھ انہوں نے محض اوپر اوپر سے کیا تھا ورنہ اندر سے وہ اس کو فاسق و فاجر اور زانی و شرابی ہی جانتے مانتے تھے۔ فرمائیے! اس طرح اس میں اور روافض کے تقیہ میں پھر کیا فرق رہ جائے گا؟

اس لئے اول تو ایسا دعویٰ کرنے والوں کو خود انہی صحابہؓ سے یہ تصریح نقل کرنا چاہیے تھی کہ اپنے اندر کی وضاحت صحابہؓ خود ہی کر سکتے تھے کوئی اور نہ ان کے اندر کی وضاحت کر سکتا ہے اور نہ کسی کو اس کا حق ہی پہنچتا ہے، لیکن آج تک کسی نے نہ تو ان صحابہؓ سے کوئی اس قسم کی تصریح نقل کی ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور ہی قابل اعتماد و قابل قبول اور مطابق اصول دلیل دی ہے، ایسا دعویٰ تو کوئی دوسری طرف سے بھی کر سکتا ہے کہ "صحابہؓ کی اس جماعت نے خروج سے انکار اور دوسروں کو بھی منع محض فتنے سے بچنے کے لئے نہ کیا تھا بلکہ اس لئے کیا تھا کہ ان کو یزید کے غیر فاسق اور اپنے درجے میں خلافت کا اہل ہونے میں کوئی شک نہ تھا"، اور اس دعوے کی تائید اِس جماعت صحابہؓ کے اس طرزِ عمل سے بخوبی ہوتی ہے جو انہوں نے خروج کرنے والوں اور بیعت توڑنے والوں کو اس سے منع کرنے میں اختیار کیا تھا۔ یعنی صحابہؓ کی اس جماعت کو (لعل شاہ صاحب

کے دعوے کے مطابق) اگر یزید کے فاسق ہونے میں شک نہ ہوتا تو وہ اس کے خلاف خروج کرنے اور اس کی بیعت توڑنے والوں کو اس سے منع کرنے کو اس طرح بلا وجہ و بلا جواز نہ بتاتے، اور اس پر ایسی وعیدیں نہ سناتے کہ:

"عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: لَمَّا خَلَعَ أَهْلُ المَدِينَةِ يَزِيدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ، جَمَعَ ابْنُ عُمَرَ، حَشَمَهُ وَوَلَدَهُ، فَقَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: يُنْصَبُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ القِيَامَةِ وَإِنَّا قَدْ بَايَعْنَا هَذَا الرَّجُلَ عَلَى بَيْعِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَإِنِّي لاَ أَعْلَمُ غَدْرًا أَعْظَمَ مِنْ أَنْ يُبَايَعَ رَجُلٌ عَلَى بَيْعِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُنْصَبُ لَهُ القِتَالُ، وَإِنِّي لاَ أَعْلَمُ أَحَدًا مِنْكُمْ خَلَعَهُ، وَلاَ بَايَعَ فِي هَذَا الأَمْرِ، إِلَّا كَانَتِ الفَيْصَلَ بَيْنِي وَبَيْنَه"۔

نافع روایت کرتے ہیں کہ جب اہل مدینہ نے یزید بن معاویہ کی بیعت توڑ دی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے ساتھیوں اور بچوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر وعدہ توڑنے والے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا، اور ہم اس (یعنی یزید) کی بیعت، اللہ اور اس کے رسول کے موافق کر چکے ہیں، میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی غداری ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کی بیعت اللہ اور اس کے رسول کے موافق کی جائے پھر اس سے جنگ کی جائے۔ تم میں سے جو شخص یزید کی بیعت توڑے گا اور اس کی اطاعت سے روگردانی کرے گا تو میرا اس سے کوئی تعلق یا رشتہ باقی نہ رہے گا۔

(صحیح البخاری، بَابُ إِذَا قَالَ عِنْدَ قَوْمٍ شَيْئًا، ثُمَّ خَرَجَ فَقَالَ بِخِلاَفِهِ)

اور صحیح مسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ:

"عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: جَاءَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ إِلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ مُطِيعٍ حِينَ كَانَ مِنْ أَمْرِ الْحَرَّةِ مَا كَانَ، زَمَنَ يَزِيدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ، فَقَالَ: اطْرَحُوا لِأَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ وِسَادَةً، فَقَالَ: إِنِّي لَمْ آتِكَ لِأَجْلِسَ، أَتَيْتُكَ

لِأُحَدِّثَكَ حَدِيثًا سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُهُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ، لَقِيَ اللهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً"۔

یعنی واقعہ حرہ کے وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن مطیع کے پاس تشریف لائے، تو عبداللہ بن مطیع نے (اپنے ساتھیوں سے) کہا کہ : ابوعبدالرحمن (یعنی حضرت ابن عمر) کے لیے تکیہ یا نشست لگاؤ، تو حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ: میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ میں تم کو نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان سنانے آیا ہوں کہ آپ نے فرمایا: جس نے اطاعتِ (امیر) سے ہاتھ کھینچ لیا (یعنی بیعت توڑ دی) وہ قیامت کے دن اس حال میں اللہ سے ملاقات کرے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی، اور جس کی اس حال میں موت ہوگئی کہ اس کی گردن میں بیعت نہ تھی تو گویا کہ وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(صحيح مسلم، بَابُ الْأَمْرِ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ عِنْدَ ظُهُورِ الْفِتَنِ وتحذير الدعاة إلى الكفر)

پھر یہ حضرات خود بیعت توڑنے والوں کا ساتھ دیتے یا نہ دیتے مگر اس کو یوں غیر محمود نہ ٹھہراتے، تفرقہ بین جماعۃ المسلمین کا نام نہ دیتے، اطاعت امیر اور لزوم جماعت کا حکم نہ کرتے۔ صحابہؓ وتابعینؒ کے اس قول وفعل، لب ولہجہ اور اندازِ منع کے ظاہر سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ یزید کو فاسق وفاجر اور زانی وشرابی نہ سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے تو یہ دعویٰ کہ "ان کو یزید کے فاسق ہونے میں شک نہ تھا" صرف بلا دلیل ہی نہیں بلکہ خلافِ دلیل بھی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ یوں نقشہ کھینچا ہے، غور سے پڑھیں :

"وَاعْتَزَلَ النَّاسَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ " زَيْنُ الْعَابِدِينَ " وَكَذَلِكَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عمر بن الخطاب لم يخلعا يزيد، ولا أحد من بيت ابن عمر، وَقَدْ قَالَ ابْنُ عُمَرَ لِأَهْلِهِ :لَا يَخْلَعَنَّ أَحَدٌ منكم يزيد فتكون الْفَيْصَلُ وَيُرْوَى الصَّيْلَمُ بَيْنِي وَبَيْنَهُ، وَسَيَأْتِي هَذَا الْحَدِيثُ بِلَفْظِهِ

وَإِسْنَادِهِ فِي تَرْجَمَةِ يَزِيدَ، وَأَنْكَرَ عَلَى أَهْلِ الْمَدِينَةِ فِي مُبَايَعَتِهِمْ لِابْنِ مُطِيعٍ وَابْنِ حَنْظَلَةَ عَلَى الْمَوْتِ، وَقَالَ :إِنَّمَا كُنَّا نُبَايِعُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَنْ لَا نَفِرَّ، وَكَذَلِكَ لَمْ يَخْلَعْ يَزِيدَ أَحَدٌ مِنْ بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَقَدْ سئل محمد بن الحنفية في ذلك فامتنع عن ذلك أشد الامتناع، وَنَاظَرَهُمْ وَجَادَلَهُمْ فِي يَزِيدَ وَرَدَّ عَلَيْهِمْ مَا اتهموا يزيد به من شرب الْخَمْرَ وَتَرْكِهِ بَعْضَ الصَّلَوَاتِ كَمَا سَيَأْتِي مَبْسُوطًا فِي تَرْجَمَةِ يَزِيدَ قَرِيبًا إِنْ شَاءَ اللَّهُ"۔

حضرت علی بن الحسین (یعنی حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ) اور اسی طرح عبداللہ بن عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہما) دونوں نے یزید کی بیعت نہیں توڑی تھی، اور نہ ہی ابن عمر کے خاندان میں سے کسی نے توڑی تھی، ابن عمر نے تو اپنے اہل وعیال سے فرمایا تھا کہ تم میں سے جس نے بھی یزید کی بیعت توڑی تو میرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا، یہ حدیث الفاظ اور سند کے ساتھ یزید کے تعارف میں آئے گی، (اسی طرح ابن عمر) نے اہل مدینہ کی اس بات کو ناپسند کیا تھا جو انہوں نے (عبداللہ) بن مطیع اور (عبداللہ) بن حنظلہ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی اور فرمایا تھا کہ ہم صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کیا کرتے تھے کہ ہم فرار اختیار نہ کریں گے، اسی طرح بنو عبدالمطلب میں سے بھی کسی نے بھی یزید کی بیعت نہیں توڑی تھی، یہاں تک کہ محمد بن حنفیہ سے یہ (بیعت توڑنے کا) کہا گیا تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا، بلکہ ان سے یہ مطالبہ کرنے والوں کے ساتھ انہوں نے یزید کے بارے میں مناظرہ ومجادلہ کیا اور جو انہوں نے یزید پر شراب نوشی اور بعض نمازیں ترک کرنے کی تہمت لگائی تھی اس میں ان لوگوں کا رد کیا جیسا کہ تفصیل کے ساتھ یزید کے تعارف میں آئے گا ان شاءاللہ۔

(البداية والنهاية، ج8، ص308، وزارة الاوقاف قطر)

بلکہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ آل ابی طالب اور بنی عبدالمطلب میں سے کسی فرد نے بھی یزید کی بیعت توڑ کر اس کے خلاف خروج نہیں کیا تھا:

" لَمْ يَخْرُجْ أَحَدٌ مِنْ آلِ أَبِي طَالِبٍ وَلَا مِنْ بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ أَيَّامَ الْحَرَّةِ"۔

یعنی واقعہ حرہ کے دنوں میں آل ابی طالب اور بنی عبدالمطلب میں سے کسی نے بھی خروج نہیں کیا تھا۔

(البداية والنهاية، ج8، ص329، وزارة الاوقاف قطر)

اہم ترین سوال! یزید کب فاسق ہوا؟

لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنوا جو یزید کو "متفق علیہ" فاسق ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، بات ذرا لمبی ہو جائے گی، لیکن جب تک شروع سے نہ کی جائے واضح اور مکمل نہ ہوگی۔

یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھی صحابہ و تابعین کے مشورے سے بوجوہ یہ مناسب سمجھا کہ وہ اپنی زندگی میں یزید کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کر دیں اور لوگوں سے اس کے لئے بیعت لے لیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اعلان کر دیا اور بیعت لینا شروع کی، جیسا کہ کتب تاریخ کے حوالے سے پہلے بیان ہوا کہ اطراف مملکت کی تمام رعایا نے ولی عہدی کی یہ بیعت کرلی، صرف چار یا پانچ افراد نے بیعت نہیں کی، پہلے نقل کیا گیا کہ مؤرخ طبری نے سنہ 56ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

"لما مات زياد دعا مُعَاوِيَة بكتاب فقرأه عَلَى الناس باستخلاف يَزِيد، إن حدث بِهِ حدث الموت فيزيد ولي عهد، فاستوسق لَهُ الناس عَلَى البيعة ليزيد غير خمسة نفر"۔

جب زیاد کی وفات ہوگئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک تحریر منگوائی اور لوگوں کے سامنے پڑھی (جس میں لکھا تھا کہ) اگر مجھے موت آجائے تو یزید ولی عہد ہوگا، پس تمام لوگ یزید کی بیعت پر جمع و متفق ہو گئے، سوائے پانچ لوگوں کے۔

(تاريخ الطبري، ج5ص303،دار المعارف)

اسی طرح حافظ ابن کثیر کا حوالہ بھی پہلے نقل ہو چکا کہ انہوں نے بھی سنہ 56ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ:

"فَلَمَّا مَاتَ زِيَادٌ، وَكَانَتْ هَذِهِ السَّنَةُ، شَرَعَ مُعَاوِيَةُ فِي نَظْمِ الْبَيْعَةِ لِيَزِيدَ وَالدُّعَاءِ إِلَيْهَا، وَعَقَدَ الْبَيْعَةَ لِوَلَدِهِ يَزِيدَ، وَكَتَبَ إِلَى الْآفَاقِ بِذَلِكَ، فَبَايَعَ لَهُ النَّاسُ فِي سَائِرِ الْأَقَالِيمِ، إِلَّا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ وَالْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَابْنَ عَبَّاسٍ، فَرَكِبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى مَكَّةَ مُعْتَمِرًا، فَلَمَّا اجْتَازَ بِالْمَدِينَةِ مَرْجِعَهُ مِنْ مَكَّةَ اسْتَدْعَى كُلَّ وَاحِدٍ مِنْ هَؤُلَاءِ الْخَمْسَةِ....الخ"۔

اور جب اسی سال (یعنی 56ھ میں) زیاد کی وفات ہوگئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے یزید کی باقاعدہ بیعت کے لئے کہنا شروع کیا، اس کے لئے انہوں نے تمام علاقوں کی طرف لکھ بھیجا، پس تمام صوبوں کے لوگوں نے یزید کی (ولی عہدی کی۔ناقل) بیعت کرلی سوائے حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت حسین بن علی، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہم) کے، اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے مکہ تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی پر مدینہ میں قیام کے دوران ان پانچ حضرات کو بلایا ....الخ۔

(البداية والنهاية، ج8ص116، وزارةالاوقاف قطر)

اور خود لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی سوائے مدینہ کے چند زعماء کے عامۃ الناس نے یزید کی بیعت کرلی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں:

"سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کرلی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

تو تاریخی روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پانچ حضرات کے ساتھ مذاکرات میں

اس مسئلے کو بھی چھیڑا اور ان سے بیعت لینا چاہی، ان حضرات نے تب بھی بیعت نہیں کی، مگر بیعت نہ کرنے کا یہ سبب کسی نے بیان نہیں کیا کہ "یزید فاسق و فاجر یا شرابی ہے"، بلکہ کسی نے یہ کہا کہ یہ تو قیصر و کسریٰ کی سنت ہے کہ باپ بیٹے کو ولی عہد بنائے، کسی نے یہ کہا کہ ایک وقت میں دو خلیفوں کے لئے بیعت نہیں ہوا کرتی، اگر آپ خلافت سے اکتا گئے ہیں تو اس سے کنارہ کش ہو جائیں پھر ہم یزید کی بیعت کے بارے میں سوچتے ہیں، کسی نے کہا کہ خلفاء راشدین میں سے کسی نے اپنے بیٹے کو جانشین نہیں بنایا۔

الغرض! بتانا یہ مقصود ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں جس وقت یزید کے لئے بیعت لی تھی، اس وقت کسی شخص نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ "وہ فاسق و فاجر یا نااہل ہے"، خود لعل شاہ صاحب کی تحریر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک، بلکہ سنہ 63ھ تک یزید فاسق و فاجر نہ ہو، چنانچہ آپ کی اپنی تحریر پہلے نقل کی گئی کہ:

> "یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ بوقت ولی عہدی سنہ 44ھ تک یزید کا فسق ظاہر نہیں ہوا تھا، <u>جب اس کا فسق ظاہر ہوا تو صحابہ کرام اس بارے میں مختلف ہو گئے کہ اس کی بیعت سے نکل جائیں یا اس پر مستقیم رہیں</u>"۔
>
> (استخلاف یزید، صفحہ 372)

لعل شاہ صاحب کی تحریر کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کریں، وہ بتا رہے ہیں کہ جب یزید کا فسق ظاہر ہوا تو اس وقت جن صحابہ کرام نے بیعت کر رکھی تھی ان میں اختلاف ہوا کہ اب بیعت توڑ کر اس کی بیعت سے نکل جائیں یا بیعت باقی رکھی جائے۔ اور یہ واقعہ سنہ 63ھ کے اواخر کا ہے جب واقعہ حرہ پیش آیا، کیونکہ اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا جب اس بات پر اختلاف ہوا ہو کہ اب یزید کی بیعت توڑی جائے یا باقی رکھی جائے۔ یوں کم از کم لعل شاہ صاحب تو اقرار کر بیٹھے کہ اس وقت تک ان سب صحابہ نے بیعت کی ہوئی تھی اور (اگر یزید میں کوئی فسق وغیرہ تھا تو) وہ سنہ 63ھ سے پہلے ظاہر ہی نہ ہوا تھا کہ بیعت توڑنے کا سوال اٹھتا۔

بہر حال یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کے فسق و فجور کا کوئی اتا پتا نہ تھا یا بقول بعض "ظاہر نہیں ہوا تھا"، نہ کسی کو اس کی شکایت تھی، نہ اس کے فسق کو کسی نے اس کی بیعت نہ کرنے کا سبب بتایا۔ کیونکہ اگر یہ مانا جائے کہ بطور ولی عہد نامزدگی کے وقت یزید فاسق و فاجر ہی تھا یا ولی

عہدی کی بیعت کے بعد (لعل شاہ صاحب کے مفروضے کے مطابق سنہ 44ھ یا اس کے بعد) حضرت معاویہ ﷛ کی زندگی میں ہی کسی وقت اس کا فسق ظاہر و مشہور ہوگیا تھا، تو اس کا مطلب ہوگا کہ حضرت معاویہ ﷛ نے یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے ایک فاسق و فاجر کو مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رکھا اور ان کے ساتھ وہ صحابہ و تابعین بھی اس کام میں برابر کے شریک تھے جنہوں نے پہلے تو ولی عہدی کی بیعت کی اور پھر یہ جان کر بھی کہ یزید فاسق و فاجر ہو چکا ہے وہ حضرت معاویہ ﷛ کی وفات تک اپنی بیعت پر قائم رہے۔ یہ بڑی ناخدا ترسی، دنیاداری اور معصیت ہے، جس کی نسبت عام دین دار اور متقی مسلمان کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی، چہ جائے کہ حضرت معاویہ ﷛ یا کسی صحابی کی طرف کی جائے، اہل سنت سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص یہ بات تسلیم نہیں کرسکتا۔

پھر رجب سنہ 60ھ میں حضرت معاویہ ﷛ کی وفات ہو جاتی ہے، تاریخی روایات کے مطابق اس کے بعد والی مدینہ یزید کی خلافت کی بیعت لینا شروع کرتا ہے، اس مقصد کے لئے وہ حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر (﷠) کو بھی بلاتا ہے، تب بھی یہ حضرات یزید کے فسق و فجور کا کوئی ذکر نہیں کرتے بلکہ (علی اختلاف الروایات) حضرت ابن زبیر ﷛ تو اس سے ملتے ہی نہیں، اور حضرت حسین ﷛ غور و فکر کے لئے مہلت مانگ کر، یا دونوں یہ کہہ کر کہ ہماری بیعت سب لوگوں کے سامنے ہونی چاہئے اپنے گھر واپس آجاتے ہیں، اور پھر دونوں اسی دن یا ایک دن آگے پیچھے راتوں رات خفیہ طریقے سے مکہ روانہ ہو جاتے ہیں، ابن کثیر کی روایت کے مطابق راستے میں ان دونوں کی ملاقات حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس (﷠) سے ہوتی ہے (جو مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہے تھے) وہ ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا خبر ہے؟ یہ حضرات بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ ﷛ کی وفات ہو چکی ہے اور یزید کے لئے بیعت لی جا رہی ہے (اور ہم وہاں سے نکل آئے ہیں)، اس پر حضرت ابن عمر ﷛ نے فرمایا:

"فَقَالَ لَهُمَا ابْنُ عُمَرَ: اتَّقِيَا اللَّهَ، وَلَا تُفَرِّقَا بَيْنَ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِينَ"۔

دیکھئے! اللہ سے ڈریے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ درہم برہم نہ کیجئے۔

(البداية والنهاية، ج8ص214، وزارة الاوقاف قطر)

پھر جب حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس (﷠) مدینہ پہنچے اور معلوم ہوا کہ اہل امصار نے

یزید کی بیعت کرلی ہے تو ان حضرات نے بھی بیعت کرلی۔ دوسری طرف جب حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) مکہ پہنچے تو وہاں حاکم مکہ عمرو بن سعید بن العاص تھا، اس سے ان حضرات کو اندیشہ پیدا ہوا، اس لئے اس سے کہا کہ ہم اللہ کے گھر میں پناہ لینے آئے ہیں۔

(ایضاً، صفحہ 215)

اب یہاں تھوڑی دیر کے لئے رک کر غور کریں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی کوئی ایک شخص زبان پر نہیں لاتا کہ یزید فاسق و فاجر اور شرابی ہے، حتیٰ کہ جن دو بزرگوں نے بیعت سے پرہیز کیا وہ بھی اس کا اشارہ تک نہیں کرتے کہ ہم اس کے فسق و فجور کی وجہ سے بیعت سے کنارہ کرتے ہیں۔

اب آگے چلئے، حضرت حسین اور حضرت ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) مکہ پہنچ کر مقیم ہو گئے، ابن کثیر کے الفاظ میں:

"بَايَعَ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَصَمَّمَ عَلَى الْمُخَالَفَةِ الْحُسَيْنُ وَابْنُ الزُّبَيْرِ، وَخَرَجَا مِنَ الْمَدِينَةِ فَارِّينَ إِلَى مَكَّةَ فَأَقَامَا بِهَا، فَعَكَفَ النَّاسُ عَلَى الْحُسَيْنِ يَفِدُونَ إِلَيْهِ وَيَقْدَمُونَ عَلَيْهِ، وَيَجْلِسُونَ حَوَالَيْهِ وَيَسْتَمِعُونَ كَلَامَهُ، حِينَ سَمِعُوا بِمَوْتِ مُعَاوِيَةَ وَخِلَافَةِ يَزِيدَ، وَأَمَّا ابْنُ الزُّبَيْرِ فَإِنَّهُ لَزِمَ مُصَلَّاهُ عِنْدَ الْكَعْبَةِ، وَجَعَلَ يَتَرَدَّدُ فِي غُبُونِ ذَلِكَ إِلَى الْحُسَيْنِ فِي جُمْلَةِ النَّاسِ"۔

خلاصہ: حضرت ابن عمر اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے یزید کی بیعت کرلی، اور حضرت حسین و حضرت ابن زبیر (رضی اللہ عنہما) اپنے موقف بیعت گریزی پر قائم رہے اور مدینہ سے روانہ ہو کر مکہ میں مقیم ہو گئے (لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قیام مکہ کو غنیمت سمجھا) اور یہ معمول بن گیا کہ لوگ آپ کی خدمت میں آکر آپ کے پاس بیٹھتے اور آپ کی باتیں سنتے، جبکہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ زیادہ تر کعبہ کے پاس اپنی جائے نماز پر بیٹھے رہتے اور کبھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس بھی آتے جاتے تھے۔

(البداية والنهاية، ج8ص219، وزارة الاوقاف قطر)

شدہ شدہ یہ خبر عراق پہنچی اور عراقیوں کے وفود اور خطوط آنے شروع ہو گئے، ان خطوط و وفود کا کیا منشا تھا، اس کو حافظ ابن کثیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"وَجَعَلُوا يَسْتَحِثُّونَهُ وَيَسْتَقْدِمُونَهُ عَلَيْهِمْ، لِيُبَايِعُوهُ عِوَضًا عَنْ يَزِيدَ بْنِ مُعَاوِيَةَ، وَيَذْكُرُونَ فِي كُتُبِهِمْ أَنَّهُمْ فَرِحُوا بِمَوْتِ مُعَاوِيَةَ، وَيَنَالُونَ مِنْهُ وَيَتَكَلَّمُونَ فِي دَوْلَتِهِ، وَأَنَّهُمْ لَمْ يُبَايِعُوا أَحَدًا إِلَى الْآنَ، وَأَنَّهُمْ يَنْتَظِرُونَ قُدُومَكَ إِلَيْهِمْ لِيُقَدِّمُوكَ عَلَيْهِمْ"۔

عراقی لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ابھارنے لگے اور اپنے پاس آنے کی دعوت دینے لگے، تا کہ یزید کی جگہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں، وہ اپنے خطوط میں ذکر کرتے کہ معاویہ کی وفات پر انہیں خوشی ہوئی ہے، نیز ان کے اور ان کی حکومت کے بارے میں غلط باتیں لکھتے، اور لکھتے کہ انہوں نے ابھی تک کسی کی بیعت نہیں کی، اور آپ کی آمد کے منتظر ہیں تا کہ آپ کو ان لوگوں (یعنی بنی امیہ) پر مقدم کیا جائے۔

(البداية والنهاية، ج8ص220، وزارة الاوقاف قطر)

چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراقیوں کی ان باتوں کی تصدیق کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا، مسلم کوفہ پہنچے تو وہاں اٹھارہ ہزار آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے کی بیعت کی اور ان کی نصرت کا وعدہ کیا..... اس کے بعد مسلم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ آپ تشریف لے آئیں آپ کے لئے بیعت اور سارے کام ٹھیک ہو گئے، اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ روانہ ہو گئے۔

(ایضا، صفحہ 220)

الغرض! آپ کتب تاریخ میں یہ پورا بیان پڑھ جائیے، آپ کو کہیں نہیں ملے گا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے مدینہ سے مکہ، اور پھر مکہ سے عراق کی طرف خروج کے کسی بھی مرحلہ میں یزید کے فسق و فجور کو اپنے اس خروج کی بنیاد قرار دیا ہو۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کوئی آناً فاناً تو نہ ہو گئی تھی کہ ان سے اس بنیاد کا منقول ہونا پردہ خفاء میں رہ گیا ہو، بلکہ انہوں نے یزید کی ولیعہدی سے، پہلے دن سے ہی اختلاف کیا اور اپنے خروج تک اس پر قائم بھی رہے۔ ولیعہدی کے زمانہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مذاکرات ہوئے، ان کی وفات کے بعد

مدینہ منورہ کے گورنر سے اس پر گفتگو ہوئی، مدینہ سے مکہ کا سفر ہوا، وہاں صحابہ کرامؓ وتابعین عظامؒ سے صلاح مشورے ہوئے،کوفہ کی طرف نکلے تو صحابہؓ وتابعینؒ نے روکا، کربلا پہنچ کر یزیدی فوج کے ذمہ داروں سے بالمشافہ باتیں ہوئیں، ان تمام مراحل میں سے کیا کسی بھی مرحلے پر حضرت حسینؓ نے اپنے اس خروج کی بنیاد یزید کے فسق وفجور کو قرار دیا؟ بلکہ کہیں کسی موقع پر اس کے فسق وفجور یا شراب نوشی کا نام بھی لیا؟ یا کوفیوں نے یہ کہا یا لکھا کہ یزید تو فاسق ہوگیا ہے، شراب پیتا، ایسا ہے ویسا ہے؟ نہ ہی یہ ملے گا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کبھی یہ فرمایا ہو کہ" مجھے تو امارت سے کوئی مطلب نہیں، نہ اس کی کوئی خواہش ہے، میں تو صرف یزید کے فسق وفجور کے خلاف یا اسلام کو بچانے کے لئے جنگ کے لئے نکلا ہوں، میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ یہ فسق وفجور دنیا سے مٹ جائے خواہ اس طرح کہ یزید توبہ تائب ہو کر پاکباز زندگی اختیار کرلے اور احکام شریعت کے آگے گھٹنے ٹیک دے، یا اس طرح کہ یزید کی حکومت مٹ جائے اور اس کی جگہ کوئی متقی و پرہیزگار اور متبع شریعت شخص حکومت کا سربراہ ہو جائے، خواہ وہ کوئی بھی ہو"۔ لیکن آپ تاریخ کے ہزاروں صفحات پڑھ کر بھی اس طرح کا کوئی ایک لفظ مستند طریقے سے پیش نہیں کرسکتے۔ لہٰذا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے یزید کی بیعت سے احتراز اور آپ کے عراق کی طرف خروج کا سبب یزید بن معاویہ بن ابی سفیان اموی کا فسق وفجور بتانا خلاف واقعہ ہے۔

ایک تلبیس اور اس کا جواب

کچھ لوگ یہ تلبیس دیتے ہیں کہ" ثابت کرو کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق جانے سے منع کرنے والے کسی صحابی نے یزید کے فاسق ہونے کی تردید کی ہو یا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر خروج سے روکا ہو کہ یزید فاسق وفاجر نہیں ہے"۔

تو اس پر ہمارا سوال ہے کہ اگر ان صحابہؓ نے یہ نہیں کہا تھا کہ" یزید فاسق نہیں" تو کیا حضرت حسینؓ نے ہی اس کی بیعت سے تخلف یا اس کے خلاف خروج یہ کہہ کر کیا تھا کہ" یزید فاسق ہے"؟ کیا اس کا کوئی ثبوت آپ پیش کرسکتے ہیں؟ جب حضرت حسینؓ نے ہی اس کے خلاف اپنا خروج یہ کہہ کر نہیں کیا تھا کہ" یزید فاسق و فاجر ہے" تو ان کو منع کرنے والے صحابہؓ ہی یہ کہہ کر آپ کو کیوں روکتے کہ" یزید فاسق نہیں"؟ کتنی عجیب بات ہے کہ بیعت نہ کرنے والوں کا صرف بیعت نہ کرنا اور خروج کرنے والوں کا صرف خروج ہی دلیل ہو فسق یزید

کی، اس کے لئے یہ کہنا ضروری نہ ہو کہ "یزید فاسق ہے"۔ لیکن اسے خلیفہ بنانے والوں، اس کی بیعت کرنے والوں، بیعت توڑنے والوں کو ایسا کرنے سے منع کرنے والوں کا عمل دلیل نہ ہو اس کے فاسق نہ ہونے کی بلکہ اس کے لئے یہ کہنا بھی ضروری ہو کہ "یزید فاسق نہیں"؟۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی عدم خروج کا مشورہ دینے والے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اگر یہ نہیں کہا تھا کہ "یزید فاسق نہیں" تو اس لئے نہیں کہ وہ ضرور اس کو فاسق ہی جانتے مانتے تھے بلکہ اس لئے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ہی خروج یہ کہہ کر نہیں کیا تھا کہ "یزید فاسق ہے"۔ یعنی وہاں یزید کے فسق کی کوئی بات ہی نہ چھڑی تھی کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس کی تردید یا تائید کرتے، ورنہ جہاں اہلِ مدینہ نے یہ بات چھیڑی تھی وہاں اسی روایت میں ہے کہ حضرت محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقدونقد اس کی مفصل و مدلل تردید بھی کر دی تھی۔

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کا وہم

بعض حضرات یزید کے فسق کو صحابہ کرام کے درمیان "متفق علیہ" ثابت کرنے کے لئے مؤرخ ابن خلدون (م 808ھ) کی ایک عبارت بڑے شدومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے لکھا ہے:

"فإنّه لمّا ظهر فسق يزيد عند الكافّة من أهل عصره..."۔

پس جب یزید کا فسق اس کے زمانہ کے تمام لوگوں پر ظاہر ہو گیا.....۔

(تاریخ ابن خلدون، ج1ص269، دار الفکر بیروت)

پھر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دیکھو علامہ ابن خلدون نے صاف لکھا ہے کہ یزید کا فسق اس کے زمانہ کے تمام لوگوں پر ظاہر ہو چکا تھا، اور وہ زمانہ صحابہ و تابعین کا ہی تھا، لہٰذا ثابت ہوا کہ فسق یزید اس زمانہ میں "متفق علیہ" تھا۔

لیکن اگر ابن خلدون کی مکمل عبارت پڑھی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابن خلدون کا یہ بیان ان کا وہم ہے اور حقائق و واقعات اس کی تائید نہیں کرتے، ملاحظہ فرمائیں مکمل عبارت، وہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے یزید کے خلاف خروج پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأمّا الحسين فإنّه لمّا ظهر فسق يزيد عند الكافّة من أهل عصره

بعثت شيعة أهل البيت بالكوفة للحسين أن يأتيهم فيقوموا بأمره، فرأى الحسين أنّ الخروج على يزيد متعيّن من أجل فسقه لا سيّما من له القدرة على ذلك وظنّها من نفسه بأهليّته وشوكته فأمّا الأهليّة فكانت كما ظنّ وزيادة وأمّا الشّوكة فغلط يرحمه الله فيها.."۔

جہاں تک حسین (رضی اللہ عنہ) کا معاملہ ہے تو، جب یزید کا فسق اس کے زمانہ کے تمام لوگوں پر ظاہر و واضح ہو گیا تو کوفہ میں رہنے والے اہل بیت کے شیعہ نے حسین (رضی اللہ عنہ) کو پیغام بھیجا کہ آپ ان کے پاس تشریف لے آئیں تو وہ آپ کی حکومت قائم کر لیں گے، پس حسین (رضی اللہ عنہ) نے یہ خیال فرمایا کہ یزید کے فسق کی وجہ سے اس کے خلاف خروج متعین و لازم ہو چکا ہے، خاص طور پر اس کے لئے جو اپنے آپ کو (خلافت) کا اہل سمجھتا ہے اور جس کے پاس (ٹکر لینے کی) طاقت بھی ہے۔ لیکن جہاں تک اہلیت کی بات ہے تو وہ ایسے ہی تھی جیسا (سیدنا حسین رضی اللہ عنہ) نے گمان کیا (کہ اہلیت تو ان میں تھی)، لیکن طاقت کے معاملے میں آپ رضی اللہ عنہ کا اندازہ غلط ثابت ہوا، اللہ کی رحمت ہو آپ پر....۔

(تاریخ ابن خلدون، ج1ص269و 270، دار الفکر بیروت)

اس کے بعد ذرا آگے لکھتے ہیں:

"وأمّا غير الحسين من الصّحابة الّذين كانوا بالحجاز ومع يزيد بالشّام والعراق ومن التّابعين لهم فرأوا أنّ الخروج على يزيد وإن كان فاسقا لا يجوز لما ينشأ عنه من الهرج والدّماء فأقصروا عن ذلك ولم يتابعوا الحسين ولا أنكروا عليه ولا أثّموه لأنّه مجتهد وهو أسوة المجتهدين ولا يذهب بك الغلط أن تقول بتأثيم هؤلاء بمخالفة الحسين وقعودهم عن نصره فإنّهم أكثر الصّحابة وكانوا مع يزيد ولم يروا الخروج عليه" ۔

سیدنا حسین (رضی اللہ عنہ) کے علاوہ جو دوسرے صحابہ و تابعین حجاز میں تھے، یا یزید کے ساتھ شام میں تھے، یا عراق میں تھے، ان سب کی رائے یہ تھی کہ یزید اگرچہ فاسق ہے لیکن اس کے خلاف خروج جائز نہیں کیونکہ اس میں اثارت فتنہ اور خون بہنے کا ڈر ہے، تو انہوں نے حسین (رضی اللہ عنہ) کی اتباع نہیں کی (یعنی ان کی بات سے اتفاق نہ کیا) لیکن ان کی رائے پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کیا، نہ ان کے اس اقدام کو گناہ کہا، کیونکہ آپ (رضی اللہ عنہ) مجتہد تھے، اور مجتہدین کا یہی طریقہ ہے (کہ وہ دوسرے مجتہد کے اجتہاد کو قطعی غلط اور اس کی وجہ سے اسے گنہگار نہیں کہتے)۔ اور یہ غلطی مت کرنا کہ تم (ان صحابہ و تابعین) کو گناہ کا مرتکب سمجھنے لگو جنہوں نے حسین (رضی اللہ عنہ) کی رائے کی مخالفت کی اور ان کی مدد نہیں کی، کیونکہ اس طرف صحابہ کی اکثریت تھی، وہ یزید کے ساتھ تھے، اور اس کے خلاف خروج کو درست نہیں سمجھتے تھے۔

(تاریخ ابن خلدون، ج1ص 270، دار الفکر بیروت)

یہ ہے علامہ ابن خلدون کی وہ عبارت جس کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ یزید کا فسق تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے فوراً بعد اس وقت کے تمام صحابہ و تابعین پر ظاہر ہو چکا تھا، اختلاف صرف اس میں تھا کہ اس کے خلاف خروج درست ہے یا نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون کے اس قول کو سند بنانا بڑی بے خبری کا ثبوت دینا ہے، ابن خلدون نے اس کو تاریخی واقعہ کے طور پر بیان نہیں کیا ہے، بلکہ یزید کی مخالفت و عدم مخالفت کے باب میں صحابہ کرام کی دونوں جماعتوں (سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم) کے موقفوں کو صحیح ثابت کرنے کے موقع پر انہوں نے یہ بات کہی ہے، وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جمہور صحابہ کا بھی ایک موقف تھا اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بھی اپنا اجتہاد کیا، جہاں تک دونوں جماعتوں کے موقفوں کی تصویب و تصحیح کا تعلق ہے وہ تو بالکل حق ہے، لیکن ابن خلدون کا یہ بیان کہ "جب یزید کا فسق تمام لوگوں پر ظاہر ہو گیا تب کوفہ کے شیعوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور آپ یزید کے فسق کی وجہ سے اس کے خلاف خروج واجب سمجھ کر نکلے" واقعات کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس بات کے ناقابل تردید دلائل موجود ہیں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ کی طرف روانگی تک کسی نے بھی یزید کے فسق کا ذکر نہیں کیا، خود سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے کبھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ اس کے برخلاف انہوں نے

اثنائے سفر کوفہ میں بار بار واپسی کا ارادہ کیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کربلا میں یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ کوئی کہے تو کہے، ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ جیسا صاحب عزم، یزید کو فاسق سمجھ کر اس کی مخالفت کا جھنڈا بلند کرے گا، پھر جان کے خوف سے رجوع بلکہ اسی فاسق کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کو تیار ہو جائے گا۔ یہ آپ رضی اللہ عنہ کی حمایت نہیں، ان کے عزم قوی اور ان کی بے نظیر شجاعت کی توہین ہے، ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ کسی عالم کا بیان اسی حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے، جب تک واقعات و مشاہدات اس کے مکذّب نہ ہوں، واقعات سے آنکھ بند کر کے کسی غیر معصوم کے قول کو واجب التسلیم سمجھنا، اس کو معصوم سمجھنا ہے۔

خود لعل شاہ صاحب نے ابن جریر طبری، ابن الاثیر اور حافظ ابن کثیر (رحمۃ اللہ علیہم) کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"ابن جریر، ابن اثیر اور ابن کثیر کی ہستیاں بلند پایہ ہیں لیکن اس مرحلے میں ہم ان کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں اور ان کے قول کو رد کر دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 275)

نیز ایک جگہ لکھتے ہیں:

"حافظ ابن کثیر اور طبری کی تحقیق بھی درست نہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 364)

جس طرح ابن خلدون کا مندرجہ بالا بیان غلط اور واقعات کے خلاف ہے، اسی طرح ان کا وہ بیان بھی واقعات کے صریح خلاف ہے جو اس سے پہلے انہوں نے لکھا ہے کہ:

"ولمّا حدث في يزيد ما حدث من الفسق اختلف الصّحابة حينئذ في شأنه فمنهم من رأى الخروج عليه ونقض بيعته من أجل ذلك كما فعل الحسين وعبدالله بن الزّبير رضي الله عنهما ومن اتّبعهما في ذلك، ومنهم من أباه لما فيه من إثارة الفتنة وكثرة القتل"۔

کہ جب یزید میں فسق پیدا ہوا تو صحابہ نے اس پر خروج اور اس کی بیعت توڑنے کے معاملے میں اختلاف کیا، بعض نے اس کے فسق کی وجہ سے خروج اور اس کی بیعت توڑنا ضروری سمجھا

جیسے حضرت حسین ﷛ وحضرت ابن زبیر ﷛ اور ان کے متبعین نے کیا، اور دوسروں نے فتنہ اور خون ریزی کے خدشہ کے پیش نظر اس سے انکار کیا۔

(تاريخ ابن خلدون، ج1ص 264و 265، دار الفكر بيروت)

اس بیان کے غلط ہونے کے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہ اس موقع پر بیعت توڑنے کا ذکر کر رہے ہیں، حالانکہ اس موقع پر اس کا کوئی سوال نہیں تھا، حضرت حسین اور حضرت ابن الزبیر (﷠) نے تو آخر تک یزید کی بیعت نہیں کی، اور جس وقت حضرت ابن عمر وحضرت ابن عباس (﷠) نے پہلی دفعہ مدینہ ومکہ کے راستہ میں حضرت حسین وابن الزبیر (﷠) کو تفریق جماعت سے منع فرمایا، اس وقت تک ان دونوں حضرات نے بھی یزید کی بیعت نہیں کی تھی، اس لئے نقض بیعت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اس کے علاوہ جب اسی وقت یزید کا فسق ظاہر ہوگیا تھا، تو اس کے بعد حضرت ابن عمر وابن عباس (﷠)، نیز دو کے سوا باقی صحابہ نے اس فاسق کی بیعت کس طرح گوارا کرلی؟ جبکہ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ "لايجوز عقد الولاية لفاسق" یعنی فاسق کو والی بنانا جائز نہیں (فتح الباری، ج13ص8)۔

اور اگر اس "بیعت توڑنے" والے بیان سے ابن خلدون کا اشارہ واقعہ حرہ کی طرف ہے تو اس وقت تو سیدنا حسین ﷛ موجود ہی نہیں تھے، پھر ان کی طرف "بیعت توڑنے" کی نسبت چہ معنی دارد؟ ان وجوہ سے ابن خلدون کا یہ بیان نہ صحیح ہے نہ قابل قبول کہ اس سے سند پکڑی جاسکے۔

یہی حال بعض علماء کے ان اقوال کا ہے جو انہوں نے لکھا ہے کہ:

"وَبعد اتِّفَاقهم على فسقه اخْتلفُوا فِي جَوَاز لَعنه بِخُصُوص اسْمه"۔

یعنی یزید کے فسق پر تو ان کا اتفاق ہے، اختلاف اس میں ہے کہ اس پر لعنت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

(الصواعق المحرقة لابن حجر الهيتمي، ج2ص634، مؤسسة الرسالة بيروت)

ابن حجر ہیتمی ﷫ کی وفات سنہ 974ھ میں ہوئی، اور یہاں "اتفاقهم" کی ضمیر نو صدیوں کے تمام علمائے سلف کی طرف راجع نہیں ہوسکتی، بلکہ اس سے صرف وہ علماء مراد ہوسکتے ہیں جن کا کلام علامہ ابن حجر ہیتمی کی نظر سے گذرا ہے، یا جو اس وقت ان کے ذہن میں تھے، تمام علمائے سلف کی نسبت نہ وہ یہ دعویٰ کرسکتے

ہیں، نہ یہ دعویٰ کریں تو صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ ان سے پہلے گذرے جن علماء سلف اہل سنت کا کلام ہماری نظر سے گذرا ہے ان میں مندرجہ ذیل معروف و مشہور ہستیاں بھی ہیں، جو یزید کو فاسق تسلیم نہیں کرتے:

(1)الإمام العلامة الحافظ القاضي أبو بكر محمد بن عبد الله بن محمد بن عبد الله ابن العربي الأندلسي الإشبيلي المالكي(م 543ھ)

(2)الامام ابُو حَامِدٍ مُحَمَّدٌ الغَزّالِيُّ الشَّافِعِيُّ الأَشْعَرِيُّ (م 505ھ)

(3)الامام المحدث عبد المغيث بن زهير الحنبلي (م583ھ)

(4)الإمام العالم الحافظ الكبير عالم الحفاظ تقي الدين أبو محمد عبد الغني بن عبد الواحد المقدسي الحنبلي(م 600ھ)

تو پھر علمائے سلف کا یزید کے فسق پر" اتفاق و اجماع" کا دعویٰ کیسے صحیح ہوا؟، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

اجماع کی حقیقت یہ ہے کہ ایک دور، یا زیادہ کے تمام اہل رائے کسی معاملے میں اس طرح رائے دیں کہ یہ امر فلاں فلاں دلائل کی بنا پر اِس طرح ہے یا اُس طرح ہے، صرف مخالفت نہ کرنا اجماع نہیں کہلائے گا"۔

(قاسم العلوم مع ترجمہ اردو انوار النجوم، صفحہ 155، ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی عالم یا مصنف کا صرف یہ لکھ دینا کہ" اس مسئلہ پر اجماع یا اتفاق ہے"، یہ اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس زمانہ کے تمام اہل رائے علماء نے صراحت کے ساتھ اس مسئلہ سے اتفاق نہ کیا ہو جس زمانہ کے اجماع یا اتفاق کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، اور اگر مثلاً کسی زمانہ کے اہل رائے علماء میں سے کچھ نے کسی مسئلہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا کہ یہ اس طرح ہے، لیکن دوسرے کچھ علماء نے صراحت کے ساتھ کچھ نہ کہا، نہ ہی یہ کہا کہ" ہم ان کی بات کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں"، اور ان سے اس مسئلہ پر کوئی صریح بات منقول نہیں بس صرف اتنا ہے کہ ان سے صریح طور پر ان علماء کی مخالفت ثابت نہیں تو بھی یہ اجماع نہیں کہلا سکتا کیونکہ بقول مولانا نانوتوی،" مخالفت نہ کرنا اجماع نہیں کہلا سکتا"۔

لہٰذا اگر کسی نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر یہ لکھ دیا کہ" یزید کے فاسق و فاجر و شرابی و زانی"

ہونے پر اجماع امت ہے اور اس پر اتفاق ہے، اور یہ متواتر معنوی ہے" تو کسی کے ایسا لکھ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ واقعی ایسا ہے، کیونکہ جیسا پہلے بیان ہوا، کسی عالم کا بیان اسی حد تک قابل قبول ہوسکتا ہے، جب تک واقعات و مشاہدات اس کے مکذِب نہ ہوں۔

میں بطور مثال ایک حوالہ پیش کرتا ہوں کہ علامہ برہان الدین مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام کے پیچھے قراءت کے منع ہونے پر اجماع کا دعویٰ کرتے ہوئے "ہدایہ" میں لکھا ہے:

"وَعَلَيْهِ إِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ" یعنی ترکِ قراءت خلف الامام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔

(الهداية، ج1ص359،ادارة القرآن والعلوم الاسلاميه كراتشي)

جبکہ اسی سے دو سطریں پہلے وہ خود لکھ چکے ہیں کہ" اس مسئلہ میں امام شافعی کا اختلاف ہے"، لہٰذا صاحب ہدایہ کا اس پر "صحابہ کے اجماع" کا دعویٰ محل نظر ہے اسی لئے اس مقام کے حاشیہ میں محشی حضرات نے یہاں تک لکھا ہے کہ:

"قد يُقَال: لَو كَانَ فيهِ اِجْمَاع لَكَانَ الشَّافِعِيُّ أَعْرَفَ بِهِ"۔

اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر اس مسئلے میں اجماع ہوتا تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسے ضرور جانتے ہوتے۔

اور کچھ نے اس بات کی یوں تاویل کی ہے کہ:

"سمّاه اجماعاً باعتبار الاكثر"۔

اکثریت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اجماع کہہ دیا گیا۔

اب کوئی صاحب ہدایہ کی اس بات سے دلیل پکڑتے ہوئے یہ دعویٰ کرتا پھرے کہ اس پر تمام صحابہ کا اجماع تھا تو اس کی بات قابل قبول نہیں ہوگی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"یزید کے باب میں علماء قدیماً و حدیثاً مختلف رہے ہیں، بعض نے تو اس کو مغفور کہا ہے بدلیل حدیث بخاری ..... (پھر حدیث قسطنطنیہ نقل فرمائی ہے۔ناقل).... اور بعضوں نے اسے

ملعون کہا ہے..... پس بلا دلیل یہ دعویٰ کریں کہ وہ (یعنی" یزید" ۔ناقل) خدا کی رحمت سے دور ہے، اس میں خطر عظیم ہے..... اگر کوئی کہے کہ جیسے کسی شخص کا ملعون ہونا معلوم نہیں، کسی خاص شخص کا مرحوم ہونا بھی تو معلوم نہیں، پس مظلومین واسطے رحمۃ اللہ علیہ کہنا کیسے جائز ہوگا کہ یہ بھی اخبار عن الغیب بلا دلیل ہے ۔ جواب یہ ہے کہ رحمۃ اللہ علیہ سے اخبار مقصود نہیں، بلکہ دعا مقصود ہے، اور عام مسلمانوں لئے حکم ہے۔ لعن الله عليه نہیں کہہ سکتے اس واسطے کہ وہ بد دعا ہے اور اس کی اجازت نہیں، فافہم....۔

(ملخصاً: امداد الفتاویٰ، ج5 ص431 و432، مکتبہ دار العلوم کراچی)

غور فرمائیں! مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صریح طور پر فرما رہے ہیں کہ" یزید کے باب میں علماء قدیماً وحدیثاً مختلف رہے ہیں" تو" اجماع واتفاق" کا دعویٰ کہاں رہا؟ اور آگے اس اختلاف کی تفصیل میں حضرت نے یہ نہیں فرمایا کہ" اس کے فسق پر تو اتفاق ہے، یہ اختلاف اس پر لعنت کرنے میں ہے"، بلکہ یہ فرما رہے ہیں کہ بعض علماء حدیث قسطنطنیہ کی بنا پر اس کے مرحوم مغفور ہونے کے قائل رہے ہیں۔

اب آگے بڑھیے! انہی کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد سے کربلا پہنچنے تک متعدد مواقع پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ" جو واپس جانا چاہے واپس چلا جائے" اس کے بعد راستہ سے جو لوگ ساتھ ہوئے تھے واپس چلے بھی جاتے ہیں اور آپ کے ساتھ وہی افراد رہ جاتے ہیں جو مکہ سے ساتھ چلے تھے، پھر انہی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا میں خدا اور اسلام کا واسطہ دے کر فرمایا کہ:

"فَنَاشَدَهُمُ الْحُسَيْنُ اللهَ وَالْإِسْلَامَ أَنْ يُسَيِّرُوهُ إِلَى أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ يَزِيدَ، فَيَضَعَ يَدَهُ فِي يَدِهِ"۔

کہ مجھے امیر المؤمنین (یزید) کے پاس روانہ کردو کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں۔

(البداية والنهاية، ج8ص243، وزارة الاوقاف قطر)

نوٹ: مندرجہ بالا حوالہ میں جو بات بیان کی گئی ہے یہ" ابو مخنف" والی روایت نہیں، بلکہ اس کی سند حافظ ابن کثیر

نے امام طبری کے واسطے سے یہ ذکر کی ہے" حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَمَّارٍ الرَّازِيُّ، حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ، ثَنَا عَبَّادُ بْنُ الْعَوَّامِ، ثَنَا حُصَيْنٌ.... قَالَ حُصَيْنٌ: فَحَدَّثَنِي هِلَالُ بْنُ يَسَافٍ"۔

اب ان باتوں کو دھیان میں رکھ کر بتائیں کہ اگر حضرت حسین ﷜ یزید کے فسق و فجور کو مٹانے اور اسلام کو بچانے کے لئے نکلے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو واپس کرا دیتے؟ یا خود لوٹنے کا ارادہ کر سکتے تھے؟ یا یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر آمادگی ظاہر کر سکتے تھے؟ یا یہ فرما سکتے تھے کہ مجھے یزید کے پاس روانہ کردو؟

الغرض! حضرت معاویہ ﷜ کی وفات کے بعد بھی حضرت حسین ﷜ کی مدینہ سے روانگی سے لے کر آپ کی شہادت تک کوئی ایک شہادت بھی یزید کے فسق و فجور کی نہیں ملتی۔ اور ملنا ممکن بھی نہیں ہے، کیونکہ جس عہد میمون کی یہ بات ہے اس وقت تک ملت اسلامیہ کا ضمیر اتنا مردہ نہیں ہوا تھا کہ مدینہ منورہ کے غیور مسلمان اور تمام بلاد اسلام میں جو صحابہ منتشر تھے، اور انبوہ در انبوہ تابعین موجود تھے، وہ سب کے سب چپ چاپ ایک فاسق و فاجر اور شرابی کبابی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔

اسی طرح یہ بات ہمارے حلق سے کسی طرح نہیں اترتی کہ مدینہ کے جن حضرات نے (بقول لعل شاہ صاحب) سنہ 63ھ میں یزید کا فاسق و فاجر ہونا ظاہر کر کے اپنی سابقہ کی ہوئی بیعت توڑ دی تھی، اور کسی قیمت پر بھی خلع بیعت سے رجوع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے، تا آنکہ حرّہ کا خونیں واقعہ پیش آیا، اگر یزید اس وقت بھی فاسق و فاجر ہی تھا جب ان لوگوں نے پہلے اس کی بیعت کی تھی تو اس وقت یہ کیسے راضی ہو گئے تھے؟ حتیٰ کہ حادثہ کربلا کے بعد بھی تقریباً تین سال تک اس بیعت پر کیوں قائم رہے تھے؟ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کم از کم سنہ 63ھ کے اواخر تک یزید کے فسق و فجور کا کوئی ذکر اذکار نہ تھا، خود لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ بوقت ولی عہدی سنہ 44ھ تک یزید کا فسق ظاہر نہیں ہوا تھا، جب اس کا فسق ظاہر ہوا تو صحابہ کرام اس بارے میں مختلف ہو گئے کہ اس کی بیعت سے نکل جائیں یا اس پر مستقیم رہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 372)

لٰہذا یزید کے فسق وفجور کو "صحابہ کے درمیان" متفق علیہ ہونے کا دعویٰ کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے یزید کے دور میں موجود تمام صحابہ کرام سے یہ تصریح دکھائیں کہ انہوں نے یزید کو فاسق کہا ہو، پھر اس کے بعد یہ بتائیں کہ وہ کب فاسق ہوا؟ یا ان کے مطابق اس کا فسق کب ظاہر ہوا؟ جب تک یہ حضرات اس کا تعین نہیں کرتے تب تک بات آگے نہیں چل سکتی، کیونکہ ایک طرف یہ حضرات یہ باور کرواتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت سے انکار اس کے فسق و فجور کی وجہ سے کیا تھا لیکن دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کا فسق ظاہر نہیں ہوا تھا، پھر اس بات کو بھی بار بار دہراتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمیت متعدد صحابہ کرام نے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا تھا (لعل شاہ صاحب تو یہ واقعہ سنہ 44ھ کا بتاتے ہیں)۔لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اگر اس وقت تک یزید کا فسق ظاہر نہیں ہوا تھا تو پھر ولی عہدی کی بیعت سے انکار کرنے والوں نے انکار کس وجہ سے کیا تھا؟ یا انہوں نے اپنے بیعت نہ کرنے کی کیا وجہ بتائی تھی؟

لعل شاہ صاحب اور ان جیسے دوسرے حضرات جو کئی صدیوں کی لمبی چھلانگ لگا کر اس زمانے کے کئی سو سال بعد پیدا ہونے والے علماء کی عبارات سے یزید کا فسق وفجور دنیا کو سنانے لگ جاتے ہیں تو خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ یا اس وقت موجود دوسرے صحابہ کرام سے ہی اس کے فسق وفجور کی تصریح کیوں نہیں دکھلا دیتے؟ ایسی صورت میں ان لوگوں کا یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کی بنیاد یزید کا فسق وفجور تھا، شاید "مدعی سُست گواہ چُست" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔اور ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ کسی عالم کی اپنی رائے یا بیان اس حد تک قابل قبول ہوسکتے ہیں جب تک واقعات و مشاہدات اس کے مکذّب نہ ہوں، واقعات سے آنکھ بند کر کے کسی غیر معصوم کے قول کو واجب التسلیم سمجھنا، اس کو معصوم سمجھنا ہے۔

اس لئے سید لعل شاہ صاحب بخاری اور ان کے ہمنوا جن کا صبح وشام وظیفہ "فسق یزید" ہے اور انہیں اس وقت تک نیند ہی نہیں آتی جب تک وہ ہر موضوع، ہر بحث اور ہر مکالمے میں "فسق یزید" کا ذکر نہ کرلیں، یہ سب اپنے دعوے کو مبہم بیان کرتے ہیں، یعنی دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ "یزید فاسق تھا" لیکن یہ نہیں بتاتے کہ وہ فاسق کب ہوا؟ وہ پیدا ہی فاسق ہوا تھا یا بعد میں کسی وقت فاسق ہوا تھا؟ اور وہ عام فاسق تھا یا "قاتل، شرابی

اور اپنی ماؤں بہنوں تک سے زنا کرنے والا" خاص مہا پاپی اور سرکش تھا؟

اس لئے ہم نے ان سب کے لئے جنہوں نے اپنی زندگی کا مشن یزید کو" فاسق و فاجر اور شرابی و زانی" ثابت کرنا بنایا ہوا ہے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے تا کہ ان کے اس عقیدے کی وضاحت ہو سکے اور ان کے مقدمہ کا ابہام دور ہو۔

فسق یزید سے متعلق سوالات

1) یزید پیدا ہوتے ہی فاسق و فاجر تھا یا بعد میں کسی وقت ہوا؟

2) اگر یہ کام اس نے جوانی میں شروع کیے تو اپنے والد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہی یہ فسقیہ کام کیا کرتا تھا یا آپ کی وفات کے بعد شروع کیے؟

3) اگر اپنے والد کی زندگی میں ہی وہ فسق و فجور کا ارتکاب کیا کرتا تھا تو کیا یہ بات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم میں آئی یا نہیں؟

4) اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم میں اپنے بیٹے کی یہ فاسقانہ حرکتیں آئیں تو انہوں نے اسے کبھی کوئی سزا دی یا درگذر کرتے رہے؟

5) اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم میں اپنے بیٹے کے یہ فاسقانہ کام نہیں تھے تو کیا اس وقت موجود دوسرے صحابہ کے علم میں تھے؟

6) اگر یزید کا فسق و فجور دوسرے صحابہ کرام کے علم میں تھا، تو جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے ولی عہد بنانے کی بات چلائی اور ان سے بیعت طلب کی تو ان صحابہ نے انہیں بتایا کہ یزید فاسق و فاجر ہے یا نہیں بتایا؟

7) خاص طور پر اس کی بیعت سے انکار کرنے والے چار یا پانچ صحابہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ بات کی کہ" ہم اس لئے یزید کی بیعت نہیں کریں گے کیونکہ وہ فاسق و فاجر یا مثلاً شرابی ہے"؟

8) اگر ان صحابہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان باتوں سے آگاہ کیا تو اس کا ثبوت پیش کیا جائے، اور پھر بتایا جائے کہ ان کے آگاہ کرنے کے بعد بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علم میں اس کا فاسق ہونا آگیا تھا یا نہیں؟

9) اور اگر ان صحابہ کرام نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اُس وقت آگاہ نہ کیا تو درست کیا یا غلط؟

10) اور اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اور نہ ہی کسی اور صحابی کو یزید کے فاسقانہ

اعمال کی خبر تھی تو پھر جن چار یا پانچ صحابہ کرام نے اس کی ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا ان کے اس انکار کی وجہ کیا تھی؟ فسق یزید یا کچھ اور؟

11) اگر کہا جائے کہ یزید فسق و فجور کا ارتکاب تو اپنے والد کی زندگی میں ہی کرتا تھا، لیکن اپنے والد سے چھپ چھپ کر، تو اس چھپ چھپ کر کیے جانے والے فسق کا علم اس زمانہ کے صدیوں بعد پیدا ہونے والے لوگوں اور حضرت لعل شاہ صاحب کو کیسے ہوا؟ یزید کے ساتھ ان فسقیہ کاموں میں شریک اس کے کسی ساتھی نے بتایا یا کوئی کشف یا الہام ہوا؟

12) اور اگر یزید نے فسقیہ کام اپنے والد کی وفات کے بعد شروع کیے تو واقعہ کربلا سے پہلے اس کے فسق و فجور کے چرچے عام ہو چکے تھے یا بعد میں کسی وقت ہوئے؟

13) اگر واقعہ کربلا یعنی محرم سنہ 61ھ سے پہلے اس کا فسق و فجور ہر طرف پھیل چکا تھا تو کیا سیدنا حسین ﷜ کو بھی اس کا علم ہو چکا تھا یا نہیں؟

14) اگر حضرت حسین ﷜ کو اس کے فسق و فجور کا علم ہو چکا تھا تو آپ سے جب بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے مدینہ یا مکہ میں یا سفر عراق کے وقت یا میدان کربلا میں کہیں بھی اس بات کا ذکر کیا کہ "چونکہ یزید فاسق و فاجر ہے اس لئے میں اس کی بیعت سے انکار کرتا ہوں"؟ اگر کہیں سیدنا حسین ﷜ سے کسی معتبر طریقے سے ایسی بات منقول ہے تو اس کا حوالہ پیش کیا جائے تا کہ ہمارے علم میں بھی اضافہ ہو۔

15) اور اگر حضرت حسین ﷜ نے کہیں بھی اپنے بیعت نہ کرنے کا سبب یزید کا فسق و فجور نہیں بتایا تو جو لوگ آپ کی طرف یہ بات منسوب کرتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟

16) کیا یہ بات درست ہے کہ مدینہ کے جن لوگوں نے سنہ 63ھ میں یزید کی بیعت توڑی تھی، انہوں نے پہلے یزید کی بیعت کر رکھی تھی اور واقعہ کربلا کے بعد بھی کم و بیش تین سال تک وہ اپنی بیعت پر قائم رہے تھے؟

17) کیا واقعہ حرہ کے وقت یزید کی بیعت توڑنے والوں کے علم میں یزید کا شرابی و زانی ہونا اسی وقت (سنہ 63ھ میں) آیا تھا یا یہ باتیں پہلے سے ان کے علم میں تھیں؟

18) اگر ان کے علم میں یزید کی یہ فاسقانہ حرکات حضرت معاویہ ﷜ کی زندگی کے وقت سے یا ان کی وفات کے متصل بعد سے تھیں تو انہوں نے شروع میں بیعت کیوں کی؟ اور پھر بیعت توڑنے کا انتظار کم و بیش تین

سال تک کیوں کیا؟ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے عظیم سانحہ کے بعد ہی یزید کی بیعت کیوں نہ توڑ دی؟ کہ بقول شُما، یزید کا یہی سب سے بڑا جرم اور فسق تھا۔

تو "فسق یزید" کو اہل سنت کے عقائد میں شمار کرنے والے پہلے مندرجہ بالا سوالات کے جوابات دے کر اپنے مبہم عقیدے کو تو واضح کریں تاکہ پھر اس کے مطابق ان سے دلائل طلب کیے جائیں۔

یہاں ہم اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد ہرگز ہرگز یزید کو خلیفہ راشد ثابت کرنا نہیں ہے، نہ ہم اس کے ساتھ ایسی ارادتِ حسنہ رکھنے کی دعوت دیتے ہیں جو عقیدت خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کے ساتھ رکھی جاتی ہے، ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ سنی ہونے اور مسلک اہل حق پر اپنے کو قائم ثابت کرنے کے لیے یزید کے فسق و فجور کا اعتقاد رکھنا یا اس کا اعلان کرنا ضروری نہیں ہے، نہ یہ بات عقائد اہل سنت میں داخل ہے، عقیدہ فسق یزید کا تعلق سنیت سے نہیں ہے، نہ اثباتاً نہ نفیاً، بلکہ اس کی حیثیت محض ایک علمی تحقیق کی ہے نیز یہ کہ یزید جمہور اہل سنت کی تصریح کے بموجب مسلمان تھا، اور کسی مسلمان کو فسق و فجور سے مُتّصف ماننے اور ثابت کرنے کے لئے شرعی اصول سے ضروری ہے کہ اس کے فسق و فجور کی چشم دید شہادتیں موجود ہوں۔

رہا لعل شاہ صاحب کا یہ نعرہ کہ:

"ظلم یزید اور فسق متفق علیہ رہا، اگر کتب تاریخ میں اس کے خلاف کوئی مواد پایا جاتا ہے تو وہ نواصب کی بے سند اور منقطع روایات ہیں، کوئی پختہ اور صحیح روایت نہیں ہے"۔

تو اس پر عرض ہے کہ یزید پر جو فسق و فجور، شراب نوشیوں، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں تک سے زنا کاریوں کے شرمناک الزامات لگائے جاتے ہیں ان کی بھی تو کوئی قابل اعتماد سند، یا کوئی پختہ اور صحیح روایت ہونی چاہئے ناں! یہ الزامات بھی تو کسی قابل اعتماد سند یا شرعی شہادت سے ثابت نہیں۔ یزید کافر و مرتد نہیں تھا، علماء اسلام نے اس کے مسلمان ہونے کی تصریح کی ہے، اور کسی مسلمان کو بلا ثبوت و دلیل فاسق کہنا جائز نہیں ہے، کوئی شہرت جو عینی شاہدوں کی شہادت پر مبنی نہ ہو لائق اعتماد نہیں ہے۔

امام ابو حامد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ (م 505ھ) لکھتے ہیں:

"فلا يجوز أن يُرمى مسلم بفسق أو كفر من غير تحقيق قال صلى الله عليه وسلم لا يَرمِي رجلٌ رجلاً بالكفر ولا يرميه بالفسق إلا ارتدت عليه إن لم يكن صاحبه كذلك"۔

(مفہوم) کسی مسلمان پر بلا تحقیق فسق یا کفر کی تہمت لگانا جائز نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کفر یا فسق کی تہمت لگاتا ہے تو اگر وہ دوسرا شخص ایسا نہیں ہے تو وہ بات اس تہمت لگانے والے کی طرف واپس لوٹ آتی ہے۔

(احیاء علوم الدین، کتاب آفات اللسان، ج3ص125، دار المعرفة بیروت)

اجماع کیا ہوتا ہے؟

رہا یہ مغالطہ کہ یزید کے فاسق وفاجر ہونے پر تمام صحابہ کرام کا اجماع واتفاق تھا، تو آئیے دیکھتے ہیں اجماع کیا ہوتا ہے۔

آپ یکے از بانیانِ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ پہلے پڑھ آئے ہیں، آپ اپنے ایک مکتوب" درتحقیق واثبات شہادت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ موافق قواعد سنیاں" میں زیر عنوان " مقدمہ سوم درحقیقت اجماع" تحریر فرماتے ہیں:

"سوم آں کہ حقیقت اجماع ایں ست کہ ہمہ اہل رائے یک عصر یا زیادہ، درامرے بایں طور رائے زنند کہ ایں امر بفلاں فلاں وجوہ چنیں ست یا چناں، نہ فقط عدم مخالفت"۔

ترجمہ: تیسری بات یہ ہے کہ اجماع کی حقیقت یہ ہے کہ ایک دور یا زیادہ کے تمام اہل رائے کسی معاملے میں اس طرح رائے دیں کہ یہ امر فلاں فلاں دلائل کی بنا پر اِس طرح ہے یا اُس طرح ہے (یہ اتفاق یا اجماع کہلائے گا۔ناقل) صرف مخالفت نہ کرنا اجماع نہیں کہلائے گا"۔

(قاسم العلوم مع ترجمہ اردو انوار النجوم، صفحہ 155، ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور)

لٰہذا لعل شاہ صاحب اور ان کے ہم فکر حضرات کا یزید کے فسق کو تمام صحابہ کے درمیان (خواہ وہ مبایعین ہوں یا غیر مبایعین) "متفق علیہ" بتانا اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتا جب تک ان تمام صحابہ و تابعین سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ان سب نے یزید کو فاسق و فاجر کہا تھا۔ صرف اس بات سے کہ ان صحابہ سے یزید کی تعریف و توصیف یا تعدیل منقول نہیں، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ یزید کو فاسق و فاجر ہی سمجھتے تھے۔

اس کے جواب میں یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ ثابت کرو کہ کسی صحابی نے یزید کو صالح اور عادل کہا ہو، تو اس پر عرض ہے کہ جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں اپنے ساتھی صحابہ کے مشورے سے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لی، نیز رجب 60ھ میں جب ان کی وفات ہوئی اور یزید کی خلافت کی بیعت کا وقت آیا تو کسی نے بھی یزید کے فسق و فجور کی کوئی بات نہیں کی تھی (جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان ہوچکا) تو جب یزید کا فسق و فجور زیر بحث آیا ہی نہیں تھا تو اس کی صالحیت کی گواہیوں کی کیا ضرورت تھی؟ سوال تب ہوتا کہ اس وقت کسی نے یزید کو فاسق و فاجر کہا ہوتا اور اس کے جواب میں صحابہ کرام نے یا تو اس بات کی تائید کی ہوتی یا خاموش ہو گئے ہوتے۔

پھر اگر صحابہ کرام سے صراحت کے ساتھ یزید کے صالح و عادل ہونے کے اقوال منقول نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے فاسق و فاجر ہی سمجھتے تھے، تو کیا صحابہ کرام کا اسے فاسق و فاجر نہ کہنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ اسے ایسا نہیں سمجھتے تھے؟

جیسا کہ عرض کیا گیا، یزید کے فسق و فجور کی باتیں سب سے پہلے سنہ 63ھ کے اواخر میں سننے کو ملتی ہیں جب مدینہ منورہ کے کچھ لوگوں نے اس کی بیعت توڑ کر اس کے خلاف بغاوت اور خروج کیا، اور جن تاریخی روایات میں یہ ذکر ہے کہ بیعت توڑنے والے ان حضرات نے یزید پر فسق و فجور کے الزام لگائے تھے، انہی روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ ان کے اس الزام کا رد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند حضرت محمد حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے شد و مد کے ساتھ کیا، اور اپنے مشاہدے اور گواہی کی بنیاد پر ان کے الزام کو غلط بتایا، جبکہ الزام لگانے والوں نے اقرار کیا کہ انہوں نے خود یزید کو یہ سب برے کام کرتے نہیں دیکھا یعنی ان کے پاس اس سب کی کوئی چشم دید گواہی نہیں ہے۔ اب جسے یہ اعتراض ہے کہ یہ روایت مستند نہیں تو اسے چاہئے کہ وہ پہلے کسی

مستند اور صحیح روایت سے یہ تو ثابت کرے کہ اہل مدینہ نے یزید پر کیا الزامات لگائے تھے؟ عجیب بات ہے کہ جب یزید پر الزامات کی بات آئے تو اسی روایت کے پہلے حصّے سے استدلال کیا جاتا ہے، اور جب اسی روایت کے دوسرے حصّے کو کوئی پیش کرے کہ ان الزامات کا اسی میں ردموجود ہے تو اس روایت کو "غیر مستند" بتا کر قبول نہیں کیا جاتا۔ بہرحال! ہمیں کوئی اصرار نہیں کہ اس روایت کو ضرور قبول کیا جائے، ہمارا موقف اصولی ہے کہ کسی بھی مسلمان پر فسق و فجور یا شراب نوشی وغیرہ کے الزامات کو ثابت کرنے کے جو اصول وضوابط شریعت مطہرہ نے مقرر کیے ہیں ان کے مطابق ان الزامات کو ثابت کیا جائے، یہ اصول وضوابط صحابی اور غیر صحابی سب کیلئے ہیں، ان سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ اگر شرعی ضابطے اور قانون شہادت کے مطابق یزید کے فسق و فجور یا شراب نوشی وغیرہ کے الزامات ثابت کر دیے جائیں تو انہیں ماننے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

تواتر کا غلط دعویٰ

اور جو بعض علماء جذبات کی رَو میں بہہ کر کہہ دیتے ہیں کہ یزید کی بداعمالیوں کی شہرت تواتر کو پہنچی ہوئی ہے (یعنی وہ تواتر کو بطور ثبوت پیش کرتے ہیں) تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان سے بھی یہ بات محبتِ اہل بیت کے جوش میں قلم سے نکل گئی ہے، مگر شریعت ایسے جوش کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کرتی، اور ہم اس کو ان علماء کی اضطراری حرکت سمجھتے ہیں، ورنہ حقیقت کی میزان میں ان کی بات پوری نہیں اترتی، ہم کتاب کے شروع میں عرض کر آئے ہیں کہ ہر افواہ جو پھیل جائے اس کو خبر متواتر کہنا تواتر کی سخت توہین ہے، تواتر کے لئے جہاں اور شرطیں ہیں اس کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ اگر خبر کا تعلق دیکھنے کی چیز سے ہو تو ضروری ہے کہ اس کا مستندِ انتہا مشاہدہ ہو، ورنہ وہ متواتر نہیں ہوسکتی۔ پس یزید کے فسق و فجور کو متواتر کہنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان خبروں کا سلسلہ اوپر جا کر جہاں ختم ہوتا ہے، وہاں بکثرت ایسے لوگوں کے بیانات پائے جاتے ہیں یا نہیں جو یہ کہتے ہوں کہ ہم نے اس فسق و فجور اور بداعمالیوں کا ارتکاب کرتے ہوئے یزید کو دیکھا ہے، اگر خبروں کا سلسلہ ایسے بیانات پر منتہی ہوتا ہے تو ان کو متواتر کہنا بے شک صحیح ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ ان کی آخری کڑی محض افواہ اور سنی سنائی باتیں ثابت ہوتی ہیں، تو ان کو متواتر کہنا بالکل غلط اور صریح مغالطہ ہے۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ آنکھ سے دیکھ کر کہنے والا ایک شخص بھی نہیں ہے، چہ جائیکہ جم غفیر، اور دعوی کر دیا جاتا ہے تواتر کا، حالانکہ اس صورت میں تواتر تو درکنار، شرعی اصول سے بداعمالیوں کا مطلقاً ثبوت نہیں ہوتا، ایسی صورت میں

یزید پر شرعی اصول سے فاسق ہونے کا حکم کیسے لگے گا؟

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو صلیب پر قتل کر دیا گیا تھا اور انہوں نے صلیب پر جان دیدی تھی، عیسائیوں کی غالب اکثریت میں یہ بات تواتر کے درجہ تک چلی آرہی ہے اور قرآن کریم کے نزول سے پہلے سے چلی آرہی ہے، تو کیا اسے تواتر کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ عیسائی لٹریچر میں آج تک ایک بھی ایسا عینی شاہد نہیں پیش کیا جاسکا جس نے خود حضرت عیسی علیہ السلام کو صلیب دیے جاتے یا قتل ہوتے دیکھا ہو، بلکہ ان کے لٹریچر کے مطابق تو حضرت عیسی علیہ السلام کے تمام حواری اس وقت بھاگ گئے تھے، لہٰذا ان کے پاس اس واقعہ کا ایک بھی چشم دید گواہ موجود نہیں۔

اسی طرح اسرائیلی تاریخ کے مطابق تو حضرت داوٗد علیہ السلام نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اپنی ہمسائی سے زنا کیا تھا پھر اس کے خاوند کو دھوکے سے قتل کروا دیا اور اس کی بیوی کو اپنے گھر میں ڈال لیا (سیموئیل دوم، باب 11، آیات 1-18)۔ حضرت لوط علیہ السلام نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) شراب کے نشے میں اپنی دو بیٹیوں سے بدکاری کی تھی جس سے دو لڑکے پیدا ہوئے (کتاب پیدائش، باب 19 آیات 33-38)۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت اسحاق علیہ السلام کو دھوکا دے کر نبوت اور برکت کی ساری دعائیں ان سے لے لی تھیں حالانکہ نبوت پر حق یعقوب علیہ السلام کے بڑے بھائی عیسو کا تھا (کتاب پیدائش، باب 27)۔ قرآن میں ہے کہ طالوت (ساؤل) کو خود اللہ تعالی نے بنی اسرائیل پر بادشاہ مقرر کیا تھا لیکن موجودہ بائبل میں طالوت اور حضرت داوٗد علیہ السلام کی باہم سخت چپقلش دکھائی گئی ہے اور طالوت کو بدمعاش اور بدترین کردار ظاہر کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہم نے صرف چند نمونے ہی پیش کئے ہیں، تاہم اہل کتاب کا ان جھوٹی کہانیوں کے صحیح اور متواتر ہونے پر مکمل اتفاق ہے، اب اگر وہ کہیں کہ:

> "ہمارے نزدیک یہ روایات متواتر ہیں ان پر ہم سبھی اہل کتاب کا مکمل اتفاق ہے اور جو روایات متواتر ہوں تو وہ خود تمہارے نزدیک بھی راویوں کے نام بنام سلسلے (اسناد) کی محتاج نہیں ہوا کرتیں، لہٰذا تم بھی انہیں مانو"۔

تو کیا ان کی اس دلیل کو درست تسلیم کر لیا جائے؟ پس اگر اہل کتاب کی (ان کے مطابق متواتر) یہ کہانیاں درست ہیں تو پھر بے شک کسی بھی افواہ کو جو پھیل جائے متواتر کہنا درست ہوگا، ورنہ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ

نہیں کہ خیر القرون کو بدنام کرنے کے لئے کئی لوگوں نے بہت سی باتوں میں ٹھیک اہل کتاب کی تقلید کی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا اپنے آپ کو بخوبی مصداق ثابت کر دکھایا ہے کہ میری امت کے لوگ بھی قدم بقدم اہل کتاب کے طریقوں کی پیروی کریں گے۔

لعل شاہ صاحب کی" پختہ" اور"صحیح روایات" پر مشتمل دلیلیں تو اس طرح کی ہیں:

"جن لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ ڈالی ان کے پاس بھی کوئی دلیل ہوگی، ورنہ مدینۃ الرسول کے باشندے جن کی اکثریت صحابہ وتابعین پر مشتمل تھی کس طرح جاہلیت کی موت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے، معلوم ہوتا ہے کہ فسق یزید وظلم یزید بلا ریب اظہر من الشمس تھا، اختلاف خلع بیعت میں تھا جس نے جو صورت صحیح سمجھی اس پر عمل کیا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 373و374)

اور

"کیا عجب ہے کہ اہل مدینہ جنہوں نے یزید کی بیعت توڑ دی تھی ان کے احاطہ علم میں یزید کا فسق وفجور اور ظلم وتعدی اتنی زیادہ واضح ہوگئی ہو کہ انہوں نے بیعت توڑنے کو واجب سمجھا ہو"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 375)

غور فرمائیں! اپنی طرف سے اندازے اور تخمینے لگائے جا رہے ہیں کہ" آخر ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوگی"، "کیا عجب ہے کہ ایسا ویسا ہو"، کیا کسی مسلمان کو فاسق ثابت کرنے بلکہ اس کے فسق کو متفق علیہ اور اجماعی ثابت کرنے کے لئے یہ" پختہ" دلیلیں ہیں؟ اگر اندازے ہی لگانے ہیں تو اس طرح کیوں نہیں لگائے جا سکتے کہ:

"شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت سے مدینے میں جو فتنہ شروع ہوا تھا، حضرت حسن وحضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی صلح سے وہ موت کی نیند سو چکا تھا، پوری امت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہو کر امن وسکون کا سانس لے رہی تھی، تمام سازشی اپنی اپنی بلوں میں جا چھپے تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان سازشیوں نے پھر سر اٹھایا اور ایک بار پھر فتنہ انگیزی کی منصوبہ بندی کرنے لگے، پہلے انہوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے

خلاف استعمال کرنا چاہا، جس میں انہیں کامیابی نہ مل سکی، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کو عراق بلوا کر بے یار و مددگار چھوڑ کر شہید کروا دیا، اس کے بعد حکومت پوری طرح چوکنا ہوگئی تو ایک عرصہ تک یہ سازشی عناصر پھر خاموش ہو گئے، اور جب دیکھا کہ حالات پھر پرسکون ہو گئے ہیں تو یہ از سر نو فتنہ انگیزی کے منصوبے بنانے لگے۔ آہستہ آہستہ ان شر پسندوں نے جھوٹ، مکاری اور چالبازی سے بعض شریف لوگوں کو بھی اپنے پروپیگنڈے کا شکار کرلیا اور پھر ان سب نے مل کر یزید کی مخالفت کا اعلان کر دیا اور بیعت توڑ دی۔ اسی پر بس نہیں بلکہ مدینہ کے حاکم عثمان بن محمد کو ذلیل کر کے مدینے سے باہر نکال دیا، نیز بنو امیہ کو بھی شہر بدر کر دیا اور پورے مدینہ میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا کر دیا۔ ان شر پسندوں سے دھوکا کھا کر اور ان کی باتوں پر یقین کر کے بعض بھولے بھالے لوگ بھی حکومت وقت کے خلاف بغاوت میں شامل ہو گئے اور بیعت توڑ کر مسلح خروج کر بیٹھے، بالآخر یہ شر پسند مسلمانوں کو آپس میں لڑانے اور مدینہ میں ایک بار پھر خونریزی کروانے میں کامیاب ہو گئے"۔

یاد رہے! لعل شاہ صاحب نے خلیفہ راشد سوم سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"....اس تنظیم کا بانی اور اس تحریک کا اولین محرک عبداللہ بن سبا تھا جو ایک یہودی تھا اور محض فتنہ پردازی کے لئے اسلام قبول کیا اور قلب میں نفاق کو پوشیدہ رکھا، امت مسلمہ میں افتراق و شقاق کا پیدا کرنا اس کا نصب العین تھا، جن کے دلوں میں کدورت تھی وہ اس کے گرد جمع ہو گئے، اس میں شک نہیں کہ بعض مخلص اصحاب بھی اس کے زہریلے پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے جس طرح حضرت مسطح رضی اللہ عنہ اور حسان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ (رضی اللہ عنہا) کے خلاف منافقین کے بپا کردہ طوفان افک و بہتان کے آتشیں شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے... "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 19 و 20)

تو فرمائیں! ہمارے اس مندرجہ بالا اندازے اور تخمینے میں کیا قباحت ہے؟ اگر ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف منافقین کے برپا کردہ پروپیگنڈے سے حضرت مسطح وحضرت حسان بن ثابت (رضی اللہ عنہما) جیسے صحابہ متاثر ہوسکتے ہیں، اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سبائیوں کے اٹھائے گئے زہریلے پروپیگنڈے کا شکار بعض مخلص صحابہ ہوسکتے ہیں تو کیا عجب ہے کہ سنہ 63ھ میں بھی یزید کے خلاف پھیلائے گئے پروپیگنڈے سے بھی ایک دو مخلص صغار صحابہ متاثر ہوگئے ہوں؟ اس زمانے میں یزید کے خلاف کیے گئے پروپیگنڈے کے اثر کا اندازہ آپ کو اس روایت سے ہوسکتا ہے جو حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے کہ:

"قرأت بخط أبي الحسين الرازي أخبرنا أحمد بن عمير نا معاوية بن صالح حدثني هدبة بن خالد الأزدي نا شباك بن عائذ رجل منا ثقة من الأزد عن عمرو بن الحزور عن نهيك بن عمرو القيسي قال وفدنا إلى يزيد بن معاوية وقد ضرب له رواق في البرية فإذا مناديه أين وفد أهل البصرة وقد أمر لكم أمير المؤمنين بكذا وامر لكم بكذا ثم خرج الثانية فقال أين وفد أهل البصرة قد أمر لكم أمير الؤمنين بكذا وأمر لكم بكذا ثم زاد الثالثة بمثل ذلك فقال بعضنا لبعض ما نظنه إلا قاعدا يشرب فجاءت ريح فطارت بطرف الرواق فإذا هو يقرأ في المصحف"۔

(مفہوم) نهيك بن عمرو القيسى کہتے ہیں کہ ہم وفد کی صورت میں یزید بن معاویہ کے پاس گئے، اس کے لئے باہر کھلی جگہ پر ایک خیمہ لگایا گیا تھا، پس اچانک یزید کا منادی آیا اور پوچھا کہ: بصرہ کا وفد کہاں ہے؟ تمہارے لئے امیر المؤمنین نے اتنا اتنا (انعام) دینے کا حکم دیا ہے، پھر وہی منادی دوسری بار آیا اور کہا کہ اہل بصرہ کا وفد کہاں ہے؟ تمہارے لئے امیر المؤمنین نے اتنے اور اتنے انعام کا حکم دیا ہے، پھر تیسری بار بھی اسی طرح کہا، پس ہم ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہو نہ ہو، وہ (خیمے کے اندر) بیٹھا شراب نوشی کر رہا ہے، اسی دوران ہوا چلی جس نے خیمے کی ایک جانب کو اڑایا تو ہم نے دیکھا کہ یزید تو قرآن کریم کی تلاوت میں

مصروف ہے۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر، ج62ص325،دار الفکر بیروت)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ سے آئے اس وفد نے بھی یزید کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں سے یہ افواہ سن رکھی تھی کہ یزید شراب نوشی کرتا ہے، اسی لئے انہوں نے اپنے خیال سے یہ گمان کرلیا کہ وہ خیمے کے اندر یہی کام کررہا ہے، لیکن درحقیقت وہ قرآن کی تلاوت میں مصروف تھا۔

لعل شاہ صاحب کا چند روایات واحادیث سے غلط استدلال

لعل شاہ صاحب نے عنوان باندھا ہے:

"ولایت یزید ارشادات النبی کے آئینے میں"

"یعنی ظلم یزید اور فسق یزید پر رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئیاں"

اور پھر لکھتے ہیں:

"مندرجہ ذیل احادیث سے ظلم یزید اور فسق یزید کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے"

(استخلاف یزید، صفحہ 377)

ملاحظہ فرمائیں! عنوان ایسا لکھا کہ جیسے نبی ﷺ نے یزید کا نام لے کر اسے ظالم وفاسق فرمایا ہے، لیکن آگے لکھتے ہیں کہ" اشارہ پایا جاتا ہے" یعنی وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان احادیث میں یزید یا اس کے ظلم وفسق کی صراحت نہیں۔اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے چند احادیث نقل کی ہیں جن میں سے کسی ایک میں بھی یزید کا نام اشارتاً بھی نہیں، آئیے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔سب سے پہلے لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کے حوالے سے مندرجہ ذیل دو حدیثیں نقل کی ہیں:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يُهْلِكُ النَّاسَ هَذَا الحَيُّ مِنْ قُرَيْشٍ قَالُوا: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: لَوْ أَنَّ النَّاسَ اعْتَزَلُوهُمْ "۔

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

کہ ہلاک کردے گا لوگوں کو قریش کا یہ قبیلہ، لوگوں نے عرض کی کہ پھر ہمیں کیا حکم ہے، فرمایا : کاش یہ لوگ ان سے جدا ہو جاتے۔

اور

"قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: سَمِعْتُ الصَّادِقَ المَصْدُوقَ يَقُولُ: هَلَكَةُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ"۔

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے صادق المصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ میری امت کی ہلاکت چند قریشی نوجوانوں کے ہاتھوں ہو گی۔

(استخلاف یزید، صفحہ 377)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان دونوں حدیثوں میں اشارتاً بھی یہ ذکر نہیں کہ قریش کے اس قبیلے یا قریشی نوجوانوں سے مراد یزید بن معاویہ ہے، یہ بات لعل شاہ صاحب بھی اچھی طرح جانتے تھے، اس لئے انہوں نے آگے عنوان قائم کیا ہے:

"ہلاکت امت کی تشریح و اغیلمة من قریش کی تعیین"

اور پھر ایک شارح بخاری کی تشریح کا حوالہ دینا شروع کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

"حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ہلاکت امت کی تشریح کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت نقل فرمائی ہے:

"قَالَ إِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ هَلَكْتُمْ أَيْ فِي دِينِكُمْ وَإِنْ عَصَيْتُمُوهُمْ أَهْلَكُوكُمْ أَيْ فِي دُنْيَاكُمْ بِإِزْهَاقِ النَّفْسِ أَوْ بِإِذْهَابِ الْمَالِ أَوْ بِهِمَا"۔

کہ فرماتے ہیں کہ اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے یعنی باعتبار دین کے، اور اگر ان کی نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں ہلاک کر دیں گے، یعنی باعتبار دنیا کے، نفس تلف کر دینے یا مال کے یا دونوں کے ضائع کر دینے سے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 378)

غور فرمائیں! حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا جو اثر نقل کیا ہے اس میں بھی کہیں ذکر نہیں کہ ان" امراء" سے کون مراد ہیں؟ نیز حافظ ابن حجر نے اس اثر کی جو تشریح کی ہے اس میں بھی کہیں یزید یا اس کے فسق و فجور کا ذکر نہیں، لیکن لعل شاہ صاحب نے چونکہ مندرجہ بالا دو احادیث سے یزید کے ظلم اور فسق کو ثابت کرنے کی قسم کھائی ہے، اس لئے آگے بات یوں چلاتے ہیں:

"شاید اسی وجہ سے وہ امراء کی تعیین نہیں فرماتے تھے بلکہ کنایہ کرتے تھے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ امراء جور کے ناموں سے بھی واقف تھے، چنانچہ بخاری ہی کی ایک روایت میں ہے۔ لو شئتُ لاسميهم۔ اگر میں چاہوں تو ان کے نام تک بیان کر دوں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو وعاء محفوظ کئے، ایک کی اشاعت کر دی ہے اور دوسرے کی اشاعت کروں تو یہ اندیشہ ہے یہ بلعوم کاٹ دی جائے۔ أما الآخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم (صحیح بخاری ص 23) دوسرے وعاء العلم میں امراء جور کے نام تھے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صراحۃً بیان کرنے میں فتنہ سمجھتے تھے، البتہ کنایۃً ان کی طرف اشارہ کرتے تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 378)

ملاحظہ فرمائیں! یہاں لعل صاحب بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو دوسرے" وعاء العلم" کا ذکر کیا ہے اس میں امراء جور کے نام تھے، یہ بات شاید لعل شاہ صاحب کو بذریعہ کشف و الہام معلوم ہوئی ہو، ورنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تو یہ بات نہیں فرمائی کہ اس دوسرے وعاء العلم میں ظالم امراء کے نام تھے، وہ تو یہ راز اپنے سینے میں لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

جب اس سے بھی بات نہ بنی تو اب لعل شاہ صاحب صحیح بخاری کے حاشیہ نگاروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"مولانا احمد علی السہارنپوری المحدث اسی روایت کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ كان ابوهريرة رضى الله عنه يكنى عن بعضهم كقوله اعوذ بالله من رأس الستين وامارة الصبيان يشير به الى خلافة يزيد ابن معاوية۔ ابوہرہ (ابو ہریرۃ۔ ناقل) کنایۃً بعض

امراء جور کی طرف اشارہ کرتے تھے، مثلاً فرمایا کرتے تھے: میں پناہ مانگتا ہوں سنہ 60ھ کے آخری حصے اور بچوں کی امارت سے، یزید بن معاویہ کی خلافت کی طرف اشارہ کرتے تھے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 378و379)

لیجئے! تیرھوی صدی ہجری میں پیدا ہونے والے مولانا احمد علی سہارنپوری (م 1297ھ) نے اس راز سے پردہ اٹھادیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان ظالم امراء کا نام لینے سے تو ڈرتے تھے لیکن ان میں سے بعض "ظالم امراء" کی طرف کنایۃً اشارہ فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں سنہ 60ھ اور بچوں کی امارت سے پناہ مانگتا ہوں۔(مولانا احمد علی سہارنپوری بتاتے ہیں کہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اس بات سے یزید کی خلافت کی طرف اشارہ تھا۔(لیکن یہ نہیں بتاتے کہ انہیں یہ بات کس نے بتائی یا کس سند سے ان تک پہنچی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ یزید کی خلافت کی طرف تھا؟)۔

پھر لعل شاہ صاحب مزید تاکید کے لئے اضافہ کرتے ہیں:

"حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

في رواية ابن ابي شيبة أن اباهريرة كان يمشي في الاسواق ويقول اللهم لاتدركني سنة ستين ولا امارة الصبيان (ص13ج7، فتح الباري)۔

ابن ابی شیبہ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بازاروں میں چلتے اور دعا کرتے تھے اے اللہ مجھے سنہ 60ھ اور امارۃ الصبیان نہ پاسکے۔

حضرت ابو ہریرہ کی دعا مقبول ہوئی اور سنہ 59ھ میں فوت ہوگئے اور امارۃ الصبیان کی روایت (امارت۔ناقل) سے بچ گئے، سنہ 60ھ کے آخر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور یزید ابن معاویہ کی خلافت سے امارۃ الصبیان کا آغاز ہوا اور یہی وہ اغيلمة من قريش کے مصداق ہیں جن کے ہاتھوں امت کی ہلاکت مقدر تھی۔

(استخلاف یزید، صفحہ 379)

تبصرہ:

آپ نے دیکھا کہ لعل شاہ صاحب کی نقل کردہ کسی حدیث میں بھی صراحتاً یا اشارۃً هذا الحي من قريش یا غلمة من قريش کی کوئی تعیین نہیں ہے کہ اس سے کون مراد ہے؟ اب اگر کسی عالم نے اپنے زعم کے مطابق یہ لکھ دیا کہ اس میں یزید کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے تو اس بنیاد پر یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ حدیث میں یزید کے ظلم وفسق اور اس کے ہاتھوں سے امت کی بربادی کی پیشین گوئی کی گئی ہے، ہم لعل شاہ صاحب کی طرح صحیح بخاری کی حدیث کو "خود ساختہ" نہیں کہتے بلکہ غیر متعین قریشی لڑکوں کے ہاتھوں امت کی بربادی کی خبر کو توحق تسلیم کرتے اور اس پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں، لیکن ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ یزید یا کسی اور قریشی لڑکے کی تصریح حدیث میں نہیں ہے اور نہ ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہی کسی کا نام لیا ہے، اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا، جس بات کی کسی حدیث میں تصریح نہ ہو اور شارحین حدیث اپنے اپنے علم کے مطابق حدیث کا محمل متعین کرنے کی کوشش کریں، تو شارحین کے بیان کردہ محامل کو حدیث کا درجہ نہیں دیا جاتا، مثلاً لعل شاہ صاحب کی منقولہ پہلی حدیث میں صرف اتنا بیان ہے کہ: "میری امت کی ہلاکت چند قریشی چھوکروں کے ہاتھوں ہوگی"، حدیث میں صراحۃً یا اشارۃً کوئی تعیین ان چھوکروں کی نہیں ہے، اب اگر کسی عالم یا شارح نے یہ لکھ دیا کہ اس میں یزید کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، تو اس بنیاد پر یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ حدیث میں یزید کے ہاتھوں سے امت کی بربادی کی پیشین گوئی کی گئی ہے، شرح احادیث میں جو کچھ شارحین اپنی رائے سے لکھتے ہیں، اس کو قطع وجزم کے صیغہ سے حدیث باور کروانا علمی دیانت کے سراسر خلاف ہے، اسی طرح اس کی بنیاد پر حدیث کی کوئی مراد جزم کے ساتھ بیان کرنا، یا ان احتمالات کو حدیث کے ساتھ جوڑ کر یہ کہہ دینا کہ یہ حدیث کا مضمون ہے، ہمارے نزدیک صحیح بخاری کی ہی حدیث مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (جس نے میری طرف ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہیں کی تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے) کی وعید شدید کا مستحق بنتا ہے۔

اس کے بعد عرض ہے کہ "يهلك امتي هذا الحي من قريش" والی حدیث کی تشریح میں کسی شارح نے یہ تعیین نہیں کی کہ اس سے مراد قریش کا فلاں قبیلہ ہے، اس کی تشریح میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ (م

544ھ) لکھتے ہیں:

وقوله:"يهلك أمتى هذا الحى من قريش" وفى البخارى :"هلاك أمتى على يدى أغيلمة من قريش". فيه الحجة على ترك القيام على أمراء الجور؛ إذ أخبر النبى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بحال هؤلاء ولم يأمر بالقيام عليهم ولا محاربتهم، بل قال إذ سُئل:لو أن الناس اعتزلوهم"

خلاصہ :اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ظالم حاکموں کے خلاف خروج سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان کے حال کی تو خبر دی ہے لیکن ان کے خلاف کھڑا ہونے اوران سے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ سوال کرنے پر یہ فرمایا کہ: کاش (بجائے ان سے الجھنے کے) لوگ ان سے الگ ہو جائیں۔

(اكمال المعلم بفوائد مسلم، ج 8ص 460 دار الوفاء، مصر)

نیز لعل شاہ صاحب نے خود حافظ ابن حجر سے بھی اس کی تشریح نقل کی ہے کہ:

"اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے یعنی باعتبار دین کے، اور اگر ان کی نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں ہلاک کر دیں گے، یعنی باعتبار دنیا کے، نفس تلف کر دینے یا مال کے یا دونوں کے ضائع کر دینے سے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 378)

اس میں بھی کوئی تعیین نہیں کہ قریش کا وہ قبیلہ کون سا ہے جس کے ہاتھوں امت کی ہلاکت کی خبر دی گئی ہے۔

پھر حافظ ابن حجر نے "غلمۃ من قریش" والی حدیث کی تشریح میں لکھا ہے:

"وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَيْضًا حُجَّةٌ لِمَا تَقَدَّمَ مِنْ تَرْكِ الْقِيَامِ عَلَى السُّلْطَانِ وَلَوْ جَارَ لِأَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْلَمَ أَبَا هُرَيْرَةَ بِأَسْمَاءِ

هَؤُلَاءِ وَأَسْمَاءِ آبَائِهِمْ وَلَمْ يَأْمُرْهُمْ بِالْخُرُوجِ عَلَيْهِمْ مَعَ إِخْبَارِهِ أَنَّ هَلَاكَ الْأُمَّةِ عَلَى أَيْدِيهِمْ لِكَوْنِ الْخُرُوجِ أَشَدَّ فِي الْهَلَاكِ وَأَقْرَبَ إِلَى الِاسْتِئْصَالِ مِنْ طَاعَتِهِمْ فَاخْتَارَ أَخَفَّ الْمَفْسَدَتَيْنِ وَأَيْسَرَ الْأَمْرَيْنِ"۔

(ترجمہ) اس حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ بادشاہ اگرچہ ظلم بھی کرے تو اس کے خلاف نہیں کھڑا ہونا (یعنی خروج نہیں کرنا) کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان (قریشی چھوکروں) کے نام اور ان کے آباء کے نام تو بتائے تھے لیکن ان کے خلاف خروج کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، باوجود اس کے کہ آپ نے خبر دی کہ امت کی ہلاکت ان کے ہاتھوں ہوگی، کیونکہ (حاکم کے خلاف) خروج کرنے میں زیادہ ہلاکت اور نقصان کا خطرہ ہے بنسبت ان کی اطاعت کے پس آپ ﷺ نے اس چیز کو پسند فرمایا جس میں کم خرابی ہے اور جو دونوں معاملوں میں سے آسان ہے۔

(فتح الباری، جلد13، صفحہ11، دار المعرفة بیروت)

تو فرمائیں! اگر ان احادیث میں "یزید" کی خلافت کی طرف اشارہ ہے تو پھر حافظ ابن حجر کی اس تشریح کے مطابق انہی احادیث کی رو سے یزید کے خلاف خروج کرنے والوں کا عمل ان احادیث کے خلاف ہے یا نہیں؟

پھر عجیب بات یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے "امارة الصبیان" والی حدیث کی شرح میں تو حافظ ابن حجر نے جو لکھا ہے اس کو گویا نص کا درجہ دے کر اپنے عقیدہ کی بنیاد قائم کر لی، لیکن بارہ خلفاء والی حدیث کے باب میں جو حافظ ابن حجر نے لکھا ہے اور یزید کو ان بارہ خلفاء میں شمار کیا ہے جن کے عہد میں اسلام باعزت وشوکت اور دین برقرار رہے گا، اس کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ اور ابن حجر کی اس توجیہ کو اس حدیث کے ساتھ جوڑ کر یہ کیوں نہیں لکھا کہ یزید کی خلافت کے ساتھ عزت وشوکت اسلام اور قیام و بقائے دین کی وابستگی کے اشارات حدیث میں پائے جاتے ہیں اور اس کی خلافت پر امت کا اجماع واتفاق ہو گیا تھا؟ اس حدیث پر ہم کتاب کے شروع میں باحوالہ مفصل کلام کر چکے ہیں، چونکہ ایک روایت میں "کلھم تجتمع علیه

الأمة" (یعنی ان سب خلفاء یا امراء پر امت اسلامیہ کا اتفاق ہوگا) کے الفاظ بھی آتے ہیں تو اس سے متعلق یہاں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح دوبارہ نقل کی جاتی ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"وَإِيضَاحُ ذَلِكَ أَنَّ الْمُرَادَ بِالِاجْتِمَاعِ انْقِيَادُهُمْ لِبَيْعَتِهِ وَالَّذِي وَقَعَ أَنَّ النَّاسَ اجْتَمَعُوا عَلَى أَبِي بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرَ ثُمَّ عُثْمَانَ ثُمَّ عَلِيٍّ إِلَى أَنْ وَقَعَ أَمْرُ الْحَكَمَيْنِ فِي صِفِّينَ فَسُمِّيَ مُعَاوِيَةُ يَوْمَئِذٍ بِالْخِلَافَةِ ثُمَّ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَى مُعَاوِيَةَ عِنْدَ صُلْحِ الْحَسَنِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى وَلَدِهِ يَزِيدَ وَلَمْ يَنْتَظِمْ لِلْحُسَيْنِ أَمْرٌ بَلْ قُتِلَ قَبْلَ ذَلِكَ ثُمَّ لَمَّا مَاتَ يَزِيدُ وَقَعَ الِاخْتِلَافُ إِلَى أَنِ اجْتَمَعُوا عَلَى عبدالملك بن مَرْوَان بعد قتل بن الزُّبَيْرِ ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى أَوْلَادِهِ الْأَرْبَعَةِ الْوَلِيدِ ثُمَّ سُلَيْمَانَ ثُمَّ يَزِيدَ ثُمَّ هِشَامٍ وَتَخَلَّلَ بَيْنَ سُلَيْمَانَ وَيَزِيدَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ فَهَؤُلَاءِ سَبْعَةٌ بَعْدَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ وَالثَّانِي عَشَرَ هُوَ الْوَلِيدُ بْنُ يَزِيدَ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ لَمَّا مَاتَ عَمُّهُ هِشَامٌ ..."۔

(خلاصہ) ان بارہ کی خلافت پر امت کے اجتماع سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگ ان کی بیعت کرلیں گے، اور واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کا اجتماع حضرت ابوبکر، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی (رضی اللہ عنہم) پر ہوا، یہاں تک کہ واقعہ تحکیم کے وقت حضرت معاویہ کا نام خلافت کے لئے لیا گیا، پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوا، پھر ان کے بیٹے یزید بن معاویہ پر ہوا، پھر یزید کی وفات کے بعد اختلاف رہا، یہاں تک کہ پھر حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے قتل کے بعد لوگ عبدالملک بن مروان پر مجتمع ہوئے، پھر عبدالملک کے چاروں بیٹوں ولید، سلیمان، یزید اور ہشام پر اجتماع ہوا، ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز بھی آتے ہیں، تو خلفاء راشدین کے بعد یہ سات خلفاء ہوئے، اور بارہواں خلیفہ ولید بن یزید بن عبدالملک ہوا جس پر لوگوں کا اجتماع ہوا"۔

(فتح الباری، ج13ص215، دار المعرفة بيروت)

اسی طرح پہلے بیان ہوا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث قسطنطنیہ کی شرح میں، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان منقول ہے کہ" سب سے پہلا وہ لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا اس کی مغفرت کر دی گئی"، اس کی شرح میں انہوں نے ایک تو" قیصر کے شہر" سے مراد "قسطنطنیہ" لیا ہے اور دوسرا یہ لکھا ہے کہ :

" فَإِنَّهُ كَانَ أَمِيرَ ذَلِكَ الْجَيْشِ بالاتفاق" وہ (یعنی یزید بن معاویہ) بالاتفاق قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے سب سے پہلے لشکر کا امیر تھا۔

(فتح الباری، جلد6، صفحہ 103، دار المعرفة بیروت)

تو اگر لعل شاہ صاحب نے شارحین ومحدثین کے بیان کردہ احتمالات کو" حدیث" کا درجہ ہی دینا ہے تو حافظ ابن حجر کی مندرجہ بالا تشریحات کو وہ کیوں نہیں تسلیم کرتے؟ بلکہ جہاں انہوں نے قدیم علماء کی کسی بات کو نہیں ماننا تو وہ بڑے دھڑلے سے لکھ دیتے ہیں کہ:

" ابن جریر، ابن اثیر اور ابن کثیر کی ہستیاں بلند پایہ ہیں لیکن اس مرحلے میں ہم ان کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں اور ان کے قول کو رد کر دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 275)

نیز ایک جگہ لکھتے ہیں:

" حافظ ابن کثیر اور طبری کی تحقیق بھی درست نہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 364)

تو اگر لعل شاہ صاحب جس کی تحقیق کو جب چاہیں اپنی مرضی سے رد کر سکتے ہیں تو حافظ ابن حجر یا محدث سہارنپوری نے جو اپنی رائے سے احتمالات لکھے ہیں دوسروں پر انہیں حدیث تسلیم کرنا کیوں لازم ہے؟ جبکہ حدیث شریف یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اثر میں نہ" هذا الحي من قريش" کی کوئی تعیین ہے اور نہ ہی "غلمة من قريش" کی ہی وضاحت ہے کہ اس سے کون مراد ہیں؟ کیا خود لعل شاہ صاحب نے حدیث قسطنطنیہ پر" عمل جراحی" کرتے ہوئے یہ نکتہ نہیں اٹھایا تھا کہ" اس حدیث میں یزید کا نام لے کر اسے جنتی نہیں فرمایا گیا"؟ (دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 359)۔

❀❀❀

قریشی بچوں کے ہاتھوں امت کی ہلاکت والی حدیث اور اس کا مفہوم

اب ہم" قریشی چھوکروں کے ہاتھوں امت کی ہلاکت" والی حدیث، نیز" ساٹھ سال" اور" بچوں کی امارت" سے پناہ مانگنے والے اثر پر مفصل بات کرتے ہیں تاکہ لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے اس استدلال کی حقیقت بھی آشکار ہو سکے۔

صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ :

حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ المَكِّيُّ، حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ الأُمَوِيُّ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ:كُنْتُ مَعَ مَرْوَانَ وَأَبِي هُرَيْرَةَ فَسَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ:سَمِعْتُ الصَّادِقَ المَصْدُوقَ يَقُولُ هَلاَكُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ، فَقَالَ مَرْوَانُ: غِلْمَةٌ؟ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ:إِنْ شِئْتَ أَنْ أُسَمِّيَهُمْ بَنِي فُلاَنٍ، وَبَنِي فُلاَنٍ"۔

(ترجمہ) عمرو بن یحییٰ بن سعید اپنے دادا (سعید) سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوہریرہ اور مروان کے ساتھ تھا جب حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ: میری امت کی بربادی قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھوں پر ہوگی، مروان نے پوچھا: نوجوان لڑکے؟ اس پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر تم چاہو تو میں ان کے نام بھی لے لوں کہ وہ بنی فلاں اور بنی فلاں ہوں گے۔

(صحيح البخاري، باب علامات النبوة في الاسلام، رقم الحديث 3605)

یہی حدیث صحیح بخاری میں ایک دوسرے مقام پر بھی یوں آئی ہے :

"حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ سَعِيدٍ، قَالَ:أَخْبَرَنِي جَدِّي، قَالَ :كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِينَةِ، وَمَعَنَا مَرْوَانُ، قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ:سَمِعْتُ الصَّادِقَ المَصْدُوقَ يَقُولُ:هَلَكَةُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَقَالَ مَرْوَانُ:لَعْنَةُ اللهِ عَلَيْهِمْ غِلْمَةً۔فَقَالَ

أَبُو هُرَيْرَةَ: لَوْ شِئْتُ أَنْ أَقُولَ: بَنِي فُلاَنٍ، وَبَنِي فُلاَنٍ، لَفَعَلْتُ فَكُنْتُ أَخْرُجُ مَعَ جَدِّي إِلَى بَنِي مَرْوَانَ حِينَ مُلِّكُوا بِالشَّامِ، فَإِذَا رَآهُمْ غِلْمَانًا أَحْدَاثًا قَالَ لَنَا: عَسَى هَؤُلاَءِ أَنْ يَكُونُوا مِنْهُمْ؟ قُلْنَا: أَنْتَ أَعْلَمُ "۔

(وہی راوی عمرو بن یحییٰ بن سعید اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، لیکن اس روایت میں کچھ الفاظ زیادہ ہیں، ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے) راوی عمرو بن یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ: جب بنو مروان شام کی حکومت پر قابض ہو گئے تو میں اپنے دادا (سعید بن عمرو) کے ساتھ ان کی طرف جایا کرتا تھا، جب میرے دادا نے وہاں نوعمر لڑکوں کو دیکھا تو کہا کہ: شاید یہ انہی میں سے ہوں، ہم نے کہا کہ: آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

(صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هَلاَكُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ أُغَيْلِمَةٍ سُفَهَاءَ)

یہی روایت مسند احمد میں بھی ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

" فَإِذَا هُمْ يُبَايِعُونَ الصِّبْيَانَ مِنْهُمْ، وَمَنْ يُبَايِعُ لَهُ، وَهُوَ فِي خِرْقَةٍ قَالَ لَنَا: هَلْ عَسَى أَصْحَابُكُمْ هَؤُلَاءِ أَنْ يَكُونُوا الَّذِينَ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَذْكُرُ أَنَّ هَذِهِ الْمُلُوكَ يُشْبِهُ بَعْضُهَا بَعْضًا"۔

(عمر بن یحییٰ بن سعید کہتے ہیں جب ہم شام گئے تو ہم نے دیکھا کہ) وہ لوگ بچوں سے بھی بیعت کر رہے تھے اور ایسے بچے سے بھی بیعت کر رہے تھے جو کپڑے (خرقہ) میں لپیٹ کرلایا گیا تھا، تو میرے دادا نے کہا: ہوسکتا ہے یہی وہ لڑکے ہوں جن کا ذکر میں نے حضرت ابوہریرہ سے سن رکھا ہے کہ یہ بادشاہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے۔

(مسند احمد، جلد14، صفحہ 58 مؤسسة الرسالة بیروت)

صحیح بخاری کی یہ دونوں احادیث اور ان کے ساتھ مسند احمد کی مندرجہ بالا روایت ایک ہی سند سے مروی ہیں، اور غور کریں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی "سعید بن عمرو" نے مذکورہ حدیث کا مصداق ایسے بچوں کو قرار دیا جو یزید کے بعد کے زمانے کے تھے، اور یزید کا حوالہ نہ انہوں نے دیا

اور نہ ہی ان کے پوتے "عمرو بن یحییٰ بن سعید" نے ہی یزید کا کوئی ذکر اذکار کیا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک کسی نے بھی اس حدیث کو یزید پر منطبق نہیں کیا تھا، اور اہل علم خوب جانتے ہیں کہ راوی اپنی روایت کا مفہوم دوسروں سے بہتر سمجھتا ہے، مگر لعل شاہ صاحب جیسے محققین اس حدیث کے راوی کے فہم کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ صحیح بخاری سے صرف وہ روایت پیش کرتے ہیں جو مختصر ہے، اور اس روایت کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں جس میں مفہوم کی وضاحت بھی موجود ہے، مقصد صاف ظاہر ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ہم نے جو مفہوم لیا ہے وہ نہ صرف راوی حدیث کی طرف سے لئے گئے مفہوم کے خلاف ہے، بلکہ خیر القرون کے تمام اہل علم کے فہم کے بھی خلاف ہے، کیونکہ یزید کے دور کے کسی بھی صاحب علم سے یہ منقول نہیں کہ اس نے اس حدیث سے یہ مفہوم مراد لیا ہو، حتیٰ کہ واقعہ حرہ میں جب مدینہ کے کچھ لوگوں نے یزید کی بیعت توڑی تو انہوں نے بھی یزید کے خلاف اس روایت کو پیش نہیں کیا۔

اب عمرو بن یحییٰ جنہوں نے اس حدیث کو اپنے دادا سے روایت کیا ہے، وہ اس حدیث کی روایت کے بعد صحیح بخاری میں فرماتے ہیں کہ: میں اپنے دادا سعید کے ساتھ اس وقت ملک شام گیا، جب وہاں بنو مروان کی حکومت تھی، تو میرے دادا سعید نے بنو مروان کو نوخیز دیکھ کر فرمایا کہ: "دور نہیں کہ یہی وہ قریش کے چھوکرے ہوں"، اس کے جواب میں ہم لوگوں نے کہا کہ اس کو آپ ہی ہم سے زیادہ جان سکتے ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ صحیح بخاری میں یہ حدیث اور اس کا یہ محمل دونوں ساتھ ساتھ مذکور ہیں، مگر لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنوا، اس محمل کا ذکر بالکل نہیں کرتے، دوسرا ستم یہ ہے کہ ابن حجر کی توجیہ کو تو یہ لوگ نص کی طرح تسلیم کرتے ہیں، مگر خود راوی حدیث اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد کی توجیہ کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ اسی طرح یزید کو لفظ "غلام" کا مصداق ثابت کرنے کے شوق میں یہ حضرات ابن حجر کی اس تاویل کو بلا تامل مان لیتے ہیں کہ غلام اپنی حقیقت پر محمول نہیں ہے، بلکہ مجازاً اس سے ضعیف العقل مراد ہے، مگر خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا لفظ "غلمة" کو اس کے حقیقی معنوں میں سمجھتا ہے، اور بنو مروان کو نوخیز پا کر ان کو اس کا مصداق قرار دیتا ہے، تو اس کی کوئی اہمیت ان حضرات کے نزدیک نہیں ہے، حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ حقیقت کو چھوڑ کر مجاز اختیار کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک حقیقت متعذر نہ ہو۔

پھر عرض ہے کہ لفظ "غلمة" جمع ہے، اور اس کا مفرد ہے "غلام"، آئیے دیکھتے ہیں "غلام" کسے

کہتے ہیں :

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتح الباری میں لکھا ہے :

"يُقَالُ لِلصَّبِيِّ حِينَ يُولَدُ إِلَى أَنْ يَحْتَلِمَ غُلَامٌ وَتَصْغِيرُهُ غُلَيِّمٌ وَجَمْعُهُ غِلْمَانُ وَغِلْمَةٌ وَأُغَيْلِمَةٌ....."۔

ولادت سے لے کر بالغ ہونے تک کے بچے کو غلام کہا جاتا ہے، اور اس کی تصغیر "غُلَيِّم" اور اس کی جمع "غلمان"، "غلمة" اور "اغيلمة" آتی ہے۔

(فتح الباری، ج13، ص9، دار المعرفة بيروت)

نیز خود حافظ ابن حجر نے الفاظ حدیث کے معانی پر کتاب لکھنے والے امام ابن الاثیر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حدیث کے ان الفاظ کو حقیقت پر محمول کیا ہے، لکھتے ہیں :

"وَقَالَ ابن الْأَثِيرِ الْمُرَادُ بِالْأُغَيْلِمَةِ هُنَا الصِّبْيَانِ وَلِذَلِكَ صَغَّرَهُمْ"۔

ابن اثیر نے کہا ہے کہ "اغیلمة" سے مراد چھوٹے بچے ہیں اسی لیے اسے تصغیر کے صیغے کے ساتھ لایا گیا ہے۔

(فتح الباری، ج13، ص 9، دار المعرفة بيروت /
النهاية في غريب الحديث والأثر، ج3، ص 382، المكتبة العلمية بيروت)

لہٰذا سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس روایت میں نابالغ "بچوں" کا ذکر ہے، اور یزید نے جب حکومت سنبھالی تو وہ بچہ تھا ہی نہیں، خود حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہ اشکال محسوس ہوا اس لئے انہوں نے یہ تاویل کی کہ :

"وَقَدْ يُطْلَقُ الصَّبِيُّ وَالْغُلَيِّمُ بِالتَّصْغِيرِ عَلَى الضَّعِيفِ الْعَقْلِ وَالتَّدْبِيرِ وَالدِّينِ وَلَوْ كَانَ مُحْتَلِمًا وَهُوَ الْمُرَادُ هُنَا فَإِنَّ الْخُلَفَاءَ مِنْ بَنِي أُمَيَّةَ لَمْ يَكُنْ فِيهِمْ مَنِ اسْتُخْلِفَ وَهُوَ دُونَ الْبُلُوغِ وَكَذَلِكَ مَنْ أَمَّرُوهُ عَلَى الْأَعْمَالِ..."۔

صبی اور غلیم کا اطلاق کم عقل وکم فہم پر بھی ہوتا ہے، اگرچہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہو، اور اس حدیث

میں بچوں سے یہی مراد ہے، کیونکہ بنی امیہ میں کوئی بھی خلیفہ نابالغ نہیں گذرا ہے، اسی طرح ان کے تمام عُمّال بھی بالغ تھے۔

(فتح الباری، ج13ص9، دار المعرفة بیروت)

چنانچہ ہم عرض کرتے ہیں کہ یہاں کوئی ایسی مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ اس حدیث میں" غلام" یا "صبی" کا حقیقی معنی لینا متعذر یا ناممکن ہو، لہٰذا اس کا مجازی معنی لینے کی کوئی مجبوری نہیں، نیز حافظ ابن حجر کی یہ مندرجہ بالا تاویل بھی محل نظر ہے کیونکہ یزید پر "کم عقلی" کا الزام تو کسی نے بھی نہیں لگایا تھا، پھر اسے کم عقل سمجھ کر اسے بچوں میں شامل کرنا چہ معنی دارد؟

لہٰذا یہ حدیث حقیقت پر ہی محمول ہوگی، جیسا کہ اس حدیث کے راوی نے خود اسے حقیقی معنوں پر ہی محمول کیا ہے، ان الفاظ کو مجازی معنوں پر محمول کرنے کی کوئی مجبوری لاحق نہیں اور نہ ہی کوئی قرینہ صارفہ عن الظاہر ہے۔

سنہ 60ھ اور امارت صبیان

اب آئیے ذرا اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ کس بنیاد پر اس حدیث میں یزید کو شامل کرنے پر اصرار کیا جارہا ہے، دراصل جس حدیث کا اوپر ذکر ہوا (یعنی قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھوں امت کی بربادی والی حدیث)، یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے مروی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث ہے، اب یہاں کاروائی یہ کی جاتی ہے کہ اس حدیث کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک موقوف اثر ملایا جاتا ہے جو لعل شاہ صاحب نے بھی حافظ ابن حجر کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے کہ :

"وَفِي رِوَايَةِ بن أَبِي شَيْبَةَ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَمْشِي فِي السُّوقِ وَيَقُولُ اللَّهُمَّ لَا تُدْرِكْنِي سَنَةُ سِتِّينَ وَلَا إِمَارَةُ الصِّبْيَانِ" ۔

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) ابن ابی شیبہ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بازاروں میں چلتے اور دعا کرتے تھے اے اللہ مجھے سنہ 60ھ اور امارۃ الصبیان نہ پا سکے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 379 بحوالہ فتح الباری)

نوٹ: ہمیں مصنف ابن ابی شیبۃ میں ان الفاظ کے ساتھ کوئی روایت نہیں ملی، البتہ مندرجہ ذیل روایت ملی ہے:

"حدّثنا غُنْدَرٌ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ سِمَاكٍ، عَنْ أَبِي الرَّبِيعِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ: إِمَارَةُ الصِّبْيَانِ، إِنْ أَطَاعُوهُمْ أَدْخَلُوهُمُ النَّارَ وَإِنْ عَصَوْهُمْ ضَرَبُوا أَعْنَاقَهُمْ"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عرب کے لیے ہلاکت ہے اس شر کی وجہ سے جو قریب ہے، اور وہ بچوں کی امارت ہے، اگر وہ ان کی اطاعت کریں گے تو وہ انہیں آگ میں داخل کردیں گے، اور اگر ان کی نافرمانی کریں گے تو ان کی گردنیں ماردیں گے۔

(المصنّف لابن ابي شيبة، ج7ص461، مكتبة الرشد ،الرياض)

لیکن بہرحال حافظ ابن حجر نے ابن ابی شیبہ کا حوالہ دیا ہے، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک دعا کا ذکر کیا ہے جس کے عربی الفاظ یہ ہیں، غور سے پڑھیں:

"اللَّهُمَّ لَا تُدْرِكْنِي سَنَةُ سِتِّينَ وَلَا إِمَارَةُ الصِّبْيَانِ"۔

ان الفاظ کا درست لفظی ترجمہ یوں ہے:

"اے اللہ! مجھے ساٹھواں سال نہ پائے، اور نہ ہی بچوں کی حکومت پائے"۔

کیونکہ یہاں "لاتدركني سنة ستين" کے بعد "ولا" کے اضافے کے ساتھ امارة الصبيان کا ذکر ہے، لعل شاہ صاحب نے جو اردو ترجمہ کیا ہے اس میں اس "وَلَا" کا ترجمہ ہضم کر گئے ہیں نیز "سنة ستين" کو "سنہ 60 ہجری" بنا ڈالا ہے اور یوں ترجمہ کیا ہے" مجھے سنہ 60ھ اور امارۃ الصبیان نہ پاسکے"۔

ترجمہ میں یہ مغالطہ اس لیے دیا گیا ہے تاکہ ایک تو یہ باور کروایا جائے کہ "سنة ستين" سے مراد ساٹھ ہجری ہے، دوسرا یہ ثابت کیا جائے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جن دو چیزوں کی دعا مانگی ہے، ان دونوں کا ایک ساتھ وقوع ہونا تھا، جبکہ" ولاامارة الصبيان" کے الفاظ جن میں صرف "و" نہیں بلکہ اس کے ساتھ الگ سے "لا" بھی ہے، یہ طرز تعبیر صاف بتا رہا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ امارت صبیان کو ساٹھویں سال سے بالکل علیحدہ اور الگ ایک مستقل چیز سمجھتے تھے، اگر دونوں میں معیت کا تصور ان کو ہوتا تو لفظ "لا" کے اعادہ

کے ساتھ اس کو پہلے پر عطف نہ کرتے، بلکہ یوں کہتے: "لاتدركني سنة ستين وامارة الصبيان"۔

خود حافظ ابن حجر نے ایک روایت یوں نقل کی ہے :

"..... أَخْرَجَهُ عَلِيُّ بْنُ مَعْبَدٍ وبنُ أَبِي شَيْبَةَ مِنْ وَجْهٍ آخر عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَفَعَهُ أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ إِمَارَةِ الصِّبْيَانِ قَالُوا وَمَا إِمَارَة الصّبيان قَالَ إِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ هَلَكْتُمْ أَيْ فِي دِينِكُمْ وَإِنْ عَصَيْتُمُوهُمْ أَهْلَكُوكُمْ أَيْ فِي دُنْيَاكُمْ بِإِزْهَاقِ النَّفْسِ أَوْ بِإِذْهَابِ الْمَالِ أَوْ بِهِمَا"۔

علی بن معبد وابن ابی شیبہ نے ایک اور طریق سے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے یہ روایت نقل کی ہے جو کہ مرفوع ہے (اور اس کے الفاظ ہیں) میں بچوں کی امارت سے پناہ مانگتا ہوں، لوگوں نے پوچھا: بچوں کی امارت کا کیا مطلب؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے، (راوی نے کہا کہ) مراد دین کی ہلاکت ہے، اور اگر ان کی نافرمانی کرو گے تو وہ تمہیں ہلاک کر ڈالیں گے، اس سے مراد دنیا کی ہلاکت ہے، یعنی یا تو تمہاری جان لے لیں گے یا تمہارا مال چھین لیں گے یا دونوں چیزیں۔

(فتح الباری، ج13ص10، دار المعرفة بیروت)

اس روایت کا ایک حصہ لعل شاہ صاحب نے بھی اپنی کتاب کے صفحہ 378 پر نقل کیا ہے ۔

اب غور فرمائیں! اس روایت میں خاص طور پر یہ ذکر ہے کہ" بچوں کی امارت" کی وضاحت کے لئے سوال بھی کیا گیا تھا، لیکن اس سوال کے جواب میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ" اس کی نشانی یہ ہے کہ یہ سنہ 60 ہجری میں ہوگا"، بلکہ اس کی پہچان کچھ اور بتائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ساٹھویں سال سے کسی اور بات کی طرف اشارہ ہے اور امارۃ صبیان سے کسی اور طرف۔

لہٰذا نہ حدیث کے ظاہری الفاظ یزید پر منطبق ہوتے ہیں کہ وہ" صبی اور غلام" نہ تھا بلکہ خود باقرار حافظ ابن حجر، بنو امیہ کا کوئی بھی خلیفہ ایسا نہیں ہوا جو بالغ نہ ہو، دوسرا خود حافظ ابن حجر کے مطابق یزید ان بارہ خلفاء میں شامل تھا جن کے دور میں دین کے غلبہ اور صاحب شان وشوکت ہونے کی بشارت دی گئی ہے، تیسرا حضرت ابو ہریرہ ؓ کی دعا کا طرز تعبیر یہ بتا رہا ہے کہ ساٹھواں سال اور امارت صبیان دو الگ الگ مستقل

چیزیں ہے اوران کا ایک ہی زمانہ میں ساتھ ساتھ پایا جانا ضروری نہیں، لہٰذا اگر کسی نے اس سے مراد یزید لیا ہے تو یہ اس کا اپنا استنباط اور اجتہاد ہے، حدیث یا روایت میں ایسا کوئی اشارہ نہیں اور یہ مفہوم لینے کے لئے خوامخواہ بلا ضرورت حدیث کے الفاظ کا "مجازی معنیٰ" لینا پڑے گا۔

اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ جن شارحین نے "امارۃ الصبیان" والی روایت سے یزید کی مذمت نکالی ہے، انہیں یہ بھی اچھی طرح علم تھا کہ یزید نابالغ بچہ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے یہ دلیل نکالی کہ:

"فَإِنَّ يَزِيدَ كَانَ غَالِبًا يَنْتَزِعُ الشُّيُوخَ مِنْ إِمَارَةِ الْبُلْدَانِ الْكِبَارِ وَيُوَلِّيهَا الْأَصَاغِرَ مِنْ أَقَارِبِهِ"۔

یزید عام طور پر بڑے شہروں کی امارت سے بوڑھوں کو ہٹا کر اپنے چھوٹے رشتہ داروں کو ان پر والی مقرر کرتا تھا۔

(فتح الباری، ج13ص10/ عمدة القاري،ج24ص180)

ہم نہیں جانتے کہ یہ بات لکھنے والوں نے کس بنیاد پر لکھی ہے اور ان کے پاس اس بات کی کیا دلیل ہے؟ یزید کے رشتہ داران "کم عمر" امراء کے کیا نام ہیں جنہیں یزید "اکثر" بڑے شہروں پر "بوڑھوں" کی جگہ مقرر کیا کرتا تھا؟، طرز تعبیر سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یزید کا یہ عام معمول تھا کہ وہ تمام علاقوں سے بڑے اور زیادہ عمر والے گورنروں کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے رشتہ دار ناتجربہ کار بچوں کو والی لگا دیا کرتا تھا، نیز اگر یہ بات بالفرض درست بھی تسلیم کر لی جائے تو بھی اس سے یہی ثابت ہوگا کہ یزید نے اپنے عامل جو مقرر کیے وہ چھوٹے بچے تھے، لیکن یزید کا بچہ ہونا تو اس سے بھی ثابت نہ ہوا، یعنی وہ جنہیں امیر مقرر کرتا تھا وہ "صبیان" ہوں گے نہ کہ خود یزید۔

ساٹھ سال یا ستر سال؟ لعل شاہ صاحب کی ایک اور علمی خیانت

لعل شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

"علامہ ابن حجر المکی الهيتمي ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

وفي حديث رواتُه ثقاتٌ نعوذ بالله من رأس الستين وفي رواية من سنة ستين

ومن امارة الصبيان"۔

ایک حدیث میں ہے جس کے راوی ثقہ ہیں کہ فرمایا ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ لیتے ہیں سنہ 60ھ کے اخیر سے اور ایک روایت میں ہے سنہ 60ھ اور امارۃ الصبیان سے۔ تطہیر الجنان، ص66۔

(استخلاف یزید، صفحہ 380)

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں لعل شاہ صاحب نے تطہیر الجنان کی عبارت بھی غلط نقل کی ہے، صحیح عبارت یوں ہے :

"وفي حديثٍ رواتُه ثقاتٌ تعوَّذوا بالله من رأس الستين، وفي رواية من رأس السبعين وامارة الصبيان"۔

(تطهير الجنان، ص226و 227،طبع دار الصحابة ، طنطا، مصر)

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے :

"ایک حدیث میں جس کے راوی ثقہ ہیں یوں ہے: اللہ کی پناہ مانگو ساٹھ کے سر سے، اور ایک روایت میں یوں ہے: ستر کے سر سے اور بچوں کی امارت سے"۔

یعنی یہاں ابن حجر مکی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ایک روایت میں" 60سال کے سر" کے بجائے "70 سال کے سر" کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے اگر یہ مرفوع روایت ہے تو اس 60اور 70 سے سنہ 60ھ یا سنہ 70ھ مراد نہیں ہوسکتا کیوں کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں سن ہجری کا رواج نہیں تھا، لہٰذا اس سے مراد یا تو نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد ساٹھ یا ستر سال ہوں گے، جو بالترتیب تقریباً70 ہجری یا 80 ہجری (باختلاف الروایات) بنے گا، یا یہ ساٹھ یا ستر سال اس وقت سے شمار ہوں گے جس وقت زبان نبوی سے یہ فرمان صادر ہوا۔ اور اگر بالفرض کوئی اس سے "ہجری سنہ" مراد لینے پر بھی بضد ہو تو پھر بھی یزید تو 70 ہجری سے پہلے اس دنیا سے جا چکا تھا، یوں ابن حجر مکی نے جس دوسری "70 سال" والی روایت کا ذکر کیا ہے اس کی رو سے یزید اس میں شامل نہیں ہوسکتا، شاید اسی لئے لعل صاحب نے کمال ہوشیاری سے تطہیر الجنان کی عبارت میں "رأس السبعين" کو "سنة ستين" بنا ڈالا۔

پھر لعل شاہ صاحب نے تو صرف "تطہیر الجنان" کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے جس میں اس کی کوئی سند مذکور نہیں، ہم اپنی طرف سے" رأس السبعين" (یعنی 70 سال) والی حدیث مرفوع کی سند پیش کر دیتے ہیں جس کی طرف ابن حجر مکی نے اشارہ کیا ہے، تو ملاحظہ فرمائیں، یہ روایت "مسند احمد" اور" مصنّف ابن ابی شیبہ" وغیرہ میں موجود ہے، چنانچہ امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں :

"حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ كَامِلٍ أَبِي الْعَلَاءِ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ رَأْسِ السَّبْعِينَ، وَمِنْ إِمْرَةِ الصِّبْيَانِ"۔

وکیع (بن جراح) روایت کرتے ہیں کامل ابو العلاء سے، وہ روایت کرتے ہیں ابو صالح (مینا مولیٰ ضباعۃ بنت الزبیر بن عبد المطلب) سے، وہ روایت کرتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی پناہ مانگو ستر کے سر سے اور بچوں کی امارت سے۔

(المصنف لابن ابي شيبة، ج7ص461، مكتبة الرشد الرياض)

اور مسند احمد بن حنبل میں یہ روایت یوں ہے :

"حَدَّثَنَا الْأَسْوَدُ قَالَ: أَخْبَرَنَا كَامِلٌ يَعْنِي أَبَا الْعَلَاءِ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا صَالِحٍ مُؤَذِّنًا كَانَ يُؤَذِّنُ لَهُمْ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ رَأْسِ السَّبْعِينَ، وَإِمَارَةِ الصِّبْيَانِ"۔

(مسند احمد،ج14ص68، مؤسسة الرسالة بيروت)

اور مسند بزّار میں یہ حدیث یوں ہے :

"حَدَّثَنَا أحمد بن منصور حدثنا أبو أحمد حدثنا كامل بن العلاء عن أبي صالح، وهو مولى ضباعة عن أبي هريرة رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يتعوذ من رأس السبعين ومن إمارة

الصبيان"۔

(مسند البزار، ج16ص249،مكتبة العلوم والحكم المدينة)

یہ ہے وہ مرفوع حدیث جس کی طرف ابن حجر مکی نے اشارہ کیا ہے، اور لعل شاہ صاحب نے "رأس السبعين" کے الفاظ کو "سنة ستين" سے تبدیل کر کے بات کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس روایت کے راویوں کا تعارف بھی کروا دیں :

أبو صالح مولىٰ ضباعة

اس روایت کی سند میں "ابوصالح" سے کون مراد ہیں؟ تو مسند بزار کی روایت میں اس کی صراحت آ گئی کہ اس سے مراد "ابو صالح مولىٰ ضباعة" ہیں، آئیے دیکھتے ہیں یہ ثقہ ہیں یا نہیں؟

امام ابن ابی شیبہ، امام علی بن المدینی سے نقل کرتے ہیں کہ :

"وَسَأَلته عَن أبي صَالح مولى ضباعه فَقَالَ كَانَ ثبتا وَكَانَ من التَّابِعين وَهُوَ الَّذِي يروي عَنهُ أهل الكوفه"۔

میں نے ابن المدینی سے ابوصالح مولیٰ ضباعۃ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا: وہ ثبت تھے اور تابعین میں سے تھے، یہ وہی ہیں جن سے کوفہ والے روایت کرتے ہیں۔

(سؤالات ابن ابي شيبة لابن المديني :ج1ص107،مكتبة المعارف الرياض)

امام ابن حبان نے انہیں ثقات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے :

"ميناء أَبُو صَالح مولى ضُباعة بنت الزُّبَيْر يَرْوِي عَن أَبِي هُرَيْرَة روى عَنهُ كَامِل أَبُو الْعَلَاء"۔

(الثقات لابن حبان، ج5ص455،دائرة المعارف حيدر آباد)

امام ذہبی لکھتے ہیں :

"فأما:أبو صالح السمان الزيات وأبو صالح الحنفي وأبو صالح مولى ضباعة من تابعي الكوفة فهولاء ثقات"۔

ابوصالح سمان زیات اور ابوصالح حنفی اور ابوصالح مولیٰ ضباعۃ جو کوفہ کے تابعین میں سے ہیں،

یہ سب ثقہ ہیں۔

(ميزان الاعتدال، ج4،ص539،دار المعرفة بيروت)

كامل بن العلاء ابو العلاء

كامل بن العلاء کے بارے میں امام یحییٰ بن معین سے ان کے شاگرد عباس الدوری نقل کرتے ہیں کہ :

"سَمِعت يحيى يَقُول كَامِل بن الْعَلَاء أَبُو الْعَلَاء ثِقَة"۔

"سَمِعت يحيى يَقُول كَامِل أَبُو الْعَلَاء وَهُوَ كَامِل بن الْعَلَاء لَيْسَ بِهِ بَأْس"۔

میں نے یحییٰ بن معین کو کامل بن العلاء ابو العلاء کے بارے میں یہ کہتے سنا کہ وہ ثقہ ہیں... اوران کی روایت لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(تاريخ ابن معين رواية الدوري، ج3ص341،طبع مكة المكرمة)

یہی بات امام ابن ابی خیثمہ نے بھی نقل کی ہے :

"سَمِعْتُ يَحْيَى بن مَعِيْن يقول :كامل أبو العلاء ثقة"۔

(تاريخ ابن ابي خيثمة، ج2ص207،الفاروق الحديثة القاهرة)

(الجرح والتعديل، ج7ص172،حيدرآباد دكن)

امام عجلی نے ان کے بارے میں لکھا :

"كامل أبو العلاء كوفي ثقة"۔کامل ابو العلاء کوفی ہیں اور ثقہ ہیں۔

(معرفة الثقات للعجلي، ج2ص224،مطبعة المدني، مصر)

ابن عدی ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

"أرجو أن لا بأس به"،میں امید کرتا ہوں کہ ان کی روایت لینے میں کوئی حرج نہیں۔

(الكامل لابن عدي، ج7ص227، دار الكتب العلمية بيروت)

امام یعقوب فسوی بھی کامل بن العلاء کو ثقہ لکھتے ہیں :

"حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ رَجَاءٍ قَالَ: ثنا كَامِلُ بْنُ الْعَلَاءِ وَهُوَ ثِقَةٌ"۔

(المعرفة والتاريخ ليعقوب الفسوي، ج3ص234،مؤسسة الرسالة بيروت)

امام نسائی سے ایک جگہ منقول ہے کہ وہ قوی نہیں، لیکن دوسری جگہ فرمایا کہ ان کی روایت لینے میں کوئی حرج نہیں:

"وقال النسائي ليس بالقوي وقال في موضع آخر ليس به بأس"۔

(تهذيب التهذيب، ج8ص409،دائرة المعارف الهند)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں :

" كامل بن العلاء أبو العلاء التميمي السعدي الكوفي عن أبي صالح السمان وعطاء وعنه وكيع وزيد بن الحباب وَثَّقَه بن حبان"۔

کامل بن العلاء ابوالعلاء کی ابن حبان نے توثیق کی ہے۔

(لسان الميزان، ج7ص344،مؤسسة الاعلمي بيروت)

الغرض! یہ راوی جمہور کے نزدیک ثقہ ہیں، اور آئیے آپ کو بتاؤں کہ اس مرفوع حدیث کے بارے میں امام بوصیری (م840ھ) نے یوں لکھا ہے :

"وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَعَوَّذُوا بالله من رأس السبعين ومن إمارة الصبيان". رَوَاهُ أَحْمَدُ بْنُ مَنِيعٍ. وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ وَأَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَأَبُو يَعْلَى إلا أنه قال: "تعوذوا بالله من سنة سبعين"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ کی پناہ طلب کرو ستر سال کے سر سے اور بچوں کی امارت سے، اس روایت کو احمد بن منیع نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، اور اسی طرح ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابویعلیٰ نے بھی روایت کیا ہے، لیکن ابویعلیٰ کے الفاظ: "تعوذوا بالله من سنة سبعين" ہیں۔

(اتحاف الخيرة المهرة للبوصيري، ج8ص41،دار الوطن، الرياض)

نوٹ : امام ابویعلیٰ کی اس روایت کو مکمل سند کے ساتھ حافظ ابن کثیر نے یوں نقل کیا ہے :

"وَقَالَ الْحَافِظُ أَبُو يَعْلَى: حَدَّثَنَا زُهَيْرُ بْنُ حَرْبٍ، ثَنَا الْفَضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ، ثَنَا كَامِلٌ أَبُو الْعَلَاءِ، سَمِعْتُ أَبَا صَالِحٍ، سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ سَنَةِ سَبْعِينَ، وَمِنْ إِمَارَةِ الصِّبْيَانِ"۔

(البداية والنهاية، ج8ص326، وزارة الاوقاف قطر)

لہٰذا اس مرفوع حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے "ستر" سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے، اب "ستر" سے مراد سنہ 70ھ لیں، یا نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد "ستر سال" مراد لیں (دوسری بات ہی صحیح ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے دور میں ہجری سنہ کا رواج نہیں تھا)، یزید بن معاویہ کسی طرح بھی اس میں شامل نہیں ہوتا کیونکہ وہ سنہ 70ھ سے پہلے ہی وفات پا چکا تھا۔

واضح رہے کہ ستر سال والی حدیث مرفوع ہے اور نبی ﷺ کا فرمان ہے، جبکہ "ساٹھ سال" والی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا موقوف اثر ہے، اس لیے اگر کوئی اس پر ہی بضد ہو کہ اس میں ایک خاص سنہ ہجری میں بچوں کی امارت سے پناہ مانگنے کا ہی ذکر ہے تو پھر "ستر سال" والی مرفوع حدیث، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے موقوف اثر کے مقابلے میں راجح ہوگی، اور یہ مرفوع حدیث حسن درجہ سے کم کی نہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک درحقیقت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے قول اور نبی ﷺ کے مذکورہ فرمان میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیوں کہ ان دونوں میں کم عمر بچوں کی امارت کے دور کی تحدید نہیں کی گئی ہے، بلکہ دو الگ الگ باتوں کا بیان ہے۔ ایک بات ایک محدود دور میں ہونے والے کسی مخصوص فتنے کی طرف اشارہ ہے، جبکہ دوسری بات کا تعلق کم عمر بچوں کی امارت سے ہے۔ لیکن یہ امارت کس زمانہ میں ہوگی؟ اس کا بیان ان دونوں روایتوں میں سے کسی میں بھی نہیں، اور دونوں روایتوں میں مذکورہ دونوں باتوں کے درمیان عربی کا جو "و" ہے یہ "مغایرت" والا ہے، جیسا تعوّذ کی دوسری دعاؤں میں ہوتا ہے۔

ایک فلسطینی عالم شیخ عبدالرحمن العقبی (جن کی ولادت سنہ 1361ھ بمطابق 1942ء بیت المقدس میں ہوئی) کا تقریباً 100 صفحہ کا ایک رسالہ ہے جس کا نام "مسائل سلطانية" ہے، اس میں انہوں

نے بھی اس" ستر سال" والی روایت کے متعلق لکھا ہے :

"فإن امارة الصبيان غير رأس السبعين، وليس المعنى أن إمارة الصبيان تكون على رأس السبعين، وذلك لأن الواو للمغايرة، كقول القائل: أعوذ بالله من الاشتراكية والرأسمالية"۔

(ترجمہ) یہاں بچوں کی امارت کا دور 70 کے اوائل میں ہونا نہیں بتایا گیا، اور اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں کہ بچوں کی امارت 70 کے اوائل میں ہی ہوگی، کیونکہ یہاں" واؤ" مغایرت کے لئے ہے، جیسے کوئی یوں کہے کہ: میں اشتراکی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام سے پناہ مانگتا ہوں۔

(مسائل سلطانية للشيخ عبدالرحمن العقبي، ص37، المسئلة السادسة)

حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کو یزید پر منطبق کرنے کی کوشش

لعل شاہ صاحب نے مسند احمد اور البدایۃ والنہایۃ کے حوالے سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کا ٹکڑا بھی نقل کیا ہے (استخلاف یزید، صفحہ 381) معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس روایت کو بھی یزید پر منطبق کرنا چاہتے ہیں، تو ہم وہ مکمل روایت بھی مع ترجمہ نقل کرتے ہیں:

"حَدَّثَنَا أَبُو عَبْدِ الرَّحْمَنِ، حَدَّثَنَا حَيْوَةُ، أَخْبَرَنِي بَشِيرُ بْنُ أَبِي عَمْرٍو الْخَوْلَانِيُّ، أَنَّ الْوَلِيدَ بْنَ قَيْسٍ حَدَّثَهُ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: يَكُونُ خَلْفٌ مِنْ بَعْدِ سِتِّينَ سَنَةً أَضَاعُوا الصَّلَاةَ، وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ، فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا، ثُمَّ يَكُونُ خَلْفٌ يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ، لَا يَعْدُو تَرَاقِيَهُمْ، وَيَقْرَأُ الْقُرْآنَ ثَلَاثَةٌ: مُؤْمِنٌ، وَمُنَافِقٌ، وَفَاجِرٌ" قَالَ بَشِيرٌ: فَقُلْتُ لِلْوَلِيدِ: مَا هَؤُلَاءِ الثَّلَاثَةُ، فَقَالَ: "الْمُنَافِقُ كَافِرٌ بِهِ، وَالْفَاجِرُ يَتَأَكَّلُ بِهِ، وَالْمُؤْمِنُ يُؤْمِنُ بِهِ"۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے نبی ﷺ کو فرماتے سنا کہ ساٹھ (60) سال کے بعد ایسے ناخلف ہوں گے جو نماز ضائع کریں گے اور شہوات کی پیروی کریں گے، یہ عن قریب جہنم کے گڑھے میں جائیں گے، پھر اس کے بعد ایسے ناخلف ہوں گے، جو قرآن تو پڑھیں گے، مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، اور قرآن کو پڑھنے والے تین قسم کے لوگ ہوں گے: مومن، منافق اور فاجر. راوی حدیث بشیر کہتے ہیں کہ میں نے (اپنے شیخ) ولید سے پوچھا: یہ تین لوگ کیسے ہوں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا: منافق قرآن کا انکار کرے گا، فاجر اس کے ذریعے کھائے گا، اور مومن اس پر ایمان لائے گا۔

(مسند احمد، جلد17، صفحہ 440، مؤسسۃ الرسالۃ)

اس روایت کو بھی یزید پر منطبق کیا جاتا ہے، لیکن اس میں بھی دور دور تک کہیں بھی یزید کا نام ونشان نہیں، نہ ہی اس میں کسی ایک خاص شخص کا ذکر ہے، بلکہ کئی سارے لوگوں کی یہ علامت بتائی گئی ہے، نیز اس حدیث میں نبی ﷺ نے ساٹھ (60) سال بعد کی صورت حال بتائی ہے، اور یقیناً یہاں ساٹھ سے ہجری سال مراد نہیں ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے دور میں ہجری سال کا رواج نہیں تھا، اس لیے اس سے آپ ﷺ کے وصال کے بعد ساٹھ سال مراد ہوں گے جو ہجری سنہ کے اعتبار سے سنہ 70 ہجری کے بعد کا دور ہوگا، اور یزید کی وفات اس دور سے پہلے ہی ہو چکی تھی، اس لیے یزید کو خوامخواہ اس حدیث کا مصداق بنانا زور زبردستی کے سوا کچھ نہیں، یا اگر یہ دعویٰ ہے کہ ساٹھ سال کے بعد صرف ایک یزید ہی ایسا ہوا ہے جس میں یہ ساری خرابیاں پائی جاتی تھیں، اس لیے اس حدیث کا مصداق صرف وہی ہے تو یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔ اس حدیث پر مزید کلام آگے آئے گا۔

❀❀❀

لعل شاہ صاحب نے چند ایسی احادیث بھی یزید پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جن میں اہل مدینہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرنے اور انہیں خوفزدہ کرنے والوں کے لئے وعید کا بیان ہے، مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

"سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: لاَ يَكِيدُ أَهْلَ المَدِينَةِ أَحَدٌ، إِلَّا انْمَاعَ كَمَا يَنْمَاعُ المِلْحُ فِي المَاءِ"۔

(صحيح البخاري،باب اثم من كاد اهل المدينة)

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ فرماتے تھے: نہ داؤ کرے گا کوئی بھی اہل مدینہ سے مگر پگھل جائے گا جیسے نمک پانی میں پگھلتا ہے۔

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ:

"مَنْ أَرَادَ أَهْلَ هَذِهِ الْبَلْدَةِ بِسُوءٍ يَعْنِي الْمَدِينَةَ أَذَابَهُ اللهُ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ"۔

(صحيح مسلم، باب من أراد اهل المدينة بسوء)

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مدینہ والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس اس طرح پگھلا دے گا جیسے نمک میں پانی پگھل جاتا ہے۔

نیز حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

"سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ أَخَافَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ، فَقَدْ أَخَافَ مَا بَيْنَ جَنْبَيَّ"۔

(مسند احمد، ج23ص121، مؤسسة الرسالة بيروت)

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) حضرت جابر ابن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جس شخص نے اہل مدینہ کو خوفزدہ کیا اس نے میرے دل کو خوفزدہ کیا جو میرے پہلو میں ہے

اس طرح امام سلیمان بن احمد، ابو القاسم الطبرانی (م 360ھ) نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللَّهُمَّ مَنْ ظَلَمَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ وَأَخَافَهُمْ فَأَخِفْهُ، وَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ"۔

(المعجم الاوسط، ج4ص53، دارالحرمین ، القاهرة)

اسی طرح کی ایک روایت امام طبرانی نے حضرت سائب بن خلاد الانصاری رضی اللہ عنہ سے بھی اس طرح روایت کی ہے:

"اللهُمَّ مَنْ ظَلَمَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ وَأَخَافَهُمْ، فَأَخِفْهُمْ، وَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يَقْبَلُ اللهُ مِنْهُ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا"۔

(المعجم الكبير، ج7ص144، مكتبة ابن تيمية، القاهرة)

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یعنی دعا کی: اے اللہ جس نے اہل مدینہ پر ظلم کیا اور انہیں خوفزدہ کیا تو بھی اسے خوفزدہ کر اس پر اللہ کی لعنت تمام فرشتوں اور انسانوں کی لعنت، نہ اس کی توبہ قبول نہ اس کا فدیہ قبول۔

یہ روایات نقل کرنے کے بعد لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"حضرات سعد ابن ابی وقاص، ابوہریرہ، عمر فاروق، جابر ابن عبداللہ اور عبادہ ابن الصامت، سائب ابن خلاد رضی اللہ عنہم کی روایات کا اولین مصداق یزید ابن معاویہ ہے جیسا کہ آگے تفصیل سے بیان ہوگا"۔

(ملخصاً: استخلاف یزید، صفحہ 382 تا 384)

<u>تبصرہ:</u>

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مندرجہ بالا روایات میں سے کسی ایک میں بھی "یزید بن معاویہ" کا ذکر نہیں

ہے،لٰہذالعل شاہ صاحب کا یہ لکھنا کہ:

"ان روایات کا اولین مصداق یزید بن معاویہ ہے"۔

یہ ان کا اپنا استنباط و اجتہاد ہے، احادیث میں ایسی بات اشارتاً بھی مذکور نہیں اور نہ ہی یہ روایات بیان کرنے والے صحابہ کرام میں سے کسی نے یہ تصریح کی ہے کہ اس سے یزید بن معاویہ مراد ہے۔

غالباً لعل شاہ صاحب کا اشارہ "واقعہ حرّہ" کی جانب ہے کہ اس وقت حاکم وقت یزید بن معاویہ نے مدینہ کے ان لوگوں کے خلاف جو اقدام کیا جنہوں نے بغاوت و خروج کا ارتکاب کیا تھا، تو لعل شاہ صاحب کے خیال میں اس اقدام پر یہ احادیث منطبق ہوتی ہیں۔

یعنی دوسرے لفظوں میں وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ میں رہنے والے تمام لوگ ساری امت سے مستثنیٰ اور معصوم ہیں، اور گر بالفرض اہل مدینہ میں سے کوئی شخص کوئی جرم کرے تو اسے سزا نہیں دی جاسکتی کہ یہ" اسے ڈرانا" شمار ہوگا اور اس پر حدیث میں وعید آئی ہے، حتیٰ کہ اگر مدینہ والے یا ان میں سے کچھ لوگ حکومت وقت کے خلاف خروج و بغاوت بھی کریں اور شہر و ریاست کا نظام درہم برہم کردیں تو بھی ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جاسکتا کہ یہ انہیں ڈرانا شمار ہوگا جسے حدیث میں موجب لعنت عمل قرار دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے ان روایات سے یہ نتیجہ نکالنا بدیہی طور پر درست نہیں، احکام شریعت جیسے دوسرے شہروں کے لوگوں کے لئے ہیں اسی طرح مدینہ والوں کے لئے بھی ہیں، کسی کو اس سے استثنیٰ نہیں۔لٰہذا ان احادیث کا درست اور صحیح مفہوم یہی ہے کہ اہل مدینہ کو بلاوجہ، ناحق اور ظلماً ڈرانے دھمکانے یا ان کے ساتھ برائی کرنے پر یہ وعید ہے۔

اس کی مزید وضاحت کے لئے ہم مختصر طور پر واقعہ حرہ کے اسباب و واقعات کا جائزہ لیتے ہیں، نیز اس بارے میں پھیلائے گئے بے سروپا افسانوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

واقعہ حرہ کا پس منظر

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کی بیعت نہ کرنے والے صحابہ

کرام میں صرف دو صحابیوں یعنی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو سانحہ کربلا (محرم 61ھ) میں شہید ہو گئے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بدستور اپنے موقف پر سختی سے جمے رہے، بدقسمتی سے یزید بن معاویہ کی طرف سے ان کے ساتھ مفاہمت کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں، تاہم ان کے ساتھ تساہل و تسامح کا رویہ اختیار کیا گیا اور واقعہ کربلا کے بعد بھی (واقعہ حرہ تک) حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف حکومت کی طرف سے کسی قابل ذکر اقدام کا کوئی ذکر نہیں ملتا ، اس دوران آپ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، لیکن آپ اپنی حکومت مخالف آراء کا اظہار سر عام فرماتے رہے جس کے نتیجے میں خطۂ حجاز میں بالعموم اور مدینہ منورہ میں بالخصوص کچھ لوگوں کا یہ ذہن بن گیا کہ یزید منصب خلافت کا اہل نہیں ہے اور وہ اس کی ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کے علاوہ پرانے سبائی شر پسندوں نے بھی کار ثواب سمجھ کر یہ افواہ زور و شور سے پھیلائی کہ یزید شراب نوش ہے، اس کے علاوہ بھی خفیہ طور پر یزید کے فرضی مثالب و معائب کو لوگوں میں پھیلایا جا رہا تھا۔

ان تمام باتوں کو سامنے رکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدینہ کی بغاوت اور بنو امیہ کے خلاف ان کا خروج اور یزید بن معاویہ کی نااہلی پر ان کا اصرار، دراصل مکہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت مخالف تحریک کا ایک فطری انعکاس اور اس کے اثر کی توسیع تھی۔ امام بلاذری (م 279ھ) نے اسی واقعہ حرہ پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مطيع أخذ البيعة لابن الزُّبَيْرِ عَلَى أهل الْمَدِينَة حين قدم عَلَيْهِم أهل الشام ليواقعوهم إن خالفوا يَزِيدَ بْنَ مُعَاوِيَة، ثُمَّ إنه فرّ حين ظفر مسلم بْن عُقْبَة، فلحق بابن الزُّبَيْر"۔

یعنی جب شامی فوج مدینہ آئی کہ اگر وہ یزید بن معاویہ کی مخالفت سے باز نہ آئیں تو ان کے خلاف کارروائی کی جائے، تو عبداللہ بن مطیع نے اہل مدینہ سے عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) کے لئے بیعت لی تھی (جو خود اس وقت مکہ میں تھے۔ ناقل)۔ پھر جب مسلم بن عقبہ (بغاوت کے

قلع وقمع میں ۔ناقل) کامیاب ہوگئے تو وہ (عبداللہ بن مطیع) وہاں سے بھاگ کر (مکہ چلے گئے ۔ناقل) اور حضرت ابن الزبیر (رضی اللہ عنہما) سے جا ملے۔

(انساب الاشراف، ج10ص481، دار الفکر بیروت)

اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ان دونوں مخالفتوں کے پس پشت یکساں افکار و خیالات کارفرما تھے جو عوام کے جذبات پر اثر انداز ہو رہے تھے تو یہ کوئی حیران کن بات نہیں ۔پہلے وہ روایت بھی بیان ہو چکی ہے جو امام ابوبکر البیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے حمزہ بن عبداللہ بن عمر کے واسطے سے نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا :

"مَا وَجَدْتُ فِي نَفْسِي مِنْ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ هَذِهِ الْأُمَّةِ مَا وَجَدْتُ فِي نَفْسِي أَنِّي لَمْ أُقَاتِلْ هَذِهِ الْفِئَةَ الْبَاغِيَةَ كَمَا أَمَرَنِي اللهُ عَزَّ وَجَلَّ. زَادَ الْقَطَّانُ فِي رِوَايَتِهِ :قَالَ حَمْزَةُ :فَقُلْنَا لَهُ :وَمَنْ تَرَى الْفِئَةَ الْبَاغِيَةَ؟ قَالَ ابْنُ عُمَرَ:ابْنُ الزُّبَيْرِ بَغَى عَلَى هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ، فَأَخْرَجَهُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ وَنَكَثَ عَهْدَهُمْ "۔

اس امت کے معاملات میں سے کسی معاملے میں مجھے اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا افسوس اس بات پر ہوا کہ میں نے اس باغی گروہ سے قتال کیوں نہ کیا جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے، (حسین بن الفضل) القطّان نے اس میں یہ الفاظ زیادہ بیان کیے ہیں کہ حمزہ کہتے ہیں ہم نے پوچھا کہ آپ کس کو باغی گروہ سمجھتے ہیں؟ تو حضرت ابن عمر نے فرمایا :ابن زبیر (رضی اللہ عنہ) کو، انہوں نے اس قوم کے خلاف بغاوت کی ہے، انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا اور ان کا عہد توڑ دیا.."۔

(السنن الکبری للبیهقی، ج 8ص 298، دار الکتب العلمیة بیروت)

یہ روایت بالکل صحیح ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مدینہ والوں کے اس اقدام کا تعلق حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کی حکومت مخالف تحریک کے ساتھ ہی سمجھتے تھے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس وقت طائف میں تھے جب مدینہ میں بیعت توڑنے کا واقعہ پیش آیا، چنانچہ امام خلیفہ بن خیاط رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں:

" فَحَدَّثني وهب قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي عَن أَيُّوب عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ سَأَلَ عَنهم وَهُوَ بِالطَّائِف فَقيل لَهُ استعملوا عَبْد اللَّهِ بْن مُطِيع عَلَى قُرَيْش وَعبد الله بْن حَنْظَلَة عَلَى الْأَنْصَار فَقَالَ أميران هلك الْقَوْم "۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما طائف میں تھے، وہاں آپ نے اہل مدینہ کے بارے میں پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ اہل مدینہ نے (یزید کی بیعت توڑ کر اور اس کے گورنر کو ہٹا کر) قریش کے لئے عبداللہ بن مطیع اور انصار کے لئے عبداللہ بن حنظلہ کو امیر مقرر کر دیا ہے، تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: دو امیر! اب یہ قوم ہلاک و برباد ہوگی۔

(تاريخ خليفة بن خياط، ص237، دار طيبة، الرياض)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی بعض اہل مدینہ کے اس طرز عمل سے راضی نہ تھے اور اسے ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔

لیکن اہل مدینہ کی بغاوت اور اس کے انجام کا مطالعہ کرتے ہوئے جو بات لامحالہ ذہن میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مخالفت کسی ایک ہدف و مقصد پر ارتکاز سے خالی تھی۔ بس ایک جوش و خروش تھا، بلند بانگ نعرے تھے، مگر ان کے پیچھے کوئی متعین نظام العمل یا منصوبہ نہیں تھا جس کی روشنی میں اس مخالفت اور حکومت کے خلاف خروج کے حدود اربعہ متعین کرنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے راستوں کا تعین کیا جاسکے۔ فوری ردعمل کے تحت پالیسیاں بنتی تھیں، بے نظم و ضبط بھیڑ کے ساتھ منظم اور تجربہ کار سرکاری فوج سے جنگ لڑی گئی، جس کا انجام وہی ہونا تھا جو کہ ہوا۔

بہرحال شروع شروع میں جب مدینہ میں یزید کی حکومت کے خلاف آوازیں اٹھنا شروع ہوئیں تو گورنر مدینہ عثمان بن محمد نے ایک وفد تشکیل دے کر دمشق بھیجا جس میں متعدد اشراف مدینہ شامل تھے، روایات میں آتا ہے کہ یزید نے اس وفد کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور ان کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا، انہیں

انعام واکرام سے نوازا، اس ملاقات کے بعد یہ وفد مدینہ واپس لوٹ گیا، چنانچہ امام خلیفہ بن خیاط نے نقل کیا ہے کہ گورنر مدینہ عثمان بن محمد نے اہل مدینہ کا ایک وفد تشکیل دے کر یزید بن معاویہ کے پاس بھیجا جس میں عبداللہ بن عمرو بن ابی حفص مخزومی، محمد بن عمرو بن حزم انصاری، بنی سراقہ کا ایک آدمی اور عبداللہ بن حنظلہ مع اپنے آٹھ بیٹوں کے بھی شامل تھے، یہ لوگ جب واپس مدینہ آئے تو انہوں نے یزید کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، بلکہ عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ:

"مِمَّن وَفد عَلَى يَزِيد بْن مُعَاوِيَة عَبْد اللَّهِ بْن حَنْظَلَة مَعَه ثَمَانِيَة بَنِينَ لَهُ فَأَعْطَاهُ مائَة ألف وَأعْطى بنيه كل رجل مِنْهُم عشرَة آلَاف دِرْهَم سوى كسوتهم وحملانهم فَلَمَّا قدم عَبْد اللَّهِ بْن حنظلة الْمَدِينَة أَتَاهُ النَّاس فَقَالُوا مَا وَرَاءَك؟ قَالَ أتيتكم من عِنْد رجل وَالله لَو لم أجد إِلَّا بَنِي هَؤُلَاءِ لجاهدته بهم قَالُوا فَإِنَّهُ بلغنَا أَنه أجازك وأكرمك وأعطاك قَالَ قد فعل وَمَا قبلت ذَلِكَ مِنْهُ إِلَّا أَن أتقوى بِهِ عَلَيْهِ وحضض النَّاس فَبَايعُوهُ"۔

یزید بن معاویہ کے پاس جو وفد گیا اس میں عبداللہ بن حنظلہ بھی اپنے آٹھ بیٹوں کے ساتھ شریک تھے، یزید نے انہیں ایک لاکھ درہم عطا کیے اور ان کے ہر بیٹے کو بھی دس دس ہزار درہم دیے، یہ کپڑوں اور دوسرے سامان کے علاوہ تھا، جب عبداللہ بن حنظلہ مدینہ واپس لوٹے تو لوگوں نے پوچھا کہ دمشق کے کیا حالات ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ: میں ایک ایسے آدمی کے پاس سے آیا ہوں کہ میرا کوئی اور ساتھ نہ بھی دے تو میں اپنے ان بیٹوں کو ساتھ لے کر ہی اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ لوگوں نے کہا کہ: ہم نے تو سنا ہے کہ یزید نے آپ لوگوں کا اکرام کیا اور آپ کو انعام وعطا سے نوازا ہے (تو آپ نے اس سے یہ سب کیوں قبول کیا؟) تو عبداللہ بن حنظلہ نے کہا: ہاں اس نے یہ سب کیا ہے، لیکن میں نے اس سے یہ سب اس لئے قبول کیا تاکہ اس مال سے اسی کے خلاف قوت حاصل کروں (یعنی اس مال سے اس کے خلاف لڑنے کی تیاری کروں) پس وہ لوگوں کو یزید کے خلاف ابھارنے لگے اور انہوں نے

(یزید کی بیعت توڑ کر) ان کی بیعت کر لی۔

(تاریخ خلیفة بن خیاط، ص237، دار طیبة، الریاض)

اگرچہ خلیفہ بن خیاط کی یہ روایت بھی واقعہ حرہ کی تفاصیل بیان کرنے والی دیگر روایات کی طرح غیر مستند ہی ہے کیونکہ اس کی سند میں ہے "جوَيْرِية بْن أَسمَاء قَالَ سَمِعت أشياخا من أهل الْمَدِينَة" یعنی راوی جویریہ بن اسماء کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات "مدینہ کے کچھ بوڑھوں سے سنی ہے"، اور یہ "شیوخ" مجہول ہیں، لیکن ہم نے صرف یہ بتانے کے لئے نقل کی ہے کہ کتب تاریخ میں اہل مدینہ کے وفد کا یزید کے پاس جانا اور یزید کا اس وفد میں شامل اہل مدینہ کا اکرام کرنا اور انہیں انعام سے نوازنا بھی منقول ہے جس کا ذکر اکثر نہیں کیا جاتا۔

البتہ ان روایات کا سب سے حیرت ناک حصہ وہ ہے جس میں ذکر ہے کہ یہ لوگ واپس آ کر یزید کی مذمت کرنے لگے اور مدینہ پہنچنے کے بعد انہوں نے علانیہ یزید کو سب وشتم کرنا شروع کر دیا اور اس کی بیعت توڑنے کی باتیں کرنے لگے، اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی واپس مدینہ آ کر یہ نہیں کہا کہ "ہم نے خود یزید کو فلاں فسق وفجور یا مثلاً شراب نوشی یا بدکاری کرتے دیکھا ہے"، اس لئے، جب یزید کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بھی حیران ہوا کہ میں نے تو ان لوگوں کا اکرام کیا اور انہوں نے واپس جا کر میرے خلاف محاذ بنا لیا (یاد رہے ایسی تمام روایات جن میں ذکر ہے کہ ان لوگوں نے یزید پر شراب نوشی یا بدکاری وغیرہ کا الزام لگایا، ان میں سے کوئی بھی مستند اور صحیح نہیں)۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سنہ 63ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فَفِيهَا كَانَتْ وَقْعَةُ الْحَرَّةِ، وَكَانَ سَبَبُهَا أَنَّ أَهْلَ الْمَدِينَةِ لَمَّا خَلَعُوا يَزِيدَ، وَوَلَّوْا عَلَى قُرَيْشٍ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مُطِيعٍ، وَعَلَى الْأَنْصَارِ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ حَنْظَلَةَ بْنِ أَبِي عَامِرٍ وَعَلَى قَبَائِلِ الْمُهَاجِرِينَ مَعْقِلَ بْنَ سِنَانٍ الْأَشْجَعِيَّ، فَلَمَّا كَانَ فِي أَوَّلِ هَذِهِ السَّنَةِ أَظْهَرُوا ذَلِكَ، وَاجْتَمَعُوا عِنْدَ الْمِنْبَرِ، وَجَعَلَ الرَّجُلُ مِنْهُمْ يَقُولُ: قَدْ خَلَعْتُ يَزِيدَ كَمَا خَلَعْتُ عِمَامَتِي هَذِهِ، وَيُلْقِيهَا عَنْ رَأْسِهِ، وَيَقُولُ الْآخَرُ: قَدْ خَلَعْتُهُ كَمَا

خَلَعْتُ نَعْلِي هَذِهِ، حَتَّى اجْتَمَعَ شَيْءٌ كَثِيرٌ مِنَ الْعَمَائِمِ وَالنِّعَالِ هُنَاكَ، ثُمَّ اجْتَمَعُوا عَلَى إِخْرَاجِ عَامِلِ يَزِيدَ مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِهِمْ، وَهُوَ عُثْمَانُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ ابْنُ عَمِّ يَزِيدَ، وَعَلَى إِجْلَاءِ بَنِي أُمَيَّةَ مِنَ الْمَدِينَةِ، فَاجْتَمَعَتْ بَنُو أُمَيَّةَ وَهُمْ قَرِيبٌ مِنْ أَلْفِ رَجُلٍ فِي دَارِ مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ، وَأَحَاطَ بِهِمْ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يُحَاصِرُونَهُمْ، وَاعْتَزَلَ النَّاسَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ زَيْنُ الْعَابِدِينَ، وَكَذَلِكَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ لَمْ يَخْلَعْ يَزِيدَ، وَلَا أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ، وَقَدْ قَالَ ابْنُ عُمَرَ لِأَهْلِهِ: لَا يَخْلَعَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ يَزِيدَ فَيَكُونَ الْفَيْصَلُ وَيُرْوَى: الصَّيْلَمُ بَيْنِي وَبَيْنَهُ، وَسَيَأْتِي هَذَا الْحَدِيثُ بِلَفْظِهِ وَإِسْنَادِهِ فِي تَرْجَمَةِ يَزِيدَ، وَأَنْكَرَ عَلَى أَهْلِ الْمَدِينَةِ فِي مُبَايَعَتِهِمْ لِابْنِ مُطِيعٍ وَابْنِ حَنْظَلَةَ عَلَى الْمَوْتِ، وَقَالَ: إِنَّمَا كُنَّا نُبَايِعُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَنْ لَا نَفِرَّ- وَكَذَلِكَ لَمْ يَخْلَعْ يَزِيدَ أَحَدٌ مِنْ بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَقَدْ سُئِلَ مُحَمَّدُ ابْنُ الْحَنَفِيَّةِ فِي ذَلِكَ، فَامْتَنَعَ مِنْ ذَلِكَ وَأَبَى أَشَدَّ الْإِبَاءِ، وَنَاظَرَهُمْ وَجَادَلَهُمْ فِي يَزِيدَ وَرَدَّ عَلَيْهِمْ مَا اتَّهَمُوهُ بِهِ مِنْ شُرْبِهِ الْخَمْرَ وَتَرْكِهِ بَعْضَ الصَّلَوَاتِ، كَمَا سَيَأْتِي مَبْسُوطًا فِي تَرْجَمَةِ يَزِيدَ قَرِيبًا، إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى- وَكَتَبَ بَنُو أُمَيَّةَ إِلَى يَزِيدَ بِمَا هُمْ فِيهِ مِنَ الْحَصْرِ وَالْإِهَانَةِ، وَالْجُوعِ وَالْعَطَشِ، وَأَنَّهُ إِنْ لَمْ يَبْعَثْ إِلَيْهِمْ مَنْ يُنْقِذُهُمْ مِمَّا هُمْ فِيهِ وَإِلَّا اسْتُؤْصِلُوا عَنْ آخِرِهِمْ..."-

(خلاصہ) اس سال (یعنی 63ھ) میں واقعہ حرہ ہوا، اس کی وجہ یہ بنی کہ اہل مدینہ نے یزید بن معاویہ کی بیعت توڑ دی اور (مدینہ میں بسنے والے) قریش پر عبداللہ بن مطیع، انصار پر عبداللہ بن حنظلہ ابن ابی عامر اور مہاجرین کے قبائل پر حضرت معقل بن سنان اشجعی کو امیر مقرر

کر دیا۔اور جب شروع میں انہوں نے اس بات کا اعلان کیا تو وہ منبر کے پاس جمع ہوئے تو ان میں سے ایک آدمی کہتا کہ میں نے یزید کو ایسے اتار دیا (یعنی اس کی بیعت ایسے اتار دی) جیسے میں نے اپنے سر سے یہ پگڑی اتار دی، اور پھر اپنے سر سے پگڑی اتار کر (زمین پر) ڈال دیتا۔اور دوسرا آدمی کہتا کہ میں نے یزید کی بیعت ایسے اتار پھینکی جیسے میں نے اپنے پاؤں سے اپنی یہ جوتی اتار دی۔یوں وہاں کافی ساری پگڑیاں اور جوتیاں جمع ہوگئیں۔پھر انہوں نے اکٹھے ہو کر فیصلہ کیا کہ یزید کے عامل (مدینہ کے گورنر) عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو جو کہ یزید کا چچا زاد بھائی تھا، اسے نکال دیا جائے، اور (مدینہ میں موجود) بنی امیہ کو بھی مدینہ سے باہر نکال دیا جائے۔تو (مدینہ میں موجود) بنو امیہ کے لوگ جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی، مروان بن الحکم کی حویلی میں اکٹھے ہو گئے۔مدینہ والوں نے گھیراؤ کرتے ہوئے ان کا محاصرہ کرلیا۔البتہ حضرت علی بن حسین (زین العابدین) ان لوگوں سے الگ رہے (ان کے ساتھ شامل نہ ہوئے)، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر نے بھی یزید کی بیعت نہ خود توڑی، نہ ان کے گھر والوں میں سے کسی نے توڑی، حضرت ابن عمر نے تو اپنے خاندان والوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی بھی یزید کی بیعت نہ توڑے، (اگر کسی نے ایسا کیا تو) میرے اور اس کے درمیان فیصلہ کن بات ہوگی۔ایک روایت ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) میرے اور اس کے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔یہ حدیث الفاظ و سند کے ساتھ آگے یزید کے تعارف میں آئے گی۔اور اہل مدینہ نے جو ابن مطیع اور ابن حنظلہ کی موت پر بیعت کی تھی، اس پر حضرت ابن عمر نے ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ (ہم نبی کریم ﷺ سے موت پر بیعت نہیں کیا کرتے تھے بلکہ) اس بات پر بیعت کیا کرتے تھے کہ ہم راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔ اسی طرح بنو عبدالمطلب میں سے بھی کسی نے یزید کی بیعت نہیں توڑی تھی۔جب حضرت محمد بن حنفیہ سے سوال کیا گیا (یعنی بیعت توڑنے میں ساتھ دینے کا کہا گیا) تو آپ اس سے رکے رہے اور سختی کے ساتھ انکار کیا (اور ایسا مطالبہ کرنے والوں) کے ساتھ یزید کے بارے میں مناظرہ و مجادلہ کیا اور ان لوگوں نے جو یزید پر شراب نوشی اور بعض مرتبہ نماز ترک کرنے کے

الزامات لگائے تھے ان کا بھی جواب دیا اور رد کیا، جیسا کہ یزید کے تعارف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا ان شاء اللہ۔ تو (محصور) بنو امیہ نے یزید کو خط لکھ کر اپنے محصور ہونے، توہین آمیز سلوک کیے جانے اور بھوک و پیاس کا شکار ہونے کے بارے میں مطلع کیا، اور لکھا کہ اگر ان کو بچانے کے لئے کوئی نجات دہندہ نہ بھیجا گیا تو وہ نیست نابود ہو جائیں گے...."۔

(البداية والنهاية، ج8ص307و 308، وزارة الاوقاف قطر)

ایک مقام پر حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

"وَقَدْ كَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَجَمَاعَاتُ أَهْلِ بَيْتِ النُّبُوَّةِ مِمَّنْ لَمْ يَنْقُضِ الْعَهْدَ، وَلَا بَايَعَ أَحَدًا بَعْدَ بَيْعَتِهِ لِيَزِيدَ" ۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) اور اہل بیت نبوت کی جماعتیں ان لوگوں میں شامل تھیں جنہوں نے عہد نہیں توڑا تھا اور نہ یزید کی بیعت کے بعد انہوں نے کسی کی بیعت کی تھی۔

(البداية والنهاية، ج8ص328،وزارة الاوقاف قطر)

مزید لکھتے ہیں :

"وَقَالَ أَبُو جَعْفَرٍ الْبَاقِرُ: لَمْ يَخْرُجْ أَحَدٌ مِنْ آلِ أَبِي طَالِبٍ وَلَا مِنْ بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ أَيَّامَ الْحَرَّةِ، وَلَمَّا قَدِمَ مُسْلِمُ بْنُ عُقْبَةَ الْمَدِينَةَ أَكْرَمَ أَبِي وَأَدْنَى مَجْلِسَهُ، وَأَعْطَاهُ كِتَابَ أَمَانٍ"۔

ابو جعفر باقر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ واقعہ حرہ کے دنوں میں آل ابی طالب اور بنی عبدالمطلب میں سے کسی نے بھی خروج نہیں کیا تھا، اور جب مسلم بن عقبہ مدینہ آئے تو انہوں نے میرے والد (یعنی زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ) کا اکرام کیا اور انہیں اپنے قریب بٹھایا اور انہیں امان کا خط دیا۔

(البداية والنهاية،ج8ص329، وزارة الاوقاف قطر)

علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے:

"فَلَمَّا كَانَ هَذِهِ السَّنَةُ أَخْرَجَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ عُثْمَانَ بْنَ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي

سُفْيَانَ عَامِلَ يَزِيدَ وَحَصَرُوا بَنِي أُمَيَّةَ (بَعْدَ بَيْعَتِهِمْ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ حَنْظَلَةَ. فَاجْتَمَعَ بَنُو أُمَيَّةَ) وَمَوَالِيهِمْ وَمَنْ يَرَى رَأْيَهُمْ فِي أَلْفِ رَجُلٍ حَتَّى نَزَلُوا دَارَ مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ. فَكَتَبُوا إِلَى يَزِيدَ يَسْتَغِيثُونَ بِهِ..."

"اس سال (یعنی 63ھ) میں مدینہ والوں نے یزید کے گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو (مدینہ سے) نکال دیا اور حضرت عبداللہ بن حنظلہ کی بیعت کرنے کے بعد (مدینہ میں موجود) بنی امیہ کا محاصرہ کرلیا تو بنو امیہ اور ان کے موالی و ہمنوا جن کی تعداد ایک ہزار (کے قریب) تھی وہ مروان بن الحکم کی حویلی میں جمع ہو گئے اور انہوں نے یزید کو خط لکھ کر مدد طلب کی.."۔

(الكامل في التاريخ، ص529، بيت الافكار الدولية،السعودية)

آگے لکھتے ہیں:

"وَأَمَّا مُسْلِمٌ فَإِنَّهُ أَقْبَلَ بِالْجَيْشِ فَبَلَغَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ خَبَرُهُمْ. فَاشْتَدَّ حِصَارُهُمْ لِبَنِي أُمَيَّةَ بِدَارِ مَرْوَانَ، وَقَالُوا: وَاللَّهِ لَا نَكُفُّ عَنْكُمْ حَتَّى نَسْتَنْزِلَكُمْ وَنَضْرِبَ أَعْنَاقَكُمْ أَوْ تُعْطُونَا عَهْدَ اللَّهِ وَمِيثَاقَهُ أَنْ لَا تَبْغُونَا غَائِلَةً، وَلَا تَدُلُّوا لَنَا عَلَى عَوْرَةٍ، وَلَا تُظَاهِرُوا عَلَيْنَا عَدُوًّا، فَنَكُفَّ عَنْكُمْ وَنُخْرِجَكُمْ عَنَّا فَعَاهَدُوهُمْ عَلَى ذَلِكَ فَأَخْرَجُوهُمْ مِنَ الْمَدِينَةِ"۔

جب مدینہ والوں کو پتہ چلا کہ مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں لشکر آرہا ہے تو انہوں نے مروان کی حویلی میں محصور بنو امیہ کا محاصرہ زیادہ سخت کر دیا اور ان سے کہا کہ ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے اور قتل کر دیں گے یا (اگر بچنا چاہتے ہو) تو اللہ کا نام لے کر وعدہ کرو کہ ہمارا کوئی راز کسی کو نہیں بتاؤ گے، اور نہ ہی ہم پر چڑھائی کرنے والے کسی دشمن کی مدد کرو گے، تو اس صورت میں ہم تمہیں چھوڑ دیں گے اور یہاں سے نکال دیں گے۔ چنانچہ جب ان (محصورین) نے

انہیں یہ عہد دیا تو ان لوگوں نے انہیں (بلا قتل وسزا) مدینہ سے نکال دیا۔

(ایضاً ص530)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ:

1) واقعہ حرہ کا سبب کچھ لوگوں کا (جنہوں نے پہلے یزید کی بیعت کی ہوئی تھی)، اپنی بیعت توڑنا بنا۔

2) ان لوگوں نے نہ صرف بیعت توڑی، بلکہ مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ مدینہ کے عامل کو بھی مدینہ سے نکال دیا۔

3) ان لوگوں نے اپنی طرف سے اپنے الگ امیر مقرر کردیے۔

4) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان و متعلقین نے ان کا ساتھ نہیں دیا، نہ ہی حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی بات مانی، بلکہ انہوں نے ان لوگوں کے ساتھ مناظرہ ومجادلہ کیا اور انہوں نے جو یزید پر الزامات لگائے تھے ان کا رد فرمایا۔

5) اہل بیت نبوت، بنو عبد المطلب اور آل ابی طالب میں سے بھی کسی فرد نے ان بیعت توڑنے والوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

4) ان لوگوں نے مدینہ میں موجود بنی امیہ کا گھیراؤ اور محاصرہ کیا، انہیں ڈرایا دھمکایا اور پھر انہیں مدینہ سے نکال دیا۔

لہٰذا اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا، مدینہ کے ان لوگوں کی طرف سے ہوئی جنہوں نے یہ سب کام کیے اور واقعہ حرہ کی سب سے پہلی ذمہ داری انہی پر آتی ہے۔

اب بتایا جائے، کیا یہ بنی امیہ اور ان کے ہمنوا، جن کی تعداد ہزار کے قریب بتائی گئی ہے (جو اس وقت کے مدینہ کی آبادی کے لحاظ سے بہت بڑی تعداد ہے) کیا یہ "اہل مدینہ" نہیں تھے؟ تو اب لعل شاہ صاحب کی طرف سے پیش کردہ وہ احادیث جن میں اہل مدینہ کو ڈرانے والوں کے لئے وعید کا بیان ہے، اگر ان کا کوئی مدمقابل ان احادیث کا مصداق ان لوگوں کو بتائے جنہوں نے بیعت توڑی، قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت وخروج کیا، ایک ہزار کے قریب اہل مدینہ کو محصور کیا، انہیں ڈرایا دھمکایا اور پھر مدینہ سے نکال دیا تو اس کو کس طرح جواب دیا جاسکتا ہے؟

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ ان احادیث میں بیان کردہ وعید کا تعلق اس صورت کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی بلاسبب اہل مدینہ کو ڈرائے دھمکائے اور ان پر ظلم کرے، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ اہل مدینہ کو استثناء حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرتے رہیں، حتیٰ کہ بغاوت وخروج بھی کریں تو ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی اور نہ انہیں ڈرایا جاسکتا ہے، اور یہ بات باطل ہے۔ شریعت کے احکام جس طرح دوسرے لوگوں پر نافذ ہوتے ہیں، اسی طرح اہل مدینہ پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مدینہ کے جن لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ کر اس کے خلاف بغاوت کی، اس کی بھی کوئی ٹھوس وجہ تو رہی ہوگی؟ تو ہمارے خیال میں اس کا پس منظر دراصل یہ ہوا کہ سنہ 35 ہجری میں تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہونے والا فتنہ ہزاروں لوگوں کی جان لینے کے بعد آخرکار حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین صلح اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق کے بعد وقتی طور پر ختم ہوچکا تھا، تمام سازشی عناصر زیر زمین چلے گئے تھے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان سازشیوں نے پھر سر اٹھانا شروع کیا، پہلے انہوں نے عراق سے خطوط لکھ کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں استعمال کرنا چاہا، لیکن جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق پہنچ کر اصل حقیقت کا علم ہوا تو انہوں نے (صحیح روایت کے مطابق) یزید کے پاس جانے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ رکھنے کی بات فرمائی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی اور کربلا کا سانحہ ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس کے بعد حکومت وقت نے ان سازشیوں کا ناطقہ بند کردیا اور ان کی کڑی نگرانی شروع کردی گئی لیکن یہ لوگ پھر شرانگیزی کے لئے موقع کی تلاش میں رہے، چنانچہ سنہ 63ھ میں انہی لوگوں کی سازش کی وجہ سے حالات یہاں تک پہنچے کہ مدینہ کے کچھ لوگوں نے مدینہ منورہ کے عامل عثمان بن محمد سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور سمجھانے بجھانے کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے، عامل مدینہ نے ان کی شکایت خلیفہ وقت یزید سے کی، جس کے ردعمل میں ان لوگوں نے یزید کے خلاف بے سروپا باتیں پھیلانا شروع کردیں اور یزید پر شراب نوشی وحرام کاری جیسے اتہامات مشہور کرنے لگے، ان لوگوں نے اتنا شدید پروپیگنڈا کیا کہ مدینہ کے کچھ بھولے بھالے سادہ لوح لوگ بھی اس کا شکار ہوگئے۔ بالکل اس طرح جیسے لعل شاہ صاحب نے

خلیفہ راشد سوم سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"....اس تنظیم کا بانی اور اس تحریک کا اولین محرک عبداللہ بن سبا تھا جو ایک یہودی تھا اور محض فتنہ پردازی کے لئے اسلام قبول کیا اور قلب میں نفاق کو پوشیدہ رکھا، امت مسلمہ میں افتراق و شقاق کا پیدا کرنا اس کا نصب العین تھا، جن کے دلوں میں کدورت تھی وہ اس کے گرد جمع ہو گئے، اس میں شک نہیں کہ بعض مخلص اصحاب بھی اس کے زہریلے پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے جس طرح حضرت مسطح رضی اللہ عنہ اور حسان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ (رضی اللہ عنہا) کے خلاف منافقین کے بپا کردہ طوفان افک و بہتان کے آتشیں شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 19 و 20)

آخر کار مدینہ میں ایک جماعت بن گئی اور انہوں نے کبار صحابہ کے منع کرنے کے باوجود یزید کی بیعت توڑ دی اور صرف اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ مدینہ کے عامل عثمان بن محمد کو مدینہ سے نکال دیا اور مدینہ میں موجود بنو امیہ کا محاصرہ کر لیا اور پھر انہیں بھی مدینہ سے نکلنے پر مجبور کیا، یوں مدینہ میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا گیا۔

بہر حال حکومت وقت نے ان لوگوں کو متنبہ کیا کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آ جائیں ورنہ ان کے خلاف فوجی طاقت کا استعمال کیا جائے گا لیکن اس کے باوجود یہ لوگ باز نہ آئے، بالآخر مجبوراً ان کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی تا کہ بغاوت کا خاتمہ کر کے مدینہ میں خوف و دہشت کے ماحول کا خاتمہ کیا جائے اور امن و امان قائم کیا جائے۔

خلیفہ وقت، یزید بن معاویہ کی ہدایت کے مطابق یہ کارروائی صرف ان لوگوں کے خلاف تھی جو خروج اور بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ یزید نے حکم دیا تھا کہ مدینہ میں تین دن تک لوٹ کھسوٹ، زنا کاری اور حرامکاری کا بازار گرم کیا جائے، یہ انہی شر پسندوں کی پھیلائی باتیں ہیں جن کی سازشوں کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا، ورنہ یزید کا ان باتوں کا حکم دینا قابل اعتماد سندوں سے ثابت نہیں، اور تین دن

تک مدینہ کی اباحت والی بات اگر تسلیم بھی کرلی جائے تو بھی اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ یزید نے حکم دیا تھا کہ خروج کرنے والوں اور باغیوں کو پہلے سمجھایا جائے کہ وہ اپنی بغاوت سے باز آجائیں، اور اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہیں تو پھر ان کے خلاف کارروائی کے لیے صرف تین دن ہیں، تین دنوں میں یہ کاروائی مکمل کرلی جائے اور مدینہ میں امن وامان قائم کردیا جائے، جسے کچھ افسانہ نگاروں نے یہ بنادیا کہ یزید نے تین دن تک مدینہ میں لوٹ مار، قتل عام اور مدینہ کی مستورات کی عزتیں تار تار کرنے کو حلال قرار دے دیا تھا۔ یہ لوگ یہ بھی نہیں سوچتے کہ باغیوں کے خلاف یہ کاروائی کرنے والی فوج بھی مسلمانوں کی تھی، اور مسلمان بھی دور صحابہ اور خیر القرون کے، وہ کافروں کی فوج نہ تھی۔

الغرض! ہمارے خیال میں واقعہ حرہ کے پیچھے دراصل انہی لوگوں کا ہاتھ تھا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے درمیان خون ریزی کے لیے سازشیں کرتے رہے تھے، واقعہ حرہ میں بھی ان کا مقصد مسلمانوں کو آپس میں لڑانا تھا، یہ وہی لوگ تھے جو اس سے پہلے بھی کئی بار ایسی سازشیں کرچکے تھے اور جس کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہہ چکا تھا، چنانچہ صحیح روایات میں آتا ہے کہ جب شام سے آنے والی فوج ان خروج کرنے والوں کے خلاف کاروائی کے لیے پہنچی تو ان کا مدینہ میں داخل ہونا مشکل معلوم ہو رہا تھا، لیکن اہل مدینہ میں سے ہی بنو حارثہ کے کچھ لوگوں نے ان کی مدینہ کے اندر داخل ہونے میں مدد کی تاکہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا خون بہائیں، اسی طرح ہمیں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے جو امام خلیفہ بن خیاط بصری رحمۃ اللہ علیہ (م 240ھ) نے اپنی مکمل سند کے ساتھ بیان کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں :

"حَدَّثَنَا وهب بْن جرير قَالَ نَا أَبُو عقيل الدَّوْرَقِي قَالَ سَمِعت أَبَا نَضرة يحدث قَالَ دخل أَبُو سعيد الْخُدْرِيّ يَوْم الْحرَّة غاراً فَدخل عَلَيْهِ رجل ثمَّ خرج فَقَالَ لرجل من أهل الشَّام أدلُّك عَلَى رجل تقتله فَلَمَّا انْتهى الشَّامي إِلَى بَاب الْغَار وَقَالَ لأبي سعيد وَفِي عُنق أَبِي سعيد السَّيْف أُخْرُج إِلَيّ قَالَ لَا وَإِن تدخل عَلَيّ أَقْتلك فَدخل الشَّامي فَوضع أَبُو سعيد السَّيْف وَقَالَ بوء بإثمي وإثمك وَكن من أَصْحَاب النَّار وَذَلِكَ جَزَاء الظَّالِمين فَقَالَ أَبُو سعيد الْخُدْرِيّ أَنْت

قَالَ نعم قَالَ فَاسْتَغْفِر لِي قَالَ غفر الله لَكَ" ۔

(حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے ساتھی) ابونضرۃ (جن کا نام" منذر بن مالک" ہے) کہتے ہیں کہ حرہ کے دن ابوسعید خدری ایک غار کے اندر داخل ہو گئے، ایک شخص غار میں ان کے پاس آیا اور پھر باہر نکل گیا، اور باہر نکل کر ایک شامی فوجی سے کہا: میں تمہیں ایک شخص کے بارے میں بتاتا ہوں تم اسے قتل کر دو، پس جب وہ شامی فوجی غار کے دروازے پر پہنچا اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے کہا جن کی گردن میں تلوار لٹکی ہوئی تھی: باہر نکلو!، ابوسعید نے کہا: میں نہیں نکلوں گا اور اگر تم نے اندر آنے کی کوشش کی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا، پھر شامی فوجی غار کے اندر داخل ہو گیا تو حضرت ابوسعید نے اپنی تلوار ایک طرف رکھ دی اور فرمایا: میرے اور اپنے گناہ اپنے سر لا دلو اور جہنمیوں میں سے ہو جاؤ، ظالموں کا یہی بدلہ ہے (یعنی اگر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو کر ڈالو) اس کے بعد شامی فوجی بول پڑا: ابوسعید خدری! یہ آپ ہیں؟، ابوسعید نے فرمایا: جی ہاں! اس پر شامی فوجی نے ان سے گذارش کی کہ میرے لئے مغفرت کی دعا کریں، چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے دعا فرمائی اور کہا کہ اللہ تیری مغفرت کرے۔

(تاریخ خلیفة بن خیاط، ص 239، مؤسسة الرسالة بیروت، واسناده صحیح)

یہ واقعہ لعل شاہ صاحب نے بھی" البدایۃ والنہایۃ" کے حوالے سے نقل کیا ہے (استخلاف یزید، صفحہ 386)، بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ اس شامی فوجی کو مدینہ میں رہنے والے ایک مقامی آدمی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے قتل پر ابھارا تھا، اور اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ جب اس شامی فوجی کو معلوم ہوا کہ سامنے صحابی رسول ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں تو اس نے انہیں کچھ نہیں کہا بلکہ ان سے دعا کروائی۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ اہل مدینہ کے اس گروہ کے اندر سبائی پارٹی کے ارکان چھپے ہوئے ہوں جو افواہوں اور جھوٹی خبروں کا بازار گرم کر کے اور پروپیگنڈے کی طاقت پر ہر صورت میں قتل وغارت کروانا چاہتے تھے، یہی گروہ ایسی ہی حرکت جمل وصفین کی جنگوں میں بھی کر چکا تھا، ہم اسی گروہ کو واقعہ حرہ کا اصل ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

لیکن یزید کے خلاف اس خروج و بغاوت کی جو وجہ مشہور کی گئی وہ یہ تھی کہ یزید شرابی اور بدکار ہو گیا

ہے، جبکہ ان میں سے کوئی بات بھی شرعی اصول اور ضابطہ شہادت کے مطابق ثابت نہیں، اہل مدینہ کا جو وفد یزید سے ملاقات کے لئے دمشق گیا تھا اس سے متعلق روایات میں کہیں بھی اس وفد کے سامنے یزید کی شراب نوشی کا کوئی ذکر نہیں ملتا، پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یزید اگر بالفرض شرابی تھا بھی تو اتنا احمق نہیں تھا کہ وفد کے لوگ جو اس کے جائزے کے لئے ہی وہاں آئے تھے، انہی کے سامنے شراب نوشی کرے۔ اسے معلوم تھا کہ اس وفد میں مدینہ کے اشراف و اخیار لوگ آرہے ہیں، ایسے میں ایک عام دنیاوی بادشاہ سے بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مہمانوں کے سامنے بتکلف ہی سہی، ایسے خلیفہ کا کردار نبھائے جو عقل منداور دوراندیش ہو، یہی یزید نے بھی کیا تھا، اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ وفد کا استقبال کیا۔ پورے ادب و احترام سے پیش آیا اور ان کے اکرام و اعزاز میں مبالغے سے کام لیا۔ یزید کا یہ عمل تقریباً تمام تاریخی روایات میں درج ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ اس وقت کے حالات میں یزید کو یہی کرنا چاہیئے تھا اور اس نے یہی کیا۔

ایسے میں یہ بات بھلا کیسے عقل میں آسکتی ہے کہ یزید نے ان لوگوں کے سامنے علانیہ شراب نوشی کی اور اس حد تک نشہ میں دھت ہوگیا کہ نماز کا وقت فوت ہوگیا اور وہ فرض نماز نہیں پڑھ سکا۔ پھر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وفد کی ملاقات یزید کے ساتھ صرف ایک بار ہوئی اور وہ بھی بہت کم وقت کے لئے، ایسے میں وفد کے لوگوں نے کیسے جان لیا کہ یزید نے شراب پی رکھی ہے اور اس سے ایک نماز فوت ہوگئی ہے؟ اگر یزید کے بارے میں یہ ثابت ہوتا کہ وہ دماغی طور پر کچھ کھسکا ہوا ہے اور تاریخی مصادر میں ایسی مستند روایتیں ملتیں کہ پاگل پن میں اس نے وفد کے سامنے ہی شراب پی، تب تو شاید ہم کسی حد تک یہ مان لیتے، مگر جب نہ یزید کا پاگل پن ثابت ہے اور نہ تاریخی روایات میں وفد کے سامنے اس کی شراب نوشی کا کہیں ذکر ہے، تو کیسے مان لیا جائے کہ یہ الزام سچا ہے؟ وہ مسلمانوں کا خلیفہ تھا اور اس کے منصب کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے ہر عمل اور تصرف پر کڑی نگاہ رکھے کیونکہ پوری امت کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ بالخصوص وفد مدینہ کے سامنے تو اسے انتہائی احتیاط کی ضرورت تھی، اس وقت حالات کشیدہ تھے اور اس کی چھوٹی سی بے احتیاطی کو پورا پہاڑ بنایا جاسکتا تھا، ایسے میں کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ یزید ان تمام نزاکتوں کو بھلا کر یہ حماقت کرے کہ سب کے سامنے شراب نوشی کرے، طنبورے بجائے اور طوائفوں کو نچائے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے برعکس ایسے بہت سے قرائن موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یزید پر لگایا جانے والا یہ الزام بالکل بے بنیاد اور غلط ہے۔ اہل مدینہ

کے کچھ لوگوں کی بغاوت اور خروج کے پیچھے محرک حقیقی کم از کم اس بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

رہی یہ بات کہ چلو ان باتوں کی شرعی شہادت بھلے نہ ہو، وفد مدینہ والوں نے اسے یہ سب کرتے بے شک نہ دیکھا ہو، لیکن کچھ لوگوں (مثلاً عبداللہ بن مطیع) نے تو یہ بات کی تھی اور وہ ان الزامات کو سچ سمجھتے تھے، تو عرض ہے کہ اول تو ایسی کوئی روایت ضعف سے خالی نہیں جس میں یزید پر ایسے الزامات کا ذکر ہے، بلکہ جن روایتوں میں یزید کے بارے میں شراب نوشی اور ترک نماز وغیرہ کی تہمت ذکر ہوئی ہے ان کی سند کا جائزہ لیا جائے تو آخری راوی کوئی ایسا شخص نکلتا ہے جس کا اہل مدینہ کی بغاوت، معرکۂ حرہ اور اس کے نتائج وعواقب سے دور دور تک کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت نہ مدینے میں موجود تھا کہ وہاں کے حالات جانتا ہوتا، نہ دمشق میں رہتا تھا کہ یزید کی دینی واخلاقی حالت کی اسے خبر ہوتی، بلکہ وہ سرے سے اس زمانے میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ثانیاً اگر بالفرض ایسی کوئی روایت صحیح بھی ہو کہ مدینہ کے لوگوں نے یزید پر ایسے الزامات لگائے، تو عرض ہے کہ غلط فہمی ہو جانا صحابیت کے خلاف نہیں، مثلاً واقعہ افک میں منافقین کی طرف سے کیے گئے پروپیگنڈے نیز سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کیے گئے سبائی پروپیگنڈے سے بعض صحابہ کا متأثر ہونا لعل شاہ صاحب کو بھی مسلم ہے (جس کا حوالہ پہلے نقل کیا گیا)، پھر ان حضرات سے بھی مستند اور قابل اعتماد طریقے سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے یزید کے خلاف کوئی عینی شہادت پیش کی ہو، بلکہ تاریخی روایات کے مطابق تو عبداللہ بن مطیع نے حضرت محمد بن حنفیہ کے ساتھ اپنی بات چیت میں صاف اقرار کیا تھا کہ "ہم نے یزید کو یہ کام کرتے خود نہیں دیکھا"، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی اور کی بات پر بھروسہ کیا تھا اور اسے اپنے خیال میں سچ سمجھا تھا (بشرط صحت روایت)۔ لہٰذا اس پورے فتنہ کے ذمہ دار وہ ہیں جنہوں نے یزید کے بارے میں اتنا زبردست پروپیگنڈا کیا کہ کچھ بھولے بھالے حضرات بھی اس سے متأثر ہو گئے اور غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ قصہ مختصر! حکومت وقت کی یہ کاروائی تمام اہل مدینہ یا مدینہ کی بزرگ شخصیات کے خلاف نہ تھی بلکہ صرف خروج اور بغاوت کرنے والوں کے خلاف تھی، اور باغیوں کے خلاف حکومت وقت کا اقدام کوئی جرم نہیں، آئیے "اطاعت امیر" اور "امیر کے خلاف خروج کرنے والوں" کے بارے میں چند نبوی ارشادات پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔

❀❀❀

اطاعتِ امیر اور حاکم کے خلاف خُروج کے بارے میں نبوی ارشادات اور جمہور اہل سنت کا موقف

"...عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِسْمَعُوا وَأَطِيعُوا، وَإِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ، كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيبَةٌ"۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : حکم مانو اور اطاعت کرو، اگر چہ تم پر ایک ایسا حبشی غلام ہی حاکم کیوں نہ بنا دیا جائے جس کا سر انگور کے خشک دانے کی طرح ہو۔

(صحيح البخاري، كتاب الاحكام ـ باب السمع والطاعة للامام ما لم تكن معصية)

"...عَنْ أَبِي ذَرٍّ، قَالَ: إِنَّ خَلِيلِي أَوْصَانِي أَنْ أَسْمَعَ وَأُطِيعَ، وَإِنْ كَانَ عَبْدًا مُجَدَّعَ الْأَطْرَافِ، وَحَدَّثَنَاهُ ابْنُ بَشَّارٍ، حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ مَهْدِيٍّ، عَنْ شُعْبَةَ، بِهَذَا الْإِسْنَادِ، وَقَالَ: عَبْدًا حَبَشِيًّا"۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ : میرے خلیل (یعنی رسول اللہ ﷺ) نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ میں حکم مانوں اور اطاعت کروں، اگر چہ وہ ایسا غلام ہو جس کے کچھ اعضاء کٹے ہوئے ہوں، (ایک روایت میں حبشی غلام کے لفظ ہیں)۔

(صحيح مسلم، باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية)

"...عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ يَرْوِيهِ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا فَكَرِهَهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ يُفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَيَمُوتُ، إِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً"۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا : جو شخص اپنے امیر میں ایسی چیز دیکھے جو اسے ناگوار گذرے تو اسے چاہیے کہ صبر کرے، کیونکہ جو شخص بالشت بھر

جماعت سے الگ ہوا اور اسے اسی حال میں موت آگئی تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(صحيح البخاري، كتاب الاحكام ۔باب السمع والطاعة للامام ما لم تكن معصية)

"....عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ، فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا"۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر دو خلیفوں کے لیے (ایک ہی وقت) بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو۔

(صحيح مسلم، باب اذا بُويع لخليفتين)

"...عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ، قَالَ:سَمِعْتُ عَرْفَجَةَ، قَالَ :سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،يَقُولُ:إِنَّهُ سَتَكُونُ هَنَاتٌ وَهَنَاتٌ، فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيعٌ، فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ" ۔

حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: عن قریب بہت سے فتنے ہوں گے، پس جو شخص اس امت کے معاملہ میں افتراق پیدا کرنا چاہے جب کہ امت متفق ہو چکی ہو تو اسے تلوار کے ساتھ مارو، وہ کوئی بھی ہو۔

(صحيح مسلم، باب من فرّق أمر المسلمين وهو مجتمع)

"...عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ، وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ، وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ، وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ، قِيلَ:يَا رَسُولَ اللهِ، أَفَلَا نُنَابِذُهُمْ بِالسَّيْفِ؟ فَقَالَ:لَا، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلَاةَ، وَإِذَا رَأَيْتُمْ مِنْ وُلَاتِكُمْ شَيْئًا تَكْرَهُونَهُ، فَاكْرَهُوا عَمَلَهُ، وَلَاتَنْزِعُوا يَدًا مِنْ طَاعَةٍ"۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

تمہارے بہترین امام (یعنی حکام) وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، جن کے لیے تم دعا کرو اور وہ تمہارے لیے دعا کریں، اور تمہارے بُرے امام (حکام) وہ ہیں جنہیں تم ناپسند کرو اور وہ تمہیں ناپسند کریں، جن پر تم لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ان کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں؟ تو ارشاد ہوا: نہیں ایسا نہیں کرنا، جب تک کہ وہ تمہارے اندر نماز قائم کرتے رہیں، اور اگر تم اپنے حکام میں کوئی ایسی چیز دیکھو جو تمہیں ناپسند ہو تو صرف اس کے اس عمل کو ناپسند کرو، لیکن اس کی اطاعت سے اپنا ہاتھ نہ کھینچو (یعنی حاکم کے خلاف خروج نہ کرو)۔

(صحیح مسلم، باب خیار الأمة وشرارهم)

"...عَنْ جُنَادَةَ بْنِ أَبِي أُمَيَّةَ، قَالَ: دَخَلْنَا عَلَى عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ وَهُوَ مَرِيضٌ، فَقُلْنَا: حَدِّثْنَا أَصْلَحَكَ اللهُ، بِحَدِيثٍ يَنْفَعُ اللهُ بِهِ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: دَعَانَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعْنَاهُ، فَكَانَ فِيمَا أَخَذَ عَلَيْنَا: أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا، وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا، وَأَثَرَةٍ عَلَيْنَا، وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، قَالَ: إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللهِ فِيهِ بُرْهَانٌ"۔

جنادہ بن ابی امیہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے، اس وقت وہ بیمار تھے، ہم نے عرض کیا: اللہ آپ کی بیماری ٹھیک کرے، ہمیں کوئی ایسی بات سنائیں جس سے اللہ نفع دے اور آپ نے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو، تو انہوں نے فرمایا: ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب فرمایا پس ہم سے جن باتوں پر بیعت لی ان میں یہ بھی تھا کہ: ہم (امیر) کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے، اگرچہ وہ ہمیں پسند ہو یا ناپسند ہو، ہمیں اس میں تنگی ہو یا آسانی ہو، اور یہ کہ ہم حکومت کے معاملے میں صاحب اقتدار (یعنی حاکم) سے جھگڑا نہیں کریں گے جب تک کہ اس سے کھلا کھلا کفر ظاہر نہ ہو اور اللہ کی طرف سے اس بارے میں کوئی قطعی دلیل

موجود نہ ہو (جو اس کے خلاف خروج کو جائز کردے)۔

(صحيح مسلم، باب وجود طاعة الامراء في غير معصيةواللفظ له / وصحيح البخاري)

یاد رہے، ایسی ہی احادیث کی بنیاد پر جمہور اہل سنت کا یہ مسلک ہے کہ فاسق وفاجر اور ظالم وجائر حکمرانوں کے خلاف بھی خروج کرنا اور شرع کے مطابق ان کے احکام میں ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا جائز نہیں ہے، چند حوالے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ حکام کی اطاعت اور ان کے خلاف خروج کی ممانعت کے بارے میں فرماتے ہیں :

"والسّمع والطّاعة للأئمة وأمير المؤمنين، البِرّ والفاجِرِ، وَمَن وَلِي الخِلافةَ فاجتمع الناسُ عليه ورَضُوا به، وَمَن غَلَبَهُم بالسّيفِ حتّى صَارَ خليفة وسُمِّي أمير المؤمنين، والغزو ماضٍ مع الأمراء الى يوم القيامة، والبِرّ والفاجر لا يُترك، وقسمة الفيء واقامة الحدود الى الأئمة ماض، ليس لأحد أن يطعن عليهم ولا ينازعهم ...."۔

(نیز فرماتے ہیں) :

"ومَن خرَجَ على إمامٍ من أئمة المسلمين، وقد كان الناس اجتمعوا عليه، وأقرّوا له بالخلافة، بأي وجه كان، بالرضا أو بالغلبة، فقد شقّ هذا الخارجُ عصا المسلمين، وخَالفَ الآثارَ عن رسول الله، فإن مات الخارج عليه ماتَ ميتة جاهلية. وَلا يحِلّ قتال السلطان ولا الخروج عليه لأحدٍ من النّاس، فَمَن فَعَل ذلك، فهُو مبتدع على غير السُنّة والطريق"۔

اور آگے فرماتے ہیں :

"ولا نخرج على الأمراء بالسيف وإن جاروا"۔

خلاصہ یہ ہے کہ : حکام اور امیر وقت کی اطاعت واجب ہے، چاہے یہ نیک ہو یا بد (فاسق و

فاجر) ہو، اور اس کی بھی اطاعت واجب ہے جو خلیفہ بنا اور اس پر لوگ خوشی سے متفق ہو گئے، اور اس کی بھی اطاعت ضروری ہے جس نے تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا اور خلیفہ بن بیٹھا ہو اور اس کا نام امیر المؤمنین ہو گیا، امراء کی معیت میں جنگ (جہاد) کے لیے نکلنا قیامت تک کے لیے مشروع ہے، وہ نیک ہو یا فاجر ہو اسے ترک نہیں کیا جائے گا، اور مال فے کی تقسیم نیز حدود کا قائم کرنا بھی ائمہ (حکام) کا کام ہے، کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان پر طعن کرے یا ان سے جھگڑا کرے.... اور جس نے مسلمانوں کے حکام میں سے کسی حاکم کے خلاف خروج کیا جبکہ لوگوں کا اس پر اجتماع ہو چکا تھا اور وہ اس کی خلافت کا اقرار کر چکے تھے، خوشی سے یا زور زبردستی سے، تو اس خروج کرنے والے نے (اپنے عمل سے) مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا، اور اللہ کے رسول (ﷺ) سے ثابت آثار کی مخالفت کی، پس اگر ایسے شخص کی موت اسی حالت میں ہو گئی تو وہ جاہلیت کی موت مرا، اور بادشاہ کے ساتھ جنگ کرنا اور اس کے خلاف خروج کرنا کسی کے لیے بھی جائز نہیں، پس جس نے ایسا کیا وہ بدعتی ہے، سنت کے طریقے پر نہیں.... اور ہم حکام کے خلاف تلوار کے ساتھ خروج نہیں کرتے اگرچہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔

(مناقب الامام احمد بن حنبل لابن الجوزي، ص240تا 242، دار هجر، مصر)

حافظ حدیث اور حنفی عالم امام طحاوی ؒ (م321ھ) اہلِ سنت کے عقائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"وَلَا نَرَى الْخُرُوجَ عَلَى أَئِمَّتِنَا وَوُلَاةِ أُمُورِنَا وإن جاروا ولا ندعوا عَلَيْهِمْ وَلَا نَنْزِعُ يَدًا مِنْ طَاعَتِهِمْ ... الخ"۔

یعنی ہم اپنے حکام اور والیوں پر خروج جائز نہیں سمجھتے، اگرچہ وہ بے راہ رو ہوں، اور نہ ان پر بد دعا کرتے ہیں، اور نہ ان کی اطاعت سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔

(العقيدة الطحاوية، ص24، دار ابن حزم، بيروت)

امام ابو زکریا محی الدین یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ (م676ھ) وغیرہ نے تو فاسق حاکم کے

خلاف خروج کا نا جائز ہونا جمہور علماء اہل سنت کا قول بتلایا ہے:

"وَقَالَ جَمَاهِيرُ أَهْلِ السُّنَّةِ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَالْمُحَدِّثِينَ وَالْمُتَكَلِّمِينَ لَا يَنْعَزِلُ بِالْفِسْقِ وَالظُّلْمِ وَتَعْطِيلِ الْحُقُوقِ وَلَا يُخْلَعُ وَلَا يَجُوزُ الْخُرُوجُ عَلَيْهِ بِذَلِكَ بَلْ يَجِبُ وَعْظُهُ وَتَخْوِيفُهُ لِلْأَحَادِيثِ الْوَارِدَةِ فِي ذَلِكَ"۔

اہل سنت کے جمہور فقہاء، محدثین اور متکلمین کا کہنا ہے کہ (حاکم) فسق، ظلم اور (رعایا کے) حقوق معطل کرنے کی وجہ سے نہ معزول سمجھا جائے گا اور نہ ہی اس کی بیعت توڑی جائے گی، اور نہ ہی اس وجہ سے اس کے خلاف خروج جائز ہے، بلکہ (ایسی صورت میں) اسے وعظ و نصیحت کرنا اور (ان کاموں کے انجام سے) ڈرانا واجب ہے، کیونکہ اس بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

(شرح النووي على صحيح مسلم،ج12ص229، دار احياء التراث العربي ، بيروت)

علامہ تفتازانی نے بھی شرح عقائد میں اہل سنت کا یہی عقیدہ بیان کیا ہے کہ:

"ولاينعزل الامام بالفسق أي الخروج عن طاعة الله والجور أي الظلم على عباد الله ..."۔

امام (حاکم) فسق یعنی اللہ کی اطاعت سے خروج کی وجہ سے اور جور یعنی اللہ کے بندوں پر ظلم کی وجہ سے معزول نہیں ہو جاتا....۔

(شرح العقائد النسفية، ص367، مكتبة البشرىٰ ، كراتشى)

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"وَلِهَذَا اسْتَقر أَمر أهل السّنة على ترك الْقِتَال فِي الْفِتْنَة للأَحاديث الصَّحِيحَة الثَّابِتَة عَن النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم وصاروا يذكرُونَ هَذَا فِي عقائدهم ويأمرون بِالصبرِ على جور الْأَئِمَّة وَترك قِتَالهمْ"۔

یعنی اہل سنت کی رائے اس بات پر قرار پا گئی کہ زمانہ فتنہ میں قتال نہ کیا جائے کیونکہ اس

بارے میں نبی ﷺ سے صحیح احادیث ثابت ہیں، اور وہ (اہل سنت) اپنے عقائد میں یہ بات ذکر کرتے ہیں اور اپنے حکام اور والیوں کے ظلم پر صبر کرنے اور ان سے قتال ترک کرنے کا حکم دیتے ہیں)۔

(منهاج السنة، ج4ص529، السعودية/
المنتقى من منهاج الاعتدال، ج1ص297، السعوديه)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

"وَلِهَذَا كَانَ الْمَشْهُورُ مِنْ مَذْهَبِ أَهْلِ السُّنَّةِ أَنَّهُمْ لَا يَرَوْنَ الْخُرُوجَ عَلَى الْأَئِمَّةِ وَقِتَالَهُمْ بِالسَّيْفِ وَإِنْ كَانَ فِيهِمْ ظُلْمٌ كَمَا دَلَّتْ عَلَى ذَلِكَ الْأَحَادِيثُ الصَّحِيحَةُ الْمُسْتَفِيضَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"۔

اسی لیے اہل سنت کا مشہور مذہب یہی ہے کہ وہ ائمہ (حکام) کے خلاف خروج اور تلوار کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کو جائز نہیں سمجھتے اگر چہ وہ ظلم کے مرتکب ہی کیوں نہ ہوں، جیسا کہ اس بات پر نبی کریم ﷺ سے مروی احادیث صحیحہ کی کثیر تعداد دلالت کرتی ہے۔

(منهاج السنة ،ج3ص391، السعودية)

مزید لکھتے ہیں :

وَكَانَ أَفَاضِلُ الْمُسْلِمِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْخُرُوجِ وَالْقِتَالِ فِي الْفِتْنَةِ، كَمَا كَانَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ وَسَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ وَعَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ وَغَيْرُهُمْ يَنْهَوْنَ عَامَ الْحَرَّةِ عَنِ الْخُرُوجِ عَلَى يَزِيدَ، وَكَمَا كَانَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَمُجَاهِدٌ وَغَيْرُهُمَا يَنْهَوْنَ عَنِ الْخُرُوجِ فِي فِتْنَةِ ابْنِ الْأَشْعَثِ. وَلِهَذَا اسْتَقَرَّ أَمْرُ أَهْلِ السُّنَّةِ عَلَى تَرْكِ الْقِتَالِ فِي الْفِتْنَةِ لِلْأَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ الثَّابِتَةِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَارُوا يَذْكُرُونَ هَذَا فِي عَقَائِدِهِمْ، وَيَأْمُرُونَ بِالصَّبْرِ عَلَى جَوْرِ الْأَئِمَّةِ وَتَرْكِ قِتَالِهِم..."۔

اور مسلمانوں کے بڑے علماء (حاکم کے خلاف) خروج اور فتنہ میں جنگ سے روکتے تھے، جیسا کہ عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) اور سعید بن مسیب اور علی بن حسین (رحمۃ اللہ علیہما) اور ان کے علاوہ دوسروں نے حرّہ کے سال یزید کے خلاف خروج سے منع کیا تھا، اور جیسے حسن بصری اور مجاہد (رحمۃ اللہ علیہما) نے فتنہ ابن الاشعث میں خروج سے روکا تھا، اسی وجہ سے اہل سنت کا مسلک فتنہ میں قتال کو ترک کرنا قرار پایا کیونکہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور صحیح احادیث موجود ہیں، اور (علماء اہل سنت) اس بات کا ذکر اپنے عقائد میں کرتے ہیں اور حکام کے ظلم پر صبر کرنے اور ان سے جنگ نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

(منهاج السنة، ج4ص529)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ، حکام وامراء کی اطاعت وفرمانبرداری سے متعلق صحیح بخاری میں مروی ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قَالَ بن بَطَّالٍ فِي الْحَدِيثِ حُجَّةٌ فِي تَرْكِ الْخُرُوجِ عَلَى السُّلْطَانِ وَلَوْ جَارَ وَقَدْ أَجْمَعَ الْفُقَهَاءُ عَلَى وُجُوبِ طَاعَةِ السُّلْطَانِ الْمُتَغَلِّبِ وَالْجِهَادِ مَعَهُ وَأَنَّ طَاعَتَهُ خَيْرٌ مِنَ الْخُرُوجِ عَلَيْهِ لِمَا فِي ذَلِكَ مِنْ حَقْنِ الدِّمَاءِ وَتَسْكِينِ الدَّهْمَاءِ وَحُجَّتُهُمْ هَذَا الْخَبَرُ وَغَيْرُهُ مِمَّا يُسَاعِدُهُ وَلَمْ يَسْتَثْنُوا مِنْ ذَلِكَ إِلَّا إِذَا وَقَعَ مِنَ السُّلْطَانِ الْكُفْرُ الصَّرِيحُ فَلَا تَجُوزُ طَاعَتُهُ فِي ذَلِكَ بَلْ تَجِبُ مُجَاهَدَتُهُ لِمَنْ قَدَرَ عَلَيْهَا كَمَا فِي الْحَدِيثِ الَّذِي بعده"۔

ابن بطال نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ظالم بادشاہ کے خلاف بھی خروج کے ترک پر دلیل ہے، فقہاء کا سلطان متغلب کی اطاعت اور اس کے زیر سایہ جہاد کے واجب ہونے پر اجماع ہے، اور اس کی اطاعت اس کے خلاف خروج سے بہتر ہے کیونکہ اسی میں خونوں کی حفاظت ہے، اور ان فقہاء کی دلیل یہ اور اس جیسی دوسری احادیث ہیں، اور انہوں نے کوئی استثناء نہیں کیا مگر یہ کہ اگر بادشاہ سے صریح کفر کا وقوع ہو تو اس صورت میں اس کی اطاعت جائز نہیں بلکہ

جو قدرت رکھے اس کے لیے (کفر کے وقوع کی صورت میں) اس سے جہاد واجب ہوگا جیسا کہ اگلی حدیث میں آرہا ہے۔

(فتح الباری، ج 13ص7، دار المعرفة بیروت)

آگے چل کر اسی سلسلہ میں اس امام سے متعلق جو پہلے عادل تھا پھر جائز ہوگیا، حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فَإِنْ أَحْدَثَ جَوْرًا بَعْدَ أَنْ كَانَ عَدْلًا فَاخْتَلَفُوا فِي جَوَازِ الْخُرُوجِ عَلَيْهِ وَالصَّحِيحُ الْمَنْعُ إِلَّا أَنْ يَكْفُرَ فَيَجِبُ الْخُرُوجُ عَلَيْهِ"۔

ہاں اگر (حاکم بننے کے وقت تو وہ عادل تھا) لیکن بعد میں اس سے ظلم ظہور پذیر ہوا تو پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس کے خلاف خروج جائز ہے یا نہیں، لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس وقت بھی اس کے خلاف خروج منع ہے، مگر یہ کہ وہ کفر اختیار کرے تو پھر اس کے خلاف خروج واجب ہے۔

(ایضاً، ج13ص8)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ زمانہ فتنہ کے نبوی احکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پہلا (حکم) یہ کہ جب (تم پر) کوئی شخص غیر مستحق خِلافت مسلط ہو جائے تو ان احکام میں جو شرع کے موافق ہوں تم پر اس کی اطاعت واجب ہے، نہ ان احکام میں جو شرع کے مخالف ہوں۔ دوسرا (حکم) یہ کہ اس سے بغاوت نہ کی جائی اور نہ اس سے جنگ کی جائے، ہاں اگر اس سے کفرِ صریح ظاہر ہو تو (اس حالت میں بغاوت اور لڑائی درست ہے) یہ مضمون متواتر بالمعنیٰ ہے"۔

آگے احادیث نقل کر کے تیسرا حکم یہ بیان کیا ہے کہ :

"جب کسی شخص کی بیعت منعقد ہو گئی اور اس کا تسلط قرار پذیر ہوا، اب اگر دوسرا شخص اس پر خروج کرے اور اس سے لڑے تو اس کو قتل کرنا چاہئے، وہ خروج کرنے والا خواہ پہلے شخص سے

افضل ہو یا اس کے برابر ہو یا اس سے مفضول ہو"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، ج1،ص536، قدیمی کتب خانہ کراچی)

ایک جگہ لکھتے ہیں :

"کسی سلطان (کی حکومت) پر مسلمانوں کے متفق ہو جانے کے بعد اس سلطان سے بغاوت کرنا حرام ہے اگرچہ وہ سلطان خلافت کی شرطوں کا جامع نہ ہو، مگر اس صورت میں کہ اُس سے صریح کفر ظاہر ہو"۔

(ازالۃ الخفاء مترجم، ج 1 ص 31)

خود لعل شاہ صاحب نے اہل سنت کے شعائر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

" حاکم کی اطاعت ضروری ہے بشرطیکہ وہ معصیت کا حکم نہ دے ورنہ لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق، حاکم فاسق کے خلاف خروج اور بغاوت جائز نہیں ہے جب تک وہ کفر بواح یعنی ظاہر کفر کا ارتکاب نہ کرے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 29)

اور لکھا ہے:

" حاکم عادل ہو یا ظالم اس کی اطاعت ضروری ہے"۔

(ایضاً)

لہٰذا مدینہ کے جن لوگوں نے یزید کی بیعت کر کے توڑی، اور پھر اس کے عامل کو زبردستی مدینہ سے نکالا، ایک حاکم کے ہوتے ہوئے دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کی، اور حکومت وقت کے خلاف خروج کیا، اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یزید واقعی فاسق ہو گیا تھا تو بھی ان کے اس اقدام کو مذکورہ فرامین نبویہ اور عقیدۂ اہل سنت کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔

نیز واقعہ حرہ پر بات کرتے ہوئے صرف انہی حدیثوں کو نہیں بیان کرنا چاہیئے جن میں اہل مدینہ کو ڈرانے پر وعید کا بیان ہے، بلکہ ان فرامین نبویہ کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے جو اطاعت حاکم اور اس کے خلاف خروج کے منع سے متعلق نقل کیے گئے، اور یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ مدینہ کا امن وسکون خراب کرنے کی اولین ذمہ

داری کس پر آتی ہے؟

سوال: اہل مدینہ کی بغاوت پر کیا اقدام کیا جاتا؟

جیسا کہ بیان ہوا، اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں کہ واقعہ حرہ سنہ 63ھ میں اس وقت پیش آیا جب پورے عالم اسلام پر یزید کی حکومت پوری طرح سے قائم ہو چکی تھی اور تمام علاقوں میں اس کے والی اور گورنر کام کر رہے تھے، امور مملکت پوری طرح اس کے ہاتھ میں تھے، اور جنگ حرہ کا سبب مدینہ کے کچھ لوگوں کا یزید کی بیعت توڑ کر اس کے مقابلے میں اپنا امیر مقرر کرنا، وہاں موجود حکومتی گورنر اور ریاست کے حامی افراد، نیز بنی امیہ کو مدینہ سے نکال دینا اور ریاست کے خلاف باقاعدہ بغاوت و خروج کرنا بنا۔ ان لوگوں کے اس اقدام کی وجہ ان کے نزدیک کچھ بھی ہو، ان کا موقف جو بھی ہو، لیکن واقعہ یہی ہے کہ ان کا یہ اقدام ہی ان کے خلاف سرکاری کارروائی کا سبب بنا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ریاست کے کسی علاقے کے کچھ لوگ ریاست کے خلاف بغاوت کر کے شہر پر قبضہ کر لیں، اپنا الگ امیر مقرر کر لیں، اور مرکزی حکومت کے خلاف باقاعدہ خروج کے مرتکب ہوں تو ریاست کو کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس علاقے میں ایک متوازی حکومت تسلیم کر لی جائے اور بغاوت کرنے والوں کو کچھ نہ کہا جائے؟ یا کسی ایک شہر کے ان چند لوگوں کے اس اقدام کی وجہ سے خلیفہ اور حاکم پر لازم ہے کہ وہ حکومت چھوڑ دے؟ یا اس بغاوت کو ختم کرنے کے لئے تمام ضروری اقدامات کیے جائیں؟

یہاں یہ اعتراض تو کیا جاتا ہے کہ سرکاری فوج نے حکومت کے خلاف خروج کرنے والوں کے خلاف کارروائی کر کے ظلم کیا، لیکن یہ کیوں نہیں بتایا جاتا کہ ایسی صورت میں حاکم یا حکومت کو کیا کرنا چاہئے تھا؟ شریعت نے ایسی صورت حال میں ریاست اور حاکم کو کیا اختیار دیا ہے؟ کیا شرعی حکم یہ ہے کہ وسیع و عریض ریاست کے کسی ایک شہر یا علاقے کے کچھ لوگ حکومت کے خلاف خروج کریں تو اس کی بنیاد پر پوری حکومت ختم کر دی جائے گی؟ یا قرآن و فرامین نبویہ میں کہیں یہ بیان ہوا ہے کہ" اگر مدینہ کے لوگ کسی حکومت کے خلاف بغاوت کریں تو وہ حکومت ختم سمجھی جائے گی" ؟

لعل شاہ صاحب نے یہ تو لکھا ہے کہ:

"مدینہ کی اکثریت یزید سے برگشتہ ہوگئی تھی اور وہ بھی صحابہ اور تابعین ہی تو تھے، معمولی اشخاص نہ تھے، بے شمار لوگ واقعہ حرہ میں مقتول ہوئے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے استدلال کی رو سے کیا وہ سبھی جاہلیت کی موت مرے العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ حاشا وکلا، صحابہ وتابعین کے اکثر و بیشتر افراد درجہ اجتہاد پر فائز تھے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حکم استنباط کیا تھا وہ یہی تھا کہ خروج سے گریز کیا جائے اور وہ اپنے اجتہاد پر قائم رہے اور جن لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ ڈالی ان کے پاس بھی کوئی دلیل ہوگی، ورنہ مدینۃ الرسول کے باشندے جن کی اکثریت صحابہ وتابعین پر مشتمل تھی کس طرح جاہلیت کی موت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے، معلوم ہوتا ہے کہ فسق یزید وظلم یزید بلا ریب اظہر من الشمس تھا، اختلاف خلع بیعت میں تھا جس نے جو صورت صحیح سمجھی اس پر عمل کیا.."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 373و374)

اور

"کیا عجب ہے کہ اہل مدینہ جنہوں نے یزید کی بیعت توڑ دی تھی ان کے احاطہ علم میں یزید کا فسق وفجور اور ظلم وتعدی اتنی زیادہ واضح ہوگئی ہو کہ انہوں نے بیعت توڑنے کو واجب سمجھا ہو"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 375)

اور

"عین ممکن ہے کہ اہل مدینہ جنہوں نے بیعت توڑ ڈالی تھی وہ بھی صحابہ اور صحابہ زادے تھے، ان کی روش حضرت ابن عمر صلی اللہ علیہ وسلم کے قیاس سے زیادہ درست ہو، بلکہ اگر یہ لوگ اول مرحلہ میں ہی بیعت نہ کرتے اور مصائب برداشت کر لیتے تو بہتر ہوتا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 376)

لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ بیعت توڑنے والوں کے اس فیصلے کی فرامین نبویہ کی روشنی میں شرعی حیثیت کیا تھی؟ ان کے اس اقدام کے خلاف حاکم یا خلیفہ کو شریعت کی رو سے کچھ کرنے کا اختیار تھا یا نہیں؟ اگر تو وہ حضرات بیعت توڑنے تک ہی محدود رہتے تو اور بات تھی، لیکن کیا ان کا مرکزی حکومت کے گورنر

اور شہر میں موجود حکومت کے حامی افراد کو نکال کر اپنی متوازی حکومت قائم کرنا اور باقاعدہ الگ امیر مقرر کرنا، یہ شرعی بغاوت وخروج کے زمرے میں آتا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں فرامین نبویہ میں کیا حکم دیا گیا ہے؟ ایسی بغاوت اور خروج کے بارے میں اہل سنت کا مسلک کیا ہے؟

پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت توڑنے سے متعلق صریح طور پر فرمان رسول ﷺ پیش کیا تھا، اپنا کوئی استنباط، اجتہاد یا قیاس نہیں بیان کیا تھا، جیسا کہ لعل شاہ صاحب غلط تاثر دے رہے ہیں، اس کے علاوہ اطاعت امیر سے متعلق بہت سے فرامین نبویہ موجود ہیں (جن میں سے کچھ ہم باحوالہ نقل کر آئے ہیں) جبکہ دوسری طرف بیعت توڑنے والوں کے پاس صرف ان کا اپنا اجتہاد ہی تھا، انہوں نے قرآن وسنت سے کوئی ایسی دلیل نہیں پیش کی تھی جس سے ان کے بیعت توڑنے کا جواز نکلتا ہو۔ صرف یہ کہنے سے بات نہیں بنے گی کہ" ان کے پاس بھی کوئی دلیل رہی ہوگی"، کیونکہ اگر کوئی دلیل تھی بھی تو انہوں نے ذکر نہیں کی تھی، یا کم از کم ہمارے سامنے نہیں آئی کہ اس کا جائزہ لیا جاتا۔

لہٰذا یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے ہمنوا صحابہ کرام وتابعین عظام کے موقف کی تائید میں احادیث نبویہ موجود ہیں، جبکہ بیعت توڑ کر حکومت کے خلاف بغاوت وخروج کرنے والوں کا اقدام صرف ان کے اپنے اجتہاد پر کھڑا ہے، انہوں نے اپنے اس عمل کی تائید میں قرآن وسنت سے کوئی نص نہیں پیش کی تھی، نہ ہی لعل شاہ صاحب نے ہی ایسی کوئی دلیل پیش کی ہے۔

کیا جنگ حرہ میں نقصان صرف ایک طرف کا ہوا؟

عام طور پر واقعہ حرہ کے مقتولین کا ذکر کرتے ہوئے یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ جتنے لوگ بھی اس واقعہ میں قتل ہوئے وہ سب کے سب سرکاری فوج کے ہاتھوں قتل ہوئے اور وہ سب خروج کرنے والوں کے ساتھ تھے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ حرہ میں باقاعدہ جنگ ہوئی تھی، اور جنگ میں دونوں طرف کے لوگ مارے جاتے ہیں، اب کتب تاریخ ورجال میں کسی کے بارے میں یہ لکھا ہونے سے کہ" وہ جنگ حرہ میں قتل ہوئے" یا صرف یہ بیان کرنے سے کہ واقعہ حرہ میں کل اتنے لوگ قتل ہوئے، یہ کیسے لازم آگیا کہ یہ سب سرکاری فوج کے مخالف اور اس کے خلاف خروج کرنے والے تھے اور انہیں سرکاری فوج نے ہی قتل کیا تھا؟ کیا خروج اور

بغاوت کرنے والوں کے ہاتھوں کوئی بھی قتل نہ ہونے کی کوئی دلیل موجود ہے؟ جب کہ دوسری طرف اس بات کا کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ مدینہ منورہ میں بھی اس وقت ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے یزید کی بیعت نہیں توڑی تھی اور نہ ہی اس کے خلاف خروج کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ بیعت توڑنے والوں نے سرکاری فوج کے ساتھ باقاعدہ جنگ کی اور جنگ میں دونوں طرف سے نقصان ہوتا ہے، پھر جنگ میں بعض دفعہ ایسے لوگ بھی مارے جاتے ہیں جو کسی طرف شامل نہیں ہوتے، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ واقعہ حرہ میں ہونے والی لڑائی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"....ثُمَّ اقْتَتَلُوا قِتَالًا شَدِيدًا، ثُمَّ انْهَزَمَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ إِلَيْهَا، وَقَدْ قُتِلَ مِنَ الْفَرِيقَيْنِ خَلْقٌ مِنَ السَّادَاتِ وَالْأَعْيَانِ.."۔

پھر انہوں نے شدید قسم کی جنگ لڑی، آخر اہل مدینہ پسپا ہو گئے، اور دونوں جانب سے بہت سے معزز اور معروف لوگ مارے گئے...۔

(البداية والنهاية، ج8ص310، وزارة الاوقاف قطر)

خود لعل شاہ صاحب نے بھی یہ حوالہ نقل کیا ہے (استخلاف یزید، صفحہ 390)۔

تو غور کریں! حافظ ابن کثیر لکھ رہے ہیں کہ" دونوں طرف سے بہت سے معزز اور معروف لوگ مقتول ہوئے"، لہٰذا کسی شخص کے بارے میں کتابوں میں صرف یہ لکھا ہونے سے کہ" وہ واقعہ حرہ کے دوران قتل ہوئے" ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ضرور حکومت کے مخالفین میں سے تھے اور سرکاری فوج کے ہاتھوں قتل ہوئے، جب تک کسی مستند دلیل سے یہ ثابت نہ ہو کہ وہ شخص علی الاعلان بیعت توڑنے والوں اور خروج کرنے والوں میں شامل تھا، نیز صحیح سند سے اس کا واقعہ حرہ میں قتل ہونا بھی ثابت ہوتا ہو۔

❀❀❀

یزید بن معاویہ کے بارے میں لعل شاہ صاحب کی ذکر کردہ صحابہ کرام وتابعین عظام کی" آراء" اوران کا تجزیہ

اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 384 سے لعل شاہ صاحب نے متعدد صحابہ کرام وتابعین عظام کا ذکر کر کے "بزعمِ خود" یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ سب یزید کے بارے میں منفی رائے رکھتے تھے، چنانچہ بات کو شروع کرتے ہوئے ایک بار پھر یہ راگ الاپا ہے کہ :

"گذشتہ صفحات میں قارئین کرام پڑھ چکے ہیں، ظلم یزید وفسق یزید کے بارہ میں صحابہ کرام وتابعین عظام تقریباً متفق ہیں، البتہ خلع بیعت کے سلسلے میں اختلاف تھا، ذیل کی سطور میں بعض صحابہ وتابعین کا تفصیلی طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ارشادات نبی ﷺ کے آئینہ (هذا الحي من قريش) (اغيلمة من قريش) (خلف بعد الستين) (رأس الستين وامارة الصبيان) (من ظلم اهل المدينة واخافه) کا جو عکس نمایاں ہوا کہ جس سے آنحضور ﷺ کا دل دہل گیا اسے بیان کرتے وقت لسان نبوت مرتعش ہوگئی تھی اور آپ نے فرمایا تھا لواعتزل الناس عنهم اس عکس سے صحابہ کرام نے یزید ابن معاویہ کی ذات کو مشخص کیا"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 384و385)

تبصرہ:

ہم بھی گذشتہ صفحات میں اس پر تفصیلی بات کر چکے ہیں کہ ظلم وفسق یزید پر صحابہ کرام وتابعین عظام کے متفق ہونے کا دعویٰ محض دعویٰ ہے اور بلا دلیل ہے، کسی ایک صحابی سے بھی بسند صحیح ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے کہا ہو کہ "سمجھتے تو ہم بھی یزید کو فاسق وفاجر ہیں لیکن اثارت فتنہ کے خوف سے ہم خلع بیعت کو درست نہیں سمجھتے"، چہ جائے کہ اس پر تمام صحابہ تابعین (مبایعین وغیر مبایعین) کے اتفاق واجماع کا دعویٰ کر دیا جائے، بلکہ باقی تمام صحابہ کو تو ایک طرف رکھیں، خاص سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے یزید کو "ظالم وفاسق" کہا ہو، نیز لعل شاہ صاحب نے جن احادیث کی طرف پھر اشارہ کیا ہے ان میں کہیں بھی یزید کے نام کی صراحت نہیں نہ ہی ان کو روایت کرنے والے صحابہ میں سے کسی نے یہ فرمایا کہ "یہ احادیث یزید بن

معاویہ کے بارے میں ہیں"، اس لئے یہ لعل شاہ صاحب کی غلط بیانی ہے جو وہ لکھ رہے ہیں کہ : "اس عکس سے صحابہ کرام نے یزید ابن معاویہ کی ذات کو مشخص کیا ہے"۔

لیکن سب سے اہم بات جس کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ ہے جسے لعل شاہ صاحب نے یوں لکھا ہے کہ:

"ظلم یزید وفسق یزید کے بارہ میں صحابہ کرام وتابعین عظام تقریباً متفق ہیں، البتہ خلع بیعت کے سلسلے میں اختلاف تھا"۔

یہاں لعل شاہ صاحب یہ تسلیم کررہے ہیں کہ صحابہ کرام وتابعین کے درمیان اس بات میں اختلاف ہوا کہ یزید کی بیعت توڑ دی جائے یا نہ توڑی جائے، یعنی بالفاظ دیگر وہ اقرار کررہے ہیں کہ واقعہ حرہ (63ھ) سے پہلے یزید کی بیعت ان سب صحابہ وتابعین نے کی ہوئی تھی، اسی لئے تو "خلع بیعت" پر اختلاف ہوا۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ واقعہ حرہ سے پہلے یزید" فاسق وفاجر اور شرابی" نہیں تھا؟ یا اس کے ان فسقیہ کاموں کا کسی کو علم نہ تھا؟ اس سے پہلے کسی کو "خلع بیعت" کا خیال کیوں نہ آیا؟ بات مکمل کرنی چاہیے ناں!

لعل شاہ بخاری صاحب کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر بہتان

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے متعدد صحابہ کرام وتابعین عظام کا فرداً فرداً ذکر کر کے (بزعم خود) یزید کے بارے میں ان کی آراء لکھی ہیں، چنانچہ سب سے پہلے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا نام ذکر کر کے لکھتے ہیں :

"ان کے سامنے یزید کی ولیعہدی کا قضیہ ہوا تھا، یزید کے کردار، عادات اور اطوار سے بخوبی واقف تھے انہیں یقیناً معلوم تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات يهلك الناس هذا الحي من قريش۔ اغليمة من قريش۔ ومن اخاف اهل المدينة ۔ کا اولین مصداق یزید بن معاویہ ہے اور صحیح بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ (لو شئت لاسميهم) اگر میں چاہوں تو ان کے نام تک بتلا دوں لیکن فرماتے ہیں کہ ان کی اشاعت کروں تو میری شاہرگ کاٹ ڈالی جائے قطع هذا البلعوم اور دعا کرتے تھے اللهم لاتدركني سنة ستين وامارة الصبيان کہ اے اللہ مجھے سنہ 60ھ اور امارۃ الصبیان کا زمانہ نہ پاسکے، ان کی دعا

قبول ہوئی اور وہ سنہ 59ھ میں انتقال فرما گئے انا لله وانا اليه راجعون"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 385)

تبصرہ:

ملاحظہ فرمائیں، کس دھڑلے کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ" حضرت ابو ہریرہ ؓ کو یقیناً معلوم تھا کہ آنحضور ﷺ کے فرمودات کا اولین مصداق یزید بن معاویہ ہے"، جبکہ آگے خود یہ بھی بتلایا جا رہا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ نے موت کے خوف سے یزید تو کیا کسی کا بھی نام نہیں لیا تھا۔ یاد رہے! لعل شاہ صاحب نے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے جو شہ رگ کاٹے جانے والی بات نقل کی ہے وہ ایک الگ حدیث ہے جس میں نہ ساٹھ ہجری کا ذکر ہے نہ اہل مدینہ کو ڈرانے کا اور نہ ہی قریش کے بچوں کی حکومت کا (دیکھیں: صحیح البخاری، باب حفظ العلم)، لیکن لعل شاہ صاحب نے اس دوسری حدیث کے الفاظ یہاں جوڑ کر اور یہ تاثر دے کر کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ" اگر میں یزید کا نام بتا دوں تو میری شہ رگ کاٹے جانے کا خوف ہے"علمی خیانت کا ثبوت دیا ہے، واللہ المستعان۔

(لعل شاہ صاحب نے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے ان پر مفصل کلام پہلے ہو چکا)۔

یہاں ہم مزید عرض کرتے ہیں کہ یزید کی ولی عہدی کی بیعت حضرت ابو ہریرہ ؓ کی زندگی میں ہو چکی تھی (لعل شاہ صاحب کے بقول تو یہ سنہ 44ھ کی بات ہے) اور یہاں لعل شاہ صاحب یہ بھی بتا رہے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ کی وفات سنہ 59ھ میں ہوئی، اور پہلے یزید کی ولی عہدی والی بیعت سے متعلق وہ خود یہ لکھ چکے ہیں کہ:

"سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کر لی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

اور ہمیں کسی روایت میں نہیں ملتا کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ نے یزید کی جانشینی کی اس بیعت پر کسی قسم کا کوئی اعتراض کیا ہو یا اس کی ولی عہدی کی بیعت نہیں کی تھی، نہ ہی کہیں یہ ملتا ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہ ؓ کو یہ احادیث سنا کر نصیحت ہی کی ہو کہ آنحضرت ﷺ کے ان فرمودات کا مصداق یزید ہے، جبکہ

بقول لعل شاہ صاحب یہ معاملہ سنہ 44ھ سے چلا آرہا تھا، اب وہ الٹا ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس بات کا مدینہ کی گلیوں میں اعلان کرتے ہوئے تو نہیں ڈرتے تھے اور اس سے پناہ بھی مانگتے تھے لیکن وہ صراحت کے ساتھ یہ بات بیان کرنے سے ڈرتے تھے۔ غور کیجئے! لعل شاہ صاحب نے اپنے مفروضے کو درست ثابت کرنے کے لئے ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ بزدل ثابت کر دیا کہ (بقول لعل شاہ صاحب) امت کی تباہی کی بنیاد ان کے سامنے رکھی جارہی تھی اور وہ اس بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے قتل کیے جانے کے خوف سے خاموش رہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ سید لعل شاہ بخاری صاحب نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر یہ بہتان باندھا ہے کہ انہیں یقیناً معلوم تھا کہ ان احادیث کا مصداق یزید بن معاویہ ہے، یہ لعل شاہ صاحب کے دماغ کی سوچ ہے ورنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایسی کوئی بات منقول نہیں، اور پھر عجیب بات ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جن صحابہ کے سامنے مدینہ کی گلیوں میں یہ دعا کیا کرتے تھے، ان میں سے بھی کسی نے ان احادیث کا حوالہ دے کر یزید کو ان کا مصداق نہیں بتایا، حتیٰ کہ واقعہ حرہ میں بیعت توڑنے والوں نے بھی ان احادیث کا حوالہ نہ دیا، یہ الہام تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے کئی صدیوں بعد پیدا ہونے والوں کو ہوا کہ ان احادیث کا مصداق یزید بن معاویہ ہے۔

تنبیہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کس سال ہوئی؟ اس میں مختلف اقوال ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قال هشام بن عروة، وخليفة وجماعة: توفي أبو هريرة سنة سبع وخمسين، وقال الهيثم بن عدي، وأبو معشر، وضمرة بن ربيعة: مات سنة ثمان وخمسين، وقال الواقدي، وأبو عبيد وغيرهما: مات سنة تسع وخمسين..."۔

ہشام بن عروہ، خلیفہ بن خیاط اور ایک جماعت کا قول ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات سنہ 57ھ میں ہوئی۔ ہیثم بن عدی، ابو معشر اور ضمرہ بن ربیعہ کا کہنا ہے کہ آپ کی وفات سنہ 58ھ میں ہوئی۔ جبکہ واقدی اور ابو عبید وغیرہ کا قول ہے کہ آپ کی وفات سنہ 59ھ میں

ہوئی۔

اور پھر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا فیصلہ یوں دیا ہے کہ:

"والمعتمد في وفاة أبي هريرة قول هشام بن عروة..."۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے سال کے بارے میں قابل اعتماد قول ہشام بن عروہ کا ہے (یعنی سنہ 57ھ والا)۔

(الاصابة في تمييز الصحابة، ج13ص58، دار هجر القاهرة)

لعل شاہ بخاری صاحب کا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ پر بہتان

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس پر مختصراً ہم پہلے بات کر آئے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"قصہ ولایت عہد یزید ان کے سامنے پیش آیا اور خلافت یزید کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے او یہ بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے آئینہ میں یزید ہی کی تصویر دیکھ رہے ہیں، چنانچہ روایت فرماتے ہیں:

سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول خلف بعد الستين اضاعوا الصلوات واتبعوا الشهوات فسوف يلقون غيا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ فرماتے تھے سنہ 60ھ کے بعد نااہل حکمران ہوں گے جو نمازوں کو ضائع کریں گے اور خواہشات کی پیروی کریں گے، عنقریب وہ ملیں گے گمراہی کو ۔مسند الامام احمد ص38 ج3"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 385و386)

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے وہ واقعہ (ادھورا) بیان کیا ہے جو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں، جس میں ذکر ہے کہ واقعہ حرہ کے دوران حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ایک غار میں روپوش ہو گئے تھے اور اہل مدینہ میں سے ایک شخص نے سرکاری فوج کے ایک سپاہی کو جاسوسی کی کہ ایک آدمی غار میں چھپا ہوا ہے، جب وہ

فوجی غار میں گیا اور اسے معلوم ہوا کہ یہ تو صحابی رسول حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں تو اس نے ان سے دعا کرنے کا کہا اور بغیر انہیں کوئی نقصان پہنچائے واپس چلا آیا۔

تبصرہ:

ملاحظہ فرمائیں، کس دھڑلے کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ" حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اس حدیث کے آئینہ میں یزید ہی کی تصویر دیکھ رہے تھے"، یہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا ہے جس کا انہوں نے اشارہ تک نہیں فرمایا، لیکن یزید دشمنی میں شاید ایسی باتیں ان حضرات کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

پھر تلبیس کی انتہا دیکھیں کہ اس حدیث کے عربی الفاظ ہیں:

"يَكُونُ خَلْفٌ مِنْ بَعْدِ سِتِّينَ سَنَةً أَضَاعُوا الصَّلَاةَ، وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ، فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا....الخ"۔

ساٹھ (60) سال کے بعد ایسے ناخلف ہوں گے جو نماز ضائع کریں گے اور شہوات کی پیروی کریں گے، پس بہت جلد ان کی گمراہی ان کے سامنے آجائے گی۔

لیکن لعل شاہ صاحب بڑی مہارت کے ساتھ اردو ترجمے میں یہ اضافہ کرتے ہیں کہ:

"سنہ 60ھ کے بعد نااہل حکمران ہوں گے...."۔

جبکہ اس حدیث کے الفاظ میں نہ" سنہ ہجری" کا ذکر ہے اور نہ ہی حدیث کے الفاظ میں" نااہل حکمران" کا کوئی لفظ ہے، معلوم نہیں لعل شاہ صاحب قرآن کریم کی اس آیت میں بھی" نااہل حکمران" کا لفظ اضافہ کرتے ہوں گے یا نہیں جس میں بالکل یہی الفاظ آئے ہیں:

﴿فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۖ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم 59)

پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کی جگہ آئے جنہوں نے نمازوں کو برباد کیا، اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلے، چنانچہ ان کی گمراہی بہت جلد ان کے سامنے آجائے گی۔

الغرض! بتانا یہ مقصود ہے کہ اس حدیث میں" نااہل حکمرانوں" کی بات نہیں ہو رہی بلکہ ایک عمومی

بات فرمائی گئی ہے کہ بعد کے زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایسے کام کریں گے، اس میں لعل شاہ صاحب کے زمانے کے لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس میں دور دور تک کہیں بھی یزید کا نام ونشان نہیں، نہ ہی اس میں کسی ایک خاص شخص کا ذکر ہے، بلکہ کئی سارے لوگوں کی یہ علامت بتائی گئی ہے، نیز اس حدیث میں نبی ﷺ نے ساٹھ (60) سال بعد کی صورت حال بتائی ہے، اور یقیناً یہاں ساٹھ سے ہجری سال مراد نہیں ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے دور میں ہجری تاریخ رائج نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس سے آپ ﷺ کے وصال کے بعد ساٹھ سال مراد ہوں گے جو ہجری سنہ کے اعتبار سے سنہ 70 ہجری کے بعد کا دور ہوگا، اور یزید کی وفات اس دور سے پہلے ہی ہو چکی تھی، یا اس وقت سے ساٹھ سال مراد ہوں گے جب یہ ارشادِ نبوی صادر فرمایا گیا، اس لیے یزید کو خواہ مخواہ اس حدیث کا مصداق بنانا زور زبردستی کے سوا کچھ نہیں، یا اگر کسی کا یہ دعویٰ ہے کہ ساٹھ سال کے بعد صرف ایک یزید ہی ایسا ہوا ہے جس میں یہ ساری خرابیاں پائی جاتی تھیں، اس لیے اس حدیث کا مصداق صرف وہی ہے تو یہ دعویٰ صراحت کے ساتھ پیش کیا جائے اور پھر اس پر دلیل دی جائے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اور ان کے بیٹے

لعل شاہ صاحب مندرجہ بالا عنوان دے کر لکھتے ہیں:

"انہوں نے بھی خلافت یزید کے مناظر دیکھے اور ثمرات خلافت یزید کا ذائقہ چکھا، اور الصادق المصدوق پیغمبر ﷺ کے قول (من اخاف اهل المدينة اخاف ما بين جنبي۔ جس نے اہل مدینہ کو خائف کیا اس نے میرے دل کو میرے پہلوؤں میں خوفزدہ کر دیا) کو یزید ابن معاویہ پر منطبق کیا.... الخ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 386 و 387)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب کا یہ دعویٰ کہ "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو یزید بن معاویہ پر منطبق کیا" یہ دعویٰ بلا دلیل ہے، جن روایات کا انہوں نے حوالہ دیا ہے ان میں کہیں بھی ایسا کوئی لفظ نہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہو کہ "یہ بات یزید بن معاویہ پر منطبق ہوتی ہے"، کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اس حدیث کو ان لوگوں

پر منطبق فرماتے ہوں جو واقعہ حرہ کے اصل ذمہ دار تھے اور جو مدینہ میں بد امنی اور خوف و ہراس کا سبب بنے؟ جنہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت اور خروج کیا اور مدینہ میں رہنے والے ایک ہزار کے قریب لوگوں کا محاصرہ کر کے انہیں ڈرا دھمکا کر مدینہ سے نکلنے پر مجبور کیا؟ یا تو دلائل شرعیہ سے ثابت کیا جائے کہ مدینہ کے ان لوگوں کا بیعت توڑنا، ایک حاکم اور امیر کے ہوتے ہوئے اپنا الگ امیر (بلکہ تین تین امیر) مقرر کرنا، اور قائم شدہ حکومت وقت کے خلاف باقاعدہ مسلح خروج کرنا فرامین نبویہ کے عین مطابق تھا اور حکومت و ریاست کے لئے ان کے اس عمل کے خلاف کسی بھی قسم کا اقدام کرنا شرعاً حرام اور ناجائز تھا، بلکہ حکومت کو چاہیئے تھا کہ وہ ریاست کے اندر ان کی الگ ریاست کو قبول کر لیتی اور ان کے اس اقدام کے خلاف کچھ نہ کرتی، تو پھر بے شک سارا ملبہ حاکم وقت یزید پر ڈالا جا سکتا ہے۔ یہ کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں کہ اہل مدینہ کو ڈرانے پر وعیدوں والی احادیث تو بیان کی جائیں، لیکن ان احادیث کا ذکر ہی نہ کیا جائے جن میں اطاعت امیر کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ:

"....عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ، فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا"۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر دو خلیفوں کے لیے (ایک ہی وقت) بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو۔

(صحيح مسلم، باب اذا بُويع لخليفتين)

"....عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ عَرْفَجَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: إِنَّهُ سَتَكُونُ هَنَاتٌ وَهَنَاتٌ، فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيعٌ، فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ"۔

حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: عن قریب بہت سے فتنے ہوں گے، پس جو شخص اس امت کے معاملہ میں افتراق پیدا کرنا

چاہے جب کہ امت متفق ہو چکی ہو تو اسے تلوار کے ساتھ مارو، وہ کوئی بھی ہو۔

(صحيح مسلم، باب من فرّق أمر المسلمين وهو مجتمع)

کیا یہ احادیث نبویہ نہیں ہیں؟ یا کوئی ایسی حدیث ہے کہ" فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا" اور" فاضربوه بالسيف كائناً من كان" سے مدینہ کے لوگ مستثنیٰ ہیں؟

لہٰذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے تو صرف حدیث بیان فرمائی کسی کا نام نہیں لیا کہ میں اس حدیث کو فلاں شخص پر منطبق کر رہا ہوں، اگر بعد میں کسی نے اپنی رائے یا اپنے ذہن سے اس حدیث کو یزید پر منطبق کر دیا تو یہ اس کا استنباط ہے، اسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں۔

یاد رہے! حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی وفات کے سال کے بارے میں بھی مختلف اقوال ملتے ہیں، 73ھ، 74ھ، 77ھ اور 78ھ (الاصابۃ، ج2 ص122، دار ہجر القاہرۃ)، یعنی آپ واقعہ حرّہ کے بعد بھی دہ سال سے زیادہ زندہ رہے۔ آپ کا یا آپ کے بیٹوں کا بیعت توڑنا یا بیعت توڑنے والوں کے ساتھ مل کر خروج کرنا یا واقعہ حرہ میں آپ کا قتل ہونا کہیں مذکور نہیں۔

حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ

آگے لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"ابن قتیبہ ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ فتح مکہ میں حاضر ہوئے اور یوم حرہ تک زندہ رہے اور مسلم بن عقبہ کے حکم سے نوفل ابن مساحق نے قتل کیا، کیونکہ یہ یزید پر طعن و تشنیع کرتے تھے۔ يذكر يزيد ابن معاوية بشرب الخمر والطعن عليه فحقد عليه (المعارف لابن قتيبة، ص298) کہ یزید ابن معاویہ کو شرابی کہتے تھے اور اس پر طعن کرتے تھے پس اس نے اس وجہ سے کینہ اور دشمنی کی۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ مسلم ابن عقبہ نے انہیں امان دے کر پھر قتل کیا (تاریخ الاسلام للذہبی، ص359)"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 387و388)

تبصرہ:

سب سے پہلے عرض ہے کہ کتاب" المعارف" کے مصنف عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری کی وفات

سنہ 276ھ کی ہے اور واقعہ حرہ سنہ 63ھ میں ہوا، اور ابن قتیبہ نے اس بات کی کوئی سند ذکر نہیں کی، اور لعل شاہ صاحب کا اصول تو یہ ہے کہ ایک جگہ البدایۃ والنہایۃ کی ایک روایت پر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”پھر جو لوگ رواۃ سند کی تمیز سے بھی بے خبر ہوں وہ صحت وسقم کی تمیز کیسے کر سکتے ہیں؟ حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 774ھ ہے اور الاعمش کی وفات سنہ 148ھ ہے، حافظ ابن کثیر کو اعمش کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا تاہنوز معرض خفا میں ہے...“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

تو سب سے پہلے اس بات کی صحیح سند درکار ہے کہ حضرت معقل بن سنان ﷛ نے یزید بن معاویہ پر شراب نوشی کا الزام لگایا تھا جس کی وجہ سے مسلم بن عقبہ ان کا دشمن ہوگیا اور بعد میں اس نے انہیں امان دے کر نوفل بن مساحق سے قتل کروادیا۔

لعل شاہ صاحب نے تو صرف ابن قتیبہ کی ”المعارف“ اور امام ذہبی کی ”تاریخ الاسلام“ کا حوالہ دیا ہے، جیسا کہ بیان ہوا، ابن قتیبہ نے تو کوئی سند ذکر نہیں کی، البتہ امام ذہبی نے دو روایات نقل کی ہیں جن میں سے پہلی روایت کی سند یوں ہے:

"وَقَالَ الْوَاقِدِيُّ: حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عُثْمَانَ بْنِ زِيَادٍ الأَشْجَعِيُّ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ..."۔

اور ایک دوسری روایت کی سند یوں ذکر کی ہے:

"وَقَالَ الْمَدَائِنِيُّ، عَنْ عَوَانَةَ، وَأَبِي زَكَرِيَّا الْعَجْلَانِيِّ، عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ.."۔

(تاریخ الاسلام، ج2ص722و723، دار الغرب الاسلامي)

ہم ان دونوں روایات پر قدرے تفصیل سے اپنی معروضات پیش کرتے ہیں۔

پہلی روایت کی سند طبقات ابن سعد میں یوں ہے:

أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ قَالَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عُثْمَانَ بْنِ زِيَادٍ الأَشْجَعِيُّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانٍ قَدْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى

اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ..... الخ"۔

(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد، ج5ص171،مكتبة الخانجي، مصر)

اور مستدرک میں امام حاکم نے اپنی سندیوں بیان کی ہے :

حَدَّثَنَا أَبُو عَبۡدِ اللّٰهِ الۡأَصۡبَهَانِيُّ، ثَنَا الۡحَسَنُ بۡنُ الۡجَهۡمِ، ثَنَا الۡحُسَيۡنُ بۡنُ الۡفَرَجِ، ثَنَا مُحَمَّدُ بۡنُ عُمَرَ، قَالَ: كَانَ مَعۡقِلُ بۡنُ سِنَانِ بۡنِ مُظَهِّرِ بۡنِ عَرَكِيِّ بۡنِ فَتَيَانَ بۡنِ سُبَيۡعِ بۡنِ بَكۡرِ بۡنِ أَشۡجَعَ شَهِدَ الۡفَتۡحَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثَنِي أَبُو عَبۡدِ الرَّحۡمَنِ بۡنُ عُثۡمَانَ بۡنِ زِيَادٍ الۡأَشۡجَعِيُّ، عَنۡ أَبِيهِ، قَالَ: كَانَ مَعۡقِلُ بۡنُ سِنَانٍ الۡأَشۡجَعِيُّ قَدۡ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ..... الخ"۔

(المستدرك للحاكم، ج3ص599، دار الكتب العلمية بيروت)

ان دونوں سندوں پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(1) دونوں سندوں میں "محمد بن عمر واقدی" کذاب ووضاع موجود ہے،وہ کوئی معمولی ضعیف نہیں بلکہ "کذاب" اور" وضاع" ہے لہٰذا روایت کے جھوٹا اور باطل ہونے کے لیے اس کا سند میں ہونا ہی کافی ہے (اس کا مفصل تعارف آگے آرہا ہے) نیز دونوں سندوں میں" عبدالرحمن بن عثمان" کے" دادا" کا ذکر نہیں۔

(2) امام حاکم کی سند میں محمد بن عمر واقدی سے روایت کرنے والے کا نام ہے "حسین بن فرج" اور اس سے روایت کرنے کا نام ہے "حسن بن جہم" اور اس سے روایت کرنے والے کا نام ہے" ابوعبداللہ الاصبہانی" اور اس سے امام حاکم نے روایت کی ہے، نیز مستدرک حاکم میں" عبدالرحمن" کو" ابوعبدالرحمن" لکھا گیا ہے۔

محمد بن عمر بن الواقد (واقدی) کا تعارف

چونکہ اس روایت کا دارومدار "محمد بن عمر الواقدی" پر ہے، اس لئے اس کا مفصل تعارف لکھا جاتا ہے۔

امام شافعی نے کہا کہ: "كتب الواقدي كذب" واقدی کی کتابیں (کذب) جھوٹ ہیں۔

(تاريخ بغداد، ج 4ص20، دار الغرب الاسلامي بيروت)

امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں "ليس بشيء" یہ کچھ بھی نہیں، یہ بھی کہتے ہیں کہ" الواقدي ضعيف" واقدی ضعیف ہے، اور یہ بھی کہتے ہیں" لا يُكتب حديثه" اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔

(تاريخ بغداد ، ج 4ص20)

علی بن المدینی کہتے ہیں کہ" محمد بن عمر الواقدي ليس بموضع للرواية ولا يروى عنه" ۔ واقدی سے روایت نہ لی جائے، یہ روایت لینے کے لائق ہی نہیں۔

(تاريخ بغداد، ج 4ص20)

یہی علی بن المدینی فرماتے ہیں: "الهيثم بْن عدي أوثق عندي من الواقدي، ولا أرضاه فِي الحديث، ولا فِي الأنساب، ولا فِي شيء" ہیثم بن عدی میرے نزدیک واقدی سے زیادہ ثقہ ہے، میں نہ اسے (واقدی کو) حدیث میں پسند کرتا ہوں، نہ انساب میں اور نہ کسی بھی اور چیز میں۔

(تاريخ بغداد، ج 16ص76)

واضح رہے کہ امام ذہبی نے علی بن المدینی کی یہ بات نقل کرکے اس پر اپنی تعلیق میں لکھا ہے: "قُلْتُ: أَجْمَعُوا عَلَى ضَعْفِ الهَيْثَم"، میں کہتا ہوں کہ (ائمہ جرح وتعدیل) کا اس پر اجماع ہے کہ ہیثم (بن عدی) ضعیف ہے۔

(سير اعلام النبلاء، ج 9ص462، مؤسسة الرسالة بيروت)

اسحاق بن راہویہ نے واقدی کے بارے میں فرمایا: "وكان عندي ممن يضع"۔ میرے نزدیک (واقدی) ان لوگوں میں سے تھا جو حدیثیں گھڑتے ہیں۔

(تاريخ بغداد، ج 4ص20)

امام بخاری، واقدی کے بارے میں کہتے ہیں:

"مَتْرُوكُ الْحَدِيثِ، تَرَكَهُ أَحْمَدُ، وَابْنُ نُمَيْرٍ، وَابْنُ الْمُبَارَكِ، وَإِسْمَاعِيلُ بْنُ زَكَرِيَّا"، واقدی "متروک الحدیث" ہے، امام احمد، ابن نمیر، ابن مبارک اور اسماعیل بن زکریا سب نے اسے ترک کردیا۔

(الضعفاء للعُقَيلي، ج 4ص107)

اور دوسری جگہ فرمایا :"مَا عِنْدِي لِلْوَاقِدِيِّ حَرْفٌ"، میرے پاس اس کے حق میں کہنے کے لئے ایک حرف بھی نہیں۔

(سير اعلام النبلاء، ج9ص463، مؤسسة الرسالة بيروت)

امام مسلم لکھتے ہیں:"أبو عبد الله محمد بن عمر بن واقد الواقدي قاضي بغداد متروك الحديث"،واقدی متروک الحدیث ہے۔

(الكنى والأسماء، ج1ص 499، المدينة المنورة)

امام ابوداود کہتے ہیں :"لا أكتب حديثه" کہ میں اس کی حدیث نہیں لکھتا۔

(تاريخ بغداد، ج 4، صفحه 20)

امام احمد بن حنبل کہتے ہیں :"هو كذّاب"، وہ بڑا جھوٹا ہے۔

(تاريخ بغداد، ج 4ص 20 / الضعفاء للعقيلي،ج 4ص 107، بيروت)

امام نسائی کہتے ہیں کہ:"الكذابون المعروفون بوضع الحديث على رسول الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أربعة..والواقدي ببغداد"،اللہ کے رسول پر جھوٹ گھڑنے والے بڑے جھوٹے چار ہیں،ان میں سے ایک بغداد میں مقیم واقدی ہے۔

(تاريخ بغداد، ج 15ص207)

نیز امام نسائی نے اسے"متروك الحديث"بھی لکھا ہے۔

(الضعفاء والمتروكون للنسائي، ص92، دار الوعي حلب)

امام ابوزرعہ رازی کہتے ہیں"یہ ضعیف ہے"۔

(الجرح والتعديل، ج8ص21، حيدر آباد دكن)

امام بیہقی کہتے ہیں کہ:"الْوَاقِدِيُّ لَا يُحْتَجُّ بِهِ" واقدی سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی۔ نیز فرماتے ہیں:"لَيْسَ بِالْقَوِيِّ" وہ مضبوط راوی نہیں ہے۔

(السنن الكبرى للبيهقي،ج1ص 62 / ج2ص189، دار الكتب العلمية بيروت)

اور ایک مقام پر یہی امام بیہقی"واقدی" کے بارے میں لکھتے ہیں :"لَا يُحْتَجُّ بِرِوَايَتِهِ فِيمَا

يُسْنِدُهُ، فَكَيْفَ بِمَا يُرْسِلُه"،اس کی جوروایت مسند ہواس میں یہ حجت نہیں ہے تواس کی مرسل روایت کیسے قابل قبول ہوگی؟

(معرفة السنن والآثار للبيهقي، ج 2ص79، دار قتيبة بيروت)

امام دارقطنی کہتے ہیں کہ"الْوَاقِدِيُّ ضَعِيف"،واقدی ضعیف ہے۔

(سنن الدار قطنی، ج3ص114/ص170/ص207، مؤسسة الرسالة بيروت)

ابن الجوزی کہتے ہیں کہ:"قَالَ أَحْمَدُ هُوَ كَذَّابٌ وَقَالَ الْبُخَارِيُّ وَالرَّازِيُّ وَالنَّسَائِيُّ مَتْرُوك"،امام احمد نے اسے کذاب اور امام بخاری،امام ابوحاتم رازی اور امام نسائی نے اسے متروک الحدیث کہا ہے۔

(التحقيق في مسائل الخلاف لابن الجوزي، ج2ص54، دار الكتب العلمية بيروت)

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں :"مُحَمَّدَ بْنَ عُمَرَ هُوَ الْوَاقِدِيُّ وَهُوَ ضَعِيف"محمد بن عمر واقدی ضعیف ہے۔

(التحقيق في مسائل الخلاف، ج 2ص 86)

ایک جگہ ایک سند جس میں واقدی ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:" لِأَنَّ ذَاكَ فِيهِ الْوَاقِدِيُّ وَقَدْ كَذَّبُوهُ"،اس سند میں واقدی ہے اور اسے (علماء حدیث نے) جھوٹا کہا ہے۔

(التحقيق في مسائل الخلاف، ج 2ص 277)

البندار محمد بن بشار نے کہا:"ما رأيت اكذب شفتين من الواقدي"،میں نے واقدی سے زیادہ جھوٹ بولنے والے ہونٹ نہیں دیکھے۔

(تاريخ بغداد، ج 4ص 20)

ابن الملقّن کہتے ہیں:"و الْوَاقِدِيّ كَذَّاب قَالَه أَحْمد، وَزَاد النَّسَائِيّ وضَّاع"،اور واقدی تو بڑا جھوٹا ہے،امام احمد نے ایسا فرمایا ہے،اور امام نسائی نے اسے"وضّاع" حدیثیں گھڑنے والا کہا ہے۔

(البدر المنير، ج4ص 542، دار الهجرة ، الرياض)

نیز کہتے ہیں:"والواقدي لَا يُحْتَج بِرِوَايَاتِهِ الْمُتَّصِلَة، فَكيف بِمَا يُرْسِلهُ أَو يَقُوله عَن

نَفسه؟"، واقدی کی وہ روایات بھی حجت نہیں جو متصل ہوں، تو اس کی مرسل روایت یا جو بات وہ اپنی طرف سے کہے کیسے حجت ہو سکتی ہے؟

(البدر المنير، ج 1ص 391، طبع دار الهجرة ، الرياض)

امام ذہبی لکھتے ہیں"وحاصل الأمر أَنَّهُ مُجْمَعٌ عَلَى ضعفه"، خلاصہ کلام یہ ہے کہ واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع ہے۔

(تاريخ الاسلام للذهبي، ج 5ص 182، دار الغرب الاسلامي، بيروت)

اسی جگہ لکھتے ہیں: "وقد وثّقه غير واحدٍ لكنْ لا عِبْرة بقولهم مَعَ توافر من تركه"، کئی ایک لوگوں نے اس کی توثیق کی ہے لیکن ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ جنہوں نے اسے ترک کیا ہے وہ وافر تعداد میں ہیں۔

(تاريخ الاسلام للذهبي، ج5ص182،دار الغرب الاسلامي، بيروت)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں : "واستقرّ الاجماع على وهن الواقدي"، واقدی کے ضعف پر اجماع ہو چکا ہے۔

(ميزان الاعتدال، ج3ص666، دار المعرفة بيروت)

ایک جگہ لکھتے ہیں: "قَدِ انْعَقَدَ الإِجْمَاعُ اليَوْمَ عَلَى أَنَّهُ لَيْسَ بِحُجَّةٍ، وَأَنَّ حَدِيْثَهُ فِي عِدَادِ الوَاهِي"، آج اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ وہ (واقدی) حجت نہیں ہے اور اس کی بیان کردہ حدیث واہی (بے کار) ہے۔

(سير اعلام النبلاء، ج4ص469، مؤسسة الرسالة بيروت)

امام نووی لکھتے ہیں کہ "مُحَمَّد بْن عُمَرَ الْوَاقِدِيُّ وَهُوَ ضَعِيفٌ بِاتِّفَاقِهِم"، واقدی بالاتفاق ضعیف ہے۔

(المجموع شرح المهذّب، ج5ص129، دار الفكر بيروت)

ابن القیم لکھتے ہیں: "الْوَاقِدِيّ لا يُحْتَجُّ بِهِ"، واقدی سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔

(المنار المنيف، ص 23، مكتبة المطبوعات الاسلامية، حلب)

امام ہیثمی ایک روایت کے بارے میں جس کی سند میں واقدی ہے لکھتے ہیں : "وَفِيهِ الْوَاقِدِيُّ، وَهُوَ كَذَّابٌ"، اس میں واقدی ہے، اور وہ بڑا جھوٹا ہے۔

(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ج1ص252، مكتبة القدسي القاهرة)

امام بوصیری لکھتے ہیں: "مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ الْوَاقِدِيُّ كَذّاب" محمد بن عمر واقدی بڑا جھوٹا ہے۔

(اتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، ج4ص291، دار الوطن ، الرياض)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں : "والواقدي لَيْسَ بمعتمد"، واقدی قابل اعتماد نہیں ہے۔

(فتح البارى، ج 1، ص 417، دار المعرفة بيروت)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں : "الْوَاقِدَيّ لَا يُحْتَجُّ بِهِ"، واقدی سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔

(فتح البارى، ج 4، ص 73)

حافظ ابن حجر ایک جگہ حافظ مغلطائی کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "لَكِنْ فِي الْأَسَانِيدِ الثَّلَاثَةِ الْوَاقِدِيُّ وَلَيْسَ بِحجَّة وَقد تعصّب مغلطاي لِلْوَاقِدِي فَنقل كَلَامَ مَنْ قَوَّاهُ وَوَثَّقَهُ وَسَكَتَ عَنْ ذِكْرِ مَنْ وَهَّاهُ وَاتَّهَمَهُ وَهُمْ أَكْثَرُ عَدَدًا وَأَشَدُّ إِتْقَانًا وَأَقْوَى مَعْرِفَةً بِهِ مِنَ الْأَوَّلِينَ"، ان تینوں سندوں میں واقدی ہے جو کہ حجت نہیں ہے، مغلطائی نے واقدی کے حق میں تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان لوگوں کا کلام تو نقل کیا ہے جنہوں نے واقدی کی توثیق کی ہے لیکن ان حضرات کے ذکر سے خاموشی اختیار کی ہے جنہوں نے واقدی کو واہی بتایا ہے اور اسے متہم بتایا ہے، جبکہ یہ (واقدی کو واہی اور متہم بتانے والے) تعداد میں زیادہ ہیں، اتقان میں زیادہ پختہ ہیں اور پہلے والوں (یعنی جنہوں نے اس کی توثیق کی ہے) کے مقابلے میں واقدی کی زیادہ معرفت رکھتے ہیں۔

(فتح البارى، ج 9، ص 113)

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں: "قُلْتُ مُحَمَّدُ بْنُ عُمَرَ هُوَ الْوَاقِدِيُّ ضَعِيفٌ جِدًّا"، میں کہتا ہوں کہ محمد بن عمر سے مراد واقدی ہے، اور وہ بہت زیادہ ضعیف ہے۔

(المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية، ج4، ص161، دار العاصمة ، السعودية)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: "محمد ابن عمر ابن واقد الأسلمي الواقدي المدني القاضي

نزيل بغداد متروك مع سعة علمه" محمد بن عمر بن واقد اسلمی واقدی مدنی قاضی، نزیل بغداد، وسیع علم رکھنے کے باوجود متروک ہے۔

(تقريب التهذيب، ص 498، دار الرشيد، سوريا)

امام سخاوی ایک روایت کی سند پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"وفيه الواقدي وهو ضعيف"،اس میں واقدی ہے اور وہ ضعیف ہے۔

(المقاصد الحسنة، ص 419، دار الكتاب العربي، بيروت)

عبد الرؤوف المناوی بھی ایک روایت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:"وَفِيه الْوَاقِدِيّ كَذَّاب"،اس کی سند میں واقدی ہے جو کہ بڑا جھوٹا ہے۔

(التيسير بشرح الجامع الصغير، ج1، ص 514، مكتبة الامام الشافعي، الرياض)

امام احمد بن حنبل نے تو واقدی پر"مفسّر جرح کی ہے" ابو حاتم رازی نے ان کی جرح کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں :

"كان الواقدي يقلب الاحاديث يلقى حديث ابن اخى الزهري على معمر ونحو هذا، قال اسحاق ابن راهويه كما وصف وأشد لانه عندي ممن يضع الحديث"۔

احمد بن حنبل نے فرمایا : واقدی احادیث کو الٹ پلٹ کر دیا کرتا تھا (یعنی احادیث کی سندوں کو تبدیل کر دیتا تھا) وہ زہری کے بھتیجے کی حدیث کو معمر کے ساتھ جوڑ دیا کرتا تھا، اسحاق بن راہویہ نے فرمایا کہ : ہاں بات ایسی ہی ہے جیسے امام احمد نے بیان کی، بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے، وہ (واقدی) میرے نزدیک تو ان لوگوں میں سے ہے جو حدیثیں گھڑا کرتے ہیں۔

(الجرح والتعديل ، ج8ص21، حيدرآباد دكن)

اسی طرح امام یحییٰ بن معین کی جرح بھی واقدی پر"مفسر" ہے، کہ وہ مجہول لوگوں سے منکر احادیث روایت کرتا تھا اس لئے ہم نے اسے ترک کر دیا (نظرنا في حديث الواقدي فوجدنا حديثه عن

المدنيين عن شيوخ مجهولين احاديث مناكير فقلنا يحتمل ان تكون تلك الاحاديث المناكير منه ويحتمل ان تكون منهم، ثم نظرنا إلى حديثه عن ابن ابي ذئب ومعمر فانه يضبط حديثهم فوجدناه قد حدث عنهما بالمناكير فعلمنا انه منه فتركنا حديثه)۔

(الجرح والتعديل ، ج8ص21، حیدرآباد دکن)

خود لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں "معروف بالکذب راوی" کے عنوان کے تحت امام نسائی کا وہ قول نقل کیا ہے جس میں ہے کہ "چار شخص کذاب وضع حدیث میں مشہور ہیں" اور ان میں ایک "واقدی" کو بھی شمار کیا ہے، نیز انہوں نے امام احمد بن حنبل اور امام ابوحاتم رازی کا قول بھی نقل کیا ہے کہ "واقدی کذاب اور واضع الحدیث ہے"۔

(دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 58)

اور پھر لکھا ہے کہ:

"مقصود یہ ہے کہ جانچ پڑتال کے بغیر واقدی کی کوئی روایت قبول نہیں کی جاسکتی اور صرف واقدی پر کسی مسئلہ کی مدار رکھنا درست نہیں ہے...."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 60)

یاد رہے! کسی ایک معروف امام جرح وتعدیل نے یہ نہیں لکھا کہ "یہ حدیث میں تو کذاب و وضاع ہے لیکن تاریخ کی روایات میں یہ قابل قبول اور ثقہ ہے"، جو آدمی نبی ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرتا ہو، اور جو حدیث کی سند بدل دیتا ہو اس کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ دعوی کرنا کہ یہ آدمی تاریخی روایات میں کبھی جھوٹ نہیں بولے گا، یہ دھوکا اور فریب ہے اور کچھ نہیں، نیز جرح وتعدیل کا معروف اصول ہے کہ "جرح مفسر" کے مقابلے میں تعدیل قابل قبول نہیں ہوتی۔

تو یہ ہے تعارف "محمد بن عمر واقدی" کا، اسے صرف "ضعیف" نہیں کہا گیا بلکہ "کذاب" اور "وضاع" کہا گیا ہے، بلکہ امام نسائی نے تو اسے "اللہ کے رسول پر جھوٹ بولنے والوں" میں شمار کیا ہے۔

لہذا ایسے کذاب راوی پر اعتماد کرتے ہوئے حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ انہوں نے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر شراب نوشی کا الزام لگایا، یہ بذات خود صحابی پر بہتان

ہی شمار ہوگا کیونکہ یہ بات ممکن نہیں کہ ایک صحابی کسی مسلمان پر بغیر شرعی ثبوت کے شراب نوشی کا الزام لگائے، جبکہ ہمارے پاس اس بات کو بیان کرنے والا" واقدی" جیسے کذاب کے علاوہ اور کوئی نہیں، یہ کوئی عام تاریخی بات نہیں کہ واقدی کی بات کو کسی درجہ میں قبول کرلیا جائے، بلکہ یہ شراب نوشی کے الزام کی بات ہے جس کے لئے شریعت نے ایک ضابطہ اور اصول مقرر کررکھا ہے، ہم اس جھوٹی روایت کا ذمہ دار واقدی کو سمجھتے ہیں اور حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ کو اس بیان سے بری سمجھتے ہیں۔

الغرض! اس روایت کی سند میں صرف" واقدی کذاب" کا ہونا ہی اسے باطل اور مردود روایت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

علاوہ ازیں مستدرک حاکم کی روایت کی سند میں موجود ایک اور راوی" الحسین بن الفرج" کے بارے میں بھی جان لیں، امام یحیٰ بن معین نے اسے" كذاب" اور" نشئی" (صاحب سکر) کہا ہے، امام ابوزرعہ رازی نے اسے" لا شيء" (ناچیز) کہا (دیکھیں: الجرح والتعديل، ج3، ص62، طبع حيدر آباد دكن)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ پورا واقعہ کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔

تاریخ ابن عساکر کی ایک روایت کا جائزہ

حضرت معقل بن سنان اشجعی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک اور روایت بھی" تاریخ مدینۃ دمشق" المعروف بہ" تاریخ ابن عساکر" کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے، جس کا حوالہ امام ذہبی نے یوں دیا ہے:

"وَقَالَ الْمَدَائِنِيُّ، عَنْ عَوَانَةَ، وَأَبِي زَكَرِيَّا الْعَجْلانِيِّ، عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ.."۔

(تاريخ الاسلام، ج2ص722، دار الغرب الاسلامي)

آئیے اس روایت کا بھی جائزہ لیتے ہیں، وہ روایت مع مکمل سند یہ ہے:

"أخبرنا أبو غالب الماوردي أنا أبو الحسين بن الطيوري أنا أبو الحسن محمد بن عبد الواحد بن محمد بن جعفر أنا أبو بكر أحمد بن الحسن بن إبراهيم بن شاذان أنا أبو بكر أحمد بن محمد بن شيبة بن أبي شيبة البزّاز أنا أبو جعفر أحمد بن الحارث

الخرّاز نا أبو الحسن علي بن محمد بن عبد الله بن أبي سيف المدائني عن عوانة وأبي زكريا العجلاني عن عكرمة بن خالد أن مسلماً لمّا دعا الناس إلى البيعة قال ليت شعري ما فعل معقل بن سنان الأشجعي وكان له مصافيا فخرج ناس من أشجع يطلبونه فأصابوه في قصر العرصة ويقال أصابوه في جبل أحد فقالوا له:الأمير يسأل عنك فارجع إليه قال أنا أعلم به منكم إنه قاتلي قالوا كلا فأقبل معهم فقال له مسلم مرحبا بأبي محمد ويقال قال له أبا عبد الرحمن وبها كان يكنى أظنك ظمآنا وأظن هؤلاء قد أتعبوك قال أجل قال شوبوا له عسلا بثلج من العسل الذي حملتموه لنا من حوارين ويقال قال خوضوا له سويق اللوز بالثلج ففعلوا وسقوه فقال سقاك الله أيها الأمير من شراب الجنة قال لا جرم والله لا تشرب بعدها لا أم لك شرابا حتى تشرب من حميم جهنم قال أنشدك الله والرحم قال ألست القائل ليلة لقيتك بطبرية وأنت منصرف من عند أمير المؤمنين وقد أحسن جائزتك سرنا شهرا وحسرنا ظهرا ورجعنا صفرا نرجع إلى المدينة فنخلع الفاسق شارب الخمر ونبايع رجلا من المهاجرين أو أبناء المهاجرين ياتيس أشجع فيم غطفان وأشجع من الخلع والتأمير إني والله عاهدت الله لا ألقاك في حرب أقدر فيها على قتلك إلا قتلتك وأمر به فقتل....."

(تاريخ ابن عساكر،ج59ص364و 365، دار الفكر بيروت)

خلاصہ اس روایت کا یہ ہے کہ: ”عکرمہ بن خالد“ نامی راوی کا بیان ہے کہ جب مسلم (بن عقبہ) نے مدینہ والوں کو (یزید) کی بیعت کی طرف بلایا (غالباً واقعہ حرّہ کے دوران یا اس کے

بعد) تو اس نے معقل بن سنان اشجعی کے بارے میں کہا کہ: کاش معقل نے ایسا نہ کیا ہوتا، پس اشجع قبیلہ کے لوگ ان (یعنی معقل بن سنان اشجعی) کی تلاش میں نکلے، تو انہیں قصر العرصہ نامی جگہ میں پایا (یہ مدینہ کے نواح میں ایک مقام ہے) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں جبل احد میں پایا، تو ان لوگوں نے معقل سے کہا: امیر (یعنی مسلم بن عقبہ) آپ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں تو ان کے پاس لوٹ چلیں، معقل نے کہا: میں اسے تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مجھے قتل کر دے گا، ان لوگوں نے کہا کہ: نہیں ایسا ہر گز نہیں ہوگا، تو معقل ان کے ساتھ آ گئے، پس مسلم (بن عقبہ) نے ان سے کہا: خوش آمدید" ابو محمد"، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلم بن عقبہ نے انہیں" ابو عبد الرحمن" کے ساتھ مخاطب کیا جو کہ ان کی کنیت تھی، اور کہا: میرا خیال ہے آپ پیاسے ہیں اور ان لوگوں نے آپ کو تھکا دیا ہے، تو (معقل نے) کہا: ہاں ایسی ہی بات ہے، تو (مسلم بن عقبہ) نے کہا کہ ان کے لیے وہ شہد برف ڈال کر لاؤ جو تم حوارین (ایک مقام کا نام) سے اپنے ساتھ لائے ہو، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے کہا کہ ان کے لیے بادام کا ٹھنڈا مشروب تیار کرو اور انہیں پلاؤ، چنانچہ انہیں پلایا گیا، تو انہوں نے کہا : اے امیر! اللہ آپ کو جنت کا مشروب پلائے، تو جواب میں اس نے (یعنی مسلم بن عقبہ) نے کہا: وہ تو ضرور ہوگا، لیکن آپ اس کے بعد جہنم کے کھولتے پانی کے سوا کچھ نہیں پیئیں گے، تو معقل نے کہا: میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں اور رحم یعنی رشتہ داری کا، تو (مسلم) نے کہا: کیا آپ کو یاد نہیں جس رات ہم طبریہ میں ملے تھے، اور آپ امیر المؤمنین (یعنی یزید) کے پاس سے ہو کر آ رہے تھے جس نے آپ کو اچھا انعام واکرام دیا تھا، اور آپ نے اس وقت کہا تھا کہ: ہم نے مہینے کا سفر کیا، اور (سواری) کی پیٹھ تھکا دی، لیکن کچھ حاصل نہ ہوا، پس ہم اس فاسق اور شرابی کی بیعت توڑ دیں گے اور مہاجرین یا مہاجرین کی اولاد میں سے کسی شخص کی بیعت کریں گے.. اور پھر مسلم نے کہا کہ: میں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر آپ مجھے کسی جنگ میں ملے اور مجھے آپ کے قتل پر قدرت حاصل ہوئی تو میں آپ کو قتل کر دوں گا، پس اس کے حکم سے انہیں قتل کر دیا گیا۔ (روایت کا مفہوم ختم ہوا)

اس روایت کو بھی یزید کے" شراب نوش" اور" فاسق" ہونے کی شہادت کے طور پر اور اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ مسلم بن عقبہ نے حضرت معقل بن سنان ﷛ کو امان دے کر قتل کروا دیا تھا ،تو ہم اس پر بھی کچھ عرض کرتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ کہ اس روایت میں جس طرح یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو یہ واقعہ بیان کر رہا ہے وہ خود وہاں موجود نہ تھا بلکہ اس نے کسی اور سے یہ سنا ہے،ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ :

"قبیلہ والوں نے انہیں قصر العرصہ نامی جگہ میں پایا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں جبل احد میں پایا"۔

اور وہ یوں نہ کہتا کہ :

"مسلم بن عقبہ نے حضرت معقل بن سنان کو ابو محمد کہہ کر مخاطب کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابو عبد الرحمن کہہ کر مخاطب کیا"۔

پھر وہ یہ بھی نہ کہتا کہ مسلم بن عقبہ نے:

"شہد کا ٹھنڈا مشروب پلانے کا کہا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادام کا مشروب پلانے کا کہا"۔

اس طرزِ بیان سے صاف اور واضح ہو گیا کہ اگر یہ بات اس روایت کے مطابق"عکرمہ بن خالد" نامی راوی ہی بیان کر رہا ہے تو وہ اس واقعہ کے وقت مسلم بن عقبہ اور حضرت معقل بن سنان کے پاس نہیں تھا ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ" یہ بھی کہا گیا ہے کہ...... "،لہٰذا یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ"عکرمہ بن خالد" نے یہ واقعہ کس سے سنا ہے اور یہ باتیں کس نے کہیں؟

یاد رہے!اسے راوی کا وہم بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ یوں نہیں بیان کر رہا کہ" مجھے بھول گیا کہ لوگوں نے معقل بن سنان کو قصر العرصۃ میں پایا یا جبل احد میں،اور مجھے یاد نہیں رہا کہ مسلم بن عقبہ نے حضرت معقل بن سنان کو ابو محمد کی کنیت سے مخاطب کیا یا ابو عبد الرحمن کی کنیت سے،اور مجھے یاد نہیں آرہا کہ انہیں شہد کا مشروب پلانے کا کہا یا بادام کا"،بلکہ" ویُقال" کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ" یہ بھی کہا گیا ہے"، کہنے والا کون ہے؟ کوئی علم نہیں۔

دوسری بات یہ کہ"عکرمہ بن خالد" نامی بھی دو آدمی ہیں اور دونوں کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی ہے،قاضی

ابویعلی بغدادی حنبلی (م580ھ) نے لکھا ہے :

"عكرمة بن خالد، اثنان مخزوميان أحدهما مكي وهو: عكرمة بن خالد بن سعيد بن العاص بن هشام........ والآخر مدني وهو: عكرمة بن خالد بن سلمة......"۔

عکرمہ بن خالد نام کے دو راوی ہیں اور دونوں مخزومی ہیں، ان میں سے ایک مکہ کے رہنے والے ہیں، ان کا نام عکرمہ بن خالد بن سعید بن العاص بن ہشام ہے.... اور دوسرے مدینہ کے رہنے والے ہیں، ان کا نام عکرمہ بن خالد بن سلمہ ہے۔

(تجريد الأسماء والكنى المذكورة في كتاب المتفق والمفترق للخطيب البغدادي، ج2ص164، مركز النعمان، اليمن)

اب یہاں تاریخ ابن عساکر کی روایت میں آخری راوی صرف "عکرمہ بن خالد" مذکور ہے، اس کے بعد دادا یا پردادا کا نام نہیں لکھا تو غالب گمان یہی ہے کہ یہ واقعہ چونکہ مدینہ کا ہے اس لیے یہ "عکرمہ بن خالد بن سلمہ مدنی" ہے (اگرچہ واقعہ اس کا بھی چشم دید نہیں ہے بلکہ اس نے بھی کسی سے سنا ہے جیسا کہ واقعہ کے انداز بیان سے ظاہر ہے)، اور "عکرمہ بن خالد بن سلمہ" کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کا کہنا کچھ یوں ہے :

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے "منكر الحديث" کہا۔

(التاريخ الكبير،ج7،ص 49،حيدر آباد دكن/ الضعفاء الصغير للبخاري، ص 111، حيدر آباد دكن)

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے "ضعیف" کہا۔

(الضعفاء والمتروكون للنسائي، ص86، دار الوعي حلب)

امام ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "منكر الحديث" کہا۔

(الجرح والتعديل، ج7، ص 9، حيدر آباد دكن)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے "ضعیف" کہا۔

(تاريخ الاسلام، ج3، ص 282طبع دار الغرب الاسلامي)

تیسری بات یہ کہ تاریخ ابن عساکر کی مندرجہ بالا روایت میں "عکرمہ بن خالد" سے روایت کرنے والے دو راوی مذکور ہیں، ایک "عوانہ" اور دوسرے "ابوزکریا العجلانی"، جبکہ اسی سند کے ساتھ یہی روایت

(الفاظ کے فرق کے ساتھ) اسی تاریخ ابن عساکر کی جلد 54 صفحہ 181 پر بھی ہے، لیکن وہاں سند یوں ہے: "عن أبي زكريا العجلاني عن عكرمة بن خالد وعوانة...... الخ" یعنی اکیلے "ابوزکریا العجلانی" نے "عکرمہ بن خالد" اور "عوانہ" دونوں سے روایت کیا ہے، اب کون سی سند درست ہے؟ واللہ اعلم۔

چوتھی بات یہ کہ "ابوزکریا العجلانی" مجہول راوی ہے اور اس کا تعارف یا توثیق وتعدیل ہمیں تلاش بسیار کے باوجود کہیں نہیں ملی، بلکہ ایک معاصر عالم اكرم بن محمد زيادة الفالوجي الأثري، جنہوں نے ان راویوں کی معجم ترتیب دی ہے جن سے ابن جریر طبری نے روایت کی ہے انہوں نے بھی "ابوزکریا العجلانی" کے بارے میں لکھا ہے

" لم أعرفه، ولم أجد له ترجمة" میں اسے نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے اس کا تعارف کہیں ملا ہے۔

(المعجم الصغير لرواة الإمام ابن جرير الطبري، ج2ص704، دار ابن عفان، القاهرة)

نیز اس روایت کی سند میں ایک راوی "عوانہ" ہے، اگر اس سے مراد "عوانہ بن الحکم" ہے تو اس کی توثیق بھی کہیں نہیں ملتی، امام ذہبی نے بھی اتنا لکھا ہے:

"أخباريٌّ مشهور عراقيٌّ .... وَقَلَّ أَنْ رَوَى حديثًا مسنَدًا، ولهذا لم يُذكر بجرح ولا تعديل، والظاهر أَنَّهُ صدوق"۔

تاریخی روایات بیان کرنے والا مشہور عراقی ہے، بہت کم روایتیں سند کے ساتھ بیان کرتا ہے اسی لئے نہ اس پر کوئی جرح ملتی ہے اور نہ اس کی تعدیل ملتی ہے، ظاہری طور پر لگتا ہے کہ یہ صدوق ہے۔

(تاريخ الاسلام للذهبي، ج4ص174، دار الغرب الاسلامي)

حافظ ابن حجر اسی "عوانہ بن الحکم" کے بارے میں لکھتے ہیں :

"كان أبوه عبدا خياطا وأمه أمة وهو كثير الرواية عن التابعين قل أن روى حديثا مسندا وأكثر المدائني عنه" ۔

اس کا باپ ایک غلام تھا جو کہ درزی تھا اور اس کی ماں ایک باندی تھی، وہ تابعین سے بہت سی

باتیں روایت کرتا ہے لیکن بہت کم ایسا ہے کہ اس نے کوئی بات مسند بیان کی ہو، مدائنی نے اس سے بہت زیادہ روایات لی ہیں۔

(لسان الميزان بتحقيق شيخ ابي غدة،ج6ص247، دار البشائر الاسلامية)

لہٰذا معلوم ہوا کہ "عوانہ بن الحکم" کی تعدیل و توثیق کہیں نہیں ملتی نیز اس کی اکثر روایات غیر مسند ہی ہوتی ہیں۔

پانچویں بات یہ کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ کو مسلم بن عقبہ نے خوش آمدید کہا اور پھر ٹھنڈا شربت پلایا، اور جب انہیں یہ کہا کہ میں آپ کو قتل کرنے لگا ہوں، تو انہوں نے مسلم بن عقبہ کو اللہ تعالیٰ اور رحمی تعلق داری کا واسطہ دے کر عفو و درگزر کی درخواست کی، یہ بات ہضم ہونے والی نہیں، کیونکہ اگر واقعی حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ جو فیصلہ انہوں نے کیا وہ بالکل درست تھا تو انہیں معافی کی درخواست کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس روایت کے ان الفاظ سے ایک صحابی کی ذات پر حرف آتا ہے کہ جب انہوں نے موت سامنے دیکھی تو رحم کی درخواست کرنے لگے اور مسلم بن عقبہ کو "امیر" کہہ کر بلانے لگے، اور یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ اگر مسلم بن عقبہ نے انہیں قتل ہی کرنا تھا تو پھر ان کی تواضع ٹھنڈے مشروبات سے کیوں کی؟۔

چھٹی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فرض کر لیا جائے کہ یہ روایت سنداً و متناً و درایتاً ہر حیثیت سے صحیح اور متصل ہے تو بھی اس روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس بات کی دلیل ہو کہ حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ نے یوں گواہی دی کہ" میں نے یزید کو شراب پیتے دیکھا اور اسے فلاں فسق والا کام کرتے دیکھا ہے"۔

تو یہ ہے حال اس روایت کا جس کا لعل شاہ صاحب نے حوالہ دیا ہے، اور جس کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ چونکہ یزید کو شرابی کہتے تھے اور اس پر طعن کرتے تھے، اس لئے مسلم بن عقبہ نے انہیں امان دے کر قتل کروا دیا۔

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ

لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

"انہوں نے بھی یزید کو شراب نوش کہا تھا، یزید کے حکم سے عامل مدینہ نے انہیں حد لگائی تھی،

اس پر حضرت مسور رضی اللہ عنہ نے مندرجہ ذیل شعر کہا تھا:

ایشربها صرفاً بفك ختامها .. ابوخالد ويجلد الحد المسور

تعجب ہے کہ مہر توڑ کر خالص شراب ابو خالد پیئے اور حد مسور کو لگائی جائے

یہ واقعہ سنہ 63ھ سے قبل مدینہ منورہ میں پیش آیا، اس کے بعد حضرت مسور ابن مخرمہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور حصار مکہ کے دوران جب حرم مکہ پر منجنیقوں سے سنگباری کی گئی تو انہیں حطیم میں نماز پڑھتے ہوئے ایک پتھر لگا جس سے یہ شہید ہو گئے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 388)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب نے اگرچہ اس افسانے کا کوئی حوالہ نہیں دیا لیکن جب ہم نے تلاش کیا تو یہ بات احمد بن یحیٰی البلاَ ذُری (م 279ھ) کی کتاب "جمل من انساب الاشراف" میں اس طرح لکھی ہے :

"وقال عوانة :كان مسور بُن مخرمة وفد إلى يزيد قبل ولاية عثمان بُن محمد، فلما قدم شهد عليه بالفسق وشرب الخمر، فكتب إلى يزيد بذلك فكتب إلى عامله يأمره أن يضرب مسورا الحدّ، فقال ابو حُزّة :

أيشربها صهباء كالمسك ريحها

أَبُو خالد ويضرب الحدّ مسور

خلاصہ یہ ہے کہ "عوانہ" نے کہا ہے کہ مسور بن مخرمہ یزید کے پاس گئے تھے اور جب واپس لوٹے تو انہوں نے یزید کے خلاف فسق اور شراب نوشی کی گواہی دی، یزید کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنے عامل کو لکھا کہ ان پر حدّ لگائی جائے، ابو حُزّہ نامی شاعر نے اس پر کہا کہ:

تعجب ہے کہ سفید انگور کی شراب جس کی خوشبو مسک جیسی ہے تو ابو خالد (یعنی یزید۔ناقل) پیئے، اور حد مسوّر پر لگائی جائے۔

(جمل من انساب الاشراف للبلاذري، ج 5ص338دار الفكر)

اس پر ہم سر دست اتنا ہی عرض کریں گے کہ بلاذری نے یہ بات "عوانة بن الحكم الكوفي" سے نقل کی جس کی وفات سنہ 158ھ میں ہوئی (تاريخ الاسلام للذهبی، ج4ص174، دار الغرب الاسلامي) اور لعل شاہ صاحب کے دعوے کے مطابق یہ واقعہ سنہ 63ھ سے قبل مدینہ منورہ میں پیش آیا، اور مندرجہ بالا روایت میں صرف "قال عوانة" ہے، لیکن عوانہ نے یہ بات کس سے سنی؟ کچھ اتا پتا نہیں، اور یہ ثابت ہی نہیں کہ اس نے خود سنہ 63ھ یا اس سے قبل کا زمانہ پایا ہو۔ اس طرح بلاذری کی وفات سنہ 279ھ میں ہوئی، یوں ان کی اور عوانہ بن الحکم کی وفات کے درمیان تقریباً 120 سال کا فاصلہ ہے، تو انہوں نے یہ بات خود عوانہ سے سنی یا درمیان میں کوئی اور واسطہ ہے؟ باقی "عوانہ بن الحکم" کا تعارف ہم پہلے کروا آئے ہیں۔

نیز لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ جب عامل مدینہ نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ پر حد لگائی تھی تو" اس پر حضرت مسور رضی اللہ عنہ نے شعر کہا تھا"، جبکہ "انساب الاشراف" سے معلوم ہوا کہ یہ شعر "ابوحزہ" نامی کسی شاعر کا ہے۔

پھر اگر بالفرض اس "غیر مستند" روایت کو ایک منٹ کے لئے صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو سوال یہ ہے کہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ پر "حد" کس بات پر لگائی گئی؟ بادی النظر میں یہ "حد قذف" معلوم ہوتی ہے، اور یہ اس وقت لگائی جاتی ہے جب کوئی کسی پر بدکاری و حرامکاری کا الزام لگائے اور پھر شریعت کے اصول وضوابط کے مطابق اپنے الزام کا کوئی ثبوت نہ پیش کر سکے، تو کیا حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی ثبوت اور شرعی شہادت کے یزید پر ایسا کوئی الزام لگایا ہوگا؟ اس لئے اس روایت سے ایک صحابی پر بھی بہتان آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ

لعل شاہ صاحب نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے:

"... مخالفین یزید اور مخالفین بیعت کے ساتھ تھے پس یوم حرہ میں قتل کیے گئے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 389)

لعل شاہ صاحب نے اس بات کے لئے مختلف کتب کے حوالے دیے ہیں، لیکن ان کتب میں سے کسی میں بھی ان کے اس دعوے کی کوئی سند مذکور نہیں کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے

ساتھ تھے جنہوں نے یزید کی بیعت توڑی تھی اور نہ ہی اس بات کی کوئی سند ہے کہ وہ جنگ حرہ میں قتل کیے گئے، بلکہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بیعت توڑنے والوں کا ساتھ نہیں دیا تھا، ملاحظہ ہو:

"حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ، عَنْ أَخِيهِ، عَنْ سُلَيْمَانَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ الحَرَّةِ، وَالنَّاسُ يُبَايِعُونَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ حَنْظَلَةَ، فَقَالَ ابْنُ زَيْدٍ :عَلَى مَا يُبَايِعُ ابْنُ حَنْظَلَةَ النَّاسَ؟ قِيلَ لَهُ: عَلَى المَوْتِ، قَالَ: لاَ أُبَايِعُ عَلَى ذَلِكَ أَحَدًا بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ شَهِدَ مَعَهُ الحُدَيْبِيَةَ"۔

عباد بن تمیم بیان کرتے ہیں کہ جب حرہ کے دن (یعنی حرہ کی لڑائی میں) لوگ عبداللہ بن حنظلہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ابن حنظلہ سے کس بات پر بیعت کی جا رہی ہے؟ تو آپ کو بتایا گیا کہ موت پر۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب میں کسی سے بھی موت پر بیعت نہیں کروں گا۔(راوی کہتا ہے کہ) وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔

(صحیح البخاری، باب غزوة الحدیبیة)

یہی روایت امام بخاری نے ایک دوسری سند کے ساتھ بھی دوسرے مقام پر ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے:

"حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ، حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: لَمَّا كَانَ زَمَنُ الحَرَّةِ أَتَاهُ آتٍ فَقَالَ لَهُ: إِنَّ ابْنَ حَنْظَلَةَ يُبَايِعُ النَّاسَ عَلَى المَوْتِ، فَقَالَ: لاَ أُبَايِعُ عَلَى هَذَا أَحَدًا بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"۔

(صحیح البخاری، بَابُ البَيْعَةِ فِي الحَرْبِ أَنْ لاَ يَفِرُّوا، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: عَلَى المَوْتِ)

نیز امام مسلم نے بھی یہ روایت اس سند کے ساتھ نقل کی ہے:

"حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ، أَخْبَرَنَا الْمَخْزُومِيُّ، حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ، حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ....."۔

(صحیح مسلم،بَابُ اسْتِحْبَابِ مُبَايَعَةِ الْإِمَامِ الْجَيْشَ عِنْدَ إِرَادَةِ الْقِتَالِ، وَبَيَانِ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ تَحْتَ الشَّجَرَةِ)

مفہوم ان سب کا ایک ہی ہے، معلوم ہوا کہ صحابی حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ بھی بیعت توڑنے والوں کے طرز عمل سے متفق نہیں تھے اور ان کے طریقۂ بیعت پر بھی انہیں اعتراض تھا۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ واقعہ حرہ میں مقتول ہوئے، تو اولاً یہ بات کسی صحیح سند سے ثابت نہیں، اور ثانیاً اگر بالفرض یہ واقعہ حرہ کے دوران ہی قتل ہوئے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا انہیں باغیوں کے خلاف کارروائی کرنے والی سرکاری فوج نے قتل کیا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ انہیں ان لوگوں نے قتل کر دیا ہو جن سے انہوں نے اختلاف کیا اور ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے؟

تنبیہ

امام بخاری کی" التاریخ الاوسط" میں مندرجہ بالا روایت ایک اور سند کے ساتھ یوں نقل کی گئی ہے:

"حدثني الأويسي حَدَّثَنِي الدَّرَاوَرْدِيُّ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ زيد قتل يَوْم الْحرَّة فَأَتى فَقيل هَذَا بن حَنْظَلَةَ يُبَايِعُ النَّاسَ عَلَى الْمَوْتِ قَالَ لَا أُبَايِعُ عَلَى هَذَا بَعْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم"۔

(التاريخ الاوسط للبخاری، ج2ص761، مكتبة الرشد، الرياض)

اس روایت میں ایک اضافی بات بیان ہوئی ہے کہ" أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ زيد قتل يَوْم الْحرَّة" کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ جنگ حرہ والے دن مقتول ہوئے۔ تو یہ اضافہ غیر ثابت اور ضعیف ہے، کیونکہ اس روایت میں" عمرو بن یحیٰ" سے بیان کرنے والے راوی" الدراوردی" ہیں جن کا نام" عبدالعزیز بن محمد الدراوردی" ہے، یہ اگرچہ ثقہ ہیں لیکن اغلاط و اوہام کا شکار بھی ہوا کرتے تھے، چنانچہ امام ابن حبان نے لکھا

ہے:

"وَكَانَ يخطيء" یعنی یہ غلطیاں کرتے تھے۔

(الثقات لابن حبان، ج7ص116، حیدرآباد دکن، الهند)

امام ابن ابی حاتم رازی نے امام ابوزرعہ رازی سے نقل کیا ہے کہ:

"عبد العزيز الدراوردى سيئ الحفظ فربما حدث من حفظه الشئ فيخطئ"

یعنی عبدالعزیز الدراوردی بُرے حافظے والے تھے، کبھی یہ اپنے حافظہ سے کوئی چیز بیان کرتے تو غلطی کر جاتے۔

(الجرح والتعديل، ج5ص396، حيدر آباد دكن، الهند)

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ:

"قال أحمد بن حنبل: إذا حدث من حفظه يهم، ليس هو بشئ، وإذ حدث من كتابه فنعم، وقال أحمد أيضاً: إذا حدث من حفظه جاء ببواطيل.... وقال أبو حاتم: لا يحتج به.... وقال أبو زرعة: سيئ الحفظ"۔

امام احمد بن حنبل نے کہا: یہ جب اپنے حافظے سے کچھ بیان کریں تو کبھی وہم کا شکار ہو جاتے ہیں اسلئے اس صورت میں یہ معتبر نہیں، اور اگر اپنی لکھی ہوئی کتاب سے بیان کریں تو پھر ان کی روایت قابل قبول ہے۔ امام احمد نے یہ بھی کہا کہ: جب یہ اپنے حافظے سے کچھ بیان کرتے ہیں تو کبھی باطل چیزیں بھی بیان کر جاتے ہیں۔ ابو حاتم رازی نے کہا: ان سے حجت نہ پکڑی جائے۔ امام ابوزرعہ نے کہا: یہ بُرے حافظے والے تھے۔

(ميزان الاعتدال، ج2ص553، دار الرسالة دمشق)

اور "الدراوردی" نے اس روایت میں اپنے سے احفظ راوی کی مخالفت کی ہے، چنانچہ پہلے صحیح بخاری کی دو روایات نقل کی گئیں جن میں سے پہلی روایت میں "عمرو بن يحيىٰ" سے روایت کرنے والے "سليمان بن بلال التيمي" ہیں، اور دوسری بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت میں "عمرو بن

یحییٰ" سے روایت کرنے والے" وهيب بن خالد الباهلی" ہیں، یہ دونوں" الدراوردی" سے احفظ ہیں اوران دونوں نے یہ بات بیان نہیں کی کہ" عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ حرہ کے دن مقتول ہوئے تھے"۔

نیز یہی روایت حافظ ابن عساکر نے بھی نقل کی ہے جس میں" عمرو بن یحییٰ" سے روایت کرنے والے راوی" محمد بن فُلیح" ہیں، وہ بھی یہ اضافہ نقل نہیں کرتے۔

(تاریخ دمشق، ج27ص429)

لہٰذا عبدالعزیز بن محمد الدراوردی نے جو حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے حرہ کے دن قتل ہونے والی بات نقل کی ہے یہ ثقہ وثبت کے بالمقابل ایک صدوق سیئ الحفظ کا غیر مقبول اضافہ ہے اور اکثر کے بھی خلاف ہے۔

حضرت حارث بن عبداللہ بن کعب الانصاری رضی اللہ عنہ

لعل شاہ صاحب ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ جلیل القدر صحابی ہیں، بیعت رضوان کا شرف حاصل ہے، یہ بھی یزید کے مخالفین اور مخالفین بیعت کے ساتھ تھے اور یوم حرہ میں شہید ہوئے۔ شهد الحديبية وقُتِل يوم الحرة (تجريد اسماء الصحابة،ص111)۔

(استخلاف یزید، صفحہ 309)

یہاں لعل شاہ صاحب نے جس کتاب" تجريد اسماء الصحابة" کا حوالہ دیا ہے اس میں صرف اتنا لکھا ہے کہ:

"الحارث بن عبدالله بن كعب الانصاري، شهد الحديبية وقتل يوم الحرة، قاله ابو عمر"۔

یہ حدیبیہ (یعنی بیعت رضوان) میں موجود تھے اور حرہ کے دن مقتول ہوئے، یہ بات ابو عمر نے کہی ہے۔

(تجريد اسماء الصحابة للذهبي، ج1ص104، دار المعرفة بيروت)

ملاحظہ فرمائیں! ایک تو یہاں ایسی کوئی بات نہیں لکھی کہ "یہ بھی یزید کے مخالفین اور مخالفین بیعت کے ساتھ تھے"، یہ لعل شاہ صاحب نے اپنی طرف سے لکھا ہے، جبکہ وہ خود آگے حافظ ابن کثیر کے حوالے سے یہ بات نقل کرتے ہیں کہ:

"قد قُتل من الفریقین خلق من السادات والاعیان .."

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) فریقین میں بہت سے سادات اور اعیان میں سے قتل کیے گئے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 390)

تو جب دونوں جانب سے بہت سے سادات اور معززین مقتول ہوئے تو بلا کسی دلیل یا معتبر سند کے یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ یہ صحابی یزید کی بیعت توڑ کر اس کے خلاف خروج کرنے والے فریق کے ساتھ ہی تھے؟ جبکہ یہ بات کتب تاریخ میں صراحت کے ساتھ لکھی ہے کہ مدینہ کے اندر بہت سے لوگ ایسے بھی تھے (جن میں اکابر صحابہ اور افراد اہل بیت نبوت بھی شامل تھے) جو بیعت توڑنے والوں کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے۔

دوسرا، امام ذہبی (م748ھ) نے یہ بات "ابو عمر" کے حوالے سے نقل کی ہے کہ ان کا ایسا کہنا ہے ۔ ان "ابو عمر" سے مراد "الاستیعاب في معرفة الاصحاب" کے مصنف ابو عمر یوسف بن عبداللہ (م463ھ)" ہیں جو "ابن عبد البر" کے نام سے مشہور ہیں، جبکہ یہ امام ذہبی کا وہم ہے، ابن عبد البر نے "حارث بن عبداللہ بن کعب الانصاری" کا تعارف اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا، حافظ ابن حجر نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:

"وعزاه الذهبيّ لأبي عمر ، فأوهم أنه ترجم له، وليس كذلك" ۔

ذہبی نے یہ بات ابو عمر کی طرف منسوب کی ہے، انہیں وہم ہوا ہے کہ (ابو عمر) نے ان صحابی کا تعارف کروایا ہے، جبکہ ایسا نہیں ہے۔

(الاصابة في تمييز الصحابة، ج2ص367، دار هجر القاهرة)

تیسرا، جس نے بھی یہ بات کہی ہے کہ یہ صحابی "حرہ کے دن مقتول ہوئے" اس نے اس بات کی کوئی سند نہیں ذکر کی، لہٰذا یہ قول بلا سند ہے۔

حضرت معاذ بن الحارث الانصاری رضی اللہ عنہ

ان کے بارے میں لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"بلند مرتبہ صحابی ہیں، حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں نماز تراویح کا امام مقرر کیا تھا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابو عمر (ابن عبد البر۔ناقل) کا قول ہے کہ غزوۂ خندق میں حاضر تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے آنحضور ﷺ کی حیات سے صرف چھ برس پائے تھے، حافظ صاحب نے اسی قول کو راجح اور محقق قرار دیا ہے، کیونکہ ابن سعد اور ابو احمد حاکم نیز ابو حاتم الرازی متفق ہیں کہ یوم حرہ میں شہید ہوئے اور ابن حبان کا قول ہے کہ عاش تسعاً وستین سنة یعنی 69 برس زندہ رہے پس معلوم ہوا کہ 69-63=6 کہ آنحضور ﷺ کی حیات سے چھ برس پاسکے ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 391)

یعنی ان کا شمار "صغار صحابہ" میں ہوگا، ویسے تو تمام اصحاب رسول ﷺ بلند مرتبہ ہیں، لیکن لعل شاہ صاحب نے حضرت معاذ بن الحارث الانصاری رضی اللہ عنہ کو جو خاص طور پر "بلند مرتبہ" لکھا ہے اگر بایں معنی ہے کہ ان کا شمار "کبار صحابہ" میں ہوتا ہے تو یہ درست نہیں۔

پھر لعل شاہ صاحب نے حافظ ابن حجر کی کتاب "الاصابۃ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ بھی حرہ کے دن شہید ہوئے تھے، اور دعویٰ کیا ہے کہ:

"یزید کی مخالفت میں نہایت شدت سے قائم رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 391)

جبکہ حافظ ابن حجر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ:

"قال ابن سعد، وأبو أحمد الحاكم: قتل يوم الحرّة، وقال أبو حاتم الرازيّ: يقال إنه قتل بالحرّة، وقال ابن حبان: عاش تسعا وستين سنة"۔

ابن سعد (م 230ھ) اور ابو احمد الحاکم (م 378ھ) کا قول ہے کہ یہ حرہ کے دن مقتول

ہوئے، ابو حاتم رازی (م 277ھ) کا قول ہے: کہا جاتا ہے کہ وہ حرہ میں مقتول ہوئے تھے، ابن حبان کا قول ہے کہ وہ انہتر سال زندہ رہے۔

(الاصابة في تمييز الصحابة، ج10ص208، دارهجر،القاهرة)

یہ صرف مذکورہ حضرات کے اقوال ہیں، کوئی سند کسی نے ذکر نہیں کی کہ یہ واقعہ حرہ میں مقتول ہوئے، پھر امام ابو حاتم رازی نے اسے "یُقال" یعنی تمریض کے صیغے کے ساتھ بیان کیا ہے جو اس قول کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ ہے، ثانیاً یہاں ایسی کوئی بات مذکور نہیں کہ "یہ یزید کی مخالفت پر نہایت شدت سے قائم رہے"، یہ لعل شاہ صاحب کا اپنی طرف سے اضافہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے

لعل شاہ صاحب نے حافظ ابن کثیر (م 774ھ) کا قول یوں نقل کیا ہے کہ:

"قد قُتل من الفريقين خلق من السادات والاعيان منهم عبدالله بن حنظلة الغسيل واخوه الخيفي محمد بن ثابت بن قيس بن شماس.."

(ترجمہ از لعل شاہ صاحب) فریقین میں بہت سے سادات اور اعیان میں سے قتل کئے گئے، ان میں سے حضرت عبداللہ بن حنظلہ الغسیل اور اس کے خیفی بھائی محمد ابن ثابت ابن قیس ابن شماس ہیں۔

(استخلاف یزید، صفحہ 390)

جبکہ حافظ ابن کثیر کی عبارت کے مکمل الفاظ یہ ہیں:

"وَقَدْ قُتِلَ مِنَ الْفَرِيقَيْنِ خَلْقٌ مِنَ السَّادَاتِ وَالْأَعْيَانِ، مِنْهُمْ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُطِيعٍ، وَبَنُونَ لَهُ سَبْعَةٌ بَيْنَ يَدَيْهِ، وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ حَنْظَلَةَ الْغَسِيلُ، وَأَخُوهُ لِأُمِّهِ مُحَمَّدُ بْنُ ثَابِتِ بْنِ شَمَّاسٍ...."۔

فریقین میں سے بہت سے نمایاں و سربرآوردہ لوگ قتل کیے گئے، ان میں عبداللہ بن مطیع اور

ان کے سات بیٹے بھی تھے، اور عبداللہ بن حنظلہ الغسیل اور ان کے ماں شریک (اخیافی) بھائی محمد بن ثابت بن شماس...۔

(البداية والنهاية، ج8ص310، وزارة الاوقاف قطر)

پھر لعل شاہ صاحب نے ابن حزم ظاہری (م456ھ) کا قول نقل کیا ہے کہ:

"قال ابن حزم قُتل معه ثمانية من بنيه"۔

ابن حزم کہتے ہیں عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے آٹھ بیٹے بھی ان کی معیت میں شریک تھے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 390)

آگے لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے ایک اور ماں شریک بھائی "یحیٰی بن ثابت" بھی واقعہ حرہ میں شہید ہوئے، اور پھر یوں رقمطراز ہیں:

"تحریر بالا سے قارئین کرام کو معلوم ہو چکا ہے کہ ایک ہی گھر کے چودہ افراد صحابہ اور صحابہ زادے یزید کی بغاوت میں مرتے دم تک مستعد رہے، وقد ذكر ابن جرير الطبري أن عبدالله ابن الغسيل كا ن يقول: بعدا لمن رام الفساد وطغى وجانب القصد وأسباب الهدى لا يبعد الرحمن إلا من عصى۔ جو شخص فساد اور طغیان کا ارادہ کرتا ہے اور میانہ روی اور اسباب ہدایت سے کنارہ کش ہوتا ہے اللہ کی پھٹکار اسی عاصی اور نافرمان پر پڑتی ہے۔ (وفاء الوفاء، ص133 ج1)"۔

یہ ہیں ایک صحابی اور صحابی زادے کے خیالات یزید بن معاویہ کے متعلق کہ وہ مفسد، طاغی، عاصی اور اسباب ہدایت سے کنارہ کش اور اللہ کی پھٹکار کا مستحق ہے اور اس کے گھرانے کے سب لوگ اور مدینہ طیبہ کے باشندوں کی اکثریت اس کی معیت میں تھی فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 392)

<u>تبصرہ:</u>

سب سے پہلے تو لعل شاہ صاحب نے جو حافظ ابن کثیر کا قول پیش کیا ہے کہ واقعہ حرّہ میں حضرت

عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے ایک ماں شریک بھائی بھی قتل ہوئے تھے، تو اس پر ہم لعل شاہ صاحب کی خدمت میں انہی کی مندرجہ ذیل بات پیش کرتے ہیں جو انہوں نے انہی حافظ ابن کثیر کی نقل کردہ ایک روایت پر نقد کرتے ہوئے لکھی ہے کہ:

"جو لوگ رواۃ سند کی تمیز سے بھی بے خبر ہوں وہ صحت و سقم کی تمیز کیسے کر سکتے ہیں؟ حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 774ھ ہے اور الاعمش کی وفات سنہ 148ھ ہے، حافظ ابن کثیر کو اعمش کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا تاہنوز معرض خفا میں ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

تو یہاں ہمارا بھی یہ سوال ہے کہ حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 776ھ ہے اور واقعہ حرہ سنہ 63ھ میں ہوا، حافظ ابن کثیر تک یہ بات کس سند سے پہنچی ہے؟ لعل شاہ صاحب نے وہ سند کیوں نہیں ذکر کی؟ نیز اسی جگہ حافظ ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مطیع کا بھی اپنے سات بیٹوں کے ساتھ واقعہ حرہ میں قتل ہونا لکھا ہے، جبکہ خود لعل شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ:

"حضرت عبداللہ بن مطیع واقعہ حرہ میں بچ کر مکہ چلے گئے تھے اور بعد میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی معیت میں شہید ہوئے تھے"۔

(مفہوم: استخلاف یزید، صفحہ 395)

تو لعل شاہ صاحب نے حافظ ابن کثیر کا یہ قول کیوں نہیں لیا؟ شاید اسی وجہ سے لعل شاہ صاحب نے "البدایۃ والنہایۃ" کی عبارت نقل کرتے ہوئے درمیان سے وہ الفاظ حذف کر دیے جن میں "عبداللہ بن مطیع" کے واقعہ حرہ میں ہی مقتول ہونے کا ذکر تھا۔

بہر حال! جب تک حافظ ابن کثیر کے اس قول کی کوئی معتبر سند نہیں مل جاتی، لعل شاہ صاحب کا دعویٰ "بلا دلیل" ہی رہے گا۔ اسی طرح ابن حزم کا یہ قول کہ عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے آٹھ بیٹے بھی قتل ہوئے تھے، یہ بھی بلا سند ہے، ابن حزم کی وفات سنہ 456ھ میں ہوئی اور واقعہ حرہ 63ھ میں ہوا، ابن حزم اندلسی نے اس بات کی کوئی سند نہیں ذکر کی۔

اور آخر میں لعل شاہ صاحب نے نور الدین سمہودی (م 911ھ) کی کتاب "وفاء الوفاء باخبار

دار المصطفیٰ " کے حوالے سے جو مؤرخ ابن جریر طبری کا قول پیش کر کے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ نے یزید کے بارے میں کہا کہ وہ مفسد، طاغی، عاصی اور اسباب ہدایت سے کنارہ کش اور اللہ کی پھٹکار کا مستحق ہے، تو یہاں لعل شاہ صاحب نے بہت بڑی ڈنڈی ماری ہے، انہوں نے جان بوجھ کر یہ بات " تاریخ طبری " کے بجائے سمہودی کی " وفاء الوفاء " کے حوالے سے پیش کی ہے تاکہ کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ تاریخ طبری میں یہ روایت کس کے واسطے سے ذکر کی گئی ہے، ابن جریر طبری نے اس کی سند یوں بیان کی ہے:

" قال هشام قال ابو مخنف ..... " ہشام (بن محمد بن سائب الکلبی) نے کہا کہ ابو مخنف (لوط بن یحییٰ) نے کہا .... "۔

(تاريخ الطبري، ج5ص489، دار المعارف مصر)

اور ہشام الکلبی و ابو مخنف کون ہیں؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

عجیب بات ہے کہ جہاں لعل شاہ صاحب نے یہ دعویٰ بلادلیل کیا ہے کہ صحابہ و تابعین کے نزدیک فسق یزید " متفق علیہ " تھا وہاں انہوں نے لکھا ہے کہ:

" اگر کتب تاریخ میں اس کے خلاف کوئی مواد پایا جاتا ہے تو وہ نواصب کی بے سند اور منقطع روایات ہیں، کوئی پختہ اور صحیح روایت نہیں "۔

(استخلاف یزید، صفحہ 376 و 377)

لیکن وہ خود بے سند، منقطع بلکہ ابو مخنف و ہشام کلبی جیسے جلے بھنے شیعوں کی روایات پر اپنے دعووں کی بنیاد رکھے ہوئے ہیں۔

بہر حال! جہاں تک عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے (جن کا شمار بھی صغار صحابہ میں ہی ہوتا ہے) اگرچہ واقعہ حرہ میں ان کا شہید ہونا بھی کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں، تاہم ان کا اسی واقعہ میں شہید ہونا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ان کا لوگوں سے موت پر بیعت لینا ثابت ہے۔ واللہ اعلم۔

الغرض! لعل شاہ صاحب نے اور بھی متعدد نام ذکر کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ سب صحابی تھے اور یزید کی مخالفت میں شہید ہوئے، کسی کا واقعہ حرہ میں شہید ہونا لکھا ہے اور کسی کا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے

ساتھ شریک ہونا لکھا ہے، لیکن کوئی صحیح سند پیش نہیں کی صرف یہی نقل کیا ہے کہ (واقعہ حرہ کے کئی سو سال بعد پیدا ہونے والے) فلاں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ حرہ میں شہید ہوئے۔ نیز ان ناموں میں سے متعدد نام تو ایسے ہیں جن کا صحابی ہونا بھی متفق علیہ نہیں، بلکہ جن ائمہ کے نزدیک "رُویت" اور "صحبت" میں فرق ہے ان کے نزدیک ان ناموں کی اکثریت "صحابی" نہیں بنتی۔

کیا "عبداللہ بن مطیع" صحابی ہیں؟

اس کی سب سے بڑی مثال واقعہ حرہ میں حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے ایک سردار "عبداللہ بن مطیع" ہی کو لے لیجئے، جو جنگ حرہ میں بچ کر مکہ مکرمہ کی طرف چلے گئے تھے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ انہیں تشریفی طور پر صحابی کہہ دیا جائے (البتہ اس صورت میں وہ صغار صحابہ میں ہی شمار ہوں گے)، لیکن اہل علم نے ان کے بارے میں صرف "له رؤية" لکھا ہے، مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :

"عبد الله ابن مطيع ابن الأسود العدوي المدني له رؤية وكان رأس قريش يوم الحرة.."۔

عبداللہ بن مطیع ابن الاسود العدوی المدنی انہیں (صرف) رؤیت حاصل ہے، اور یہ حرہ والے دن (بیعت توڑنے والے۔ناقل) قریش کے سردار تھے۔

(تقريب التهذيب، ج1، ص324، طبع دار الرشيد سوريا)

لہٰذا اگر کسی نے انہیں "صحابہ" میں شمار کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ صرف "رؤیت" کے لحاظ سے صحابی ہیں، جبکہ بہت سے علماء کے نزدیک "صحبت" اور "رویت" میں فرق ہے، چند مثالیں ہم یہاں عرض کرتے ہیں۔

امام ابن ابی حاتم "محمود بن الربیع" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"محمود بن الربيع ويقال ابن ربيعة الخزرجي الانصاري مديني أدرك النبي صلى الله عليه وسلم وهو صبى ليست له صحبة وله

رؤية"۔

کہ انہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ پایا ہے جب یہ بہت چھوٹے بچے تھے لہٰذا انہیں صحبت حاصل نہیں صرف رؤیت حاصل ہے۔

(الجرح والتعديل، ج8، ص289، حيدرآباد دكن)

ایک جگہ "یوسف بن عبد اللہ بن سلام" کے بارے میں لکھتے ہیں :

"يوسف بن عبد الله بن سلام المديني أبو يعقوب رأى النبي صلى الله عليه وسلم وليست له صحبة"۔

یوسف بن عبد اللہ بن سلام نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے لیکن انہیں صحبت حاصل نہیں۔

(الجرح والتعديل، ج9، ص225)

ابن مندۃ العبدی (م395ھ) "بشیر بن فدیک" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"له رؤية، ولأبيه صحبة"۔

انہیں "رویت" حاصل ہے اور ان کے والد کو "صحبت"۔

(معرفة الصحابة لابن مندة، ج1، ص253، جامعة الامارات العربية المتحدة/ معرفة الصحابة لابي نعيم الاصبهانى، ج1، ص 406، الرياض/أُسُد الغابة، ج1، ص 395، دار الكتب العلمية بيروت)

اسی طرح علامہ ابن الاثیر الجزری نے "عَبْد اللَّهِ بْن خباب بْن الأرت" کے بارے میں لکھا ہے :

"له رؤية ولأبيه صحبة"۔

انہیں صرف رویت حاصل ہے، جبکہ آپ کے والد کو صحبت حاصل ہے۔

(أُسُد الغابة، ج3، ص223)

"فراس بن عمرو الليثي" کے بارے میں بھی ایسے ہی الفاظ ہیں:

"لَهُ رؤية، ولأبيه صحبة"۔

(أُسُد الغابة، ج4، ص337)

امام ابن ابی حاتم (م 327ھ) اپنے والد (ابوحاتم رازی) کے واسطے سے اسحاق بن منصور سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے امام یحییٰ بن معین سے پوچھا :

"قُلْتُ لِيَحْيَى، مُحَمَّدُ بْنُ حَاطِبٍ لَهُ رُؤْيَةٌ أَوْ صُحْبَةٌ قَالَ رُؤْيَةٌ"۔

محمد بن حاطب کو "رویت" حاصل ہے یا "صحبت"؟ تو انہوں نے فرمایا : "رویت"۔

(المراسيل لابن ابي حاتم،ص183،مؤسسة الرسالة بيروت)

اسی طرح امام ابوحاتم رازی نے "طارق بن شہاب" کے بارے میں فرمایا :

"طَارِقُ بْنُ شِهَابٍ لَهُ رُؤْيَةٌ وَلَيْسَتْ لَهُ صُحْبَةٌ"۔

طارق بن شہاب کو "رویت" تو حاصل ہے لیکن "صحبت" نہیں۔

(المراسيل لابن ابي حاتم، صفحه 98)

لہٰذا جن علماء کے نزدیک "رویت" اور "صحبت" میں فرق ہے، ان کے مطابق عبداللہ بن مطیع اور ان جیسے دیگر حضرات صحابی نہیں بلکہ صرف "له رؤية" والے ہی ہوں گے، اور بعض اہل علم جو "له رؤية" والوں کو صحابی کہہ دیتے ہیں تو ان کی نظر میں صحابی کا عام اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتا، بلکہ تشریفی طور پر مقید صحبت مراد ہوتی ہے، چنانچہ ایسی ہی ایک شخصیت "عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام المخزومی" کے بارے میں امام ذہبی لکھتے ہیں :

"وَلاَ صُحْبَةَ لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ، بَلْ لَهُ رُؤْيَةٌ، وَتِلْكَ صُحْبَةٌ مُقَيَّدَةٌ"۔

عبدالرحمن صحابی نہیں ہیں، بلکہ انہیں صرف رؤیت حاصل ہے، اور یہ ایک مقید صحبت ہوتی ہے۔

(سير اعلام النبلاء، ج3ص484، مؤسسة الرسالة بيروت)

اور اگر انہیں صحابہ میں ہی شمار کیا جائے تو بھی وہ صغار صحابہ میں ہی ہوں گے، والله اعلم بالصواب وعلمه اتمُّ وأحكم۔

نوٹ

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "مروان بن الحکم" کے بارے میں بھی لکھا ہے :

"فلم يثبت له أزيد من الرؤية"۔
پس ان کے لئے (نبی ﷺ) کی" رویت" سے زیادہ کچھ ثابت نہیں۔

(الاصابة في تمييز الصحابة، ج10ص389، دار هجر ، القاهرة)

لیکن لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنوا "رویت" ہونے کے باوجود مروان بن الحکم کو صحابی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، جبکہ "عبداللہ بن مطیع" کے بارے میں ایسے باور کرواتے ہیں جیسے وہ متفق علیہ صحابی ہیں۔

الغرض! اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ واقعہ حرہ میں کسی متفق علیہ صحابی کا شہید ہونا کسی بھی صحیح سند سے ثابت نہیں، زیادہ سے زیاد محدثین و مؤرخین کے اقوال ہیں کہ فلاں اس واقعہ میں شہید ہوا، دوسری طرف انہی کتابوں میں صراحت کے ساتھ یہ بھی ملتا ہے کہ مدینہ منورہ کے کئی لوگوں نے بغاوت کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا تھا، ان میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے بزرگ صحابی بھی تھے جنہوں نے اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو سختی کے ساتھ اس بغاوت میں شامل ہونے سے منع فرمایا تھا، اسی طرح اہل بیت نبوت اور آل ابی طالب میں سے بھی کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ تاریخی روایات کے مطابق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لخت جگر حضرت محمد بن علی المعروف بہ "محمد بن حنفیہ" رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس بغاوت کی قیادت کرنے والوں کے ساتھ ایک قسم کا مناظرہ کیا اور ان کے الزامات کو غلط بتایا۔ اگر کوئی کہے کہ جس روایت میں حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا یزید پر لگائے جانے الزامات کا انکار مذکور ہے وہ روایت غیر مستند ہے تو پھر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جن روایات واقوال کی بنا پر یزید کو فاسق، فاجر، شرابی، زانی اور قاتل ثابت کیا جاتا ہے، ان کی بھی کوئی قابل اعتبار سند بیان کی جائے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں کہ پیمانے الگ الگ رکھے جائیں۔

نیز جیسا کہ خود لعل شاہ صاحب نے حافظ ابن کثیر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:
" فریقین میں بہت سے سادات اور اعیان میں سے قتل کئے گئے...۔

(استخلاف یزید، صفحہ 390)

تو صرف کسی کے بارے میں یہ لکھا ہونے سے کہ" وہ حرّہ میں مقتول ہوئے" یہ کیسے ثابت ہوسکتا ہے

کہ وہ ضرور سرکاری فوج کے خلاف اور باغیوں کے حق میں لڑتے ہوئے قتل ہوئے؟ جبکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ مدینہ میں کئی لوگ ایسے تھے جنہوں نے باغیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا، تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ باغیوں کے ہاتھوں کوئی ایک شخص بھی قتل نہیں ہوا تھا؟

کیا یزید بن معاویہ کے بیٹے نے اپنے والد کے خلاف گواہی دی؟

لعل شاہ صاحب نے ایک عنوان لکھا ہے" حضرت معاویہ بن یزید کا خطبہ" اور پھر" یزید بن معاویہ" کے بیٹے" معاویہ" کی طرف منسوب ایک بے سروپا روایت" الصواعق المحرقۃ" کے حوالے سے نقل کی ہے جس کے مطابق اس نے یزید کی وفات کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں نہ صرف اپنے والد کو برا بھلا کہا بلکہ اپنے دادا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر بھی سخت تنقید کی، چنانچہ اس نے کہا:

" یہ خلافت اللہ کی ایک رسی ہے اور میرے دادا معاویہ نے اس معاملہ میں اہل سے اور مستحق امر سے تنازع کیا اور اس چیز کا ارتکاب کیا جسے تم سب جانتے ہو یہاں تک کہ اسے موت آ گئی، پس وہ اپنی قبر میں اپنے ذنوب کے ساتھ مرہون ہے، پھر میرا باپ قلادہ ڈالا گیا (یعنی خلافت کا قلادہ اس کے گلے میں ڈالا گیا۔ ناقل) اور وہ نااہل تھا پس اس نے اپنی عمر کو لہو ولعب میں ضائع کر دیا اور عاقبت کو برباد کر دیا، پھر سخت رویا اور کہا: سب سے بڑی مصیبت ہم پر یہ ہے کہ ہم اس کے ٹھکانہ کی برائی کو جانتے نہیں اور اس کی بازگشت بری ہے بتحقیق اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت کو قتل کیا ہے اور شراب کو مباح سمجھا اور کعبہ کی تخریب کی..... الخ"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 412و413)

جبکہ یہ سب خُرافات نقل کرتے ہوئے لعل شاہ صاحب یہ بھول گئے کہ" الصواعق المحرقۃ" کے مصنف ابن حجر ہیتمی کی وفات سنہ 972ھ میں ہوئی ہے، اور یزید کی وفات ربیع الاول سنہ 64ھ میں ہوئی ہے، درمیان میں تقریباً 9 صدیاں ہیں، مصنف نے اس بات کی کوئی سند ذکر نہیں کی، آج کل بھی کئی لوگ مکھی پر مکھی مارتے ہوئے یہ" افسانہ" بیان کرتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ اس روایت کی کوئی سند تلاش کر کے لائیں، چاہے وہ ابومخنف، واقدی جیسے کذابوں کی ہی کیوں نہ ہو، ہم ایسی جھوٹی اور بے بنیاد کہانیوں کی بنیاد پر کسی کو بھی

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات کے بارے میں تبرا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

عبیداللہ بن زیاد کی طرف منسوب ایک جھوٹی روایت

اسی طرح لعل شاہ صاحب نے "عبیداللہ بن زیاد" کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ اس نے یزید کو فاسق کہا تھا، اور دلیل میں "البدایۃ والنہایۃ" کے حوالے سے ایک روایت پیش کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"عبیداللہ بن زیاد نے یزید کی حکومت کے استحکام کے لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا ارتکاب کیا، لیکن جب بعد میں اہل مدینہ اہل مکہ بھی باغی ہو گئے تو یزید نے عبیداللہ بن زیاد کو لکھا کہ مکہ پر حملہ کر کے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنا ہے، عبیداللہ بن زیاد نے انکار کر دیا اور کہا:

"واللہ لا اجمعھما للفاسق ابداً، اقتل ابن بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واغزو البیت الحرام"۔

اللہ کی قسم فاسق کے لئے میں ہرگز دو چیزوں کو جمع نہیں کروں گا، نبی کے نواسے کو بھی قتل کروں اور بیت الحرام پر حملہ کروں۔

عبیداللہ بن زیاد بھی جسے فاسق سمجھے، اس کے فسق وضلال کا کیا حال ہوگا؟

(استخلاف یزید، صفحہ 416)

یہاں لعل شاہ صاحب نے دھوکا یہ دیا ہے کہ وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ابن کثیر نے یہ بات بلا سند ذکر کی ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے انہی کے حوالے سے یہ روایت پیش کی، جبکہ یہ روایت سند کے ساتھ تاریخ طبری میں موجود ہے لیکن لعل شاہ صاحب نے جان بوجھ کر وہاں سے نقل نہیں کی تاکہ کسی قاری کی نظر اس کی سند پر نہ چلی جائے۔

طبری میں اس کی سند یوں ہے:

"حَدَّثَنَا ابن حمید قَالَ: حَدَّثَنَا جریر، عن مغیرۃ، قَالَ: کتب یَزِید إِلَی ابن مرجانۃ: أن اغز ابن الزُّبَیْر ....الخ"۔

(تاريخ الطبري، ج5، ص483، دار المعارف مصر)

ملاحظہ فرمائیں! مؤرخ طبری یہ بات اپنے استاد "ابن حُمید" سے روایت کر رہے ہیں، جس کا نام "محمد بن حمید الرازی" ہے، یہ شدید قسم کا مجروح راوی ہے، مثلاً:

امام ابو حاتم رازی نے اس کے بارے میں فرمایا:

"كذاب لا يحسن يكذب"۔

ایسا جھوٹا جو جھوٹ بھی اچھے طریقے سے نہیں بول سکتا (اور ابو حاتم رازی نے جس وجہ سے یہ بات فرمائی وہ بھی تفصیل کے ساتھ یہاں مذکور ہے، لہٰذا یہ جرح مفسر ہے)۔

(الضعفاء لابي زرعة الرازي، ج2ص739، المدينة المنورة)

امام بخاری نے فرمایا:

"فيه نظر" اس میں نظر ہے۔

(التاريخ الكبير، ج1ص69، الهند)

امام ابو زرعہ نے بھی اس کے جھوٹے ہونے کا بتایا۔

(تهذيب التهذيب، ج9ص13، دائرة المعارف، الهند)

ابن خراش نے کہا: "اللہ کی قسم یہ جھوٹا ہے"۔

(ایضاً)

امام نسائی نے کہا "ليس بشيء" یہ کچھ بھی نہیں۔

(ایضاً)

امام نسائی نے ہی کہا "ليس بثقة" یہ ثقہ نہیں ہے۔

(ميزان الاعتدال، ج3ص530، دار المعرفة بيروت)

فضلک رازی کہتے ہیں:

"دخلت على محمد بن حميد وهو يركب الأسانيد على المتون"۔

میں محمد بن حمید کے پاس گیا تو یہ متون کی سندیں وضع کر رہا تھا (یعنی جھوٹی سندیں بنا رہا تھا)۔

(ميزان الاعتدال، ج3ص530)

یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں :

"کثیر المنا کیر" یہ بہت زیادہ منکر روایات بیان کرتا ہے۔

(میزان الاعتدال، ج3ص530)

صالح بن جزرۃ نے کہا :

"ما رأیت أحذق بالکذب من ابن حمید ومن ابن الشاذکونی"۔

میں نے دو آدمیوں سے زیادہ جھوٹ کا ماہر کوئی نہیں دیکھا، ایک محمد بن حمید اور دوسرا ابن شاذکونی۔

(میزان الاعتدال، ج3ص530)

امام ذہبی نے لکھا:

"محمد بن حميد الرازي، مُتَّهم"۔

محمد بن حمید رازی (وضع حدیث) سے متہم ہے۔

(تلخيص الموضوعات لابن الجوزي، ص349، مكتبة الرشد،الرياض)

امام سیوطی نے بھی اسے "کذّاب" (بڑا جھوٹا) کہا ہے۔

(اللآلي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة،ج1ص12،دار الكتب العلمية بيروت)

اور چونکہ یہ روایت لعل شاہ صاحب نے البدایۃ والنہایۃ کے حوالے سے نقل کی ہے، اس لیے "محمد بن حمید رازی" کے بارے میں حافظ ابن کثیر کی رائے بھی پیش ہے، اس کی ایک روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ حُمَيْدٍ الرَّازِيُّ وَهُوَ شِيعِيٌّ"۔

محمد بن حمید رازی نے کہا جو کہ شیعہ ہے۔

(البداية والنهاية، ج8ص270،وزارة الاوقاف قطر)

یہ تو تھا مؤرخ طبری کے استاذ "محمد بن حمید رازی" کا تعارف، دوسرا اس بات کو بیان کرنے والے "مغیرۃ بن مقسم الضبی" ہیں جن کی وفات سنہ 136ھ میں ہوئی ہے، ان کی تو کبار تابعین سے بھی ملاقات

ثابت نہیں، تو اپنی وفات سے تقریباً 73 سال قبل کے جس واقعہ کا وہ ذکر کر رہے ہیں اس وقت ان کی عمر کیا ہو گی؟، نیز یہ "مغیرہ بن مقسم" تیسرے درجہ کے مدلس ہیں (طبقات المدلسين لابن حجر ، ص46، مكتبة المنار، عمان) اور یہاں وہ سماع کی تصریح تو کیا اپنے استاد کا نام بھی ذکر نہیں کر رہے۔

الغرض! لعل شاہ صاحب کی پیش کردہ یہ روایت بھی ناقابل اعتماد ہے۔

کیا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے یزید کو "امیر المؤمنین" کہنے والے کو کوڑے لگوائے؟

لعل شاہ صاحب نے ایک جگہ عنوان لکھا ہے "حضرت عمر بن عبدالعزیز کا عمل" اور پھر "الروض الباسم" اور "تاريخ الاسلام للذهبى" اور "الصواعق المحرقة" وغیرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"انه ضرب من سمّى يزيد امير المؤمنين عشرين سوطاً" ۔جس نے یزید کو امیر المؤمنین کہا اسے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بیس کوڑے کی سزا دی۔

(استخلاف یزید، صفحہ 414، نیز دیکھیں صفحہ 505)

تبصرہ:

"الروض الباسم" اور "الصواعق المحرقة" وغیرہ میں تو اس بات کی سرے سے کوئی سند ہی مذکور نہیں، صرف اتنا ہی لکھا ہے یہ بات "نوفل بن ابی الفرات" نامی راوی نے بیان کی ہے، البتہ امام ذہبی نے اس کی سند یوں بیان کی ہے:

"قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي السري: حدثنا يَحْيَى بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ أَبِي غُنْيَةٍ، عَنْ نَوْفَلِ بْنِ أَبِي الْفُرَاتِ، قَالَ :كُنْتُ عِنْدَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ، فَذَكَرَ رَجُلٌ يَزِيدَ، فَقَالَ: قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ يَزِيدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ، فَقَالَ :تَقُولُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ؟ وَأَمَرَ بِهِ فَضُرِبَ عِشْرِينَ سَوْطًا"۔

(تاريخ الاسلام، ج2ص731، دار الغرب الاسلامي)

ملاحظہ فرمائیں! امام ذہبی نے اس روایت کو "محمد بن ابی السري" سے نقل کیا ہے، جن کا پورا

نام"محمد بن المتوكل المعروف بابن أبي السري" ہے اور ان کی وفات سنہ 238ھ میں ہوئی (تهذيب التهذيب، ج9ص224، دائرة المعارف ، الهند)، جبکہ امام ذہبی کی پیدائش 673ھ ہے، یعنی درمیان میں تقریباً 435 سال کا فاصلہ ہے، اور لعل شاہ صاحب کے نزدیک ایسی روایات سے استدلال کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو راویوں کی تمیز سے بے خبر ہوں، چنانچہ ان کا حوالہ پہلے بھی متعدد مرتبہ نقل ہو چکا جس میں وہ ایک روایت پر جرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پھر جو لوگ رواۃ سند کی تمیز سے بھی بے خبر ہوں وہ صحت وسقم کی تمیز کیسے کر سکتے ہیں؟ حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 774ھ ہے اور الاعمش کی وفات سنہ 148ھ ہے، حافظ ابن کثیر کو اعمش کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا تا ہنوز معرض خفا میں ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

تو ہم بھی یہاں عرض کرتے ہیں کہ امام ذہبی کو"محمد بن ابی السری" کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا؟ ہنوز معرض خفا میں ہے۔

تنبیہ

یہ روایت حافظ ابن حجر نے بھی اس سند کے ساتھ نقل کی ہے:

"قال يحيى بن عبد الملك بن أبي غنية أحد الثقات ثنا نوفل بن أبي عقرب ثقة قال كنت عند عمر بن عبد العزيز"۔

(تهذيب التهذيب، ج11ص361)

انہوں نے ایک تو سند ہی"يحيىٰ بن عبدالملك" سے شروع کی ("محمد بن ابی السری" کا نام بھی حذف کر دیا)، دوسرا یہ بات بیان کرنے والے راوی کا نام"نوفل بن ابی الفرات" کی جگہ"نوفل بن ابی عقرب" لکھا ہے۔ یہاں اگر اس پر بات کی جائے کہ یہ"نوفل بن ابی الفرات" ہے یا"نوفل بن ابی عقرب"؟ تو کلام طویل ہو جائے گا، سر دست اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہ روایت غیر مستند ہے، امام ذہبی یا حافظ ابن حجر سے آگے کی سند نا معلوم ہے۔

عمرو بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

لعل شاہ صاحب نے واقعہ حرہ کے ضمن میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بیٹے "عَمرو بن عثمان" کا ذکر بھی کیا ہے (جنہیں لعل شاہ صاحب نے غلطی سے "عُمربن عثمان" لکھا ہے)، لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"ان کے دوسرے صاحبزادے عمر بن عثمان تھے، یوم حرہ میں بنو امیہ کے ساتھ نہ تھے، اس لئے زیر عتاب ہوئے، اگر وہ امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے نہ ہوتے تو قتل کر دیے جاتے، مسلم ابن عقبہ نے انہیں کہا تھا.. لولا انت ابن امير المؤمنين عثمان لضربت عنقك.. اگر تو امیر المؤمنین عثمان کا بیٹا نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 401)

پھر لعل شاہ صاحب نے "البداية والنهاية" کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسلم بن عقبہ نے حکم دیا کہ ان کی داڑھی نوچ ڈالی جائے اور بڑی داڑھی والے تھے۔

(ایضاً)

تبصرہ:

سب سے پہلے تو لعل شاہ صاحب نے یہ غلط بیانی کی ہے کہ عمرو بن عثمان یوم حرہ میں بنو امیہ کے ساتھ نہ تھے، جبکہ اسی روایت میں جس کا ایک ٹکڑا انہوں نے نقل کیا ہے کہ "مسلم بن عقبہ نے ان سے کہا تھا کہ اگر تم امیر المؤمنین عثمان کے بیٹے نہ ہوتے تو میں تیری گردن مار دیتا" صاف طور پر یہ بیان ہے کہ وہ بنو امیہ کے ان ہزار کے قریب لوگوں میں شامل تھے جنہیں مدینہ سے نکال دیا گیا تھا اور جو مروان بن الحکم کی حویلی میں محصور ہو گئے تھے، اور جنہیں بعد میں باغیوں نے اس شرط پر وہاں سے نکلنے دیا تھا کہ تم ہمارے بارے میں معلومات کسی کو نہیں دو گے، اور ان کی مسلم بن عقبہ کے ساتھ ملاقات مدینہ سے باہر "وادی القری" مقام پر اس وقت ہوئی تھی جب ابھی مسلم بن عقبہ نے مدینہ کے باغیوں کے خلاف کارروائی شروع نہیں کی تھی، چنانچہ تاریخ طبری کے الفاظ ہیں:

"ولما قدمت بنو أُمَيَّة عَلَى مسلم بن عُقْبَةَ بوادي القرى دعا بعمرو

بن عُثْمَانَ بن عَفَّانَ أول الناس فَقَالَ لَهُ: أَخْبِرْنِي خبر مَا وراءك، وأشر علي، قَالَ: لا أستطيع أن أخبرك، أخذ علينا العهود والمواثيق أَلا ندل عَلَى عورة، وَلا نظاهر عدوا، فانتهره ثُمَّ قَالَ: وَاللَّهِ لولا أنك ابن عُثْمَان لضربت عنقك"۔

جب بنو امیہ (باغیوں کے محاصرے سے رہا ہو کر) مسلم بن عقبہ کے پاس آئے تو اس نے سب سے پہلے عمرو بن عثمان بن عفان کو بلایا اور کہا کہ: مجھے بتاؤ تمہارے پیچھے (یعنی مدینہ میں) کیا (تیاریاں) چل رہی ہیں؟ تو انہوں نے کہا: میں تمہیں اس کی خبر دینے سے قاصر ہوں کیونکہ ہم سے یہ عہد و پیمان لیا گیا ہے کہ ہم کوئی راز نہیں بتائیں گے اور ان کے خلاف کسی دشمن کا ساتھ نہیں دیں گے (یعنی ہمیں اس شرط پر محاصرے سے رہائی ملی ہے) پس (مسلم بن عقبہ نے) انہیں ڈانٹا اور کہا کہ: اگر تم عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بیٹے نہ ہوتے تو میں تمہاری گردن مار دیتا۔

(تاریخ الطبری، ج5ص486، دار المعارف مصر)

واضح رہے کہ اگرچہ اس روایت کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ تاریخ طبری میں یہ روایت "ابومخنف لوط بن یحییٰ" کے واسطے سے نقل کی گئی ہے، لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ لعل شاہ صاحب نے یہ غلط بیانی کی ہے کہ عمرو بن عثمان اس وقت بنو امیہ کے ساتھ نہیں تھے، جبکہ یہی روایت بتا رہی ہے کہ وہ انہی کے ساتھ مدینہ سے نکال دیے گئے تھے۔

رہی لعل شاہ صاحب کی دوسری بات جو انہوں نے "البدایۃ والنہایۃ" کے حوالے سے لکھی کہ "عمرو بن عثمان کی داڑھی نوچ ڈالی گئی تھی" تو اس بات کی کوئی سند "البدایۃ والنہایۃ" میں نہیں ہے، حافظ ابن کثیر نے یہ بات "قالوا" سے شروع کی ہے، یعنی "انہوں نے کہا" کس نے کہا؟ یہ کہیں بیان نہیں، واقعہ حرہ سنہ 63ھ کے آخر میں ہوا، اور حافظ ابن کثیر کی ولادت سنہ 701ھ میں ہوئی، درمیان میں تقریباً ساڑھے چھ صدیاں ہیں، اور لعل شاہ صاحب کا قاعدہ تو یہ ہے کہ وہ اسی البدایۃ والنہایۃ کی ایک روایت پر یوں جرح کرتے ہیں:

"حافظ ابن کثیر کی وفات سنہ 774ھ ہے اور الاعمش کی وفات سنہ 148ھ ہے، حافظ ابن کثیر کو

اعمش کا یہ قول کس سند کے ساتھ پہنچا تاہنوز معرض خفا میں ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 667و668)

لہٰذا یہ داڑھی نوچنے والی بات بلا سند ہے، نیز اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن عثمان کو جنگ حرہ میں باغیوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے بعد بلایا گیا، جبکہ پہلے نقل کی گئی تاریخ طبری کی روایت میں ہے کہ مسلم بن عقبہ کی ان سے بات چیت جنگ شروع ہونے سے پہلے اس وقت ہوئی تھی جب وہ دوسرے بنو امیہ کے ساتھ محاصرے سے نکل کر ملے تھے۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں غیر مستند ہیں۔

لعل شاہ صاحب نے متعدد اور نام بھی گنوائے ہیں کہ فلاں نے یزید کے بارے میں یہ کہا اور فلاں نے یہ کہا، یا وہ بھی حرّہ میں قتل ہوئے،ان تمام باتوں کا بھی وہی حال ہے کہ جن کتب کے حوالے سے پیش کی گئی ہیں ان میں یا تو کوئی سند ہی نہیں، یا اگر ہے تو جھوٹے اور ضعیف راویوں پر مشتمل ہے اس لئے ہم آگے چلتے ہیں۔

❀❀❀

یزید بن معاویہ کے بارہ میں مبالغہ آرائی اور عدل وانصاف کا تقاضا

قارئین محترم! حقیقت یہ ہے کہ یزید بن معاویہ معصوم عن الخطاء نہیں تھا کہ اس سے غلطی یا گناہ کا صدور ممکن نہیں تھا، نہ وہ زمرۂ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھا، لیکن اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ ایک مسلمان تھا، کافر نہیں تھا اور اس کا تعلق صحابہ و تابعین کے زمانے یعنی خیر القرون سے تھا، اسے صحابہ و تابعین نے ہی تخت امارت پر بٹھایا، اس کی بطور ولی عہد نامزدگی کرنے والے صحابہ ہی تھے، وہ خود خلیفہ نہیں بن بیٹھا تھا، اس وقت اس کے ذاتی کردار کے بارے میں کسی نے کوئی منفی بات نہیں کی، جن چار پانچ صحابہ کرام نے اس وقت دوسرے صحابہ کے مقابلے میں اختلافی موقف اپنایا انہوں نے بھی اپنی اختلافی رائے کا سبب یزید کی ذات یا اس کا کردار نہیں بتایا، بلکہ اختلافی نکتہ، باپ کے بعد بیٹے کی نامزدگی یا طریق ولی عہدی ہی تھا۔ حتیٰ کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کی بیعت خلافت کا وقت آیا تو واقعہ یہ ہوا کہ ولی عہدی کی بیعت نہ کرنے والے چار یا پانچ صحابہ میں سے ایک یعنی حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما تو اس سے پہلے ہی اگلے جہاں سدھار چکے تھے، باقی چار میں سے دو یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے یزید کی بیعت کر لی تھی (حوالے پہلے گذر چکے) صرف حضرت حسین بن علی اور حضرت عبد اللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہم) ہی باقی رہ گئے جو اس وقت بھی اپنے سابقہ موقف پر قائم رہے، پھر ان دو میں سے بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جب حقیقت حال کا درست اندازہ ہوا کہ یزید کی حکومت اور تسلط قائم ہو چکا ہے تو آپ نے بھی کربلا میں آخری وقت جو تجاویز پیش کیں ان میں صاف طور پر ایک تجویز یہ بھی تھی کہ "مجھے امیر المؤمنین کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں رکھ دوں"، جو صریح طور پر اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ اپنے سابقہ موقف میں لچک پیدا کرنے یا دوسرے لفظوں میں جمہور امت کی رائے کے حق میں اپنی رائے سے دستبرداری کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ (تفصیل پہلے بیان ہو چکی)

یہ بھی حقیقت ہے کہ محرم 61ھ میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے حادثۂ فاجعہ کے بعد بھی تقریباً تین سال (سنہ 63ھ کے آخر تک) پوری اسلامی ریاست میں کہیں بھی یزید کے خلاف کوئی بغاوت یا تحریک نہیں اٹھی، نہ کہیں کوئی قتل غارت ہوئی۔

سب سے پہلے یزید کی ذات کے بارے میں الزامات کا ذکر ہمیں واقعہ حرہ کے ضمن میں ہی ملتا

ہے اور کہا جاتا ہے کہ مدینہ کے کچھ لوگوں نے یزید کے ذاتی کردار پر انگلی اٹھاتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ فاسق وفاجر اور شراب نوش ہے اپنی بیعت توڑ کر اس کے خلاف خروج کیا جس کے نتیجے میں سرکاری فوج نے ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی اور حرہ کا واقعہ پیش آیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اول تو ایسی تمام روایات کی استنادی حیثیت کمزور ہے جن میں ان کے ان الزامات کا ذکر ہے، نیز اگر وہ روایات صحیح بھی ہوں تو ان میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ بیعت توڑنے والوں نے بھی یزید پر لگائے گئے اپنے الزامات کا کوئی شرعی اور ضابطے کا ثبوت پیش کیا تھا، ثانیاً جن روایات میں یہ ذکر ہے کہ انہوں نے یزید پر فسق وفجور اور شراب نوشی کے الزام لگائے، انہیں روایات میں یہ بھی ذکر ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے الزامات کو غلط بتایا اور باقاعدہ ان کے ساتھ ایک قسم کا مناظرہ کیا اور یزید کا دفاع کیا، جس دوران الزام لگانے والوں نے تسلیم کیا کہ ہم نے خود یزید کو یہ کام کرتے نہیں دیکھا یعنی ہمارے پاس "چشم دید" گواہ تو کوئی نہیں۔ تاہم حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یزید کی صفائی پیش کرنے والی اس روایت کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مستند نہیں، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جب ان حضرات سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کہاں بیان ہوا ہے کہ مدینہ کے جن لوگوں نے یزید کی بیعت توڑی تھی انہوں نے یزید پر فاسق وفاجر اور شرابی ہونے کے الزام لگائے تھے؟ اس بارے میں بھی تو کوئی "مستند اور صحیح" روایت پیش کی جائے تو یہ حضرات وہی محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ والی روایت پیش کرتے ہیں اور پھر ایک بہت بڑا مغالطہ دیتے ہیں جو لعل شاہ صاحب مؤرخ ومحدّث واہ کینٹ کے الفاظ میں یوں دیا جاتا ہے کہ:

> "البتہ حافظ ابن کثیر اور بعض دوسرے مؤرخین نے حضرت محمد ابن حنفیہ سے عبداللہ بن مطیع کے معارضہ میں یزید کی عدالت پر شہادت نقل کی ہے، مگر ایک صحابی کے مقابلہ میں ایک تابعی کی تعدیل چہ معنی دارد، نیز محمد ابن حنفیہ نے جو کچھ دیکھا اسے بیان کر رہے ہیں، وہ پہلے کی بات ہے، اور حضرت عبداللہ بن مطیع اپنی تحقیق سے بات کر رہے ہیں اور یہ بعد کی بات ہے، دونوں باتوں میں چنداں تعارض نہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 422)

غور فرمائیں! لعل شاہ صاحب خود تسلیم کر رہے ہیں کہ حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے وہ بتایا جو انہوں

نے" دیکھا" (یعنی انہوں نے اپنی" چشم دید شہادت" بیان فرمائی) جبکہ ان کے سامنے عبداللہ بن مطیع نے جو کہا وہ "اپنی تحقیق" سے کہا، یہاں لعل شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے بھی" جو دیکھا وہ بیان کیا"۔ دوسرا لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"محمد بن حنفیہ نے جو کچھ دیکھا اسے بیان کر رہے ہیں اور وہ پہلے کی بات ہے اور حضرت عبداللہ بن مطیع جو بات کر رہے ہیں وہ بعد کی بات ہے"۔

اس پر ہمارا سوال ہے کہ یہ" پہلے کی بات" کب کی بات ہے؟ یزید کی پیدائش سے پہلے کی؟ یا اس کے دور خلافت کی ہی؟ نیز عبداللہ بن مطیع کس تحقیق سے بات کر رہے ہیں؟ انہوں نے تو اپنی تحقیق کا کوئی حوالہ نہیں دیا کہ اس کی بنیاد کیا ہے؟ جبکہ مقابلے میں محمد بن حنفیہ اپنے مشاہدے کا حوالہ دے رہے ہیں کہ میں خود یزید کے پاس رہا ہوں، میں نے تو اس میں یہ باتیں نہیں دیکھیں۔

دید اور شنید کا تقابل ہو تو دید کو ترجیح دی جاتی ہے

رہا لعل شاہ صاحب کا یہ کہنا کہ:

"ایک صحابی کے مقابلے میں ایک تابعی کی تعدیل چہ معنی دارد"

تو یہ بھی ایک بہت بڑا مغالطہ ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ" عبداللہ بن مطیع" کی "قطعی" صحابیت کہاں سے ثابت ہے؟ ان کی صحابیت مختلف فیہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، دوسری بات یہ ہے کہ جب دید اور شنید کا تقابل ہو تو دید کو ترجیح دی جاتی ہے، اور یہاں صرف صحابی اور تابعی کی بات نہیں بلکہ" دید" اور" شنید" کا تقابل ہے، اس روایت میں محمد بن حنفیہ نے عبداللہ بن مطیع کی"سنی سنائی" بات کو اپنی عینی شہادت سے رد کیا ہے، کیا لعل شاہ صاحب کے نزدیک محمد بن حنفیہ نے جھوٹ بولا؟ یا ان کے نزدیک انہوں نے جھوٹی شہادت دی؟ بات واضح کرنی چاہئے، ہم بانگ دہل کہتے ہیں کہ عبداللہ بن مطیع کا بیان کسی بھی طرح یزید کے فسق و فجور اور شرب خمر وغیرہ کے اثبات کے لیے شرعی شہادت نہیں بن سکتا، کیونکہ اس روایت کے مطابق انہوں نے خود اقرار کیا کہ" میں نے خود یزید کو یہ کام کرتے نہیں دیکھا" اور نہ ہی یہ کہا کہ" مجھے فلاں عینی شاہدین نے بتایا ہے کہ انہوں نے یزید کو یہ کام کرتے دیکھا ہے" یعنی ان کے علم کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ انہوں نے نہیں بتایا، اب لعل شاہ صاحب کو بتانا چاہئے تھا کہ عبداللہ بن مطیع نے یہ بات کس سے سنی تھی؟ یا انہیں کس نے

بتایا تھا؟ تاکہ ہم اس "مجہول" مخبر کی بھی تحقیق کر لیں، نیز یہ معلوم ہو کہ عبداللہ بن مطیع کو یہ بات بتانے والے کتنے تھے؟ پھر یہ کوئی کسی حکم شرعی کی وضاحت یا تشریح کا معاملہ نہیں یا کسی دینی مسئلہ کے بارے میں فتویٰ کا معاملہ نہیں کہ وہاں صحابی اور غیر صحابی کے قول کی بحث کی جائے، بلکہ ایک مسلمان پر "فسق وفجور اور شرب خمر" کا الزام ثابت کرنے کی بات ہے، اور اس کے لیے شریعت میں ایک ضابطہ ہے، اور وہ ضابطہ صحابی وغیر صحابی سب کے لیے ہے، لہٰذا یہاں تقابل صرف عبداللہ بن مطیع اور محمد بن حنفیہ کی بات کا ہی نہیں تھا بلکہ دید اور شنید کا تقابل بھی تھا، محمد بن حنفیہ اپنا مشاہدہ بیان کر رہے تھے اور عبداللہ بن مطیع محض سنی سنائی بات، اور دید وشنید میں دید کو ہی پسند کرنا یا اس کا پسند آنا نہ صرف یہ کہ قرین عقل وقیاس ہے بلکہ تعلیم نبوی بھی ہے، چنانچہ کتب میں آنحضرت ﷺ کی ام ولد (حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا) کا واقعہ مذکور ہے کہ بعض منافقین نے ان کو ان کے چچازاد بھائی (جن کا نام "مابور" بتایا جاتا ہے) سے متہم کر دیا، آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ جاؤ مابور جہاں نظر آئے اس کو جا کر قتل کر دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ گئے اور اس کو پکڑنے کے لیے جو اپنی طرف کھینچا تو اسی کش مکش میں اس کا ستر کھل گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو پیدائشی طور پر اس کا عضو مخصوص ہی نہ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو قتل کیے بغیر واپس آ گئے اور آنحضرت ﷺ کو ساری بات آ کر بتلا دی، اس روایت میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: "الشَّاهِدُ يَرَى مَا لَا يَرَى الْغَائِبُ" یعنی حاضر وہ کچھ دیکھ سکتا ہے جو غائب نہیں دیکھ سکتا۔

(ملخصاً: البداية والنهاية، ج5ص431، وزارة الاوقاف قطر)

دیکھ لیجئے! یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی "دید" کو "شنید" پر ترجیح دی گئی۔

نیز مسند احمد کی صحیح روایت ہے:

" عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ" ۔

یعنی کسی کی دی گئی خبر، خود دیکھنے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

(مسند احمد، ج3ص341، حديث نمبر 1842، مؤسسة الرسالة)

فقہاء نے بھی اس اصول کو دلیل کے طور پر ذکر کیا ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ ایک جگہ ایک مسئلہ کی

دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیس الخبر کالمعاینة"۔

(الهداية، ج3ص170، مکتبه شرکت علميه ملتان)

اسی طرح کسی صحابی کو کسی کی بات سے غلط فہمی ہو جانا، ناممکن نہیں، اس کی ایک مثال پڑھ لیں، حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا تھا کہ:

"اللہ کی قسم یہ بھی محض دنیا کے لیے لڑ رہے ہیں"...وَإِنْ ذَاكَ الَّذِي بِمَكَّةَ وَاللَّهِ إِنْ يُقَاتِلُ إِلَّا عَلَى الدُّنْيَا....."۔

(صحيح البخاري،بَابُ إِذَا قَالَ عِنْدَ قَوْمٍ شَيْئًا ثُمَّ خَرَجَ فَقَالَ بِخِلاَفِهِ،رقم الحديث 7112)

اسی طرح کی بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، آپ نے اہل مکہ (یعنی حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں) کے بارے میں فرمایا:

"يَقْتَتِلُونَ عَلَى الدُّنْيَا، يَتَهَافَتُونَ فِي النَّارِ تَهَافُتَ الذُّبَابِ فِي الْمَرَقِ"۔
یعنی یہ تو دنیا پر لڑ رہے ہیں اور آگ میں ایسے گر رہے ہیں جیسے مکھی شوربے میں گرتی ہے۔

(السنن الکبری للبیهقی، ج3، ص173، دار الکتب العلمية بيروت)

اب سوال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ لعل شاہ صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے خیال میں خالص دین کے لیے لڑ رہے تھے یا خالص دنیا کے لیے؟ اگر خالص دنیا کے لیے تو بتایا جائے، اگر خالص دین کے لئے لڑے تھے تو بتائیے حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی اس بات میں یہ حضرات غلطی پر کہتے ہیں یا کیا؟ واضح رہے کہ یہ دونوں حضرات جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں۔

اس کی ایک دوسری مثال ہم کتاب کے شروع میں بیان کر آئے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کچھ لوگوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر زنا کی شہادت دی ان شہادت دینے والوں میں صحابی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، لیکن یہ شہادت ضابطہ شہادت پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے رد ہوگئی (چار گواہ پورے نہ ہوئے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ پر حد قذف لگوائی اور ان سے فرمایا کہ" اگر یہ اپنی غلطی مان

کرتو بہ کرلیں تو پھر مقبول الشہادۃ ہوجائیں گے"لیکن انہوں نے اپنے آپ کو جھٹلانے سے انکار کردیا۔
(دیکھیں:صحیح البخاری، ج3، ص379،باب حد القاذف والسارق والزانی، طبع دار طوق النجاۃ / مع شرحه في فتح الباري، ج 5ص 256طبع دار المعرفة بيروت)

تو کیا یہاں یہ کہا جائے گا کہ حضرت ابو بکرہ ؓ چونکہ صحابی ہیں،تو حضرت عمر فاروق ؓ کو ان کی بات کو تسلیم کرنا چاہیے تھا اور ان کی شہادت رد نہیں کرنا چاہئے تھی؟ ہر گز نہیں کیونکہ گواہی کو شریعت کے قانون شہادت کے مطابق جانچا جائے گا، چاہے گواہی دینے والا صحابی ہو یا غیر صحابی۔

اس لیے یہ صرف جذباتی بیان ہیں کہ عبداللہ بن مطیع صحابی ہیں لہٰذا انہوں نے کسی سے سن سنا کر بات کہہ دی تو اب کسی ضابطہ شہادت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اصول یہی ہے کہ ایسی باتوں کا فیصلہ تو اصول شہادت کی بنیاد پر ہی کیا جائے گا، ورنہ حضرت عمر ؓ بھی حضرت ابو بکرہ ؓ کی گواہی کو رد نہ فرماتے، اصل بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک آدمی کسی پروپگنڈے سے متأثر ہو کر ایک امر غیر واقع کو امر واقع یقین کر لیتا ہے، یہ صحابیت یا تابعیت کے منافی نہیں، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ بعض اہل مدینہ، وہاں موجود ان شر پسندوں کے پروپگنڈے سے متأثر ہو کر یہ باتیں کر رہے ہوں جن کا کام ہی مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے سازشیں کرنا تھا اور جن کے آباء و اجداد اس سے پہلے جمل و صفین میں یہی کام کر چکے تھے، کیونکہ یہ اقرار تو عبداللہ بن مطیع خود کر رہے ہیں کہ انہوں نے بچشم خود یزید کو یہ کام کرتے نہیں دیکھا، ایسی صورت میں یہ محض ان کی شنید ہوئی، اور شنید و دید میں تعارض کے وقت دید کا قابل پسندیدگی ہونا نص حدیث سے ثابت ہے، جیسا کہ بیان ہوا۔

ہم یہاں ایک اور بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شراب نوشی اور زنا کاری جیسے جرائم دو طرح ہی انجام دیے جاسکتے ہیں، ایک تو کھلے عام، دوسرے چھپ کر، اگر تو یزید یہ افعال کھلے عام انجام دیتا تھا تو کیا وجہ ہے کہ دو چشم دید گواہ بھی ہمیں آج تک نہیں ملے؟ اس صورت میں تو چشم دید گواہوں کا ایک جم غفیر ہونا چاہئے تھا، نیز اگر وہ کھلے عام یہ کام کرتا تھا تو صحابہ و تابعین کی وہ اکثریت جنہوں نے اس کی بیعت خلافت کی تھی کیا انہوں نے ایک کھلے شرابی اور زانی کی بیعت کی تھی؟، اور اگر وہ یہ کام چھپ چھپ کر کرتا تھا، تو سوال ہے کہ ان راویوں کو یہ کیسے علم ہوا کہ وہ یہ کام چھپ چھپ کر کرتا تھا؟ کیا یہ راوی خود اس کی مجلس میں شریک رہے تھے یا

یزید نے ان کے سامنے خود یہ اعتراف کیا تھا کہ میں شراب بھی پیتا ہوں اور حرام کاری بھی کرتا ہوں؟

بہر حال بات ہو رہی تھی یزید کے بارے میں مبالغہ آرائی کی، قرآن کریم میں ہمیں واضح طور پر حکم دیا گیا ہے کہ:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ"۔

اے ایمان والو! ایسے بن جاؤ کہ اللہ (کے احکام کی پابندی) کے لئے ہر وقت تیار رہو، (اور) انصاف کی گواہی دینے والے ہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم نا انصافی کرو، انصاف سے کام لو، یہی طریق تقویٰ سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ یقیناً تمہارے تمام کاموں سے باخبر ہے۔

(المائدۃ، آیت نمبر 8)

تو یزید بن معاویہ کے بارے میں بھی ہمیں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے، اس کے کھاتے میں بھی وہی گناہ یا جرائم ڈالنے چاہئیں جن کا شرعی ضابطوں کے مطابق ثبوت موجود ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ ایسی تمام روایات جن میں یزید کا کسی متعین قسم کے فسق و فجور (شراب نوشی، بدکاری اور ترک صلاۃ) کا مرتکب ہونا بیان ہوا ہے، استنادی لحاظ سے ضعیف ہی ہیں، نیز کسی صحیح روایت میں یزید کے ان باتوں کا مرتکب ہونے کی کوئی عینی شہادت نہیں پائی جاتی، محض بعد کے کسی شخص کے لکھ دینے سے یہ الزامات ثابت نہیں ہو جاتے۔

پھر غور کیا جائے تو جن لوگوں نے یزید کو فاسق کہا یا لکھا ہے ان میں سے بھی اکثر نے اس وجہ سے لکھا ہے کہ (ان کے خیال یا ان کی تحقیق میں) واقعہ کربلا، واقعہ حرہ اور مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حصار کا ذمہ دار یزید ہے، تو اگر واقعی مستند دلائل سے ثابت ہو جائے کہ مندرجہ بالا واقعات میں ساری ذمہ داری اور جرم یزید کا ہی تھا اور اس کے حکم سے کہیں حد سے بڑھ کر ظلم یا زیادتی کی گئی یا کسی بے گناہ کو اس کے حکم سے سزا دی گئی تو اس کے جرائم کی فہرست اسی حد تک رکھی جائے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر یہ

بات مشہور کردی گئی کہ یزید شروع سے ہی فاسق و فاجر اور شرابی و زانی تھا، وہ دین کو مٹانے کے درپے تھا اس لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی بیعت نہ کی اور اللہ کے دین کو بچانے کے لئے اس کے خلاف نکلے، اور پھر دنیا جہاں کے تمام جرائم یزید کے سر تھوپ دے جاتے ہیں۔غیروں کو تو چھوڑیے، خود اہل سنت کہلانے والے عوام الناس کے ذہنوں میں یہی بات ڈال دی گئی ہے، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یزید کو حاکم بنانے والے، اس کی بیعت کرنے والے اور اس کی بیعت توڑنے سے منع کرنے والے بھی صحابہ و تابعین ہی تھے بلکہ اس وقت کی اکثریت تھی، وہ خود ہی خلیفہ نہیں بن بیٹھا تھا، تو کیا اس وقت کی جمہور امت نے جانتے بوجھتے ہوئے ایک فاسق، فاجر، شرابی اور زانی کو امت پر مسلط کر دیا، اور زمانہ خیر القرون میں دو افراد کے سوا کوئی بھی اس کے راستے میں کھڑا نہ ہو سکا؟

جمہور امت نے یزید کو بطور حاکم اور خلیفہ قبول کرلیا تھا

ممکن ہے اس پر کوئی کہہ دے کہ ثابت کرو کہ اس وقت کی جمہور امت نے یزید کو خلیفہ اور حاکم تسلیم کرلیا تھا، تو ہم کہتے ہیں کہ پورے ذخیرہ حدیث و تاریخ میں یزید کی بیعت سے تخلف کرنے والے صحابہ کے جو نام لکھے ہیں وہ چار یا پانچ ہی ہیں، جن میں سے بھی آخر میں صرف دو رہ گئے، پہلے کتب تاریخ کے حوالے گذر چکے ہیں کہ تمام صوبوں اور شہروں میں یزید کی بیعت کی گئی تھی، مثلاً حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سنہ 56ھ کے واقعات کے ضمن میں یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"...فَبَايَعَ لَهُ النَّاسُ فِي سَائِرِ الْأَقَالِيمِ، إِلَّا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ وَالْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ وَعَبْدَ اللَّهِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَابْنَ عَبَّاسٍ فَرَكِبَ مُعَاوِيَةُ إِلَى مَكَّةَ مُعْتَمِرًا ..."۔

سوائے عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، حسین بن علی، عبداللہ بن زبیر اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے باقی تمام صوبوں اور علاقوں کے لوگوں نے یہ بیعت کرلی تھی، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

(البداية والنهاية، ج8،ص116، وزارة الاقاف، قطر)

خود لعل شاہ صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے کہ:

"سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کر لی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

رہی یہ بات کہ صحابہ کرام نے یزید کی بیعت کی تھی یا نہیں؟ تو اس بارے میں حافظ تقي الدين عَبْدُ الغَنِيِّ بن عَبْدِ الوَاحِدِ المَقْدِسِي رحمۃ اللہ علیہ (م600ھ) فرماتے ہیں:

"وسُئِل عَن يَزِيد بُن مُعَاوِيَة؟ فأجاب: خلافته صحيحة. قَالَ: وَقَالَ بَعْض الْعُلَمَاء: بايعه ستون من أَصْحَاب رَسُول اللَّه صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِنْهُم ابْن عُمَر. وَأَمَّا محبته: فمن أحبه فلا ينكر عَلَيْهِ، ومن لَمْ يحبه فلا يلزمه ذَلِكَ؛ لأنه لَيْسَ من الصحابة الذين صحبوا رَسُول اللَّه صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فيلتزم محبتهم إكراما لصحبهم وليس ثمَّ أمر يمتاز بِهِ عَن غيره من خلفاء التابعين، كعبد الْمَلِك وبنيه، وإنما يمنع من التعرض للوقوع فِيهِ، خوفا من التسلق إِلَى أَبِيهِ، وسدّاً لباب الْفِتْنَة"۔

ان سے (یعنی حافظ عبد الغنی المقدسی سے۔ناقل) یزید کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے جواب دیا: اس کی خلافت صحیح ہے، نیز یہ فرمایا کہ: بعض علماء کا کہنا ہے کہ یزید کی بیعت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساٹھ صحابہ کرام نے کی تھی، ان میں سے ایک حضرت ابن عمر بھی تھے، جہاں تک اس سے محبت رکھنے کا تعلق ہے؟ تو جو اس سے محبت کرے اس پر نکیر نہیں کی جائے گی، اور جو اس سے محبت نہ رکھے، اس پر اس کی محبت رکھنا ضروری بھی نہیں، کیونکہ یزید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے نہ تھا جن کی محبت ان کے صحابی ہونے کی وجہ سے لازمی ہے، اور یزید میں ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں تھی جس کی بنا پر اسے دوسرے تابعی خلفاء جیسے عبد الملک (بن مروان) اور اس کے بیٹوں سے ممتاز سمجھا جائے، تاہم اس سے تعرض کرنے (یعنی

اسے برا بھلا کہنے سے ۔ناقل) ایک تو اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ اس میں اس کے والد (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ۔ناقل) کی ذات تک پہنچنے کا ڈر ہے اور دوسرا فتنہ کے دروازہ کو بند کرنے کے لئے۔

(الذيل على طبقات الحنابلة ، ج3ص55، مكتبة العبيكان،السعودية)

نوٹ : حافظ عبد الغنی المقدسی کا یہ فتویٰ حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ (م795ھ) نے نقل کیا ہے،
یہ حافظ عبد الغنی المقدسی الحنبلی رحمۃ اللہ علیہ وہی ہیں جن کی کتاب "الكمال في أسماء الرجال" کی تہذیب، حافظ جمال الدین مزی رحمۃ اللہ علیہ نے "تهذيب الكمال" کے نام سے کی، اور پھر "تهذيب الكمال" کا اختصار حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "تهذيب التهذيب" کے نام سے کیا، ان کا تعارف علامہ ذہبی نے یوں کروایا ہے :

"الإِمَامُ، العَالِمُ، الحَافِظُ الكَبِيْرُ، الصَّادِقُ، القُدْوَةُ، العَابِدُ، الأَثَرِيُّ، المُتَّبِعُ، عَالِمُ الحُفَّاظِ"۔

(سير اعلام النبلاء، ج21ص444، مؤسسة الرسالة بيروت)

اس کے مقابلے میں جس نے بھی بیعت نہ کرنے والے صحابہ کا ذکر کیا ہے، وہ پہلے مرحلے میں (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ولی عہدی کی بیعت کے وقت) چار یا پانچ ناموں کے علاوہ کوئی اور نام ذکر نہیں کرتا جس کے بارے میں صراحت کے ساتھ یہ مذکور ہو کہ اس نے بیعت سے انکار کیا، اور دوسرے مرحلے میں (یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی بعد یزید کی بیعتِ خلافت کے وقت) دو ناموں کے علاوہ کوئی تیسرا نام نہیں ملتا۔ ان دو میں سے بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ نے مقام کربلاء میں جو تجاویز دیں ان میں ایک تجویز یزید کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کی بھی تھی۔ لہٰذا یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس وقت جمہور امت نے یزید کو بطور خلیفہ اور حاکم قبول کیا تھا، تمام صوبوں اور شہروں میں اس کے گورنر اور عمال کام کر رہے تھے، اور واقعہ کربلاء کے بعد تو خاص طور پر تین سال تک کسی صوبے یا علاقے سے اس کے خلاف کوئی تحریک نہیں اٹھی تھی، نہ کہیں جنگ کی نوبت آئی تھی۔

اب ملاحظہ فرمائیں، لعل شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"....بلاد اسلامیہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات سے لے کر یزید بن معاویہ کی وفات تک جسقدر قتل وغارت ہوئی اس کا صحیح اندازہ علام الغیوب ہی کے احاطہ میں ہے، کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ یوم حرہ میں اہل مدینہ کے وجوہ الناس تین سو سے زائد اشخاص شہید ہوئے....اور سات سو حملۃ القرآن شہید ہوئے اور عوام الناس کی تعداد تو ہزاروں ہے... اہل مکہ و دیگر بلاد کے باشندوں کی تعداد علاوہ ازیں ہے، یہ سارے بزرگوار یزید بن معاویہ کو فاسق، شراب نوش اور حدود اللہ سے تجاوز وتعدی کرنے والا یقین کرتے تھے اور اسی بنا پر انہوں نے بیعت سے گریز کیا یا بیعت کر کے توڑ ڈالی، کیا یہ باور کر لیا جائے کہ یہ سبھی بہتان تراش اور نا خدا ترس تھے کہ بیعت یزید پر جاہلیت کی موت کو ترجیح دیتے تھے العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ کلا ثم کلا ہرگز ایسا نہیں بلکہ اہل مدینہ نے جو صحابہ و تابعین تھے یزید کی مخالفت کو دین سمجھا اور اسی پر مستقیم رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے..... جن اشخاص کا نصب العین حمایت یزید ہے انہیں عدالت ورشد یزید پوری دنیا کی تضلیل کے معاوضہ میں بھی میسر آئے تو بھی ارزاں ہے مگر جن کا مطمح نظر صحابہ کے ناموس کا تحفظ ہے ان کے لئے بڑی الجھن ہے، مجھے احادیث صحیحہ کی روشنی میں یزید بن معاویہ کی حیثیت مجروح اور اس کے مخالف صحابہ کرام وتابعین عظام کی روش راست نظر آتی ہے... اللہ تعالی یزید کو بخشے تو سو بار بخشے وہ فعال لما یرید بھی ہے اور غفور رحیم بھی، مگر اگر یزید بن معاویہ کا راستہ حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے راستہ سے قیامت کے دن جدا ہو جائے جیسا کہ اس دنیا میں جدا تھا تو ہم اپنا حشر حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چاہتے ہیں یزید بن معاویہ کے ساتھ نہیں چاہتے..."

(استخلاف یزید، صفحہ 417و418)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب نے یہ تاثر دیا ہے کہ جیسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بلاد اسلامیہ میں بدستور ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم رہا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ محرم 61ھ میں ہونے والے واقعہ کربلا کے بعد سے ذی الحج 63ھ (واقعہ حرہ تک) پورے تین سال کہیں بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا، نہ یزید کے

خلاف کہیں بغاوت ہوئی، نہ کسی کے خلاف کوئی لشکر کشی کی گئی، نہ ہی لعل شاہ صاحب ایسی کسی قتل وغارت کا کوئی حوالہ پیش کر سکے ہیں، اسی لئے تو وہ ایک دم تین سال کی چھلانگ لگا کر واقعہ حرہ پر چلے گئے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

"کتب تواریخ میں لکھا ہے کہ یوم حرہ میں اہل مدینہ کے وجوہ الناس تین سو سے زائد اشخاص شہید ہوئے ..... اور سات سو حملۃ القرآن شہید ہوئے اور عوام الناس کی تعداد تو ہزاروں ہے ..... اہل مکہ و دیگر بلاد کے باشندوں کی تعداد علاوہ ازیں ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 417)

یہاں بھی لعل شاہ صاحب نے انتہائی تلبیس کا مظاہرہ کیا ہے، انہوں نے مختلف تاریخی روایات کو گڈ مڈ کر کے یہ باور کروایا ہے کہ جیسے اہل مدینہ کے معروف ومشہور لوگ (وجوہ الناس) جو اس واقعہ میں قتل ہوئے ان کی تعداد تین سو سے زائد تھی، اور ان کے علاوہ سات سو حملۃ القرآن مزید قتل ہوئے اور عوام الناس (غیر معروف لوگ) تو ہزاروں کی تعداد میں ان دونوں کے علاوہ قتل ہوئے۔

جبکہ انہوں نے خود جن کتب کا حوالہ دیا ہے ان میں پہلے ابو بکر بن حسین بن عمر المراغی الشافعی (م 816ھ) کی کتاب "تحقیق النصرة" کا نام لکھا ہے، اور دوسرا انہوں نے "تاریخ خلیفة بن خیاط" کا نام لکھا ہے، اور خود جو عربی الفاظ انہوں نے نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

"قتل من اولاد المهاجرين والانصار ثلثمائة وستة انفس"

مہاجرین وانصار کی اولاد میں سے تین سو چھ نفس قتل کیے گئے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 417)

جبکہ یہ الفاظ نہ "تاریخ خلیفة بن خیاط" کے ہیں اور نہ ہی "تحقیق النصرة" کے ہیں، تاریخ خلیفہ بن خیاط کے الفاظ یوں ہیں:

"وَجَمِيع من أُصِيب من قُرَيْش وَالْأَنْصَار ثَلَاث مائَة رجل وَسِتَّة رجال"۔

مجموعی طور پر قریش وانصار کے جو مرد اس واقعہ میں کام آئے ان کی تعداد تین سو چھ (306)

تھی۔

(تاريخ خليفة بن خياط، صفحه250، دار طيبة ، الرياض)

اور"تحقيق النصرة" میں یہ الفاظ ہیں:

"وقتل من اولاد المهاجرين فوق الثلاثمائة"۔
مہاجرین کی اولاد میں سے تین سو سے زائد افراد قتل ہوئے۔

(تحقيق النصرة، صفحه250، طبع السعودية)

غور فرمائیں! تاریخ خلیفہ بن خیاط میں مہاجرین و انصار کی مجموعی تعداد لکھی ہے (وہاں "اولاد المهاجرين والانصار" کے الفاظ نہیں) نیز کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ یہ تعداد تو مدینہ کے "وجوہ الناس" (یعنی بڑے معروف و مشہور افراد) کی ہے اور ان کے علاوہ سات سو حفاظ قرآن اور عوام الناس کے ہزاروں مقتول اور بھی ہیں، اور "تحقيق النصرة" میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "مہاجرین کی اولاد میں سے تین سو سے زیادہ مقتول ہوئے"، ہزاروں کا ذکر اس میں بھی نہیں ہے۔

ثانیاً، نہ ہی "خلیفہ بن خیاط" (م 240ھ) نے اس بات کی کوئی سند ذکر کی ہے اور نہ ہی "تحقيق النصرة" کے مصنف "ابو بکر المراغی" (م 816ھ) نے ہی کوئی سند بیان کی ہے کہ معلوم ہو کہ یہ تعداد انہیں کس نے بتائی ہے یا کس نے شمار کی ہے؟ بہر حال! یہ مقتولین کی مجموعی تعداد بیان کی گئی ہے، دونوں کتابوں میں کہیں نہیں لکھا کہ "اس تعداد کے علاوہ ہزاروں مقتول اور بھی ہیں"۔

اس کے بعد لعل شاہ صاحب نے "البدایۃ والنہایۃ" اور "تاریخ الاسلام للذہبی" کے حوالے سے امام مالک کی طرف منسوب ایک روایت نقل کی ہے کہ:

"رُوي عن مالك بن انس سبعمائة رجل من حملة القرآن"۔ حضرت مالک ابن انس سے روایت کی گئی ہے کہ سات سو حملۃ القرآن شہید ہوئے۔

(استخلاف یزید، صفحہ 417)

اگر چہ یہ روایت بھی منقطع ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی پیدائش سنہ 93ھ کی ہے (یعنی واقعہ حرہ کے تیس سال بعد) انہوں نے یہ تعداد کس سے سنی؟ اس کا ذکر نہیں (بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ امام مالک

نے یہ روایت اپنے شیخ "یحییٰ بن سعید الانصاری" سے لی ہے، اگر ایسا بھی ہے تو ان کی ولادت بھی واقعہ حرہ کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئی) لیکن اگر اس روایت کو صحیح بھی فرض کرلیا جائے تو یہاں بھی ایسی کوئی بات نہیں کہ یہ سات سو حملۃ القرآن، ان تین سو سے زائد" وجوہ الناس" کے علاوہ تھے جن کا ذکر خلیفہ بن خیاط نے کیا ہے، نہ ہی یہاں یہ ذکر ہے کہ ان سات سو کے علاوہ ہزاروں عام لوگ بھی قتل ہوئے۔

لیکن لعل شاہ صاحب نے اپنے افسانے میں رنگ بھرنے کے لئے ایک تو یہ تاثر دیا ہے کہ جیسے تین سو الگ ہیں، سات سو الگ ہیں اور ہزاروں ان دونوں کے علاوہ ہیں، اور اسی پر بس نہیں کی، بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ" اہل مکہ و دیگر بلاد کے باشندوں کی تعداد علاوہ ازیں ہے" لیکن اس کا حوالہ کوئی نہیں دیا نہ ہی دیا جا سکتا ہے کہ دیگر بلاد میں کوئی قتل و غارت گری ہوئی تھی۔ یہ مبالغہ آرائی کی ایک اعلیٰ مثال ہے تاکہ یہ باور کروایا جائے کہ اس وقت کے ہزاروں لوگ یزید کو فاسق و فاجر اور شرابی سمجھتے تھے۔

تنبیہ

خلیفہ بن خیاط نے جنگ حرہ میں قتل ہونے والے اہل مدینہ کی فہرست بھی درج کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ قریش و انصار کے مجموعی مقتولین کی تعداد تین سو چھ تک پہنچتی ہے، لیکن خلیفہ بن خیاط نے اس فہرست کی کوئی سند نہیں ذکر کی۔ البتہ جب ہم" ابو العرب محمد بن احمد بن تمیم التمیمي (م333ھ) کی کتاب" المحن" دیکھتے ہیں تو اس میں مقتولین کی جو فہرست درج ہے وہ بڑی حد تک تاریخ خلیفہ بن خیاط کی فہرست کے مطابق ہے، فرق یہ ہے کہ ابو العرب نے اپنے مأخذ کی صراحت کی ہے اور خلیفہ بن خیاط نے خاموشی اختیار کی ہے۔ بظاہر دونوں کے بیانات سامنے رکھیں تو لگتا ہے کہ دونوں کا مصدر معلومات ایک ہی ہے۔ ابو العرب نے مقتولین کی فہرست کا مأخذ" واقدی" کو بتایا ہے، واقدی نے کہا ہے کہ میں نے ابراہیم بن اسماعیل بن ابی حبیبہ کی کتاب پڑھی تھی جس میں حرہ کے مقتولین کے اسماء درج تھے، ابراہیم نے مجھے بتایا کہ یہ رسالہ داؤد بن حسین کا تحریر کردہ ہے جو آل عثمان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ (کتاب المحن، ص152و 153، دار الغرب الاسلامي، بیروت)۔ اس لئے یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ خلیفہ بن خیاط کا مصدر معلومات بھی یہی ہے، اور انہوں نے بھی یہیں سے مقتولین کی فہرست اخذ کی تھی۔ تاہم سوال یہ ہے کہ خلیفہ نے اس سند کے ساتھ یہ فہرست کیوں نہیں درج کی؟ تو بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کا راوی" محمد

بن عمر الواقدی" ہے اور خلیفہ بن خیاط نے اپنی کتاب میں واقدی کی روایت صرف دو جگہوں پر وہ بھی بامر مجبوری لی ہے (دیکھیں: تاریخ خلیفہ بن خیاط ص 130 اور 230 طبع دار طیبہ، الریاض) ورنہ انہوں نے عام طور پر واقدی کی روایتوں سے دامن بچالیا ہے، یہ دو جگہیں بھی تاریخ کے اہم واقعات کے زمرے میں نہیں آتیں، ان کے مقابلے میں مقتولین حرہ کی فہرست ایک اہم تاریخی واقعے سے متعلق ہے، اس لئے خلیفہ بن خیاط نے یہی مناسب سمجھا کہ ایسے اہم تاریخی واقعے میں واقدی کا نام نامی نہ لیا جائے جو کہ بالاتفاق ایک ضعیف و ناکارہ راوی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہاں ہم یہ بتاتے چلیں کہ لعل شاہ صاحب نے یزید کی ولی عہدی کے قضیہ میں جب یہ دعویٰ کیا کہ (ان کے مطابق) سنہ 44ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے لوگوں سے بیعت لینے کے لئے تشریف لائے تو اس زمانہ کے بارے میں لکھا کہ:

"مدینہ شہر میں اکابر صحابہ کی موجودگی بھی محل نظر ہے، بہت سے صحابہ نے دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کرلی تھی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 303)

یعنی ان کے مطابق سنہ 44ھ میں ہی بہت سے صحابہ دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کر کے مدینہ منورہ سے جاچکے تھے، اب معلوم نہیں سنہ 63ھ میں پھر یہ صحابہ اور ان کی اولادیں واپس مدینہ آگئی تھیں کہ مدینہ کی آبادی ہزاروں کی تعداد تک پہنچ گئی تھی یا کیا معاملہ تھا؟ نیز یہ جو بہت سے صحابہ دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کرچکے تھے، ان شہروں سے یزید کے خلاف کوئی خروج یا بغاوت کیوں نہیں ہوئی؟

جمل و صفین کے مقتولین اور حرہ کے مقتولین کا عددی موازنہ

لعل شاہ صاحب نے یزید بن معاویہ کے دور کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"بلاد اسلامیہ میں جس قدر قتل و غارت ہوئی اس کا صحیح اندازہ علام الغیوب ہی کے احاطہ میں ہے"۔

لیکن وہ صرف تین سو یا سات سو کے حوالے ہی پیش کرسکے، یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ

جمل وصفین دونوں جنگوں میں مقتولین کی مجموعی تعداد ستر ہزار کے قریب بیان کی جاتی ہے، جس میں دس ہزار جنگ جمل میں اور ساٹھ ہزار جنگ صفین میں بتائے جاتے ہیں، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"وَكَانَ مَجْمُوعُ مَنْ قُتِلَ يَوْمَ الْجَمَلِ مِنَ الْفَرِيقَيْنِ عَشَرَةَ آلَافٍ، خَمْسَةٌ مِنْ هَؤُلَاءِ، وَخَمْسَةٌ مِنْ هَؤُلَاءِ"۔

جنگ جمل کے دن دونوں جانب سے قتل کیے جانے والوں کی تعداد دس ہزار تھی، پانچ ہزار ایک طرف سے اور پانچ ہزار دوسری طرف سے۔

(البداية والنهاية، ج7ص425، وزارة الاوقاف قطر)

"وَقَدْ رَوَى الْبَيْهَقِيُّ مِنْ طَرِيقِ يَعْقُوبَ بْنِ سُفْيَانَ، عَنْ أَبِي الْيَمَانِ، عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: كَانَ أَهْلُ الشَّامِ سِتِّينَ أَلْفًا فَقُتِلَ مِنْهُمْ عِشْرُونَ أَلْفًا، وَكَانَ أَهْلُ الْعِرَاقِ مِائَةً وَعِشْرِينَ أَلْفًا فَقُتِلَ مِنْهُمْ أَرْبَعُونَ أَلْفًا"۔

صفوان بن عمرو کہتے ہیں کہ: (صفین کی جنگ میں) شامی لشکر کی کل تعداد ساٹھ ہزار تھی جس میں سے بیس ہزار قتل ہوئے، اور عراقی لشکر کی کل تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی، جس میں سے چالیس ہزار قتل ہو گئے۔

(البداية والنهاية، ج7ص466، وزارة الاوقاف قطر)

تو اگر لعل شاہ صاحب کی جنگ حرہ میں بیان کردہ مقتولین کی تعداد کو درست تسلیم کرلیا جائے (اگر چہ یہ مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں)، اور یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ یہ سات سو صرف وہ تھے جنہوں نے یزید کے خلاف خروج کیا، تو یقیناً یزید کی فوج کے کئی لوگ بھی تو قتل ہوئے ہوں گے کہ یہ دو فوجوں کے درمیان جنگ تھی، تو ہم ان کی تعداد بھی سات سو فرض کر لیتے ہیں، یوں حرہ کے مقتولین کی کل تعداد 1400 ہو جائے گی (دونوں طرف کے مقتولین)، تو پھر بھی اس تعداد کو ستر ہزار سے کیا نسبت جو جمل وصفین میں قتل ہوئے؟ یہ عدد جمل وصفین کے مقتولین کا صرف دو فیصد بنتا ہے، اور یاد رہے ان ستر ہزار میں خاص صحابہ کرام کی تعداد یقیناً بنسبت حرہ کے مقتولین کے بہت زیادہ رہی ہوگی، اور وہ حرہ میں خروج کرنے والوں سے کئی گنا افضل و بہتر

بھی تھے۔ تو اب کوئی یہاں بھی لعل شاہ صاحب کی طرح یہ لکھ دے کہ:

"جنگ جمل وصفین کے وقت بلاد اسلامیہ میں جس قدر قتل وغارت ہوئی اس کا صحیح اندازہ علام الغیوب کے احاطہ میں ہے"۔

تو اس کا جواب کیا دیا جائے گا؟

پھر یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ جمل وصفین کی جنگیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیعت نہ کرنے والوں سے بیعت لینے کے لیے لڑی تھیں کیونکہ وہ اسے اپنا شرعی حق سمجھتے تھے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہاں ایک بہت بڑی تعداد ایسے جلیل القدر صحابہ کی بھی تھی جو غیر جانبدار رہے تھے اور جنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی، کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے بیعت کرنے کے باوجود ان جنگوں میں شرکت سے معذرت کرلی تھی، جبکہ جس وقت واقعہ حرہ ہوا اس وقت یزید کی بیعت نہ کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) کے سوا کوئی نام نہیں ملتا، اور واقعہ حرہ میں کارروائی بھی ان لوگوں کے خلاف کی گئی جنہوں نے پہلے بیعت کرکے پھر تین سال بعد توڑ دی تھی۔

واضح رہے کہ یہاں یہ جذباتی اعتراض نہ اٹھایا جائے کہ یزید کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موازنہ درست نہیں، کہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور کہاں یزید؟، کیونکہ ہم موازنہ نہیں کررہے بلکہ صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان کی بیعت نہ کرنے والے حضرات صحابہ کرام کے خلاف جمل وصفین والا اقدام صحیح اور درست تھا جس میں کتب تاریخ کے مطابق ستر ہزار کے قریب صحابہ وتابعین کی جانیں گئیں، تو شریعت کی رُو سے یزید کا ان لوگوں کے خلاف اقدام اصولی طور پر کیوں غلط شمار ہوگا جنہوں نے اس کی بیعت کرکے پھر توڑ دی اور نہ صرف توڑی، بلکہ اس کے مقابلے میں اپنا الگ امیر بنا کر اس کی بیعت بھی کی اور پھر یزید کے خلاف خروج بھی کیا اور اس کے عامل کو مدینہ سے نکال دیا؟ جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ ان لوگوں کو احادیث نبویہ سنا کر اس اقدام سے باز رہنے کی نصیحت بھی کرتے ہیں کہ تمہارا یہ اقدام درست نہیں، لہٰذا اصولی طور پر یہ سوال بہرحال اٹھتا ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان کی بیعت نہ کرنے والوں کے خلاف یہ اقدامات غلط نہیں تھے تو جذبات کو ایک طرف رکھ کر بتلایا جائے کہ بیعت کرکے پھر توڑنے والوں کے خلاف کوئی حاکم ایسا اقدام کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیا ہمارے بعض فقہاء کرام نے یہ نہیں لکھا کہ باغیوں کے ساتھ

تعامل میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ قُدوہ ہیں؟

اور جو لعل شاہ صاحب نے ہزاروں کا عدد ذکر کر کے یہ لکھا ہے کہ:

"یہ سارے بزرگوار یزید بن معاویہ کو فاسق شراب نوش اور حدود اللہ سے تجاوز و تعدّی کرنے والا یقین کرتے تھے اور اسی بنا پر انہوں نے بیعت سے گریز کیا یا بیعت کر کے توڑ ڈالی"۔

تو اس پر عرض ہے کہ یہ خود لعل شاہ صاحب کی تعدی اور حدود اللہ سے تجاوز ہے، اور ان ہزاروں لوگوں کے ذمہ وہ بات لگانا ہے جو ان سے ثابت نہیں، ورنہ وہ ان" ہزاروں" لوگوں سے یہ صراحت مستند طریقے سے نقل کرتے کہ" ہم یزید کو فاسق، شراب نوش اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا" یقین کرتے ہیں"۔ یا کم از کم ان چار یا پانچ صحابہ سے ہی یہ صراحت ثابت کر دیتے جنہوں نے شروع میں (ولی عہدی کی بیعت کے وقت) یزید کی بیعت سے گریز کیا تھا، یا اگر یہ بھی ممکن نہ تھا تو وہ صرف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے ہی یہ ثابت کر دیتے کہ آپ نے کہیں یہ فرمایا ہو کہ" میں نے یزید کی بیعت سے اس لئے گریز کیا کیونکہ میں اسے فاسق، شرابی اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا یقین کرتا ہوں"۔

جب لعل شاہ صاحب اپنی پوری کتاب میں خود ان حضرات سے کسی مستند طریقے سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں کر سکے تو پھر ہم سمجھتے ہیں کہ لعل شاہ صاحب نے اپنے ذہن و دماغ کی بات ان حضرات کی طرف منسوب کر کے ان پر بہتان باندھا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ان صحابہ و تابعین پر جنہوں نے یزید کی بیعت کی تھی یہ کہہ کر بہتان لگایا کہ" انہوں نے صرف اثارت فتنہ کے خوف سے ایسا کیا تھا"۔

کیا ناموسِ صحابہ کے تحفظ کے لئے یزید کو فاسق و فاجر کہنا ضروری ہے؟

آگے جو لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"جن اشخاص کا نصب العین حمایت یزید ہے انہیں عدالت و رشد یزید پوری دنیا کی تضلیل کے معاوضہ میں بھی میسر آئے تو بھی ارزاں ہے مگر جن کا مطمح صحابہ کی ناموس کا تحفظ ہے ان کے لئے بڑی الجھن ہے"۔

تو اس پر عرض ہے کہ اگر یہ اصولی مطالبہ کرنا حمایت یزید اور پوری دنیا کی تضلیل ہے کہ یزید

پر لگائے جانے والے فسق و فجور، شراب نوشی حرامکاری اور ترک نماز وغیرہ جیسے الزامات کو شریعت کے ضابطے کے مطابق ثابت کیا جائے، تو اس کے فسق و فجور، شراب نوشی اور مخالفت کی یہ لعل شاہی تسبیح خوانی بھی دوسری طرف اُس پوری دنیا کی تضلیل ہے جس نے اس کو خلیفہ بنایا، مانا، بیعت کی، بیعت کر کے توڑنے سے منع کیا یا خاموشی اختیار کی، کیا خود لعل شاہ صاحب نے نہیں لکھا کہ:

"سنہ 59ھ کے اواخر تک بجز چند زعمائے مدینہ کے عامۃ الناس نے طوعاً و کرہاً بیعت کر لی"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 274)

تو کیا مدینہ کے تین چار زعماء کو چھوڑ کر باقی ساری دنیا نے یزید بن معاویہ کو فاسق شراب نوش اور حدود اللہ سے تجاوز و تعدی کرنے والا جانتے بوجھتے ہوئے بیعت کی تھی؟ کیا اس وقت پورے عالم اسلام میں مدینہ کے یہی تین چار زعماء ہی صحابی تھے کہ اگر یزید کو فاسق و فاجر، شرابی اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا ہونے کا اعلان نہ کیا جائے تو صحابہ کی ناموس خطرے میں پڑ جاتی ہے، اور باقی "عامۃ الناس" میں کوئی صحابی یا تابعی نہ تھا؟ ان کی ناموس کا تحفظ کوئی معنیٰ نہیں رکھتا؟ جبکہ یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ پہلے مرحلے میں یزید کی بیعت سے تخلف کرنے والے ان چار یا پانچ حضرات نے بھی کہیں یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم اس لئے بیعت نہیں کر رہے کہ یزید فاسق و فاجر، اور تارک نماز و شرابی ہے۔

تو لعل شاہ صاحب کو اس بارے میں الجھن کیوں نہ ہوئی کہ یزید کو خلافت کے لئے نامزد کرنے والے بھی صحابی تھے، اس کی بیعت کرنے والے بھی صحابی تھے، اس کے خلاف خروج نہ کرنے والے اور سکوت اختیار کرنے والے بھی صحابی تھے، اس کی بیعت توڑنے والوں کو احادیث میں وارد وعیدیں سنا کر ایسا کرنے سے منع کرنے والے بھی صحابی تھے، حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بھی جلیل القدر صحابی تھے جو یزید کی طرف سے پہلے کوفہ کے والی رہے پھر دمشق میں اس کے مشیر خاص کے طور پر رہے اور اس کی وفات تک اس سے وابستہ رہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بھی صحابی تھے، جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ "عبداللہ صورت و سیرت میں میرے جیسے ہیں"..وَأَمَّا عَبْدُ اللهِ فَشَبِيهُ خَلْقِي وَخُلُقِي..(مسند احمد، ج3ص279، مؤسسة الرسالة) یہ اکثر یزید سے ملنے دمشق جایا کرتے تھے اور ہر بار

یزیدان کا خیر مقدم کیا کرتا تھا، بلکہ بعض مصادر میں آتا ہے کہ یہ واقعہ حرہ سے پہلے دمشق جانے والے اہل مدینہ کے وفد میں بھی شامل تھے اور وفد کے ساتھ واپس لوٹنے کے بجائے یزید کے پاس ہی رک گئے تھے، کتب انساب کے مطابق ان کی ایک صاجزادی "ام محمد" یزید کے نکاح میں تھیں (نسب قريش لمصعب الزبيري، ص83، دار المعارف مصر / جمهرة انساب العرب لابن حزم، ج1ص69، دار المعارف مصر)۔

الغرض! یہ دونوں بھی جلیل القدر صحابی ہیں، ان دونوں نے کبھی یزید کی شراب نوشی یا فسق و فجور کی بابت ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ یزید کے پاس ان کا یہ مقام و مرتبہ ہونے کے باوجود کیا وجہ تھی کہ یہ لوگ اس کی ان برائیوں پر مطلع نہ ہوسکے جس پر دمشق سے کئی سو میل دور بیٹھے اہل مدینہ ہو گئے تھے؟ پھر ان دونوں صحابیوں کی صحابیت کیا معنیٰ رکھتی ہے اگر یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر غیرت و حمیّت کا مظاہرہ نہ کرسکیں؟ یہ یزید کو شراب پیتے دیکھیں، نماز چھوڑتا ہوا پائیں اور پھر بھی اس کے ساتھ لگے رہیں اور اس سے تعلقات برقرار رکھیں۔ کیا حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کہ وہ شراب پینے اور فرض نماز چھوڑنے کے گناہ سے واقف نہ ہوں گے؟ حالانکہ اسلام کی بنیاد سمجھی جانے والی مشہور حدیث انہوں نے ہی امت کو سنائی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا: الحلال بيِّن والحرام بيِّن وبينهما امور متشابهات لايعلمها كثير من الناس .. الحديث (حلال خوب واضح ہے اور حرام بھی خوب واضح ہے، مگر ان دونوں کے بیچ بہت سے مشتبہ معاملے ہیں جن کی حلت یا حرمت اکثر لوگوں کے علم میں نہیں (صحیح بخاری وصحیح مسلم وغیرہ)۔

پھر ان دونوں بزرگوں کے علاوہ بھی یزید کے ارد گرد بہت سے صلحاء وزُہاد رہتے تھے۔ مثلاً خالد بن معدان الکلابی رحمۃ اللہ علیہ کو لیں جو صاحب شُرطہ (پولیس کے ذمہ دار) تھے، آپ کا شمار اکابر تابعین میں ہوتا ہے اور تمام لوگ ان کے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور خشیت و انابت کی گواہی دیتے ہیں (سير اعلام النبلاء، ج4ص536، مؤسسة الرسالة)۔

تو سوال یہ ہے کہ آخر یزید کی شراب نوشی اور حدود اللہ سے تجاوز کا علم ان صحابہ و تابعین کو کیوں نہ ہوا جو اس کے وزیر و مشیر تھے اور جو اس کے پاس دمشق میں رہتے تھے، (بشرطِ صحت روایات) صرف مدینے کے چند لوگوں کو کیوں اور کیسے ہوا؟ کیا دمشق کے مغرب میں شمالی افریقہ اور مشرق میں فارس (ایران) تک چونسٹھ

لاکھ مربع میل سے زیادہ علاقے پر پھیلی ہوئی اسلامی ریاست میں صرف ایک ہی شہر "مدینہ" تھا جس میں سارے صحابہ وتابعین جمع تھے؟

قصہ مختصر! ان قرائن و دلائل کی روشنی میں صاف پتہ چلتا ہے کہ یزید پر شراب نوشی، ترک نماز اور دیگر متعین قسم کے فسق و فجور کا کوئی الزام ثابت نہیں ہے، اور جن روایات میں ایسی باتیں اس کی طرف منسوب کی گئی ہیں، ان میں کوئی بھی صحیح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام علامہ قاضی ابو بکر محمد بن عبداللہ ابن العربی الاندلسی المالکی رحمۃ اللہ علیہ (م 543ھ) نے بالکل درست فرمایا ہے کہ:

"فإن قيل: كان يزيد خمّارًا، قلنا: لا يحل إلا بشاهدين فمن شهد بذلك عليه، بل شهد العدلُ بعدالته. فروى يحيى بن بكير، عن الليث بن سعد، قال الليث: تُوُفّي أمير المؤمنين يزيد في تاريخ كذا - فسماه الليث "أمير المؤمنين" بعد ذهاب ملكهم وانقراض دولتهم"۔

اگر کوئی کہے کہ یزید شراب نوش تھا، تو ہم کہیں گے کہ ایسا الزام لگانا دو عدد (چشم دید) گواہوں کے بغیر حلال نہیں، اب ذرا بتایا جائے کہ اس کے خلاف ایسی گواہی کس نے دی ہے؟ (کہ میں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے) بلکہ اس کے برعکس اہل عدل نے اس کی عدالت کی گواہی دی ہے۔ چنانچہ (امام) یحییٰ بن بکیر نے (شَيْخُ اَلْإِسْلَامِ اَلْإِمَامُ اَلْحَافِظ) لیث بن سعد (م 175ھ) سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: امیر المؤمنین یزید کی وفات فلاں تاریخ کو ہوئی، پس لیث بن سعد نے اسے "امیر المؤمنین" کہا، اور اس وقت کہا جب ان کی حکومت وسلطنت ختم ہو چکی تھی۔

(العواصم من القواصم بتحقيق محب الدين الخطيب، صفحه 232و 233، مصر)

شاید اسی وجہ سے لعل شاہ صاحب نے جہاں قاضی ابو بکر ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب کی تعریف کی ہے وہیں ان پر ناصبیت کی چوٹ بھی کر دی ہے، لکھتے ہیں:

"العواصم من القواصم قاضی ابو بکر ابن العربی کی نہایت شاندار تصنیف ہے، ناموس صحابہ کے

تحفظ میں حصن حصین ہے، البتہ یزید ابن معاویہ کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ناصبیت کی جھلک پائی جاتی ہے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 71)

نوٹ: امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کے جس قول کا ذکر کیا گیا ہے وہ خلیفہ بن خیاط رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ یوں نقل کیا ہے کہ:

" قرئَ عَلَى ابْن بكير وَأَنا أسمع عَن اللَّيْث قَالَ توفّي أَمِير الْمُؤمنِينَ يَزِيد فِي سنة أَربع وَسِتِّينَ"۔

امام لیث بن سعد نے کہا: امیر المؤمنین یزید کی وفات 64ھ میں ہوئی۔

(تاریخ خلیفه بن خیاط، ص 253، دار طیبة،الریاض)

اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یزید کے بارے میں شراب نوشی و دیگر فواحش کی تہمتوں کی نفی فرمائی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ولم يكن مُظهرا للفواحش كما يحكي عنه خصومُه"۔

یزید ایسا نہیں تھا کہ فواحش و منکرات کا علانیہ ارتکاب کرتا جیسا کہ اس کے مخالفین نے اس کے بارے میں مشہور کر رکھا ہے۔

(الوصية الكبرىٰ، صفحه 107، مكتبة الصديق، السعودية)

الغرض! بتانا یہ مقصود ہے کہ جن لوگوں نے یزید کے فسق کی بات کی ہے ان میں سے اکثر نے یہ بات سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور واقعہ حرہ وغیرہ کے تناظر میں کی ہے کہ (ان کے خیال اور ان کی تحقیق کے مطابق) ان واقعات کی وجہ سے اس نے فسق کا ارتکاب کیا، مثلاً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"کسی مسلمان کو کافر کہنا مناسب نہیں، یزید مؤمن تھا بسبب قتل کے فاسق ہوا، کفر کا حال دریافت نہیں کافر کہنا جائز نہیں کہ وہ عقیدہ قلب پر موقوف ہے"۔

(فتاویٰ رشیدیہ کامل، صفحہ 192، دارالاشاعت کراچی)

لہٰذا یہ باور کروانا کہ یزید شروع ہی سے ذاتی کردار کے لحاظ سے فاسق و فاجر، زانی و شرابی اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا تھا اور اسی وجہ سے کچھ صحابہ نے اس کی بیعت نہیں کی تھی اور اسی وجہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اس کے خلاف نکلے تھے، یہ سب مبالغہ آرائی اور عدل و انصاف سے تجاوز ہے، کسی آدمی پر اتنا ہی الزام لگانا چاہئے جتنا اس کے بارے میں ثابت ہو، اگر بالفرض قتل حسین رضی اللہ عنہ میں اس کا شریک ہونا یا اس کے حکم سے ایسا ہونا ثابت ہو، یا واقعہ حرہ میں بغاوت وخروج کرنے والوں کے خلاف بطور حاکم اس کا اقدام شرعاً غلط ثابت ہو جائے، یا یہ ثابت ہو جائے کہ اس کے حکم سے مدینہ کے ان باغیوں کے خلاف کارروائی کے دوران شرعی حدود سے تجاوز کیا گیا تو صرف اس قدر ہی اسے ملزم قرار دیا جائے جتنا مستند ثبوت ہو۔ جبکہ ان باتوں کی حیثیت بھی ایک علمی تحقیق کی ہے، یہ کوئی عقیدے کا مسئلہ نہیں، لہٰذا اگر کسی کے نزدیک شرعی قواعد کے تحت یزید کے بارے میں یہ الزامات ثابت نہ ہوں اور وہ اس بارے میں سکوت کرتا ہو تو اسے اہل سنت سے خارج کرنا اور اس پر طعن و تشنیع کرنا غلط ہے۔

اسی طرح یہ بھی عدل و انصاف کا خون ہے کہ نفرت میں دنیا بھر کی برائیاں یزید بن معاویہ کے کھاتے میں ڈال دی جائیں اور شیعیت زدہ تقیہ باز کمزور وضعیف راویوں کی انتہائی بودی وغیر ثابت تاریخی روایتوں کے زیر اثر یزید کو مجمع الفسق والفجور رکھ ڈالا جائے۔ فسق وفجور کی روایات نقل در نقل ہو کے حد و حساب سے ماوراء ہوگئی ہیں جسے کچھ لوگ غلطی سے "تواتر" سمجھنے لگ گئے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یزید کو فاسق و فاجر اور شرابی وغیرہ کہے جانے کی اصل بنیاد ایسی تاریخی روایات ہیں جو قصہ گو، جعل ساز، مجہول الحال اور ضعیف راویوں نے بیان کی ہیں۔ جب یہ روایات مسترد ہو جاتی ہیں تو تفسیق کے اقوال بھی قابل غور ٹھہر جاتے ہیں۔ امور دین اور مسائل اعتقادیہ میں سے نہ ہونے کے باعث اس میں بیجا انہماک درست نہیں ہے، یہی احوط واسلم و پسندیدہ طریق بھی ہے۔ فسق وفجور کی جو روایات عام کی گئی ہیں انہیں سن کے آگے چلتا کر دینے کے بالمقابل ان کی تحقیق کرنا اور فنی اعتبار سے الزامات کا جائزہ لینا ہی درست طریقہ ہے اور یہی شریعت کا حکم بھی ۔ ہم شروع میں عرض کر آئے ہیں کہ یک روایت (یا واقعہ) کو متعدد مصنّفین کا نقل کر دینا اس کے معتبر ہونے کی دلیل نہیں بن جاتا، اگر ایک واقعہ شروع میں ایک ضعیف گواہ نے بیان کیا ہو، پھر اس سے تین افراد نے نقل کر کے اپنی کتب میں لکھ دیا ہو، بعد میں سینکڑوں عالم فاضل لوگوں نے اسے نقل کر دیا تو اس طرح ایک

دوسرے سے نقل کرتے چلے جانے سے اصل واقعے کے ثبوت میں کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی، اگر شروع کے راوی ضعیف ہیں تو واقعہ ضعیف ہی ثابت ہوگا۔لہٰذا خوب واضح رہنا چاہیے کہ "نقل تفسیق" الگ ہے اور "اثبات فسق" امر آخر۔کسی کا یزید کو فاسق، فاجر، قاتل حسین اور شراب نوش وغیرہ کہنا اس وقت تک قابل سماع نہیں ہے جب تک ان باتوں کی شریعت کے اصول وضوابط کے مطابق کوئی ٹھوس بنیاد اور مستند دلیل نہیں پیش کی جاتی۔کسی افواہ کے محض نقل در نقل ہونے سے وہ حقیقت نہیں قرار پاجاتی۔اس لئے احتیاط پر مبنی موقف تو سکوت کا ہے لیکن تحقیق پر مبنی موقف تردید فسق ہے، مسلمان میں عدل اصل ہے اور فسق اس کی نفی ہے، بغیر مضبوط وثابت دلائل کے تفسیق مسلم میں احتیاط برتنے کی ضروت ہے۔

سانحہ کربلا اور یزید کا کردار

اسی طرح یہ مشہور کر دیا گیا کہ یزید نے عبیداللہ بن زیاد کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا تھا اور اسی کے حکم سے انہیں شہید کیا گیا، یوں یزید کو "قاتل حسین" کہہ دیا جاتا ہے۔مگر کسی صحیح روایت سے یہ بات ثابت نہیں کہ یزید نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہو۔ثابت شدہ بات یہی ہے کہ عراق کے گورنر عبیداللہ بن زیاد نے اپنے اختیار پر یہ سب کیا تھا، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"إن يزيد بن معاوية لم يأمر بقتل الحسين باتفاق أهل النقل ولكن كتب إلى ابن زياد أن يمنعه عن ولاية العراق..........ولمّا بلغ يزيدَ قتلُ الحسين أظهر التوجع على ذلك وظهر البكاء في داره، وَلَمْ يَسْبِ لَهُ حَرِيمًا أَصْلًا، بَلْ أَكْرَمَ أَهْلَ بَيْتِهِ، وَأَجَازَهُمْ حَتَّى رَدَّهُمْ إِلَى بَلَدِهِمْ"۔

اہل نقل کا اتفاق ہے کہ یزید نے حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا، صرف ابن زیاد کو یہ لکھا تھا کہ انہیں عراق کی ولایت (یعنی وہاں حکومت بنانے سے) سے روکا جائے.......جب یزید کو حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کے قتل کی خبر پہنچی تو اس نے اس پر بڑے دکھ اور تکلیف کا اظہار کیا اور اس کے گھر میں آہ وبکا ہونے لگی، اس نے کسی کو قیدی نہیں بنایا بلکہ ان

کے گھر والوں کا اکرام کیا اور انہیں عزت کے ساتھ ان کے شہر (مدینہ) کی طرف لوٹا دیا۔

(ملخصاً: منهاج السنّة، ج4ص472، السعودية)

امام ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ (م643ھ) اسی سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"لم يَصح عندنَا أَنه أَمر بقتْله رَضِي الله عَنهُ وَالْمَحْفُوظ أَن الْآمِر بقتاله المفضي إِلَى قَتله كرمه الله إِنَّمَا هُوَ عبيد الله بن زِيَاد وَالِي الْعرَاق إِذْ ذَاك، وأما سبُّ يزيد ولعنه فليس من شأن المؤمنين "۔

ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا تھا۔ محفوظ (صحیح) یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس جنگ کا حکم جو آپ رضی اللہ عنہ کے قتل کا سبب بنی، عبید اللہ بن زیاد نے دیا تھا جو اس وقت عراق کا حاکم تھا، جہاں تک یزید کو برا بھلا کہنے اور اس پر لعنت کرنے کی بات ہے تو یہ مومنوں کی شان کے خلاف ہے۔

(فتاوى ابن الصلاح، صفحه 102، دار الحديث، القاهرة)

امام ابو حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ (م505ھ) فرماتے ہیں :

"فإن قيل هل يجوز لعن يزيد لأنه قاتل الحسين أو آمر به، قلنا هذا لم يثبت أصلاً فلا يجوز أن يقال إنه قتله أو أمر به ما لم يثبت، فضلاً عن اللعنة لأنه لاتجوز نسبة مسلم إلى كبيرة من غير تحقيق، قال صلى الله عليه وسلم لا يَرمِي رجلٌ رجلاً بالكفر ولا يرميه بالفسق إلا ارتدّت عليه إن لم يكن صاحبه كذلك"۔

اگر کہا جائے کہ کیا یزید پر لعنت کرنا جائز ہے کیونکہ وہ حسین (رضی اللہ عنہ) کا قاتل ہے یا اس نے اس کا حکم دیا تھا؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ بات سرے سے ثابت ہی نہیں (کہ اس نے یہ قتل کیا یا اس کے حکم سے ایسا ہوا۔ ناقل) لہٰذا جب تک یہ ثابت نہ ہو، یہ کہنا جائز ہی نہیں کہ اس نے قتل کیا یا اس کے حکم سے ہوا، (اور اس وجہ سے) اس پر لعنت کرنا تو دور کی بات ہے، کیونکہ ایک

مسلمان کی طرف بلا تحقیق کبیرہ گناہ کی نسبت کرنا جائز نہیں، نبی ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کفر یا فسق کی تہمت لگاتا ہے تو اگر وہ دوسرا شخص ایسا نہیں ہے تو وہ بات اس تہمت لگانے والے کی طرف واپس لوٹ آتی ہے۔

(احیاء علوم الدین، کتاب آفات اللسان، ج3ص125، دار المعرفة بیروت)

علامہ شمس الدين ابن خَلِّكان الأربلي الشافعي(م 681ھ) نے بھی امام غزالی کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے جس میں آپ نے فرمایا:

"ويزيد صحَّ إسلامه، وما صحَّ قتله الحسين رضي الله عنه، ولا أمره ولا رضاه بذلك، ومهما لم يصح ذلك منه لا يجوز أن يظنَّ ذلك به فإن إساءة الظن بالمسلم أيضاً حرام ...."۔

یزید صحیح الاسلام تھا، اور یہ بات درست نہیں کہ اس نے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا، نہ ہی اس نے اس بات کا حکم دیا اور نہ ہی وہ اس پر راضی ہوا، تو جب اس کے بارے میں یہ بات کسی صحیح طریق سے ثابت ہی نہیں تو اس کے بارے میں ایسا گمان کرنا جائز نہیں کیونکہ کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی حرام ہے۔

(وفيات الاعيان وأنباء ابناء الزمان، ج3ص288، دار صادر بیروت)

خود لعل شاہ صاحب نے صحیح بخاری کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اہل عراق سے متعلق مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے اور اس کا رد نہیں کیا کہ:

"اہل عراق مکھی کے قتل کے بارے میں دریافت کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے کو قتل کیا ہے اور نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ حسن و حسین دنیا میں میرے دو پھول ہیں"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 420)

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمہ داری عراقیوں پر ڈالتے تھے۔

زیادہ سے زیادہ یزید کا قصور یہ گنوایا جاسکتا ہے کہ فرمانروائے سلطنت ہونے کی حیثیت سے اسے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا،لیکن یزید پر یہ ذمہ داری ڈالنے والوں کو پہلے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یزید کی حکومت و خلافت قائم ہو چکی تھی اور وہ ساری اسلامی سلطنت کا بلاشرکت غیرے حکمران بن چکا تھا، اور اس کی قائم شدہ حکومت کے خلاف خروج کا وہی شرعی حکم ہے جو کسی بھی حاکم کے خلاف ایسے اقدام کا ہوا کرتا ہے۔ یہ سوال وہ لوگ نہیں اٹھا سکتے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یزید کی خلافت وحکومت قائم ہی نہیں ہوئی تھی، اور سوائے شام کے باقی کسی جگہ کے لوگوں نے اسے حاکم تسلیم نہیں کیا تھا۔

ایک اہم سوال

اس کے ساتھ ایک اہم سوال یہ ہے کہ سانحۂ کربلا کے بعد اس وقت موجود صحابہ وتابعین میں سے کتنوں نے یہ کہہ کر یزید کی بیعت توڑ دی کہ وہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا ذمہ دار ہے اور اس وجہ سے وہ فاسق ہوگیا ہے؟ اس وقت موجود کتنے لوگوں نے قصاص کا مطالبہ کیا، جیسے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً بعد ان کے قصاص کا مطالبہ کیا گیا اور اس پر دو جنگیں (جمل وصفین) تک ہوگئیں؟ وہ اہل مدینہ جنہوں نے سنہ 63ھ کے آخر میں یزید کی بیعت توڑ کر اس کے خلاف باقاعدہ خروج کیا، وہ آخر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بھی تین سال تک کیوں خاموش رہے اور اس کی بیعت پر قائم رہے؟ اور جب تین سال بعد انہوں نے بیعت توڑی اور ان کی طرف سے یزید پر لگائے گئے جو الزامات بیان کیے جاتے ہیں ان میں یہ الزام کیوں نہیں ملتا کہ اس نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؟ کیا ان کے نزدیک "قتل حسین" فسق وفجور اور شراب نوشی کے مقابلے میں معمولی جرم تھا؟

یہاں ہمیں لعل شاہ صاحب کا "حُجر بن عدی" کے قتل سے متعلق اٹھایا گیا سوال یاد آگیا جو انہوں نے یوں اٹھایا تھا کہ :

> "سوال پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ سے ہم عصر صحابہ وتابعین نے کیا تاثر لیا ہے، حجر بن عدی کی بغاوت جتھہ بندی اور حکومت وقت کے ساتھ اس کا محاربہ اور تصادم، متعدد اصحاب کی شہادتیں بھی ان کے سامنے تھیں انہوں نے حجر ابن عدی کو مطعون کیا یا زیاد کو ملعون جانا..... "۔
>
> (استخلاف یزید، صفحہ 160)

تو ہمارا سوال بھی یہ ہے کہ جس وقت سانحہ کربلا ہوا، اس زمانے میں موجود صحابہ وتابعین میں سے کتنوں نے یزید کو" قاتل حسین" قرار دے کر اس کے خلاف آواز اٹھائی یا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ اٹھایا؟ یا اس کے خلاف اسی بنیاد پر خروج کیا؟ جنہوں نے واقعہ کربلا کے تین سال بعد مدینہ میں اس کی بیعت توڑ کر اس کے خلاف خروج کیا، انہوں نے واقعہ کربلا کے فوراً بعد یہ کام کیوں نہ کیا؟ اور پھر ان کی طرف یزید پر لگائے گئے الزامات کی جو چارج شیٹ منسوب کی جاتی ہے، اس میں "قتل حسین" کا الزام کیوں نہیں ملتا؟

رہی یہ بات کہ اگر سانحہ کربلا کا ذمہ دار حاکم عراق عبیداللہ بن زیاد تھا تو یزید نے اسے سزا کیوں نہ دی یا اسے معزول کیوں نہ کیا؟ تو ہمیں اس بارے میں یزید کی طرف سے عذر خواہی دینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں، تاہم ممکن ہے اس وقت کے سیاسی حالات، خاص طور عراق میں موجود فتنہ پردازوں کی شرارتوں کے پیش نظر اور ان پر قابو پانے کے لئے ابن زیاد کو وہاں رکھنا حکومتی مجبوری رہا ہو، بالکل اسی طرح جیسے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے معاملے میں ان کے خلاف فساد بپا کرنے والوں اور ان کے قتل کے ذمہ داروں کے خلاف فوراً سخت کارروائی نہ کرسکنا اس وقت کے حالات کے پیش نظر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سیاسی مجبوری تھی، یہاں تک کہ اس بات پر جنگیں ہوگئیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہاں تک مولانا سید لعل شاہ صاحب بخاری کی کتاب کے اہم موضوعات پر ہمارا تحقیقی تبصرہ مکمل ہوتا ہے، اپنی کتاب کے اگلے حصے میں (صفحہ 466 سے) انہوں نے محمود احمد عباسی صاحب کے خاص نظریات اور ان کی تصنیفات پر نقد شروع کیا ہے۔ ہم شروع میں عرض کر آئے ہیں کہ ہماری اس تحریر کا موضوع عباسی صاحب کے نظریات یا ان کی تصنیفات یا ان کا دفاع نہیں، ہماری غرض سید لعل شاہ صاحب کے نظریات پر تبصرہ ہے۔ چنانچہ ہم لعل شاہ صاحب کی چند مزید متفرق باتوں پر تبصرہ کر کے اپنی کتاب کا اختتام کرتے ہیں۔

❀❀❀

متفرقات

صحابہ کرام پر لعل شاہ صاحب کا بہتان

لعل شاہ صاحب نے "تتمۃ" کا عنوان دے کر لکھا ہے کہ:

"جو صحابہ اثارت فتنہ کے خوف سے خاموش رہے یا کسی دوسری مصلحت کی بنا پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے یزید کے زمانہ تک ان کے ہمراہ رہے تھے کہ امت کا مجتمع رہنا افتراق سے بہر حال بہتر ہے، ان کے ساتھ بنوامیہ نے کیا کیا؟ ذیل کی سطور میں ذرا اسے ملاحظہ کریں تا کہ اغیلمۃ سفہاء کے منظر کی ایک جھلک سامنے آجائے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 443)

اس کے بعد انہوں نے جن صحابہ کرام کے نام ذکر کیے ہیں وہ یہ ہیں:

(1) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (2) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (3) حضرت انس رضی اللہ عنہ 4)) حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ (5) حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ (6) حضرت قیس بن خرشہ رضی اللہ عنہ (7) حضرت ابی شریح العدوی رضی اللہ عنہ۔

(استخلاف یزید، صفحہ 423 تا 427)

پھر لعل شاہ صاحب نے یہ انتہائی نامناسب سرخی لگائی ہے" طرفداروں کا حشر" اور پھر ان حضرات کا ذکر کیا ہے:

(1) حضرت الضحاک بن قیس الفہری رضی اللہ عنہ (2) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ (3) عَمرو بن سعید الاشدق۔

(استخلاف یزید، صفحہ 429 تا 431)

تبصرہ:

اولاً تو ان صحابہ کرام پر لعل شاہ صاحب نے یہ بہتان لگایا ہے کہ یہ حضرات اثارت فتنہ کے خوف سے یا کسی مصلحت کی بنا پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کے ساتھ رہے تھے۔ یہ ان صحابہ کرام کے ذمہ وہ بات لگانا ہے جو ان سے ثابت نہیں، لعل شاہ صاحب یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ سمجھتے تو یہ حضرات بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کی خلافت کو غلط تھے، صرف فتنہ اور امت مسلمہ میں افتراق کے خوف سے ان کے ساتھ

رہے یا خاموش رہے۔ لعل شاہ صاحب نے یہ ان صحابہ کرام کے اندر کی بات کی ہے، اور اپنے اندر کی بات یہ حضرات خود بتا سکتے تھے، اور لعل شاہ صاحب نے ان میں سے کسی سے بھی ایسی کوئی تصریح یا وضاحت نقل نہیں کی، اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ لعل شاہ صاحب کا ان صحابہ پر بہتان ہے۔

آگے لعل شاہ صاحب نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا نام لے کر لکھا ہے کہ:

"جیسا کہ معلوم ومعہود ہے کہ ولاۃ الامور کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ ان کے فسق وفجور اور جَور وتعدی کی بنا پر ان کے امتثالِ امر میں کوتاہی نہ کی جائے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 423)

یہاں لعل شاہ صاحب نے پہلے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف وہ بات منسوب کی ہے جو ان سے منقول نہیں، ہمارے علم کے مطابق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہیں نہیں فرمایا کہ" میری ذاتی رائے یہ ہے کہ فسق وفجور اور جور (ظلم) وتعدی کی وجہ سے حاکم کا حکم ماننے میں کوتاہی نہ کی جائے"۔ دوسرا لعل شاہ صاحب نے یہ تاثر دیا ہے جیسے یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ذاتی رائے اور اجتہاد یا ان کا تفرد تھا اور باقی امت کی رائے ان سے مختلف ہے۔

جبکہ یہ بات فرامین نبویہ سے مستفاد ہے جن میں سے متعدد احادیث ہم پہلے نقل کر آئے ہیں، اور انہی احادیث نبویہ کی بنا پر جمہور صحابہ وجمہور امت کا مسلک وموقف ہے کہ:

"وَلَا نَرَى الْخُرُوجَ عَلَى أَئِمَّتِنَا وَوُلَاةِ أُمُورِنَا وإن جاروا ولا ندعوا عَلَيْهِمْ وَلَا نَنْزِعُ يَدًا مِنْ طَاعَتِهِمْ ... الخ"۔

یعنی ہم اپنے حکام اور والیوں پر خروج جائز نہیں سمجھتے، اگرچہ وہ بے راہ رو ہوں، اور نہ ان پر بد دعا کرتے ہیں، اور نہ ان کی اطاعت سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔

(العقيدة الطحاوية، ص24، دار ابن حزم، بيروت)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"وَلِهَذَا كَانَ الْمَشْهُورُ مِنْ مَذْهَبِ أَهْلِ السُّنَّةِ أَنَّهُمْ لَا يَرَوْنَ الْخُرُوجَ عَلَى الْأَئِمَّةِ وَقِتَالَهُمْ بِالسَّيْفِ وَإِنْ كَانَ فِيهِمْ ظُلْمٌ كَمَا دَلَّتْ عَلَى ذَلِكَ

الْأَحَادِيثُ الصَّحِيحَةُ الْمُسْتَفِيضَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "۔

اسی لیے اہل سنت کا مشہور مذہب یہی ہے کہ وہ ائمہ (حکام) کے خلاف خروج اور تلوار کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کو جائز نہیں سمجھتے اگرچہ وہ ظلم کے مرتکب ہی کیوں نہ ہوں، جیسا کہ اس بات پر نبی کریم ﷺ سے مروی احادیث صحیحہ کی کثیر تعداد دلالت کرتی ہے۔

(منهاج السنة ،ج3ص391، السعودية)

خود لعل شاہ صاحب نے بھی اپنی کتاب کے شروع میں لکھا ہے:

"حاکم کی اطاعت ضروری ہے بشرطیکہ وہ معصیت کا حکم نہ دے ورنہ لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق، حاکم فاسق کے خلاف خروج اور بغاوت جائز نہیں ہے جب تک وہ کفر بواح یعنی ظاہر کفر کا ارتکاب نہ کرے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 29)

لہٰذا اسے صرف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ذاتی رائے بتانا اور یہ تاثر دینا کہ جیسے یہ جمہور صحابہ کے مقابلے میں ان کا تفرد اور ذاتی اجتہاد تھا، مغالطہ آفرینی کے سوا کچھ نہیں۔

ثانیاً: لعل شاہ صاحب نے تسلیم کیا کہ جن (9) صحابہ کرام کے نام انہوں نے یہاں لکھے ہیں یہ سب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے ساتھ تھے یا کم از کم ان کے فیصلوں کے خلاف نہیں بولے اور خاموش رہے، یعنی انہوں نے یا تو یزید کی بیعت کی تھی یا خاموش رہے اور اسے فاسق و فاجر وغیرہ نہیں کہا۔ فلله الحمد۔

ثالثاً: لعل شاہ صاحب نے ان صحابہ کا نام لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعد کے زمانہ میں بنو امیہ کے حکام نے ان کے ساتھ ظلم و زیادتی یا بدکلامی کی تھی، ان میں سے بھی اکثر جن کتابوں کا حوالہ انہوں نے دیا ہے ان میں یہ باتیں بغیر کسی سند کے لکھی ہیں جن پر تبصرہ کرنا وقت کا ضیاع ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ یا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ؟

لعل شاہ صاحب کی ایک روایت میں تحریف

لعل شاہ صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

"راقم السطور مکرر عرض کرتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت انصار موجود تھے اور

سعد ابن عبادہ کے بغیر جمیع انصار نے بیعت کر لی تھی اور مہاجرین کے بعض معتمد علیہ افراد موجود تھے جنہوں نے برموقعہ بیعت کر لی تھی اور جو برموقعہ موجود نہ تھے انہوں نے بھی بعد میں بیعت کر لی تھی۔ البتہ حضرت علی ؓ، حضرت زبیر ؓ اور حضرت عباس ؓ کے قلوب مکدر تھے کہ ہم سے بے اعتنائی برتی گئی، ہمیں مشورہ میں نہیں بلایا گیا، حالانکہ ہم اس امر کے مستحق تھے، لیکن حضرت عمر الفاروق ؓ کا بیان اس بارہ میں غیر مبہم ہے کہ اگر ہم بعجلت معاملہ نہ کرتے اور مشورہ تک معاملہ ملتوی کرتے تو فساد کا اندیشہ تھا، تاہم حضرت عمر ؓ کو زندگی بھر اس کوتاہی کا ملال رہا۔ چنانچہ جب کلب عقور نے (یعنی ابولؤلؤ فیروز مجوسی نے۔ ناقل) انہیں زخمی کیا اور آپ قریب المرگ ہو گئے، اصحاب رسول عیادت کو حاضر ہو رہے تھے، عم رسول ﷺ بھی تشریف لائے، دیکھا تو حضرت عمر ؓ کو متاسف پایا گویا کسی ذہنی کشمکش اور کرب و اضطراب میں ہیں، عرض کیا کہ امیر المؤمنین یہ کیا جزع فزع ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے آنحضور ﷺ سے حسن مصاحبت کی ہے کہ وہ آپ سے راضی ہو کر گئے ہیں، پھر ابوبکر کی مصاحبت کی، وہ بھی آپ کی حسن مصاحبت سے راضی گئے، پھر مسلمانوں سے آپ کی صحبت کا یہی حال رہا اگر آپ ہم سے جدا ہو جائیں گے وہ سب آپ سے راضی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ساری باتیں جو تو نے کی ہیں درست ہیں، یہ اللہ کا احسان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر ؓ مجھ سے راضی گئے (ما تری بي من جزعي فهو من اجلك ومن اجل اصحابك) لیکن تو جو کچھ میری جزع دیکھ رہا ہے وہ تیری وجہ سے ہے اور تیرے اصحاب کی وجہ سے ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آخری وقت جب کہ انسان کو اپنی کوتاہیاں سامنے نظر آتی ہیں، امیر المؤمنین حضرت عمر ؓ کے سامنے اپنی صرف ایک کوتاہی ہی تھی کہ انہوں نے بیعت ابی بکر ؓ کے وقت حضرت عباس ؓ اور ان کے اصحاب علی ؓ و زبیر ؓ کو مشاورت میں شامل نہیں کیا جس کی عذر خواہی وہ آخری جمعہ کی تقریر میں بھی کر چکے تھے لیکن جس مصلحت کے پیش نظر انہوں نے تساہل کیا وہ بمراتب احسن ہے"۔

(استخلاف یزید طبع اول، صفحہ 535و536)

تبصرہ:

لعل شاہ صاحب نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آخری وقت میں عمِ رسول سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے ان کے پاس تشریف لانے والی روایت نہ جانے کہاں سے نقل کی ہے؟ ورنہ اصل روایت میں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بجائے ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا آپ کے پاس آنا مذکور ہے (صحیح البخاری،باب مناقب عمر بن الخطاب ابي حفص القرشی) تو چونکہ روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر ہوتے ہوئے لعل شاہ صاحب کا وہ مطلب نہیں بن سکتا تھا جو وہ اس روایت سے کشید کرنا چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے اس میں یہ تحریف کی کہ" ابن عباس "کو" عباس" بنا دیا، پھر" من اجلك ومن اجل اصحابك" کا معنی شُرّاحِ حدیث نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے اپنا غم نہیں، تمہارا غم ہے کہ میں فِتَن کا بند دروازہ تھا، میرے بعد یہ دروازہ کھل جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے تو تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے میرے بعد تمہارا کیا بنے گا؟ لیکن لعل شاہ صاحب نے اپنے" ما فی الباطن" کا دیکھئے کیسا مظاہرہ کیا ہے کہ:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے قلوب مکدر تھے کہ ہم سے بے اعتنائی برتی گئی..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زندگی بھر اس کوتاہی کا ملال رہا..... معلوم ہوتا ہے کہ آخری وقت جب کہ انسان کو اپنی کوتاہیاں سامنے نظر آتی ہیں، امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنی صرف ایک کوتاہی ہی تھی کہ انہوں نے بیعت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب علی رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کو مشاورت میں شامل نہیں کیا"۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ! کس بے باکی کے ساتھ آخری وقت میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ان کی یہ کوتاہی یاد کروائی جا رہی ہے کہ انہوں نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں (سیدنا علی وسیدنا زبیر رضی اللہ عنہما) کو مشاورت میں شامل کیوں نہ کیا، جبکہ اس روایت میں سرے سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آنے کا ذکر ہی نہیں، بلکہ روایت میں" عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما " کا نام ہے، لعل شاہ صاحب نے یہ سارا افسانہ خود سے بنایا ہے دوسرے لفظوں میں یہ ان کی" خود ساختہ" کہانی ہے۔

__نوٹ:__ غالباً کسی نے لعل شاہ صاحب کو اس تحریف پر متنبہ کیا ہوگا تو "استخلافِ یزید" کی طبع دوم (نومبر 1989ء) میں انہوں نے عبارت میں تبدیلی کرتے ہوئے" __عمِ رسول حضرت عباس__ "کو" __ابن عمِ__

رسول حضرت ابن عباس" تو بنا دیا لیکن آگے کی عبارت جوں کی توں رہنے دی جس میں ہے کہ:

"..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنی صرف ایک کوتاہی ہی تھی کہ انہوں نے بیعت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب، علی رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ کو مشاورت میں شامل نہیں کیا جس کی عذر خواہی وہ آخری جمعہ میں بھی کر چکے تھے"۔

(استخلافِ یزید طبع دوم، صفحہ 566)

حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ چونکہ اس روایت کا عمِ رسول سیدنا عباس رضی اللہ عنہ یا ان کے ساتھیوں سیدنا علی وسیدنا زبیر (رضی اللہ عنہما) کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہی نہ تھا تو وہ اس پوری عبارت کو ہی حذف کر دیتے۔

کسی صحیح روایت کو جعلی اور موضوع کہہ دینا ناخدا ترسی کا ثبوت

سید لعل شاہ صاحب بخاری نے صحیح بخاری کی" حدیث قسطنطنیہ" کو راوی کی خود ساختہ (موضوع) لکھا تھا (جیسا کہ آپ نے پڑھا) لیکن یہی لعل شاہ صاحب مولانا محمد اسحاق سندیلوی صاحب پر ایک جگہ نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قارئین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سندیلوی صاحب نے اس روایت کو جعلی اور موضوع کہہ کر کس قدر ناخدا ترسی کا ثبوت دیا ہے۔ اس حدیث پر ائمہ الحدیث نے صحت کا حکم لگایا اور محققین مصنفین نے اس کی صحت پر اعتماد کر کے اس کا تذکرہ کیا حالانکہ کسی موضوع روایت کا ذکر بغیر بتلائے کہ یہ موضوع ہے امانت و دیانت کے خلاف ہے"۔

(اظہار حقیقت بر بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 154)

تبصرہ:

اسی کو کہتے ہیں" دوسروں کو نصیحت، خود میاں فضیحت"، حدیث قسطنطنیہ کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا، محققین ائمہ مؤرخین نے اس کی صحت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کا تذکرہ کیا (حوالے آپ پڑھ چکے)، کسی محدث یا شارح نے اس حدیث کو" خود ساختہ" کہنے کی جرات نہ کی، صرف لعل شاہ صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کے بغض میں اس حدیث کو" راوی کی خود ساختہ" قرار دے کر ناخدا ترسی کا

ثبوت دیا۔

آخری بات

مولانا سید لعل شاہ بخاری نے اپنی کتاب کے آخر میں محمود احمد عباسی صاحب کے بارے میں لکھا ہے:

"ہم صدق دل سے دعا کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے خلوص نیت اور جذبہ صادقہ سے قلم اٹھایا تھا تو اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے، اور اگر انہوں نے کسی خاص منصوبہ کے تحت قلم اٹھایا تھا جیسا کہ ہم دیانتداری سے سمجھتے ہیں، خداوند تعالیٰ سوءظن سے محفوظ رکھے، تو وہ ہمارے محاسبہ سے کہیں زیادہ سنگین احتساب میں آچکے ہوں گے۔ وما اردت الا الاصلاح ماالستطعت وما توفيقي الا بالله عليه توكلتُ واليه انيب۔

(استخلاف یزید، صفحہ 711)

ہم بھی صدق دل سے مولانا سید لعل شاہ صاحب کے لئے اسی دعا اور انہی الفاظ کے ساتھ اپنی گزارشات کا اختتام کرتے ہیں۔

الهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه، وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه

ضمیمہ

بغاوت

اور

”الفئۃ الباغیۃ“

E-BOOK

مولانا سید لعل شاہ صاحب بخاری نے "استخلاف یزید" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والے مشاجرے اور جنگ صفین کے بارے میں (بزعم خود) اہل سنت کے موقف کی تشخیص کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا اور مختلف حوالے نقل کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "باغی، علی الباطل، جائر، گناہ کے مرتکب، عاصی" بتایا حتی کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ایک قول پیش کر کے ان کے اور ان کے ساتھیوں کی طرف "فسق وظلم" کی نسبت بھی کی، اور پھر آخر میں لکھا کہ:

"دلائل کے لحاظ سے یہ قول بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے"۔

(دیکھیں: استخلاف یزید، صفحہ 180 تا 188)

تو جب اس بارے میں لعل شاہ صاحب پر مختلف لوگوں کی طرف سے نقد کیا گیا تو انہوں نے 51 صفحے کا ایک اور رسالہ شائع کیا جس کا نام رکھا:

"ماقال اصحاب الانابة في مقاتلات الصحابة یعنی اقوال منیبین دربارۂ جنگ صفین"

اور اس کے پیش لفظ میں لکھا کہ:

"....بعض حضرات کو بندہ کے یہ الفاظ ناگوار گذرے اور توہین کی رٹ لگائی، اس لئے بندہ نے رسالہ ہذا لکھنے کا تہیہ کیا ہے کہ بعض معروف بزرگواروں کی آراء لکھ دی جائیں جنہوں نے "باطل"، "فاسق"، "باغی"، "جائر" کے الفاظ بولے، بغاوت کی تو خیر جملہ بزرگوں نے نسبت کی ہے، بعض نے "ضلالت" کی بھی نسبت کی ہے، مقصد یہ ہے کہ قارئین کرام مطلع ہو جائیں کہ بندہ تو ناقل ہے، اصل قائلین تو صحابہ، تابعین، ائمہ دین واکابرین ہیں"۔

(ماقال اصحاب الانابة في مقاتلات الصحابة، صفحه 2)

یعنی لعل شاہ صاحب نے یہ بتایا کہ یہ سب کچھ جو میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے، یہ تو پہلے گذرے بزرگوں نے کہا ہے، میں نے تو صرف نقل کیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ لعل شاہ صاحب نے یہ سب نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ بھی یوں دیا تھا کہ:

”دلائل کے لحاظ سے یہ قول بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 188)

اور دوسری طرف انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ:

”جرح تو خیر دور کی بات ہے پچھلی امت صحابہ کی نسبت یہ حیثیت بھی نہیں رکھتی کہ ان کی تعدیل کرسکے وہ بزرگوار ہماری تعدیل سے بھی بالاتر ہیں وہ جن کی تعدیل خدا اور رسول نے کر دی ہے انہیں معیار تعدیل پر لانا بھی ان کی توہین ہے“۔

(استخلاف یزید، صفحہ 48)

اپنے اوپر ہونے والے اعتراض کے جواب میں لعل شاہ صاحب نے بعینہ وہی بات کی ہے جو ان کے مرید ”عبدالقیوم علوی“ (مصنف کتاب ”تاریخ نواصب“) نے اپنے خلاف دائر شدہ مقدمے میں جواب دیتے ہوئے اسلام آباد کی عدالت میں کہی تھی کہ ”میں نے تو اپنی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کو کچھ نہیں کہا، میں نے تو پہلے لوگوں کے حوالے ہی نقل کیے ہیں“۔

نیز لعل شاہ صاحب نے اپنی ایک کتاب میں زیر عنوان ”بغاوت“ لکھا ہے:

”امام برحق کے خلاف خروج وقتال فسق اور ظلم کو مستلزم ہے کیونکہ امام برحق کی اطاعت لازم اور خروج عن الاطاعت ممنوع اور حرام، اور ممنوع کا عمداً ارتکاب معصیت ہے، جو لوگ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف خطاء عنادی نسبت کرتے ہیں، وہ فسق وفساد کی نسبت جائز سمجھتے ہیں“۔

(اظہار حقیقت پر بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 248)

لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ”بغاوت“ کا شرعی وفقہی معنیٰ ومفہوم بھی بیان کر دیا جائے، تاکہ معلوم ہوسکے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف جو بغاوت کی نسبت کی جاتی ہے، کیا وہ اصول وضوابط کے لحاظ سے ”شرعی واصطلاحی“ بغاوت بنتی بھی ہے یا نہیں؟ نیز ”خروج عن طاعۃ الامام“ کا کیا مطلب ہے؟

❀❀❀

بغیؒ" یا" بغاوت" کا شرعی و فقہی معنیٰ

باغی، شرع میں کہتے ہیں امامِ عادل و برحق کی اطاعت سے ناحق خروج کرنے والے کو، چنانچہ فقہاء نے اس کی فقہی و شرعی تعریف کی ہے :

"البغي وهو الخروج عن طاعة الامام"۔

(الهداية، ج4ص353،باب البغاة)

بعض فقہاء نے اس کو جمع کے صیغہ سے یوں بیان کیا ہے :

"الخارجون عن طاعة الامام الحق بغير حق"۔

باغی وہ لوگ ہیں جو خارج ہوئے امام حق کی اطاعت سے ناحق۔

(الدر المختار مع رد المحتار، ج6ص411،باب البغاة،دار عالم الكتب الرياض)

درمختار کے بعض نسخوں میں" عن طاعة الامام الحق" کے بجائے" على الامام الحق " کے الفاظ ہیں، لفظی ترجمہ گو پہلے جملے کا ہے" امام حق کی اطاعت سے" اور دوسرے جملے کا ہے" امام حق کے خلاف" لیکن مفہوم و مقصود دونوں کا ایک ہی ہے.

علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ (م 855ھ) لکھتے ہیں:

"هم الخارجون على الامام الحق بغير حق"۔

باغی وہ لوگ ہیں جو امام حق کے خلاف ناحق خروج کریں۔

(البناية شرح الهداية، باب البغاة، ج7ص298،دار الكتب العلمية بيروت)

بلکہ یہیں علامہ عینی نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ:

"بيانه أن المسلمين إذا اجتمعوا على إمام، وصاروا آمنين به، فخرج عليه طائفة من المؤمنين، فإن فعلوا لِظُلم ظَلَمهم، فهم ليسوا من أهل البغي، وعليه أن يترك الظلم وينصفهم ولا ينبغي للناس أن يعينوه لأن فيه إعانة على الظلم، وأن لا يعينوا تلك

الطائفة على الإمام أيضاً لأن فيه إعانة لهم على خروجهم على الإمام، وإن لم يكن ذلك لظلم ظلمهم، ولكن ادعوا الحق والولاية فقالوا :الحق معنا، فهم أهل البغي"۔

جب مسلمانوں نے ایک امام پر اجتماع کیا اور اس کے سبب سے امن میں ہو گئے پھر مسلمانوں کی ایک جماعت نے اس پر خروج کیا، سو اگر انہوں نے یہ خروج امام کے کسی ایسے ظلم کی وجہ سے کیا جو اس نے ان پر ڈھایا تو وہ لوگ باغی نہ ہوں گے بلکہ امام پر لازم ہو گا کہ وہ اپنے ظلم سے باز آئے اور ان لوگوں سے انصاف کرے اور اس صورت میں (دوسرے) لوگوں کو نہ تو اس حاکم کی مدد کرنی چاہئے کیونکہ یہ ظلم پر اعانت ہوگی، اور نہ ہی اس خروج کرنے والے گروہ کی حاکم کے خلاف مدد کریں کیونکہ یہ حاکم کے خلاف خروج میں مدد کرنا شمار ہو گا، لیکن اگر اس گروہ کا خروج حاکم کے ظلم کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس گروہ کا یہ دعویٰ ہو کہ ہم حق پر ہیں اور ساتھ وہ اپنے لئے حکومت اور ولایت کے مدعی بھی ہوں تو انہیں باغی کہا جائے گا۔

(البناية شرح الهداية، باب البغاة، ج7ص298)

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے دو مزید باتیں معلوم ہوئیں کہ بغاوت اس خروج کو کہتے ہیں جو اس امام اور حاکم کے خلاف ہو جس پر مسلمانوں کا اتفاق و اجتماع ہو چکا ہو..إذا اجتمعوا على إمام.. اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ باغی اپنی حکومت کے بھی دعویدار ہوتے ہیں .. ادعوا الحق والولاية..”۔

فتاوی ہندیہ (المعرف فتاویٰ عالمگیری) میں ہے :

"أَهْلُ الْبَغْيِ كُلُّ فِرْقَةٍ لَهُمْ مَنَعَةٌ يَتَغَلَّبُونَ وَيَجْتَمِعُونَ وَيُقَاتِلُونَ أَهْلَ الْعَدْلِ بِتَأْوِيلٍ وَيَقُولُونَ الْحَقُّ مَعَنَا وَيَدَّعُونَ الْوِلَايَةَ.."۔

یعنی باغی اس گروہ کو کہتے ہیں کہ جن کے پاس قوت اور طاقت ہو اور وہ جمع ہو کر اہل عدل کے خلاف قتال کریں تاویل کے ساتھ اور یہ کہیں کہ حق ہمارے ساتھ ہے اور وہ ولایت یعنی

حکومت کے بھی مدعی ہوں۔

(الفتاوى الهندية، ج2ص302،دار الكتب العلمية بيروت)

غور کریں! یہاں بھی باغی ہونے کے لئے یہ شرط بیان ہوئی ہے کہ" وہ حکومت وولایت کے مدعی بھی ہوں"۔

شمس الدین محمد بن عبداللہ الزرکشی الحنبلی رحمۃ اللہ علیہ (م772ھ) لکھتے ہیں :

"قوم من أهل الحق يخرجون عن قبضة الإمام ويرومون خلعه...."۔

یعنی وہ لوگ جو اہل حق میں سے ہوں لیکن امام کے قبضہ حکومت سے خروج کریں اوران کا مقصداسے حکومت وامامت سے ہٹانا ہو۔

(شرح الزركشي على مختصر الخرقي، ج6ص222،مكتبة العبيكان)

بغاوت کی اس تعریف میں بھی صاف یہ بتایا گیاہے کہ ان کا مقصد حاکم کی حکومت ختم کرنااوراسے اقتدارسے ہٹانا ہو۔

موفق الدین ابن قدامۃ المقدسی الحنبلی رحمۃ اللہ علیہ (م620ھ) نے بھی بالکل یہی الفاظ لکھے ہیں :

"قَوْمٌ مِنْ أَهْلِ الْحَقِّ، يَخْرُجُونَ عَنْ قَبْضَةِ الْإِمَامِ، وَيَرُومُونَ خَلْعَهُ"۔

(المغني في الفقه الحنبلي، ج12ص242، دار عالم الكتب)

قاضی ابوالحسن احمد بن محمد المحاملی الشافعی رحمۃ اللہ علیہ (م415ھ) لکھتے ہیں :

"وإنما نحكم لهم بحكم أهل البغي إذا وجدت ثلاث شرائط:لأن يكون لهم تأويل، وأن ينصبوا إماما، وأن تظهر لهم شوكة.."۔

یعنی باغی کاحکم لگانے کے لئے تین شرطوں کا پایا جاناضروری ہے، پہلی یہ کہ ان کا خروج کسی تاویل کی بنیاد پر ہو، دوسری یہ کہ وہ (موجودہ امام اورحاکم کے مقابلے میں) ایک امام اور

حاکم مقرر کریں اور تیسری یہ کہ ان کے پاس قوت اور شوکت بھی ہو۔

(اللباب في الفقه الشافعي، ص373، دار البخاري، المدينة)

فقہاء کی بیان کردہ باغی یا باغیوں کی ان تعریفات کے پیش نظر کسی گروہ کے شرعاً باغی ہونے کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے:۔

1) ایک یہ کہ امام، عادل و برحق ہو۔

2) دوسری یہ کہ اس کی اطاعت سے خروج ہو۔

3) تیسری یہ کہ وہ خروج ناحق ہو۔

4) چوتھی یہ کہ امام پر لوگوں کا اتفاق واجتماع ہوا ہو۔

5) پانچویں یہ کہ خروج کرنے والوں کا مقصد امام کو معزول کرنا ہو۔

6) چھٹی یہ کہ وہ خود اپنے لئے حکومت کا دعویٰ بھی کریں۔

ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر نہ پائی گئی تو کوئی گروہ، شرعاً باغی نہ کہلائے گا، نہ اس پر باغیوں والے احکام ہی جاری ہوں گے، چنانچہ:

الف:......اگر امام ہی عادل و برحق نہ ہو بلکہ جائر و ناحق ہو تو اس کے ظلم و جور اور ناحق شناسی و ناحق کوشی کی وجہ سے اس کی اطاعت سے خروج کرنے والا باغی نہ ہوگا بلکہ وہ اپنے اس خروج میں معذور ہوگا، اس کو اپنی اور مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا حسبِ طاقت و قدرت حق حاصل ہوگا، اس کے مقابلہ میں امام پر اپنے ظلم و جور سے باز آنا لازم ہوگا، چنانچہ علامہ عینیؒ کی عبارت پہلے نقل ہو چکی کہ:

"جب مسلمانوں نے ایک امام پر اجتماع کیا اور اس کے سبب سے امن میں ہو گئے پھر مسلمانوں کی ایک جماعت نے اس پر خروج کیا"......الخ)

(البناية شرح الهداية، باب البغاة، ج7ص298)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، امام عادل و برحق کی اطاعت سے خروج کرنے والوں کی چار قسمیں بیان کرکے پانچویں قسم امامِ جائر کی اطاعت سے خروج کرنے والوں کی بیان کرتے ہوئے لکھتے

ہیں:۔

"قُلتُ، وَلَهم صِنف خامِس وهو مَن خَرَجَ عن طاعة اِمامٍ جائرٍ اَرَادَ الغلبة علیٰ مالِه او نفسِه او اهله او علیٰ اموال المسلمین وانفسهم، فَهو معذُورٌ لا یحِلُّ قِتَالُه ولَه ان یدفعَ عن نفسه وماله وأهلیه بقدر طاقته"۔

میں کہتا ہوں امام کی اطاعت سے خروج کرنے والوں کی ایک پانچویں قسم بھی ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص ایسے امامِ جائر کی اطاعت سے خروج کرے جو اس کے جان ومال، اہل وعیال یا مسلمانوں کے جان ومال کو ہتھیانا چاہتا ہو تو ایسا شخص، معذور ہوگا، امام کے لئے اس سے قتال کرنا جائز نہ ہوگا (لیکن اگر امام نے ایسا کیا تو) اس شخص کو اپنے جان ومال اور اہل وعیال کے دفاع کا اپنی ہمت کے مطابق حق ہوگا۔

آگے اس کی دلیل میں خوارج سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

"اِن خَالَفُوا اماماً عدلاً فَقَاتِلُوهُم واِن خَالَفُوا اماماً جائراً فلا تُقَاتِلُوهم فاِن لهم مقالاً"۔

اگر وہ امام عادل کی مخالفت کریں تو ان سے قتال کرو اور اگر وہ امام جائر کی مخالفت کریں تو تم ان سے قتال نہ کرو کیونکہ (اس صورت میں) ان کے لئے گنجائش ہے۔

(اعلاء السنن،ج12ص655،ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة، کراتشی)

ب :...... اسی طرح اگر امام برحق کی اطاعت سے خروج نہ پایا جائے بلکہ کسی صاحبِ حل وعقد کی طرف سے عدم دخول فی طاعة الامام پایا جائے یا یوں کہہ لیجئے کہ بیعت توڑنا نہ پایا جائے بلکہ بیعت سے علیحدہ رہنا اور اس سے ہاتھ کھینچ لینا پایا جائے تو اس صاحبِ حل وعقد کا یہ عدم دخول فی طاعة الامام یا بیعت سے ہاتھ کھینچ لینا، شرعی وفقہی بغاوت نہ ہوگا، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے متعلق اپنے مکتوب میں" مقدمہ ششم" کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:

"ششم آنکہ خروج چیزے دیگرست وخلع بیعت چیزے دیگر، چنانچہ نقض عہد چیزے دیگر ست ومنابذۂ عہد چیزے دیگر، اول بحکم: اَوفُوا بِالعَھد اِنَّ العھدَ کَانَ مسئُولاً۔۔۔ ولَا تَنقُضُوا الاَیمانَ بَعدَ تَوکِیدِھا ممنوع ست وثانی بارشاد: فَانبِذ اِلَیھم علیٰ سواء مباح، ہمچنیں خروج برامام بعد بیعت ممنوع بالذات ست وخلع بیعت بوقتِ ضرورت، بذاتِ خود مباح"۔

چھٹے یہ کہ (امام کی اطاعت سے) خروج اور چیز ہے اور (اس کی) بیعت سے علیحدہ ہوجانا دوسری چیز ہے، جیسے کہ عہد توڑ دینا اور چیز ہے اور عہد واپس کر دینا دوسری چیز ہے، اول بحکم :اَوفُوا بِالعَھد...الخ ناجائز ہے اور ثانی بارشاد: فَانبِذ اِلَیھم ...الخ مباح ہے، ایسے ہی بیعت کرنے کے بعد امام کے خلاف خروج از خود ناجائز ہے، اور بوقتِ ضرورت بیعت سے ہاتھ کھینچ لینا اپنی جگہ مباح ہے۔

(مکتوب قاسمی در تحقیق واثبات شہادت امام حسین مطابق قواعد سُنّیاں، مقدمہ ششم، قاسم الفقہام مع اردو ترجمہ انوار النجوم، صفحہ 160)

حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے :

"...اگر امام کی بیعت ہی مختلف فیہ ہو کہ بعض بیعت کریں اور بعض ابتدا ہی سے نہ اسے امام مانیں نہ اس کی بیعت کریں تو بیعت نہ کرنے والے اس کی اطاعت کے پابند نہیں"۔

(شہید کربلا اور یزید، صفحہ 107 و108، ادارہ اسلامیات لاہور)

اور پھر آگے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اس عبارت سے واضح ہے کہ امام کی اطاعت کا وجوب بیعت کے بعد ہوتا ہے نہ کہ بیعت سے پہلے، پھر بیعت کے بعد بھی سمع وطاعۃ کا بقاء جب رہتا ہے کہ امام متفق علیہ عادل ہو، پس ایک نفس امارت ہے اور ایک عموم امارت، عموم سے پہلے جو بھی دائرۂ بیعت میں داخل نہ ہو اس پر امام کی اطاعت واجب نہیں.."۔

(شہید کربلا اور یزید، صفحہ 109، ادارہ اسلامیات لاہور)

یاد رہے! لعل شاہ صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی صاحب کی اسی کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

"محمود عباسی کے افکار کے رد میں جناب حکیم الامت قاری محمد طیب قاسمی صاحب نے ایک کتابچہ بعنوان "شہید کربلا اور یزید" تصنیف فرمایا ہے، اس کتابچہ کا ایک ایک حرف ہمارے مدعا کی تصدیق کرتا ہے اور یزید کی تفسیق اور عباسی تکذیب اس مقالے کا اصل مقصد ہے، بلکہ یوں سمجھیے کہ ہم نے اس کتاب (یعنی "استخلاف یزید" ۔ناقل) میں حکیم الامت کے مدعا کی ہی تکمیل کی ہے فلله الحمدوالمنة"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 446)

ج :...... تیسری چیز جو کسی کے شرعی باغی ہونے کے لئے ضروری ہے، یہ ہے کہ امام برحق کی اطاعت سے اس کا خروج ناحق ہو، اگر برحق ہو تو خروج کرنے والا شرعاً باغی نہ ہوگا، چنانچہ اوپر فقہاء کے حوالہ سے باغی کی جو شرعی وفقہی تعریف نقل کی گئی ہے اس میں "خروج بغير حق" کی تصریح موجود ہے، علامہ حصکفیؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

"فَلَو بحقّ فَلَيسُوا بِبُغَاةٍ" (اگر ان کا خروج کسی امرِ حق پر ہو تو وہ باغی نہیں)۔

(الدرُّ المختار مع رد المحتار، ج6ص411، باب البُغاة)

د... : چوتھی، پانچویں اور چھٹی چیز بھی بعض فقہاء کے حوالے سے نقل ہو چکی کہ جس امام کے خلاف خروج ہو رہا ہے اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہو چکا ہو، اور خروج کرنے والے اسے معزول کرنا یا ہٹانا چاہتے ہوں اور وہ خود اپنی حکومت کے مدعی بھی ہوں۔

کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا صفینی موقف "شرعی بغاوت" تھا؟

بغاوت اور باغی کی اس شرعی وفقہی تعریف کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت معاویہؓ اپنے صفینی موقف میں شرعی باغی نہیں بنتے، کیونکہ شرعی بغاوت کے لئے جن مذکورہ چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے یہاں

ان میں سے صرف ایک چیز پائی گئی تھی یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اپنے دور میں امام برحق وعادل اور خلیفہ راشد ہونا (اور اس پر بھی اہل سنت کا اتفاق قرن اول کے بعد ہوا، قرن صحابہ میں آپ کی خلافت پر اتفاق نہ ہوسکا) لیکن دوسری چیزیں نہ پائی گئی تھیں، یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے امام برحق کی اطاعت سے اول تو خروج ہی نہ کیا تھا بلکہ جو کچھ ان سے وقوع میں آیا تھا وہ ایک صاحب حِل وعقد کا شروع سے ہی "عدم دخول فی طاعۃ الامام" تھا، یعنی انہوں نے خلیفہ کی بیعت کر کے توڑی نہ تھی بلکہ شروع میں بیعت کی ہی نہ تھی، بیعت کر کے اس سے خارج نہ ہوئے تھے بلکہ شروع سے بیعت میں داخل ہی نہ ہوئے تھے، اور کسی صاحبِ حل وعقد کا شروع سے ہی امام وخلیفہ کی بیعت سے ہاتھ کھینچ لینا بقول حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ و قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ اپنی جگہ مباح ہے نہ کہ امام کے خلاف بغاوت۔

اور اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے صفینی موقف کو ایک گھڑی کے لئے امامِ برحق کی اطاعت سے خروج ہی فرض کر لیا جائے تو پھر ان کا یہ خروج کسی امرِ ناحق پر ہرگز نہ تھا کہ بغاوت کہلاتا بلکہ سراسر ایک امرِ حق پر تھا کیونکہ یہ قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے تھا اور قصاصِ عثمان رضی اللہ عنہ یقیناً امرِ حق ہی تھا اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فی الوقت قصاص لینے سے اپنی معذوری تو ظاہر فرمائی تھی لیکن قصاص اور مطالبہ قصاص کو ناحق وناجائز نہ فرمایا تھا، علاوہ ازیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص اور اس کے مطالبہ کو ناحق کہنے کا معنیٰ تو یہ بنتا ہے کہ ان کا قتل (العیاذ باللہ) برحق تھا، اور اس کا قائل کوئی کور باطن سبائی تو ہوسکتا ہے کوئی سُنی ہرگز نہیں ہوسکتا۔

الغرض! حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا صفینی موقف بالفرض اگر امامِ حق کی اطاعت سے خروج ہی تھا تو وہ بحقٍ تھا، بِغیرِ حقٍ نہ تھا اور علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ بغاوت، امامِ حق کی اطاعت سے وہ خروج ہوتا ہے جو بغیر حقٍ ہو، اگر بحقٍ ہو تو وہ خروج بغاوت نہیں ہوتا "فَلَو بِحقٍ فلَیسُوا بِبُغاۃٍ"، جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ خروج بغیر حقٍ نہ ہوا بلکہ "بِحقٍ" ہوا تو وہ اپنے صفینی موقف میں باغی بھی نہ ہوئے۔

اور اگر ان شرطوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے جو دوسرے فقہاء کے حوالے سے نقل کی گئیں تو ان کے مطابق بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی نہیں بنتے کیونکہ آپ کا اختلاف قصاص عثمان رضی اللہ عنہ پر تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت وخلافت پر نہ تھا اور نہ ہی جنگ صفین کا مقصد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت وامامت سے معزول کرنا تھا،

چنانچہ علامہ ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

"وَمن اعْتِقَاد أهل السّنة وَالْجَمَاعَة أَن مَا جرى بَين مُعَاوِيَة وَعلي رَضِي الله عَنْهُمَا من الحروب فَلم يكن لمنازعة مُعَاوِيَة لعَلي فِي الْخلَافَة..." ۔

یعنی اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگوں کی بنیاد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت کا نزاع نہ تھا۔

(الصواعق المحرقة، ج2ص622،مؤسسة الرسالة بيروت)

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

"امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ وہ جھگڑا خلافت پر نہیں ہوا بلکہ حضرت امیر (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ ناقل) کی خلافت کی ابتدا ہی میں قصاص کے پورا کرنے کے لئے ہوا، شیخ ابن حجر ہیتمی نے بھی اسی بات کو اہل سنت و جماعت کے معتقدات میں سے بیان کیا ہے" ۔

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی مترجم اردو، دفتر اول، حصہ دوم، صفحہ 119 مکتوب نمبر 251)

نیز یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اپنی ولایت و حکومت کا بھی کوئی دعویٰ یا اعلان نہیں کیا تھا۔

اور سب سے اہم یہ کہ جن لوگوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اجتہادی خطا کی نسبت کی ہے وہ بھی مانتے ہیں کہ اجتہادی خطا حق کے دائرے کے اندر ہی ہوتی ہے، اسی لئے تو اس پر ایک اجر ملتا ہے، تو اگر اجتہادی خطا، حق کے دائرے کے اندر ہی ہوئی تو بغاوت بھی نہ ہوئی کیونکہ بغاوت تو جیسا کہ ابھی معلوم ہوا، حق کے دائرے سے باہر کی چیز ہوتی ہے نہ کہ حق کے دائرے کے اندر کی، خود لعل شاہ صاحب نے لکھا ہے :

"...امام برحق کی اطاعت لازم اور خروج عن الاطاعت ممنوع اور حرام ہے، اور حرام و ممنوع کا عمداً ارتکاب معصیت ہے.... الخ" ۔

(اظہار حقیقت پر بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 248)

بلکہ لعل شاہ صاحب نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ:

"صفین کی جنگ جو حضرت معاویہ نے قصاص دم عثمان سے لڑی ہے، اہل السنۃ والجماعت کے عقیدہ کے تحت اس جنگ میں حضرت معاویہ باغی تھے، انہوں نے خلیفہ برحق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بغاوت کر کے دم عثمان کی آڑ لی ہے اور جنگ کی ہے"۔

(استخلاف یزید، صفحہ 526)

اس لحاظ سے اجتہادی خطا اور بغاوت آپس میں ایک دوسرے کی ضدیں ہوئیں، اور دو ضدیں ایک محل میں ایک ہی وقت میں جمع نہیں ہو سکتیں، لہٰذا حضرت معاویہؓ کی یہ خطائے اجتہادی اگر حق کے دائرے کے اندر تھی تو فقہی و شرعی بغاوت نہ تھی اور اگر بغاوت تھی تو حق کے دائرے کے اندر نہ تھی۔

ایک اہم بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اسلاف صرف گنتی کے وہی چند رازی وغزالی نہیں جنہوں نے حضرت معاویہؓ وغیرہ کو شرعی باغی قرار دیا ہے بلکہ وہ ہزاروں صحابہؓ وتابعینؒ بھی اسلاف ہی ہیں اور سب بعد والوں سے بڑھ کر اسلاف ہیں، اور بعد والی ساری امت کے اسلاف ہیں، جنہوں نے حضرت عمارؓ کی شہادت کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی حضرت معاویہؓ وغیرہ کو قاتل عمارؓ اور باغی قرار نہیں دیا، چنانچہ:۔

سب سے پہلے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ہی لیجئے! یہ بُغاۃ وخوارج کے احکام میں قدوہ مانے جاتے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ان کی براہِ راست مڈھ بھیڑ ہوئی، حضرت عمار رضی اللہ عنہ انہی کی طرف سے لڑتے ہوئے صفین میں شہید ہوئے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضرت معاویہؓ وغیرہ کو حضرت عمارؓ کا قاتل اور "الفئۃ الباغیۃ" کا مصداق نہیں ٹھہرایا، ورنہ وہ تحکیم قبول نہ کرتے، نیز رفع مصاحف یا ارسالِ مصحف کے جواب میں یہ نہ فرماتے کہ "نَعَمْ. أَنَا أَوْلَى بِذَلِكَ. بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللهِ" یعنی میں اس کا زیادہ حق دار ہوں، ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ اللہ کی کتاب کے مطابق ہی ہوگا (البدایۃ والنہایۃ، ج7ص464، وزارۃ الاوقاف قطر) بلکہ یہ فرماتے کہ حضرت عمارؓ کو قتل کر کے تم از رُوئے حدیث نبوی شرعی وحقیقی باغی قرار پا چکے ہو اور حقیقی باغیوں کے حق میں یہی مُصحف "فقاتلوا التي تبغي حتىٰ تفيء الى امر الله" کا فیصلہ دے چکا ہے، لہٰذا مزید اب کسی فیصلے کی ضرورت نہیں، بس یا تو بیعت کر کے

میری اطاعت قبول کرو یا پھر اسی مصحف کے فیصلے کے مطابق آخر تک تم سے یوں ہی قتال جاری رکھا جائے گا۔ لیکن حضرت علیؓ یوں نہیں فرماتے بلکہ جنگ بندی قبول کر لیتے اور آخر کار مہادنہ (صلح) پر راضی ہو جاتے ہیں، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ، حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو شرعی و حقیقی باغی نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی آپ انہیں "حدیث قتل عمار" میں مذکور لفظ "الفئة الباغية" کا مصداق سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس واقعہ سے نہ تو کہیں اپنے حق میں اور حضرت معاویہؓ کے خلاف استدلال کیا اور نہ کسی کے سامنے اس کو حجت کے طور پر پیش ہی کیا، حتیٰ کہ شام پر دوبارہ حملہ کی تیاری کے موقع پر بھی اس کا حوالہ دیا نہ کوئی ذکر اذکار ہی کیا، حالانکہ اس اعتبار سے یہ واقعہ نہایت ہی اہم اور فیصلہ کن تھا، حضرت معاویہؓ کے خلاف، اُن کی ایک قوی ترین اور مفید ترین دلیل تھی۔

لعل شاہ صاحب نے اس سوال کا جواب دینے کی یوں کوشش کی ہے کہ:

"ہمارے نزدیک تو جیسا کہ ہم نے استخلاف یزید کے صفحہ 26 میں ذکر کیا کہ آپ (یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ۔ناقل) فریق ثانی کے رفع مصاحف کو سمجھے کہ حتی تفيء الى امر الله کی صورت واضح ہوگئی ہے..."

(اظہار حقیقت پر بصیرت افروز تبصرہ، صفحہ 250)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"راقم السطور کہتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حتی تفيء الى امر الله کی تعمیل میں جنگ بندی کا حکم دیا اور حَکَم مقرر کیے..."۔

(استخلاف یزید، صفحہ 526)

لیکن اس پر پھر سوال ہوتا ہے کہ چلیں فرض کرلیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ "رفع مصاحف" سے یہ سمجھے کہ فریق ثانی اپنی بغاوت ترک کر کے اللہ کے حکم کی طرف لوٹنا چاہتا ہے، اس لئے آپ رضی اللہ عنہ نے جنگ بندی اور تحکیم پر رضامندی قبول فرمالی، لیکن کیا مذاکرت اور تحکیم کے نتیجے میں فریق ثانی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول فرما کر ان کی بیعت کرلی تھی؟ ہرگز نہیں، تو جب معلوم ہوگیا کہ فریق ثانی کی طرف سے "حتی

تفيء الی امر الله" پرعمل درآمد نہیں ہوا، اوراس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ تقریباً تین سال بقید حیات بھی رہے،تو آپ نے پھر" فقاتلوا التي تبغي" پرعمل کرتے ہوئے قتال کیوں نہ کیا؟

نیز اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جن صاحب ہدایہ، علامہ مرغینانی کا حوالہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو" جائز" ثابت کرنے کے لئے دیا جاتا ہے، انہوں نے ہی یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ باغیوں اور ڈاکوؤں میں سے جو مارا جائے اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے گی اور دلیل یہ دی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغیوں کی نماز جنازہ نہ پڑھی تھی...... ومن قُتل من البُغاةِ او قُطّاعِ الطريقِ لم يُصلَّ عليه لِانَّ علياً لم يُصَلِّ على البُغاةِ...... (ہدایہ، ج2 ص189، باب الشہید) اور ادھر تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے اصحابِ صفین کے قیدیوں میں سے فوت ہونے والوں پر نماز جنازہ پڑھی تھی اور مدِ مقابل لشکریوں نے ایک دوسرے کے مقتولین کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا تھا، چنانچہ:۔

"عن عقبة بن علقمة اليشكري قال :شهدت مع علي صفين، فأُتي بخمسة عشر أسيراً من أصحاب معاوية، فكان من مات منهم غسله وكفنه وصلى عليه"۔

عقبہ بن علقمہ کہتے ہیں کہ میں جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ حاضر تھا، ان کی خدمت میں حضرت معاویہؓ کے ساتھیوں میں سے پندرہ قیدی لائے گئے، ان میں سے جو فوت ہوا اس کو غسل و کفن دے کر اس پر حضرت علیؓ نے نماز جنازہ پڑھی۔

(مختصر تاريخ دمشق، ج1ص131،دار الفكر دمشق)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

"متعدد مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ جنگِ صفین وغیرہ کے موقع پر دن کے وقت فریقین میں جنگ ہوتی اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دوسرے لشکر میں جا کر ان کے مقتولین کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا کرتے"۔

(البدایۃ والنہایۃ، بحوالہ مقامِ صحابہ، ص111)

اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک اصحابِ صفین، فقہی و شرعی باغی اور حدیث قتلِ عمارؓ کے مصداق نہ تھے ورنہ وہ ان کی تجہیز و تکفین نہ کرتے، ان پر نماز جنازہ نہ پڑھتے، لشکر مرتضویؓ کے لوگ لشکرِ معاویہؓ کے مقتولین کی تجہیز و تکفین میں حصہ نہ لیتے، کیونکہ صاحبِ ہدایہ کے بقول حضرت علیؓ نے باغیوں پر نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔

حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان نقل کیا ہے جو آپ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا جن سے آپ کی جنگ ہوئی: "....فإنهم زعموا أنّا بغينا عليهم وزعمنا أنهم بغوا علينا.." "یعنی ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی جبکہ ہمارا خیال تھا کہ انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی (تاریخ دمشق لابن عساکر، ص343ج1) اب اگر اس بات پر غور کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل حضرات کا یہ گمان کس بنیاد پر تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے؟ جبکہ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل حضرات میں سے کسی نے بھی اپنے خلیفہ یا امام ہونے کا سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا تھا اور بغاوت تو امام و حاکم کے خلاف خروج کی صورت میں ہوتی ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے یوں ہی تعبیر فرما رہے ہیں کہ "ان کا گمان تھا کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے" تو اس سوال کا جواب یہی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس قول میں "بغاوت" سے مراد "شرعی و حقیقی" بغاوت نہیں جو کہ حاکم و امام کے خلاف کچھ شروط کے ساتھ ہوتی ہے، بلکہ یہاں یہ اپنے لغوی معنی میں صرف "زیادتی" کے معنی میں ہے، اسی کو کچھ علماء نے یوں تعبیر کیا ہے کہ "یہ بغاوت حقیقی نہ تھی بلکہ صورتاً بغاوت تھی"۔

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح ان کے مخلص لشکری بھی حضرت معاویہؓ اور ان کے لشکریوں کو حضرت عمارؓ کا قاتل اور "الفئة الباغية" کا مصداق نہ سمجھتے تھے، کیونکہ یہ سب بھی قرآن مجید کو حَکم بنانے اور جنگ بند کرنے پر راضی ہو گئے تھے، ان میں سے کسی ایک سے بھی حضرت معاویہؓ کے خلاف حدیثِ قتل عمارؓ سے استدلال کر کے ان کو باغی قرار دینا اور پھر اس بنا پر ان سے جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دینا بسندِ معتبر منقول نہیں، بلکہ صحیح بخاری (ج1ص451و 602اور ج2ص1087) اور صحیح مسلم (ج2ص106) کی

روایت کے مطابق تو حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے صفین سے واپسی پر ایک سلسلۂ گفتگو میں اپنے ہی ساتھیوں سے یہاں تک فرمادیا تھا کہ" اتهموا رأيكم على دينكم " وفي رواية" اتهموا انفسكم " یعنی اپنی ہی رائے کو الزام لگاؤ، حالانکہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ بدری صحابی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مواخاتی بھائی ہیں، صفین میں انہی کی طرف سے بنفس نفیس موجود تھے، حدیثِ قتل عمار رضی اللہ عنہ اور واقعۂ قتلِ عمار رضی اللہ عنہ سے بخوبی واقف تھے، اگر یہ حضرات، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو ہی شرعی باغی اور قاتل عمار رضی اللہ عنہ سمجھتے ہوتے تو نہ تو وہ قرآن کو حَکَم بنانے اور جنگ بند کرنے پر راضی ہوتے اور نہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ ان کو" اتهموا رأيكم " کا مشورہ ہی دیتے۔

اسی طرح سینکڑوں غیر جانبدار صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کو" الفئة الباغية" کا قطعی مصداق اور شرعی و حقیقی باغی نہ سمجھتے تھے، ورنہ وہ اس جنگ کے بعد غیر جانبدار نہ رہتے بلکہ قرآن کے حکم " فقاتلوا التی تبغی... الخ" پر عمل کرنے کے لئے کمربستہ ہوجاتے، حالانکہ وہ جیسے جنگ صفین اور قتل عمار رضی اللہ عنہ سے پہلے غیر جانبدار تھے ایسے ہی اس کے بعد بھی بدستور غیر جانبدار ہی رہے۔

"فئہ باغیہ" کا مصداق کون؟

مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت مروی ہے جس میں آپ کے شاگرد "عکرمہ" بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں اور اپنے بیٹے "علی" کو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس جانے کا کہا، اس روایت کے الفاظ ہیں :

"..... انْطَلِقَا إِلَى أَبِي سَعِيدٍ فَاسْمَعَا مِنْهُ حَدِيثَهُ فِي شَأْنِ الْخَوَارِجِ، فَانْطَلَقَا فَإِذَا هُوَ فِي حَائِطٍ لَهُ يُصْلِحُ، فَلَمَّا رَآنَا أَخَذَ رِدَاءَهُ، ثُمَّ احْتَبَى، ثُمَّ أَنْشَأَ يُحَدِّثُنَا حَتَّى عَلَا ذِكْرُهُ فِي الْمَسْجِدِ، فَقَالَ: كُنَّا نَحْمِلُ لَبِنَةً لَبِنَةً، وَعَمَّارٌ يَحْمِلُ لَبِنَتَيْنِ لَبِنَتَيْنِ، فَرَآهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يَنْفُضُ التُّرَابَ عَنْ رَأْسِهِ، وَيَقُولُ: يَا عَمَّارُ أَلَا تَحْمِلُ لَبِنَةً لَبِنَةً كَمَا يَحْمِلُ أَصْحَابُكَ؟ قَالَ: إِنِّي أُرِيدُ الْأَجْرَ عِنْدَ اللهِ، قَالَ: فَجَعَلَ

يَنْفُضُ وَيَقُولُ: وَيْحَ عَمَّارٍ، تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ قَالَ: وَيَقُولُ عَمَّارٌ: أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الْفِتَنِ..."۔

مفہوم یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے شاگرد عکرمہ اور اپنے بیٹے علی بن عبداللہ بن عباس کو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس یہ فرما کر بھیجا کہ: جاؤ اور ان سے وہ حدیث سنو جو خوارج کے بارے میں ہے، چنانچہ یہ دونوں حضرات ان کے پاس گئے تو اس وقت تو وہ اپنی ایک دیوار کی مرمت میں مصروف تھے، جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو اپنی چادر گھٹنوں کے گرد باندھ کر بیٹھ گئے اور پھر ہمیں حدیث سنانے لگے یہاں تک کہ مسجد میں ان کی آواز بلند ہونے لگی، آپ نے فرمایا کہ (مسجد کی تعمیر کے وقت) ہم ایک ایک اینٹ اٹھا رہے تھے اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو دو اینٹیں اٹھا رہے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عمار! آپ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح ایک ایک اینٹ کیوں نہیں اٹھاتے؟ تو حضرت عمار نے فرمایا: میں اللہ سے اجر کا طالب ہوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ان کے سر سے گرد جھاڑتے ہوئے فرمایا کہ: افسوس ہے کہ عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا (یاد رہے! اس روایت میں صرف "تقتله الفئة الباغية" کے ہی الفاظ ہیں، آگے یہ الفاظ نہیں ہیں کہ وہ باغی گروہ جہنم کی طرف بلانے والا ہوگا اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ انہیں جنت کی طرف بلانے والے ہوں گے)۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے، هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ عَلَى شَرْطِ الْبُخَارِي۔ یعنی یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرط کے مطابق صحیح ہے، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "تلخیص المستدرک" میں اس روایت کی تصحیح سے اختلاف نہیں کیا۔

(المستدرك للحاكم،بتحقيق مصطفى عبد القادر عطا، ج2ص162و 163،دار الكتب العلمية بيروت)

اس روایت میں صاف تصریح ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے شاگرد اور اپنے بیٹے کو خاص طور پر وہ حدیث سننے کے لئے بھیجا جو "خوارج" کے بارے میں ہے، اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے

انہیں وہ حدیث سنائی جس میں ایک باغی گروہ کے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا ذکر ہے، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک بھی" الفئۃ الباغیۃ" سے مراد خوارج ہیں، اور یہ وہی لوگ تھے جو پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کر کے" الفئۃ الباغیۃ" بن چکے تھے اور یہی بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہو کر" خوارج" بنے۔

ایک اشکال کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ" خوارج" نام کا فرقہ تو جنگ صفین میں جنگ بندی اور تحکیم کے بعد پیدا ہوا اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ تو اس سے پہلے جنگ کے دوران شہید ہو چکے تھے، تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والی" فئہ باغیہ" کا مصداق خوارج کو قرار دینا کیسے درست ہوگا؟

تو اس اشکال کا حل یہ ہے کہ وہ لوگ جو جنگ صفین میں جنگ بندی کے بعد "خوارج" کہلائے، یہ دراصل وہی" سبائی باغی گروہ" تھا جن کی سازشوں کی نتیجے میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی اور جن کی ریشہ دوانیوں اور فساد کی وجہ سے ہی مسلمانوں کے مابین جمل و صفین جیسے واقعات ہوئے، اور جب جنگ صفین میں جنگ بندی ہوگئی اور صلح و تحکیم پر جانبین کی رضامندی ہو چکی اور اس سازشی گروہ کو اپنے منصوبے کی تکمیل خطرے میں نظر آئی تو اس وقت یہ کھل کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بھی خلاف ہو گئے، تو بھلے ان کا نام" خوارج" اس کے بعد پڑا ہو لیکن یہ گروہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور مدینہ منورہ میں فتنہ و فساد بپا کر کے انہیں شہید کیا، تو مندرجہ بالا روایت میں "خوارج" سے یہی گروہ مراد ہے جنہوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شہادت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بار بار آپ کے قاتلین کو" خوارج" کے لفظ سے یاد کیا ہے، مثلاً ان اصحاب و تابعین کا ذکر کرتے ہوئے جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے قاتلین سے قصاص لینے کا مطالبہ لے کر اٹھے تھے، لکھتے ہیں :

"... وَقَامَ فِي النَّاسِ مُعَاوِيَةُ وَجَمَاعَةٌ مِنَ الصَّحَابَةِ مَعَهُ يُحَرِّضُونَ

النَّاسَ عَلَى الْمُطَالَبَةِ بِدَمِ عُثْمَانَ، مِمَّنْ قَتَلَهُ مِنْ أُولَئِكَ الْخَوَارِجِ.."۔

مفہوم: لوگوں میں حضرت معاویہ اوران کے ساتھ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی ایک جماعت کھڑی ہوئی اورانہوں نے ان لوگوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کا مطالبہ کیا جنہوں نے ان"خوارج" میں سے آپ کو قتل کیا تھا۔

(البداية والنهاية، ج7ص402، دار ابن كثير بيروت)

اہلِ خِرِبتا، جو دس ہزار ایسے نفوس پر مشتمل تھے جو بقول حافظ ابن کثیر"سادة الناس ووجوههم" یعنی لوگوں میں معتبر اور بڑے معروف تھے (البداية والنهاية، ج7ص435، وزارة الاوقاف قطر) جن میں حضرت مسلمۃ بن مُخلَّد اور حضرت معاویہ بن حُدیج (رضی اللہ عنہما) جیسے صحابہ بھی تھے، یہ لوگ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان معاملہ صاف ہونے تک گو حضرت علیؓ کے لئے بیعت کرنے میں متوقف تھے، اسی لئے صفین میں عملاً شریک نہ ہوئے تھے، مگر ابتداءً معتقد انہی کے تھے اور انہی کے گورنرِ مصر حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کے مطیع وفرمانبردار تھے، انہوں نے جنگ صفین اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ بہت قریب سے دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود جب مصر کے دوسرے علوی گورنر یعنی محمد بن ابی بکرؓ کی غلط پالیسی نے ان کو برہم کر دیا تو وہ دس ہزار کے دس ہزار" وجوہ الناس" حضرت معاویہؓ سے مل گئے، ان میں سے دس بیس بھی حضرت علی المرتضیٰؓ کے ساتھ نہ رہے، جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ سمجھ نہیں آتا کہ یہ دس ہزار "سادة الناس" بھی حضرت معاویہؓ اوران کے لشکر کو شرعی باغی اور" الفئة الباغية" کا مصداق نہ سمجھتے تھے ورنہ وہ قرآن کے حکم" فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء الى امر الله" سے یوں اجتماعی بغاوت نہ کرتے اور یوں یکدم حضرت علیؓ سے کٹ کر حضرت معاویہؓ سے نہ مل جاتے۔

یہ تو اسلاف تھے اُس دور کے جس دور کا یہ واقعہ تھا، بعد کے اسلاف کی بھی ایک جماعت، حضرت معاویہؓ وغیرہ صحابہؓ کے بجائے خوارج کے نام سے سبائیوں کو ہی" الفئة الباغية" کا مصداق سمجھتی رہی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ مہلب رحمۃ اللہ علیہ (م 435ھ) اور حافظ ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ (م449ھ) کے حوالہ سے پہلے تو حدیث کا یہ مصداق یوں نقل کیا (اصل عبارت حافظ ابن حجرؒ کی نقل کے

مطابق یہ ہے):

"وقال ابن بطال تبعاً للمهلب، انما يصح هذا فى الخوارج الذين بَعثَ اليهم عليٌّ عمّاراً يدعوهم الى الجماعة ولايصح فى احد من الصحابة"۔

اور پھر ساتھ ہی یہ تصریح بھی کی ہے کہ:

"وتابعه علىٰ هذا الكلام جماعة من الشُرّاح" یعنی علامہ مہلبؒ کی پیروی میں حافظ ابن بطالؒ نے حدیث کا جو یہ مصداق بیان کیا ہے اس میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ شراحِ حدیث کی پوری ایک جماعت بھی اس میں ان کی ہمنوا ہے۔

(فتح البارى، ص542/ج 1۔ عمدة القارى، ص209/الجزء الرابع، باب التعاون فى بناء المسجد)

اسی طرح قوام السنۃ ابو القاسم اسماعیل بن محمد الاصبہانی (م 535ھ) نے بھی اپنی شرح صحیح البخاری میں لکھا ہے کہ:

"وقوله:يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار ، يعني الخوارج الذين دعاهم الى الجماعة وليس يصح ذلك في حق أحد من الصحابة الذين اثنى الله عليهم، وشهد لهم بالفضل، فقال تعالى:كنتم خير أمة أخرجت للناس،قال أهل اللغة والتفسير:هم اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم"۔

(اس حدیث میں جو یہ بیان ہے کہ) حضرت عمارؓ انہیں جنت کی طرف بلائیں گے اور وہ حضرت عمارؓ کو آگ کی طرف بلائیں گے، اس سے مراد وہ خوارج ہیں جنہیں جماعت کی طرف بلایا گیا تھا، اور اس بات کو جماعت صحابہ میں سے کسی ایک کی طرف بھی منسوب کرنا درست نہیں ہے، جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور جن کی فضیلت کی گواہی دی ہے، چنانچہ فرمان خداوندی ہے: تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے،

اہل لغت اور مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد حضرت محمد ﷺ کے صحابہ ہیں۔

(شرح صحيح البخاري لقوام السنة الاصبهاني، ج2ص407،طبع الكويت)

شُرّاحِ حدیث کی اس جماعتِ متقدمین کا بیان کردہ حدیث کا یہ مصداق صحیح ہے یا غلط؟ اور بعد کے شراحِ حدیث ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں؟ اس وقت اس سے بحث نہیں بلکہ اس وقت تو صرف یہ بتانا ہے کہ اسلاف میں حضرت معاویہؓ وغیرہ کو حضرت عمارؓ کا قاتل اور" الفئة الباغية" کا مصداق ٹھہرانے والے ہی نہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو ان کو شرعی باغی اور قاتل عمارؓ نہیں ٹھہراتے۔

پھر بات گزشتہ ادوار کے اسلاف تک ہی محدود نہیں بلکہ ہمارے دور کے اکابر و علماء کی بھی ایک جماعت، حضرت معاویہؓ کے بجائے سبائیوں کو ہی حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل اور" الفئة الباغية" کا مصداق قرار دیتی رہی ہے۔

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

"حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے بے شک طائفہ باغیہ ہوں گے لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے ماتحت نہیں آتے اس لیے کہ باغی اسے کہتے ہیں جو کسی حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے خلاف ہو جائے اور جو شروع سے ہی مخالف ہو اس پر باغی کا لفظ پورا منطبق نہیں اترتا، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور پھر وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت میں شامل ہو گئے ہوں ہاں یہ صحیح ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے والے اس حدیث کی رو سے طائفہ باغیہ ہیں لیکن جب تک ان قاتلوں کی نشاندہی نہ ہو جائے ہم اس حدیث کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پورے لشکر پر منطبق نہیں کر سکتے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو اپنی وفات کے وقت تک مسلمانوں کے بالاتفاق حکمران تھے مختلف فیہ شخصیت نہ تھے، وہ باغی کیسے ہو سکتے ہیں".

(عبقات جلد دوم، صفحہ 379)

استاذنا المکرم حضرت مولانا شیخ محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"... مگر ذیل کے حقائق پر نظر ڈالتے ہوئے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے مخلص ساتھیوں اور اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دامن حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے سے بالکل پاک وصاف ہے، نہ تو انہوں نے حضرت رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور نہ ہی وہ باغی اور داعی الی النار بنے...."

اس کے بعد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے" سبائی فسادی ٹولے" کے کارناموں کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے اور پھر لکھا ہے :

"سبائی پارٹی کے شریر اور مفسد کارندے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں بھی شامل تھے اور فتنہ سازی کی خاطر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بھی گھسے ہوئے تھے....... حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں داخل ہونے والے انہی فسادی لوگوں نے جو الفئۃ الباغیۃ اور یدعون الی النار کا مصداق تھے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو شہید کیا.."۔

آگے مختلف دلائل ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

"...اس سے بھی ثابت ہوا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل نہ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے اور نہ ان کی شامی فوج، یہ کاروائی عبداللہ بن سبا کے یمنی کارندوں کی تھی"۔

(بخاری شریف کے چند ضروری مباحث ص 4 تا 13 / یہ رسالہ حضرت شیخ کی تقریر بخاری" احسان الباری لفہم البخاری" طبع ششم 2009 کے آخر میں ملحق ہے)

حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب، شیخ الحدیث دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ (تلمیذ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ، وسابق استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن) کے افادات پر مشتمل امام سراج الدین علی بن عثمان الأوشی الحنفی (م569ھ وقیل 575ھ) کے منظوم رسالے" بدء الأمالي" کی شرح دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، مفتی صاحب نے" حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل کون؟" کے عنوان کے تحت حدیث قتل عمار" تقتلہ الفئۃ الباغیۃ" پر تفصیلی کلام کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، آپ

لکھتے ہیں :

"اس حدیث کے پہلے حصے کو اکثر حضرات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت پر محمول کرتے ہیں اور ان کو باغی قرار دیتے ہیں، لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے، اس کا مصداق وہ ٹولہ ہے جو خلافت اسلامیہ کی توسیع کا دشمن تھا اور جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تھی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت ہی نہیں کی تھی تو بغاوت کہاں؟......"۔

(بدر اللیالی شرح بدء الآمالی، جلد 2 صفحہ 118 طبع جنوبی افریقہ)

اس کے بعد مفتی صاحب نے صفحہ 121 پر عنوان باندھا ہے "فئۃ باغیۃ کا مصداق وہ جماعت ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کی باغی تھی" اور پھر بہت سے قرائن وشواہد سے اس بات کو ثابت کیا ہے، تفصیل کے لئے کتاب مذکور کی جلد 2 کے صفحات 117 تا 128 کا مطالعہ مفید ہوگا۔

انہی مفتی صاحب نے اپنی دوسری کتاب "العصیدۃ السماویۃ شرح العقیدۃ الطحاویۃ"، جلد 2 صفحہ 256 پر بھی لکھا ہے کہ :

"فئہ باغیہ کا مصداق وہ جماعت ہے جو حضرت عثمان t کی خلافت کی باغی تھی"۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا صحابہ کرام وتابعین عظام کو "شرعی واصطلاحی" باغی قرار دینا بغاوت کی شرعی وفقہی تعریف کے مطابق درست نہیں، اور اگر قرون اولیٰ میں کسی نے سیدنا رضی اللہ عنہ کے مدمقابل صحابہ کرام پر "بغاوت" کا لفظ بولا بھی ہے تو اس سے مراد شرعی واصطلاحی بغاوت ہرگز نہیں، بلکہ لغوی معنیٰ مراد ہے (جیسے ہم کسی بھی فریقین کے درمیان صلح کرواتے ہوئے کسی ایک فریق کا قصور بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ "زیادتی" تمہاری طرف سے ہوئی ہے)، یا "صورتاً" بغاوت مراد ہے نہ کہ حقیقی بغاوت۔

آج کل کے بعض مصنفین کو کتب فقہ میں لکھی اس بات سے بھی اشتباہ ہوا ہے کہ "باغیوں کے احکام کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا عمل اور طریقہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے"، اور یہ لوگ اس میں جمل وصفین کو بھی شامل کر دیتے ہیں، جبکہ اس بات کا تعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے "خوارج" (حقیقی "الفئۃ الباغیۃ") کے خلاف

اپنائے گئے طرز عمل سے ہے اور آپ کا یہی عمل بعد والوں کے لئے قدوہ ہے۔

ایک اشکال کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام کا اتفاق نہ ہوسکا، جبکہ دوسری طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ دوسرے صحابہ کا اختلاف، خلافت پر نہ تھا بلکہ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ پر تھا، تو اگر اختلاف قصاص پر تھا، خلافت پر نہ تھا تو پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت تو صحابہ کرام کے درمیان اتفاقی ہوگئی، لہٰذا یہ کہنا کیونکر درست ہوگا کہ آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحابہ کرام کا اتفاق نہ ہوسکا؟

جواب

یہ بات درست ہے کہ جو صحابہ کرام سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے الگ رہے تھے، ان کا بنیادی اختلاف قصاص عثمان رضی اللہ عنہ پر ہی تھا، اس بات پر نہیں تھا کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں خلافت کے مدعی تھے یا وہ (معاذ اللہ) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے، لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ان حضرات نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت نہیں کی تھی، اگر بیعت کرلی ہوتی تو پھر جنگوں اور قتال کی نوبت ہی کیوں آتی؟ چند حوالے ملاحظہ ہوں:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، چند اقوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَيُقَالُ: حَادِي عَشَرَ قَوْلُكُمْ: "بَايَعَهُ الْكُلُّ بَعْدَ عُثْمَانَ" مِنْ أَظْهَرِ الْكَذِبِ، فَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ: إِمَّا النِّصْفُ، وَإِمَّا أَقَلُّ أَوْ أَكْثَرُ لَمْ يُبَايِعُوهُ، وَلَمْ يُبَايِعْهُ سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ وَلَا ابْنُ عُمَرَ وَلَا غَيْرُهُمَا۔

"اور جو گیارہویں بات یہ کہی جاتی ہے کہ: سیدنا عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بعد سب نے ان (سیدنا علی رضی اللہ عنہ) کی بیعت کرلی تھی۔ تو یہ بات صاف جھوٹ ہے، کیونکہ بہت سے مسلمانوں نے، آدھوں نے یا اس سے ذرا کم یا اس سے زیادہ نے (یعنی تقریباً آدھوں نے) ان کی بیعت نہیں کی تھی، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے نہیں کی تھی، ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نہیں کی تھی"۔

(منهاج السنة، ج4ص515و 516،طبع سعوديه)

نوٹ: امام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) سے بڑا قاطع رافضیت شاید ہی کوئی ہوا ہے، اور وہ فرمارہے ہیں کہ اس وقت موجود مسلمانوں کی آدھی کے قریب تعداد نے سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کی بیعت نہیں کی تھی۔

ایک اور جگہ یہی امام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) لکھتے ہیں:

فَإِنَّ ثُلُثَ الْأُمَّةِ أَوْ أَقَلَّ أَوْ أَكْثَرَ لَمْ يُبَايِعُوا عَلِيًّا. بَلْ قَاتَلُوهُ وَالثُّلُثَ الْآخَرَ لَمْ يُقَاتِلُوا مَعَهُ وَفِيهِمْ مَنْ لَمْ يُبَايِعْهُ أَيْضًا؛ وَالَّذِينَ لَمْ يُبَايِعُوهُ مِنْهُمْ مَنْ قَاتَلَهُمْ، وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ يُقَاتِلْهُمْ …

بے شک امت کے ایک تہائی یا کم یا زیادہ لوگوں نے سیدنا علی (رضی اللہ عنہ) کی بیعت نہیں کی تھی، بلکہ ان کے ساتھ جنگ بھی کی، اور دوسرے ایک تہائی نے ان کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ نہ لیا پھر ان (ان کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ نہ لینے والوں) میں ایسے بھی تھے جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی، اور پھر جنہوں نے ان کی بیعت نہیں کی تھی ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کے ساتھ انہوں نے قتال کیا اور ایسے بھی تھے جس کے ساتھ قتال نہیں کیا"۔

(منهاج السنة ،ج8ص338، طبع سعوديه)

اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:

"اے برادر! اس معاملہ میں (یعنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے میں) امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) تنہا نہیں ہیں، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کم وبیش نصف جماعت اس معاملہ میں سیدنا معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے شریک ہیں"۔

(مکتوبات امام ربانی، اردو، دفتر اول، مکتوب نمبر 251، طبع ادارہ مجددیہ کراچی)

اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ پہلے نقل ہوا کہ:

"حضرت علی مرتضی (رضی اللہ عنہ) باوجود سوابق اسلامیہ میں راسخ القدم ہونے اور باوصف کثرت اوصاف خلافت خاصہ کے (ان کی ذات میں پائے جانے کے) اور باوجود اس کے کہ ان کے لئے بیعت کا انعقاد ہوا، اور رعیت کا احکام الہی میں ان کے لئے مطیع ہونا ثابت ہوگیا، خلافت میں متمکن نہ ہوئے اور اطراف ملک میں ان کا حکم نافذ نہ ہوا اور تمام مسلمانوں نے ان

کے حکم کے آگے سر نہ جھکایا اور جہاد ان کے زمانہ میں بالکل بند ہوگیا اور مسلمانوں کی یکجہتی میں فرق آیا......... ہر چند ان خرابیوں نے آنجناب رضی اللہ عنہ کے صفات کاملہ نفسانیہ میں کوئی خلل نہیں پیدا کیا مگر مقاصد خلافت جیسا کہ چاہیئے حاصل نہ ہوئے.. "۔

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 479، 480 جلد 1)

نیز یہ بھی پہلے نقل ہوا کہ :

" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث میں جو متواترہ ہیں اور متعدد اسناد سے روایت کی گئی ہیں بیان فرمادیا ہے کہ امت حضرت مرتضی (رضی اللہ عنہ) پر جمع نہ ہوگی".

(ازالۃ الخفاء مترجم اردو، صفحہ 504 جلد 4)

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین چکوالی مرحوم لکھتے ہیں :

" حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موعود خلیفہ راشد ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے لیکن دور صحابہ میں یہ نصوص صحابہ کرام کے پیش نظر نہ تھیں، کیونکہ آیت وحدیث میں خلفائے اربعہ کے نام نہیں تھے، اس وقت صحابہ کرام نے اپنے اپنے اجتہاد کی بنا پر اپنا اپنا موقف اختیار کرلیا... "

(خارجی فتنہ، جلد اول، صفحہ 390، طبع جدید)

نیز ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

" اور مشاجرات صحابہ کے دوران کسی کو علم نہ تھا کہ باقتضاء النص حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ چوتھے موعودہ خلیفہ راشد ہیں، کیونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی اور صحابی مراد ہو، اس لیے فریق ثانی نے اپنے اجتہاد کی بنا پر آپ کی مخالفت کی.... لیکن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے بعد یہ ثابت ہوا یہ باقتضاء النص علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ چوتھے درجہ پر قرآن کی موعودہ خلافت کے مصداق تھے... "

(ملخصاً، دفاع حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، صفحہ 52، طبع جدید)

یہ تمام حوالے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آپ رضی اللہ عنہ کی

خلافت وبیعت پر تمام صحابہ کرام کا اتفاق نہ ہوسکا، اور اس کی وجہ (معاذ اللہ) آپ رضی اللہ عنہ کی شخصیت یا آپ کی خلافت کے لئے اہلیت نہیں تھی، نہ ہی آپ کے مقابلے میں کوئی دوسرا خلافت کا مدعی تھا، بلکہ اختلاف کا سبب قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کا مسئلہ ہی تھا لیکن اختلاف کا سبب قصاص عثمان رضی اللہ عنہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کی خلافت اور بیعت پر تمام صحابہ کا اتفاق ہوگیا تھا اور سب نے بیعت کر لی تھی، کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ کئی صحابہ کرام نے آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی اور قرن صحابہ میں آپ کی خلافت پر اتفاق نہ ہوسکا۔

❁❁❁

E - BOOK